

Downloaded From Paksociety.com

پچھلے باغیچے میں وہ عائشہ کی ورک ٹیبل کی کرسی کھینچ کر بیٹھا اور یوں ہی آسمان کو دیکھنے لگا۔ اس کا اپنا دل بھی بہت دکھی تھا۔ ان دونوں بہنوں کو اس کی وجہ سے اتنی تکلیف اٹھانی پڑے گی، اس نے کبھی یہ نہیں چاہا تھا، مگر وہ جانتا تھا کہ وہ اس سب کا ذمہ دار ہے۔ اس کی اور اس کے کاموں کی وجہ سے یہ سب ہوا تھا، مگر پھر بھی وہ بے قصور تھا۔ بہارے سے سختی اور سرد مہری سے بات کر کے اس نے اپنے تئیں ان کی روانگی آسان بنانے کی کوشش کی تھی، شاید یوں کرنے سے بہارے اس سے محبت کرنا چھوڑ دے اور پھر جلد اسے بھول جائے۔ یہ سب آسان نہیں ہوگا، مگر عائشہ سنبھال لے گی اسے۔

اور اپنے کمرے کی کھڑکی سے اسے باغیچے میں بیٹھے دیکھ کر عائشہ نے بے اختیار سوچا تھا کہ بہارے کو تو وہ سنبھال لے گی، مگر خود کو کیسے سنبھالے گی؟ چند ماہ قبل اس کی اور عبدالرحمن کی شدید لڑائی کے بعد اسے علم ہو گیا تھا کہ جلد یا بدیر وہ عبدالرحمن سے الگ ہو جائیں گی۔ وہ ان کا کبھی نہیں تھا۔ وہ ان کے لیے بنا ہی نہیں تھا۔ وہ ایک غیر فطری زندگی گزار رہے تھے، مگر اب وہ فطری طریقے پہ واپس آجائیں گے۔ دادی، چچا، چھوٹی بہن..... عائشہ کے تین ساتھی، فیملی ممبرز۔ اصل زندگی، حقیقی گھر، مکمل فیملی۔

اس نے انگلی کی نوک سے آنکھ کا بھیگا گوشہ صاف کیا اور الماری کی طرف بڑھ گئی۔ آنے صبح سے تیاری میں لگی تھیں۔ وہ بہت خوش تھیں، سوا سے بھی اب تیاری مکمل کر لینی چاہیے۔

رہی محبت..... تو وہ اچھی لڑکیوں کو بھی ہو ہی جاتی ہے، لیکن جب انہیں یہ پتا چل جائے کہ وہ محبت انہیں مل ہی نہیں سکتی، تو وہ خاموش رہتی ہیں۔ اچھی لڑکیاں خاموش ہی اچھی لگتی ہیں۔

دکھی دل کے ساتھ اس نے دراز سے اپنی قیمتی چیزیں نکالنی شروع کیں۔ وہ ان سب کو ایک جیولری باکس میں ڈال رہی تھی۔ سب سے اوپر اس نے اپنی انگلی میں انگلی اتار کر رکھی۔ یہ اسے عبدالرحمن نے اس کی سالگرہ پہ تحفے میں دی تھی اور وہ اسے کبھی نہیں اتارتی تھی۔ جواب میں اس نے عبدالرحمن کو اپنی سالگرہ پہ کیا دیا تھا۔ اس نے اپنے جیولری باکس کی سب سے آخری، چھوٹی سی دراز کھولی۔ وہ خالی تھی۔ کبھی اس میں وہ شے ہوتی تھی، جو اس نے عبدالرحمن کو دے دی تھی۔ مگر اس بے رحم آدمی نے اس کے تحفے کے ساتھ کیا کیا؟

عائشہ نے آزر دگی سے سر جھٹکا۔ زندگی میں سب سے زیادہ خوف اسے اسی بات پر آتا تھا کہ کہیں وہ جانتا تو نہیں کہ وہ کیا سوچتی ہے۔ مگر نہیں، وہ کبھی نہیں جان سکتا تھا۔ اس نے خود کو تسلی دی۔ وہ غلط تھی۔

☆ ☆ ☆

زارا اس سے ملنے آئی تھی۔ اتنے عرصے میں زارا کو تو وہ جیسے بھول ہی گئی تھی۔ اب دونوں مل کر بیٹھیں تو وہ ترکی کی باتیں ہی کیے گئی۔ بس یہی وہ موضوع تھا جس پر وہ زارا سے بات کر سکتی تھی۔ بعض دفعہ دوست تو وہی ہوتے ہیں، مگر وقت انسان کو اتنا آگے لے جاتا کہ وہ اپنے دوست کے مدار سے ہی نکل آتا ہے۔ پھر کتنا ہی میل ملاقات رکھ لے، وہ درمیانی فاصلہ ناقابل عبور بن جاتا ہے۔ وہ بھی زارا کے مدار سے نکل آئی

تھی۔ اس کی دوستیں تو صرف عائشہ گل اور بہارے گل تھیں، جن کو وہ بتا کر بھی نہیں آئی تھی۔

آج فون کیا تو عائشہ کا سیل آف تھا، ہواس نے میل کر دی۔ ابھی تک جواب نہیں آیا تھا۔

زارا گئی تو فاطمہ نے اسے بلالیا۔ صائمہ تائی آئی تھیں۔ اسے دیکھ کر مسکرا دیں۔

”شکر ہے بیٹا! تم ہو..... ورنہ میں کیا کرتی۔ ارم کے سرسرا والوں کی شاپنگ کرنی ہے۔ منگنی کے تحائف وغیرہ۔ ارم کو تو کچھ سمجھ نہیں

ہے۔ تمہارا میٹ اچھا ہے۔ میرے ساتھ چلو۔“ تائی کی زبان میں جو حلاوت تھی، چکنائی بھری حلاوت عائشہ، بہارے، ہالے، مقصم، ڈی جے یہ لوگ اس چکنائی سے کتنے دور تھے نا۔

شیور تائی اماں! میں ذرا عمایا لے آؤں۔“ وہ ہامی بھر کر اٹھنے لگی تو فاطمہ چوکیں۔

”تم نے عمایا لیا ہے؟“

”جی اماں! ایک فرینڈ نے گنٹ کیا تھا۔ میں نے سوچا، اب باہر جاتے ہوئے لے لیا کروں گی۔“ وہ بظاہر بہت لاپرواہی سے کہتی اٹھ آئی۔

پھر تھوڑی دیر بعد ہی وہ اپنے پاؤں کو چھوتے، حریر کے عمایا میں سیاہ اسٹول سلیپے سے چرے کے گرد لپیٹ کر باہر آئی تو وہ دونوں پل بھر کو حیران رہ گئیں۔

”یہ اچھا کیا تم نے..... تم پہ اچھا بھی بہت لگ رہا ہے۔ فیشن بھی ہے آج کل عمایا کا۔“ صائمہ تائی مسکرا کر بولیں۔ ”ویسے! تمہارے

تایا نے دیکھا تو بہت خوش ہوں گے۔“

(مجھے تایا سے محفلیت تو نہیں چاہیے تائی اماں!)

”ہاں! عمایا تو اچھا ہے مگر بہت سہل نہیں ہے؟“ فاطمہ ذرا متذبذب تھیں۔

چونکہ اس کا عمایا سادہ اور سوائے آستین کے ہزار اسٹوز کے جواتنے مدھم تھے کہ توجہ نہ گھیرتے، کوئی کام نہ تھا، سوانہیں قلق تھا۔

”اور میں جب حج پگئی تو کتنا کہتی رہی کہ تمہارے لیے عمایا لے آؤں، مگر تم نے انکار کر دیا تھا۔“ فاطمہ تین چار سال پرانی بات

دہرائے لگیں۔ وہ اس لیے اصرار کرتی رہی تھیں کہ ان کی بھابھی جو ان کے ساتھ حج پر تھیں، اپنی بیٹیوں کے لیے قیمتی اور کامدار عمایا لے رہی تھیں۔

حیا نے صاف منع کر دیا تھا۔ عمایا کے بجائے اس کی کزنز کے برقعے عروسی ملبوسات لگتے تھے۔

”بس! دل چاہ رہا تھا۔“ وہ نقاب کی پٹی سر کے پیچھے باندھنے لگی۔

”تم نے نقاب بھی شروع کر دیا؟“ صائمہ تائی کو اب واقعتاً جھجکا لگا تھا۔

”چلیں تائی!“ وہ گاڑی کی چابی پرس سے نکالتے ہوئے بولی۔ اس کے نظر انداز کرنے کے باوجود تائی کہنے لگیں۔

”چلو اچھا لگ رہا ہے، مگر دیکھتے ہیں کہ تم کتنے دن کرتی ہو۔“

”اس نے دو دن بعد ہی چھوڑ دینا ہے۔“ فاطمہ مسکرا کر بولیں۔

”چلیں! دیکھتے ہیں لیڈیز۔“ وہ شانے اچکا کر کہتی باہر نکل آئی۔

استنبول بلا شاک و شبہ ایک خوب صورت اور شان دار قسم کا شہر تھا۔ وہ مانتی تھی، مگر جو بھی ہو، پاکستان، پاکستان تھا۔ اپنے ملک کا کوئی مقابلہ نہیں ہوتا۔ بہت عرصے بعد وہ اپنے اسلام آباد کی سڑکیں، درخت اور مارکیٹ دیکھ رہی تھی۔

تائی کو پورا ایف ٹین پھر آکر وہ دونوں شام ڈھلے واپس آئیں تو اب اور تایا فرق ان لان میں ہی بیٹھے تھے۔ حیا شاپر اٹھائے چلتی ہوئی

آئی تو تایا ذرا سیدھے ہوئے۔ شاید انہیں لگا کوئی مہمان ہے۔

”میں ہوں تایا!“ اس نے سر کے پیچھے بندھی پٹی اتار کر نقاب چہرے سے علیحدہ کیا تو وہ دونوں واقعی حیرت زدہ رہ گئے۔

”تم نے کب سے برقع لیا شروع کر دیا؟“

”ترکی میں شروع کیا تھا اور بس! ایسے ہی شروع کر دیا تھا۔“ وہ بہت عام سے انداز میں اپنے برقعے کی بات کر رہی تھی۔ تاکہ کوئی

مناق نہ اڑا پائے۔

مگر صائمہ تائی کسی اور ہی موڑ میں تھیں۔ وہ وہیں کھڑے کھڑے حیا کے برقعے کی تعریفیں کرنے لگیں۔ اباب مسکرا رہے تھے۔ انہیں

کچھ خاص فرق نہیں پڑتا تھا۔ تایا البتہ بہت خوش ہوئے۔

”ہم آج جیسا کہ رہے تھے کہ دیکھتے ہیں! کتنے دن تم برقع کرتی ہو۔“

”نہیں! ان شاء اللہ میری بیٹی قائم رہے گی۔“ تایا کی بات پتہ پھیکا سا مسکرا دی اور اندر چلی آئی۔

برقع ہی تھا، اتنا کیوں ڈسکس کرنے لگے تھے سب۔ اسے اچھا نہیں لگتا تھا، مگر شاید وہ بھی حق بجانب تھے۔ وہ پہلے اس کے برعکس لباس پہنتی تھی، ہوان کی حیرانی بجا تھی۔

خیر! جو بھی ہے۔ عیالیا اتار کر لکانے تک وہ ان تمام سوچوں سے چھٹکارا پا چکی تھی۔ اب اسے وہ کام کرنا تھا جس کے لیے وہ سارا دن مارکیٹ میں مضطرب رہی تھی۔ کل اسے یاد ہی نہیں رہا۔ تھکاوٹ ہی اتنی تھی اور آج موقع نہیں ملا۔ مگر اب مزید انتظار نہیں۔ اس نے لیپ ٹاپ آن کر کے بیڈ پر رکھا اور پرس سے وہ ٹھیکس ڈبی نکالی۔ وہ جب بھی اسے کھولتی، دل عجیب طرح سے دھڑکتا تھا۔ پتا نہیں، کیا ہوگا اس میں؟

اس نے فلیش ڈرائیو کا پلگ لیپ ٹاپ میں لگایا۔ روشن اسکرین پہ ایک چوکننا ابھرا۔ اس پہ ایک مختصر سا پیغام تھا۔ جس کا لب لباب یہ تھا کہ اس فائل پہ پاس ورڈ تھا اور پاس ورڈ درج کرنے کے لیے ایک ہی کوشش کی جاسکتی تھی۔ صحیح پاس ورڈ درج کیا تو فائل کھل جائے گی۔ غلط درج کیا تو فائل خود کو خود ہی ختم کر دے گی یعنی وہ کبھی نہیں جان سکے گی کہ اس میں کیا تھا۔ پیغام چند لمحوں بعد غائب ہو گیا۔ اب اسکرین پہ ایک خالی چوکننا چمک رہا تھا، جس میں آٹھ خانے بنے تھے۔ کسی آٹھ حرفی لفظ کے لیے یا کسی آٹھ ہندسوں کے عدد کے لیے۔

ایک تلخ مسکراہٹ اس کے لبوں پہ ابھری۔ اسے ایک نئی پہیلی دیکھ کر بالکل بھی غصہ نہیں چڑھا۔ میجر احمد نے اسے چیلنج کیا تھا اور اسے اب یہ چیلنج جیت کر دکھانا تھا۔ کہیں نہ کہیں سے اسے اس کا پاس ورڈ مل ہی جائے گا اور پھر وہ اسے کھول لے گی۔ اس نے فائل کو آگے پیچھے ہر طرح سے کھولنے کی کوشش کی، مگر اس کا پروگرام خاصا پیچیدہ تھا۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ ویسے یہ عجیب بات تھی کہ اس دفعہ احمد نے پہلی نہیں دی تھی۔ یہ پہلی دفعہ ہوا تھا، ورنہ وہ پہیلی ہمیشہ ساتھ ہی دیتا تھا۔ اب وہ پاس ورڈ کیسے ڈھونڈے؟ خیر! کوئی نہ کوئی حل نکل ہی آئے گا۔ وہ پرامید تھی۔

ترکی سے واپس آنے کے بعد آج اس نے فون آن کیا تھا۔ اپنی برائی سم و نکلو اچکی تھی۔ ابھی دو گھنٹے ہی گزرے تھے کہ فون بجنے لگا۔ وہ جو لیپ ٹاپ پہ اپنی اور ڈی جے کی تصاویر دیکھ رہی تھی، چونک کر سیدھی ہوئی۔ حلتی بھتی اسکرین پہ چمکتے الفاظ دیکھ کر ایک گہری سانس اس کے لبوں سے آزا ہوئی۔

”غیر مل گئی آپ کو میجر صاحب؟“ فون کان سے لگاتے ہوئے وہ بولی۔

”مل تو گئی مگر میں کافی حیران رہ گیا۔ آپ واپس کیوں آگئیں؟“ وہی نرمی، وہیما، شائستہ انداز۔ وہ جیسے اس کے انداز پر مسکرایا تھا۔

”حیرت ہے، آپ کو پہلی دفعہ پوری بات کا علم نہیں ہوا۔“

”لگتا ہے، آپ بہت غصے میں ہیں۔ کیا ہوا ہے؟“

”پتا نہیں۔“ وہ بے زاری بولی۔ پہلی بار اسے شدید احساس ہوا کہ وہ میجر احمد سے مزید بات نہیں کرنا چاہتی۔

”آپ کی آواز کافی بوجھل لگ رہی ہے۔ اداس بھی ہیں اور پریشان بھی۔ اگر آپ وجہ نہیں بتائیں گی تو میں اصرار نہیں کروں گا۔ بس اتنا بتائیں! آپ ٹھیک تو ہیں؟“ وہی فکر مند انداز۔ وہ کیوں کرتا تھا اس کی اتنی فکر۔

”جی! میں ٹھیک ہوں اور کچھ نہیں ہوا۔“ اگر اسے نہیں معلوم تھا تو وہ خود..... اپنے شوہر کی کسی کمزوری سے اسے آگاہ نہیں کرے گی۔

اور بتاتی بھی تو کیا، کہ اس نے عبدالرحمن کے ساتھ دیکھا ہے جہاں کو؟ اور وہ ان کی باتیں؟

ان ساری باتوں کو از سر نو یاد کرتے ہوئے وہ پھر سی گئی۔ عبدالرحمن نے اسے ٹیکسٹ کر کے بلایا تھا۔ جب وہ پیٹرنی کی کھڑکی کے قریب پہنچی تو اسے وہاں سے پاشا کا چہرہ سامنے دکھائی دے رہا تھا۔ ہو سکتا ہے، اس نے اسے آتے ہی دیکھ لیا ہو۔ ہو سکتا ہے وہ جان بوجھ کر یہ سب کہہ رہا ہو تاکہ وہ بدل ہو جائے اور جہاں کو چھوڑ دے۔ ہو سکتا ہے اس نے حیا کو ”سیٹ اپ“ کیا ہو۔ آخر! اس نے جہاں کی طرف کی کہانی تو نہیں سنی تھی۔ ابھی پورا مہینہ حائل تھا، اس کی اور جہاں کی ملاقات میں۔ تب تک وہ.....

”حیا؟“ وہ چوکی، پھر سر جھکا۔

”یہ جو آپ کی فلیش ڈرائیو پہ پاس ورڈ ہے، اسے کھول کر کوئی اور پزل بھی نکلے گا کیا؟“

”نہیں! یہ آخری لاک ہے۔ پھر میری امانت آپ دیکھ لیں گی۔“

”اور اس کا پاس ورڈ کیا ہے؟“

”وہ آپ جیسی ذہین خاتون کو چند منٹ میں ہی مل جائے گا۔“

”اچھا! آپ طنز کر رہے ہیں، وہ بے اختیار ہنس دی۔

”نہیں! سچ کہہ رہا ہوں۔ بہت ہی آسان ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ میرے پزل کا آخری ٹکڑا بھی جوڑ لیں گی۔“

”ٹھیک ہے! اگر مجھے مزید آپ کی ضرورت نہیں ہے تو پھر آپ آئندہ مجھے کال مت کیجئے گا۔ میں مزید آپ سے کوئی تعلق نہیں رکھنا

چاہتی۔“ اس کا لہجہ بہت خشک ہو گیا تھا۔ چند ثانیے وہ کچھ کہہ نہیں پایا۔

”مگر آپ کے شو ہر کو علم تو ہے، پھر.....؟“ مجھے آپ کو کچھ بتانا ہے حیا..... اس کی آواز میں دکھ سا تھا۔

”میں بغیر کسی ضرورت کے آپ سے بات نہیں کرنا چاہتی اور اب مجھے ضرورت نہیں رہی۔ اس لیے آئندہ میں آپ کی کال انیڈ نہیں

کروں گی۔ خدا حافظ۔“

کس لمبی بحث سے بچنے کے لیے اس نے از خود کال بند کر دی۔ احمد نے فوراً دوبارہ کال کی۔ اس نے نہیں اٹھائی۔ اب اسے احمد کی مزید کال نہیں اٹھانی تھی۔ کل کو کوئی اونچ نیچ کوئی سب سے پہلے اس کا حجاب بدنام ہوگا۔ وہ جانتی تھی کہ اب اسے بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ اس نے موبائل نیچے پیڈال دیا۔ احمد سے قطع تعلق کر کے اسے کوئی افسوس نہیں ہوا تھا۔ وہ اس کے لیے کبھی بھی، کچھ بھی نہیں رہا تھا۔ وہ مطمئن تھی۔

☆ ☆ ☆

اس شام وہ کچن میں کھڑی سلا دی تیار کر رہی تھی۔ فاطمہ بھی ساتھ ہی کام میں مصروف تھیں۔ نور بانو برتن دھو رہی تھی۔ ابالوؤنج میں ٹی وی کے سامنے بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ وہ ذرا بلند آواز میں ان تینوں افراد کی مصروفیت سے بے نیازان کو ترکی کی باتیں سنارہی تھی۔ جب اپنے اندر کی اداسی، جہان کی خاموشی اور یادوں سے تنگ آجاتی تو اسی طرح بولنے لگ جاتی اور آج کل تو اس کی ہر بات ترکی سے شروع ہو کر ترکی پہ ختم ہوتی تھی۔ سفر نامہ اتنبول، یہ وہ موضوع تھا جس سے گھر والے اب بور ہو چکے تھے۔ مگر وہاں پروا کسے تھی۔

اپنے گھر میں یہ سہولت تھی کہ کوئی مرد ملازم نہ تھا۔ تایا فرقان کا کلک ظفر بہت ہی کم اٹھرایا کرتا تھا۔ ان کا خاندان ویسے بھی روایتی تھا۔ تایا کی تربیت تھی کہ روئیل نہیں ہے تو ان کے بیٹوں کو اٹھ نہیں آنا اور خود بہت کم، سوائے کسی کام کے، اٹھ نہیں آتے تھے۔ سو وہ اپنے گھر میں آزادی سے گھوم پھر سکتی تھی۔

”پتا ہے نور بانو! وہاں ٹاپ قہی پیلس کے پیچھے والے ریسنورٹ میں کیا ملتا تھا؟“

اب نور بانو کے تو فرشتوں کو بھی نہیں پتا تھا کہ ٹاپ قہی پیلس کس جگہ کا نام ہے۔ وہ بے چارگی سے نفی میں سر ہلائے گئی۔ مگر وہاں جواب کا انتظار کروں رہا تھا۔ وہ کنگ بورڈ پہ بنریاں کھٹ کھٹ کاٹتی بولتے چلی جا رہی تھی۔

”وہاں ایک مشروب ملتا تھا، ایران نام کا۔ بالکل لمبی کی طرح تھا۔ اتنا مزے دار کہ جس کی کوئی حد نہیں۔ میں ریسپی لائی ہوں۔ کبھی مل کر بنائیں گے۔“

لاؤنج میں رکھا لینڈ لائن فون بجنے لگا تو ابانے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھایا۔ حیانے گردن اٹھا کر ان کو دیکھا۔ لاؤنج اور کچن کے درمیانی دیوار اوپر سے آدھی کھلی تھی، وہ ان کو با آسانی دیکھ سکتی تھی۔

”ہاں سین! کیسی ہو؟“ وہ اب مسکرا کر بات کرنے لگے تھے۔

اس کا دل زور سے دھڑکا۔ لمبے بھر کو اسے ٹاپ قہی اور ایران بھول گیا۔ وہ بالکل چپ سی ہوئی، ذراست روی سے ہاتھ چلانے لگی۔ سماعت ادھر ہی لگی تھی۔

”کیا..... کب؟“ ابانے تاثرات بدلے۔ وہ ایک دم سیدھے ہو کر بیٹھے۔

اس نے چھری گاڑ میں لگی چھوڑ دی اور پریشانی سے ابا کو دیکھا۔ کہیں کچھ غلط تھا۔

”انٹھ وانا لیراجعون!“ وہ بہت دکھ سے کہہ رہے تھے۔ فاطمہ بھی جیسے گھبرا کر باہر گئیں۔ تب تک ابان فون رکھ چکے تھے۔
 ”کیا ہوا؟“ فاطمہ پریشانی سے پوچھ رہی تھی۔ حیا اسی طرح مجسمہ بنے کھڑی، سانس روکے ان کو دیکھ رہی تھی۔
 ”سکندر کا انتقال ہو گیا ہے۔“

ابا کے الفاظ نے پورے لاؤنج کو سکستے میں ڈال دیا۔ ملال بھرے سکتے میں۔ حیرت، شاک، دکھ، وہ ملی جلی کیفیات میں گھری کھڑی تھی۔
 ”وہ لوگ دو، ایک روز میں باڈی لے کر آ رہے ہیں۔ میں فرقان بھائی کو بتا دوں۔“ ابا تاسف سے کہتے فون اٹھا کر نمبر ملانے لگے۔
 ایک لمحہ، بس ایک لمحہ انسان سے اس کی شناخت چھین کر اسے باڈی بنا دیتا ہے۔
 اس کے اندر کہیں بہت سے آنسو گرے تھے۔ بے اختیار اسے ڈی جے یاد آیا تھی۔

☆ ☆ ☆

سلیمان صاحب کے بیٹنگلے پونفٹی والے گھر کی سوگواریت چھائی تھی۔ لان میں قات لگا کر مردوں کے بیٹھنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ جبکہ خواتین اندر لاؤنج میں تھیں، جہاں فرنیچر ہٹا کر چاندنیاں بچھادی گئی تھیں درمیان میں کھجور کی گٹھلیوں کا ڈھیر تھا۔ رشتے دار خواتین سادہ حلیوں میں تھیں، مگر عابدہ چچی، حشر اور شبا بالکل سفید، نئے لباس پہن کر آئی تھیں۔ پتا نہیں یہ رواج کہاں سے چل نکلے تھے۔ اس نے البتہ چاکلیٹی رنگ کی لمبی قمیص، چوڑی دار کے ساتھ پہن رکھی تھی۔ ہم رنگ دوپٹا ٹھیک سے سر پہ لیے، گٹھلیاں پڑھتے وہ لاشعوری طور پہ ایسی جگہ پہنٹتی تھی، جہاں سے کھڑکی کے باہر لان صاف نظر آتا مگر باہر والوں کو اندر نہیں نظر آتا تھا کہ دوپہر کا وقت تھا اور کھڑکیوں کے شیشے باہر سے ری فلیکٹ کرتے تھے۔ لان میں خاندان کے مرد جمع تھے۔ ابا، تایا اور کچھ کزنز البتہ نہیں تھے۔ وہ لوگ پھپھو اور میت کو لینے ایر پورٹ گئے تھے۔ آج تین روز بعد سکندر انکل کی باڈی کلیئرنس حاصل کر کے اپنے ملک لائی جا رہی تھی۔

اور وہ صرف یہ سوچ رہی تھی کہ وہ جہان کا سامنا کیسے کرے گی؟

خیر! خفت اسے ہونی چاہیے، نہ کہ حیا کو۔ وہی قصور وار تھا، وہی پاشا کا ساتھی تھا اور اتنی تو وہ مضبوط تھی ہی کہ اپنے تاثرات چہرے پہ نہیں آنے دے گی۔ جو بھی ہوگا، دیکھا جائے گا۔ اس کے باوجود جب باہر شور سا مچا اور وہ لوگ پہنچ گئے تو اس کا دل اتنی زور سے دھڑکنے لگا کہ وہ خود حیرت زدہ رہ گئی۔

اتنے برس بعد پھپھو آئی تھیں، وہ بھی تابوت کے ساتھ۔ لاؤنج کے دروازے پہ خواتین ان سے ملتے ہوئے رو رہی تھیں۔ اونچا بین، بلند سکیاں۔ وہ دور دراز کی رشتہ دار عورتیں جو ہر شادی میں سب کی طرف سے گاتی اور ہر پونفٹی میں سب کی طرف سے رودتی تھیں، سب سے آگے تھیں۔

پھپھو بہت نڈھال لگ رہی تھیں۔ بھیگی آنکھوں کے ساتھ فاطمہ سے مل رہی تھیں۔ وہ سب ہی کھڑے ہو چکے تھے۔ لڑکے تابوت اندر لا رہے تھے۔ حیا ذرا ایک طرف ہو گئی۔ اور دوپٹے کا پلو ذرا تر چھا کر کے چہرے پہ ڈال کے، ہاتھ سے پکڑ لیا۔ دوپٹا پریشانی سے کافی آگے تھا اور یوں تر چھا کر کے ڈالنے سے گال، ہونٹ، ناک، سب چھپ گیا تھا۔ یہ اس کا غیر محسوس سانقلاب تھا۔ اب اگر وہ نقاب کرتی ہی تھی تو منافقت کیسی کہ باہر کے مردوں سے کرے اور کزنز سے نہ کرے؟ ایک فیصلہ کیا ہے تو اسے صحیح سے نبھائے بھی۔
 مرد باہر چلے گئے تو وہ آگے بڑھ کر پھپھو کے گلے لگی۔

”حیا..... تم کہاں چلی گئی تھیں؟ جہان بہت اپ سیٹ تھا۔“ بے آواز آنسو بہاتی پھپھو اس سے الگ ہو کر آہستہ سے بولی تھیں۔ وہ سخت شرمندہ ہوئی۔ کیا تھا اگر پھپھو کو ایک فون ہی کر لیتی؟ اس نے جواب نہیں دیا۔ جواب تھا بھی نہیں۔
 پھر جب وہ اپنی جگہ پہ آ کر بیٹھی تو نگاہ کھڑکی پہ پھسل گئی۔ باہر گلے مجمع میں وہ جہان کو کھونچنے لگی اور پھر ایک دم وہ چوکی۔
 اس نے بہت سی باتیں سوچی تھیں۔ جہان اتنا غیر متوقع تھا کہ اس سے کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ اس کے ساتھ کیسا رویہ رکھے گا، مگر جو جہان نے کیا، وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

جہان سکندر پاکستان آیا ہی نہیں تھا۔

”جہان نہیں آیا چچی!“ فرخ پتا نہیں کب اندر آیا تھا اور قریب ہی کھڑا فاطمہ کو بتا رہا تھا۔ ”پھپھو بتا رہی تھی کہ وہ کاموں میں پھنسا

ہوا ہے۔“

فرخ بتا کر آگے بڑھ گیا۔ فاطمہ تو فاطمہ، وہ خود بھی ششدر رہ گئی۔ ایسی بھی کیا مجبوری کہ بندہ باپ کے جنازے پہ بھی نہ آئے۔ وہ اتنی حیران تھی کہ مٹھلیاں بھی نہیں پڑھ پارہی تھی۔ وہ ایسا کیسے کر سکتا تھا۔ صرف حیا کا ساتھ دینے وہ ڈی بے کے وقت آ سکتا تھا تو اپنے باپ کے ساتھ کیوں نہیں.....؟

”جب تک انسان دوسرے کی جگہ پہ کھڑا ہو کر نہیں دیکھتا، اسے پوری بات سمجھ نہیں آتی“
کہیں دور سے جہان کی آواز ابھری تھی۔ شاید وہ وضاحت اس نے اسی لمحے کے لیے دی تھی۔ مگر..... وہ کیوں نہیں آیا! کیوں!

☆ ☆ ☆

سب بہت متاسف اور غمزہ سے تھے۔ گھر میں خاموشی نے سوگواریت طاری کی ہوئی تھی۔ اگلے روز قفل تھے۔ گھر میں کچھ کرنے کے بجائے تایا اور ابانے وہی کیا تھا، جس کا رواج آج کل اسلام آباد میں چل نکلا تھا۔ تمام عزیزو اقارب کو کسی فائبرسٹار ہوٹل میں ڈنر کے لیے فلی فوڈ پر ڈے دیے گئے کہ جمع خاندان جا کر ڈنر کریں اور مرحوم کے ایصالِ ثواب کے لیے دعا کریں۔ اسلام آباد بھی کبھی کبھی اسے لگتا کہ استنبول بنتا جا رہا ہے۔ اس سے یہ ہوا کہ لوگوں کے سوال اور گڑے مردے اکھاڑے جانے سے تایا اور ابانے محفوظ رہے۔ مگر حیا نے سوچا ضرور کہ تیا فرقان کے اسلام کو اب کیا ہوا؟
فاطمہ فون سننے نہیں تو وہ کافی کا کپ لیے پھپھو کے پاس آگئی۔ وہ اکیلی بیٹھی تھیں۔ خاموش تھکی ہوئی۔ ایک سفر تھا جو تمام ہوا۔ ایک مشقت تھی جو ختم ہوئی۔

”تھینک یو بہ!“ اس نے کپ بڑھایا تو وہ چونکیں، پھر بیچگی آنکھوں سے مسکرائیں اور کپ تھام لیا۔ ”تمہارے ساتھ بیٹھ ہی نہیں سکی۔“

”شرمندہ مت کریں پھپھو! میری ہی غلطی ہے، میں نے سوچا، جہان کو میرا بیج مل گیا ہوگا اور وہ آپ کو بتا دے گا۔“ ایک مبہم سی وضاحت دے کر وہ اپنا کپ لیے ان کے ساتھ آ بیٹھی۔

”نہیں! وہ کہہ رہا تھا، تم بغیر بتائے چلی گئی ہو۔ بہت پریشان تھا۔ شاید کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے۔“

”وہ..... آیا کیوں نہیں؟“ سرسری سے انداز میں اس نے پوچھ ہی لیا۔

وہ چند لمحے اسے دیکھتی رہیں، جیسے فیصلہ نہ کر پارہی ہوں کہ وہ کتنا جانتی ہے۔

”وہ ترکی سے باہر گیا ہوا تھا۔ فلائٹ کا مسئلہ تھا کچھ ابھی ایک دو روز میں آجائے گا۔“

”پھر آپ کو تو بہت مشکل ہوئی ہوگی، اکیلے سب کچھ منیج کرنا۔“

”حیا! میں نے ساری زندگی سب کچھ تنہا ہی منیج کیا ہے۔ میرے ساتھ تب بھی کوئی نہیں تھا، جب میں اور میرا بیٹا جلا وطنی کاٹ رہے تھے۔“ وہ آہستہ آہستہ کہہ رہی تھیں۔

”اور اب تو میں اتنی مضبوط ہو چکی ہوں کہ اپنے مسئلے حل کرنے کے لیے مجھے اپنے خاندان کے مردوں کے سہارے کی ضرورت نہیں رہی۔“

وہ بس ان کو دیکھ گئی۔ ان کے چہرے کی لکیروں میں برسوں کی مشقت کی داستان تھی، جسے پڑھنے کی آنکھ حیا کے پاس نہیں تھی۔

”تمہیں بھی اتنا ہی مضبوط بننا چاہیے۔“

ان کی آخری بات پہ بے اختیار وہ چونکی تھی۔

یہ ماں بیٹا بعض اوقات کتنی مبہم باتیں کر جاتے تھے۔

☆ ☆ ☆

وہ گہری نیند میں تھی، جب کوئی آواز سیٹی کی طرح اس کی ساعت میں گونجی۔ کافی دیر بعد اس نے بھاری پونے بمشکل اٹھائے اور اندھیرے میں جلتے بجتے روشنی کے منبع کی طرف دیکھا۔

موبائل۔

برقت اس نے بازو بڑھا کر بجتا ہوا موبائل اٹھایا۔

جہان کا لنگ۔

اس کی ساری نیند اڑ گئی۔ رات کے تین بج رہے تھے۔ وہ ایک دم اٹھ بیٹھی اور کال پک کی۔ ساری ناراضی رات کی خاموشی میں تحلیل ہوئی تھی۔

”جہان؟“ اس کی آواز ابھی بھی نیند سے بوجھل تھی۔

”جیا.....!“ وہ جھمی آواز میں کہتا ڈاراکا ”کیسی ہو؟“

”میں ٹھیک ہوں اور تم؟“ بید کر اؤن کے ساتھ ٹیک لگاتے ہوئے اس نے ریموٹ اٹھا کر اسی آف کیا۔ کراہت ٹھنڈا ہو چکا تھا۔

”فائن۔ تم سو رہی تھیں؟“

”ہاں!“

اس وقت میں فٹ بال تو کھیلنے سے رہی، اس نے سوچا۔

”ممی سو رہی ہیں؟“

”ظاہر ہے! اٹھاؤں انہیں؟“

”نہیں، نہیں! ان کو ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتا۔ ماموں ہیں یا ڈرائیور؟“ وہ جیسے سوچ سوچ کر بول رہا تھا۔

”نہیں! ابا اور اماں شام میں لاہور گئے ہیں۔ کوئی فوننگی ہو گئی تھی۔ صبح ہی آجائیں گے، کیوں؟“ وہ ایک دم چونکی۔ ”تم کہاں ہو؟“

”میں ایرپورٹ پہ ہوں اور مجھے تمہارے گھر کا راستہ معلوم نہیں ہے۔ تم مجھے لینے آ سکتی ہو۔“

”اوہ ہاں! تم رکو۔ میں آ رہی ہوں۔“ وہ لطف پھینک کر تیزی سے بستر سے اترتی۔

منہ دھو کر عبا یا پھن کر وہ جانی لیے خاموشی سے باہر نکل آئی۔ ڈرائیور ابا کے ساتھ گیا تھا۔ ویسے بھی وہ پارٹ نامم تھا۔ ایسے میں وہ خود جائے، اس کے علاوہ کوئی دوسرا اہل نہیں تھا۔

اسلام آباد کی خوب صورت، صاف ستھری سڑکیں خالی پڑی تھیں۔ ابھی رات باقی تھی۔ اسٹریٹ پولز کی زرد روشنی سڑک کو جگمگا رہی

تھی۔ ایرپورٹ پہ پہنچ کر اس نے جہان کو کال کر کے آنے کا پیغام دیا۔ اس کا ترکی کا نمبر روٹنگ پہ تھا۔

”السلام علیکم!“ چند ہی منٹ بعد وہ دروازہ کھول کر فرنٹ سیٹ پہ بیٹھا۔ ایک چمڑے کا بھورا دستی بیگ اپنے قدموں میں رکھا اور سیٹ

بیلٹ پہنے لگا۔

”علیکم السلام!“ انکیشن میں چابی گھماتے ہوئے جیانے ذرا کی ذرا نگاہ پھیر کر اسے دیکھا۔ وہ سیاہ جینٹ پہ آدھے آستین والی گرے ٹی شرٹ پہنے ہوئے تھا۔ وہی ماتھے پہ گرتے ذرا نکھرے بکھرے بال۔ ایرپورٹ کی بتیاں اندھیرے میں اس کے چہرے کو نیم روشن کیے ہوئے تھیں۔ وہ اسے پہلے سے ذرا کمزور لگا۔ اسے ترکی سے آئے ڈیزلہ ہفتہ بھی نہیں ہوا تھا، مگر پھر بھی فرق واضح تھا۔

کار سڑک پہ رواں دواں تھی۔ دونوں خاموش تھے۔ آخری ملاقات کا بوجھل پل اور تناؤ ابھی درمیان میں حائل تھا۔

”ممی ابھیں تو نہیں؟“

”نہیں!“ وہ ذرا دیر کر کی۔ ”تم آئے کیوں نہیں؟ سب پوچھ رہے تھے۔“

”مصرفو تھا۔“ وہ گردن ذرا اتر چھی کیے باہر ویران اندھیری سڑک کو دیکھ رہا تھا۔ وہ خاموش ہو گئی۔ کہنے کو جیسے کچھ نہیں تھا۔

”کیا تم مجھے پہلے قبرستان لے جا سکتی ہو؟“

”جیانے سر ہلادیا۔ قبرستان گھر سے زیادہ دور نہ تھا۔ جلدی ہی وہ پہنچ گئے۔ باہر نیلا سا اندھیرا اچھایا تھا۔ سوالیہ نشان کی صورت بنے

سات، بہن بھائی، ستارے آسمان پہ چمک رہے تھے۔

”پھو پھو کی قبر آپ کے دادا کی قبر کے ساتھ ہی ہے۔“ جیانے اسے بتایا۔

احاطے میں جہان کے والد اور دادا کی قبریں داخلی دروازے کے ساتھ ہی ایک طرف تھیں۔ ایک درخت اس کے دادا کی قبر پہ سایہ کر رہا تھا۔ وہ سینے پہ بازو لیے قبرستان کے داخلی دروازے پر ہی کھڑی ہو گئی۔ یہاں سے وہ جہان کو بے آسانی دیکھ سکتی تھی۔ جہان آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا دونوں قبروں کے پاس آیا پھر دھیرے سے وہ سکندر شاہ کی قبر کے سامنے بچوں کے بل بیٹھتا گیا۔ دونوں ہاتھ دعا کے لیے اٹھائے اب وہ دعا مانگ رہا تھا۔ جیاس کے عقب میں تھی، سواں کا چہرہ نہیں دیکھ سکتی تھی۔

دعا کے بعد وہ کافی دیر سر جھکائے، ایک پنچے کے بل قبر کے سامنے بیٹھا رہا۔ انگلی سے وہ مٹی پر لکیریں کھینچ رہا تھا، پھر جب وہ اٹھا تو حیا جانے کے لیے پلٹ گئی۔

گھر آ کر وہ اندر داخل ہوا تو حیا نے آنکھوں سے لالہ کا دروازہ بند کیا اور دو انگلیوں سے نقاب نیچے نیچے ہونے اتارا۔
”تم آرام کرلو۔ میں اوپر کمرادکھاتی ہوں۔“ وہ اجنبی سے انداز میں کبھی سر ہٹا کر چڑھنے لگی۔ جہاں خاموشی سے اس کے پیچھے اوپر آیا۔ دتی بیگ ہاتھ سے پکڑ کر کندھے پہ ڈال رکھا تھا۔

حیا دروازہ کھول کر ایک طرف کھڑی ہو گئی صاف ستھرا سراگیسٹ روم۔
”کچھ کھاؤ گے؟“ اس نے چوکھٹ پہ کھڑے کسی ریکی میزبان کے لہجے میں پوچھا۔ جہاں نے بیگ بیڈ پر رکھا اور ساتھ بیٹھا۔
”بس ایک کپ چائے۔ میرے سر میں درد ہے۔“ وہ جھک کر جو گرز کے تسمے کھول رہا تھا۔

وہ اٹنے قدموں واپس پلٹی۔ چند منٹ بعد جلدی جلدی چائے بنا کر لائی۔
وہ بیڈ پر نیم دراز آنکھوں پہ بازو رکھے ہوئے تھا۔
”چائے!“ اس نے کپ سائیز ٹیبل پر رکھا۔ وہ ہلاتک نہیں۔
”جہاں!“

مگر وہ سوچ کا تھا۔

حیا کی نگاہیں اس کے پاؤں پہ پھسلیں۔ جو گرز کے تسمے کھول چکا تھا، مگر اتارے نہیں۔ پتا نہیں کیوں اسے ترس سا آیا۔ شاید وہ تھکا ہوا تھا۔ شاید بیمار تھا۔ اس نے اسی آن کیا اور دروازہ بند کر کے باہر آ گئی۔

صبح وہ دیر سے اٹھی۔ لاؤنج میں آئی تو فاطمہ اور پھوپھو چائے پی رہی تھیں۔ گیارہ بج چکے تھے۔
”نور بانو! میرا ناشتا!“ نور بانو کو پکار کر وہ ان کے پاس آئی۔ فاطمہ لاہور والوں کا تذکرہ ہی کر رہی تھیں۔
”آپ لوگ کب آئے؟“

”صبح آٹھ بجے پہنچ گئے تھے۔ تم سو رہی تھیں۔“ فاطمہ مسکرا کر کہنے لگیں۔
”ہوں، اچھا! جہاں اٹھ گیا؟“ حیا کی نگاہ سبز حلیوں کے اوپر پھسلتی تو یونہی لبوں سے نکلا وہ دونوں ایک دم اسے دیکھنے لگیں۔
”جہاں؟“

”اوہ.....“ وہ ایک دم سیدھی ہوئی۔ ”وہ صبح پہنچ گیا تھا۔ اوپر کمرے میں ہے۔ آپ کو نہیں پتا چلا؟“
”نہیں..... وہ آگیا؟“ سبین سکندر کے چہرے پہ ایک دم چمک سی ابھری۔ خوش گوار سی حیرت۔ وہ باپ کے جنازے کے تیسرے دن پہنچ رہا ہے، مگر ادھر کوئی ناراضی نہیں۔
”جی! میں دیکھتی ہوں۔“ وہ خود ہی اٹھ آئی۔

اوپر اس کے کمرے کا دروازہ کھولا تو بج بستی ہو چکا تھا۔ اے سی تب کا آن تھا۔ اس نے جلدی سے اے سی بند کیا اور پنکھا چلا دیا۔
جہاں اسی حالت میں جوتوں سمیت لیٹا تھا۔ آنکھوں پہ بازو رکھے۔ وہ شاید نیند میں بھی کسی کو اپنی آنکھیں پڑھنے نہیں دیتا تھا۔ تپائی پہ دھری چائے ٹھنڈی اور پرانی ہو چکی تھی۔ سوچا، اٹھا لے، پھر خیال آیا کہ رہنے دے۔ اس کو پتا تو چلے کہ وہ اس کے لیے چائے لے آئی تھی۔
وہ دوپہر کے کھانے تک بھی نہیں اٹھا۔ پھوپھو اس کو ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتی تھیں، سو اس کے اٹھنے کا انتظار کر رہی تھیں۔ سہ پہر میں زارا آگئی۔ موسم اچھا تھا۔ دونوں نے شاپنگ پلان کر لی، مگر جب وہ عیالیا بہن کر باہر آئی تو پھر سے ایکشن ری پلے شروع ہو گیا۔
”تم نے عیالیا کب سے لینا شروع کر دیا؟“
وہی حیرت، سوال، تفتیش، تسویش۔

ایک لمبا اور جامع سا جواب دے کر بھی اسے لگا کہ زارا غیر مطمئن ہے اور غیر آرام دہ بھی۔ شاپنگ کرتے، جوتے دیکھتے، کپڑے نکلاتے اور پھر آخر میں راحت بیکر کے سامنے پارکنگ لاٹ میں بیٹھے ”اسکوپ“ کا سلس پتے ہوئے زارا بار بار ایک غیر آرام نگاہ اس پہ ڈالتی جو پورے اعتماد سے عیالیا اور نقاب میں بیٹھی، سلس پی رہی تھی۔

”یار! چہرے سے تو اتار دو۔“

”زارا! میرا نہ دم گھٹ رہا ہے، نہ ہی مرنے لگی ہوں۔ میں بالکل کمزور نہیں ہوں۔ اگر تم نہیں ہوتو بتاؤ۔“ وہ ایک دم بہت سنجیدگی سے کہنے لگی۔

وہ حیا سلیمان تھی۔ وہ عائشہ گل کی طرح ہر بات نرمی سے سہ جانے والی نہیں تھی۔ جب وہ اپنے زمانہ جاہلیت کے لباس پہ کسی کو بولنے کا موقع نہیں دیتی تھی تو اب نقاب پہ کیوں کسی کو بولنے دے؟ صرف تجاویز کی صبر کیوں کرے؟ اس کی رائے میں بہت زیادہ چپ رہنے کو بھی کمزوری سمجھا جاتا تھا۔

”نہیں نہیں! میں تو تمہارے لیے کبہ رہی تھی۔“ زارا ذرا بولکھلائی تھی۔
وہ سر جھٹک کر سلسل پینے لگی۔

باہر پارکنگ لاٹ میں چند ماہ پہلے کے مناظر اب بھی رقم تھے۔ ڈولی اسے سب سے پہلے اسی جگہ پہ ملا تھا۔ میجر احمد یعنی پنگی سے مل کر جو اسے الجھن ہوئی تھی کہ وہ پنگی کیسے بنا، اب وہ ختم ہو گئی تھی۔ وہ تو اس کی جاب کا حصہ تھا۔ پتا نہیں، وہ بات پہلے کیوں نہیں سمجھ سکی؟ وہ واپس آئی تو دل ذرا بو جھل تھا۔ زارا اور اس کا مددگار مختلف ہو گیا تھا۔ پتا نہیں، ڈی جے اگر ہوتی تو کیسا رد عمل دیتی؟ اب اجنبی کا ٹیگ جو پیشانی پہ لگ گیا تھا۔

لاؤنج میں سب بڑے بیٹھے تھے۔ تاپا، تانی، ابا، اماں، پچھو اور سامنے ایک صوفے پہ سنجیدہ سا بیٹھا جہان۔ وہی صبح والے کپڑے، مگر بال سکیلے تھے۔ شاید ابھی ابھی فریش ہو کر نیچے آیا تھا۔ وہ سلام کر کے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ دروازے پہ پہنچ کر اسے لگا کہ وہ اسے دیکھ رہا ہے۔ اس نے بے اختیار پلٹ کر دیکھا۔ جہان تیا فریقان کی طرف متوجہ تھا۔ وہ اسے نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ سر جھٹک کر اندر آ گئی۔ دوبارہ اس کی جہان سے ملاقات رات کے کھانے پہ ہوئی۔

وہ ذرا دیر سے ڈائننگ ٹیبل پہ پہنچا تھا۔ ابا مرزئی کرسی پہ تھے۔ حیا، فاطمہ کے ساتھ ایک طرف تھی۔ جہان نے جو کرسی کھینچی، وہ حیا کے بالقابل تھی، مگر وہ اسے نظر انداز کر رہی تھی۔ وہ بھی یہی کر رہا تھا۔ بلکہ وہ تو شاید ہمیشہ سے یہی کرتا آیا تھا۔
”کتنی چھٹی ہے تمہاری؟“ ابا کھانے کے دوران پوچھنے لگے۔ وہ سر جھٹکائے، کانٹے سے سلاڈا نکال کر اٹھاتے ہوئے بولا۔
”کچھ کمفرم نہیں ہے۔“

”چھٹی کیسی؟ اپنا ریٹورنٹ ہے اس کا۔ بلکہ پاشا کا۔“ اس نے تنگی سے سوچا۔
”ایک ڈیڑھ ہفتہ تو ہوں، پھر شاید چلا جاؤں۔ مئی کو یہیں اپارٹمنٹ لے دوں گا۔“
حیا نے چونک کر سر اٹھایا۔

”پچھو! آپ اب یہیں رہیں گی؟“ اس کے چہرے پہ خوش گواری حیرت اٹھ آئی تھی۔ سین پچھو نے ہلکی۔ سے مسکراہٹ کے ساتھ سر اثبات میں ہلا دیا۔

صرف سکندر کے لیے وہاں تھی۔ اب ادھر رہنے کا جواز نہیں ہے۔“
”تو جہان! آپ بھی یہیں شفٹ ہو جاؤ۔“

فاطمہ نے ذرا دبے دبے سے جوش سے کہتے ہوئے ایک نظر سلیمان صاحب کو دیکھا۔ وہ بھی ذرا امید سے جہان کو دیکھنے لگے۔ وہی، بیٹی کو اپنے قریب رکھنے کی خواہش۔

”اور اپارٹمنٹ کی کیا ضرورت ہے؟ یہی گھر ہے سین کا۔“
جہان ہلکا سا مسکرایا۔ وہ پورے دن میں پہلی دفعہ مسکرایا تھا۔

”رہنے دیں ماما! میرے نصیب میں پاکستان میں رہنا لکھا ہی نہیں ہے۔“
اس کی آواز میں کچھ تھا کہ حیا ہاتھ روک کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ سر جھٹکائے کھانا کھا رہا تھا، مگر چہرے پہ وہی مسکراہٹ، وہی چمک تھی، جو

وہ کبھی کبھی اس کے چہرے پہ دیکھا کرتی تھی۔ خاص موقعوں پہ، خاص باتوں پہ۔
خیر! کبھی وہ اس کی وجہ بھی جان ہی لے گی۔ وہ دھیرے سے سر جھٹک کر کھانا کھانے لگی۔

☆ ☆ ☆

صبح فجر پڑھ کر سونے کی بجائے وہ اوپر اٹھی۔ جہان کے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے ایک نظر اس نے بند دروازے پہ ضرور ڈالی تھی۔ کچھ چیزیں کرنے سے انسان خود کو کبھی رک نہیں پاتا۔

چھت پہ ہر طرف اہلالتے گملوں کی سرحد بنی تھی۔ ابا کا شوق، منڈیر وہاں سے کافی اونچی تھی۔ منڈیر کے ساتھ ہی کین کا ایک جھولا رکھا تھا۔ اس خوب صورت صبح میں وہ جھولے پر آٹیشی اور گردن موڑ کر منڈیر کے سوراخ سے باہر دیکھا۔ منڈیر اس کے سر سے اونچی تھی، مگر ڈرائن کے طور بنے بڑے بڑے سوراخوں سے نیچے کا لونی اور سڑک صاف نظر آتی تھی۔ وہ اونچی تر چھی ہو کر ٹیشی کا لونی پہ اترتی صبح دیکھے گئی۔ ہر سو خاموشی اور تازگی تھی۔ کبھی کبھی پرندوں کے بولنے کی آواز آ جاتی یا پھر کسی بے بھانگے کی۔

وہ ذرا چونکی۔ دور سڑک پر کوئی بھاگتا آ رہا تھا۔ ٹریک سوٹ میں لمبوس، جاگنگ کرتا شخص۔ اسے ایک لمحہ لگا تھا پہچانے میں۔
”جہان!“

وہ حیران ہوئی تھی۔ وہ کب اٹھا، کب گھر سے نکلا، معلوم نہیں۔ وہ اسے دیکھتی رہی۔ جہان اب گھر کے سامنے سے گزر کر مخالف سمت دوڑتا جا رہا تھا۔ وہ گردن پوری موڑ کر اس کو دیکھے گئی۔

چند قدم دور وہ رکا، اور ٹھنک کر پیچھے سڑک کو دیکھا۔ جیسے اسے محسوس ہوا ہو کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔ مگر وہ سڑک پہ ہی دیکھ رہا تھا، اوپر نہیں۔ وہ جلدی سے جھولے پر سے اٹھی اور اندر دوڑ گئی۔

وہ پھر سے پکڑے نہیں جانا چاہتی تھی۔ بزنس لوپ، پھولوں کی مارکیٹ اور وہ دکاندار..... اسے سب یاد تھا۔

☆ ☆ ☆

جب جہان نے اس کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا تو وہ کتابیں کھولے بیٹھی تھی۔ دستک پہ چونکی اور پھر اٹھ کر دروازہ کھولا۔ اسے سامنے کھڑے دیکھ کر دل عجیب سی متضاد کیفیات کا شکار ہونے لگا۔

”حیا! کیا تم فارغ ہو؟“ وہ بہت دوستانہ انداز میں پوچھ رہا تھا۔

”ہاں! کیوں؟“ اس نے دروازہ دراز زیادہ کھول دیا تاکہ وہ بستر پہ پھیلی اس کی کتابیں دیکھ کر جان لے کر وہ ہرگز بھی فارغ نہیں ہے۔

”اوکے! تم فارغ ہی ہو ٹھیک۔“ اس نے سمجھ کر سر ہلایا۔ ”یعنی تم میرے ساتھ مارکیٹ چل سکتی ہو؟“

”شیور!“ اس نے شانے اچکا دیے۔

حالانکہ اسے اس پہ بہت غصہ تھا۔ وہ اس سے مخاطب بھی نہیں ہونا چاہتی تھی۔ اس نے ہمیشہ غلط بیانی ہی کی تھی۔ اسے جہان سے بہت گلے تھے مگر پھر بھی جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ وہ اسے انکار نہیں کر سکتی تھی۔

”کیا خریدنا ہے؟ تاکہ اسی حساب سے مطلوبہ جگہ پہ جائیں۔“

”کپڑے وغیرہ۔ جلدی میں نکلا تھا۔ زیادہ سامان نہیں اٹھا سکا۔“

ایک تو جب وہ مہذب اور شائستہ ہوتا تھا تو اس سے زیادہ نرم خو کوئی نہیں تھا۔ وہ اندر ہی اندر تملاتی ہوئی باہر آتی تھی۔ کوئی اور نہیں ملا تھا اسے ساتھ لے جانے کے لیے۔ اسے ضرور گھینٹنا تھا اپنے ہمراہ۔

شاپ پہ اس کا ساتھ دینے کے لیے وہ بھی ریک پر کپڑوں کے بیگز لٹ پلٹ کے دیکھتی رہی۔ جہان ایک کرتے کا بیگز کندھے سے لگاتے ہوئے سامنے قد آور آئینے میں خود کو دیکھ رہا تھا۔ حیا اس کے قریب ہی کھڑی تھی، سو آئینے میں وہ بھی نظر آ رہی تھی۔ اس کا عکس دیکھتے ہوئے جہان ذرا سا مسکرایا۔

”تم نے وہ کارٹون دیکھے ہیں بجا ٹرنلر؟“ وہ مسکراہٹ دبائے سنجیدگی سے پوچھنے لگا تو اس نے سادگی سے سر اثبات میں ہلادیا۔

”ہاں تو؟“ وہ جواب دیے بنا بے ساختہ انداز میں مسکراہٹ دباتے ہوئے بیگز پکڑے پلٹ گیا۔

چند لمحوں بعد ابھی کھڑی رہی۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہنا چاہتا تھا۔ پھر قد آور آئینے میں اپنا عکس دیکھا تو فوراً سمجھ میں آ گیا۔ غصے کا شدید ابال اس کے اندر اٹھا تھا۔ بمشکل ضبط کرتے ہوئے اس نے نگاہوں سے جہان کو تلاشا۔ وہ وہی کرتا لے کر سڑک کی طرف جا رہا تھا۔

وہ بدتمیز انسان اس کے نقاب کو بجا ٹرنلر کی آنکھوں کی پٹی سے تشبیہ دے گیا تھا؟ اس کا موڈ واپسی کا سارا راستہ آف رہا، مگر وہاں پروا



کچن میں شام کی چائے دم پہ چڑھی تھی۔ لالچئی اور تلنے کبابوں کی ملی جلی خوشبو سارے کچن میں پھیلی تھی۔ وہ نور بانو کے سر پہ کھڑی ٹرائی میں برتن رکھوا رہی تھی۔ ذمہ دار وہ پہلے بھی تھی، مگر ترکی سے آنے کے بعد ہر کام اپنے ہاتھ سے کرنے لگی تھی۔ اب بھی نور بانو سے زیادہ وہ کام کر رہی تھی۔

باہر لاؤنج میں تایا فرقان اور صائمہ تائی آئے بیٹھے تھے۔

اماں، بابا، پھوپھو اور جہان بھی وہیں تھے۔ کام کرتے ہوئے مسلسل اسے احساس ہوتا رہا کہ جہان اسے دیکھ رہا ہے، مگر جب وہ رک کر گردن موڑ کر دیکھتی تو وہ کسی اور جانب دیکھ رہا ہوتا۔

جہان کے ساتھ ایک بی گھر میں وہ دو دفعہ رہی تھی۔ ایک جب ڈی جے کی بار وہ اکٹھے پاکستان آئے تھے تب اسے اپنے غم سے وقت نہ ملا تھا۔ دوسرا جب اپنی "منگنی" کی رات وہ پھوپھو کے گھر رک گئی تھی اور تب جہان کو اپنی فون کال کے انتظار سے وقت نہ ملا تھا۔ یوں اب نارمل حالات میں پہلی دفعہ وہ ایک چھت تلے تھے اور اسے احساس ہوا تھا کہ بہت بے ضرر، خاموش اور دھیماسا انسان تھا۔

یہ اس کا ایسی ٹیوڈ نہیں، فطرت تھی۔ اس کے پاس سے گزرتے ہوئے وہ سلام کر لیتا، حال احوال پوچھتا اور بس۔ ہاں! گھر میں فارغ رہ رہ کر وہ اکتا جاتا تو نور بانو کے ساتھ کچن میں کبھی برتن دھونے لگ جاتا تو کبھی اسے سبزیاں کاٹ کر دیتا۔ نور بانو بے چاری حق دق رہ جاتی۔ اگر باہر جاتا تو صبح جاگنگ۔

اسے پہلی دفعہ معلوم ہوا تھا کہ وہ جاگنگ، واک، ورزش، ان چیزوں کا بہت خیال رکھتا تھا۔ پھر جب گھر میں بہت بور ہو گیا تو ایک دفعہ فاطمہ کے کہنے پہ چیا اسے باہر لے گئی، مگر وہ اتنا تنگ کر دینے والا تھا "یہاں سے مڑ جاؤ، وہاں لے جاؤ، نہیں! اب پیچھے چلو۔ لیفٹ سے کیوں مڑ رہی ہو، رائٹ سے مڑو۔"

"کیونکہ میں رائٹ ہینڈ ڈرائیو کر رہی ہوں جہان!" اب اس نے اپنی گاڑی کی چابی جہان کو دے دی تھی۔ جہان جانا ہے، خود چلے جاؤ، جیسے تاثرات کے ساتھ۔ اس کے پاس انٹرنیشنل لائسنس تھا، سو مسئلہ نہیں تھا۔

اب وہ کبھی کبھی باہر نکل جاتا۔ گھر کے قریب اس نے جم بھی ڈھونڈ لیا تھا۔ جہان کے ساتھ رہنے میں ایک مسئلہ تھا۔ وہ اتنی خاموشی سے بنا چاپ پیدا کیے گھر میں داخل ہوتا کہ پتا ہی نہ چلتا اور وہ آپ کے پیچھے کھڑا ہوتا تھا۔ اب آتے جاتے چند ایک رسمی باتوں کے علاوہ ان کی بات نہ ہو پائی۔ چاندی کے بجسے یا تو چٹخ چکے تھے یا بالکل پتھر چکے تھے۔

آج بھی وہ اسے دیکھ رہا تھا، مگر وہ اسے پکڑ نہیں پائی تھی۔ وہ کچھ کہتا کیوں نہیں ہے۔ اسے الجھن ہوتی۔ وہ اسے بے اعتبار قرار دے کر چھوڑ آئی تھی۔ وہ گلہ کیوں نہیں کرتا۔ صفائی نہ دے مگر شکایت تو کرے۔ لیکن وہاں اذلی خاموشی تھی۔

وہ ٹرائی دھکیلتی لاؤنج میں لائی۔ دو پناشوں پہ پھیلا کر اس نے لمبے بالوں کو سمیٹ کر کندھے پہ آگے کو ڈالا ہوا تھا۔

"واقعی! دل تو نہیں کرتا۔ سکندر بھائی کو گئے ہفتہ بھی نہیں ہوا، مگر وہ لوگ سمجھتے ہی نہیں۔ جلدی مچائی ہوئی ہے۔" صائمہ تائی کہہ رہی تھی۔ شاید ارم کی منگنی کا معاملہ تھا۔

حیا بچوں کے بل کا پرنٹ پہنچی، چائے کے کپ پرچ میں رکھ کر باری باری سب کو پکڑانے لگی۔

"بھابھی! آپ فکر نہ کریں۔ جب ہمیں اعتراض نہیں ہے تو لوگوں کا کیا ہے۔ آپ اللہ توکل کر کے فنکشن کی تیاری شروع

کریں۔" پھوپھو بہت رساں سے واضح کر رہی تھیں کہ انہیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔

"اصل میں اسجد کے بھائی اور بھابھی باہر سے آئے ہوئے ہیں۔ ان کی موجودگی میں وہ فنکشن کرنا چاہتے ہیں تھینکس!"

تایا نے مسکرا کر اس سے کپ پکڑا تو وہ واپس آئی اور آخری کپ جہان کی طرف بڑھایا۔ وہ جو غور سے اب تائی کی بات سن رہا تھا، ذر

سی نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا اور کپ پکڑ لیا۔

"وہ اسی اتوار کا کہہ رہے تھے۔"

"تو بھائی! آپ ہاں کر دیں نا۔ مجھے خوشی ہوگی۔"

”اتوار فنکشن!“ حیانے سوچا۔ کیا پہنے گی؟ وہ چائے سے فارغ ہو کر کمرے میں آئی اور الماری کھول کر کپڑے الٹ پلٹ کرنے لگی۔ کوئی سیلوئس تھا۔ کسی کی آستین شیوین کی تھیں۔ کسی کا دو پٹا باریک تھا۔ اس کا ایک جوڑا ابھی ”آئیڈیل جلابی لباس“ پہ پورا نہیں اترتا تھا۔ دوسری الماری کو لاک لگا تھا۔ اس نے جلابی نکالنے کے لیے پرس میں ہاتھ ڈالا تو انگلیاں مٹلیں ڈبی سے نکرائیں۔ وہ مسکرائی۔ میجر احمد کا چلیج ڈولی کی امانت۔

اس نے ڈبی کھولی۔ سیاہ بوالیس بی فلیش اندر محفوظ رکھی تھی۔ پزل باکس کھل گیا۔ جواہر کالا کر بھی کھل گیا، مگر اس لاک کو کیسے کھولے؟ آخری لاک۔ اس کی تو پہیلی بھی نہیں تھی، مگر پہیلی ہونی چاہیے تھی۔ میجر احمد نے پہیلی کے بغیر کبھی کوئی پزل اسے نہیں دیا تھا۔ وہ تالے کے ساتھ اس کی جابی بھی ہمیشہ دیا کرتا تھا۔

”اوہ..... ڈبی تو میں نے دیکھی ہی نہیں۔“ ایک دم اسے خیال آیا۔

وہ بیڈ پہ آ بیٹھی اور فلیش باہر نکالی۔ وہ صاف تھی۔ کوئی لفظ نشان وغیرہ نہیں۔ اب اس نے ڈبی اوپر نیچے سے دیکھی۔ کچھ بھی نہیں۔ اس نے اندر رکھے مٹلیں قوم کو اٹھیں۔ سے پکڑ کر باہر نکالا۔ نیچے ڈبی کے پینڈے پہ سیاہ مٹل کا ایک اور کڑا رکھا تھا اس نے ٹکڑا نکال کر پلٹ کر دیکھا۔ وہاں سنہری دھاگے سے دو الفاظ ملے تھے۔

Story Swapped

”اسٹوری سوپ؟“ اس نے اجنبیہ سے دہرایا۔ یہ فلیش ڈرائیو کی پہیلی تھی۔ اس کو حل کر کے ہی وہ آخری تالا کھول سکتی تھی۔ مگر اس سطر کا مطلب کیا تھا کہ کہانی کو ”Swap“ کرنے سے کیا مراد ہوا بھلا؟ کیا یہ سطر انگریزی گرامر کے لحاظ سے درست بھی تھی؟ اول بدل کی گئی کہانی؟ کہانی کو Swap کرنے سے مراد تو یہی ہوتا ہے نا! کہ آپ اپنی کہانی کسی کو پڑھنے دیں اور وہ جواب میں اپنی کہانی آپ کو پڑھنے دے۔ اس عجیب سی سطر کا یہی مطلب نکلتا تھا۔ مگر کون سی کہانی؟

شاید پروفیسر گوگل کچھ کر سکے۔ یہی سوچ کر اس نے کمپیوٹر آن کیا اور گوگل پہ یہی الفاظ لکھ کر ڈھونڈا مگر لا حاصل۔ دو متفرق سے الفاظ تھے جن کو ادھنے جمع کر دیا تھا۔ یہ کل بارہ حرف تھے، سو پاس ورڈ نہیں ہو سکتے تھے، مگر پاس ورڈ ان ہی میں چھپا تھا۔ رات سونے سے پہلے تک وہ ان ہی دو الفاظ کو سوچتی رہی تھی۔ مگر کسی نتیجے پہ پہنچنے سے قبل ہی نیند آ گئی۔



ارم کی منگنی کا فنکشن تا یا فرقان کے لان میں منعقد کیا گیا تھا۔ فنکشن خواتین کا تھا۔ مردوں کا انتظام باہر تھا، مگر تیار ہوتے وقت وہ جانتی تھی کہ یہ فنکشن بھی انتہائی سیکرٹ (غیر مخلوط) ہوگا، جتنا داور بھائی کی مہندی کا فنکشن تھا۔ برائے نام ”زنانہ حصہ“ جہاں ویٹرز، مووی سیکر، لڑکے، کزنز، سب آ جا رہے ہوں گے۔ پتا نہیں، پھر بے چارے باقی مردوں کو علیحدہ کیوں بٹھایا جاتا تھا، پھر ایسی شادیوں کو سیکرٹ کیسے کی مناسبت کیوں تھی؟ سوسائٹی کے..... معیارات جن پہ کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا تھا۔ اس نے اپنی بائیں سالز زندگی میں کبھی کوئی مکمل طور پر سیکرٹ سہادی نہیں دیکھی تھی۔ تا یا کی تختی تھی کہ منگنی پہ دلہا نہیں آئے گا، انگوٹھی ساس پہنائے گی، مگر جو خاندان کے لڑکے کام کے بہانے چکر لگا رہے ہوں گے، ان پر کوئی پابندی نہیں تھی۔

باہر وہ عبا یا لیتی تھی۔ اصولاً اسے ادھر بھی عبا یا لینا چاہیے تھا مگر منگنی کا فنکشن برائے نام ہی سہی تھا تو سیکرٹ سہادی کے بغیر وہ بے مکروہ ذرا دور تھے۔ وہ مکمل طور پہ مکسڈ گنڈ رنگ نہیں تھی۔

عبا یا کا مقصد زینت چھپانا اور چہرہ چھپانا ہی تھا تو وہ یہ کام اپنے لباس سے بھی کر سکتی تھی، سو اس نے عبا یا نہیں لیا، مگر لباس کا انتخاب عبا یا کے متبادل اور مترادف کے طور پہ کیا۔

کچے سب کے رنگ کا سبز پاؤں کو چھوٹا فراک، نیچے ٹراؤز اور کھائی تک آتی آستین۔ یہ ایک مشہور برانڈ کا جوڑا تھا اور اس کے ساتھ نیٹ کا دو پٹا تھا، سواس نے الگ سے بڑا سا دو پٹا بنوالیا تھا، کچے سب کے رنگ کا۔ یوں گلے کا کام دو پہنے میں چھپ گیا۔ چہرے کے گرد بھی دو پٹا یوں لپیٹا کہ وہ پیشانی سے کافی آگے تھا۔ کان بھی چھپ گئے۔ سہولت تھی کہ کسی آدمی کو دیکھتے ہی وہ تھوڑی سے انگلی سے دو پٹا پکڑ کر اوپر لے جا کر نقاب لے سکتی تھی۔ یوں عبا یا کے بغیر بھی زینت چھپ گئی، نقاب بھی ہو گیا اور اچھا لباس بھی پہن لیا۔ بیٹھی بھی وہ ڈراکون کی میز پہ تھی۔ گلابی پھولوں سے آراستہ اسٹیج پہ ارم کا مڈار گلابی لباس میں گردن اونچی کیے اور نگاہیں جھکائے بیٹھی تھی۔ وہ ارم کو جانتی تھی۔ اسے معلوم

تھا کہ وہ زبردستی بٹھائی گئی ہے۔ اس کی ساس اب اسے انگوٹھی پہنا رہی تھیں۔ مودی میکر مودی بنا رہا تھا۔ پتا نہیں یہاں تایا کے اسلام کو کیا ہوا تھا۔ ویٹرز مودی میکرز، یہ بھی تو مرد تھے، مگر وہی سوسائٹی کے دہرے معیارات۔

جباب کپڑے کا ایک ٹکڑا تو نہیں ہوتا۔ یہ تو ایک مکمل الگ طرز زندگی ہوتا ہے۔ اور یہ طرز زندگی اتنا آسان نہیں تھا۔ اسے جلد ہی اندازہ ہو گیا۔

”تم نے دو پٹاسر پہ کیوں لے رکھا ہے؟“

”گلے کا کام ہی نظر نہیں آ رہا۔“

”چہرے سے تو ہٹاؤ۔“ مودی میکر ویڈیو بنا رہا تھا، سودہ چہرے کو ڈھکے، رخ موڑے بیٹھی تھی اور فاطمہ جو زرا دیر کو ادھر آئی تھی، اپنی حیرت ظاہر کرنے میں ساتھی خواتین کے ہمراہ لگتی تھیں۔

”نہیں ہٹا سکتی لیڈیز! میں اب نقاب کرتی ہوں۔“ وہ رساں سے جواب دے رہی تھی مگر پھر.....

”کیوں؟ اور یار! فنکشن پہ تو خیر ہوتی ہے۔“

”خیر؟ مجھ سے پوچھو کہ کتنا بڑا اثر ہوتا ہے۔“ وہ اب بدول ہو رہی تھی۔ جباب سے نہیں۔ لوگوں سے۔

”یا اللہ! لوگ خاموش کیوں نہیں رہتے؟ اتنا کیوں سوال کرتے ہیں؟“

سحرش، شادراہجد کی بہنیں اب ڈانس کی تیاری کر رہی تھیں۔ انہیں کوئی نہیں نوک رہا تھا، سلیولیس پہننے پھرتی کسی لڑکی کو کوئی نہیں نوک رہا تھا، مگر جبابی لڑکی کے سب پیچھے پڑ گئے تھے۔

”کیا لوگوں نے مجھ لیا ہے کہ وہ کہیں گے کہ ہم ایمان لائے اور وہ آزمائے نہ جائیں گے؟“

وہ اپنے آنسو اندر ہی اتار رہی۔ لڑکیاں رقص کے لیے پوزیشنز سنبھالے کھڑی تھیں۔ مودی میکر کا کیمرہ ایڈی تھا۔ اس نے رخ موڑ لیا۔ دل اندر ہی اندر لرز رہا تھا۔ وہ کسی کو منع نہیں کر سکتی تھی۔ اس کی کوئی نہ سنتا۔

تباہی..... تباہی کتنی قریب تھی اور سب بے خبر تھے۔ ہر اقلیت کی دائمی آگ، بھڑکتے الاؤ، دھکتے انگارے انسان بھی خود ہی اپنے لیے کیا کیا کما لیتا ہے؟“

اور یادیں بھی کتنی عجیب ہوتی ہیں۔ جب بندہ اندھیرے سے نور میں آتا ہے تو ہر شے سمجھ میں آنے لگتی ہے۔ اسے یاد آ رہا تھا، شریعہ اینڈ لاء کے دوسرے سمسٹر میں اصول الدین ڈیپارٹمنٹ کے ہی ایک پروفیسر ڈاکٹر عبدالباری نے یونہی ایک قصہ سنایا تھا۔ اسے وہ قصہ آج پوری جزئیات کے ساتھ یاد آ رہا تھا۔

”میری بیٹی کی جب شادی ہونے لگی تو میں نے اسے منع کیا کہ بیٹا مودی اور نوٹیشن وغیرہ مت کروانا، مگر وہ مجھ سے بہت خفا ہوئی۔ وہ مجھ سے لڑتی رہی کہ اب میں نے ہمیشہ پردہ کیا۔ آپ کی ساری باتیں مانیں۔ اب میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی پہ مجھے بدول نہ کریں۔ میں خاموش ہو گیا۔ اصرار نہیں کیا کہ میں زبردستی کا قائل نہیں تھا۔ شادی ہوئی۔ اس کی سرال نے نوٹیشن کا مکمل انتظام کروا رکھا تھا۔ میں چپ رہا۔ شادی کے چوتھے روز میں اپنے کمرے میں آرام کر رہی پہ بیٹھا تھا کہ میری بیٹی آئی اور میرے قدموں میں بیٹھ کر چپ چاپ رونے لگی۔ میں نے بہتیرا پوچھا کہ کیا ہوا ہے۔ اس نے کچھ نہیں بتایا۔ بس یہی کہا۔

”ابا! آپ ٹھیک کہتے تھے۔“

میری بیٹی کے آنسو میرے دل پہ اس دن سے گڑ گئے ہیں اور یہی سوچتا ہوں کہ پتا نہیں، ہم اپنی خوشی کے موقع پہ اللہ کو ناخوش کیوں کر دیتے ہیں؟“

جب ڈاکٹر عبدالباری نے وہ قصہ سنایا تھا تو اس نے چند جبابی لڑکیوں کی آنکھوں سے آنسو گرتے دیکھے تھے تب کدھے اچکا کر وہ حیران ہو کر سوچتی تھی کہ یہ کیوں رو رہی ہیں؟

اب اسے پتا چلا تھا کہ وہ کیوں رو رہی تھیں۔

فنکشن ختم ہونے تک اس کا دل اچاٹ ہو چکا تھا۔ رات اپنے کمرے میں ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے وہ بالیاں اتارنے کے ارادے سے بے دلی سے کھڑی تھی۔ کچے سب کے رنگ کا دو پٹا کدھے پہ تھا اور بال کھول کر آگے کو ڈال رکھے تھے۔ بہارے بھی اس کی نقل میں کھنگریا بی

پونی آگے کو ڈال لیتی تھی۔

”پتا نہیں، وہ ہمیں فون کیوں نہیں اٹھاتیں اور میل کا جواب بھی نہیں دیتیں۔ خیر! دو ہفتے ہی تو رہ گئے تھے، جا کر پوچھ لوں گی۔“
دروازے پہ دستک ہوئی وہ چونکی، پھر آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ وہاں جہان کھڑا تھا۔ زمر درنگ کرتا اور سفید شلوار پہنے۔ پتا نہیں، کہاں سے کرتا خرید کر لایا تھا مگر اچھا تھا۔ آستین عادتاً کہنیوں تک موڑے وہ ہاتھ میں دمک لیے کھڑا تھا۔

”کافی پیو گی؟“ وہ پھر سے وہی دوستانہ سے انداز والا جہان سکندر بن چکا تھا۔

”میں سونے سے پہلے کافی نہیں پیتی۔“ کہہ دینے کے بعد اسے لہجے کی سرمد مہری کا احساس ہوا تو رکی، پھر زبردستی مسکرائی۔

”ہاں! لیکن اگر اسٹینبل کے بہترین شیف، مکینک اور کارپینٹر نے بنائی ہے تو ضرور پیو گی۔“

”تم ایک لفظ کا اضافہ کرتے کرتے رہ گئیں..... کر میٹل۔“ وہ مسکرایا تو حیا کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

”کیا مجھے اس الفاظ کا اضافہ کرنا چاہیے؟“

”ہم اس بارے میں بات کر سکتے ہیں؟“

دو ہفتے بعد اسے بالآخر اس کے متعلق بات کرنے کا خیال آ ہی گیا تھا۔

”ٹھیک ہے! چھت پہ چلتے ہیں۔“

اس نے کانوں سے بالیاں نہیں اتاریں، جن میں موتی پروئے تھے۔ جہان کے موتی۔ وہ سچ نہیں بولتا تھا تو اس کے موتی کیسے نکل آئے؟ وہ ان دو ہفتوں میں یہ سوچتی رہی تھی۔ نامحسوس طور پہ بھی وہ عبدالرحمن پاشا سے متعلق تھی کہ وہ ”سچے موتی“ ہی تھے۔ مگر جہان کو تو یاد بھی نہیں ہو گا کہ یہ وہی موتی ہیں۔

چھت پہ اندھیرا تھا۔ دور نیچے کالونی کی بتیاں حل رہی تھیں۔ وہ دونوں منڈیر کے ساتھ لگے جھولے پہ آ بیٹھے۔ ہلکا ہلکا جھولا ان کے بیٹھنے سے بالکل تھم گیا۔ حیا نے کافی گامگ لبوں سے لگایا۔

”ہوں! اچھی بنی ہے۔“

”آخر! اسٹینبل کے بہترین شیف، مکینک اور کارپینٹر نے بنائی ہے۔“

”اوہ! تم نے بھی کر میٹل کا اضافہ نہیں کیا۔“

”کیونکہ میں کر میٹل ہوں بھی نہیں۔ کیا تمہیں میرا اعتبار ہے؟“

”ہاں!“ اس نے سوچنے کا وقت بھی نہیں لیا۔ سامنے دیوار پہ اباکے گملوں سے اوپر ان دونوں کے سائے گر رہے تھے۔ پودوں کی

ٹھہنیوں سے اوپر وہ عجیب سی ہیئت بنا رہے تھے۔

”ٹھیک ہے! پھر تم مجھے بتاؤ کہ تم اس شخص کو کیسے جانتی ہو، جو اس روز میرے ساتھ تھا؟“

”عبدالرحمن پاشا؟ امت اللہ حبیب پاشا کا بیٹا؟“ اس نے آنے کا پورا نام لیا۔ وہ ذرا چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

”آ..... ہاں..... تم کیسے؟“

”لمبی کہانی ہے۔ سناؤ گے؟“ اس نے بے نیازی سے شانوں کو جنبش دے کر پوچھا۔ وہ سامنے دیوار پہ ہی دیکھ رہی تھی۔ اس نے

دوسرے سائے کو اثبات میں سر ہلاتے دیکھا تو وہ کہنا شروع ہوئی۔ اپنے سائے کے پلٹے لب دکھائی نہیں دیتے تھے۔ نہ ہی کان میں پڑی بالی کے موتی کی چمک۔ اگر دکھائی دے رہی تھی تو وہ پریشانی، اذیت اور اضطراب جسے وہ بچھلے پانچ ماہ سے اپنے دل میں چھپائے ہوئے تھی۔ جس کا ایک حصہ اس نے ڈی جے کے ساتھ بانٹا بھی تھا اور اب اس نے پورا ہی بانٹ دیا۔ سبائٹی کی طرف سے میل وصول ہونے والی رات جب پہلی دفعہ پھول آئے تھے، اس سے لے کر اس روز کے واقعے تک، اس نے سب کہہ سنایا۔ وہ بالکل خاموشی سے سنتا رہا۔ اگر بولا تو صرف اس وقت جب اس نے استقلال جدیسی میں پاشا کے چہرے پہ کافی اٹکنے کا واقعہ بتایا۔

”اچھا! تم نے پاشا بے کے اوپر کافی الٹ دی؟“ وہ جیسے بہت محفوظ ہوا تھا۔

”ہاں! تم اسے پاشا بے کیوں کہتے ہو؟“

”اسے سب پاشا بے کہتے ہیں، مسٹر پاشا۔ شوق ہے خود کو مسٹر کہلانے کا۔“

کافی گنگ خالی ہو کر زمین پر پڑے تھے۔

دیوار پر سائے ویسے ہی چپکے پیچھے، ساری داستان سنتے رہے۔ پودے بھی متوجہ تھے۔ جب وہ خاموشی ہوئی تو وہ جیسے سوچتے ہوئے بولا۔
 ”یعنی کراس نے تمہارے بارے میں معلومات حاصل کیں، مجھے بلک میل کرنے کے لیے، مگر میں صرف ایک بات نہیں سمجھ سکا۔
 اتنا سب کچھ ہوا اور تم نے کبھی اپنے پرنسز کو نہیں بتایا۔... کیوں؟ تم نے کسی سے مدد کیوں نہیں لی؟“

”میں کبھی بھی ان کو یہ سب نہیں بتا سکتی جہاں اب تو معاملہ ختم ہو گیا ہے، مگر جب یہ شروع ہوا تھا تو مجھے ترکی جانا تھا۔ اگر میں بتاتی تو وہ مجھ سے فون لے لیتے اور گھر سے نکلنے پہ پابندی لگا دیتے۔ ترکی تو جانے کا سوال ہی نہیں تھا۔ ویسے بھی میں جانتی تھی کہ جو میرے گھر کے اندر پھول رکھ کر جا سکتا ہے، میرے فون میں زیر سر لگا سکتا ہے، اس کے خلاف اب بھی کچھ نہیں کر سکتے اور اب کو بتانے کا مطلب تھا کہ تیا فرقان کو بھی بتا دینا، یعنی پورے خاندان میں تماشا۔ اب بتانا اب کو نہ بتائیں، یہ نہیں ہو سکتا اور اتنی بہادر تو میں تھی ہی کہ خود اپنے مسائل حل کر سکتی۔“

”سو تو ہے!“ اس نے سر ہلا کر اعتراف کیا۔ ”کیا تم واقعی جانا چاہتی ہو کہ میں پاشا بے کو کیسے جانتا ہوں؟“

”دیکھ لو! تم نہ بھی بتاؤ، میں نے جان تب بھی لیتا ہے۔ تمہارے پاس کوئی دوسرا آپشن نہیں ہے۔“

”اللہ، اللہ! یہ اعتماد“ وہ پہلی دفعہ ہنسا تھا۔ وہ بولے سے مسکرا دی۔

”اصل میں، میں نے کچھ عرصہ سٹول گرینڈ پر کام کیا ہے۔ اس لیے میں ان سو کالڈ بھائیوں کو قریب سے جانتا ہوں۔ یہ سب بھائی نہیں ہیں۔ یہ ماما بھائی ہیں، ابک ہی ماما فیملی کا حصہ، مگر یہ بات اوالا ر میں، گر کوئی میرے علاوہ جانتا ہے کہ وہ سب بھائی نہیں ہیں تو وہ امت اللہ حبیب پاشا ہیں۔ خیر! میرا پاشا بے سے کچھ مسئلہ ہو گیا اور میں استقلال اسٹریٹ پہ آ گیا۔ وہ ریہ سٹورنٹ اس کا ہی ہے اور وہ عورت جس کو میں اپنی لینڈ لیڈی بتاتا ہوں، اس کو وہاں بھیجتا ہے۔ اس کی ساتھی شہزادہ ہولڈر ہے۔ وہ مجھے ریہ سٹورنٹ کی قسطوں کے لیے نکلنے نہیں کرتا۔ میں نے جھوٹ بولا تھا۔ سوری! مگر اس نے میرے ذمے ایک کام لگا دیا تھا، جو میں کر نہیں سکا، جس کی وجہ سے اس روز ہماری تلخ کلامی ہوئی تھی۔“

”کون سا کام؟“ وہ چونکی

”وہ اپنی فیملی کو بیرون ملک شفٹ کروانا چاہتا تھا۔ اس کے لیے اسے اس ملک کی جعلی دستاویزات اور نئی شناختیں چاہیے تھیں۔ میں اپنے ایک دوست سے اس کے لیے وہی بنوا رہا تھا۔ اینڈ تھینکس ٹو یو! میں نے اب وہ بنوا دیے ہیں اور اس کی فیملی ترکی سے جا چکی ہے۔“

”کیا؟“ اسے جھکا لگا۔ ”عائشے اور بہارے چلی گئیں؟“ (تو وہ عائشے، بہارے، سب کو جانتا تھا!)

”ہاں! مزید میں کچھ نہیں جانتا، اس لیے اس موضوع کو ختم کر دو۔“

”اور..... اور وہ اس کا بھائی؟ وہ کہاں چلا گیا؟“

”میں نہیں جانتا، وہ اب کہاں ہے۔“ اس نے شانے اچکا دیے۔ وہ جیسے اس موضوع سے بچنا چاہتا تھا۔ پھر حیانے دیکھا، اس کا سایہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ پودوں کے اوپر سے ہوتا، پوری دیوار پہ پھیل گیا۔ اس نے سائے میں اس کا چہرہ تلاشنے کی کوشش کی، مگر ناکام رہی۔ کتنا عجیب تھا، سائے میں سب گڈمڈ ہو چکا تھا۔

”تم کیا کرتے پھرتے ہو جہاں! مجھے یقین ہے کہ تم کریمنٹل نہیں ہو، مگر تم ایسے لوگوں سے تعلق بھی نہ رکھا کرو بلکہ۔“

”جو آپ کا حکم!“ سایہ مسکرایا تھا۔

وہ بس تاسف سے سر ہلا کر رہ گئی۔ اس کی ساری کتھان کر بھی وہ اپنی دفعہ پھر بہت کچھ چھپا گیا تھا۔

اور عائشے بہارے، وہ کہاں چلی گئی تھیں؟

وہ دونوں آگے پیچھے سینے اترتے ہی نیچے آ رہے تھے، جب اس نے ابا کو لاؤنچ میں کھڑے اپنی جانب متوجہ پایا۔

”جہاں!“ وہ صرف جہاں کی طرف متوجہ تھے۔

”جی ہاں!“ وہ پرسکون انداز میں قدم اٹھاتا میز بیوں سے نیچے ان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

”مجھے کچھ پوچھنا ہے تم سے۔“ وہ بہت سنجیدہ لگ رہے تھے۔ وہ پہلی سیڑھی پر ریلنگ پہ ہاتھ رکھے کھڑی ان کو دیکھنے لگی۔

”میں سن رہا ہوں۔“

”تم راجیل سے ان بچے ہو، یہ میں جانتا ہوں، مگر کیا کوئی ایسی بات ہے جو تم مجھے بتانا چاہو، جو کہ میں نہیں جانتا؟“ جہاں نے لمبے بھر

کی خاموشی کے بعد نفی میں سر ہلایا۔

”نہیں! میں اس معاملے میں نہیں پڑنا چاہتا۔“

”یعنی کوئی بات ہے؟“

”ناموں! میں دوسروں کے معاملے میں مداخلت کبھی نہیں کرتا، اس لیے خاموش رہوں گا۔ البتہ آپ اپنے طور پر کسی سے بھی پتا کروا سکتے ہیں۔“

”پتا کروالیا تھا۔ تم سے تصدیق چاہ رہا تھا، بہر حال مجھے اپنا جواب مل گیا ہے۔ تم آرام کرو۔“

اس کا شانہ بچھتا کر وہ آگے بڑھ گئے۔ ان کے چہرے کی سنجیدگی اور اضطراب پہلے سے بڑھ چکا تھا۔ جہان واپس میز پر ہاتھ رکھ کر اوپر آیا کہ اس کا کمر اوپر تھا۔ وہ ابھی تک وہیں کھڑی تھی۔

”کیا ہوا؟“

”جواباً جہان نے ذرا سے شانے اچکائے۔“

”تمہیں پتا چل جائے گا۔ اب ذہن پر زور مت دو، سو جاؤ۔“ وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ سایہ غائب ہو گیا، روشنی عیاں تھی۔

وہ ابھی ہوئی واپس کمرے میں آئی تھی۔ جہان سکندر کے ساتھ رہنے کا مطلب تھا، انسان بہت سے رازوں کے ساتھ رہے اور پھر صبر سے ان کے کھلنے کا انتظار کرے۔

وہ تمام سوچوں کو ذہن سے بھٹک کر غائب کو ای میل کرنے لگی۔

☆ ☆ ☆

جہان نے ٹھیک کہا تھا۔ اسے پتا چل جائے گا۔ مگر حیا کو اندازہ نہیں تھا کہ اسے اتنی جلدی پتا چل جائے گا۔ اسی رات وہ ابھی کچنی نیند میں ہی تھی کہ سب سے پہلے پریشانی کے عالم میں جھنجھوڑ کر اسے اٹھایا۔

”حیا... جلدی اٹھو۔“

وہ جڑ بڑا کر اٹھ بیٹھی۔ سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ کیا ہو رہا ہے۔

”تمہارے ابا کو ہارٹ ایک ہوا ہے۔ چلو! ہسپتال چلنا ہے۔“

وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے پھپھو کو دیکھ گئی۔ زندگی ایک دفعہ پھر استقلال اسٹریٹ میں پہنچ گئی تھی۔ اس کے سامنے ڈی جے گری

تھی اور کسی کا جوتا اس کی عینک پہ آیا تھا۔ ایک آواز کے ساتھ عینک ٹوٹی تھی۔ وہ آواز جو کالج ٹوٹنے کی ہوتی ہے۔ وہ آواز جو زندگی کی ڈور ٹوٹنے کی ہوتی ہے۔

☆ ☆ ☆

سلیمان صاحب کو شدید قسم کا دل کا دورہ پڑا تھا۔ وہ سی سی یو (کارڈیوک کینٹرل یونٹ) میں تھے اور ان کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ باقی سب

کہاں تھے، اسے کچھ نہیں پتا تھا۔ وہ تو بس دونوں ہاتھوں میں سر تھا مے بچ پینٹھی، روئے جاری تھی۔ کارڈیور میں کون آ جا رہا تھا، اسے ہوش نہ تھا۔ وہ پھر سے ناقص فرسٹ ایڈ ہسپتال کے سرورموت کے سنانے جیسے کارڈیور میں پہنچ گئی تھی۔

”وہ اب بہتر ہیں۔ یقین کرو! وہ ٹھیک ہو جائیں گے۔“ جہان اس کے ساتھ بچ پینٹھے ہوئے بولا۔ رات سے وہی تھا جو ساری

بھاگ دوڑ کر رہا تھا۔ تیا وغیرہ تو صبح آئے تھے اور اب تک پورے خاندان کو وہ وجہ بھی پتا چل چکی تھی جو اب کی بیماری کا باعث بنی تھی۔

روجیل نے شادی کر لی تھی۔

ٹھیک ہے! بہت سے لڑکے امریکا میں شادی کر لیتے ہیں۔ سب کے والدین کو ہارٹ ایک نہیں ہوتا، مگر روجیل نے دو سال سے

شادی کر رکھی تھی..... اور سب سے بڑھ کر اس نے ایک نیپالی بدھ سے شادی کی تھی۔ ابا قدرے روشن خیال تھے، مگر اپنی اقدار اور مذہبی حدود کا

پاس انہیں بہت تھا۔ روجیل کے حوالے سے انہوں نے بہت خواب دیکھے تھے۔ بہت مان تھا ان کو اس پر۔ وہ ایک دفعہ کہتا تو سہی، مگر اس نے خود ہی

سارے فیصلے کر لیے۔ شاید وہ جانتا تھا کہ کہنے کا فائدہ نہیں ہے، کیونکہ وہ لڑکی بدھ مت کی پیروکار تھی۔ مسلمان تو چھوڑ، وہ تو اہل کتاب بھی نہ تھی کہ

ایسی شادی جائز ہوتی۔ وہ مسلمان ہونے کو تیار نہ تھی اور روجیل اس کو چھوڑنے پر راضی نہ تھا۔ اپنی حدود کا مذاق بنانے پر ابا کا دکھ الگ۔ جہان سے

تصدیق کر لینے کے بعد انہوں نے رو جیل کو فون کر کے جب باز پرس کی تو پھر تلخ کلامی سے ہوتی ہوئی بات باپ بیٹے کے ایک سنگین جھگڑے تک پہنچ گئی۔ ابا نے غصے میں اسے سخت برا بھلا کہا اور پھر ہر تعلق توڑ دیا، مگر فون کال کی ڈور ٹوٹنے سے قبل ہی وہ ڈھسے گئے تھے۔ پھپھو اور فاطمہ اس سارے معاملے کی گواہ تھیں۔ معلوم نہیں وہ کیوں سوتی رہ گئی۔

”جب میں رو جیل کے پاس رات رہا تھا، تب اس لڑکی نے مجھے ٹریسٹ دی تھی۔ انہوں نے کچھ نہیں بتایا، مگر میں جان گیا تھا کہ ان کے درمیان کیا ہے۔ اس کے کوئی سال و یڑھ بعد انہوں نے شادی کی تھی۔ یہ مجھے بعد میں امریکا میں مقیم ایک دوست نے بتایا۔ کتنی دیر ایسی باتیں جھپتی ہیں۔ ماموں کو بھی کسی عزیز سے خیر ملے گی۔“

وہ غم آنکھوں سے سر ہاتھوں میں دیے سنتی رہی۔ اسے رو جیل یا اس کی بیوی میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اسے صرف ابا کی فکر تھی۔ ڈھائی ماہ قبل کا واقعہ پھر دہرایا جانے لگا تھا کیا؟ وہ پھر علامتی خوشبو میں ایک محبت کو کھونے لگی تھی کیا؟

جب بمشکل انہیں ابا سے ملنے کی اجازت ملی، تب وہ غنودگی میں تھے اور وہ ان کے قریب بیٹھی اندر ہی اندر رو رہی تھی۔ آنکھیں خشک ہو چکی تھیں، مگر ہر آنسو آنکھ سے تو نہیں گرنا تھا۔ شاید اگر ابا کے دوست ذیشان انکل ملنے نہ آئے ہوتے تو وہ آنکھوں سے بھی رونے لگ جاتی، مگر ان سب کے سامنے خود کو مضبوط ظاہر کرنا تھا۔ فاطمہ نڈھال تھیں، مگر سین پھپھو بہت ہمت سے کام لے رہی تھیں۔

”سلیمان بہت مضبوط ہے بیٹا! فکر نہ کرو، وہ ٹھیک ہو جائے گا۔“
ذیشان انکل کو چھوڑنے وہ فاطمہ کے ساتھ باہر تک آئی تو وہ تسلی دینے لگے۔

وہ ابا کے سب سے اچھے دوست تھے۔ وہ ان کو زیادہ نہیں جانتی تھی، مگر فاطمہ واقف تھیں۔ ان کے ساتھ ان کی بیٹی بھی تھی، پندرہ سولہ سالہ رجا جو قد اور ذہنی طور پر اپنی عمر سے پیچھے تھی۔ قدرے انا پرل بیٹی جو گھٹنگھریالے بالوں والا سر جھکائے مسلسل اخبار پہ قلم سے کچھ لکھتی رہی تھی۔ ”رجا بہت ذہین ہے۔“ اس کی نگاہوں کو اپنی بیٹی پہ پا کر ذیشان انکل مسکرا کر بتانے لگے۔ ”اسے ورڈ پزل اور کراس ورڈ کھیلنے کا بہت شوق ہے۔ پورا چارٹ مل کرنے میں کئی دن لگاتی ہے، مگر کر لیتی ہے۔“

وہ بھیک سی مسکراہٹ کے ساتھ سنتی رہی۔ وہ اپنی بیٹی کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے تھے، چاہے گھر ہو یا آفس محبت تھی یا فکر یا پھر دونوں۔ ان کے جانے کے بعد وہ کچھ دیر کے لیے گھر آئی تھی۔ گھر پہ دشت اور دیرانی چھائی تھی۔ جیسے سب کچھ تم گم گیا ہو۔ وہ ابھی عبا یا اتاری رہی تھی کہ فون بجنے لگا۔ پرائیویٹ نمبر کا لنگ۔

اس روز کے بعد میجر احمد نے آج کال کی تھی، مگر اس نے کال کاٹ دی۔ وہ بار بار فون کرنے لگا، مگر حیانے فون بند کر دیا۔ وہ اس آدمی سے کوئی رابطہ نہیں رکھنا چاہتی تھی۔ ضرورت ہی نہیں تھی۔

ابا ابھی ہسپتال میں تھے۔ آج سین پھپھو اور فاطمہ ان کے پاس تھیں، سو وہ اور جہان گھر پہ تھے۔ وہ شام کا وقت تھا، مگر روشنی باقی تھی۔ حیا چھت پر منڈیر کے ساتھ لگے جھوٹے پنڈیٹ ابا کے گملوں کو دیکھ رہی تھی۔ آج ان پہ سائے نہیں گر رہے تھے۔ مگر وہ پھر بھی مر جھائے ہوئے لگ رہے تھے۔ ان کا اس گھر میں خیال رکھنے والا جو تھا، وہ اب خیال رکھنے کی پوزیشن میں نہیں رہا تھا۔ اس نے بہت سے آنسو اپنے اندر اتارے۔ ابا کے پودے اکیلے ہو گئے تھے۔

”کیسی ہو؟“ جہان ہولے اس کے ساتھ آکر بیٹھا۔
”تمہارے سامنے ہوں۔ تم نے کھانا کھالیا؟“
”ہاں! نور بانو میرا کھانا لے آئی تھی۔ اور تم نے؟“
”موڈ نہیں ہے۔“ وہ ابھی تک گملوں کو دیکھ رہی تھی۔
وہ اسے سرزنش کرنے ہی لگا، مگر رک گیا۔ منڈیر کے سوراخ سے اسے جیسے کچھ نظر آیا تھا۔
”سنو! یہ آدمی کون ہے؟“

”کون؟“ حیانے ذرا چونک کر گردن پھیری۔ منڈیر کے سوراخ سے نیچے تاپا کے لان کا منظر واضح تھا۔ وہ اپنے ذرا نیوے پہ کھڑے ایک صاحب کے ساتھ باتیں کر رہے تھے، جو سیاہ سوٹ میں ملبوس، بریف کیس ہاتھ میں لیے ہوئے تھے۔ وہ انہیں نہیں پہچانتی تھی۔
”پتا نہیں۔“ اس نے لافعلق سے شانے اچکائے۔

”میرا خیال ہے، وکیل ہے۔“

”تمہیں کیسے پتا؟ اس کے سوٹ کا رنگ تو سہل بلیک ہے، لائزر والا تو نہیں ہے۔“

”مگر ناکی دیکھو، جیٹ بلیک ہے۔ وکیل کی مخصوص ناکی۔“ وہ آنکھوں کی پتلیاں سکیڑے ان کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”اور میرا خیال

ہے وہ ابھی ادھر آنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔“ حیائے ذرا حیرت سے اسے دیکھا۔

”وہ اپنے ڈرائیوے پہ کھڑے ہیں، تمہیں کیسے پتا کہ ان کا کیا ارادہ ہے؟“

”غور سے دیکھو! فرقان ماموں کے جوتوں کا رخ کس طرف ہے؟“

حیائے گردن ڈراؤنچی کر کے دیکھا۔ تاپا بابا کے جوتوں کا رخ نامحسوس سے انداز میں ان کے گھروں کے درمیان دروازے کی طرف تھا۔

”انسان جلدھر جانے کا ارادہ رکھتا ہے، اس کے پاؤں خود بخود ادھر ہی مڑ جاتے ہیں، چاہے وہ ساکن کھڑا بیٹھا ہی کیوں نہ ہو۔ اگر

دوران گفتگو تمہارے مخاطب کے جوتے تمہاری مخالف سمت ہوں تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ وہ پورہ پورہ ہے تم سے۔“

حیائے بے اختیار جہان کے جوتوں کو دیکھا اس کے سیاہ تسمے والے بوٹ سیڑھیوں کے دروازے کی سمت تھے۔

”اس فائل میں کیا ہو سکتا ہے؟“ اب وہ ذرا الجھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ حیائے گردن پھر سے منڈیر کی جانب موڑی۔ نیچے وکیل صاحب

اپنے برف کیس سے ایک فائل نکال کر تاپا بابا کو دکھا رہے تھے۔

”سلیمان ماموں کہنی کے ایم ڈی ہیں نا؟“

”ہاں..... اور باقی شیئر ہولڈرز ہیں۔“

”ہوں! اس کا مطلب ہے کہ ماموں کی بیماری کے باعث کچھ کام رک گئے ہوں گے، سو باقی شیئر ہولڈرز ان سے کچھ دستخط کروانا

چاہتے ہوں گے۔ ماموں کا پاور آف اٹارنی کس کے پاس ہے۔“

”میرے پاس!“ وہ بے اختیار بولی۔ جہان ذرا ساجو نکا۔

”اصل میں بہت پہلے ابانے مجھے Attorney-in-fact بنایا تھا اور وہ صرف اس صورت میں، جب وہ خدا خواستہ کام

کرنے کے اہل نہ رہیں۔“

”یعنی کہ میں اس وقت اصغر اینڈ سنز کی ایم ڈی سے مخاطب ہوں۔“ وہ مسکرایا۔

”ارے نہیں! میں تو بس اٹارنی ان فیکٹ ہوں۔ ابانھیک ہو جائیں گے تو خود سنبھال لیں گے۔ سب کچھ۔“

”اور جب تک وہ ٹھیک نہیں ہوتے؟“

”تب تک تا یا فرقان سنبھال لیں گے۔“ اس نے کہنے کے ساتھ نیچے دیکھا۔ تا یا فرقان اب سمجھتے ہوئے اثبات میں سر ہلاتے فائل

کے صفحے پلٹ رہے تھے۔

”اس کے لیے انہیں سلیمان ماموں کا پاور آف اٹارنی چاہیے ہوگا..... اور شاید وہ ان سے اسی پہ دستخط کروانا چاہتے ہوں گے۔“

”جہان! ہو سکتا ہے، یہ ان کا کوئی دوست ہو اور تمہارے سارے انداز سے غلط ہوں۔“

”اور اگر میرے انداز سے درست ہوئے تب؟ تم انہیں پاور آف اٹارنی لینے دو گی؟“

”ہاں! کیوں نہیں؟ تا یا فرقان، ابانے کے بھائی ہیں آخر!“

جہان نے جیسے افسوس سے اسے دیکھا۔

”مادام! ایک بات کہوں؟ جب باپ کسی قابل نہیں رہتا تو اولاد کے لیے زندگی بدل جاتی ہے۔ یہ جو آج تمہارے ساتھ ہیں نا، ایک

وفدہ کار و بار تمہارے ہاتھ سے گیا تو تمہیں کنارے سے لگا دیں گے۔“

”ہر کسی پہ شک مت کیا کرو جہان!“ وہ بے زار ہوئی۔

”یہ فرقان ماموں ہی ہیں نا، جن کی ہم بات کر رہے ہیں؟ آنکھیں کھولو اپنی، تم انہیں اپنے باپ کی کرسی نہیں دے سکتیں حیا! اور دیکھو!

وہ ادھر ہی آرہے ہیں۔“

وہ بے اختیار چوکنی۔ وہ دونوں حضرات واقعی تیز قدموں سے درمیانی دیوار کے منقش لکڑی کے دروازے کی جانب بڑھ رہے تھے۔ وہ

ذرا سیدھی ہوئی۔ جہان کے لبوں پہ ہلکی سی فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔

”مگر جہان اپنی غیر موجودگی میں ان کے علاوہ کون سنبھال سکتا ہے کاروبار؟ مجھے تو بزنس ایڈمنسٹریشن کا کچھ نہیں پتا۔“ وہ مضطرب سی کھڑی ہو گئی۔

تایا ابانے نکھٹی بھائی۔ نور بانو بچکن سے نکل کر دروازہ کھولنے بھاگی۔

”پتا ہو یا نہ پتا ہو، تم انہیں اپنی کرسی نہیں لینے دو گی۔ اپنی جگہ کبھی نہیں چھوڑتے۔ ہٹل گریڈ کی مثال یاد رکھنا۔ ایک پاشانے جگہ چھوڑی تو دوسرے پاشانے قبضہ کر لیا۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ جھولا دھیرے دھیرے بلے لگا۔

”اب چلو! وہ اندر آ رہے ہیں۔“

وہ ابھی ابھی سی جہان کے ساتھ میز چایاں اترتی بیچنے آئی۔ تایا ابانے کیل صاحب کو باہر چھوڑ کر خود لاؤنج میں آکھڑے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھ میں فائل تھی، مگر حیرانہ کتب بھی لگ رہا تھا کہ جہان کے انداز سے غلط ہیں۔

”حیا۔۔۔!“ تایا نے جگت بھرے انداز میں اسے پکارا۔ ”تمہارے پاس کنڈیشن میں سائن کر سکتے ہیں؟“

وہ آخری میز پر پہنچی گئی۔ حالات اتنے حساس ہو چکے تھے کہ معمولی سی بات بھی بہت زور سے لگتی تھی۔ اب بھی لگی۔ انہوں نے اب کا حال پوچھنے کی بجائے صرف دستخط کا پوچھا۔

”آپ کو کیا سائن کروانا ہے؟“ سپاٹ سے انداز میں پوچھتی، وہ ان کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ جہان بہت سکون سے آخری میز پر بیٹھ گیا تھا اور اب گویا تماشا دیکھ رہا تھا۔

”تمہارے کام کی چیز نہیں ہے۔۔۔ اور وہ سائن کر سکتے ہیں یا نہیں؟“ تایا ابانے کو اس کا سوال کرنا سخت ناگوار لگ رہا تھا۔ جہان ہلکا سا مسکرایا، مگر حیا تایا ابانے کی طرف متوجہ تھی۔

”وہ نہیں کر سکتے۔ ڈاکٹر نے ان سے زیادہ بات چیت سے منع کیا ہے۔“ وہ دانستہ لمحے بھر کو کی۔ ”آپ مجھے بتادیں تایا ابانے! شاید میں آپ کی مدد کر سکوں۔ آخر میں ابانے کی انٹرنی ان فیکٹ ہوں۔“

تایا فرقان کو جیسے جھٹکا لگا۔ وہ حیرت بھری الجھن سے اسے دیکھنے لگے۔

”تم؟ سلیمان نے تمہیں کب انٹرنی ان فیکٹ بنایا؟“

”بہت پہلے ابانے اپنا ڈیورسبل (Durable) پاور آف انٹرنی مجھے دیا تھا اور اس کے مطابق میں ابانے کی جگہ کام کر سکتی ہوں۔“ پر اعتماد وہ ہمیشہ سے تھی اور اب بھی تایا فرقان کی بارعب شخصیت کے سامنے کھڑی بہت اطمینان سے انہیں بتا رہی تھی۔ خلاف توقع وہ ایک دم غصے میں آ گئے۔

”دماغ خراب ہے سلیمان کا۔ وہ اس طرح کیسے کر سکتا ہے؟“

اب تو وہ کر چکے ہیں۔ آخر! میں ان کی بیٹی ہوں۔ انہیں مجھ پر بھروسہ ہے۔“

”کیا مذاق ہے یہ؟“ وہ جیسے جھنجھلائے تھے۔ ”اب سارا کام کیسے چلے گا؟ کیا میں ذرا ذرا سی بات کے لیے تمہارے پاس ادھر آتا رہا ہوں؟“

”اوہ! انہیں تایا ابانے! میں آپ سب کو اپنی وجہ سے زحمت نہیں دوں گی۔ کسی کو ادھر نہیں آنا پڑے گا۔ میں کل سے خود ہی آفس آ جاؤں گی۔“

”انسٹرنگ!“ آخری زینے پہ مطمئن سے بیٹھے تماشا لائی نے دلچسپی سے انہیں دیکھا جو آئے سامنے کھڑے تھے۔ وہ جیسے دونوں کو

تقریباً لڑوا کر بہت لطف اندوز ہو رہا تھا۔

”تم۔۔۔ تم آفس آؤ گی؟ تمہیں کیا پتا بزنس ایڈمنسٹریشن کا؟“ وہ بے غصے سے انہوں نے ہاتھ سے گویا ناک سے مکھی اڑائی۔

”کیا فرق پڑتا ہے تایا ابانے! اور بھائی جب پولیٹیکل سائنس میں سیل ایم اے کر کے آج بورڈ آف ڈائریکٹرز میں شامل ہو سکتے ہیں تو

پھر چند دن کے لیے ابانے کی کرسی میں بھی سنبھال سکتی ہوں۔“

وہ لب بھینچ کر مشکل ضبط کر کے رہ گئے۔

”ہمارے خاندان کی پتی اب آفس آئے گی، لوگ کیا کہیں گے آخر؟“ وہ ذرا اسے دھیسے پڑے۔

”جب وہ اپنے تایا، چچا اور تایا زاد بھائی کے ہمراہ آفس آئے گی تو لوگ کچھ نہیں کہیں گے۔“ وہ جلدی دفعہ ذرا سی مسکرائی۔

”عجب روان چل نکلے ہیں۔“ تایا اباحتھے پہل لیے پلٹ گئے اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے باہر نکل گئے۔ اپنے پیچھے دروازہ انہوں نے زوردار آواز سے بند کیا تھا۔

”کیا بات ہے!“ وہ مسکرا کر نائشی انداز سے کہنا میری سے اٹھا۔ بس تائی نہیں، جانی وہ رندا انداز دیا ہی تھا۔
 ”تایا اباحتھے مجھ سے کبھی ایسے بات نہیں کی۔“ وہ ابھی تک طلال سے دروازے کو دیکھ رہی تھی، جہاں سے وہ گئے تھے۔
 ”آہستہ آہستہ وہ اس سے بھی زیادہ مختصر سے بات کرنے لگیں گے۔ بس اذکھتی جاؤ۔“

”مگر وہ ٹھیک کہہ رہے تھے۔ میں کیسے اب کی سیٹ پہ بیٹھ سکتی ہوں؟ مجھے واقعی ان کے کاروبار کا کچھ نہیں پتا۔“ اب پہلی دفعہ اسے فکر ستانے لگی۔ تایا کے سامنے جو بڑے بڑے دعوے کیے تھے، ان کو ثابت کرنے کے لیے وہ کیا کرے گی؟ ایک دم سے بہت سا بوجھ اس کے کندھوں پہ آگرا تھا۔

”ہیا! چپ مٹے اس رات مجھے وہ ساری باتیں بتائیں نہیں، تو میں نے تمہارے بارے میں دو آراء قائم کی تھیں۔ پہلی یہ کہ وہ لڑکی کسی کی مدد لیے بغیر اتنا کچھ خود ہی تنہا سنبھال رہی ہے، وہ بہت مضبوط لڑکی ہوتی ہے۔ شاید چند ماہ قبل تم اتنی مضبوط نہ ہو، مگر اب ہو گئی ہو۔“
 وہ نرمی سے کہتا اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔ وہ ابھی تک دروازے کو دیکھ رہی تھی۔

”اور دوسری یہ کہ تم نے اس سائیکو آفیسر کا پرزل حل کر لیا جس سے مجھے لگا کہ تم ایک سمجھ دار اور ذہین لڑکی ہو، جو معمولی سی باتوں سے بھی اپنے مسائل کے حل ڈھونڈ لیتی ہے۔ یقین کرو! بزنس سنبھالنے کے لیے کسی ڈگری سے زیادہ کامن سنس، مضبوط اعصاب اور ذہانت کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ سب تمہارے پاس ہے، پھر فکر کیسی؟“

اس نے دروازے سے نگاہیں ہٹا کر جہاں کو دیکھا۔

”کیا تم میری مدد کرو گے؟“ بہت پر امید انداز میں اس نے پوچھا تھا۔

”بالکل بھی نہیں۔ جو کرنا ہے، اکیلے کرو اور خود کرو کیونکہ تم کر سکتی ہو۔“ ایک لائق ساترہ کر کے وہ دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

اس نے تھملا کر اسے جاتے دیکھا۔ آخر اس نے مدد مانگی ہی کیوں اس آدمی سے؟ سوچا بھی کیسے کر وہ اس کی مدد کرے گا؟ وہ تو جہاں تھا، وہ تو ہمیشہ سے اسے تنہا چھوڑ کر چلے جانے کا عادی تھا۔

اب وہ کیا کرے گی؟ سر ہاتھوں میں تھا وہ صوفے پہ گر سی گئی۔ اس کی انا کا سوال تھا۔ تایا کے سامنے اتنے دعوے کر کے وہ پیچھے نہیں ہٹ سکتی تھی۔ پیچھے ہٹنے کا راستہ اب بند تھا۔ اسے کل سے واقعی آفس جانا پڑے گا، وہ جانتی تھی۔
 ”چند دن کی ہی قوت بات ہے۔“ اس نے خود کو تسلی دی۔

☆ ☆ ☆

رات وہ اب اسے ملنے لگی۔ جب فاطمہ قریب نہیں تھیں تو ان کا ہاتھ کھڑکریزی سے انہیں اس نے اپنے فیصلے کا بتایا۔ ساری بات سن کر وہ نحیف سے انداز میں ہلکا سا مسکرائے۔

”باقر صاحب سے ملنے لینا، وہ تمہیں کام سمجھا دیں گے۔“ بہت دھیمی آواز میں وہ بس اتنا حاکم کہہ پائے تھے۔ ”اور ذیشان میرا دوست ہے۔ کوئی مدد چاہیے، تو اسے کہہ دینا۔“

پھر انہوں نے آٹھ گھنٹے موند لیں۔ بیماری واحد شے نہیں ہوئی جو انسان کو ڈھاسکتی ہے۔ دکھ زیادہ زور آور ہوتے ہیں۔ وہ بھی ٹوٹ چکے تھے۔ اسے روئیل پہ پہلے سے بھی زیادہ غصہ آیا۔

فاطمہ سے سامنا ہوا تو بس سرسری سا بتایا۔

”کل میں اب اسے آفس جاؤں گی۔“ انہوں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”کیوں؟“

اب اسے لگا تھا۔ اچھا! آپ یہ کاروباری باتیں ان سے مت کیجیے گا۔ ڈاکٹر نے منع کیا ہے۔“

وہ نگاہ بجا کر اس سے نکل گئی۔ وہ فاطمہ کو جانتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اس کے فیصلے پہ بہت خوش نہیں ہوں گی اور خوش تو شاید خود بھی

نہیں تھی۔ وہ خود بھی ایسا نہیں چاہتی تھی۔ یہ تو جہان تھا، جس نے اسے پھنسوایا تھا اور پھر خود پیچھے ہٹ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

سلیمان صاحب کا آفس نہایت پر نفیش انداز میں آراستہ کیا گیا تھا۔ گمرے اور کمرے سیٹا کی ضخیم کے ساتھ، سفید چمکنے والے ماربل ناچار، قیمتی پردے، شاہانہ سافرینچ اور اس اونچی، سیاہ، گھونسنے والی کرسی کی توشان ہی الگ تھی، جس پر وہ اس وقت بیٹھی تھی۔

اپنے سلک کے سیاہ عیابا میں ملبوس، دونوں کہنیاں کرسی کے ہتھ پہ جمائے، انگلیوں سے دوسرے ہاتھ میں موجود پلاٹینم گھماٹے ہوئے، لک لگا کر بیٹھی، وہ سنجیدگی سے سر بلاتی باقر صاحب کی بریفنگ سن رہی تھی۔ نفاست سے کیے گئے نقاب میں سے جھلکتی آنکھیں متوجہ انداز میں سکڑی ہوئی تھیں۔ وہ ادھیڑ عمر اور شریف النفس سے انسان لگتے تھے اور اب پوری جانفشانی سے اسے اپنی کنسٹرکشن کمپنی کے بارے میں آگاہی دے رہے تھے۔ بورڈ آف ڈائریکٹرز شیئر ہولڈرز، کمپنی کے زیرِ تفسیر پروجیکٹس، مینیڈرز، وہ سن سب رہی تھی، مگر بعض اصطلاحات بہت مشکل تھیں۔ اسے سب سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ رہ رہ کر اسے کاروباری معاملات میں اپنی کم علمی کا افسوس ہورہا تھا۔ وہ خود کو سمجھا رہی تھی کہ یہ افسوس بھی کم علمی کا ہے، نہ کہ تباہی کو یوں چیلنج کرنے کا، مگر شاید آخر الذکر پر اسے زیادہ افسوس تھا۔

”کمپنی میں چالیس فیصد شیئرز آپ کے والد کے ہیں میم! بیس فیصد فرقان صاحب کے، بیس فیصد زاہد صاحب کے اور دس فیصد سیٹھی صاحب کے ہیں۔“

”اور آخری دس فیصد؟“ پہلی دفعہ اس نے زبان کھولی اور ساتھ ہی آفس کا دروازہ کھلا۔ حیانے چونک کر دیکھا اور پھر ناگواری کی ایک لہر نے اسے سر سے پاؤں تک گھیر لیا۔ اگر اسے تھوڑا سا بھی خیال آتا کہ آخری دس فیصد شیئرز ہولڈر ولید لغاری ہو سکتا ہے تو وہ کبھی آفس نہ آتی۔
”اوہ! آپ..... آفس آئی ہیں؟“ وہ ”آپ“ پہ زور دیتا، طنز یہ مسکراہٹ کے ساتھ بہت اعتماد سے چلتا اندر آیا۔ باقر صاحب کے چہرے پہ ناگواری ابھری، مگر وہ خاموش رہے۔

”تو سلیمان انکل کی سیٹ آپ سنیا لیں گی؟“ اس کے سامنے کرسی کھینچ کر وہ ناگ پر ناگ رکھ کر بیٹھا۔ ”کیا بزنس ایڈمنسٹریشن میں ڈگری آپ نے ترکی سے لی ہے؟ مگر اکو تو آپ نے بتایا تھا کہ آپ ایل ایل بی کر رہی ہیں؟“
تسمنہ نے انداز میں کہتا وہ واضح طور پہ اس رات کا حوالہ دے رہا تھا۔ یہ طے تھا کہ پہلی دفعہ نقاب میں دیکھ کر اگر وہ فوراً اسے پہچان گیا تھا تو وجہ یہی تھی کہ اس نے باہر اسٹاف سے اس کی آمد کے بارے میں سنا تھا، تب ہی وہ اتنے ہی اعتماد سے بے دھڑک اس آفس میں داخل ہوا تھا، جس سے وہ غالباً ہمیشہ ہوتا تھا۔

”تو میڈم ایم ڈی! کیا ارادے ہیں آپ کے؟ کیا اب اس آفس میں طالبانہ انٹرنیشن رائج ہو جائے گی؟“
وہ جو خاموشی سے لب بھینچے اس کی بات سن رہی تھی، اس نے دائیں ابرو سوالیہ اٹھائی۔ سیاہ نقاب سے جھلکتی آنکھوں کی حنّی واضح تھی۔
”میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔“ آپ کی تعریف؟“ باقر صاحب! یہ کون صاحب ہیں؟“
”میم! یہ لغاری صاحب کے.....“

”پہچان تو خیر آپ گئی ہیں۔ مجھے نہیں لگتا، آپ کبھی بھول پائیں گی۔ ولید لغاری کہتے ہیں مجھے اور.....“
”ولید صاحب! امیری ایک بات کا جواب دیں۔“ متوازن لہجے میں بات کاٹتے ہوئے وہ آگے کو بھٹی اور ایک دوسرے میں پھنسے ہاتھ میز پر رکھے۔ وہ جواستہ زائے انداز سے بولے جارہا تھا، رک گیا۔

”ولید صاحب! کیا میں نے آپ کو اپنے آفس میں بلایا تھا؟“ ولید نے ہنس کر سر جھٹکا۔

”میڈم حیا! بلکہ مسز حیا! اب جب آپ کو ادھر کام.....“

”ولید صاحب! کیا میں نے آپ کو بلایا تھا؟“ وہ پہلے سے بلند اور درشت آواز میں بولی۔ ولید کی ہنسیوں سکڑیں۔

”سلیمان انکل کے آفس میں آنے کے لیے مجھے اجازت.....“

”ولید صاحب! کیا میں نے آپ کو بلایا تھا؟“

وہ بے حد اونچی آواز میں کہتی کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ باقر صاحب بھی احتراماً ساتھ ہی اٹھے۔ تابعداری کا ثبوت۔ وفاداری کا احساس۔ ولید کی پیشانی کے بل گہرے ہو گئے۔ وہ تیزی سے اٹھا۔

”سلیمان اکل میرے ساتھ یہ سلوک کبھی برداشت نہ کرتے۔“

”میں آپ کے ساتھ اس سے بھی بدتر سلوک کر سکتی ہوں۔ باقر صاحب! ان صاحب کو باہر جانا ہے۔ پلیز! دروازہ کھول دیں۔“

باقر صاحب نے ذرا تذبذب سے اسے دیکھا، پھر پلٹنے ہی لگے تھے کہ ولید نے ہاتھ اٹھا کر انہیں روکا۔

”میں دیکھتا ہوں، آپ اس آفس میں کتنے دن رہتی ہیں۔“ ایک خشک نگاہ باقر صاحب پہ ڈالتا وہ تیزی سے پلٹا۔

حیائے کرسی پہ واپس بیٹھتے ہوئے انٹرکام کارسیور اٹھایا۔

”درنشان! اگر یہ آدمی مجھ کو بارہ بلا اجازت اپنے آفس میں داخل ہوتا نظر آیا تو آپ کی چھٹی۔ سن لیا آپ نے!“ اور سنایا تو اس نے

ولید کو تھا، جو اس کی بات ختم کرنے کے بعد ہی باہر نکلا تھا۔

”جی..... جی میم!“ ابا کی سکریری بوکھا گئی تھی۔

”بیٹھے!“ رسیور واپس رکھتے ہوئے اس نے باقر صاحب کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”باقی دس فیصد شیئرز ان کے پاس ہیں میم!“ باقر صاحب نے سلسلہ کلام وہیں سے جوڑا۔ تب تک وہ چند گہرے سانس لے کر خود کو

کپور کر چکی تھی۔

”پہلے غیر نظامی آفس آیا کرتے تھے، مگر گزشتہ ایک ماہ سے وہ ملاج کے سلسلے میں بیرون ملک ہیں۔“

چند مزید تفصیلات کے بعد وہ اسے بورڈ آف ڈائریکٹرز کی آج متوقع میٹنگ کے بارے میں بتانے لگے۔

”میم! ایک ٹریڈینفر کا پروجیکٹ ہے۔ ہمیں وہ حاصل کرنا ہے اور.....“

”یعنی کہ ٹریڈینفر کی نظامی ہے اور ہمیں نظامی جتنی ہے؟“ اس نے وہ دے بے بوش سے ان کی بات کاٹی۔ گزرتے گزرتے کبھی کوئی

سوپ سیریل دیکھتی تھی تو اس میں عوامانہ ٹریڈینفر کی نظامی ہو رہی ہوتی اور مخالف کہنیاں بولی لگا رہی ہوتیں۔ سو کم از کم کچھ تو پتا تھا اسے کنسرکشن کہنیاں

سے متعلق۔

باقر صاحب نے بھر کو خاموش ہوئے، پھر لٹی ہیں سر ہلایا۔

”ہمیں ہم ٹریڈینفر کی نظامی کا معاملہ نہیں ہے۔“

”اچھا!“ اس نے غفلت چھپاتے ہوئے سر ہلادیا۔ اب وہ درمیان میں نہیں بولے گی۔ خاموش رہ کر بس سنے گی۔

”اصل میں ایک گروپ ٹریڈینفر بنانا چاہ رہا ہے۔ وہ اس کے لیے مختلف کہنیوں کے آئیڈیاز دیکھنا چاہتے ہیں کہ کون ان کی زمین کو

بہترین طور پر استعمال کر کے ٹریڈینفر بنا سکتا ہے۔ اگر ہا آئیڈیاز اپروہو گیا تو پروجیکٹ ہمیں مل جائے گا۔ میں ہیڈ آرکیٹیکٹ کو بھیجتا ہوں۔ وہ آپ

کو مزید بریف کر دیں گے۔“ باقر صاحب مؤدب انداز میں اٹھتے ہوئے بولے۔

ہیڈ آرکیٹیکٹ رضوان بیگ صاحب درمیان عمر کے تجربہ کار انسان تھے، مگر ان کا انداز بول تھا، گویا ان کے سامنے کوئی ان پڑھ لڑکی

بیٹھی ہو، جس کو بریف کرنا وہ اپنی شان میں تو جین سمجھتے ہوں۔ جان بوجھ کر مشکل اصطلاحات استعمال کرتے ہوئے وہ بہت لاپرواہی سے اس کو اپنا

کام دکھا رہے تھے۔

”یہ ٹریڈینفر ہے، یہ پارکنگ لاٹ ہے، یہاں ہم بولیں کریں گے، یہاں یوں.....“ حیا اسی انداز میں کنفرینس سے نکلتے، ہتھیلیاں

ملائے بیٹھی بہت جلد سے ان کی بات سن رہی تھی۔

”اب آپ کو اتنا پتا نہیں ہوگا میم! بہر حال یہ اتنا شان دار پروجیکٹ پلان ہے کہ عمارت دیکھتے ہی گاہک فوراً سے کار ادھر پارک

کرے گا اور شاپنگ شروع کر دے گا۔“

”خیر! میں تو اس موت کے کنوینس میں کبھی کار پارک نہ کروں۔ کار کو کچھ ہو گیا تو روجیل کبھی نہیں چھوڑے گا کہ وہ اس کی کار تھی، مگر اب

تو روجیل نے بہت کچھ چھوڑ دیا..... اور کار تو جہاں کے پاس تھی۔ پتا نہیں، وہ اس وقت کیا کر رہا ہوگا۔“ اف حیا کام پہ توجہ دو۔“

وہ سر جھٹک کر ان کی طرف متوجہ ہو گئی۔ ڈیزائن کی اسے واقعی کچھ سمجھ نہیں تھی، لیکن اگر وہ اتنے قابل آرکیٹیکٹ اس کی اتنی تعریف

کر رہے تھے تو یقیناً وہ بہت اچھا ہوگا، وہ قابل ہو گئی تھی۔

بورڈ آف ڈائریکٹرز کی میٹنگ اس کی توقع سے زیادہ بری رہی۔ جب وہ کانفرنس روم میں داخل ہوئی تو لمبی کانفرنس ٹیبل کے دونوں

اطراف کرسیوں کی قطاروں پہ سوئڈ بوئڈ افراد منتظر سے بیٹھے تھے۔ سربراہی کرسی خالی تھی۔ وہ فائل سنبھالے، تیز تیز قدموں سے چلتی کرسی تک آئی۔ کوئی اس کے لیے کھڑا نہیں ہوا۔ اس نے میز پر پرس رکھا اور کرسی سنبھالتے ہوئے فائل کھولی۔ پھر گردن اٹھا کر دیکھا تو سب مرد حضرات اسی کی طرف متوجہ تھے۔ تایا فرقان، زہد چچا، داور بھائی، ولید، چند غیر شناسا چہرے۔ لمحے بھر کو اس کا اعتماد انواں ڈول ہوا۔

”جوڑکی اتنا کچھ تباہی سہتی ہے۔ وہ بہت مضبوط لڑکی ہوتی ہے۔“ اس نے فوراً سے خود کو سنبھال لیا۔

تمہید کے بعد وہ اپنے ازلی پر اعتماد اور دو ٹوک میں انداز میں کہنے لگی۔

”سلیمان اصغر کی اناری ان فیکٹ ہونے کے ناتے ان کی صحت یابی تک میں ان کی سیٹ سنبھالوں گی۔ مجھے امید ہے کہ کسی کو اعتراض نہیں ہوگا۔“

”اعتراض تو خیر ہے مگر کیا کیا جاسکتا ہے؟“ تایا فرقان نے ناگواری چھپانے کی کوشش کیے بغیر ہاتھ جھلا کر کہا۔ اس نے گردن موڑ کر بہت سنجیدگی سے انہیں دیکھا۔

”جی سر!“ میں جانتی ہوں کہ بہت سے لوگوں کو اعتراض ہوگا، مگر چونکہ آپ میرے ساتھ ہیں، اس لیے مجھے ان کی پروا نہیں ہے۔

اب کام کی بات پآتے ہیں۔“

ان کو کچھ اس طرح سے گھیرا کہ نہ وہ ہاں کر سکے نہ ہی ناں۔ وہ مینٹگ کے مقاصد کی طرف آگئی۔

اس کی غلطی تھی کہ ولید دوبارہ اس کے راستے میں نہیں آئے گا۔ ولید سمیت قریب سب ہی، حتیٰ کہ داور بھائی بھی تمام عمر سے اس سے بات بہ بات سوال کرتے رہے۔ حان بوجھ کر کنفیوژ کرنے والے سوال اور پھر اس کی توجیہ پہ استہزائیہ انداز میں سر جھٹک دیا جاتا۔ غصہ اسے آیا مگر اسے عائشہ گل کی اچھی لڑکی کی طرح تحمل سے کام لینا تھا۔ لیکن آخر میں اس کا صبر جواب دے گیا، جب داور بھائی نے بہت چپچپے ہوئے انداز میں کہا۔

”میڈم! آپ کا تو ایل ایل بھی مکمل نہیں ہوا تو آپ ایک کنسٹرکشن فرم کی پیچیدگیاں کیسے سمجھ پائیں گی؟“

”جب آپ چار سال میں دو دفعہ انگلش لینگویج میں سبلی لے کر بی اے کر سکتے ہیں اور پہل ایم اے کر کے آج ادھر بیٹھ کر مجھ سے سوال و جواب کر سکتے ہیں تو پھر مجھے یقین ہے کہ میں بھی جلد ہی کمپنی کی ساری پیچیدگیاں سمجھ جاؤ گی۔“

بہت سکون سے کہتی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ کانفرنس روم میں سنا سنا چھا گیا۔ داور بھائی کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ وہاں پروا کسے تھی۔

وہ ”السلام علیکم“ کہہ کر اپنی چیزیں اٹھا کر اسی اعتماد اور وقار کے ساتھ چلتی دروازے کی سمت بڑھ گئی، جس کے ساتھ وہ اندر آئی تھی۔

”سلیمان اصغر کی مغرور بیٹی.....“

پیچھے سے اس نے کسی کو کہتے سنا تھا، مگر وہ باہر نکل آئی۔ پرسوں پر پرنٹیشن تھی اور اگر وہ اچھی سی پرنٹیشن دے کر پروجیکٹ اپروو کروالے تو وہ ان شاؤنٹ مردوں پہ یہ ثابت کروے گی کہ سلیمان اصغر کا انتخاب درست تھا۔

☆ ☆ ☆

بیڈ پہ لیپ ٹاپ کے سامنے بیٹھی کی بیڈ پہ اگلیاں میز تیز چلاتی، وہ پوے اٹھاکے اسے اپنے کام کی طرف متوجہ تھی۔ پرنٹیشن کے لیے وہ مکمل تیاری سے جانا چاہتی تھی تاکہ کوئی اس پہ انگلی نہ اٹھائے۔ مسلسل کام کے باعث اس کے ہاتھوں میں درد ہو رہا تھا۔ سر کے پیچھے حصے میں بھی ہلکی نیسیں اٹھ رہی تھیں۔ اس کا ارادہ کام ختم کر کے دوا لے کر سونے کا تھا۔

”حیا! فاطمہ اسے پکارتے ہوئے کمرے تک آئیں۔ صبح ابا کو گھر شفٹ کر دیا گیا تھا، جس کے باعث اب وہ بالآخر سب ایک جھٹ

تلے تھے۔“

”کیا کر رہی ہو؟“ اس کے گرد کاغذوں، فائلز اور لیپ ٹاپ کو دیکھ کر فاطمہ نے افسوس سے سر ہلایا۔ کیا ضرورت تھی یہ سب کرنے کی؟

صائمہ بھابھی بہت تھکا ہو رہی تھیں کہ جب تایا کی موجودگی میں تم خود کرو گی تو سب کہیں گے کہ ان پہ بے اعتباری ظاہر کی جا رہی ہے۔“

”مجھے یہی بہتر لگا تھا اماں! ابانے مجھے اپنا اناری ان فیکٹ بنایا تھا تو کچھ سوچ کر ہی بنایا ہوگا۔“ وہ اسکرین سے لگا ہی ہٹائے بنا بولی۔

”اچھا اکل ارسل کا بیمہ ہے۔ کیا پابنوی؟“

”اف ایہ شادیاں۔“ جب سے اب بیمار ہوئے تھے، ان چیزوں کا دل ہی نہیں کرتا تھا۔ ارسل ان کا سیکنڈ کزن تھا، پھر بھی مہندی د

شادی پہ وہ اور فاطمہ نہیں گئی تھیں۔ اب ولیمہ پہ جانا ضروری تھا۔

”کچھ بھی بہن لوں گی۔ مسکند گیدرنگ ہوگی“ ان کی انگلیوں سے دراب کلائیوں تک سرایت کر رہا تھا۔

”ہاں! مسکند ہی ہے مگر پلیر! اس دن کی طرح دو پنامت پلینٹا“ فاطمہ اس کے قریب بیڈ پٹھتی نروٹھے پن سے بولیں۔

”پر اماں! مسکند گیدرنگ جو ہے۔ نقاب تو کرنا پڑے گا۔“ وہ ابھی تک اسکرین کی جانب متوجہ تھی۔ اسے پتا نہیں چلا کہ اس نے کس

شے کو دعوت دے ڈالی تھی۔

”نقاب کس لیے؟ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ وہاں کس سے کیا ہے نقاب؟ کزن کی شادی ہے۔ وہاں سب اپنے ہی ہوں گے۔“ وہ

حیرت اور غصے سے بولیں۔ حیا نے رک کر انہیں دیکھا۔

”اپنا تو کوئی نہیں ہوتا اماں! وہ کزن ہیں۔ سگے بھائی تو نہیں۔ اب جب کرتی ہوں نقاب تو ٹھیک سے کروں نا۔“ اسے سر کے پچھلے حصے

سے درد اپنے بازو تک بڑھتا ہوں محسوس ہو رہا تھا، یوں جیسے اس کی ان دیکھی انگلیاں ہوں اور اس کے سر کو آہستہ آہستہ اپنے شکبے میں لے رہا ہو۔

”تم باگل ہو گئی ہو؟ تم فنکشن میں برقع اوزھو گی؟“

”برقع نہیں اوڑھ رہی۔ بڑے دوپٹے سے ہی کام چلاؤں گی۔ مسکند گیدرنگ جو ہے۔“ اس نے حتی الوسع لہجہ کو نرم اور دھیمار کھنے کی

کوشش کی۔

”مگر مسکند گیدرنگ میں بھی مردوں اور عورتوں کی ٹیبلر الگ الگ ہوتی ہیں حیا! مرد دور ہوتے ہیں۔“

”دور کہاں؟ سامنے ہی تو بیٹھے ہوتے ہیں سب۔ درمیان میں اسکرین تو نہیں حاصل ہوتی..... اور پھر جو ویز عورتوں کی طرف پھر

رہے ہوتے ہیں اور اسل کے بھائی..... وہ تو ہمیشہ ہی عورتوں کی طرف ہوتے ہیں۔“

”وہ تو بچے ہیں حیا!“

”میں بیس سال کے بچے ہیں؟“

”تم بحث کیوں کر رہی ہو؟“

ورد کی لمبی انگلیاں اب اس کی کپٹنی سے ہوتی، پیشانی کو اپنے شکبے میں لے رہی تھیں۔ تکلیف ہر بل بڑھتی جا رہی تھی۔

”نہیں اماں! بحث تو نہیں کر رہی صرف وضاحت کر رہی ہوں اپنے نقاب کی۔“

”اچھا! پہلے تو تم نقاب نہیں لیتی تھیں۔ پہلے تو تم بہت ماڈرن تھیں۔“

وہ چپ ہو گئی۔ زمانہ جاہلیت کا طعنہ کیسے چابک کی طرح لگتا ہے۔ کاش! یہ طعنہ دینے والوں کو معلوم ہو سکے۔

”جی! میں پہلے نہیں لیتی تھی، لیکن اگر اب کرتی ہوں تو مجھے پر اپر طریقے سے کرنا چاہیے۔“

”تم شادی پہ نقاب لوگی تو لوگ کیا کہیں گے؟“ وہ ہنسنے لگی۔

”نہیں لوں گی تو اللہ تعالیٰ کیا کہے گا؟“

”کچھ نہیں ہوتا حیا! ایسے بھی تو کتنے گناہ کر لیتے ہیں۔ غیبت، گلے، یہ سب گناہ نہیں ہوتا؟ کیا صرف نقاب نہ کرنا گناہ ہے؟“

ورد کی فواد کی گرفت اس کے سر کو جکڑ لینے کے بعد اب گردن تک پھیلی جا رہی تھی۔ اسے کندھوں پہ شدید دباؤ محسوس ہونے لگا۔

”اماں! میں نے کب کہا کہ میں بہت نیک ہوں یا کوئی گناہ نہیں کرتی، لیکن اگر میں کوئی نیک کام کرنا چاہتی ہوں تو مجھے مت روکیں۔“

اسے لگا، وہ التجا کر رہی ہے، منت کر رہی ہے۔ وہ بنو قریظہ سے منت کر رہی ہے۔

”اچھا! پہلے تو تم نے کبھی احساس نہیں کیا گناہ ثواب کا۔ جب ابادرتا کہتے تھے تب تو تم نہیں مانتی تھیں۔ پھر وہی پہلے کا طعنہ۔“

”تو اماں! اگر میں تایا کہ کہنے پہ اللہ کی مانتی تو میں قابل قبول ہوتی، مجھے شاباش بھی ملتی اور وہ ابھی، لیکن اگر میں اپنی مرضی سے اللہ

کی مانوں تو میں قابل قبول نہیں ہوں؟“ اس نے دکھ سے انہیں دیکھا۔ وہ ماس کو برجھی کی طرح زنجی کرتی اذیت کندھوں سے گزرتی، سینے میں اتر

رہی تھی۔

”مجھے بے کار کے دلائل مت دو۔ اپنا ایل ایل بی مجھ پہ مت آزماؤ۔ ارم کی مقفی پہ تھوڑے لوگ تھے، بات دب گئی، لیکن اگر اب اتنے

بڑے فنکشن پہ نقاب لوگی تو جاتی ہو، لوگ کتنی باتیں بنائیں گے؟“

”آپ لوگوں سے ڈرتی ہیں، جبکہ اللہ زیادہ حق دار ہے کہ اس سے ڈرا جائے..... اور لوگوں کا کیا ہے..... صائمہ تائی تو پہلے بھی مجھ پہ باتیں بناتی آئی ہیں۔“ مگر فاطمہ بے زار ہو چکی تھیں۔

”حیا! شادیوں پہ کون حجاب لیتا ہے؟“

”میں لیتی ہوں..... اور میں نے کر دکھاؤں گی۔ نہیں! میں کوئی دعوہ نہیں کر رہی، لیکن اگر میں اپنے خاندان کی وہ پہلی لڑکی ہوں جو شادیوں میں بھی حجاب لے..... تو میں وہ پہلی لڑکی بنوں گی اماں!“

تکلیف اس کی شریانیوں میں کسی سیال مادے کی طرح تیرتی اندر سب کچھ جلاتی، دل میں قطرہ قطرہ گرنے لگی تھی۔

”حیا! شادیوں پہ تو خیر ہوتی ہے۔“

”نہیں اماں! شادیوں پہ ہی تو..... ان تقریبات سے ہی تو خیر کم اور شر زیادہ نکلتے ہیں۔“

”کتنا برا لگے گا، تم نقاب میں بٹھی ہوگی؟“ انہیں رہ رہ کر اس کی کم عقلی پہ افسوس ہو رہا تھا۔

”کس کو برا لگے گا..... لوگوں کو؟ مگر اللہ تعالیٰ کو اچھا لگے گا۔“

”اچھا! یعنی ہم جو نقاب نہیں کرتے تو ہم سب کافر ہوئے.....؟ ہاں! ہم سب بہت برے ہوئے؟“

”میں نے یہ کب کہا ہے اماں؟ میں خود نقاب لیتی ہوں، مگر کسی دوسرے پر تو تنقید نہیں کرتی۔ میں تو کسی سے کچھ بھی نہیں کہتی اماں!“ اس کی آواز بھیک گئی۔ درد اب اس کے دل کو کاٹ رہا تھا۔ الٹی چھری سے ذبح کر رہا تھا۔ خندق کی کوئی جنگ، نو قریظہ کے بغیر نہیں لڑی جاتی۔ اسے بھی، نو قریظہ مل گیا تھا اور وہاں سے ملا، جہاں سے اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

”تم مت کہو، مگر تمہارا حجاب چیخ چیخ کر یہی کہتا ہے کہ میں بہت اچھی ہوں اور باقی سب برے ہیں۔“ انہوں نے ہاتھ اٹھا کر چمک کر کہا۔ وہ کہیں سے بھی ایک مہذب اور تعلیم یافتہ خاتون نہیں لگ رہی تھیں۔

”اماں! اگر کوئی ایسا سمجھتا ہے تو یہ اس کے اپنے اندر کی ان سیکورٹی ہے۔ میرا کیا قصور؟ میں تو کسی کو برا نہیں سمجھتی۔ میں تو بس، آگ

سے بچنا چاہتی ہوں۔“

”تو یہ سب پہلے کیوں نہیں کرتی تھیں؟ بچپن سے علم تھا تمہیں جہنم کی آگ کا یا نہیں علم تھا؟“

”پہلے صرف علم تھا اماں! اب یقین آ گیا۔“ اس نے بہت سے آنسو اپنے اندر اتارے۔“

کیا لوگوں نے واقعی سمجھ لیا ہے کہ وہ کہیں گے، ہم ایمان لائے اور وہ آزمائے نہ جائیں گے؟

”اچھا! صرف پردہ نہ کرنا گناہ ہے، ماں کی بات نہ ماننا گناہ نہیں ہے؟“ کیا قرآن نہیں پڑھا تم نے کہ والدین کو اف بھی نہیں

کر سکتے؟“

”اس نے جواب میں ایک گہری سانس لی۔

”اماں! آپ کو بھی پتا ہے اور مجھے بھی پتا ہے کہ آپ اس آیت کو غلط جگہ پہ غلط طریقے سے کوٹ کر رہی ہیں۔ میں آپ کو ناراض نہیں

کرنا چاہتی، مگر میں اللہ تعالیٰ کو بھی ناراض نہیں کر سکتی۔“

”بس کرو! پتا ہے مجھے، یہ سب تم جہان کے لیے کر رہی ہو۔ وہی ہے ایسی دقیانوسی سوچ کا حامل۔ ترکی میں رہ کر بھی فرق نہیں پڑا

اسے۔ دیکھتی ہوں میں، کس طرح روزِ فجر پہ مسجد جا رہا ہوتا ہے۔“

”اماں! کوئی لڑکی اپنی مرضی سے حجاب لینے لگے تو سب یہ کیوں فرض کر لیتے ہیں کہ وہ کسی کے دباؤ میں آ کر یہ کر رہی ہے؟ کوئی یہ

ماننے کو تیار کیوں نہیں ہوتا کہ اس لڑکی کا اپنا دل بھی کچھ کہہ سکتا ہے؟“

”مگر پہلے تو تم نہیں کرتی تھیں نا۔“ وہ غصے سے کہتی انھیں۔ ”اور کرو! جس سے بھی کرنا ہے نقاب۔ میں کون ہوتی ہوں کچھ کہنے

والی۔“ وہ فن کرتی باہر نکل گئیں۔

الٹی چھری ابھی تک اس کے دل کو کاٹے جا رہی تھی۔ خون کے قطرے اندر ہی اندر گر رہے تھے۔ مائیں بھی دفعہ کتنا دل دکھاتی

ہیں، مگر انہیں کبھی احساس نہیں ہوتا۔

اس نے آنکھوں کو قطیلی کی پشت سے رگڑا، مگر آنسو پھر بھی ابل پڑے۔

”جاڑے اور بھوک کی تکلیف میں خندق کھودنا کٹھن ہوتا ہے یا بنو قریظہ کی بے وفائی سہنا؟ اس نے خود سے پوچھا۔“ اور اگر یہ دونوں ساتھ مل جائیں تب.....؟“

اس کا دل ابھی تک تکلیف سے رس رہا تھا۔



پریزنیشن اچھی چلی گئی، جبکہ ویرہ کا فنکشن اس سے بھی اچھا۔ آج اس نے نبوی بیلو لباس پہنا تھا اور بڑا سادہ پنڈ ویسے ہی لیا، جیسے ارم کی منگنی۔ پیرا تھا۔ بیٹھی بھی ذرا الگ تھی، مگر یہ نہیں کہ کثرت کر رہی، بلکہ۔۔۔ ایک سے ملی۔ وہی سوال جو اب کا سلسلہ البتہ جاری رہا۔

”جبرے سے تو ہٹاؤ۔“ یہ وہ فقرہ تھا جو حیرت اور اچھبھ سے بہت لوگوں نے آ کر و ہرایا اور جواب میں وہ ایک سادہ مسکراہٹ کے ساتھ کہتی رہی۔

”تھینک یو! میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

البتہ سب کی باتیں دل پہ بہت زور سے لگتی تھیں۔ فاطمہ نے کتنی ہی دفعہ اسے آنکھ سے اشارہ کیا کہ چہرہ پورا کھول لے مگر جواب میں وہ ابرو سے پیچھے کی طرف اشارہ کرتی، جہاں مووی بیکر مووی بنا رہا تھا۔ وہ جھنجھلا گئیں۔

”اوہو! فیلٹی ویڈیو ہے۔ اپنوں میں ہی رہے گی۔ باہر تھوڑی دکھائیں گے۔“

”بالکل!“ وہ اثبات میں سر ہلا کر دوسری جانب دیکھنے لگی۔

صرف شہلا تھی جو اسے یوں ملی جیسے کوئی تبدیلی ہی نہ آئی ہو۔ اس کی آنکھیں البتہ اب بھی ویسی ہی اداس اور نکان سے بھر پور تھیں۔ مگر اب حیا کو جو جانے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اس نے ابھی ایک دو فنکشنز حجاب میں اینڈ کیے تھے، کل فاطمہ سے بحث کی تکلیف کا اثر ابھی تک دل پہ تھا اور شہلا تو پچھلے دو برس سے ہر غمی، خوشی میں اسی طرح شرکت کرتی رہی تھی۔

اور پھر جب انسان کہتا ہے کہ وہ ایمان لایا ہے تو وہ آزما یا بھی ضرور جاتا ہے۔ جانے شہلا کی تکلیف کتنی تھی اور کب سے تھی۔“

سلام ہو ہم اجنبیوں پہ!“ اس نے گہری سانس لیتے ہوئے سوچا۔

شادی کے لیے دوسرے شہروں سے آئے کچھ رشتہ دار تیا فرقان کے گھر ٹھہرے ہوئے تھے۔ تیا نے رات میں سب کا کھانا کیا تھا۔ اس وقت بھی ان کا گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ جب وہ پریزنیشن کا بتانے ان کی طرف آئی۔

لان میں اندھیرا اتر آیا تھا۔ تیا براؤن میں ہی کھڑے تھے۔ اندر جانے والا دروازہ کھلا تھا، مگر آس پاس کوئی نہ تھا۔ اندر سے البتہ گہما گہمی اور رونق کی سی آوازیں آرہی تھیں۔

”آج پریزنیشن اچھی ہو گئی ہے۔ امید ہے پروجیکٹ ہمیں ہی ملے گا۔“

وہ نرمی و بشاشت سے بتانے لگی۔ جو سرد مہری کی دیوار ان دونوں کے بیچ درآئی تھی۔ وہ اسے گراتا جاتی تھی۔ جو بھی تھا، اسے فطری طور پہ اپنے تیا سے بہت محبت تھی۔

”خیر! مجھے تو اتنی امید نہیں ہے۔ تم ٹھیک سے کر کے بھی آئی ہو یا نہیں۔“ وہاں ہنوز رکھائی تھی۔ وہ بہت اکھڑے اکھڑے سے لگ رہے تھے۔

”نہیں تیا ابا! سب بہت اچھا ہو گیا۔ وہ پورا ہوم ورک کر کے گئی تھی۔“

وہ خاموش رہے۔ تے ہوئے ابرو اور ماتھے کے بل۔ وہ اس سے خوش نہیں تھے۔ اس نے ایک اور کوشش کرنی چاہی۔

”اچھا! باقر صاحب بتا رہے تھے کہ سائٹ بی میں وینڈر کچھ مسئلہ کر رہا ہے۔ سلائی روک دی ہے۔ میں سوچ رہی تھی کہ اگر میں خود.....“ وہ ایک دم رکی۔ دروازہ کھول کر داور بھائی باہر آ رہے تھے۔ حیا کسی میکا کی عمل کے تحت دو پٹا دو انگلیوں سے تھوڑی سے اٹھا کر ناک تک لے گئی۔ تیا نے چونک کر اس کی حرکت کو دیکھا اور پھر اندر سے آتے داور بھائی کو، جو اسے دیکھ کر رک گئے تھے، جیسے متذبذب ہوں کہ کھڑا ہوں یا واپس چلا جاؤں۔

”یہ تم کس سے پردہ کر رہی ہو؟“ تیا نے کڑے تیوروں سے اسے دیکھا۔ لمبے بھر کو تو اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

”جی؟“

”تم میرے بیٹے سے پردہ کر رہی ہو؟“

”تایا ابا! میں تو.....“ اس نے کچھ کہنا چاہا، مگر وہ ایک دم بہت بلند آواز میں بولنے لگے۔

”میرے بیٹے آوارہ ہیں؟ لوہر لنگے ہیں؟ بدنیت ہیں؟ کیا کیا ہے میرے بیٹوں نے جو تم ان کے سامنے پردے ڈالنے لگتی ہو؟“ اونچی

غصیلی آواز نے اندر باہر خاموشی طاری کر دی۔

وہ بالکل ساکت سی بنا پلک جھپکے انہیں دیکھ رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہو کیا رہا ہے۔

”تم میرے ہی گھر میں کھڑے ہو کر میرے بیٹوں کو گھسیا اور بیچ ثابت کرنا چاہتی ہو؟ تم میرے بیٹوں کو ذلیل کر رہی ہو۔“ وہ غصے سے

دھماکے۔ داور بھائی نے نفی میں سر ہلایا، جیسے انہیں قطعاً نہ لگا ہو کہ ان کو ذلیل کیا گیا ہے۔

اندر سے لوگ باہر آنے لگے۔ کوئی بچن کے دروازے سے باہر نکلا۔ کوئی برآمدے کے دروازے سے تماشا جگ گیا تھا۔ اور تماشائی جمع

ہو رہے تھے۔

”میرے بیٹوں نے ساری عمر بھائیوں کی طرح خیال رکھا تمہارا۔ اپنا بھائی تو اس کا فرعونیت کے ساتھ منہ کالا کر کے بیٹھ گیا ہے نا! مگر

تم انامیرے بیٹوں کے خلاف محاذ بنارہی ہو؟ پورے ترکی میں آوارہ پھرتے تمہیں پردے کا خیال نہیں آیا تھا؟“

اس کا جیسے سانس رک گیا۔ اسی پل ان کو دیکھا۔ بمشکل وہ چند لفظ کہہ پائی۔

”زائد پچا! آپ تایا ابا کو سمجھائیں، انہیں غلط نہی ہوئی ہے۔ میں تو.....“

”ٹھیک کہہ رہے ہیں بھائی! یہ ڈھکوسلے تم کس کے لیے کرتی ہو؟ پہلے ساری زندگی خیال نہیں آیا، اب کہاں کا اسلام شروع ہو گیا ہے

تمہارا؟“ وہ جوابا ہاتھ ہی غصے سے بولے۔

”پورے خاندان میں ہمارا تماشا بننا کر رکھ دیا۔ سب باتیں بنارہے ہیں کہ حیاتی بی نقاب میں کھانا کھا رہی تھیں۔“

”وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ ارد گرد لگے مجمع کی نظرس، تجقیر، بطر، ذلت۔ اس نے کیا کچھ محسوس نہیں کیا تھا۔

”آپ سب کو کیا ہو گیا ہے؟“ وہ بولنا چاہتی تھی مگر لبوں سے بس یہی نکلا۔“

”تایا! آپ کو تو حجاب بہت پسند تھا۔ آپ تو.....“

”بکواس مت کرو میرے سامنے، اور میری بات کان کھول کر سن لو! اگر تم آئندہ میرے گھر آؤ گی تو منہ لپیٹے بغیر آؤ گی۔ اگر تمہیں

میرے بیٹوں کو اس طرح ذلیل کرنا ہے تو میرے گھر میں آئندہ قدم مت رکھنا۔“

انگلی اٹھا کر متنبہ کرتے وہ سر چہرہ لیے بولے۔ اس سے مزید کھڑ نہیں ہوا گیا۔ وہ ایک دم پلٹی اور اپنے گھر کی طرف دوڑتی چلی گئی۔

پچھے تماشا بنیوں کے مجمع میں کہیں فاطمہ کی تھیں مگر وہ بھی اس کا ساتھ دینے کے لیے آگے نہیں بڑھی تھیں۔ ان سب نے اسے

اندھیری خندق میں تنہا چھوڑ دیا تھا۔

اپنے لان میں وہ برآمدے کی سیڑھیوں پہ بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور قدموں میں سکت

نہیں رہی تھی۔ آنکھوں سے گرم گرم آنسو ابل کر گرتے جا رہے تھے۔

اتنی ذلت؟ اتنی تحقیر، اتنا تماشا؟

یہ تایا فرقاں تھے۔ ساری عمر اس حجاب پہ ہی اختلاف رکھنے والے تایا فرقاں اب حجاب پر ہی اس کے خلاف ہو گئے تھے۔ ان کا دین،

شریعت، سب کدھر گیا تھا؟

اس کی گردن گھٹنوں پہ جھکی تھی۔ وہ روئے چلی جا رہی تھی۔ پورے خاندان کے سامنے تایا نے اسے ذلیل کیا تھا اسے لگا، وہ اب کبھی سر

نہیں اٹھا سکے گی۔

گاڑی کے اندر آنے کی آواز آئی، پھر کوئی اس کے ساتھ آ بیٹھا۔

آج میرا چالان ہوتے ہوئے بچا۔ پوچھو کیوں؟ کسی اور ہی دھن میں محفوظ سنا رہا تھا۔

وہ ایک دم کھڑی ہو گئی۔ جہان نے حیرت سے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیجا ہوا تھا۔

”جیا! کیا ہوا؟ ماموں ٹھیک ہو جائیں گے۔ پریشان مت ہو۔“ اس نے یہی اندازہ لگایا کہ وہ لبا کی وجہ سے رو رہی ہے۔

”کچھ ٹھیک نہیں ہوگا۔ اب کبھی کچھ ٹھیک نہیں ہوگا۔“ وہ روتے ہوئے اتنا ہی کہہ پائی، پھر آنسو ہر منظر پہ غالب آنے لگے وہ پوچھتا رہ گیا، مگر وہ اندر دوڑی چلی آئی تھی۔

پوری رات وہ سو نہیں سکی۔ اتنی ذلت، اتنا تماشا؟ تایا درست بھی ہوتے، پھر بھی یہ کون سا طریقہ تھا بات کرنے کا؟ اب تک پورے خاندان کو پتا چل چکا ہوگا۔ وہ ہر جگہ بے عزت ہو کر رہ گئی تھی۔ رات بھر وہ روتی رہی۔ صبح سر بھاری ہو رہا تھا۔ فریٹش ہونے تک اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ آج وہ اباسے بات کر کے تایا اباکو ان کا اتارنی ان فیکٹ بنا دے گی۔ تایا اباکو مسئلہ اس کے جواب سے نہیں، اس کے آفس آنے سے تھا، سواب وہ یہ سارا مسئلہ ہی ختم کر دے گی۔

ناستے کی میز پر وہ اور فاطمہ اکیلی تھیں۔ سین پھپھو اباکو ناشتا کروا رہی تھیں۔ اور جہاں پتا نہیں کہاں تھا۔

”یہ ہوتا ہے ماں باپ کی مافرمائی کا انجام۔ سارے خاندان میں بے عزتی کروا کر رکھ دی۔“ فاطمہ خفگی سے بولی جاری تھیں۔ وہ سر جھکائے چند لمحے مشکل زہر مار کر سکی، پھر اٹھ آئی۔

ایسے لمحوں میں وہ اس سینینار میں واپس پہنچ جایا کرتی تھی جو اس نے اناطولیئن استنبول میں اٹینڈ کیا تھا۔ اسے ششے کی دیواروں سے لٹکھا کر گرتی چیزیاں یاد آتی تھیں۔ اس نے بھی تو اپنے گرد ایسی ہی دیوار کھڑی کر دی تھی اور یہ لوگ تو ان ہی پرندوں کی طرح تھے۔ پہلے وہ ان کی بات سن لیتی تھی تو وہ دھمکتے تھے کہ اب بھی سنتی رہے گی۔ وہ اس طرح اس کو تھکا نہیں سکتے تھے۔ ششے کی دیواروں سے ٹکرانے میں نقصان پرندوں کا ہی ہوتا ہے۔ دیوار کو کیا فرق پڑتا ہے؟

ابا ہی طرح مخمف و کمزور سے لگ رہے تھے۔ اسے دیکھ کر ذرا سے مسکرائے۔

”کام کیسا جا رہا ہے؟“

”سب ٹھیک ہے ابا!“ اس نے بہت سے آنسو اپنے اندر اتار لیے اور بظاہر مسکرا کر بولی۔

”بہت محنت کر رہی ہے یہ لڑکی!“ پھپھو مسکرا کر کہتی ناشتے کے برتن اٹھا رہی تھیں۔ پتا نہیں، انہیں رات کے واقعے کا علم تھا یا نہیں۔ پھر بھی ان سے نگاہ نہ ملا سکی۔



آفس میں ایک بری خبر اس کی منتظر تھی۔ ٹریڈ سینٹر کا پروجیکٹ انہیں نہیں ملا تھا۔ اس بات نے تو اسے مزید شکست دل کر دیا۔ اس نے باقر صاحب کو بلوایا تا کہ ان کو اپنے ارادے سے آگاہ کر دے اور وکیل صاحب کو بلوا سکے، مگر پہلے اس نے بے اختیار ہی وہ تکلیف دہ موضوع خود ہی اٹھالیا۔

”اتنی اچھی پریزنٹیشن دی تھی، پھر ہمیں پروجیکٹ کیوں نہیں ملا؟“ رات کے واقعے کی تھکن اور اذیت اس کی آنکھوں میں اتر آئی تھی۔

”انہیں ہمارا پلان پسند نہیں آیا۔ وہ شاید کچھ اور چاہتے تھے۔“

”اچھا!“ وہ خاموش ہو گئی۔ کچھ سوچ کر اس نے باقر صاحب سے کوئی بات نہیں کی اور انہیں بھیج دیا۔ ان کے جانے کے بعد اس نے سارا پروجیکٹ پلان نکالا اور اسے نو جائزہ لینے لگی۔ ٹھیک ہے کہ وہ آج آفس چھوڑ دے گی اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ اسے ان معاملات کا کوئی تجربہ نہیں، مگر وہ صرف یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ اس سے غلطی کہاں ہوئی۔

تمام خاکے اچھے تھے۔ بقول آرکیٹیکٹ بے حد شان دار۔ مگر جب اس نے پہلی دفعہ ان کو دیکھا تھا تو اس کے ذہن میں کیا بات آئی تھی؟ کچھ غیر آرام دہ لگا تھا اسے۔ اس نے ذہن پہ زور دیا اور ایک دم کسی بہتی ندی کی طرح وہ خیال اٹھ آیا۔

موت کا کنواں۔

اور اگلے ہی لمحے اسے غلطی نظر آ گئی۔

داور بھائی کی شادی کی کچھ شاپنگ فاطمہ اور اس نے لاہور سے کی تھی۔ کسی کام سے وہ شاہ عالمی مارکیٹ چلے گئے۔ غلطی یہ کہ اپنی کار لے گئی۔ وہاں ایک مٹی اسٹوری پارکنگ بلڈنگ میں کالہ پارک کرنا پڑی، وہ بھی چوتھی منزل پہ۔ گول گول گھومتی منزلیں، تنگ تاریک جگہ، گاڑی اوپر چڑھانا گویا یوں تھا جیسے موت کے کنوئیں میں ڈرائیو کرنا۔ تب سے اسے مٹی اسٹوری پارکنگ عمارات بہت بری لگتی تھیں اور اب اس کے پلان میں ٹریڈ سینٹر کی پارکنگ ایک چھوٹے رقبے پہ مٹی اسٹوری بنائی گئی تھی۔

اسے تعمیراتی کاموں کا تجربہ نہ تھا۔ مگر شاہنگ کا ایک طویل اور وسیع تجربہ تھا، پھر یہ اتنی بڑی غلطی اسے پہلے کیوں نظر نہیں آئی؟ شاید اس لیے کہ وہ پہلے خود کو کم علم سمجھ کر آرکیٹکٹ پہ بھروسہ کر رہی تھی۔ انڈھی تقلید، مگر اب اپنی عقل سے سوچا تو چونک گئی۔ لوگ ایک کھلا اور ”زمینی“ پارکنگ لٹ پسند کرتے اور ملٹی اسٹوری پارکنگ بلڈنگز تو ادھر کم ہی بنتی ہیں۔ پھر آرکیٹکٹ نے ایسا کیوں کیا؟

وہ جاتی رہی ہے تو ذرا ان صاحب سے دو ٹوک بات تو کر لے۔ یہی سوچ کر وہ باہر آئی۔ ترکوں سے اس نے خود چل کر جانا سیکھا تھا۔ وہاں کسی سے راستہ پوچھو تو وہ آپ کے ساتھ چل کر اخیر منزل تک چھوڑ آتا تھا۔ سو وہ خود آرکیٹکٹ صاحب سے ملنے چلی آئی، لیکن کوریڈور کے سرے پہ وہ ایک دم پیچھے ہوئی۔

ولید اور آرکیٹکٹ رضوان صاحب کسی بات پہ ہنستے ہوئے اندر جا رہے تھے۔ وہ اگلے قدموں واپس آئی۔ ایک سرخ بتی جلنے بجھنے لگی تھی۔ کہیں کچھ غلط تھا۔ کوئی گڑبڑ تھی۔

واپس اپنی سیٹ پہ بیٹھی، وہ کتنی ہی دیر سوچتی رہی۔ پھر اپنے پرس میں موبائل کے لیے ہاتھ ڈالا تو وہ محفل کا ٹکڑا بھی نظر آ گیا جس پہ سنہری دھماگے سے دو الفاظ لکھے تھے۔ وہ اسے دو انگلیوں سے گھمائی، الٹ پلٹ کرتی، سوچتی رہی۔ فرار ہر مسئلے کا حل نہیں ہوتا۔ مسئلہ کا حل ڈھونڈنا پڑتا ہے، راستہ تلاش کیا جاتا ہے۔ منجبر احمد کا سبق اسے یاد تھا۔

چند منٹ میں اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ وہ پھر سے کام کرنے کے لیے تیار تھی۔ کوئی اس کے باپ سے غداری کر رہا تھا۔ اسے ساری گڑبڑ کے منبع کو ڈھونڈنا تھا۔



کافرنس روم میں سب جمع تھے۔ وہ بنا کسی کو دیکھے سر برانی کرسی پہ آ کر بیٹھ تو گئی تھی، مگر سر اٹھا کر تایا فرقان، داور اور زاہد چچا کو دیکھتا، ان سے نگاہ ملانا کتنا اذیت ناک تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا۔ رات کے رخصوں سے پھر سے خون رسنے لگا تھا۔ مگر وہ کتنے آرام سے اس کے سامنے بیٹھے تھے، جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

”تو آپ نے پروجیکٹ ہار دیا۔“ تایا فرقان نے نخوت بھری سنجیدگی سے اسے مخاطب کیا۔

اس نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا۔ وہ تایا فرقان کی بیٹی کی طرح رات گئے پکڑی نہیں گئی تھی۔ (جیسا کہ تایا نے ایک دفعہ اسے فون کیا تھا) کہ وہ سر اٹھانہ سکتی۔ نہ ہی وہ زاہد چچا کی بیٹی کی طرح پورے خاندان میں چیخ چلا کر داور بھائی کو بے عزت کرنے کی مجرم تھی۔ زاہد چچا نے اسے سخت سناٹے ہوئے اپنی بیٹی کی حرکت کو کیوں فراموش کر دیا؟ اور تایا نے بھی کبھی داور کی اس بے عزتی پہ باز پرس کی؟ پھر اب.....؟ مگر وہ تجابی لڑکی تھی اور کوئی تجابی لڑکی یہ کتنا ہی کچھرا اچھا لڑنے کی کوشش کرے اسے میلا نہیں کر سکتا تھا۔

”جی ساریں! نے ہار دیا۔“ تایا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس نے سپاٹ انداز میں کہا۔

”کیا آپ جتنا پسند کریں گی؟“ ولید کی بات پہ اس نے گردن موڑ کر اسی سنجیدگی سے اسے دیکھا۔

”میں آپ کو جواب دہ نہیں ہوں ولید صاحب۔“

”درست! پھر میں آپ کو مطلع کرنا چاہوں گا کہ ہم گرین ہاؤس اسکیم والا پروجیکٹ ڈیلے (Delay) کرنے پہ مجبور ہو چکے ہیں۔“

”کیوں؟“ وہ چونکی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ کتنا اہم پروجیکٹ تھا۔

”کیونکہ بجٹ نہیں ہے۔ فنڈز کم پڑ رہے ہیں۔ ہمارے پاس اس کو کیری آن کرنے کے لیے اتنا پیسہ نہیں ہے۔“ اس نے ایک کاغذ

حیا کی طرف بڑھایا، جس پہ ایک لمبا سا فیکر لکھا تھا۔

”اقتی رقم کا انتظام کیسے ہوگا؟ وہ بج میں مضطرب ہو گئی۔

”مگر اس طرح پروجیکٹ بند کرنے سے تو بہت نقصان ہوگا۔“

”پھر کیا کریں؟“

”یہ میرے ابا کا پروجیکٹ تھا۔ ہم اس کو یوں کال آف نہیں کر سکتے۔“ وہ فکر مندی سے کہہ رہی تھی۔

”تم ہمیں یہ اماؤنٹ لا دو۔ ہم اس کو جاری رکھیں گے، بات ختم۔“ زاہد چچا نے بے زاری سے کہا۔ وہ دونوں تایا، چچا سے یوں مخاطب

کرتے تھے، گویا وہ ان کے بھائی کی بیٹی نہیں، ملازمہ ہو۔

”واقعی؟“ اگر میں آپ کو یہ اماؤنٹ لادوں تو آپ کام جاری رکھیں گے؟ کیا آپ زبان دے رہے ہیں؟“ اس کا لہجہ تیز ہو گیا۔ ان کا پہنچ کرنا، مذاق اڑانا انداز سے پہلے سے زیادہ برا لگا تھا۔ رات کے زخم پھر سے کھرنے لگے تھے۔

”بالکل!“ تاپا فرقان نے شانے جھٹکے۔

”ٹھیک ہے! میں ہیر کی صبح آپ کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر دوں گی۔“ وہ فائل بند کرتے ہوئے حتیٰ انداز میں بولی۔

پھر جب وہ اپنے آفس واپس آئی تو موبائل بج رہا تھا۔ اس نے کرسی پر تھکے تھکے انداز میں گرتے ہوئے فون اٹھایا۔ نمبر جہان کا تھا۔

”کیسی ہو؟“ وہ چھوٹے ہی ٹکڑے مندی سے پوچھنے لگا۔

”ٹھیک ہوں۔“ اس نے اٹکیوں سے پیشانی مسلتے ہوئے جواب دیا۔ بے خوابی کے باعث سر بے حد درد کر رہا تھا۔

”چلو! پھر لچ سا تھکرتے ہیں۔ میں نے ایک چھوٹا سا انٹالین ریسنورٹ دیکھا ہے۔ تمہیں ایڈریس سمجھاؤں؟“

سارے دن میں وہ پہلی دفعہ ہنسی تھی۔

”یہ میرا شہر ہے جہاں بے! مجھے اس کے سارے رستے معلوم ہیں۔ ریسنورٹ کا نام بتاؤ۔“ وہ بھی ہلکا سا ہنس دیا۔

”اوہ سوری! ایف ٹین میں انٹالین اوون پہ آ جاؤ۔“

☆ ☆ ☆

کارڈرائیور چلا رہا تھا۔ وہ بچھلی نشست پر بیٹھی سیل فون پر نمبر ملا رہی تھی۔ اس نے ابا کی نصیحت پر عمل کرنے کا سوچا تھا۔ کال ملا کر اس نے فون کان سے لگایا۔ صد شکر کہ انہوں نے کال ریسو کر لی۔

”السلام علیکم ذیشان! میں حیاتاں اٹکل! میں حیاتاں کر رہی ہوں۔“

کارڈریفک کے ساتھ بہتی چلی جاری تھی۔ اسی طرح اس کے سننے، پریشان اعصاب ڈھیلے پڑتے جا رہے تھے۔ ان سے بات ختم کی تو آفس سے فون آ گیا۔ وینڈر مال کی سلائی کھولنے پہ تیار تھا اور پرانی قیمت پہ تو ہرگز نہیں۔ سراسر بلیک میلنگ تھی اور بلیک میلرز سے تو اسے نفرت تھی۔

”کل میری مینٹگ اسٹیج کروا دیں وینڈر سے۔ میں ان صاحب سے خود بات کرنا چاہوں گی۔“ اس نے بند کر دیا۔ کارڈریسنورٹ کے سامنے آکھڑی ہوئی تھی۔

وہ اطالوی ریسنورٹ کی بالائی منزل کی سیڑھیاں چڑھتی اور آئی۔ دوپہر کا وقت تھا۔ تمام میزیں خالی تھیں۔ ہال کی ایک دیوار شیشے کی بنی تھی، جس سے نیچے ڈبل روڈ اور اس کے پار گرین بیلٹ کے درخت و سبزہ نظر آ رہا تھا۔ شیشے کی دیوار کے ساتھ کونے کی میز پر وہ بیٹھا تھا۔ اسے آتے دیکھ کر وہ دھیرے سے مسکرایا۔ وہ ہانسی دقت کے اسے نقاب میں پہچان لیتا تھا۔ پہلی دفعہ جب وہ نقاب میں اس کے پاس لگی تھی، فریڈم فلوئڈا کے احتجاج کے دن، تب بھی اس نے کوئی جبرانی ظاہر نہیں کی تھی۔ شاید وہ حیران کم ہی ہوتا تھا۔

”پہلے فیصلہ کر لو کونج کس کی طرف سے ہے؟“ کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے اس نے میز پر اپنا پرس رکھا۔

”آف کورس! تمہاری طرف سے ہے۔ اصغر اینڈ سنز کی قائم مقام ایم ڈی مجھ غریب آدمی کو کونج تو کر دے سکتی ہے۔“

”شیور!“ اس نے بشارت سے کہتے ہوئے موبائل پرس میں رکھنے کے لیے پرس کھولا۔ ٹھیل کا ٹکڑا اندرونی جیب میں ہزار کے ایک نوٹ کے ساتھ رکھا تھا۔

ہزار کا نوٹ؟ وہ زپ بند کرتے ہوئے چونکی۔ پھر بنا محسوس سے انداز میں پرس کو اندر سے دیکھا۔ اس کا روپوں والا پاؤچ آفس میں ہی رہ گیا تھا۔ اب سوائے اس لاوارث سے نیلے نوٹ کے اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔ اللہ، اللہ کا روبرا کی الجھنوں میں پاؤچ اٹھانا یاد ہی نہیں رہا۔

اب کیا کرے؟

”کیا ہوا؟ ایم ڈی صاحب! پیسے تو نہیں بھول آئیں؟“ وہ مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا۔ ایک تو اس آدمی کی عقابانی نظریں، اس نے سنبھل کر پرس بند کیا۔

”تم ایم ڈی صاحب سے ایسی غیر ذمہ دارانہ حرکت کی توقع کر سکتے ہو؟ بظاہر مسکراتے ہوئے وہ سیدھی ہوئی۔

”نہیں! خیر! روڈ کر دو تمہارا شہر ہے۔ تمہیں زیادہ پتا ہوگا۔“ وہ پیچھے ہو کر بیٹھ گیا۔

جیانے ”شیور“ کہتے ہوئے میوہ کارڈ اٹھا لیا۔ اس کو کونج کر دانا تھا اور وہ بھی ہزار کے نوٹ سے۔ اسے ٹی ایم بھی پاؤچ میں تھا اور وہ کوئی

ایسی حرکت نہیں کر سکتی تھی، جس سے جہان کو پتا چلے کہ وہ پیسے واقعی بھول آئی ہے، ورنہ ادا نیکی کر دے گا۔ سوال انا کا تھا۔
 ”لیکن ایک ہزار میں اسے اٹالوئی بیچ کیسے کرواؤں؟“ اس نے قدرے اضطراب سے فہرست دیکھی۔
 ”سنو! صرف مین کورس منگوانا، سلاوا، اشار ٹراورڈرنگس کے فالتو اخراجات مجھے پسند نہیں ہیں۔“ وہ کرسی کی پشت سے ٹھیک لگائے، مسکراہٹ دبائے اسے بغور دیکھتا کہہ رہا تھا۔

”اوکے! مجھے تو کوئی خاص بھوک نہیں ہے، دل ہی نہیں چاہ رہا۔“ آرڈر دے کر اس نے کارڈ رکھ دیا۔ جہان نے مسکراہٹ دبا تے ہوئے سمجھ کر سر ہلادیا۔ چند لمحے خاموشی کی نذر ہو گئے۔ وہ ششے کی، یوار سے باہر دیکھنے لگی۔ اس ششے سے تو کوئی پرندہ نہیں آنکرایا تھا۔ شاید پرندے تعمیر کے بعد صرف پہلے موسم میں ٹکراتے ہوں۔ بعد میں عادی ہو کر راستہ بدل لیتے ہوں۔ راستہ پرندوں کو ہی بدلنا پڑتا ہے، دیوار ویسی ہی کھڑی رہتی ہے۔

”کل کیا ہوا تھا؟“

”جیانے نگاہیں موڑ کر اسے دیکھا۔

”اب تک تم نے پتا تو کر ہی لیا ہوگا۔ بہر حال! تایا نے سارے خاندان کے سامنے میرے پردے کی وجہ سے مجھے بے عزت کیا، تماشا بنایا اور گھر سے نکال دیا۔ اس کے علاوہ کچھ خاص نہیں۔“
 جہان نے قدرے تاسف سے نفی میں سر ہلادیا۔
 ”پرانی عادتیں آسانی سے نہیں جاتیں۔ اس طرح لوگوں کو ذلیل کرنے کے وہ عادی ہیں۔ کتنا آسان ہے ان کے لیے اپنی انا کے پیچھے رشتے توڑ دینا۔“

”جو بھی ہے، میں ابا کی کرسی ان کے لیے خالی نہیں کروں گی۔ یہ فیصلہ میں نے کر لیا ہے۔ اب اس قصے کو بند کر دیتے ہیں۔ تم بتاؤ! تم نے ترکی واپسی کا کیا سوچا ہے؟“

”سب مجھ سے یہی پوچھتے ہیں کہ واپسی کا کیا پروگرام ہے۔ لگتا ہے مجھ سے تنگ آگئے ہیں۔ دل کرتا ہے میرا کہ ”ماہ سن“ کی طرح کبوتر بن کر کسی غار میں چھپ جاؤں۔“ اس نے غالباً کوئی ترک محاورہ بولا تھا۔
 ”خیر! ابھی کچھ دن ادھر ہوں۔ تمہیں کب جانا ہے؟“

”جولائی شروع ہو چکا ہے۔ مجھے پانچ جولائی کے بعد کلیئرس کروانی ہے۔ ابا کی طبیعت ذرا سنبھل جائے، پھر جاؤں گی۔“
 ”بیچ آگیا تو وہ اپنے نقاب سے بے آسانی چھری کاٹنے کی مدد سے کھانے لگی۔ پھر کسی خیال کے تحت پوچھا۔
 ”جہان! تمہیں میرا نقاب..... میرا مطلب ہے تمہیں اچھا لگتا ہے میرا یوں نقاب لینا؟“
 وہ ذرا چونکا تھا۔

”آ..... ہاں! ٹھیک ہے۔“ اس نے ذرا الجھتے ہوئے شانے اچکائے۔ وہ مطمئن ہو کر کھانے لگی، مگر وہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا تھا۔
 بل آیا تو اس نے ایک مطمئن سی سانس اندر کو اتاری۔ نو سو پچاس صرف دو مین کورس منگوائے تھے اس لیے۔ ثابت ہوا کہ اگر پیسے ہوں تو بندے کو لڈو ڈرنگس، سلاوا اور اشار ٹریجیسے فالتو لوازمات سے پرہیز کرنا چاہیے۔

یکایک کسی خیال کے تحت وہ چونکی۔

”فالتو لوازمات؟“ اس کا ذہن آفس کی طرف بھٹک گیا۔ جہان نے نرمی سے اس سے بل لے لیا۔

”میں بے کروں گا۔“

وہ چونکی۔ ”نہیں یہ تو مجھے.....“

”میں مذاق کر رہا تھا، بیچ میری طرف سے تھا۔“ وہ بنا ایک لفظ سے فائل میں پیسے رکھنے لگا۔ اس نے اصرار نہیں کیا۔ اس کا ذہن کسی اور ہی طرف الجھا تھا۔

”فالتو لوازمات؟“

ادھیڑ عمر صاحب نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور پھر ایک طرف ہٹ گئے۔ وہ پر اعتماد اور سبک قدموں سے چلتی اندر آئی۔ دروازے سے نجی صاحب (وینڈر) کی کرسی میز کا فاصلہ کافی زیادہ تھا۔ وہ سیدھ میں چلتی میز تک آئی اور بیٹھنے کے لیے کرسی کھینچی۔
 نجی صاحب نے اگلیوں میں پکڑی سکریت لبوں میں دبا کر سانس اندر کو کھینچی اور سر سے پاؤں تک سیاہ عبایا میں ملبوس دروازہ لڑکی کا جائزہ لیا جو بہت اطمینان سے کرسی کھینچ کر بیٹھ رہی تھی۔ انہوں نے سکریت ہٹائی، مویں کا مرغولہ اڑ کر فضا میں تحلیل ہوا۔
 ”میں حیا سلیمان ہوں، اصغر اینڈ سنز کی فینیک ڈائریکٹر.....“ کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر، ٹانگ پر ٹانگ رکھے کہنیاں ہاتھ پر جما کر، تحلیلیاں ملائے بیٹھی وہ بہت سنجیدگی سے بولی۔

نجی صاحب نے کندھوں کو ذرا سی جنبش دی، یعنی وہ جانتے ہیں، اب آگے بات کرے۔ ادھیڑ عمر صاحب اس لڑکی کے پیچھے ہاتھ باندھے مؤدب سے اکھڑے ہوئے تھے۔ ان کے لیے دوسری کرسی موجود نہیں تھی۔ نجی صاحب نے کرسی منگوانے کی ضرورت بھی نہ سمجھی۔
 ”ہماری سائٹ پہ پلائی آپ نے روک دی ہے جس سے ہمارا پروجیکٹ تاخیر کا شکار ہو سکتا ہے۔“
 ”دیکھیں بی بی! میں نے اپنی ڈیمانڈ آپ کے.....“
 ”بھری بات ابھی ختم نہیں ہوئی نجی صاحب!“ اس نے ہاتھ اٹھا کر ایک دم بہت سخت لہجے میں انہیں روکا۔ اس کی آواز میں کچھ تھا کہ وہ رک گئے۔

”چند باتیں ہیں جو میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں۔“ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بنا کسی تمہید کے وہ کہہ رہی تھی۔
 ”آپ کے پیچھے جو کھڑکی ہے، اس سے جھانک کر دیکھیں تو دائیں جانب، دور کہیں ایک زیر تعمیر منصوبہ دکھائی دے رہا ہے۔ کس چیز کا منصوبہ ہے وہ باقر صاحب؟“ لڑکی نے رک کر پیچھے کھڑے آدمی کو مخاطب کیا مگر دیکھ وہ ابھی تک نجی صاحب کو رہی تھی۔
 ”اور ہیڈ ہے میم!“ انہوں نے فوراً بتایا۔

”بالکل! اور ہیڈ تعمیر ہو رہا ہے وہاں اور کیا آپ جانتے ہیں کہ اس میں سینڈ (Sand) اور سلیٹ (Slit) استعمال ہو رہا ہے، اور وہ بھی کس کی جگہ؟ (Crusher) میٹرل کی جگہ!“

نفیس سے نقاب سے جھلکتی اس کی بڑبڑی، سیاہ آنکھیں مسکرائی تھیں۔ نجی صاحب نے سکریت والا ہاتھ نیچے کر دیا ان کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑ چکے تھے اور وہ پوری طرح سے اس کی طرف متوجہ تھے۔

”آپ اس اور ہیڈ سے دو گوی میٹر دائیں چلے جائیں۔ تو ایک سکس اسٹار ہٹل زیر تعمیر نظر آئے گا، اس کی تعمیل آخری مراحل میں ہے، مگر اس کے مالکان کو یہ علم نہیں ہے کہ اس کی روفنگ (roofing) اور وائر پروٹنگ میں سب اسٹینڈرڈ میٹرل استعمال کیا گیا ہے۔ بے حد سستا اور گھٹیا میٹرل۔“ اس کی مسکرائی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی تھی۔

نجی صاحب نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے، مگر اس نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔
 ”میری بات ابھی ختم نہیں ہوئی۔“

وہ لب بھیج کر رہ گئے۔ پیشانی پر بلوں کا اضافہ ہونے لگا۔

”ایک روڈ بھی حال ہی میں مکمل ہوئی ہے اور اس کا بھی ان دونوں پروجیکٹس سے تعلق ہے۔“ لگا ہیں ان پہ جمائے وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ”اور جو تعلق ہے، وہ آپ بہتر جانتے ہیں، میں تو بس اتنا جانتی ہوں کہ اس سڑک کے اطراف کو سیمینٹڈ (Cemented) نہیں کیا گیا اور اندر ہونے چھوڑ دیے گئے ہیں۔ وہ کون سا مسئلہ ہوگا جو سب سے پہلے چند دن میں منظر عام پہ آئے گا باقر صاحب؟“

نجی صاحب اپنے سابقہ انداز میں دیکھتے ہوئے اس نے اپنے ساتھی کو مخاطب کیا۔ وہ اسی تابع داری سے بولے۔

”ڈیرین ایچ کا مسئلہ میم!“

”بالکل! ڈیرین ایچ کا مسئلہ۔ مگر سب سے بڑا مسئلہ کون سا ہوگا؟ انپکشن کا مسئلہ۔ چار انپکشن ٹیمیں ان تینوں پروجیکٹس کو چند روپے رشوت لے کر اپروور کر چکی ہیں، لیکن وہ کیا ہے نجی صاحب! کہ جو ہمارا میڈیا ہے، وہ ذرا سی ریننگ کے لیے ایسی خبروں کو خوب اچھالتا ہے اور یوں اس وینڈر کی ساکھ تباہ ہو کر رہ جاتی ہے، بالخصوص تب جب ان کے ہاتھ ڈاکو مغذ پروف بھی لگ جائے۔ باقر صاحب!“

اس نے انگلی سے اشارہ کیا تو باقر صاحب نے چند کاغذات میز پر رکھے فحشی صاحب ان کو اٹھانے کے لیے آگے نہیں بڑھے۔ وہ بشکل ضبط کرتے ہوئے بولے۔

”مجھ پہ ہاتھ ڈالنا آسان نہیں ہے۔“

”ارے!“ اس کی سیاہ آنکھوں میں حیرت ابھری۔ ”آپ کی بات کس نے کی؟“ پھر وہ ذرا سا مسکرائی۔ ”میں تو اپنی سپلائی کی بات کر رہی تھی۔ کل ہفتہ ہے۔ میں امید کرتی ہوں کہ سووماری صبح مجھے اپنی کنسرکشن سائنٹ پہ سپلائی کی بحالی کی خبر مل جائے گی۔“ اپنا پرس اٹھاتے ہوئے وہ کھڑی ہوئی۔

”اور وہ بھی میری پرانی قیمت پہ۔ چلیں باقر صاحب!“

وہ مزید کچھ کہے، ہانپتی اور غیر صاحب نے ہاتھ آگے بڑھا کر دروازہ کھولا۔ وہ ان ہی سبک قدموں سے چلتی باہر نکل گئی۔ سگریٹ نے فحشی صاحب کی انگلی کو جلایا تو وہ چونکے، پھر غصے سے اسے الٹش ٹرے میں پھینکا اور میز پر رکھے کاغذات اٹھاے۔ جیسے جیسے وہ انہیں پڑھتے جا رہے تھے، ان کی پیشانی پہ پینے کے قطرے نمودار ہونے لگے تھے۔

☆ ☆ ☆

”مجھے آپ کو ایک اچھی خبر دینی تھیں جنٹلمین!“ میٹنگ کے آغاز پہ اس نے مسرور مطمئن انداز میں انہیں مخاطب کیا جو اپنے سابقہ رویے کو برقرار رکھے اس کی طرف متوجہ تھے۔

”ابھی ابھی پتا چلا ہے کہ وینڈر عارف فحشی نے سپلائی بحال کر دی ہے اور وہ بھی پرانی قیمت پہ۔“

”واقعی؟“ فرقان تایا حیران ہوئے تو زاہد چچا سیدھے ہو بیٹھے۔

”مگر اس نے تو اس روز فنانس ڈیپارٹمنٹ کے رؤف صاحب سے خاصی بدتمیزی کی تھی اور وہ سراسر بلیک میلنگ پہ اترا ہوا تھا۔ میں نے خود اسے فون کیا تھا مگر وہ تو سیدھے منہ بات کرنے کا روادار بھی نہیں تھا۔“

”پھر آپ کو بلیک میلرز سے پنپنے کا فن سکھ لینا چاہیے سر! کیونکہ میں نے اس سے بات کی ہے اور وہ غیر مشروط طور پہ سپلائی بحال کرنے پر راضی ہو گیا ہے۔“

زاہد چچا خاموش ہو گئے۔ ان کے لیے یہ سب خاصا غیر متوقع تھا۔ اگر سلیمان صاحب ان کو آکر بتاتے کہ انہوں نے وینڈر کو راضی کر لیا ہے تو انہیں حیرانی نہ ہوتی، کیونکہ وہ اس قابل تھے، تب ہی تو اپنے بڑے بھائی سے زیادہ مضبوط شیئر ہولڈر اور ایم ڈی تھے، مگر حیا.....؟ یہ بات نگنا بھی دشوار تھا۔

”آپ کو گرین ہاؤس اسکیم کے لیے بجٹ کم پڑا تھا، اس لیے میں نے بجٹ کوری شیپ کیا ہے۔“ وہ اپنے کاغذات آگے پلٹ کر بتانے لگی۔ ”ہمیں چھٹی رقم چاہیے، وہ ہمارے بجٹ کے اندر ہی پوری ہو سکتی ہے، اگر ہم فالو لوامت کو نکال دیں۔“

”مطلب؟“ تایا فرقان نے ابرو اٹھاے۔

”ہم ہرسال تمام شیئر ہولڈرز کو سالانہ پروفٹ کا ایک منقسم حصہ دیتے ہیں، جبکہ بہت سی کمپنیاں شیئر ہولڈرز کو سالانہ پروفٹ dividend دینے کے بجائے اس کو ری انویسٹ کرتی ہیں۔ ہم بھی اس دفعہ شیئر ہولڈرز کو وہ حصہ دینے کے بجائے اسے اس پروجیکٹ میں لگا دیں گے۔“

”مگر اس طرح تو مطلوبہ رقم پوری نہیں ہوگی۔“

”ولید! آپ ان کو بات مکمل کرنے دیں۔“ سبھی صاحب نے پہلی دفعہ ولید کو ٹوکا۔ پہلی دفعہ بورڈ میٹنگ میں اس کی سائیڈ لی گئی تھی۔ سب خاموش ہوئے تو اس نے کہنا شروع کیا۔

”ہم اپنے بجٹ کا پندرہ سے بیس فیصد حصہ مارکیٹنگ اور ایڈورٹائزمنٹ پر خرچ کرتے ہیں۔ ہم فی الحال بھی یہی کر رہے ہیں۔ ہم مارکیٹنگ کر رہے ہیں تاکہ مستقبل میں ہمیں پروڈیکٹس ملیں۔“ وہ لمحے بھر کو کی۔ لمبی میز کے گرد موجود تمام ایگزیکٹو ذاب وقتاً بوقتاً اس سے رہے تھے۔ ”مستقبل کے پروڈیکٹس جو ابھی ملے نہیں اور جن پہ کام کرنے کے لیے ہمارے پاس پیسے نہیں، ان کے لیے ہم اپنے حالیہ پروجیکٹ کو قربان نہیں کر سکتے۔ میں نے مارکیٹنگ بجٹ کو کھٹا کر پانچ فیصد کر دیا ہے۔ یوں ہم یہ آسانی دم آہستہ آہستہ اس پروجیکٹ میں منتقل

کر سکتے ہیں۔ کیا کسی کو کوئی اعتراض ہے؟“
 پیچھے ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے اس نے ذرا مسکرا کر خاموش پڑے کانفرنس روم پہ نگاہ دوڑائی۔ وہ جانتی تھی کہ اب کوئی اس پہ اعتراض نہیں کر سکتا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اپنا انتخاب درست ثابت کر رہی تھی۔

☆ ☆ ☆
 آج تا یا فرقان کے گھر حیا کے دادا کی بری کی قرآن خوانی تھی۔ خیرات کی دیکھیں الگ تھیں۔ سب مدعو تھے، سوائے اس کے۔ اس کو جانے کی خواہش بھی نہیں تھی۔

وہ مغرب پڑھ کر لاؤنج میں آئی تو فاطمہ، جہان سے کچھ کہہ رہی تھیں۔ اسے آتے دیکھ کر خاموش ہو گئیں۔
 ”اچھا! میں جا رہی ہوں۔“ سرسری سامنے کر کے وہ باہر نکل گئیں۔ پچھو پہلے ہی جا چکی تھیں۔ ابا کرے میں سو رہے تھے۔ ان کے پاس نہ تھی۔

وہ خاموشی سے صوفے پہ آ بیٹھی اور بی وی کار میوٹ اٹھایا۔ ٹیکھیوں سے اس نے لاؤنج کی بڑی کھڑکی کے پار اماں کو لان عبور کرتے دیکھا۔ وہ اس سے ناراض نہیں تھیں، بات بھی ٹھیک سے کرتیں، مگر ایسے جیسے کہ انہیں بہت دکھ پہنچا گیا ہو۔
 باہر بجلی زور کی ہنسی۔ پل بھر کو کھڑکیوں کے باہر سارا لان روشن ہو گیا۔ پھر اندھیرا چھا گیا۔
 وہ کچھ سوچتے ہوئے اس کے سامنے آ بیٹھا۔ حیا نے بی وی نہیں چلایا۔ وہ ری میوٹ پکڑے بیٹھی بس اس کو دیکھتی رہی۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا شاید۔

”اماں کیا کہہ رہی تھیں؟“ اس نے بظاہر سرسری سے انداز میں پوچھتے ہوئے بات کا آغاز کیا۔ جہان نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ نیلی جینز پہ سیاہ ٹی شرٹ پہنے، گیلے بالوں کو پیچھے کیے، وہ جیسے کہیں جانے کے لیے تیار لگ رہا تھا۔
 ”وہ چاہتی ہیں کہ میں تمہیں سمجھاؤں کہ تم یہ برقع وغیرہ چھوڑ دو۔“ وہ سنجیدگی سے کہنے لگا۔ اس کی پشت پہ لاؤنج کی دیوار گیر کھڑکی پہ ٹپ قطرے گرنے لگے تھے۔ تاریک پڑا آسمان پہلے ہی بادلوں سے ڈھک چکا تھا۔

”تو تم نے کیا کہا؟“ وہ اسی طرح مطمئن سے انداز میں ناگنگ پناگنگ رکھے بیٹھی تھی، جیسے وہ اپنے آفس میں بیٹھا کرتی تھی۔
 ”بات تو ٹھیک ہے ان کی۔ تم ایک برقعے کے لیے اپنے اتنے رشتے نہیں کھو سکتیں۔“
 باہر بادل زور سے گرجے تھے۔ کھڑکی کے شیشوں پہ تڑا تڑکرتے قطرے کی اب آوازیں آنے لگی تھیں۔
 ”دوسروں کو چھوڑو، تم اپنی بات کرو جہان۔ کیا تم بھی میرے جواب سے خوش نہیں ہو؟“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی تو اس کی آواز بہت دھیمی تھی۔

”اگر میں کہوں کہ میں نہیں ہوں تب؟ اگر میں کہوں کہ تم میرے لیے اسے چھوڑ دو، تب؟“
 ”دروغ کہیں زوردار آواز آتی تھی۔ جیسے بجلی گرنے کی ہوتی ہے۔ جیسے صدمہ پہنچنے کی ہوتی ہے۔“
 ”کیا تم مجھے چو آؤں دے رہے ہو؟“ یکا یک اس کی آواز میں سرد مہری دوڑائی۔
 ”اگر میں کہوں، ہاں تب؟“

وہ اٹھی اور چھوٹے چھوٹے قدموں سے چلتی دیوار گیر کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ اس نے سیاہ لمبی قمیص اور چوڑی دار پہن رکھا تھا۔ بال بھی سیدھے کرپے کر رہے تھے۔ قمیص اور بالوں کے رنگ کا فرق غیر واضح سا تھا۔ سیاہی جس کا نہ آغاز تھا نہ اختتام۔
 ”مجھے کبھی کسی نے کہا تھا کہ خندق کی کوئی جنگ بنو قریظہ کے بغیر وجود میں نہیں آئی اور تب میں نے سوچا تھا کہ میرے سارے قرابت دار تو میرے ساتھ ہی ہوں گے۔“ وہ ہنسنے لگی۔
 ”پار تاریک لان کو دیکھتی کہہ رہی تھی۔“

”تایا، اباجاب کے سب سے بڑے علم بردار، اماں جن کی ہمیشہ سے خواہش تھی کہ میں اللہ تعالیٰ کے قریب ہو جاؤں اور میرا شو ہر جو روز منہ فخر پڑھے مسجد جاتا ہے، لیکن آج مجھے پتا چلا کہ عائشہ ٹھیک کہتی تھی۔ خندق کی جنگ بنو قریظہ کے بغیر وجود میں آ ہی نہیں سکتی۔“
 بارش کے ٹپ ٹپ گرتے قطرے شیشے سے لڑھک کر زمین پہ گر رہے تھے جب بجلی چمکتی تو پل بھر کو ان میں تو س قزح کے ساتوں رنگ چمکتے اور پھر اندھیرا چھا جاتا۔ وہ صوفے سے نہیں اٹھا تھا۔ بس گردن موڑ کر اسے دیکھنے لگا۔

”اگر میں لوگوں کے لیے حجاب لیتی ہوتی تو لوگوں کے کہنے پہ چھوڑ بھی دیتی، لیکن میں اب نہیں چھوڑ سکتی۔“ آنسو اس کی آنکھ سے نوٹ کر کمال پہ پھسلتا گیا۔

”کیوں؟ میں یہی نہیں سمجھ پا رہا کہ آخر کیوں؟“ وہ اس کے پیچھے آکھڑا ہوا تھا۔ بادل ابھی تک مریج رہے تھے۔

حیاء نے جواب نہیں دیا۔ اس نے ایک نظر جہان کو دیکھا اور پھر آگے بڑھ کر کوئٹہ میں رکھی مٹی پلانٹ کی سبز بوتل اٹھائی۔ پودے کی تیل جھٹک کر نکال پھینکی اور بوتل کو ہاتھ سے پکڑے ہوئے دیوار پہ مارا۔ کانچ ٹوٹا۔ ٹکڑے ٹکڑے گرتے گئے اور ایک ٹوک دار بڑا ٹکڑا اس کے ہاتھ میں رہ گیا۔

”یہ پکڑو۔“ اس نے بوتل کی گردن کا وہ ٹکڑا جہان کی طرف بڑھایا۔ ”اور جا کر اپنی ماں کی گردن اتار دو۔“

”حیاء! اس نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ حیاء نے آنسو سے سر نہی میں ہلایا اور آخری ٹکڑا باقی ماندہ کڑیوں پہ پھینک دیا۔

”نہیں کر سکتے نا؟ کانپ اٹھتا ہے نادل؟ لگتا ہے نا جیسے آسمان پھٹ پڑے گا اگر تم نے ایسا سوچا بھی؟“ اس نے گردن موڑ کر بھیگی آنکھوں سے باہر برستی موسلا دھار بارش کو دیکھا۔

”مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔“ وہ بولی تو اس کی آواز آنسوؤں سے بھاری تھی۔ ”مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے جہاں! اللہ نے امانت کو آسمان و

زمین پہ پیش کیا تھا، مگردوؤں نے اسے اٹھانے سے انکار کر دیا تھا اور اسے انسان نے اٹھالیا تھا۔ تمہاری ماں، ایک انسانی جان تم پہ امانت ہے۔ ایسے

ہی مجھ پہ میرا وعدہ امانت ہے۔ میں نے زندگی میں بس، ایک دفعہ کوئی وعدہ کیا اللہ تعالیٰ سے۔ کوئی مجھے اسے نبھانے کیوں نہیں دیتا؟“

بجلی نے اپنی چاندنی پھر سے ہر سو کھیر دی۔ بس لمحے بھر کی چاندنی اور پھر..... اندھیری رات چھا گئی۔

”مجھے کبھی نے کہا تھا کہ دل مارے بغیر نور نہیں ملتا اور میں سوچتی تھی کہ نور کیا ہوتا ہے؟ جانتے ہو نور کیا ہوتا ہے؟“ آنسوؤں نے گلے میں پھندا ڈال دیا تھا، دم کھوٹنے والا پھندا۔

”نور قرآن ہوتا ہے۔ اللہ کا حکم جن کو پورے کا پورا لیا جاتا ہے۔ ایک حصہ لے کر دوسرے سے انکار نہیں کیا جاتا جہاں! میں ہمیشہ

سوچتی تھی کہ اللہ کیوں کہتا ہے کہ اگر وہ قرآن کو پہاڑ پہ نازل کرتا تو وہ نوٹ جاتا۔ مجھے کبھی اس بات کی سمجھ نہیں آتی تھی۔ مگر آج آگئی ہے۔“

گرم، اٹلتے آنسو اس کی غموزی سے پھسلتے ہوئے، گردن تک لڑھک رہے تھے۔ وہ کھڑکی کے باہر دیکھ رہی تھی اور وہ اسے۔

”جانتے ہو پہاڑ کیوں ٹوٹا؟ کیونکہ وہ قرآن کو پورے کا پورا لیتا..... اور جو شخص قرآن کو پورے کا پورا اپنے دل پہ اتارتا ہے نا، اسے

ایک بار ٹوٹنا پڑتا ہے۔“ اس نے جلتی آنکھیں بند کیں۔ اب ہر طرف اندھیرا تھا۔ بل بھر کو بجلی چمکتی بھی تو اسے پروا نہیں تھی۔

”لوگوں نے مجھے اس لیے چھوڑا، کیونکہ میں نے اللہ کو نہیں چھوڑا..... تو مجھے واقعی ایسے لوگوں کا ساتھ نہیں چاہیے۔“

اس نے آنکھیں کھولیں۔ وہ وہاں پلٹ رہا تھا۔ اس نے دھندلی بصارت سے گردن موڑ کر اس شخص کو میز پر حیاں چڑھتے دیکھا، جس

سے اس کی زندگی کا ایک حصہ محبت کرنے میں گزرا تھا۔ وہ اوپر چلا گیا، مگر حیا کی طرح میز پر حیاں کو دیکھتی رہی۔

چند منٹ بعد وہ اترتا دکھائی دیا۔ اس کا دتی بیک اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ بنا اس کی طرف دیکھے، بنا کچھ کہے، باہر نکل گیا۔ اس نے

اسے نہیں روکا، آواز تک نہیں دی۔ دے ہی نہیں سکی۔ آنسوؤں نے ہر راستہ روک دیا۔ وہ جا رہا تھا۔ وہ جانے کے لیے ہی تو آیا تھا۔



باب 10

وہ جا رہا تھا۔ وہ جانے کے لیے ہی تو آیا تھا۔

اس نے بھگیا چہرہ کھڑکی کی طرف موڑا۔ وہ اب اسے تیز بارش میں سبک قدموں سے لان عبور کرتا نظر آ رہا تھا۔ بو چھاڑا اسے بھگوری تھی مگر اس نے اس سے بچنے کو اپنے سر پر کچھ بھی نہیں تانا تھا۔ گیٹ کے قریب پہنچ کر وہ لمبے بھر کوڑکا اور پلٹ کر دیکھا۔
حیا کا دل ڈوب کر ابھرا۔ رخسار پہ بہتے گرم آنسو مزید تیزی سے نیچے لڑھکنے لگے۔ جہان نے آخری بار پلٹ کر اسے نہیں بلکہ اوپر اپنی ماں کے کمرے کی کھڑکی کو دیکھا تھا، چونکہ پھپھو ادھر نہیں تھیں، سواگلے ہی پل جہان نے گردن ذرا سی تایا فرقان کے گھر کھلنے والے درمیانی دروازے کی طرف موڑی اس کی ماں وہاں تھی۔

اسے اب بھی صرف اپنی ماں کی فکر تھی۔ پھر وہ مڑا اور گیٹ کھول کر باہر نکل گیا۔ حیا پلٹنے لگی، تب ہی اس کو باہر درمیانی دروازے کی اوٹ میں کچھ غائب ہوتا دکھائی دیا۔ گلابی اور پیلا آٹھل۔ ارم کا دوپٹہ جو وہ پہچانی تھی۔ یقیناً ارم ادھر آئی تھی اور وہ سب سن چکی ہوگی۔ اس نے گہری، تھکی تھکی سی سانس اندر کو کھینچی۔

ارم کس سلسلے میں ادھر آئی تھی، وہ نہیں جانتی تھی، نہ ہی یہ کہ جہان نے اسے دیکھا تھا یا نہیں، مگر وہ اتنا ضرور جانتی تھی کہ وہاں جا کر وہ تمام رشتے داروں کے بیچ کھڑے ہو کر سارا قصہ مزے سے دہرا دے گی۔ قرآن خوانی کی تقریب میں گویا رنگ بھر جائے گا۔

گوسپ کا ایک نیا موضوع۔

لاؤنج میں دروازہ اماں پورا بند کر کے نہیں گئی تھیں، سوا سے یہ خام خیالی ہرگز نہ تھی کہ ارم نے کچھ نہ سنا ہوگا۔ بس چند ہی منٹ بعد پورے خاندان کو پتا چل جائے گا کہ حیا نے جہان کو گناہ دیا ہے۔ وہ حیا کے پردے سے تنگ آ کر اسے چھوڑ کر چلا گیا ہے۔
وہ تھکے تھکے سے انداز میں واپس صوفے پہ آ گری۔ کھڑکی کے ساتھ سبز بوتل کی کرچیاں ابھی تک بکھری تھیں۔ اس میں انہیں اٹھانے کی ہمت نہیں کی۔ اس میں ابھی کسی شے کی ہمت نہیں تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ ارم ہی تھی اور اس نے وہی کیا جو حیا نے سوچا تھا۔ فاطمہ واپس آئیں تو سخت متاسف تھیں۔ وہ سین بھپھوکی بات سن ہی نہیں رہی تھیں جو بار بار کہہ رہی تھیں۔

”بھابی! وہ اس وجہ سے نہیں گیا، اس نے صبح مجھے بتا دیا تھا کہ وہ آج چلا جائے گا۔ اس نے ویسے ہی چلے جانا تھا۔“
پھپھو کو ارم سے بھی شکوہ تھا۔ انہوں نے ارم کو ہلکا سا ڈانٹ بھی دیا تھا کہ وہ غلط بات نہ کرے مگر فاطمہ کا انداز بتا رہا تھا کہ انہیں یقین نہیں ہے۔ ان کے نزدیک اگر کوئی اس سب کا ذمہ دار تھا تو وہ حیا تھی جس نے اپنی ”ضد“ کے پیچھے سب کچھ کھودیا تھا۔

جب بتایا نے اسے بے عزت کر کے گھر سے نکالا تھا، تب وہ روئی تھی لیکن جب جہان چلا گیا تو اس نے اپنے آنسو پونچھ لیے تھے۔ خندق کی جنگ میں صرف بنو قریظہ تو نہیں ہوتا نا۔ اس میں جاڑے کی تختی بھی ہوتی ہے، وہ سردی اور خشکی جو لوگوں کے رویوں میں درآتی ہے۔ رشتے سرد مہر ہو جاتے ہیں اور اس میں بھوک کی تنگی بھی ہوتی ہے۔ معاشی دباؤ اور فکر بھی ہوتی ہے۔ وہ اب پروا کیے بنا کان لپیٹے اماں کی ساری باتیں سنتی رہتی اور آگے نکل جاتی۔ آفس میں البتہ اب رویہ ذرا بدل رہا تھا۔ اس کی بات سنی جاتی تھی، کبھی کبھار تاہم سیدھی ہو جاتی۔ وہ کارڈ میں چل کر جاری ہوتی یا لٹ کے انتظار میں کھڑی ہوتی، لوگ ادھر ادھر ہٹ جاتے۔ اس کے لیے رستہ چھوڑ دیتے۔ اس کے لیے کھڑے ہو جاتے۔

ہیڈ آفیسر ریٹنڈا کو اس نے اگلے ہی روز اپنے آفس میں بلایا تھا۔

”بیٹھے۔“ اپنے مخصوص انداز میں پاور سیٹ پہ ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے، اس نے ہاتھ سے سامنے کرسی کی جانب اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ گئے

البتہ ان کے چہرے پہ ذرا الجھن تھی۔

”کچھ نہیں سمجھتا“

”کافی ٹھیک رہے گی!“

”ٹھیکور!“ اس نے اظہار کام کارسیور اٹھایا۔

”ایک اچھی کڑوی سی بلیک کافی اندر بھیجیں، بغیر چینی کے!“

رضوان صاحب ذرا چوکے۔ رسیور رکھ کر وہ واپس کرسی پہ بیچھے ہو کر بیٹھی اور سنجیدگی سے ان کو دیکھا۔

”بیگ صاحب! ادھر آپ نے کون سی ملٹی اسٹوری پارکنگ دیکھ لی جو آپ کو لگا کہ اس ٹریڈ سینٹر میں اسے ہونا چاہیے؟“

”میرا خیال تھا کہ وہ ایک منفرد آئیڈیا ہے جس میں کم جگہ پر ایک بہت بڑی پارکنگ بن سکتی تھی۔“

”آپ کے ساتھ اور کس کا خیال تھا؟“

رضوان صاحب نے ابرو اٹھائی۔

”آپ مجھ پہ الزام لگا رہی ہیں؟“ بنا گھبرائے وہ قدرے ناگواری سے بولے۔

”بیگ صاحب! آواز نیچی رکھ کر بات کریں کیونکہ آپ کے پارٹنر نے ایک دو جگہ بہت فخر سے آپ کا اور اپنا کارنامہ بیان کیا ہے، میں

تو پھر آپ سے بند کرے میں پوچھ رہی ہوں۔“

”میرا کوئی پارٹنر نہیں ہے، یہ دھمکیاں آپ کسی اور کو دیں۔ ایک عمر گزری ہے کارپوریٹ ورلڈ میں، آپ کی طرح وراثت میں کرسی

نہیں ملی۔“

استہزائیہ انداز میں کہتے وہ اٹھے۔

”اگر میرا آئیڈیا ان کو پسند نہیں آیا تو اس کی ذمہ داری ہم دونوں پر ہے۔ میں نے ڈیزائن بنایا، آپ نے پیش کیا۔ اگر کوئی مسئلہ تھا تو

اس وقت آپ کی سمجھ داری کدھرتھی؟ جو آپ نے تب کچھ نہیں کیا؟ اب اپنی ناکامی چھپانے کے لیے آپ مجھ پہ الزام لگا رہی ہیں۔ مائی فٹ!“ وہ سر

جھٹک کر تیزی سے مڑے اور باہر نکل گئے۔

اس نے جیسے سمجھتے ہوئے سر ہلایا اور فون کارسیور اٹھایا۔ ایک نمبر ڈائل کر کے وہ دھیرے سے بولی۔

”عمران صاحب! پورے آفس میں موبائل جبر آں کر دیں جیسا کہ ہم نے پہلے بات کی تھی اور بیگ صاحب کے آفس فون کی ایک

لائن مجھے ٹرانسفر کر دیں۔“

رسیور واپس رکھتے ہوئے ایک طویل سانس اس کے لبوں سے آزاد ہوئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس نے رضوان بیگ کو اکسا دیا ہے۔

وہ اب پہلی کال اسے ہی کریں گے جو ان کا ساتھی تھا۔ اخلاقی حرکت تھی یا غیر اخلاقی، اسے یہی درست لگا تھا۔

☆ ☆ ☆

سمندری جگے ساحل کنارے پھڑ پھڑاتے ہوئے اڑ رہے تھے۔ نیلا، خوب صورت ہاسٹورس آج صبح بہت ہی پرسکون تھا۔ وہ ہاربر

کے قریب سڑک پر ڈرائیور کر رہا تھا۔ اس کی توجہ سمندری طرف تھی، نہ موسم کی جانب، وہ قدرے تشویش کے عالم میں ایک ہاتھ سے موبائل پہ نمبر ملا

رہا تھا جب سلسلہ ملا تو اس نے فون کان سے لگایا۔

”ہاں بولو سفیر! کیا مسئلہ ہوا ہے؟“ دوسری جانب سے آواز سن کر وہ پھنوس سیکڑ کر بولا تھا۔

”عبدالرحمن بھائی! میں نے بہت کوشش کی مگر معاملہ میرے ہاتھ سے باہر ہے۔ میں.....“

”سفیر بے! مجھے تمہید سے نفرت ہے۔ سیدھی بات کرو۔“ وہ ذرا بے زاری سے بات کاٹ کر بولا تھا۔ کار کی رفتار اس نے قدرے

آہستہ کر دی تھی۔ اس کے تھے ہوئے اعصاب پوری طرح فون کی طرف متوجہ تھے۔

”بھائی! میں..... اصل میں ہمارے مسئلہ کر رہی ہے۔ اس نے پہلے ہمیں کہا کہ وہ آخری فلائٹ سے جائے گی، سب کے جانے کے

بعد۔ اس نے سب کو راضی کر لیا کہ اسی شرط پہ وہ بغیر کوئی شور ڈالے آرام سے چلی جائے گی۔“

”پھر، وہ نہیں جاری؟“ اس نے بمشکل اپنی ناگواری چھپاتے ہوئے پوچھا۔

”صرف یہی نہیں، اس نے اپنا پاسپورٹ بھی جلا دیا ہے اور اس کا کہنا ہے کہ جب تک آپ نہیں آئیں گے اس کے پاس، وہ نہیں

جائے گی۔“

بہارے، عائشہ نے آئے کے جانے کے بعد عثمان شہیر کے گھر پہنچی اور وہ یقیناً وہیں اسے بلارہی تھی۔
 ”سفیر! میں نے تمہیں ایک کام کہا تھا، وہ بھی تم سے نہیں ہوا۔ بہت اچھے!“ وہ برہمی سے گویا ہوا۔
 ”سوری بھائی!“ وہ نادم تھا۔

”پھر آپ کب آئیں گے؟“

”میں کیوں آؤں گا؟ اتنا فارغ ہوں میں کہ ایک مندی بچہ کی مرضی پہ چلا آؤں؟ اسے بلو، اس نے جانا ہے تو جائے، نہیں تو نہ جائے۔ مجھے پروا نہیں ہے اور سنو! اب اتنی غیر اہم باتوں کے لیے مجھے تنگ مت کرنا۔“ قریباً جھڑکتے ہوئے اس نے فون بند کیا اور ڈیش بورڈ پہ ڈال دیا۔

مسائل پہلے کم تھے جو یہ ایک نیا مسئلہ کھڑا ہو گیا تھا۔ اب اس کا پاسپورٹ پھر سے ہونا پڑے گا۔ اور یہ بہارے کی شرائط..... ذرا ایک دو کام کر لے پھر نیچے گا وہ اس ناگہم برابر لڑکی سے۔

ناگوار سے سر جھکتے ہوئے اس نے سوچا۔ اس کے سر کے پچھلے حصے میں پھر سے درد اٹھنے لگا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ لاؤنچ میں صوفے پہ پیرا پر کیے بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں دو مسلمان کی ڈبی تھی، جس میں سے وہ دو انگلیوں پہ کریم نکال کر ایڑیوں پہ لہ رہی تھی۔ فاطمہ اور سہیل شام کی چائے پی کر ابھی ابھی اٹھی تھیں۔ ارم کے سرال والے آئے تھے، شادی کی تاریخ رکھی جا رہی تھی، سوان کا وہاں ہونا ضروری تھا۔ حیا کا دل بھی نہیں چاہا کہ وہ وہاں ان کے ساتھ ہو جائے، وہ بہت پتھروں ہو گئی تھی، یا بہت مضبوط، جودل پہ لگنے والی چوٹوں کو سہنا سیکھ گئی تھی۔

دروازہ ہولے سے بجاتا اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ سونیا دروازے میں کھڑی تھی۔

”بھابھی! آئیے، پلیز۔“ وہ خوشگوار حیرت سے مسکراتی اٹھی اور دو مسلمان کی ڈبی بند کر کے میز پہ رکھی۔

”جھینکس!“ سونیا خوش دلی سے مسکراتی صوفے پہ آ بیٹھی۔ حیا نے نشو واکس سے نشو نکال کر ہاتھ پونچھے اور اس کے قریب آ بیٹھی۔

سونیا بظاہر مسکراتی تھی مگر اس کے انداز میں قدرے ہچکچاہٹ تھی، جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی ہو مگر متذبذب ہو رہی تھی۔

”کیسے بھابھی؟“ وہ بغور اس کو دیکھ رہی تھی۔

”ہل میں حیا! میں تمہیں لینے آئی تھی۔ میں چاہتی ہوں کہ تم آکر باا سے معافی مانگ لو، ان کی ناراضی دور ہو جائے گی اور ہم سب

پھر سے ساتھ مل کر بیٹھ سکیں گے۔ دیکھو، اب سب ادھر ہیں، مگر تمہاری کمی پھر بھی محسوس ہو رہی ہے۔“

حیا نے سمجھتے ہوئے سر ہلایا۔ آفس سیٹ پہ بیٹھ کر جس طرح وہ معاملات کا تجزیہ کرتی تھی، ویسے ہی اس کے دماغ نے فوراً کڑیاں ملانی شروع کیں۔ ظفر اور دوسرے ملازموں کے ہوتے ہوئے بھی منہانوں کی آمد پہ تائی سارا کام سونیا سے کرواتا تھا۔ اس کو لمبے بھر کی بھی فرصت نہیں ہوتی تھی۔ سو یہ تو طے تھا کہ وہ خود سے یعنی تائی سے چھپ کر نہیں آئی تھی، مطلب اسے تائی نے ہی بھیجا تھا۔ تاکہ وہ حیا کو جھکا سکیں اور ان کی اتائی تسکین ہو سکے۔ دوسری طرف اسے ”معاف“ کر کے بتایا اور تائی ایثار اور عظمت کا پرچم بلند کریں گے۔ زبردست۔

”میں تیار ہوں بھابھی!“ وہ بولی تو اس کا لہجہ بے تاثر تھا۔ ”میں تباہا سے ہر اس وقت کی معافی مانگنے کو تیار ہوں جب میں نے ان کا دل دکھایا، جب میں نے کوئی گستاخی کی یا مجھ سے کوئی بدتمیزی سرزد ہوئی۔ ان سے کہیں میں پوری دنیا کے سامنے معافی مانگنے پہ تیار ہوں۔ وہ بڑے ہیں، میں چھوٹی۔ مجھے جھکنا چاہیے، میں جھک جاؤں گی، لیکن..... لیکن بھابھی! تباہا بانیہ ایک شرط رکھی تھی۔“

وہ لمبے بھر کوڑکی۔

”اور وہ شرط یہ تھی کہ میں ان کے گھر ان کے بیٹوں سے منہ لینے بغیر داخل ہوں گی، ورنہ نہیں ہوں گی۔ میں ان کی اس بات کا بھی مان رکھوں گی۔ میں ہر بات کی معافی مانگ لوں گی، سوائے اپنے جناب کے۔ یہاں میں ٹھیک ہوں، وہ غلط ہیں۔ میں ان کے گھر میں داخل نہیں ہوں گی۔ یہ بات آپ ان کو بتادیں۔“

”حیا!“ سونیا نے بے بسی سے اسے دیکھا۔ ”اب اتنا بھی کیا پردہ؟ دیکھو اس دن ڈاکٹر ڈاکرنا ٹیک کہہ رہے تھے کہ.....“

”بھابھی پلیز، کوئی میرے حق میں بات کرے یا عطا، مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بہت سی لڑکیاں صرف اسکا رٹ لیتی ہیں، چہرہ نہیں

وہ طعنتیں کیونکہ انہوں نے اللہ سے اتنا ہی وعدہ کیا ہوتا ہے۔ سو جتنا وہ کرتی ہیں، اس پر قائم رہتی ہیں، اس سے پیچھے نہیں جاتیں۔ میں نے بھی ایک وعدہ کیا تھا کہ جو حکم سن لوں گی اور اس پر دل کھل جائے گا، اسے اپنالوں گی۔ اب میرا دل نقاب کے لیے کھل چکا ہے۔ پلیز مجھے اسے بھانے دیں۔“ وہ بات کرنے کے ساتھ ساتھ ایڑی پہ لگائی چکنائی کو انگلیوں سے مل بھی رہی تھی۔ ذرا سی سخت پڑی ایڑی اس کی پوروں کو کھروری محسوس ہو رہی تھی۔

”دیکھو! تمہاری بات ٹھیک ہے۔ مگر حیا! تم جانتی ہو پورا خاندان باتیں بنا رہا ہے کہ جہاں تمہیں صرف اس لیے ٹھکرا کر گیا ہے کیونکہ تم نے اپنی دنیاوی ضد نہیں چھوڑی۔“

”بھابھی! جب ارم نے یہ بات سنا مگر کبھی تھی، تب پھپھو نے یہ کہا تھا کہ وہ صرف اپنی جسمی ختم ہونے پر واپس گیا ہے مگر لوگوں نے ان کی بات پر یقین نہیں کیا۔ انہوں نے ارم کی بات پر یقین کیا۔ لوگ اسی بات پر یقین کرتے ہیں جس پر وہ یقین کرنا چاہتے ہیں۔“ ساری کریم ایڑی میں جذب ہو گئی تھی، اس نے میز پر رکھی ڈبی کھولی۔ انگلی اندر ڈال کر پورے پہ ذرا سی دسلیں نکالی اور پھر سے کھروری ایڑی پہ لگانے لگی۔

”اور اگر جہاں نے واقعی تمہیں اسی وجہ سے چھوڑا ہو، تب تم کیا کرو گی؟“ وہ جیسے بہت فرصت سے اسے سمجھانے آئی تھی۔ یقیناً اسے بھیجا گیا تھا۔

”بھابھی! یہ میرا اور اس کا مسئلہ ہے، جیسے ہم ہینڈل کر لیں گے۔ میں نیکہت و یکبہت کی جارہی ہوں نا، بات کر لوں گی اس سے۔ پورے خاندان کو اس بات کی کیوں اتنی فکر ہے، میں سمجھنے سے قاصر ہوں۔“ وہ غصے سے نہیں بلکہ بہت نرمی سے ہموار لہجے میں بول رہی تھی۔ بات کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی انگلیاں ایڑی کا مساج بدستور کر رہی تھیں۔

”مگر حیا! تم یہ بھی تو دیکھو کہ کزنز سے پردہ کون کرتا ہے۔ میری ایک فریڈ کا تعلق بہت سخت قسم کی چھان فیل سے ہے مگر ان کے ہاں بھی کزنز سے چہرے کا پردہ نہیں کیا جاتا۔ ٹھیک ہے، وہ سب اسلام کا حصہ ہے مگر اب اس سب کو دنیاوی سمجھا جاتا ہے۔ زمانہ بہت آگے بڑھ گیا ہے۔“ اس نے بہت ڈکھ سے سونیا کو دیکھا۔

”اگر میرے اور آپ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آج ہمارے سامنے ہوتے تو کیا ان کی موجودگی میں بھی آپ یہی بات کہہ سکتیں؟“

سونیا ایک دم بالکل چپ ہو گئی۔

”بتائیں نا بھابھی! ان کے سامنے آپ سے پوچھا جاتا تو آپ ان کے بتائے ہوئے اصولوں کو سپورٹ کرتیں یا اپنے ساس سر کو؟“ سونیا نے لب کھولے، مگر کچھ نہیں کہہ سکی۔ اس کے پاس سارے الفاظ ختم ہو گئے تھے۔ حیا نے ڈبی سے ذرا سی مزید دسلیں نکالی اور دوسری ایڑی پہ دھیرے دھیرے رگڑتے ہوئے بولی۔

”کیا آپ جانتی ہیں کہ داؤر بھائی پہلے مجھ سے شادی کرنا چاہتے تھے؟“ سونیا کی آنکھیں حیرت سے ذرا سی کھلیں۔ دھیرے سے اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”بالکل ایسے جیسے فرخ کچھ عرصہ پہلے تک مجھ سے شادی کے لیے تائی اماں کو ٹھک کرتا رہا ہے، ویسے ہی داؤر بھائی نے بھی بہت اصرار کیا تھا۔ یہ بات میں نے تائی کے منہ سے آپ کی شادی سے دو روز قبل سنی تھی۔ جانتی ہیں داؤر بھائی ایسا کیوں چاہتے تھے؟“ وہ کچھ نہیں بولی۔ وہ بس بنا پلک جھپکے شاک کے عالم میں اسے دیکھ رہی تھی۔

”کیونکہ میں ہمیشہ بہت تیار رہا کرتی تھی۔ اب بھی رہتی ہوں۔ میری کپڑے، جوتے، بال، ناخن..... میں ہر چیز آج بھی اتنی ہی تراش خراش کر سیٹ رکھتی ہوں جتنا پہلے رکھتی تھی۔ فرق بس اتنا ہے کہ اب میں باہر نکلتے ہوئے خود کو ڈھک لیتی ہوں۔ جانتی ہیں اس سے کیا ہوتا ہے؟ بس اتنا کہ دوسری عورتوں کے شوہر میری طرف متوجہ نہیں ہوتے اور یوں اپنی بیوی سے ناخوش ہونے کی کوئی وجہ نہیں رہتی ان کے پاس۔“ ایڑی میں ساری چکنائی جذب ہو چکی تھی۔ وہ اب بھی پہلے کی طرح کھروری تھی مگر وہ جانتی تھی کہ یہ چکنائی ایک دم سے اڑ نہیں کرتی۔ آہستہ آہستہ وہ کھرورے پن کو نرم کرے گی اور یوں پھٹی ہوئی جلد ویسی ہو جائے گی جیسا کہ اسے ہونا چاہیے۔

”کیا آپ اب بھی مجھے غلط سمجھتی ہیں؟“ نشو سے ہاتھ پونچھتے ہوئے اس نے بہت اطمینان سے دیکھا۔ وہ جو بالکل گم صم ہی بیٹھی

تھی۔ کچھ کہے بنا اٹھ کھڑی ہوئی۔

حیائے دور تک سونہا کو جالے دیکھا اور پھر اپنی بھئی ایزیوں کو۔ آہستہ آہستہ یہ نرم پڑ جائیں گی۔ وہ جانتی تھی کچھ چیزیں کافی وقت لیا کرتی ہیں۔

☆ ☆ ☆

اس دن اس سے صرف اتنی غلطی ہوئی کہ وہ بغیر بتائے زارا سے ملے چلی آئی تھی۔ آج آفس میں زیادہ کام نہیں تھا، ویسے بھی باقر صاحب کو وہ اپنی ٹاپ Heirarchy کو از سر نو تشکیل دے کر گزارنا چاہتی تھی، سو اس پہ کام کا بوجھ ذرا کم تھا۔ فراغت ملی تو سوچا زارا سے مل لے۔ پانچ جولائی آکر گزر بھی چکی تھی۔ اب اس کو اسی ہفتے واپس ترکی جا کر کیئرنس کروانی تھی انہی سوچوں میں غلطیاں وہ اس کے گھر آئی۔

”زارا اندر کمرے میں ہے، فارینہ وغیرہ آئی ہوئی ہیں۔ تم اندر چلی جاؤ۔“ زارا کی بھی اسے دروازے پہ ہی مل گئیں۔ وہ کہیں جانے کے لیے نکل رہی تھیں۔ خوش اخلاقی سے بتا کر وہ باہر نکل گئیں۔ وہ سر ہلا کر اندر آگئی۔

زارا کا کمرہ کارڈور کے آخری سرے پہ تھا۔ گھر میں خاموشی تھی۔ کمرے سے باتوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ فارینہ اور مشال کی آوازیں، ان کی کلاس فیلوز اور فرینڈز، وہ یقیناً اچھے وقت پہ آئی تھی۔ ان سے بھی مل لے گی۔ یہی سوچ کر وہ چند قدم آگے آئی مگر اس سے پہلے کہ مانوسیت پیدا کرنے کے لیے کوئی آواز دیتی اُدھ کھلے دروازے سے آتی آوازوں نے اسے روک دیا۔

”حیا کومت بلانا پلیز!“ بے زاری سے بولی وہ زارا تھی۔ وہ بے اختیار دو قدم پیچھ پٹی دیوار سے جا لگی۔ سانس بالکل روکے۔ وہ اب ان کی گفتگو سن رہی تھی۔

”کیا یار! اکٹھے ہو جائیں گے تو مزہ آئے گا نا۔“ فارینہ ذرا حیران ہوئی۔

”تم اس سے ٹپ نہیں ہونا ترکی سے واپس پہ، اسی لیے کہہ رہی ہو۔ ورنہ وہ اتنی بور ہو گئی ہے کہ کوئی حد نہیں۔ تمہیں بتا ہے اس نے برقع پہننا شروع کر دیا ہے۔ اینڈ آئی مین ریل برقع؟“ وہ ”ریل“ پہ زور دے کر جیسے بے یقینی کا اظہار کر رہی تھی۔

”برقع؟“ ڈونٹ ٹیل می زارا!“

”ہاں، میں نے اسے یوں، تم ترکی سے آئی ہو یا عمر سے ہے۔“

”یہ جھوٹ تھا۔ زارا نے کبھی اسے ایسے نہیں کہا تھا۔ وہ دم سادھے سننے لگی۔

”میں اس کا وہ کالا طالبان والا برقع نہیں وداسٹینڈ کر سکتی۔ پلیز اسے کال مت کرنا۔ اسے دیکھ کر میرا دم گھٹتا ہے۔ پتا نہیں اپنا کیا حال

ہوتا ہوگا۔“

”خیر! حیا کو میں جتنا جانتی ہوں، اس لحاظ سے اس نے برقع بھی ڈیزائن لیا ہوگا، براؤن ڈر برقع۔ شاید فیشن میں کر رہی ہو۔“

اب مزید کھڑے ہونا خود کو ذلیل کرنا تھا۔ وہ بنا چا پ پیدا کیے واپس پلٹ گئی۔ باہر گیٹ کپڑے کے قریب بڑھ چکی تھی۔

”زارا کو بتا دینا کہ میں آئی تھی مگر جاری ہوں۔ وجہ پوچھیں تو کہنا انہیں معلوم ہے۔“ سختی سے دد نوک انداز میں کہہ کر وہ باہر کار کی

طرف بڑھ گئی۔

”چلو اور کہیں دور لے جاؤ۔ میں ذرا دور جانا چاہتی ہوں۔“ پچھلی سیٹ پہ بیٹھتے ہوئے اس نے تھکے تھکے انداز میں ڈرائیور سے کہا،

جس نے سر ہلا کر اشارت کر دی۔

اس نے سر سیٹ کی پشت سے نکا کر آنکھیں موند لیں۔ گردن کے پچھلے حصے اور کندھوں پہ عجب دباؤ سامحوس ہونے لگا تھا۔ جیسے اب

اعصاب تھکان کا شکار ہو رہے ہوں۔ وہ انسان ہی تھی۔ اس کی قوت برداشت اور اعصاب کی مضبوطی کی بھی ایک حد تھی۔ اس سے زیادہ پریشورہ

نہیں لے سکتی تھی۔ ہر دروازے سے دھتکارے جانا، ہر جگہ سے ٹھکرائے جانا، ہر دوست کا جھوٹ جانا، کیا مشکلات کی کوئی حد تھی؟ صبر، صبر، صبر.....

انسان کتنا صبر کرے؟ ایک نقاب ہی تو کرنا شروع کیا تھا اس نے، ایک دم سے اتنے چہروں سے نقاب کیسے اتر گئے تھے؟

ڈرائیور بے مقصد سڑکوں پہ گاڑی چلاتا گیا۔ بہت دیر بعد جب اس کا سردرو سے پہنچنے کا تو اس نے گھر چلنے کا کہا۔

ابا کمرے میں تھے۔ آج ٹیک گا کر بیٹھے، ٹیک لگائے اخبار دیکھ رہے تھے۔ اس نے دروازے کی درز سے ان کو دیکھا۔ ایک تھکی تھکی

سی مسکراہٹ اس کے لبوں پہ بکھر گئی۔ پھر وہ بنا انہیں تنگ کیے اپنے کمرے میں چلی آئی۔

زارا کی باتوں نے اتنا ڈسٹرب کیا تھا کہ وہ رات کا کھانا بھی نہیں کھا سکی۔ فاطمہ نے پوچھا۔ ان کا رویہ ذرا بہتر تھا۔ آخر ماں تھیں، مگر اس نے بھوک نہ لگنے کا بہانہ کر دیا، پھر وہ اوپر چھت پہ چلی آئی۔

کیونکہ جھولا منڈیر سے لگا دیران بڑا تھا۔ وہ اس پہ آ بیٹھی تو دھیرے سے بہت سی یادیں سامنے دیوار سے لگے ابا کے گملوں کے اوپر سائے بن کر ناچنے لگیں۔ آج چاند کی روشنی کافی تیر تھی، پودوں کے پتے چمک رہے تھے۔ اسے سب انجی میں جمیل کنارے پہ چھائی چاندی کی تہہ یاد آئی اور چاندی کے جیسے اور اسی جگہ بیٹھا وہ شخص جو خاموشی سے اس کی کہانی سنے گیا تھا، مگر اپنی نہیں سنائی تھی۔ واپس جا کر فون بھی نہیں کیا۔ وہ تھائی ایسا، پھر بھی وہ اس سے اُمید وابستہ کر لیتی تھی۔ باطل تھی وہ۔

بہت دیر وہ جھولے پہ بیٹھی ابا کے گملوں کو دیکھتی رہی۔ وہ پہلے سے زیادہ مہم جھانگنے لگی۔ ابا ہمارے تو طوازموں نے بھی ان کا خیال رکھنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ منڈیر کے سامنے والی دیوار کے ساتھ رکھے تھے۔ ان کے اور منڈیر کے درمیان قریباً چار گز چوڑا آئینہ تھا۔ وہ چھت کا پچھلا حصہ تھا۔ ٹیرس دوسری طرف تھا۔ وہ اب ٹیرس پر نہیں بیٹھتی تھی کہ وہاں بے پروی ہوئی تھی سامنے گھروں میں نظر آتا تھا، اللہ، اللہ، پھر پردہ! اس نے بدولی سے سر جھکا نہیں، وہ اپنے پردے سے تنگ نہیں پڑ رہی، مگر پھر وہ بے زاری کیوں محسوس کر رہی ہے؟ اپنی سوچوں سے اکتا کر وہ ایک دم کھڑی ہوئی اور اندر جانے کے لیے دروازے کی طرف بڑھی، مگر پھر رُک گئی۔ گملوں اور منڈیر کے درمیان کچھ تھا۔ کچھ چمکا تھا۔

”کون؟“ وہ ذرا چونکی ہو کر پیچھے ہوئی۔ ”کوئی ہے؟“

وہاں ہر طرف سناٹا تھا۔ خاموشی۔ اندھیرا۔ کچھ بھی نہیں تھا۔ پھر شاید اس کا وہم ہو۔ اس نے سر جھٹک کر پھر سے قدم اندر کی جانب بڑھانے چاہے مگر لمبے بھر کو پھر سے کچھ چمکا۔

”کون..... کون ہے؟“ وہ بالکل سا کن کھڑی پلکیں سکیڑے اس جگہ کو دیکھ گئی۔ اسے ڈر نہیں لگ رہا ہے۔ وہ بالکل بھی خوف زدہ نہیں ہے۔ اس نے خود کو بتانے کی کوشش کی، مگر فطری خوف نے اسے جھوٹا۔ پھر بھی وہ کچھ سوچ کر آگے بڑھی۔ گملوں کی قطار کے ساتھ چلتی وہ آخری گمے تک پہنچی جس میں لگائی پلانٹ ڈنڈی کی مدد سے قریباً چھ فٹ اونچا کھڑا تھا۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا، مگر کچھ تھا۔ کسی احساس کے تحت وہ ذرا سی آگے ہوئی اور پھر ایک دم رُک گئی۔

”غدا۔“ وہ جیسے کرٹ کھا کر دو قدم پیچھے ہٹی اور پھر یہ یقینی سے پھٹی پھٹی لگا ہوں سے گردن اونچی کر کے دیکھا۔

اونچے منی پلانٹ سے لے کر چھت کی منڈیر تک ایک اُن دیکھی دیواری بنی تھی، کٹری کے جالے کی دیوار۔ جیسے کسی بیڈ منٹن کورٹ میں جالی دار نیٹ لگا ہوتا ہے۔ وہ چھ فٹ اونچا اور بے حد لمبا سا جالا ہے۔ حد خوب صورت اور سرخ رنگیز تھا۔ اس کے تانے بانے بہت نفاست سے بنے تھے گو کہ وہ بہت پتلا تھا، پھر بھی چاند کی روشنی کسی خاص زاویے سے پڑتی تو دھنک کے ساتوں رنگ چمکتے۔

وہ اسے تحیر سے دیکھتی اُلٹے قدموں پیچھے آئی۔ اگلے ہی پل وہ اندر بیڑیوں کے دہانے پہ غصے سے نور بانو کو پکار رہی تھی۔

”جی، جی آئی۔“ نور بانو جو کچن میں کھانے کے برتن سمیٹ رہی تھی، بھاگتی ہوئی باہر آئی۔

”جاؤ کوئی جھاڑو لے کر آؤ۔ اتنے جالے لگے ہیں چھت پہ۔ تم صفائی کیوں نہیں کرتیں ٹھیک سے؟“ پتا نہیں اسے کس بات پہ زیادہ غصہ چڑھا تھا۔ اس کے تیردیکھ کر نور بانو بھاگتی ہوئی کچی والی جھاڑو لیے اوپر آئی۔

”اتنا بڑا جالا یہاں بنایا کیسے؟“ جب نور بانو اس کے ساتھ باہر چھت پہ آئی تو وہ حیرت سے اچھنبے سے جیسے خود سے بولی تھی۔

”حیا باجی! دیکھیں نا، یہاں کی صفائی کی ذمہ داری سرین (جزوقی ملازمہ) کی ہے، وہ روز چھت صاف نہیں کرتی۔ مجھے تو لگتا ہے کافی دن سے ادھر سے گزری بھی نہیں ہے۔ گزری ہوئی تو جالانہ بنتا۔ یہ کڑیاں جالے ادھر ہی بنائی ہیں جہاں کچھ عرصہ کچھ گزرا نہ ہو، چاہے بندہ، چاہے جھاڑو۔ جتنے آتا رو جالے، پر کچھ روز بعد بن لیتی ہیں۔ سدا کی کام چور ہے سرین، ذرا سا کام نہیں ہوتا۔ یہ جالا دیکھنے میں کتنا بڑا تھا جی، مگر جھاڑو ایک دفعہ ماری اور اتر گیا۔ اتنی سی بات تھی۔“

نور بانو جھاڑو وہاں میں اوپر نیچے مارتی جلدی جلدی وضاحتیں دے رہی تھیں۔ حیا نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ درست کہہ رہی تھی۔ وہاں سے کافی دنوں سے کوئی نہیں گزرا تھا۔ وہ بھی ادھر آئی تو جھولے پہ بیٹھ کر تھوڑی دیر بعد اندر چلی جاتی۔ اسی لیے تو جالا بنا تھا۔ اسی لیے تو جالے بنے ہیں۔ اس کے دل میں بھی بن گئے تھے۔ اب اسے ان کو صاف کرنا تھا۔ کیسے؟ لمحے بھر بعد ہی اس کے دل نے اسے جواب دے دیا تھا۔

اب اسے صبح کا انتظار تھا۔

☆ ☆ ☆

انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی ویسی ہی خوب صورت اور بڑے سکون تھی جیسی وہ جمہور کریم تھی۔ لہذا تا سبزہ، کشادہ مڑکیں اور کیمپس کے سرخ اینٹوں والے بلاکس۔ کیمپس میں رش بہت کم تھا۔ وہ بنا کچھ دیکھے، سیدھی ڈاکٹر ابراہیم حسن کے آفس آئی تھی۔ خوش قسمتی سے اسے ان کا نمبر مل گیا تھا اور چونکہ وہ ان کی ایک اچھی اسٹوڈنٹ تھی، اس لیے انہوں نے ملاقات کا وقت طے کر لیا تھا۔

”السلام علیکم سر!“ اجازت ملنے پہ ان کے آفسر اس داخل ہوتے ہوئے وہ بولی۔ وہ معمر مگر بڑے وقار سے استاد تھے۔ مسکراتے ہوئے اس کے لیے اٹھے، اور ”علیکم السلام“ کہتے ہوئے سامنے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

”بہت شکریہ آپ نے نام دیا۔ میں کچھ پریشان تھی، سوچا آپ سے ڈسکس کر لوں شاید کوئی حل نکل آئے۔“ کرسی کھینچتے ہوئے اس نے وہی بات دہرائی جو فون پہ کہی تھی۔ اپنے سیاہ عبا یا اور نفاست سے لیے گئے نقاب میں وہ بہت تھکی تھکی لگ رہی تھی۔

”نشیور۔ آپ بتائیے اور چائے لیں گی یا.....؟“

”نہیں نہیں سر! پلیز، کچھ بھی نہیں۔ بس میں بولنا چاہتی ہوں۔ مجھے ایک سامع چاہیے۔“

انہوں نے سمجھ کر سر ہلایا۔ وہ منتظر تھے۔ حیا ایک گہری سانس لے کر ٹیک لگا کر بیٹھی کہیاں کرسی کی ہتھی پہ رکھے، ہتھیلیاں ملانے، وہ پلانٹیم کی انگوٹھی انگلی میں گھماتے ہوئے کہنے لگی۔

”میں جانتی ہوں کہ ایک مسلمان کا بہترین ساتھی قرآن ہوتا ہے اور اسے اپنی تمام کنسولیشن (ہدایت) اللہ تعالیٰ سے لینی چاہیے، اپنا مسئلہ صرف اللہ تعالیٰ کے سامنے رکھنا چاہیے، لیکن اگر یہی کافی ہوتا تو اللہ سورہ عصر میں یہ نہ فرماتا کہ ”انسان خسارے میں ہے، سوائے ان کے جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے اور ایک دوسرے کو حق کی تلقین کی۔ اور ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کی۔“ سر! یہ جو دو تا صواب صبر ہوتا ہے نا، یہ بندے کو بندوں سے ہی چاہیے ہوتا ہے، خصوصاً تب جب دل میں کڑی کے جالے بن جائیں۔“

انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ کرسی پہ قدرے آگے ہو کر بیٹھے وہ بہت توجہ سے اسے سن رہے تھے۔

”آپ مجھے جانتے ہیں، آپ کو معلوم ہے کہ میں ہمیشہ سے ایسی نہیں تھی۔ میرے لیے دین کبھی بھی لائف اسٹائل کا حصہ نہیں رہا تھا، پھر بھی میں ایک بری لڑکی کبھی بھی نہیں تھی۔ ہر انسان اپنی کہانی خود سناتے ہوئے خود کو مار جن دے دیا کرتا ہے، شاید میں بھی دے رہی ہوں۔ پھر بھی میں بے شک حجاب نہیں لیتی تھی، مگر لڑکوں سے بات نہیں کرتی تھی۔ میری کسی لڑکے سے خفیہ دوستی نہیں تھی۔ میں دکان دار سے پیسے پکڑتے ہوئے بھی احتیاط کرتی تھی کہ ہاتھ نہ چھوئے۔ میرا نکاح بچپن میں ہوا تھا اور میں اتنی وفادار تھی کہ اگر کبھی کسی لڑکے سے یوں ملی تو اسی نکاح کو بچانے کے لیے۔“

وہ کہہ رہی تھی اور ہر لفظ..... سے تکلیف عیاں تھیں۔ دل میں جیسے کا سننے اتنی اذیت نہیں دیتے جتنا ان کو نوچ کر نکالنے کا عمل اذیت دیتا ہے۔

”پھر میں باہر چلی گئی۔ وہاں بھی دین میرے لیے بس اتنا ہی تھا کہ میلا دا اینڈ نہ کر لیا اور ٹاپ تھی میں متبرکات دیکھ کر سر ڈھانپ لیا، بس ٹو اپ مل گیا، پھر جو چاہے کرو، مگر پھر میں نے محسوس کیا کہ میری عزت نہیں ہے۔ میں نے خود کو بے عزت اور رسوا ہوتے دیکھا۔ میری نیت کبھی بھی غلط نہیں ہوتی تھی، پھر بھی میں رسوا ہو جاتی تھی۔ تب میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کیوں ہوتا ہے۔ پھر مجھے اللہ نے دو قسم کے عذاب چکھائے۔ روحانی اور جسمانی۔ پہلے میں نے موت دیکھی، اور موت کے بعد کا جہنم۔“ درد سے اس نے آنکھیں میچ لیں۔ بھڑکتا لاوا، دہکتے انگارے۔ سب کچھ سامنے ہی تھا۔

”میری جلد پہ آج بھی وہ زخم تازہ ہیں جو اس بھیا تک حادثے نے مجھے دیے اور تب مجھے سمجھ میں آ گیا کہ اللہ تعالیٰ کی رضا صرف تمنا اور خواہش سے نہیں ملتی۔ اس کے لیے دل مارنا پڑتا ہے۔ محنت کرنی پڑتی ہے اور میں نے دل مارا۔ تاکہ میری آنکھ میں اور دل میں اور وجود میں نور داخل ہو جائے اور میں نے وہ سب کرنا چاہا جو اللہ تعالیٰ چاہتا تھا کہ میں کروں مگر تب مجھے کسی نے کہا تھا کہ قرآن کی پہیلیاں زیادہ دلچسپ ہوتی ہیں اور یہ کہ ”انزبا“ میں آیت حجاب اتنا بھی ایک پہیلی ہے۔ اس نے اس پہیلی کو یوں حل کیا کہ حجاب لینا خندق کی جنگ کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ جہاں کسی عہد میں بندھے بنو قریظہ ساتھ چھوڑ جاتے ہیں، جہاں جائزے کی تختی اور بھوک کی بیٹی ہوتی ہے اور پھر میں نے خود کو اسی خندق میں

پایا۔ اب جب کہ میں اس دوسرے لائف اسٹائل کو نہیں چھوڑنا چاہتی تو لوگ مجھے اس پر مجبور کر رہے ہیں۔ میرے سگے تایا جو اپنی بیٹی کو ساری عمر اسکارف کرواتے آئے ہیں، وہی اس کے خلاف ہو گئے ہیں۔ میں کیسے اس دل کی دیرانی پہ قابو پاؤں جو میرے اندر اتر آئی ہے؟ میں کیسے ان جالوں کو صاف کروں؟

بہت بے بسی اور شکستگی سے کہتے اس نے اپنا سوال ان کے سامنے رکھا۔ دل بیٹے ایک غبار سے صاف ہوا تھا۔ ایک بوجھ مٹا دینا تو اس سے آتا تھا۔

”میں جہاں تک آپ کی بات سمجھ سکا ہوں۔“ بہت دھیمے مگر مضبوط لہجے میں انہوں نے کہنا شروع کیا۔ ”تو آپ کے دل میں کمزری کے جالے اسی لیے بن رہے ہیں کہ آپ لوگوں کے ان رویوں کو دائمی سمجھ رہی ہیں۔ دیکھیں! قرآن کیا کہتا ہے؟ ایک سورہ ہے جس کا نام عنکبوت یعنی ”کمزری“ ہے، اس میں یہی لکھا ہے تاکہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں کو اپنا کارساز بناتا ہے، اس کی مثال کمزری کی سی ہے جو اپنا گھر بنتی ہے اور بے شک گھروں میں سب سے کمزور گھر کمزری کا ہی ہوتا ہے تو چنانچہ جو ”کارساز“ بنانا ہوتا ہے نا، یہ صرف کسی انسان کو خدا کے برابر سمجھنا نہیں ہوتا بلکہ کسی کو زور اور تسلیم کرنا اور اس کے رویے کو خود پر طاری کر لینا بھی ہوتا ہے۔ آپ نے اپنے حجاب کے لیے بہت فائنٹ کی، یہی تو عورت کا جہاد ہوتا ہے، اس کی الٹی میٹ اسٹرٹجی۔ مگر آہستہ آہستہ فطری طور پہ آپ نے یہ سمجھ لیا ہے کہ لوگوں کا رویہ ہمیشہ یہی رہے گا۔“

”آپ کو لگتا ہے وہ بدلیں گے؟ نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا، ”میرے تایا کبھی اپنی شکست تسلیم نہیں کریں گے، آپ ان کو نہیں جانتے۔“

”آپ کے تایا کا مسئلہ ہوتا ہے کیا ہے حیا؟ بہت سے لوگوں کی طرح انہوں نے بھی اپنی بیٹی کو اسکارف اللہ کی رضا کے لیے کر دیا ہوگا، انہوں نے حجاب کے لیے اسٹینڈ لیا ہوگا، جیسے آج آپ لے رہی ہیں اور حجاب کے لیے ہر اسٹینڈ لینے والے کو آزمایا جاتا ہے۔ آپ کو خطرہ طعنے کے نشتروں سے آزمایا گیا کیونکہ یہی آپ کی کمزوری ہے کہ آپ کسی کی ٹیڑھی بات زیادہ برداشت نہیں کر سکتیں اور آپ کے تایا کو ”تعریف، ستائش اور واہ واہ“ سے آزمایا گیا۔ انہوں نے اپنی بیٹی کی بہت اچھی تربیت کی ہے۔ یہ بات ان سے لوگوں نے کئی ہوگی اور یوں ان کا وہ کام جو اللہ کی رضا کے لیے شروع ہوا تھا، اس میں تکبر اور خود پسندی شامل ہوگئی۔“

وہ بالکل یک دم ان کو دیکھے جاری تھی۔ اس نے تو کبھی اس بچے پہ سوچا بھی نہیں تھا۔

”اب اس خود پسندی میں وہ اتنے راجح ہو گئے کہ اپنی ہر بات ان کو درست لگتی ہے۔ یہاں ہر شخص نے اپنا دین بنا رکھا ہے، اصولوں کا ایک سیٹ اسٹینڈرڈ جس سے آگے پیچھے ہونے کو وہ تیار نہیں۔ آپ کے تایا کا بھی اپنا دین ہے، جو اس تک عمل کرے مثلاً صرف اسکارف لے، اس کو وہ سراہیں گے مگر جو اس سے آگے بڑھے، شرعی حجاب شروع کرے، مثلاً ان کے بیٹے یا داماد سے پردہ کرنے لگے، اس نے ان کے دین سے آگے نکلنے کی کوشش کی، نتیجتاً وہ ان کے عتاب کا شکار ہوا۔“

اس نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ جو اسے لگتا تھا کہ تایا اس کی مخالفت میں دین کے دشمن ہو گئے ہیں تو وہ غلط تھی۔ وہ یہ سب دین اور صحیح کام سمجھ کر ہی تو کر رہے تھے۔

”مگر اب اس سب کا انجام کیا ہوگا؟ یہ سب کدھر ختم ہوگا؟ انا اور اپنی نیکی پہ تکبر کی یہ جنگ..... کیا بنے گا اس کا؟“

اس کی بات پہ وہ دھیرے سے مسکرائے۔

”حیا! ابھی آپ نے احزاب کی پہیلی کی بات کی۔ اسے آپ نے حجاب سے تشبیہ دی۔“

”میں نے نہیں، میری دوست نے۔“ اس نے فوراً تصحیح کی۔

”دوست۔ آپ کی دوست نے یہ سب کہا؟ خندق، بنو قریظہ، بھوک اور جائز۔ سب کی حجاب سے تشبیہ دی جاسکتی ہے، مگر پھر بھی آپ ایک آخری چیز مس کر گئی ہیں۔“

”کیا؟“ وہ چونکی۔ کیا عائشہؓ کچھ مس کر گئی تھی؟

”آپ نے احزاب کی پہیلی ابھی مکمل حل نہیں کی۔ آپ بس ایک چیز نہیں دیکھ رہیں، وہ جو اس پہیلی کی اصل ہے، اس کی بنیاد ہے، ایک چیز جو آپ بھول گئی ہیں۔“

”کیا سر؟“ وہ آگے ہو کر بیٹھی۔

”اگر وہ میں آپ کو بتاؤں یا سمجھاؤں تو آپ کو اس کا اتنا فائدہ نہیں ہوگا جتنا آپ کے خود سوچنے سے ہوگا۔ قرآن کی پہیلیاں خود حل کرنی پڑتی ہیں۔ خود سوچیں، خود دھونڈیں، آپ کو اپنے مسئلے کا سیدھا سیدھا حل نظر آجائے گا۔“

اس نے مسکرا کر سر اثبات میں ہلایا۔ اب اسے پہیلیاں بوجھنا اچھا لگتا تھا۔

”ٹھیک ہے، میں خود سوچوں گی۔ مگر سر! لوگ مجھے دقیقاً تو یہی کہتے ہیں تو میرا دل دکھتا ہے، میں اپنے دل کا کیا کروں؟“ وہ ایک ایک کر کے دل میں جیسے سارے کانٹے باہر نکال رہی تھی۔ اذیت ہی اذیت تھی۔

”دقیقاً تو یہی کیا ہوتا ہے حیا؟“

اس نے جواب دینے کے لیے لب کھولے، وہ کہنا چاہتی تھی کہ پرانا، بیک ورڈ، پینڈو، مگر زک مٹی۔ اہل علم کے سوالات کا جواب کسی اور طریقے سے دینا چاہیے۔

”آپ بتائیں سر! کیا ہوتا ہے؟“

ڈاکٹر حسن ذرا سے مسکرائے۔ ”اصحاب کہف کا قصہ تو سنا ہوگا آپ نے؟ جس بادشاہ کے ظلم و جبر سے، اور اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری سے روکے جانے پہ انہوں نے اپنے گھر چھوڑ کر غار میں پناہ لی تھی، اس بادشاہ کا نام دقیقاً تو یہ تھا۔“

King Decius دقیقاً تو یہی طریقہ اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری سے روکنا تھا۔ سو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی کوئی بھی چیز دقیقاً تو یہی کیسے ہو

سکتی ہے؟“ وہ لمحے بھر کو بالکل چپ رہ گئی۔

”میں تو یہ سمجھ جاؤں، مگر ان کو کیسے سمجھاؤں؟ میں نے اپنی اماں سے ایک گھنٹہ بحث کی مگر وہ نہیں سمجھیں۔“

”آپ کی عمر کتنی ہوگی؟“

”تیس سال کی ہونے والی ہوں۔“ اس نے بنا حیران ہوئے قہقہے سے بتایا۔

”آپ کو بارہ، تیرہ برس کی عمر سے اس کا ہف لینا چاہیے تھا، مگر آپ نے بائیس، تیس برس کی عمر میں لیا۔ جو بات دس سال، ایک دوست کی موت اور ایک بھیا کی حادثے کے بعد آپ کی سمجھ میں آئی، آپ دوسروں سے کیسے توقع کرتی ہیں کہ وہ ایک گھنٹے کی بحث سے اسے سمجھ لیں گے؟“ وہ بہت نرمی سے اس سے پوچھ رہے تھے۔

”تو کیا ان کو بھی میرا موقف سمجھنے میں دس سال لگیں گے؟“

”اس سے زیادہ بھی لگ سکتا ہے اور کم بھی، مگر آپ انہیں ان کا وقت تو دیں۔ کچھ چیزیں وقت لیتی ہیں حیا!“

”مگر انسان کتنا صبر کرے! کب تک صبر کرے؟“ وہ اضطراب سے ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولی۔

”جب زخم پہ تازہ تازہ دو کا قطرہ گرتا ہے تو کسی ہی جلن اور تکلیف ہوتی ہے۔ میرے بچے! صبر کی ایک شرط ہوتی ہے، یہ صرف اسی مصیبت پہ کیا جاتا ہے جس سے نکلنے کا راستہ موجود نہ ہو۔ جہاں آپ اپنے دین کے لیے لڑ سکتی ہوں، وہاں لڑیں وہاں خاموش نہ رہیں۔ آپ سے آیت حجاب میں اللہ نے کیا وعدہ کیا ہے؟ یہی کہ آپ چادریں اپنے اوپر لٹکائیں تاکہ آپ پہچان لی جائیں۔ یہ جو ”پہچان لی جائیں“ ہے نا، عربی میں ”عرف“ کہتے ہیں۔ اس کا مطلب ”تاکہ آپ عزت سے جانی جائیں“ بھی ہوتا ہے۔ آپ اپنا وعدہ نبھارہی ہیں تو اللہ تعالیٰ سے کیا توقع کرتی ہیں؟ وہ آپ کو عزت دینے اور اذیت سے بچانے کا وعدہ نہیں نبھائے گا کیا؟“

مرہم لگنے کے باوجود زخم درد کر رہے تھے۔ اس کے گلے میں آنسوؤں کا گولا سا بنا گیا۔

”مگر کب سر؟ کب میں تبدیلی دیکھوں گی؟“ اس کی آواز میں نمی تھی۔

”مزدور کو اجرت مزدوری شروع کرتے ہی نہیں ملتی حیا! بلکہ جب مطلوب کام لے لیا جاتا ہے تب ملتی ہے، شام ڈھلے، مگر کام ختم ہوتے ہی مل جاتی ہے، اس کے پسینے کے خشک ہونے کا انتظار کیے بغیر۔ ابھی آپ نے کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی رضا صرف تمنا اور خواہش سے نہیں مل جاتی۔ اس کے لیے محنت کرنی پڑتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے راستے میں تھکنا پڑتا ہے، پھر ہی اجرت ملتی ہے۔“ فون کی گھنٹی بجی تو وہ رُکے اور ریسیور اٹھایا۔ چند ثانیے کو وہ عربی میں بات کرتے رہے، پھر ریسیور رکھ کر اٹھیں۔

”میں تمہاری دیر میں آتا ہوں، تب تک آپ بیٹھیں۔ سوری! میں آپ کو زیادہ کچھ آفر نہیں کر سکتا، سوائے اس کے۔“ انہوں نے سائیڈ

نیبل پر رکھا شیشے کا جار اس کے سامنے میز پر رکھا جو گلابی ریپر والی کینڈیز سے بھرا تھا۔

”اُس ادا کے سرا“ وہ خفیف سی ہو گئی۔

”دو بیٹے قبل ہم ترکی گئے تھے، یونیورسٹی آف اسٹن بول میں ایک کانفرنس تھی، اس سلسلے میں۔ یہ میں کہا دو کیہ سے لایا تھا۔ آپ کو ترکی پسند ہے، سو یہ بھی اچھی لگے گی۔ میں ابھی آتا ہوں۔“ وہ مسکرا کر بتاتے ہوئے چند کتب اٹھائے، جن میں سر فہرست ہولی بائبل تھی، باہر نکل گئے۔ اس نے بیٹکی آنکھیں رگڑیں اور پھر مسکرا کر جا رکھولا۔ اندر ہاتھ ڈال کر دو کینڈیز نکالیں۔ گلابی ریپر اُتار کر اس نے کینڈی منہ میں رکھی، پھر ریپر کو انٹ پلٹ کر دیکھا۔ اس پہ کوئی عجیب وغریب سا غار بنا تھا۔ جو بھی تھا، اس نے دوسری کینڈی اور ریپر پرس میں ڈال دیے۔ ترکی سے متعلقہ ہر چیز اسے بہت پیاری تھی۔

کینڈی کو اپنے منہ میں محسوس کرتے، اس نے گردن موڑ کر بند دروازے کو دیکھا جہاں سے ابھی ابھی سر گئے تھے۔ کچھ لوگ صرف دین کی وجہ سے آپ کے کتنا قریب آ جاتے ہیں نا۔

☆ ☆ ☆

صبح آفس جانے سے قبل وہ ڈاننگ نیبل پہ جلدی جلدی ناشتا کر رہی تھی۔ کھل سے اس کا دل اتنا پر سکون تھا کہ کوئی حد نہیں۔ کبھی کبھی انسان کو اپنا بوجھ بانٹ لینا چاہیے، مگر صبح بندے کے ساتھ اور صبح وقت پہ۔

”نور بانو!“ فاطمہ قریب ہی کچن میں کھڑی نور بانو کو ہدایات دے رہی تھیں۔

”عابدہ بھابھی اور حشر ددیہر کے کھانے پہ یہاں ہوں گی، تم لٹچ کی تیاری ابھی سے شروع کر دو۔ یوں کرنا کہ.....“

جس کا گلاس لبوں سے لگاتے ہوئے وہ بھر گئی۔

یہ عابدہ چچی اور حشر کے چکر ان کے گھر بڑھ نہیں گئے تھے! پرسوں ہی تو وہ آئی تھیں اور پچھو کے لیے ایک بہت قیمتی جوڑا بھی لائی تھیں۔ آج پھر آ رہی تھیں۔ کیوں بھلا؟

”اماں!“ کرسی سے اٹھ کر نشہ سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے اس نے فاطمہ کو آتے دیکھا تو پکار لیا۔

”چچی کیوں آ رہی ہیں، ابا سے ملنے؟“

”نہیں! تمہاری پچھو کے ساتھ شاپنگ پہ جانا چاہتی ہیں۔ حشر کے کالج میں کوئی فنکشن ہے۔ اسے آئرش طرز کی ڈلہن بننا ہے۔ وہ

اس کے لیے کوئی خاص ڈریس بنوانا چاہتی ہے۔ سین کو تجربہ ہے نا کپڑوں وغیرہ کا، اس لیے۔“

”اچھا۔“ وہ اچھٹے سے عیاں پہننے لگی۔

”پہلے تو حشر کسی سے مشورہ نہیں لیتی تھی، اب کیوں؟ اور پچھو کیوں؟ یا پھر وہ جہاں سکندر بنتی جا رہی تھی۔ ہر ایک پہ شک کرنا۔

اُف!“ وہ غائب کی پٹی سر کے پیچھے باندھ کر باہر نکل آئی۔

”خیر جو بھی ہے۔“ اسے آتے دیکھ کر ڈرائیور نے فوراً بچھلی نشست کا دروازہ کھولا۔ وہ اندر بیٹھے ہی لگی تھی کہ.....

”جیا!“ ارم کی آواز نے اسے چونکایا۔ وہ بیٹھے بیٹھے رکی اور حیرت سے پلٹی۔ ارم سامنے ہی کھڑی تھی۔ سر پہ دوپٹا لیے، آنکھوں تلے

حلقہ چہرے پہ سنجیدگی۔

”ارم؟“ اسے حیرت ہوئی۔ ارم چلتی ہوئی اس کے سامنے آئی۔

”بات کرنی تھی تم سے۔“ پھر اس نے ڈرائیور کو دیکھا۔

”تم باہر جاؤ۔“ وہ جیسے اسی جگہ پہ بات کرنا چاہتی تھی۔ ڈرائیور فوراً تابع داری سے وہاں سے ہٹ گیا۔

”بتاؤ کیا بات ہے؟“ اس نے نرمی سے پوچھا۔ ارم چند لمحے اسے سنجیدگی سے دیکھتی رہی، پھر دھیرے سے بولی۔

”اس روز میں نے جوسنا، وہ وہاں جا کر کہتا ہوں صرف اس لیے کیونکہ مجھے تم پہ غصہ تھا۔ کیونکہ تم نے بھی میرا پردہ نہیں رکھا تھا۔“

”ارم! اگر تم نہ بھی بتا تیں اور مجھ سے کوئی پوچھتا کہ وہ کیوں گیا ہے تو میں خود ہی بتا دیتی۔ جہاں تک بات ہے میری..... مجھے بتانے

رات کے تین بجے فون کر کے پوچھا تھا کہ میرے پاس کوئی دوسرا نمبر ہے یا نہیں، اگر تم نے مجھ پہ بھروسہ کیا ہوتا تو میں بھی تم پہ بھروسہ کرتی کہ تم مجھے

پھنساؤ گی نہیں۔“ وہ گاڑی کے کھلے دروازے کے ساتھ ہی کھڑی، بہت سکون سے کہہ رہی تھی۔ ارم چند لمحے لب کاٹتی رہی، پھر نفی میں سر ہلایا۔

”مگر میں نے اس روز زیادتی کر دی تمہارے ساتھ۔ آئی ایم سوری فار ویت۔“ مجھے یہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔“ حیا نے بغور اسے دیکھا۔

وہ واقعی نام نہان تھی یا اس کے پیچھے کوئی اور مقصد تھا۔ البتہ اس کا دل پسینے لگتا تھا۔

”کوئی بات نہیں۔ کیا فرق پڑتا ہے؟“

”فرق تو پڑا ہے نا، اسی وقت سے عابدہ چچی، پھپھو کے پیچھے پڑی ہیں کہ تمہارا پتا صاف ہو اور وہ جہاں کے لیے محرش کی بات

چلا سکیں۔“

”کیا؟“ وہ چونکی۔ اس کی آنکھوں میں حیرت ابھری۔

”ہاں! اسی لیے تو روز ہی پھپھو کے پاس آئی بیٹھی ہوتی ہیں۔ کیا تم نہیں جانتیں؟“ اب کے ارم کو حیرت ہوئی۔ حیانے بمشکل شانے

اچکائے۔

”جو بھی ہے، مجھے ان باتوں سے فرق نہیں پڑتا۔“ اس نے بظاہر لاپرواہی سے کہا، البتہ اس کا دل اٹھل پھٹھل ہو رہا تھا۔

”مگر..... خیر۔“ ارم نے گہری سانس لی۔ لمبے بھر کو وہ خاموش رہی پھر بولی۔

”کیا مجھے تمہارا فون مل سکتا ہے، مجھے ایک کال کرنی ہے بس!“ اس کا لہجہ متحلی نہیں ہوا، بلکہ ہموار رہا۔ ”بس مجھے اس قفسے کو ختم کرنا ہے،

بس اسے خدا حافظ کہنا ہے۔“

تو یہ بات سنی۔ حیانے گہری سانس اندر کو کھینچی۔ ارم نے ”جسے“ بھی فون کرنا وہ اسے اپنے لینڈ لائن یا کسی بھی طرح ماں، بھابھی کی کا بھی فون لے کر سکتی تھی، مگر غائبانہ وہ پہلے پکڑی گئی ہوگی یا پھر سختی بڑھ گئی تھی، تب ہی وہ خطرہ مول نہیں لیتی تھی۔

”ٹھیک ہے! مگر بہتر ہے کہ تم میرا فون استعمال مت کرو..... الٹی بخش!“ اس نے دور کھڑے ڈرائیور کو آواز دی۔ وہ فوراً ہاتھ باندھے ان کے پاس آیا۔

”کیا میں تمہارا فون لے سکتی ہوں ایک منٹ کے لیے؟“

”جی، جی!“ اس نے فوراً اپنا موبائل پیش کیا اور دور چلا گیا۔

”لو!“ حیانے موبائل ارم کی طرف بڑھایا۔ ارم نے بنا کسی ہچکچاہٹ کے فون تھا ما اور تیزی سے نمبر ملانے لگی۔

وہ گاڑی میں بیٹھی اور دروازہ بند کیا۔ باہر ارم جلدی جلدی فون پر دھیمی آواز میں کچھ کہہ رہی تھی۔ اسے کچھ بھی سنائی نہیں دیا۔ نہ اس نے سننے کی کوشش کی۔ ایک منٹ بعد ہی ارم نے فون بند کر دیا۔ حیانے مٹن دبا یا، شیشہ نیچے ہوا۔

”تھمکنس حیا!“ ممنونیت سے کہتے ہوئے اس نے فون حیا کو تھمایا۔ ”میں چلتی ہوں۔“ وہ تیزی سے واپس مڑ گئی۔ جب وہ درمیانی دروازہ پار کر گئی تو حیانے موبائل کے کال ریکارڈز چیک کیے۔ اس نے ڈائلنگ کالز میں سے کال مٹا دی تھی مگر یہ نوکیلا کا وہ ماڈل تھا جس میں ایک کال لاگ الگ سے موجود تھا۔ حیانے اسے کھولا۔ وہاں نمبر محفوظ تھا۔ اس نے وہ نمبر اپنے موبائل میں اتارا اور محفوظ کر لیا۔

”الٹی بخش!“ اب وہ دور کھڑے الٹی بخش کو واپس آنے کے لیے کہہ رہی تھی۔

”کبھی اگر ارم نے اسے پھنسانے کی کوشش کی، تو اس کے پاس ثبوت بھی تھا اور موقع کا گواہ بھی۔“ الٹی بخش کو آتے دیکھ کر اس نے سوچا تھا۔

”ذیشان صاحب کے آفس لے چلو! جہاں اس دن گئے تھے۔“ فون آگے ہو کر اسے تھماتے ہوئے اس نے الٹی بخش کو ہدایت دی۔

”اور ارم بی بی نے تمہارا فون استعمال کیا ہے، یہ بات کسی اور کو بتانے لگی چاہیے۔“

”جی ہیم!“ اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اسٹیرنگ سنبھال لیا۔

☆ ☆ ☆

ذیشان انکل آفس میں نہیں تھے۔ ان کی بیکریٹری پھر بھی اسے آفس میں لے گئی کیونکہ رجا (ان کی ایب نارمل بیٹی) اندر تھی۔

”آپ بیٹھ جائیے۔ سر ابھی آتے ہوں گے۔“ جاتے ہوئے ان کی بیکریٹری نے اوپر سے نیچے تک ایک عجیب سی نظر اس پر ڈالی تھی۔

وہ بنا اثر لیے کاؤچ پر بیٹھ گئی۔ اس کے عیاں کو بہت سی جگہوں پر اسی طرح دیکھا جاتا تھا مگر جب دوسرے غلط ہو کر اسے پر اعتماد تھے تو وہ درست ہو کر پر اعتماد کیوں نہ ہو؟ اور وہ بھی کتنی پاگل تھی جو نالی اور اس کی باتوں کو دل سے لگا لیتی تھی۔ نالی بے چاری نے چند ایک بار فقرے اچھالنے کے سوا کہا ہی کیا تھا۔ وہ تو اہل مکہ تھی، ان سے کیا گلہ؟ اصل اذیت دینے والے تو بنو قریظہ ہوتے ہیں۔ مگر یہ جنگ وہی جیتتا ہے جو ہار نہیں

بابر سیکریٹری کو بتا کر، رجا کو ”بائے“ کہہ کر وہ تیزی سے باہر آئی تھی۔ گاڑی میں ہی اس نے اپنے موبائل سے گوگل آن کیا اور ایک

اینا گرام فائٹر روپ سائٹ کھولی تاکہ وہ دیکھ سکے کہ سائیڈ اسٹور سے کتنے ممکنہ الفاظ بن سکتے ہیں۔

”پانچ ہزار چار سو تراسی مجموعات؟“ نتیجہ دیکھ کر اس نے گہری سانس لی۔ اب ان میں سے کون سا درست ہو سکتا ہے بھلا؟ خیر، وہ ان تمام الفاظ کو دیکھتی ہے، شاید کچھ مل جائے۔

پہلا مجموعہ تھا۔ ”Pasty Powders“

”اؤنہوں!“ اس نے ننگی سے نفی میں سر ہلایا۔

”So Try Swopped“، ”Trays Swopped“

وہ ان عجیب وغریب مجموعات پر سے نظر گزراتی تیزی سے موبائل اسکرین کو اُننگلی سے اوپر نیچے کر رہی تھی کہ ایک مجموعہ الفاظ پہنچ رہی تھی۔

Story Swapped کے حرف کو آگے پیچھے کرنے سے بننے والے یہ دو الفاظ تھے۔

Type Password

”ٹائپ پاس ورڈ؟“ اس نے اچھنبے سے دہرایا۔ ”یعنی کہ پاس ورڈ ٹائپ کرو۔ کیا مطلب؟“ اور پھر روشنی کے کسی کوندے کی طرح وہ اس کے دل و دماغ کو روشن کر گیا۔

”پاس ورڈ..... پاس ورڈ میں پورے آٹھ حروف ہوتے ہیں۔ ٹائپ پاس ورڈ کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ کوئی خفیہ لفظ ٹائپ کرے، بلکہ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ لفظ ”پاس ورڈ“ ہی ٹائپ کر دے۔

لفظ ”پاس ورڈ“ جو آج بھی دنیا میں سب سے زیادہ استعمال ہونے والا پاس ورڈ ہے، لاکھوں امی میل ہولڈرز کا پاس ورڈ آج بھی یہی لفظ ”پاس ورڈ“ ہی ہے۔ دنیا کا سب سے کامن، سب سے آسان پاس ورڈ۔ اس نے موبائل بند کیا اور پرس میں ڈالا۔

”تیز چلاؤ الٹی بخش!“ وہ بے چینی سے بولی۔ اپنے آفس پہنچنے کی اتنی جلدی اسے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔

”میں آفس جاری ہوں مگر پلیز! میں کسی سے ملنا نہیں چاہتی، سو مجھے کوئی ڈسٹرب نہیں کرے گا۔ ٹھیک؟“ ابا کی سیکریٹری کو حکم یہ لہجے میں کہتے ہوئے وہ آگے بڑھ گئی۔

آفس مقفل کرنے اور نقاب اتارنے کے بعد اس نے لیپ ٹاپ کھول کر میز پر رکھا اور پرس سے عملیں ڈبی نکالی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اندر سیافلیش ڈرائیو کی سی رکھی تھی۔ اس نے اسے باہر نکالا اور ڈھکن کھول کر ساکٹ میں ڈالا۔

چند لمحوں بعد اسکرین پہ آٹھ چوکھٹے اس کے سامنے چمک رہے تھے۔ کی بورڈ پہ اُنگلیاں رکھ کر اس نے لمبے بھر کو آنکھیں بند کر کے گہری سانس اندر کو کھینچی اور پھر آنکھیں کھولی۔ اگر وہ غلط ہوئی تو وہ اس فائل کو کھودے گی، مگر اسے یقین تھا کہ ”پاس ورڈ“ ہی وہ لفظ تھا جو اسے اس فائل میں داخل کر دے گا۔ غنڈی پڑتی اُنکلیوں سے اس نے ٹائپ کیا۔

”ہی اے ایس ایس ڈبلیو اور آر ڈی۔“

اور انٹر پہ اُننگلی رکھ دی۔ چند لمبے خاموشی چھائی رہی، پھر ہراسٹل چکا۔ Acces Granted (یکسیس گرانٹڈ) پاس ورڈ درست تھا۔

”یا اللہ!“ وہ خوش ہو، یا حیران، اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، مگر دل کی دھڑکن مزید تیز ہو گئی تھی۔ اسکرین پہ اب وہ فائل کھل رہی تھی۔ اس کے لیے جو پروگرام کمپیوٹر نے کھولا وہ ونڈوز میڈیا پلیر تھا۔

”میڈیا پلیر؟“ اس نے اچھنبے سے اسکرین کو دیکھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ فائل کوئی ویڈیو یا آڈیو تھی۔ اس کا پہلا خیال اپنی اور ارم کی ویڈیو کی طرف گیا تھا، داور بھائی کی مہندی کی.....

مگر اسے زیادہ کچھ سوچنے کا موقع نہیں ملا۔ وہ کوئی ویڈیو تھی اور شروع ہو چکی تھی۔

اس کے پہلے منظر پہ نظر پڑتے ہی حیا سلیمان کا سانس رُک گیا۔ اسے لگا وہ کبھی بل نہیں سکے گی۔

”اللہ، اللہ، یہ کیسے.....؟“ وہ سفید پڑتا چہرہ لیے چمکتی اسکرین کو دیکھ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

جو کام پنہا کر اسے بہارے گل سے پنہا تھا، وہ کام ابھی نہیں ہوئے تھے، مگر وہ جانتا تھا کہ آج دو پہر سے اچھا موقع اسے حلیمہ عثمان

کے گھر جانے کا نہیں ملے گا، اس لیے وہ ادھر آ گیا تھا۔

حلیہ آئی نے دروازہ کھولا تو وہ سامنے ہی کھڑا تھا۔ سوٹ میں ملبوس، وہی گلاسز، جیل سے پیچھے کیے بال اور عبدالرحمن کے ماتھے کے مخصوص بل۔

”عبدالرحمن؟ آ جاؤ“ وہ خوش گوار حیرت سے کہتے ہوئے ایک طرف ہوئیں۔

”سفیر کدھر ہے حلیہ؟“ بے تاثر اور سپاٹ انداز میں پوچھتے ہوئے اس نے اندر قدم رکھا۔ یہ تو طے تھا کہ وہ لوگوں کو کبھی ریلیشن شپ ٹائٹل سے نہیں بلایا کرتا تھا۔ صرف ان کے پہلے نام لیا کرتا تھا۔

”ہٹل میں ہوگا، کال کروں اسے؟“

”نہیں! آپ اسے کال نہیں کریں گی..... اور بہارے؟“ اس نے ایک لفظی استفسار کیا۔ جتنا حلیہ عثمان اسے جانتی تھیں، وہ بہانہ پگئیں کہ وہ بہت بُرے موڈ میں تھا۔

”وہ اندرا سٹڈی روم میں بیٹھی ہے۔ بہت اُداس ہے۔“ انہوں نے ملال سے بتایا۔ شاید اس کا دل نرم کرنے کی کوشش کی۔

”حرکتیں جوابی ہیں اس کی۔“ وہ بے حد بے غصے سے کہتے ہوئے لمبے لمبے ڈگ بھر کر اسٹڈی روم کی جانب بڑھ گیا۔

بنادستک کے دروازہ دھکیلا تو کرسی پہ بیٹھی بہارے گل نے چونک کر سر اٹھایا۔ پورے تھنکھریالے بالوں کی پونی بنائے، لمبے فرائک میں ملبوس وہ جو دقائق غم زدہ لگ رہی تھی، اسے دیکھ کر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

”عبدالرحمن!“ وہ کرسی سے اٹھی اور میز کے پیچھے سے گھوم کر سامنے آئی۔ بہارے کا پھول جیسا چہرہ کھل اٹھا تھا۔

”بہت اچھا لگتا ہے تمہیں دوسروں کو اذیت دینا؟“ وہ اتنے غصے سے بولا تھا کہ وہ دہیں رگ گئی۔ چہرے کی جوت بجھی گئی۔

”میں تمہارے لیے کیا نہیں کرتا اور تم بدلے میں میرے مسائل بڑھانے پہ تلی ہو۔ تم میری دشمن ہو یا دوست؟“ اس کی بڑی بڑی بھوری آنکھوں میں نئی نئی آرائی۔

”تم مجھ سے ناراض ہو عبدالرحمن؟“

”نہیں، نہیں! میں تم سے بہت خوش ہوں۔ اتنا پیسہ خرچ کر کے، اتنی مشکل سے میں نے تمہارے لیے پاسپورٹ بنوایا تھا۔ نئی شناخت، نیا گھر، نئی زندگی..... مگر تم نے اسے جلادیا۔“ وہ اتنی برہمی سے جھڑک رہا تھا کہ کوئی حد نہیں۔

بہارے غٹکی سے سر جھکائے واپس کرسی پہ جا بیٹھی۔

”مجھے نیا گھر نہیں چاہیے۔ اگر میں چلی جاتی تو تمہاری مدد کون کرتا؟ میں نے تم سے مدد کا وعدہ کیا تھا نا۔ تمہیں میری ضرورت ہے، میں اس لیے نہیں گئی۔“ چند لمحوں بعد سر اٹھا کر بہت سمجھداری سے اس نے سمجھایا۔

”اچھا! مجھے تمہاری ضرورت ہے؟“ وہ استہزائیہ انداز میں کہتا آیا اور کرسی کھینچ کر ٹانگ پہ ٹانگ رکھ کر بیٹھا۔ اب دونوں کے درمیان میز حائل تھی۔

”ہاں! ہے۔ میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔“

”مجھے ایک بے وقوف بچے کی کسی مدد کی ضرورت نہیں ہے، سنا تم نے!“

”مجھے بچہ مت کہو۔“ بہارے نے دبے دبے غصے سے اسے دیکھا۔ میں پورے ساڑھے پانچ سال بعد پندرہ سال کی ہو جاؤں گی۔

”اور پھر؟“

”اور..... اور تم مجھ سے تب شادی کرو گے۔ کرو گے نا؟“ اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ عائشہ نے بھی ہو، تب بھی اسے لگتا کہ وہ کہیں نہ کہیں سے غٹکی سے اسے دیکھ رہی ہے۔

”بہارے گل!“ اس نے بے زاری سے سر جھٹکا۔ ”میں تم سے کبھی شادی نہیں کروں گا، بلکہ جو تم کر رہی ہو، اس سے تم مجھے مروا ضرور

دوگی۔“

”نہیں! ایسے مت کہو۔ میں تمہیں ہرٹ نہیں کر سکتی۔“ اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ ”مگر تم ہمیشہ مجھے ہرٹ کرتے ہو، تم ہمیشہ مجھ سے

جھوٹ بولتے ہو۔“

”اچھا! کون سا جھوٹ بولا ہے میں نے؟ ذرا میں بھی تو سنوں۔“ اس کے تیور ایسے ہی لگ رہے تھے مگر پلکیں کھینچ کر اب وہ جس طرح اسے دیکھ رہا تھا، بہارے کو محسوس ہوا وہ دلچسپی سے اس کی بات سننے کا منتظر ہے اور اس کا غصہ بھی ذرا کم ہوا ہے۔

”بہت سارے جھوٹ..... اتنے تو اداوار میں بگلے نہیں ہیں، جتنے جھوٹ تم نے مجھ سے بولے ہیں۔“ وہ خفا سے انداز میں مگر ڈرتے ڈرتے کہہ رہی تھی۔ ”مگر اب مجھے سب پتا چل گیا ہے۔“

”مثلاً کیا پتا چل گیا ہے تمہیں میرے بارے میں؟“ بہارے کو لگا وہ ذرا سا مسکرایا تھا۔ غلیظ دیتی مسکراہٹ۔ اُکسانتی ہوئی مسکراہٹ۔

”بہت ہی باتیں..... یہ کہ تمہارا اصلی نام عبدالرحمن نہیں ہے اور یہ بھی کہ تمہارا نام بہانہ کھنڈر ہے اور تم ہی مینا کے کزن ہو۔“ جہان ایک دم فس پڑا۔ بہارے کو حوصلہ ہوا۔ اسے بُرا نہیں لگا، وہ اسے ڈانٹنے لگا نہیں۔ اس کو ذرا تقویت ملی۔

”صبر نہیں ہوا غائے سے..... میں نے اسے کہا تھا کہ جاتے وقت بتائے۔ اس نے ابھی بتا دیا۔“ وہ جیسے بہت منظور ہوا تھا۔

”اس نے اپنے جاتے وقت ہی بتایا تھا۔ تم بہت جھوٹ بولتے ہو عبدالرحمن۔“ بہارے نے غصے سے اسے دیکھا تھا۔

”اور یہ بات تم نے کتنے لوگوں کو بتائی ہے؟“ وہ کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔ اس کے تاثرات اب تک ہموار ہو چکے تھے۔ نہ غصہ تھا، نہ منظور سی مسکراہٹ۔

”کسی کو نہیں۔ پر اس۔“

”مجھے امید ہے کہ تم اسے راز رکھو گی۔ کیا تمہیں راز رکھنے آتے ہیں بہارے گل؟“ میز پر دونوں ہتھیلیاں رکھ کر اس کی طرف جھک کر وہ بنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔ بہارے نے اثبات میں سر ہلایا۔

”مجھے راز رکھنے آتے ہیں۔“

”تمہارا پاسپورٹ کہاں ہے؟“

”میں نے جلا دیا اور میں یہاں سے نہیں جاؤں گی۔“ اس کے تھوڑی دیر قبل ہنسنے کا اثر تھا، جودہ ذرا نرمی سے انداز میں بولی تھی۔

”میں تمہارا نیا پاسپورٹ جلد ہی مجھ کو اداؤں گا اور تمہیں جانا پڑے گا، کیونکہ میں بھی یہاں سے جا رہا ہوں۔“ وہ واپس سیدھا ہوا۔

”کدھر ہمارے ساتھ؟“ اس کا چہرہ جھک اٹھا۔

”نہیں! بلکہ یہاں سے بہت دور اور میں تم سے آخری دفعہ مل رہا ہوں۔ اب ہم کبھی نہیں ملیں گے۔ تم مجھے ایک اچھی یا بُری یاد سمجھ کر بھلا دینا۔ مجھے یہاں سے نکلنا ہے اس سے قبل کہ میں گرفتار ہو جاؤں اور اگر میں گرفتار ہوا تو مجھے پھانسی ہو جائے گی۔ اگر تم نہیں چاہتیں کہ میرے ساتھ یہ سب ہو، تو میری بات مانو۔ جب پاسپورٹ آجائے تو چلی جانا۔“ وہ بے تاثر لہجے میں کہہ کر جانے کے لیے مڑا۔

”مگر تم کہاں جا رہے ہو؟“ وہ پریشانی سے کہہ اٹھی۔

جہان نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

”میں جہاں بھی جا رہا ہوں، اس کے بارے میں تمہیں، عائشے، آنے یا یا شاید کوئی بتا سکتا۔ اس لیے یہ سوال مت کرو۔“

”کیا تم نے کسی کو نہیں بتایا کہ تم کہاں جا رہے ہو؟“ وہ آنسو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے ہنسنے لگی۔

”میں نے آنے سے کچھ دن پہلے حیا کو بتایا تھا، اسے معلوم ہے میں کدھر جا رہا ہوں۔ اسے راز رکھنے آتے ہیں۔“ وہ کہہ کر دروازہ کھولتا باہر نکل گیا۔

بہارے گل بھاگ کر باہر آئی۔ بیٹگی، آنکھوں سے اس نے اپنے عبدالرحمن کو بیرونی دروازہ پار کرتے دیکھا۔ یہ خیال کہ وہ اسے آخری دفعہ دیکھ رہی ہے، بہت اذیت ناک تھا۔ آنسو ٹپ ٹپ اس کے چہرے پر لڑھکنے لگے۔

آج پہلی دفعہ اسے یقین آیا تھا کہ وہ آخری دفعہ عبدالرحمن کو دیکھ رہی ہے۔

مگر بہت جلد وہ غلط ثابت ہونے والی تھی۔



اسکرین کی روشنی اس کے سفید پڑتے چہرے کو بھڑکا رہی تھی۔ وہ سانس روکے، ایک نکل اس منظر کو دیکھ رہی تھی جو اس کے سامنے چل

رہا تھا۔

وہ ایک کمرے کا منظر تھا۔ نفاست سے بنا ہئیکل، کھڑکی کے آگے گرے پردے۔ کیمرا کسی اونچی جگہ پر رکھا تھا، کیونکہ اسے سامنے رائٹنگ ٹیبل کی خالی کرسی نظر آرہی تھی۔ کیمرا یقیناً کمپیوٹر مانیٹر کے اوپر رکھا گیا تھا۔ مانیٹر نظر نہیں آ رہا تھا، مگر وہ جانتی تھی کہ یہاں کمپیوٹر ہی رکھا ہوتا ہے۔ وہ کمرہ پہلے کئی بار دیکھ چکی تھی۔ کمرے نے اسے نہیں چونکا یا تھا، اس شخص نے چونکا یا تھا جو ابھی ابھی کرسی پر آکر بیٹھا تھا۔

”میں امید کرتا ہوں مادام! آپ وہ پہلی اور آخری شخصیت ہوں گی جو اس فائل کو کھول پائیں گی۔“ اس کے ہاتھ میں مونگ پھلی کا پیکٹ تھا، جسے کھولتے ہوئے وہ مخاطب تھا۔ کس سے..... یقیناً حیا سے۔

وہ سانس روکے اسے دیکھ گئی۔

”میرزا نام جہان سکندر احمد ہے۔“ بہت ہڈ سکون سے انداز میں گویا اسے دیکھتے ہوئے وہ کہہ رہا تھا۔

”میجر جہان سکندر احمد! احمد میرے دادا کا نام تھا اور یہی میرا سرنام ہے۔ میں جانتا ہوں، تم یہ سمجھتی ہو کہ میں یعنی میجر احمد، بچہ تھا۔ ایسا نہیں ہے۔ میں بچہ نہیں تھا۔“ بات کرنے کے ساتھ ساتھ وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد مونگ پھلی نکال کر منہ میں رکھتا تھا۔

وہ بت بنی اسے دیکھ رہی تھی۔ بنا پلک جھپکے، دم سادھے۔ چند لمبے ٹھہر کر وہ بولا۔

”میں ڈولی تھا۔ یاد ہے تمہیں؟“ وہ ذرا سا مسکرایا تھا۔ گیم جیتنے کے بعد لنگ میکر کی مخصوص مسکراہٹ۔ وہ اسے نہیں جانتی تھی، نہیں پہچانتی تھی۔

”ایک چوتھے نام سے بھی تم مجھے جانتی ہو۔ عبدالرحمن پاشا۔ ہوٹل گرینڈ کا مالک، ایک بُرا آدمی۔“ وہ گویا سانس لینے کے لیے زکا، پھر نفی میں سر ہلایا۔

”میں بُرا آدمی نہیں ہوں، نہ ہی کبھی تھا۔ میں چاہتا تھا کہ تم مجھے خود تلاش کرو۔ مجھے خود ڈھونڈو، مجھے ڈسکور کرو۔ بہت بار میں نے تمہیں بتانے کی کوشش کی، مگر تم نہیں سمجھ سکیں۔ سو میں نے چاہا کہ میں تمہیں خود بتا دوں۔“

وہ اب ٹیک لگا کر کرسی پر بیٹھا جیسے یاد کر کے، سوچ سوچ کر بول رہا تھا۔ اس کی نگاہیں دور کسی غیر مرئی نقطے پہ جمی تھیں۔

وہ بالکل سانس روکے، دم سادھے اسے دیکھ رہی تھی۔ یہ اس کی زندگی کا سب سے بڑا سرپرائز تھا۔

”میں نے تمہیں سب کچھ ڈائریکٹلی اسی لیے نہیں بتایا، کیونکہ میں کبھی اتنی آسانی سے، اتنے صاف لفظوں میں کسی کو کچھ نہیں کہا کرتا۔

میرے پیشے کا یہی تقاضا ہے اور میں نے اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ انفارمیشن کو ان کوڈ اور ڈی کوڈ کرنے میں صرف کیا ہے۔ اس لیے میں نے ایک پزل ترتیب دیا۔ ایک ٹریزمرٹ۔“

اور تم اسے حل کر لو گی۔ یہ میں جانتا ہوں۔ کب کر دو گی، تب میں کہاں ہوں گا۔ زندہ بھی ہوں گا یا نہیں، باہر ہوں گا یا پھر سے جیل میں.....

میں نہیں جانتا۔ بس اتنا جانتا ہوں کہ تم اسے حل کر لو گی۔“

جولائی کی گرمی میں ہی اس کے ہاتھ، پیر برف بن رہے تھے۔ وہ پلکیں بالکل بھی نہیں جھپک پارہی تھی۔ وہ بس اسکرین کو دیکھ رہی تھی، ایسے جیسے اس نے کبھی اسے نہ دیکھا ہو۔ وہ واقعی پہلی دفعہ اس شخص سے مل رہی تھی۔

”جب تک انسان کسی دوسرے کی جگہ پر کھڑا نہیں ہوتا، وہ نہیں جان پاتا کہ اصل کہانی کیا ہے۔ ایک ہی روایت میں اگر راوی اور مروی کی جگہیں بدل دو تو سارا قصہ ہی بدل کر رہ جاتا۔ پچھلے چند ماہ میں تمہاری زندگی کی کہانی کا حصہ رہا ہوں۔ اب میں چاہتا ہوں کہ تم میری طرف کی کہانی سنو۔“ بات کے اختتام پر وہ مسکرایا تھا۔

”اسے کہتے ہیں اپنی کہانیوں کو Swap کرنا، رائٹ؟“

”یو ایڈیٹ!“ بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا تھا۔ وہ ابھی تک پلکیں نہیں جھپک پارہی تھی۔



وہ ماہ دسمبر کے اسلام آباد کی خوب صورت، ٹھنڈی سی سہ پہر تھی۔ بادل ہر سو چھائے تھے۔ سبز درخت، سیاہ بادل، سرمئی سڑک، ایک ہڈ سکون ٹھنڈا سا امتزاج۔

وہ پینٹ کی جیسوں میں ہاتھ ڈالے، سر جھکائے سڑک کے کنارے چل رہا تھا۔ جس ہوٹل میں اسے جانا تھا وہ وہاں سے چند گز کے فاصلے پہ تھا۔ وہ عادتاً ٹیکسی سے مطلوبیہ مقام سے ذرا دور رُتر تھا۔ اب اسے پیدل چل کر ہوٹل تک جانا تھا۔

وہ وہی کر رہا تھا، مگر سر کے پچھلے حصے میں اٹھتا درد شدت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ وہ میگزین نہیں تھا، مگر شدت ویسی تھی۔ وہ غماہ نہیں کرتا تھا، لیکن تکلیف کبھی کبھی ناقابلِ برداشت ہو جاتی تھی۔ یہ الگ بات تھی کہ ابھی اس کی ذہنی اذیت کا بڑا سبب می کی باتیں، بنی ہوئی تھیں، صبح سے اس کے دماغ میں گھوم رہی تھیں۔ جب می غصے سے اسے ”جہان سکندر“ کہہ کر مخاطب کرتیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ اب اگر وہ بات نہیں مانے گا تو وہ ہرے۔ ہوں گی۔ ایسے مواقع کم آتے تھے مگر جب آتے تو اسے ڈکھی کر جاتے۔ تب اس کے پاس بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا تھا۔ آج بھی نہیں تھا۔ آج تو می نے کال کے اختتام پہ طعنہ بھی دے دیا تھا۔

”جہان سکندر! تم مجھ سے زیادہ اپنے باس کی مانند ہو، مجھے اب یہی لگا ہے۔“

ہوٹل کا بیرونی گیٹ سامنے تھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا اندر داخل ہوا۔ اسے کسی نے نہیں روکا، البتہ آج معمول سے زیادہ سیکورٹی نظر آرہی تھی۔ اینٹرنس کی نوپا کی طرف جاتے ہوئے وہ مختار نظروں سے اطراف کا جائزہ لے رہا تھا۔ یقیناً ہوٹل میں کوئی خاص تقریب ہوتی تھی، جس کی وجہ سے سیکورٹی عام دنوں سے کہیں زیادہ تعینات کی گئی تھی۔

ابھی وہ اینٹرنس سے ذرا دور تھا۔ جب اس کا موبائل بجا۔ وہ ڈاکواریا جیکٹ کی جیب سے موبائل نکالا۔ اس کا سلور اسمارٹ فون جو کچھ عرصہ قبل اسے دیا گیا تھا، جس میں لگے بے حد بیش قیمت سرپلینس (مگرانی کرنے والے) آلات اس کی قیمت کو اسی ماڈل کے کسی بھی فون سے کئی گنا زیادہ بنا چکے تھے اور وہ جانتا تھا کہ موجودہ کام ختم ہوتے ہی اسے یہ سب واپس کرنا ہوگا، سیکرٹ فنڈ کی ایک ایک پائی کا حساب اور سٹی فیکیشن انہیں ہی دینی پڑتی تھی۔

”مسز پائزر!“ اسکرین پہ یہ نام جل بھڑ رہا تھا۔ وہ عادتاً کبھی بھی نمبر زنگوں کے اصل ناموں سے محفوظ نہیں کرتا تھا۔ حماد پائزر کے نام سے اور اس کی منگیتیرانیہ جوان کے ساتھ ہی کام کرتی تھی، مسز پائزر کے نام سے اس کے فون میں موجود تھی۔

”ہیلو!“ اس نے فون کان سے لگایا۔ پہلے دوسرے کو بولنے کا موقع دینا بھی اس کی عادت بن چکی تھی۔ بہت سی عادات جوان بارہ سالوں نے اسے دی تھیں۔

”تم کہاں ہو؟ میں لابی میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں؟“

”بس آرہا ہوں۔“ اس نے موبائل بند کر کے جیکٹ کی جیب میں رکھا اور داخلی دروازے تک آیا۔ گارڈ نے کافی رکھائی سے اس سے شناخت طلب کی۔ آج واقعی حد سے زیادہ سختی تھی۔ ایسے مواقع پہ جو کم ہی آتے تھے۔ وہ اپنی اصل شناخت ہی دکھایا کرتا تھا۔

اس نے اندرونی جیب سے والٹ نکالا، اسے کھولا اور اندروالٹ کے ایک خانے میں پلاسٹک کور میں مقید کارڈ کچھ اس طرح سے سامنے کیا کہ اس کا آٹو گٹھ اس کے نام کو چھپا گیا، مگر تصویر، انجینی کا سرخ رنگی مخفف اور وہ مشہور مان پھول بوٹوں سے مزید چار چوٹھوں کا نشان واضح تھا۔

گارڈ کی تتی ابرو سیدھی ہوئیں، ایزھیاں خود بخود لگیں اور ”سر“ کہتے ہوئے اس نے ذرا پیچھے ہٹ کر راستہ دیا۔

وہ سپاٹ چہرے کے ساتھ والٹ واپس رکھتا اندر کی جانب بڑھ گیا۔

کبھی کبھی جب وہ پاکستان میں ہوتا تھا تو یہ عیش اسے بہت اچھے لگتے تھے۔

لابی میں داخل ہوتے ہی اس نے بنا گردن گھمائے بس نگاہوں سے چھت، فانوس اور دیواروں کے کنوؤں میں لگے سیکورٹی کیسروں کا جائزہ لیا۔ کتنے کیسے تھے، ان کا زخ کیا تھا۔ ڈیوٹی پہ کتنے گارڈز موجود تھے، اگر آگ لگ جائے یا ایمر جنسی ہو تو فائر ایگزٹ کس طرف تھی اور اس جیسی بہت سی باریکیوں کو جانچ کر وہ لابی میں ایک طرف لگے صوفوں کی جانب بڑھ گیا۔ جدھر ایک صوفے پہ ٹائیپ بیٹھی تھی۔

اس نے سیاہ سفید دھاریوں والی شلوار قمیص پہ بلیک سویٹر پہن رکھا تھا، گلے میں دوپٹا، مگر بے بالوں کی اونچی پونی اور اپنے مخصوص انداز میں ٹانگ پہ ٹانگ رکھے بیٹھی ٹائیپا اسے اپنی جانب متوجہ پاکر شاسائی سے مسکراتی تھی۔ وہ اس کی ایک، بہت اچھی دوست تھی، ان سے جو نیز تھی مگر حادی کی فمیلی سے گہرے تعلقات کے باعث وہ ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح جانتے تھے۔

وہ بھی جواباً ہلکے سے مسکرا کر اس کی طرف آیا۔ وہ دو صوفے آئے سامنے لگے تھے۔ درمیان میں چھوٹی میز تھی۔ جس پہ ٹائیپ کا سیاہ پاؤچ رکھا تھا۔ ایک قدرے بڑا پرس بھی ساتھ ہی پڑا تھا۔ وہ قریب آیا تو ٹائیپ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”السلام علیکم! کیسے ہو اور کب سے ہو ادھر؟“

”علیکم السلام۔ فائن، ٹھیکس۔ زیادہ دن نہیں ہوئے۔ کام سے آیا تھا۔“ مقابل صوفی پہ بیٹھتے ہوئے اس نے بتایا۔ وہ کتنے دنوں سے اسلام آباد میں تھا، تعداد اس نے نہیں بتائی۔ دوسرے آپ کے بارے میں جتنا کہ جانیں، اتنا ہی اچھا ہوتا ہے۔

”وہ تو مجھے اندازہ تھا۔ تمہارا کام!“ اس نے بیٹھتے ہوئے ابرو سے سیاہ پوچج کی طرف اشارہ کیا۔ جہان نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”جتنا کہ سکی، کرو یا۔ تمہاری معلومات ٹھیک تھیں۔ وہ سفارت خانے کی کار استعمال نہیں کرتی۔“

اب اس کے سامنے بیٹھی وہ اسے دھیمی آواز میں امر کی سفارت خانے کی سینڈ سیکریٹری کے متعلق بتا رہی تھی، جو ریز اسیکشن کی ہیڈ تھی اور بھارتی نژاد امریکی شہری تھی۔ اسے سفارت خانے کی سینڈ سیکریٹری کے متعلق چند معلومات درکار تھیں، وہ بھی بہت جلد۔ اس لیے اس نے صبح ٹائیپ کو فون کیا تھا۔ ٹائیپ تمام ضروری چیزیں لے آئی تھی اور اب زبانی بریفنگ دے رہی تھی۔

”یہ نوواٹ! وہ امریکی سفارت خانے کی ان گاڑیوں میں سے کوئی استعمال نہیں کرتی جو ہر وقت اسلام آباد میں گردش کرتی رہتی ہیں ویسے ان گاڑیوں کی تعداد قریباً ڈیڑھ سو ہے۔“

”ایک سو چالیس!“ اس نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ قہقہہ کی۔ ٹائیپ سر ہلا کر رہ گئی۔ وہ ہمیشہ اس سے زیادہ باخبر رہتا تھا۔

”بہر حال، وہ ان میں سے کسی گاڑی پہ سفر نہیں کرتی کیونکہ اس کو ایک جگہ یہ کہتے سنا گیا تھا کہ اگر ان ڈیڑھ سو..... ایک سو چالیس گاڑیوں میں سے کسی ایک کا دروازہ بھی کھلے تو ہمیں کوئی خبر ہو جاتی ہے، اسی لیے اسے ہمیں کسی کی گاڑیوں سے چڑھے اور یہ بھی کہ ان کی اتنی سکیورٹی ڈی سی میں نہیں ہوتی جتنی اسلام آباد میں ہوتی ہے۔“

”اس کے باوجود امریکی سفارت کار خود کہہ کہہ کر اپنی پوسٹنگ اسلام آباد میں کرواتے ہیں۔ کراچی سے بھاگتے ہیں مگر اسلام آباد ان کے لیے جنت ہے۔“

چند منٹ وہ دونوں سفارت خانے کی باتیں کرتے رہے۔ نام لیے بغیر، بے ضرری باتیں، پھر لمحے بھر کو جب وہ دونوں خاموش ہو گئے تو ٹائیپ نے موضوع بدلا۔

”کوئی اور کام بھی ہے اسلام آباد میں؟“ اس نے سرسری سا پوچھا مگر وہ جانتا تھا وہ کس طرف اشارہ کر رہی ہے۔

”ہاں! دو دن بعد میرے کرنل کی مہندی ہے اور می چاہتی ہیں کہ میں وہ اینڈ کروں۔“

”اور تم کیا چاہتے ہو؟“ وہ پتلیاں سکیڑے بغور اسے دیکھ رہی تھی۔ وہی ٹیکھا انداز جو ان کے ہم پیشہ افراد میں کثرت سے پایا جاتا تھا۔

”مجھے نہیں معلوم۔ بس میں ان لوگوں سے نہیں ملنا چاہتا۔“

”ملو گے نہیں تو بات آگے کیسے بڑھے گی؟ تمہارا نکاح ہو چکا ہے تمہارے ماموں کے گھر۔ اس طرح اس بے چاری لڑکی کی زندگی تو مت لٹاؤ یا بھادو یا چھوڑ دو!“ بات کے اختتام پہ اس نے ذرا سے کندھے اُچکائے۔

جہان نے زخمی نگاہوں سے اسے دیکھا۔ ٹائیپ کے لیے یہ تبصرہ کرنا کتنا آسان تھا۔

”چھوڑی تو نہیں کر سکتا۔ می بہت ہرٹ ہوں گی۔ ایک ہی تو صورت ہے کہ وہ اپنے بھائیوں کے ساتھ پھر سے ایک ہو جائیں، یہ راستہ میں کیسے بند کروں؟“

”تو پھر نبھاؤ۔ کتنے عرصے سے تم اس بات کو لڑکے رہے ہو۔ جا کر مل لو نا اپنے ماموں سے۔“

”میں ان کے گھر جاؤں، ان سے ملوں، ان کے ساتھ تعلقات پھر سے استوار کروں، میرا دل نہیں چاہتا یہ سب کرنے کو۔“ اس نے

بے بسی سے سر جھٹک کر کہا تھا۔ اپنے ملک میں اپنے دوستوں کے ساتھ، بس یہی وہ مقام تھا جہاں وہ اپنے دل کی بات کہہ دیا کرتا تھا۔

”دیکھو جہان! انسان اپنا کیا بہت جلد بھول جاتا ہے، وہ بھی بھول چکے ہوں گے۔ تم جاؤ اور ان کو ایک شت اشارہ دو۔ اس سے وہ یہ جان لیں گے کہ تم اور تمہاری می ان کے ساتھ رشتہ رکھنا چاہتے ہو۔ وہ تمہیں بہت اچھا دیکھ دیں گے۔“ وہ کرسی پہ ذرا آگے ہو کر بیٹھی، گویا سمجھا رہی تھی مگر وہ سمجھنا نہیں چاہتا تھا۔

”میں رشتہ نہیں نبھا پاؤں گا، میں کیوں ان کو دھوکا دوں؟ کیوں ان کی بیٹی کے ساتھ زیادتی کروں؟ دیکھو! میں جھوٹ بول کر شادی نہیں کروں گا اور جج جاننے کے بعد وہ اپنی بیٹی سے میری شادی نہیں کریں گے۔ بات پھر وہیں آجائے گی کہ می ہرٹ ہوں گی۔“ وہ شدید قسم کے

مجھے میں تھا یا شاید وہ مسئلہ حل کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔

”ضروری نہیں ہے کہ چیزیں ویسی ہی ہوں جیسے تم سوچ رہے ہو۔ تم انہیں بتانا کہ تم کیا جاب کرتے ہو۔ اس کی کیا پچیدگیاں ہیں۔ کیا مجبوریاں ہیں اور یہ کہ تم یہ جاب نہیں چھوڑ سکتے۔ مجھے یقین ہے کہ انڈرا سینڈز کریں گے۔“ جہان نے نفی میں سر ہلایا۔ لابی میں پرس منظر میں دھیماسا بجا میوزک جیسے ایک دم سے بہت تلخ ہو گیا تھا۔

”تم میرے ماموں کو نہیں جانتی۔ وہ ذرا ذرا سی بات پہ لٹو بنانے والے لوگ ہیں۔ وہ اس بات کو لٹو بنالیں گے کہ ہم نے پہلے انہیں بے خبر کیوں رکھا۔ اتنے سال میں کبھی ان سے ملنے نہیں آیا، وغیرہ وغیرہ۔ اپنے تمام رویے، سب تلخ باتیں، سب بھلا کر وہ پھر سے مئی پہ چڑھ دوڑیں گے اور نیتجائی برٹ ہوں گی۔ میں ان کو مزید دکھی ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ اب میں کیا کروں، میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔“ ثانیہ چند لمحوں خاموشی سے اسے دیکھتی رہی، پھر آہستہ سے بولی۔

”جہان! اگر ہر چیز بالکل ویسے ہو جیسے تم کہہ رہے ہو اور وہ واقعی تمہاری مئی کو پھر سے برٹ کریں، تب بھی وہ اتنی مضبوط تو ہیں کہ بہادری سے مقابلہ کر سکیں اور یہ بات تم اچھی طرح جانتے ہو۔ تم صرف اور صرف اپنے رویے کی صفائیاں دے رہے ہو۔ اصل وجہ یہ نہیں ہے۔“

تم بتاؤ! کیا ہے اصل وجہ؟“ اس نے سنجیدگی سے ثانیہ کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ ٹھیک کہہ رہی تھی، پھر بھی وہ اس کے منہ سے سننا چاہتا تھا۔

”اصل وجہ یہ نہیں ہے جو تم کہہ رہے ہو کیونکہ میں تمہیں جانتی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تم جب انہیں بتاؤ گے کہ تم صرف ایک آرمی آفیسر نہیں بلکہ ایک جاسوس بھی ہو اور وہ اس پر عمل ظاہر کریں تب بھی تم آدھے گھنٹے میں انہیں مطمئن اور قائل کر لو گے۔“

”نہیں! میں انہیں قائل نہیں کر سکتا۔ وہ جانتے ہو جیسے کبھی بھی اپنی بیٹی کی شادی کسی ایسے جاسوس سے نہیں کریں گے جس کی زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں ہو۔ جوان کی بیٹی کے ساتھ نہ رہے بلکہ دوسری دوسرے ملک میں کسی دوسرے نام کے ساتھ زندگی گزارے، جو وہاں مر بھی جائے تو مہینوں ان کی بیٹی کو بتانہ چلے کہ اس کی قبر کہاں ہے۔“ اذیت سے کہتے ہوئے وہ کرسی پہ پیچھے کو ہوا۔ آنکھوں کے سامنے ایک روح کو زخمی کر دینے والا منظر پھر سے لہرایا تھا۔

اظہار کیہ کے قدیم شہر میں اس بڑے سے دالان کے فوارے کے ساتھ کھڑا گھوڑا اور اس کی کمر پہ اونڈھے منہ لا دا گیا وہ وجود..... اس نے سر جھٹکا۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ اصل وجہ نہیں ہے۔ تمہیں پتا ہے تمہارا مسئلہ کیا ہے؟“ قدرے خشکی سے کہتی وہ باہم ملی مٹھیاں میز پہ رکھتی آگے ہوئی۔ ”تم اپنے ماموں سے ڈرتے ہو۔“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ بے زاری سے ہاتھ جھلا کر وہ دوسری طرف دیکھنے لگا۔

”ایسی ہی بات ہے تم اپنے احساس کمتری سے ابھی تک چھٹکارا نہیں پاسکے کہ وہ تمہیں تمہارے ابا کا طعنہ دیں گے اور تم ان کے سامنے سر نہیں اٹھا سکو گے۔ کم آن جہان! اب اس چیز سے باہر نکل آؤ۔“ جہان نے جواب نہیں دیا۔ وہ گردن ذرا سی موڑے دائیں طرف دیکھتا رہا۔

”مجھے حیرت ہوتی ہے کبھی کبھی تم پہ۔ اتنا قائل آفیسر، اتنا شاندار ٹریک ریکارڈ، ایجنسی کے بہترین ایجنٹس میں سے ایک۔ پھر بھی اپنے اندر کے احساس کمتری سے تم نہیں لڑ سکتے۔ تم اپنے ابا کے کسی جرم میں شریک نہیں رہے ہو جہان!“

جہان اس کی بات نہیں سن رہا تھا، وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھا، وہ کہیں اور دیکھ رہا تھا۔ ثانیہ نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا۔ لابی کے دوسرے کونے میں دو لڑکیاں صوفوں پہ بیٹھ رہی تھیں۔ ایک نیل لباس میں تھی اور دوسری سیاہ میں۔ سیاہ لباس والی دراز قد لڑکی جس نے سیاہ لمبے بال آگے کندھے پہ دائیں طرف کو ڈالے ہوئے تھے، کافی خوب صورت تھی۔ صوفے پہ بیٹھے ہوئے اس نے دوسری لڑکی کے ہاتھ سے کیبنڈی پکڑی اور منہ میں رکھی۔ دوسری لڑکی ساتھ ہی کچھ کہے جا رہی تھی۔

”جہان!“ ثانیہ نے اسے پکارا۔ وہ ذرا چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔ ”کیوں دیکھ رہے ہو ایسے؟ یہ پاکستان ہے!“ وہ خجل ہوا، نہ شرمندہ، بلکہ دوبارہ ان دو لڑکیوں کو دیکھا۔

”ثنانیہ! یہ بلیک کپڑوں والی میری بیوی ہے۔“

”اوہ اچھا!“ ثانیہ تجربے اور ذہنی پختگی کے اس درجے پہ تھی کہ بنا چوکے سنجیدگی سے اثبات میں سر ہلایا۔

”ہوں! اچھی ہے۔ تم نے بلایا ہے اسے؟“
 ”نہیں! میں تو خود اسے دیکھ کر حیران رہا ہوں۔“ اس نے لاعلمی سے شانے اچکائے۔
 ”آریوشیور یہ وہی ہے؟“

”ہاں! میں نے اس کی پگھڑ دیکھ رکھی ہیں۔“ ثانیہ نے اب کے ذرا احتیاط سے گردن پھیر کر اسے دیکھا۔ سیاہ لباس والی لڑکی کو جیسے مرچیں لگی تھیں۔ کینڈی غالباً مرجع والی تھی۔ اس کی آنکھوں میں پانی آ گیا تھا اور ناک سرخ پڑ گئی تھی۔ وہ جیسے ننگی سے ساتھ والی کو ڈانٹنے لگی جو ہنس رہی تھی۔

”کیا وہ تمہیں پہچان لے گی؟“

”معلوم نہیں۔ میں تصویروں کے معاملے میں احتیاط برتتا ہوں، سوشائڈ نہیں!“ وہ بہت غور سے دور بیٹھی لڑکی کا سرخ پڑا چہرہ دیکھ رہا تھا۔
 ”اتنی نزاکت؟“ اسے مایوسی ہوئی تھی۔

”یہ یہاں کیا کر رہی ہے؟“ وہ جیسے خود سے بولا۔

”پتا کرو؟“ ثانیہ کی بات پر اس نے اثبات میں سر کو جنبش دی۔ وہ اٹھ گئی۔ اسی وقت سیاہ لباس والی لڑکی کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھتی اٹھی تھی۔ انہیں شاید کہیں پہنچنا تھا۔

”یہ کہاں پڑھتی ہے؟“ ثانیہ نے جاتے ہوئے پوچھا۔

”انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی، شریعہ اینڈ لاء، ساتواں سسٹر!“ ممی کی دی ہوئی معلومات اس نے جوں کی توں دہرا دی۔ ”اور اس کا نام

حیا سلیمان ہے۔“

ثانیہ سر ہلا کر آگے بڑھ گئی۔ وہ دونوں لڑکیاں اب لابی پار کر رہی تھیں۔ ثانیہ سیدی ان کے پاس نہیں گئی، بلکہ پہلے اس نے قریب بنے کیفے کی طرف جاتے راستے پہ تیز تیز چلتے ایک ویٹر کو روکا اور اس سے ٹرے لی جس میں کافی کے چار کپ رکھے تھے۔ وہ یقیناً عملے سے واقف تھی، سو ویٹر سر ہلا کر آگے چلا گیا۔ ثانیہ نے اٹھائے ان دولہائیوں کی جانب بڑھ گئی، جواب لابی کے آخری سرے تک پہنچ چکی تھیں۔

اس نے کچھ کہہ کر انہیں روکا۔ وہ دونوں چلی تھیں۔ اتنی دور سے وہ ان کی گفتگو نہیں سن سکتا تھا مگر ان کے تاثرات بخوبی دیکھ رہا تھا۔ ثانیہ نے ٹرے اسی لیے پکڑ رکھی تھی تاکہ وہ یہ تاثر دے سکے کہ وہ لابی کے قریب ہی بنے کیفے (جس میں سیلف سروس موجود تھی) سے اٹھ کر آئی ہے، (اس کیفے کی انٹرنس پہ اگر آپ موجود ہوں تو لابی وہاں سے صاف نظر آتی ہے)، اور ان سے بات کر کے وہ فوراً واپس جہان کی طرف آنے کے بجائے اندر کیفے میں چلی جائے گی تاکہ وہ لڑکیاں اس طرف نہ دیکھ پائیں جہاں وہ بیٹھا تھا۔

سیاہ لباس والی لڑکی اچھنبے سے نفی میں سر ہلاتی کچھ کہہ رہی تھی۔ ان سے کافی فاصلے پہ بیٹھا وہ انہیں ہی دیکھ رہا تھا۔ دفعتاً اسے احساس ہوا کہ وہ اکیلا نہیں ہے بلکہ دوسرے بھی بہت سے لوگ جو آس پاس سے گزر رہے تھے، گردن موڑ کر ایک دفعہ اس پہ نگاہ ضرور ڈالتے تھے۔ اس نے قدرے بے چینی سے پہلو بدلا۔

اسے کیا برا لگا تھا، وہ فیصلہ نہ کر سکا۔

”جبریل جی تلخ ہے کوئی، اسی لیے آئی ہے۔“ ثانیہ ان کو بھیجنے کے بعد کیفے میں چلی گئی تھی اور اب جب کہ وہ لڑکیاں اندر جا چکی تھیں، وہ واپس آئی اور صوفے پہ بیٹھتے ہوئے بتانے لگی۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ غیر معمولی سکیورٹی کی وجہ اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔
 ”کیا بات ہوئی؟“ وہ سرسری سے انداز میں پوچھنے لگا۔

”بس وہی پرانا حربہ کہ آپ کو میں نے اصول الدین ڈپارٹمنٹ میں دیکھا تھا اور متوقع طور پر اس نے مجھے نہیں پہچانا، پھر میں نے پوچھ لیا کہ ادھر کس لیے آئی ہیں وہ، سو اس نے بتا دیا۔ اچھی ہے ویسے۔“ اس نے جواب نہیں دیا۔ وہ خاموشی سے بیٹھا رہا۔ کچھ اسے بہت برا لگا تھا۔
 ”پھر جاؤ گے آج اس کے گھر؟“

”ہاں! جاؤں گا۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا مگر وہ اچھا محسوس نہیں کر رہا تھا۔ اس عجیب سے اتفاق نے ایک دم بہت کچھ بدل دیا

تھا۔ ”خالی ہاتھ مت جانا۔ کچھ لے کر جانا۔“

”میں ترکی سے ان کے لیے کچھ نہیں لایا۔ خالی ہاتھ ہی جاؤں گا۔“

”اچھا! پھر کچھ خرید کے لے جانا، اچھا امپریشن پڑے گا۔ چلو! چل کر کچھ کھاتے ہیں۔“ وہ جیسے جان گئی تھی کہ اس کا موڈ اچھا نہیں ہے، سو اٹھتے ہوئے بولی۔ وہ خاموشی سے اٹھ کھڑا ہوا اور میز پر رکھا سیاہ پاؤچ اٹھا کر جیکٹ کی جیب میں ڈال لیا۔

”تم آپ سینٹ لگ رہے ہو۔“

”نہیں! بالکل نہیں۔“ وہ زبردستی مسکرایا۔ ”تم سناؤ کب تک تمہارا منگتیر دوبارہ مجھ جتنا اینڈم ہو جائے گا؟“

”چند سیشن مزید لگیں گے، برن کافی زیادہ تھا۔“ بات کا رُخ بدلنے پہ ثانیہ اسے حماد کے بارے میں بتانے لگی۔ کچھ عرصہ قبل ایک حادثے میں اس کا چہرہ قدرے مسخ ہو گیا تھا، الیٹر سرجری سے وہ بہتر ہو رہا تھا۔ وہ بے توہمی سے سنتا گیا۔ اس کا ذہن وہیں پیچھے تھا۔

پھر جب ثانیہ چلی گئی تو وہ باہر آ گیا۔ اسلام آباد کی ٹھنڈی سرمئی سڑک کے کنارے چلتے ہوئے اس کے دل دو ماغ میں ثانیہ کی باتیں مسلسل گونج رہی تھیں۔

”اس چیز سے باہر نکل آؤ..... تم اپنے ابا کے کسی جرم میں شریک نہیں رہے ہو جہاں! اس چیز سے باہر نکل آؤ.....“

اذیت کی ایک شدید لہر اس کے اندر اٹھی۔ آنکھوں کے سامنے وہ زخمی کر دینے والا منظر پھر سے لہرایا۔ ثانیہ غلط تھی۔ ایک جرم میں وہ اپنے باپ کے ساتھ کسی حد تک شریک رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

بچپن کی یادیں اس کے ذہن میں بہت ٹوٹی پھوٹی، بکھری، مدھم مدھم سی تھیں۔ باسفورس کا نیلا سمندر، سمندری بگلے، جہاںگیر میں واقع ان کا گھر اور دادا۔ یہ وہ سب تھے جو اس کے بچپن میں اس کے ساتھ تھے۔ دادا ابا کا ساتھ ان میں سب سے زیادہ اثر انگیز تھا۔ وہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھا۔ شادی کے ساتویں برس ملنے والی پہلی اور آخری اولاد۔ احمد شاہ کا اکلوتا پوتا۔ دادا کاروبار کے سلسلے میں ترکی آیا کرتے تھے۔ وہ فوج سے میجر ریٹائرڈ ہوئے تھے۔ وقت سے قبل ریٹائرمنٹ کی وجہ ان کی خرابی صحت تھی۔ فوج سے باعزت طور پر ریٹائرمنٹ کے بعد وہ اپنے ایک دوست کے ساتھ کاروبار میں شریک ہو گئے اور تب ہی وہ ترکی آئے اور پھر آتے جاتے رہے۔ ترکی میں ان کا علاج، جو پاکستان میں ممکن نہ تھا، قدرے سستا ہوتا رہا۔

جب ابا کا تبادلہ ترکی ہوا تو وہ بھی ساتھ آئیں۔ دادا نے تب ہی چند پیسے جوڑ کر جہاںگیر (Cihangir) کے علاقے میں زمین خریدی۔ وہ خوش قسمتی کا دور تھا۔ ابا نے بعد میں اس جگہ گھر بنوانا شروع کیا۔ وہ تب ہی پیدا ہوا تھا۔ دادا کی گویا آدھی بیماری دور ہو گئی۔ وہ تب بہت خوش رہا کرتے تھے۔ باقی بچی آدھی بیماری کے بہترین علاج کی سہولتوں کے باعث وہ استنبول نہ چھوڑ سکے۔ اس وقت سلطنت ترکی اتنی ترقی یافتہ نہیں تھی۔ ابھی بابا کی حکومت آنے میں کئی دہائیاں پڑی تھیں۔ (بابا یعنی طیب اردگان) مگر ترکی تب بھی خوب صورت تھا۔

ابا واپس چلے گئے تھے مگر مری، دادا اور وہ ادھر ہی رہے۔ دادا بگڑتی صحت کے باعث کاروبار میں بہت زیادہ فائدہ نہ حاصل کر سکے، سو گھر کے حالات قدرے خراب ہوتے گئے۔ کچھ عرصہ قبل کی خوش حالی روٹھ گئی۔ ابا کی تنخواہ پہ گزرا کر ناتوانی ممکن سی بات لگتی تھی۔ تب ہی اس نے می کو کام تلاش کرتے اور پھر نوکری کرتے دیکھا۔ تب وہ بہت چھوٹا تھا، وہ عمر جس میں محنت اور شفقت کے معانی سمجھ سے بالاتر ہوتے ہیں۔

مئی ایک فیکٹری میں معمولی ملازمت کرنے لگی تھیں۔ پتا نہیں وہ کیا کام کرتی تھیں مگر ملک کے برے حالات کے باعث وہ نوکری ان کی تعلیمی قابلیت سے کم ہی تھی۔ گھر سے جیسے قسمت ہی روٹھ گئی تھی۔

دادا ابا کو کاروبار میں شدید گھٹانا ہوا اور ناسازی صحت کے باعث ان کا کام کرنا نہ کرنا برابر ہو گیا، مگر وہ کام پھر بھی کرتے تھے۔ وہ محنت کرنے والے، مضبوط ہاتھوں والے، مشقت اٹھانے والے آدمی تھے۔ بظاہر رعب دار لگتے، مگر بات کرنے پر اتنی ہی مہربان اور شفقت۔ جہاں کو وہ کبھی بیمار نہیں لگتے تھے۔ روزِ صبح وہ اسے ساتھ لے کر واک پہ جایا کرتے تھے۔ وہ تھک جاتا، دادا انہیں تھکتے تھے۔ وہ بہت مضبوط، بہت بہادر انسان تھے۔ وہ اس کے آئیڈل تھے، اس کے ہیرو۔

بروقت کم نہیں ہوا، بڑھتا گیا تو ایک روز اس نے دادا کو افسردہ دیکھا۔ جہاںگیر والا گھر جو انہوں نے بہت چاہ سے بنوایا تھا، انہیں بیچنا پڑ رہا تھا۔

”دادا! ہم وہ گھر کیوں چھوڑ رہے ہیں؟“ جب وہ داک کے لیے باہر نکلے، تو ان کا ہاتھ پکڑ کر چلتے ہوئے اس نے گردن اٹھا کر ان کو دیکھتے پوچھا تھا۔ انہوں نے ملال سے اسے دیکھا مگر بولے تو آواز مضبوط تھی۔

”یہ گھر بہت بڑا ہے، ہماری ضرورت سے بھی زیادہ۔ اس کو بیچ کر ہم کوئی چھوٹا گھر لے لیں گے۔“

”کیا ہم نیا گھر خریدیں گے؟“

”نہیں بیٹا! ہم ابھی اس کے قائل نہیں ہیں مگر یہ بات تم اپنی ماں سے مت کرنا۔ تم تو جانتے ہو، یہ جان کر وہ غمگین ہوگی۔ کیا تم کو راز

رکھنے آتے ہیں میرے بیٹے؟“ اس نے فوراً اثبات میں سر ہلایا۔

”جی دادا! مجھے راز رکھنے آتے ہیں۔“

پھر انہوں نے جہانگیر چھوڑ دیا اور وہ سمندر کنارے ایک قدرے خستہ حال جگہ پہنچے۔ یہاں ان کا گھر چھوٹا اور پہلے سے کتر تھا۔ کرائے کا گھر۔ تب اس کے قریب پھیلا ساحل سمندر آج کی طرح خوب صورت پنڈت پاتھ سے مزین نہیں ہوتا تھا، بلکہ وہاں پتھروں کا کچا پکا سا ساحل تھا۔ بنگلے ہر وقت وہاں پھڑپھڑاتے ہوئے اُڑا کرتے۔ دادا کہتے تھے۔

استنبول مسجدوں کا شہر ہے، مگر جہان کو وہ ہمیشہ بنگلوں کا شہر لگتا تھا۔ اپنے گھر کی بالکونی سے وہ ان بنگلوں کو اکثر دیکھا کرتا تھا۔ شام میں وہاں بیٹھ کر وہ ان کو یوں شمار کرتا جیسے لوگ تارے شمار کرتے تھے۔ وہ تھک جاتا مگر بنگلے ختم نہ ہوتے۔

وہ اب بھی صبح دادا کے ساتھ باسفورس کنارے واک پہ جایا کرتا تھا۔ وہ اپنی بیماری کے باوجود بہت تیز تیز چلا کرتے، جہاں بنگلوں کے لیے روٹی کا ٹکڑا پکڑنے کی رفتار سے ملنے کی کوشش میں لگا رہتا مگر وہ ہمیشہ آگے نکل جاتے، پھر رُک جاتے اور جب تک نہ چلنے جب تک وہ ان کے ساتھ نہ ملتا۔

”آپ رُکتے کیوں ہیں؟“ وہ تنک کر پوچھتا۔

”میں چاہتا ہوں کہ میرا بیٹا مجھ سے آگے نکلے، پیچھے نہ رہے۔“ وہ اسے ہمیشہ ”میرا بیٹا“ کہتے تھے۔

بہت بعد میں اسے محسوس ہوا کہ وہ اپنے اصل بیٹے کو بہت پسند نہیں کرتے۔ ابا عرصے بعد آیا کرتے اور جب بھی آتے، دادا کے ساتھ تلخ کلامی ضرور ہوجاتی تھی۔ اب کسی جگہ سے کپڑوں پر مختلف قسم کے موتیوں کا کام کھینچتے تھے، ساتھ میں نوکری۔ ابا ان سے بھی لڑ پڑتے مگر اس نے ہمیشہ اپنی ماں کو صبر شکر کر کے، خاموشی سے اپنا کام کرتے دیکھا تھا۔ وہ ابا کو بہت رمان سے جواب دے کر انہیں خاموش کر دیتیں اور ساتھ ساتھ اپنا کام کرتی رہتیں۔ مئی اور دادا، یہ دونوں افراد کبھی فارغ نہیں بیٹھتے تھے۔ بے کار رہنا، یہ لفظ ان کی لغت میں نہیں تھا۔

بہت بچپن سے وہ ان کی طرح بننا گیا۔ اسے کام کی عادت پڑ گئی اور پھر اسے فارغ بیٹھنے کا مطلب بھول گیا۔ اسے بس اتنا معلوم تھا کہ وہ در رنگ کلاس لوگ ہیں۔ انہیں ہر وقت کام کرنا چاہیے۔ فارغ صرف ان لوگوں کو بیٹھنا چاہیے، جو امیر ہوں اور جن کے پاس ہر سہولت میسر ہو۔ جیسا کہ اس کے ماموں لوگ۔

وہ ان سے تب ہی مل پاتا جب کبھی شادو ناروہ ترکی آتے۔ وہ اسے ہمیشہ ناپسند رہے تھے۔ اس کے دونوں بڑے ماموں زعب دار، دینگ اور مغرور سے تھے۔ ان کے سامنے بیٹھ کر ہی لگتا کہ وہ بہت شاہانہ قسم کے لوگ ہیں، جبکہ وہ، دادا اور مئی بہت غریب اور معمولی انسان ہیں۔ اس نے مئی کو بڑے ماموں کے سامنے سختی سے نفی میں سر ہلاتے، جیسے انکار کرتے یا منع کرتے ہیں، دیکھا تھا۔ مئی استفسار پہ کچھ نہ بتاتیں، دادا سے پوچھا تو انہوں نے بتا دیا۔

”وہ تمہاری مئی کو پیسے دینا چاہتے ہیں مگر وہ نہیں لیتیں۔“

”کیوں؟“ وہ حیرت سے سوال کرتا۔

”جب انسان کے یہ دو ہاتھ سلامت ہوں تو اس کی عزت کسی سے کچھ نہ لینے میں ہی ہوتی ہے۔ جو ہاتھ پھیلاتا ہے میرے بیٹے! وہ

اپنا سب کچھ کھودیتا ہے۔“

دادا کہتے تھے، انسان کو عزت سے جینا اور وقار سے مرنا چاہیے۔ جیسے دادا تھے، بہت عزت والے اور جیسی مئی تھیں۔ محنت کر کے، مشقت کر کے زندگی بسر کرنے والے لوگ مگر پتا نہیں کیوں ابا ایسے نہ تھے۔

وہ آٹھ برس کا تھا، جب ابا ایک روز ترکی آئے۔ تب وہ ایک اعلیٰ عہدے پہ پہنچ کر کافی بہتر کمانے لگ گئے تھے، مگر تب بھی ان کے حالات نہ بدل پائے۔ البتہ اس بار اس نے پہلی دفعہ ابا اور دادا کو لڑتے ہوئے سنا تھا۔ بلند آواز سے، غصے سے بحث کرتے۔ وہ بہت ڈر گیا تھا۔ مئی اس وقت گھر پہ نہیں تھیں۔ ابا لڑ بھگڑ کر سامان پیک کر کے باہر چلے گئے اور دادا اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گئے۔

رات وہ ڈرتے ڈرتے، خاموشی سے دادا کے کمرے میں آیا۔ وہ چپ چاپ لیٹے تھے۔ لحاف اوڑھے، چھت کو تکتے۔ ان کا چہرہ پیلا، سفید اور سُخا ہوا تھا اور آنکھیں گلابی پڑ رہی تھیں۔

”دادا!“ وہ دھیرے سے ان کے پاس آ بیٹھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ انہیں کیا ہوا ہے۔ اس نے پوچھا کہ ”کیا وہ ٹھیک ہیں، انہوں نے کھانا کھایا ہے، ان کو کچھ چاہیے۔“ دادا ابائم آنکھوں سے اسے دیکھتے نفی میں سر ہلائے گئے۔

”تمہیں بتا ہے جہان!“ اپنے بوڑھے ہاتھوں میں اس کا چھوٹا سا ہاتھ تھام کر وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے کہنے لگے۔ ”سلطان ٹیپو کو جس نے دھوکا دیا تھا، وہ میر صادق تھا۔ اس نے سلطان سے دعا کیا، مگر یز سے وفا کی۔ مگر یز نے انعام کے طور پر اس کی کئی پشتوں کو نوازا۔ انہیں ماہانہ وظیفہ ملا کرتا تھا، مگر بتا ہے جہان! جب میر صادق کی اگلی نسلوں میں سے کوئی نہ کوئی ہر ماہ وظیفہ وصول کرنے عدالت آتا تو چہرہ اسی صدا لگایا کرتا۔“

”میر صادق نثار کے ورثا حاضر ہوں“

ایک آنسو ان کی آنکھ سے پھسلا اور نیکی میں جذب ہو گیا۔

”میرے بیٹے! میری بات یاد رکھنا، جیسے شہید قبر میں جا کر بھی سینکڑوں سال زندہ رہتا ہے، ایسے ہی نثار کی ندرت بھی صدیوں یاد رکھی جاتی ہے۔ دن کے اختتام پہ صرف اس چیز سے پڑتا ہے کہ انسان تاریخ میں صحیح طرف تھا یا غلط طرف۔“

پھر انہوں نے اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیا۔ اسے آج بھی یاد تھا، دادا کے ہاتھ اس روز کپکپا رہے تھے۔

”میرے بیٹے! مجھ سے ایک وعدہ کرو گے؟“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”یہ تمہارا ملک نہیں ہے، مگر تم اس کا کھارہے ہو، کبھی اس کو نقصان مت پہنچانا۔ لیکن وہ جو تمہارا ملک ہے نا، جس نے تمہیں سب کچھ دیا ہے اور تم سے کچھ نہیں لیا، اس کا کبھی کوئی فرض اُپڑے تو اسے اٹھالینا۔ میں وہ بوجھ نہیں اٹھ سکتا، جو تم پر آن پڑا ہے۔ تم اسے اٹھالینا۔“ پھر انہوں نے لحاف میں جیسے جگہ بنائی۔ ”آؤ میرے پاس لیٹ جاؤ۔“

وہ وہیں دادا کے بازو سے لگا، ان کے لحاف میں لیٹ گیا۔ دادا بہت گرم ہو رہے تھے، ان کا بستر بھی گرم تھا۔ اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ وہ سو گیا۔

صبح وہ اٹھا تو دادا فوت ہو چکے تھے۔

اس روز وہ بہت رویا تھا۔ ممی بھی، بہت روئی تھیں۔ اس نے پہلی بار جانا تھا کہ موت کیا ہوتی ہے۔ موت کی شکل اور ہیئت کیا تھی، وہ کچھ نہیں جانتا تھا، سوائے اس کے کہ موت بہت سرد ہوتی ہے۔ دادا کے جسم کی طرح۔ اس نے بہت بار ان کا ماتھا، ان کی آنکھیں اور ہاتھوں کو چھوا۔ وہ برف ہو رہے تھے۔ سرد اور ساکن۔

اسی شام ایک سمندری بگلا ان کی بالکونی میں آگرا تھا۔ وہ ڈھکی تھا، جب تک اس نے دیکھا، وہ مر چکا تھا۔ جہان نے اسے دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر دیکھا، وہ بھی سرد تھا۔ سرد اور سخت۔

یہی موت تھی۔

ابا ان کے ساتھ نہیں تھے، وہ کہاں تھے، اسے نہیں معلوم تھا۔ بس ممی اور وہ دادا کو پاکستان لے آئے۔ وہیں ان کو دفنایا گیا، وہیں وہ ابدی نیند جا سوئے، مگر ابا کا کوئی نام و نشان نہ تھا۔

ممی ان دنوں بہت غم زدہ رہتی تھیں۔ غم بہت سے تھے، مگر تب وہ ان کی شدت کو نہیں سمجھتا تھا۔ وہ اپنے بڑے ماموں کے گھر تھا، جب ایک روز ممی نے اسے بتایا کہ وہ اس کا نکاح ماموں کی بیٹی سے کر رہی ہیں۔

”کیوں؟“ اس نے اپنا پسندیدہ سوال کیا تھا۔

”کیونکہ کچھ ایسا ہوا ہے کہ شاید ہم پھر یہاں نہ آسکیں۔ میں چاہتی ہوں کہ تعلق کی ڈور بندھی رہے۔ میرے بھائی مجھ سے نہ

چھوٹیں۔“ ممی نے اور بھی بہت کچھ کہا تھا مگر اسے یاد نہیں تھا۔ اسے صرف دادا کی باتیں یاد تھیں۔

ماموں کا گھر، مہمانیاں اور ان کے بچے، اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہاں رہ کر اسے مزید احساس دلایا جاتا کہ وہ ان سے کم تر ہے۔

وہ بہت حساس ہوتا جا رہا تھا۔ اسے یاد تھا۔

وہ اس روز فرقان ماموں کے کچن میں پانی لینے آیا تھا۔ جب اس نے اپنے سے تھوڑے سے بڑے دادا کو غصے سے فرق کا دروازہ بند

ابند از بالکل بھی دادا جیسا نہ تھا۔

”یہ آدمی مجھ سے لڑ رہا تھا، میرے پاس کوئی دوسرا راستہ نہ تھا، سوائے اس کے کہ میں اس کو روکوں۔ ورنہ یہ مجھے پاکستان لے جاتا۔ میرے بیٹے! تم یہ بات کسی کو نہیں بتاؤ گے، ٹھیک ہے؟“ اس نے خالی خالی نظروں سے انہیں دیکھتے اثبات میں سر ہلایا وہ بہت گھبرائے ہوئے لگ رہے تھے۔

”تم کسی کو بتاؤ گے تو نہیں؟ اپنی ماں کو بھی نہیں۔“

”نہیں! اب! مجھے راز رکھنے آتے ہیں۔“ اس نے خود کو کہتے سنا۔

”چلو! پھر جلدی کرو۔ اس جگہ کو ہمیں صاف کرنا ہے اور اس کی لاش کو کہیں دور لے کر جانا ہے۔ میں گھوڑا لاتا ہوں، تب تک تم تولیہ

لے کر یہ جگہ صاف کرو۔“

اس نے فرماں برداری سے سر اثبات میں ہلایا۔ چند روز پہلے بازے میں ایک گائے زخمی ہو کر مر گئی تھی، اس کا خون جو دیوار پہ لگ گیا تھا، اسی نے صاف کیا تھا مٹی کے ہمراہ۔ اب بھی وہ کر لے گا۔

”میں ابھی آتا ہوں۔“ لاتی تیزی سے باہر نکل گئے۔ اسے لگا شاید وہ اب کبھی واپس نہ آئیں، جیسے دادا انہیں آئے تھے۔ پہلی دفعہ اسے محسوس ہوا تھا کہ اس کو بابا یہ پھر دہرے نہ تھا مگر کام تو اسے کرنا تھا۔ وہ بھاگ کر دو تین تولیے لے آیا اور بچوں کے بل کے فرش پہ جھکا خون صاف کرنے لگا۔

وہ باؤں کے کان سے ٹپس ٹپسی، وہ کوئی انسان تھا، جیتا جاگتا وجود جواب لاش، من چکا تھا۔ چند لمبے بدمذہبی وہ شدید خوف کے زیر اثر آنے لگا۔ اس کے ہاتھوں میں لڑش آگئی۔ مگر کام تو اسے کرنا تھا۔

کچھ ٹائپے بعد کسی خیال کے تحت اس نے خون سے تر تولیہ چہرے کے قریب لے جا کر سونگھا۔ پھر ناک اس اووندھے منہ گرے وجود کے اوپر جھکا کر سانس اندر کو کھینچی۔

اس آدمی کے وجود سے خوشبو اٹھ رہی تھی۔ ایسی خوشبو جو اس نے کبھی نہیں سونگھی تھی۔ وہ خوشبو دھیرے دھیرے اس کا خوف زائل کر گئی۔ بہت زور لگا کر اس نے اس آدمی کو سیدھا کیا۔ پھر اس کے سینے پہ، جہاں سے خون اُبل رہا تھا، تولیہ زور سے دبا کر رکھا۔ اپنے سامنے ایک نقش کو دیکھ کر بھی اسے ڈر نہیں لگ رہا تھا۔ اس لیے نہیں کہ وہ احمد شاہ کا بہادر پوتا تھا، بلکہ اس شخص میں ہی کچھ ایسا تھا جو ہر طرف خوشبو بکھیر رہا تھا۔

اس نے سیاہ پینٹ، سیاہ سوئٹر اور سر پہ سیاہ ادنی نوٹی لے رکھی تھی۔ اس کا رنگ سرخ و سفید تھا، وہ بہت خوب صورت اور وجہ آدمی تھا۔ سیدھا کرنے پہ اس کی ٹھوڑی جو سینے سے جا لگی تھی، ذرا اوپر کو ہو گئی تو گردن پہ سینے کے قطرے نمایاں نظر آرہے تھے۔ جہاں نے اس کے ماتھے پہ ہاتھ رکھا، وہ گرم تھا۔ دادا کے جسم کی طرح ٹھنڈا نہیں، سخت نہیں، اکڑا ہوا نہیں۔ وہ بہت نرم اور گرم تھا۔

کیا وہ واقعی مر چکا تھا؟

اسی اثنا میں اب آگئے۔ وہ اب پہلے سے زیادہ سنبھلے ہوئے لگ رہے تھے۔ اس کے زخم پہ ایک کپڑا کس کر باندھنے کے بعد اب اسے کھینچتے ہوئے باہر لے گئے۔ وہاں ایک گھوڑا اکھڑا تھا۔ اسے بمشکل گھوڑے پہ اووندھا لا کر ابانے باگ تھا ملی۔ وہ بھی ساتھ ہی ہو لیا۔ رات کا وقت تھا، ہر سوسنا تھا، مہیب تاریکی۔

ابا فارم کی کچھلی طرف آگئے۔ وہاں بوے سے کچے صحن کے وسط میں ایک نوارہ بنا تھا۔ ابادو بیچے کہیں سے لے آئے اور زمین کھودنے لگے۔ اس نے بھی بیچے تھا ملیا۔ وہ ان کی مدد کرنے لگا۔

کافی دیر بعد جب گھڑا اکھڑ گیا تو ابانے اس لاش کو بمشکل اتار کر گڑھے میں ڈالا۔

”ابا! کیا یہ مر چکا ہے؟“ وہ متذبذب تھا۔ تب بول اٹھا۔ انہوں نے ذرا حیرت سے اسے دیکھا۔

”ہاں! یہ مر چکا ہے، نہ سانس ہے نہ دھڑکن۔“

”یہ کون تھا ابا؟“

مٹی ڈالتے ہوئے وہ لمبے بھر کوڑکے، جیسے فیصلہ کر رہے ہوں کہ اسے بتانا چاہیے یا نہیں، مگر پھر بتانے کا فیصلہ کر لیا۔

”یہ پاک اسپانی تھا، اور مزید کوئی سوال نہیں۔“

جہاں نے اثبات میں سر ہلادیا۔ وہ مزید کوئی سوال کر بھی نہیں رہا تھا۔ اس کی نگاہیں اس سیاہ پوش شخص پہ جمی تھیں، جس پہ ابا اب مٹی گرا رہے تھے۔ بلاشبہ وہ اس دنیا کا خوب صورت ترین آدمی تھا۔

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف ایڈفرس لنکس
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ ناولز اور عمران سیریز کی مکمل رینج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

<http://twitter.com/paksociety1>

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

- Open Paksociety Page.
- Click Liked.
- Select Get Notifications.
- Select See First.

All Done

پاک اسپائی۔ پاکستانی جاسوس۔

واپسی پہ ابانے کمال مہارت سے تمام نشانات صاف کر دیے۔ ٹھوڑی ہی دیر بعد کمرایوں ہو گیا جیسے وہاں کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ چیزیں درست کرتے ہوئے اب اسے پتائیں کیوں پھر سے ڈر لگنے لگا تھا۔ جب تک وہ آدنی قریب تھا، اس کا سارا خوف زائل ہو گیا تھا، مگر جب وہ دفن ہو گیا تو وہ خوف پھر سے عود کر آ گیا۔ ابانے ہر نشان مٹا ڈالا، مگر کبھی کبھار ہٹا نہ لگ سکا۔

گمراہ سے یاد تھا، وادہا کہا کرتے تھے، انسان جس جگہ پہ جو کرتا ہے، اس کا اثر وہ اس جگہ پہ چھوڑ جاتا ہے۔ آثار ہمیشہ وہیں رہتے ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ یہ سورہ یسین میں لکھا ہے۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ انسان جو بولتا ہے، اس کے الفاظ ہوا میں ٹھہر جاتے ہیں۔ آثار کبھی نہیں مٹتے۔

اس پاک اسپائی کے آثار بھی اس کے ذہن پہ، اس کمرے کے فرش پہ اور فوارے کے سنگ مرمر پہ نقش ہو چکے تھے۔

اگلے تین روزہ بخار میں پھنکتا رہا۔ ایک عجیب سا احساس کہ کوئی اسے پکار رہا ہے۔ فوارے کے ساتھ کچے صحن کی قبر سے کوئی اسے

آواز دے رہا ہے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ اس کا بدلہ ضرور لیا جائے گا، یہ احساس ہر شے پہ حاوی تھا۔

تب پہلی دفعہ اس نے وہی منظر خواب میں دیکھا۔ حقیقت میں وہ اسے دفن کر آ گئے تھے مگر خواب میں ہمیشہ یوں دکھائی دیتا کہ جب وہ دفن کر پلٹتے ہیں تو وہ قبر سے اسے پکارتا ہے۔ خوب صورت سحر انگیزی آواز۔ مگر الفاظ اسے سمجھ میں نہیں آتے۔ وہ بہت مدہم، مبہم سا کچھ کہتا تھا، وہ کبھی نہ جان پایا کہ وہ کیا کہتا تھا لیکن تب بھی اسے لگتا کہ شاید وہ بتا رہا ہے کہ اس کا بدلہ ضرور لیا جائے گا۔

وہ لوگ جلد ہی اٹھا کیہ چھوڑ کر ادا نہ چلے آئے۔ یہاں سے وہ کچھ عرصے بعد قونین منتقل ہو گئے اور جب وہ بارہ برس کا ہوا تب چار برس کی خانہ بدوشی کے بعد وہ استنبول واپس آ گئے۔ مئی نے بتایا کہ اب انہیں حکومت نے اجازت دے دی ہے اور یہ کہ اب وہ آرام سے استنبول میں رہ سکتے ہیں۔ مگر آرام سے وہ تب بھی نہیں رہنے لگے تھے۔ مئی دیے ہی جاب کرتیں، البتہ ابا بدلتے جا رہے تھے۔ وہ پہلے سے زیادہ مضطرب اور چڑچڑے رہنے لگے تھے۔ کبھی کبھی وہ غصے میں اتنے بے قابو ہوتے کہ اسے لگتا، وہ پاگل ہوئے جا رہے ہیں۔

تب اسے وہ پاک اسپائی بہت یاد آتا۔ پھر ایک رات مئی کے ساتھ لیٹے ہوئے، چھت کوکتے اس نے ان سے پوچھ ہی لیا۔

”مئی! یہ پاک اسپائی کون ہوتا ہے؟“

مئی چند لمبے خاموش رہیں، پھر کہنے لگیں۔

”بیٹا! پاکستان کی فوج میں جو خفیہ ایجنسیز ہوتی ہیں، ان میں بہت سے فوجی اور غیر فوجی کام کرتے ہیں۔ ان اہل کاروں میں سے کچھ

ترتیب یافتہ ایجنٹ ہوتے ہیں، وہ اپنے ملک کے رازوں کی حفاظت کے لیے دوسرے ممالک کے راز چرایا کرتے ہیں۔“

”نکرو کر دے کیا ہیں؟“

”وہ دوسرے ممالک میں جا کر جاسوسی کرتے ہیں۔ ہمیں بدل بدل کر وہ ہر جگہ پھرتے ہیں۔ ان کا کوئی ایک نام یا شناخت نہیں

ہوتی۔ ان کا کوئی ایک گھرا ایک فیملی نہیں ہوتی۔ وہ کبھی کبھار کبھی کچھ بن جاتے ہیں۔ ان کو یہ سب سکھایا جاتا ہے، تاکہ وہ جاگیریں اور پاکستان کے لوگ سکون سے سو سکیں۔ وہ اپنے ملک کی آنکھیں ہوتے ہیں۔“

”اور پھر ان کو کیا ملتا ہے؟“

”کچھ بھی نہیں۔“ مئی نے گہری سانس لے کر کہا۔ ”جب کوئی درودی والا سپاہی محاذ پہ لڑتا ہے تو اگر وہ زندہ رہ جائے تو غازی

کہلاتا ہے۔ جان قربان کر دے تو شہید، اعزازت صرف درودی والے کو ملتے ہیں۔ ان کے نام سے سڑکیں اور چوک منسوب کیے جاتے ہیں، ان پہ فلمیں بنائی جاتی ہیں مگر جو جاسوس ہوتا ہے نا وہ Unsung Hero ہوتا ہے۔ بے نام و نشان، خاموشی سے کسی دوسرے ملک میں زندگی بسر کرتا، وہ اکیلا، تنہا ہی کام کیا کرتا ہے اور اگر گرفتار ہو جائے تو اسے بچانے کے لیے عموماً کوئی نہیں آتا۔“

”کیوں؟“ وہ حیران ہوا۔

”بیٹا! ایسی ہی ایک پیشے کی مجبوری ہوتی ہے۔ گرفتار ہونے کی صورت میں جاسوس کا ملک، حکومت، فوج، ایجنسی کوئی بھی کھلم کھلا اسے اون

نہیں کرتی، اگر پوچھا جائے تو صاف انکار کر دیا جاتا ہے۔ دوسرے طریقوں سے وہ اسے جیل سے بھاگنے کی کوشش ضرور کرتے ہیں لیکن اگر یہ نہ ہو سکے تو جاسوس کو ساری زندگی جیل میں رہنا پڑتا ہے۔ اگر وہ راز اگل دے تو وہ خدا کہلاتا ہے، اس لیے اسے یہ تک چھپانا ہوتا ہے کہ وہ جاسوس ہے، کیونکہ ہر ملک میں جاسوسی کی سزا موت ہوتی ہے۔ پھر اگر اس پہ جاسوسی ثابت ہو جائے تو اسے مار دیا جاتا ہے اور اس کی لاش کہیں بے نام و

نشان دفن کی جاتی ہے یا کسی بھی طرح ڈسپوز آف کر دی جاتی ہے اور بعض دفعہ کتنے ہی عرصے تک اس کے خاندان والوں کو بھی پتا نہیں چلتا کہ وہ کہاں ہے۔ اس کا جنازہ تک نہیں پڑھایا جاتا۔“

اس کی آنکھوں کے سامنے اٹھا کیہ میں نورے کے ساتھ کھودی گئی قبر گھوم گئی۔ بے نام و نشان قبر۔

”پھر تو اس کو کچھ بھی نہ ملا!“

”بیٹا! جو آدمی خود کو اس کام کے لیے پیش کرتا ہے، وہ اس بات سے واقف ہوتا ہے کہ گرفتار ہونے یا دیار غیر میں مارے جانے کے بعد اس کے ساتھ کیا ہوگا۔ اس کو تاریخ کبھی میر و کے نام سے یاد نہیں کرے گی۔ اس کے ملک میں اس کی فائل پہ پاپ سیکرٹ یا کلاسیفائیڈ کی مہر لگا کر بند کر دی جائے گی۔ وہ یہ سب جانتے بوجھتے بھی خود کو اس جاب کے لیے پیش کرتا ہے۔ پتا ہے کیوں؟“

”کیوں؟“ اس نے اپنا پسندیدہ سوال پھر سے دہرایا۔

”کیونکہ بیٹا! جو شخص اپنی جان کے ذریعے اللہ کی راہ میں لڑتا ہے اسے دنیا کے اعزازات اور تاریخ میں یاد رکھے جانے یا نذر کھے جانے سے فرق نہیں پڑتا۔ اسے اس بات سے بھی فرق نہیں پڑتا کہ گرفتاری کی صورت میں سب اسے چھوڑ دیں گے اور موت کی صورت میں کوئی اس کا جنازہ بھی اٹھانے نہیں آئے گا، کیونکہ اسے اللہ تعالیٰ کی رضا چاہیے ہوتی ہے اور جسے یہ مل جائے، اسے اور کچھ نہیں چاہیے ہوتا۔“

”مئی اکثر اسے ایسی باتیں بتایا کرتیں۔ پھر ایک دم چپ ہو جاتیں اور پھر اپنی رو میں کہتیں۔“ اپنے ملک کے راز کبھی نہیں بیچنے چاہئیں۔ انسان بھی کتنی تھوڑی قیمت پر راضی ہو جاتا ہے۔“ اس وقت ان کی آنکھوں میں ایک لودیتی اذیت ہوئی۔ بہت عرصے بعد جہان کو اس تاثر کی وجہ سمجھ آئی تھی۔

اور یہ تب ہوا جب ان کی جدیسی (مکلی) سے بچھلی جدیسی میں رہنے والے ایک لڑکے حاقان نے اس پہ راہ چلتے فقرہ اُچھالا کہ وہ پناہ گزین ہے، اور یہ کہ اس کا باپ ایک مفرور مجرم ہے۔

اس نے حاقان کو کچھ بھی نہیں کہا مگر رات جب مئی سے پوچھا تو انہوں نے بتا دیا۔ سب کچھ صاف صاف کہ کس طرح ابا سے غلطی ہوئی اور اس کی سزا وہ بھگت رہے تھے۔ جلاوطنی کی سزا۔ اور ترک حکومت نے رحم کھاتے ہوئے انہیں سیاسی پناہ بخشی تھی۔ تب اسے لگا، وہ بھی وظیفہ لینے والوں کی قطار میں عدالت میں کھڑا ہے اور چر اسی زور زور سے صدا لگا رہا ہے۔

”سکندر شاہ عدار کے در و ثناء حاضر ہوں۔“

اس سب کے باوجود وہ اب اسے نفرت نہ کر سکا۔ وہ ان سے اتنی ہی محبت کرتا تھا جتنی پہلے۔ ابا ویسے ہی اب بیمار بنے لگے تھے۔ مئی کبھی کبھی ان کو ڈاکٹر کے پاس لے جایا کرتی تھیں۔ مگر ان کے اخراجات، اس کی پڑھائی مئی کو ذیل شفقت کام کرنا پڑتا۔ رات میں کبھی کبھار وہ مئی کو لاؤنچ میں پاؤں اوپر کر کے بیٹھے ٹوکوں پہ بنے چھالوں پہ دو الگ الگ دیکھتا۔ ان کے ہاتھ سوئی، موٹی، کپڑے دھاگے اور قینچی سے آشنا ہو کر اب سخت پڑتے جا رہے تھے۔

تب وہ سوچتا کہ وہ بہت محنت کر کے بہت امیر آدمی بنے گا، تا کہ مئی کو کام نہ کرنا پڑے اور وہ انہیں جہانگیر والا گھر دوبارہ خرید کر دے سکے۔ مگر وہ وقت تو سب طرح دور چلتا تو دکھائی دیتا لیکن اگر وہ اس کے پیچھے بھاگتا تو وہ غائب ہو جاتا۔

ایک روز وہ اسکول سے آیا تو مئی اپنا زیور انٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھیں، ان کے چہرے کے افسردہ تاثرات کو دیکھتے ہوئے ان کے پاس آ بیٹھا۔

”مئی! کیا آپ اپنا زیور بیچ دیں گی؟ جیسے دادا نے جہانگیر والا گھر بیچا تھا؟“

مئی بے دلی سے مسکرائیں۔

”جیزیں اسی لیے تو ہوتی ہیں۔ میں تمہارے ابا کے اس پیسے کو ہاتھ نہیں لگانا چاہتی، جو بینک میں رکھا ہے اور جس نے ہم دونوں کو اپنے ملک کے سامنے شرمندہ کر دیا ہے۔ اس لیے زیور بیچ رہی ہوں۔ مگر تم یہ بات کسی کو نہیں بتاؤ گے۔ کیا تمہیں راز رکھتے آتے ہیں جہان؟“ وہ اکثر دادا کو جہان سے یہ فقرہ کہتے سنی تھیں، اس لیے دہرایا تو اس نے نہ ملال مسکراہٹ کے ساتھ سر اثبات میں ہلا دیا۔

مئی نے زیور بیچ دیا۔ کچھ وقت کے لیے گزرا وہ ہونے لگا، مگر پھر اس کا دل چاہنے لگا کہ وہ بھی کچھ کام کر کے پیسہ کمائے۔ تا کہ اس کی ماں کے ہاتھ نرم پڑ جائیں اور ان کے پیروں کے چھالے ملت جائیں۔ یہی سوچ کر اس نے بچھلی جدیسی کے حاقان کے چچا کرامت کی ورکشاپ

میں کام کرنے کے لیے خود کو پیش کر دیا۔ کرامت بے کا بیٹا علی کرامت اس کا کلاس فیلو بھی تھا، سو اس کو کام مل گیا۔ اسے راز رکھنے آتے تھے۔ سو یہ بات اس نے می سے راز رکھ لی۔

کرامت بے کی گاڑیوں کی درکشاپ ان کے گھر کے ساتھ تھی، یعنی جہان کے گھر سے کچھ ملے گی میں۔ جہان کا کمرہ بالائی منزل پر تھا، اگر وہاں سے کھڑے ہو کر دیکھا جائے تو کرامت بے کا گھر اور درکشاپ دونوں دکھائی دیتی تھیں۔ درکشاپ گلی کے بالکل کچلے پتے تھے، اس سے آگے دوسری گلی میں مزدو کو کمرشل ایریا شروع ہو جاتا تھا۔

ایک روز می نے اس کے کمرے کی کھڑکی سے جھانکا تو درکشاپ میں ہاتھ منہ کالا کیے، کام کرتا نظر آ گیا۔ یہ وہ وقت تھا جب وہ کھیلنے کے لیے جانے کی اجازت لے کر جایا کرتا تھا اور می کو علم ہوتا تھا کہ وہ علی کرامت کے گھر جا رہا ہے۔ آج ان کو پتا لگ گیا کہ وہ اصل میں کہاں جاتا تھا۔ جب وہ گھر آیا تو انہوں نے ساری بات ذہرا دی، مگر نہ اسے ڈانٹا، نہ ہی خفا ہوئیں۔

”تم درکشاپ میں کام کرو، اخبار پتو یا پھولوں کے گلہ سے بناؤ۔ کبھی ان کاموں میں اتنا پیسہ نہیں کما سکو گے کہ اپنی پوری کتابیں بھی خرید سکو۔ اس کے باوجود میں تمہیں نہیں روکوں گی۔ میں اپنے بیٹے کو مضبوط اور محنتی دیکھنا چاہتی ہوں۔“

اس نے ہمیشہ کی طرح اثبات میں سر ہلادیا۔ کمائی نہ ہونے کے برابر تھی، مگر بھری اسے کام کرنا اچھا لگتا تھا۔ اس نے می سے کہا کہ وہ بڑا ہو کر مکینک بنے گا۔ می خوب نہیں۔

”اچھی تم نے زندگی میں بہت کچھ دیکھا ہے۔ بہت سے پیشے دیکھ کر تم کہو گے، تمہیں وہی بننا ہے لیکن اصل میں انسان کو وہی پیشہ اپنانا چاہیے جس کے مطابق اس کی صلاحیت ہو۔ اچھی یہ فیصلہ بہت دور ہے کہ تم کیا بنو گے۔“

مگر تب بھی وہ جانتا تھا کہ وہ مکینک ہی بنے گا۔ یہی اس کی منزل تھی۔ پھر کبھی کبھی وہ خواب اسے ستاتا۔ وہ خواب جس نے ان برسوں میں کبھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ وہ پاک اسپائی اور اس کا روشن چہرہ، تب اس کی خواہش ہوتی کہ وہ بھی اس جیسا بنے لیکن پھر وہ ڈر جاتا۔ معلوم نہیں کیوں۔

اس کا یہ خوف، یہ عجیب سا الجھن بھراؤ رکب لکھا؟ شاید تب جب اس نے فریحہ سے دشمنی مول لی۔

فریحہ کرامت بے کے بھائی کی بیوی تھی۔ دراز قد، اسماٹ، خوب صورت سبز آنکھوں اور کندھوں تک گرتے اخرونی بالوں والی۔ اس کا لباس، اس کا اٹھنا بیٹھنا، اس کے ناز و انداز، سب میں ایک شاہانہ سی جھلک ہوتی تھی۔ وہ بہت مغرور، بہت طرح داری تھی۔ اس کا بیٹا حاقان بھی اتنا ہی مغرور اور تک چڑھتا تھا۔ فریحہ کا شوہر ایک ان معمولی صورت کا تھا، جب کہ کرامت بے کا کافی وجہ تھے۔ اسی لیے حاقان، جو عمر میں جہان سے دو برس ہی بڑا تھا، ہر جگہ اپنی ماں کے حسن کے قصے سنایا کرتا تھا۔ وہ لوگ پیچھے سے عرب تھے، آپس میں عربی بولا کرتے۔ ایک روز فریحہ ایک ان کے اسکول آئی تو حاقان نے سب کے سامنے اپنی ماں کو گلاب کا پھول پیش کرتے ہوئے عربی میں کچھ کہا۔ میں ”انت مرہ جیلہ“ ہی اسے سمجھا آیا۔

اس نے علی کرامت سے مطلب پوچھا تو اس نے بتایا کہ ”مرہ جیلہ“ بہت بہت خوب صورت عورت کو کہتے ہیں۔ اسے ”انت“ بھی بھول گیا۔ صرف ”مرہ جیلہ“ ذہن پر نقش رہ گیا۔

بے حد حسین عورت..... مرہ جیلہ.....

جب می اپنے زیور بیچ رہی تھیں تو انہوں نے بتایا تھا کہ انہوں نے ایک ٹیکس رکھ لیا ہے، وہ اسے نہیں بیچیں گے کیونکہ وہ اسے حیا کو دیں گی۔

”تم ہمیشہ یاد رکھنا۔ میں تمہاری شادی اپنے بھائی کے گھر ہی کروں گی، اس لیے تمہیں استنبول میں کوئی لڑکی بہت خوب صورت نہیں لگنی چاہیے۔ سن لیا تم نے؟“

مگر فریحہ کا کافی خوب صورت تھی، اسے بھی اچھی لگی، لیکن اتنی بھی نہیں کہ وہ اسے مرہ جیلہ ہی کہہ دے۔

حاقان سے اس کا جھگڑا گیم کے دوران ہوا تھا۔ درکشاپ میں کام ختم کر کے وہ جلدی میں کھیلنے علی کرامت، حاقان اور دوسرے لڑکوں کے ساتھ آشریک ہوا تھا۔ حاقان کو اعتراض تھا، مگر علی کرامت کا کہنا تھا کہ جب دوسرے آدھے گیم کے دوران شامل ہو سکتے ہیں۔ تو جہان کیوں نہیں (اس کا اشارہ حاقان کی جانب تھا جو کڑھتے روز اس کی طرح شامل ہوا تھا)۔

”مجھ میں اور اس میں فرق ہے۔ میں حاقان ایک ان رضا ہوں اور یہ ایک پناہ گزین کی اولاد۔“

جہان نے ہاتھ میں پجڑی سرخ گیند کھینچ کر اس کو دے ماری۔ اس نے بروقت سر پہنچ کر لیا مگر پھر تن فن کرتا آگے بڑھا۔ تھوڑی سی رکنائی کے بعد لڑکوں نے انہیں چھڑا لیا۔ وہ وہاں سے یوں بکھرے کہ حاقان کا ہونٹ پھٹا ہوا تھا اور جہان کی نکسیر پھوٹی تھی۔

گھر آ کر اس نے چپ چاپ خون صاف کر لیا۔

اصل اذیت اس طعنہ کی تھی، جو اسے دیا گیا تھا۔ جیسے منہ پہ چا جب دے مارا ہو۔ وہ تکلیف بہت زیادہ تھی۔ پھر بھی وہ ابا کے خلاف نہ جاسکا۔ شاید اس لیے کہ اس کی ماں نے بھی اسے باپ کے خلاف نہیں بھرا، بلکہ ہمیشہ یہی سکھایا کہ نفرت گناہ ہے کی جاتی ہے، گناہ گار سے نہیں۔

حاقان نے البتہ چپ چاپ اپنا خون نہیں صاف کیا۔ اس کا ثبوت یہ تھا کہ فریج تن فن کرتی ان کے گھر آتی، بلند آواز اور عونت سے اس کو بہت سی باتیں سن کر مٹی (اس کا شوہر کارو باری آدی تھا، اور مالی حالات کرامت بے سے اچھے تھے، اسے اسی پیسے کا غرور تھا) یہی نہیں، اس نے جا کر میوٹھلی والوں سے بات بھی کی کہ ان سیاسی پناہ گزینوں کو کمپیں اور رہائش اختیار کرنے کا کہا جائے ورنہ وہ ماحول خراب کریں گے۔

مٹی کو اس بات کا علم نہ ہوسکا، وہ گھر پہ نہیں تھیں۔ ابا ان دنوں بیمار بنے تھے، سوکرے میں تھے۔ اس نے اکیلے فریج کی باتیں سنیں، مگر چپ رہا۔ میوٹھلی والی بات اسے علی نے بتائی۔ اس کا دل جیسے ٹوٹ سا گیا۔ ابا کی وجہ سے، بلکہ اس کے اپنے جھگڑے کی وجہ سے ان کو یہ گھر چھوڑنا پڑے گا۔ اتنی مشکل سے مٹی خرچے کی گاڑی کھینچ رہی تھیں، اب ان کو مزید تکلیف سہی پڑے گی۔ وہ بہت پریشان ہو گیا۔

”تم ان باتوں سے پریشان مت ہو بچے! کوئی نہ کوئی راستہ نکل آئے گا۔ راستہ ہمیشہ ہوتا ہے، بس ڈھونڈنا پڑتا ہے۔“ علی کی بات سن کر اس کی مٹی نے کہا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر ان کو دیکھا۔

وہ اس وقت کچی سلیب کے سامنے کھڑی تھیں۔ وہ باہر کام سے آئی تھیں اور ابھی ابھی انہوں نے اسکارف سے کیا گیا، نقاب اُتارا تھا۔ اب وہ ٹشو سے چہرے پر آپاسینہ تھپتہا رہی تھیں۔ ان کا رنگ سیاہ تھا، وہ مصری تھیں، مصری سیاہ فام مگر پھر بھی ان کے چہرے پر ایسی روشنی ایسا نور تھا کہ وہ نگاہ نہیں ہٹا سکتا تھا۔ اسے وہ بہت خوب صورت لگتی تھیں۔ اس دن ان کی بات بن کر وہ خاموشی سے اٹھ گیا، مگر بعد میں مارکیٹ جا کر اس نے ایک کارڈ خریدا اور اس پہ انگریزی میں لکھا۔

“You are my marrah jameelah”

ساتھ میں ان کا نام اور فقط میں اپنا نام لکھ کر اس نے کارڈ کو خط کے لفافے میں ڈالا اور گوند سے لفافہ بند کر دیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ صبح جا کر چپکے سے یہ ان کو دے آئے گا۔ ٹھیک ہے کمری نے کہا تھا کہ اسے کوئی دوسری لڑکی خوب صورت نہیں لگتی چاہیے۔ مگر وہ لڑکی تو نہ تھیں۔ وہ تو ایک درمیانی عمر کی خاتون تھیں، اپنی جیٹانی فریج سے بالکل مختلف۔

جس ہل وہ کارڈ اپنے بیگ میں رکھ رہا تھا، اسے کھڑکی کے باہر کچھ دکھائی دیا۔ اس نے جلدی سے جی کل کی اور کھڑکی کے شیشے کے سامنے آکھڑا ہوا۔

باہر ات پھیلی تھی۔ فریج کا گھر (جہاں کرامت بے اور ایکان دونوں کے خاندان اکٹھے رہتے تھے) اور کرامت بے کی ورکشاپ سامنے دکھائی دے رہی تھی۔ ورکشاپ کے دروازے کے پاس دو بولے سے کھڑے تھے۔ ایک لاک کھول رہا تھا جبکہ دوسرا ساتھ میں چپکا کھڑا تھا۔

لاک کھول کر وہ اندر چلے گئے، جب دروازہ بند کرنے کے لیے وہ سایہ پلٹا تو اسٹریٹ پول کی روشنی ان دونوں پہ پڑی۔ لاک کھولنے والے شخص کا چہرہ واضح ہوا، جو کرامت بے کا تھا جب کہ اس کے پیچھے موجود لڑکی اسی وقت چلتی تھی۔ روشنی نے اس کے اخرونی بالوں کو چمکایا اور پھر دروازہ بند ہو گیا۔

فریج..... اور وہ بھی کرامت بے کے ساتھ اس وقت؟

استنبول میں رہنے والے ایک تیرہ سالہ لڑکے کے لیے یہ سب سمجھنا کچھ مشکل نہ تھا، مگر یقین کرنا اور اس دھوکے کو جذب کرنا، یہ بہت مشکل تھا۔ وہ کتنی ہی دیر تو حقیر کے عالم میں وہیں بیٹھا رہا تھا۔ پھر ہررات اس نے ان پہ نظر کھنی شروع کر دی۔ وہ ہررات نہیں آتے تھے۔ دو، دو، تین، تین دن بعد آیا کرتے۔

قریباً ایک مہینے بعد اس نے فریج کو سر راہ اس وقت روکا، جب وہ صبح واک پہ تیز تیز چلتی جا رہی تھی۔

”لیڈی ایکان..... کیا آپ مجھے ایک منٹ دے سکتی ہیں؟“

فریج نے گردن موڑ کر کچھ اچھپے، کچھ غصے سے اسے دیکھا۔

☆ ☆ ☆

ٹائیڈ کی باتیں تب بھی اس کے ذہن میں گھوم رہی تھیں۔ جب وہ اپنے اپارٹمنٹ بلڈنگ کی لفٹ سے نکلا۔ پرانی یادیں، کسی نوے کا بچ کی سی صورت ماس میں کھب گئی تھیں۔ ان کو کھینچ کر نکالنے کی تکلیف کا تصور ہی جان لیوا تھا۔

اس نے ست روی سے فلیٹ کے دروازے میں چابی گھمائی اور دروازہ کھولا تو اوپر کہیں سے پانی سے بھری ڈبی آگری۔ وہ عین ڈور میٹ پر گری تھی اور کارپٹ گیلیا ہو گیا تھا۔ اس نے توجہ دینے بغیر دروازہ بند کیا۔ وہ اکثر ایسی چیزیں گھر میں چھوڑ دیتا تھا۔ اگر ڈبی ابھی گری تھی تو اس کا مطلب تھا کہ اس کے بعد فلیٹ میں کوئی داخل نہیں ہوا تھا۔ ڈبی دوبارہ بھر کر رکھی جاسکتی تھی مگر کارپٹ پہ نشانات ضرور ملتے۔

اس کے باوجود عادت سے مجبور اس نے اندر آ کر کچن کی کھڑکی کی کنڈی چیک کی، پھر باتھ روم کے روشن دان کو دیکھا۔ سب کچھ دیکھا ہی تھا جیسا وہ چھوڑ کر گیا تھا۔

اس نے ٹی وی آن کیا اور لیپ ٹاپ گود میں رکھ کر پاؤں لمبے کر کے میز پر رکھے، صوفے پہ بیٹھ گیا۔ وہ ان تمام ڈاکومنٹس کو دیکھنا چاہتا تھا جو ٹائیڈ نے اسے سی ڈی کی صورت میں دیے تھے۔

ٹائیڈ نے فائل پہ سرہ جرتی پاس ورڈ لگا دیا تھا اور وہ اسے بتا چکی تھی کہ پاس ورڈ کیا تھا اگر وہ اس سے کچھ بھی لیتا تو اس کو اس فائل پہ یہی پاس ورڈ لگانے کا کہا کرتا تھا۔ ”ARP“

لےے بھر کو اس کا دھیان بھٹک کر اوالا میں اپنے ہوٹل گریڈ کے آفس کے باہر گنجشکی کی طرف چلا گیا۔ وہاں بھی اس نے یہی لکھوار کھا تھا۔ اس سے عموماً تاثر یہی پڑتا تھا کہ اے آر پی کا مطلب عبدالرحمان پاشا ہے جب کہ ایسا نہیں تھا۔ وہ جب بھی خود کو اے آر پی لکھتا، وہ اس سے مراد کبھی بھی عبدالرحمان پاشا نہیں لیا کرتا تھا۔ اے آر پی کا مطلب اس کے نزدیک کچھ اور تھا۔

فائلز کا مطالعہ کرتے ہوئے بھی وہ ذہنی طور پر الجھا ہوا تھا۔ ممی نے صبح اسے جتنی تاکید سے کہا تھا کہ وہ ماموں سے مل لے، اب اگر وہ نہیں جائے گا تو وہ ہرٹ ہوں گی اور یہی وہ چیز تھی جو وہ نہیں چاہتا تھا۔ اسے جانا ہی پڑے گا۔ وہ جتنا اس رشتے اور ان رشتہ داروں سے احترام کرتے کی کوشش کر رہا تھا، اب اتنے ہی وہ اس کے سامنے آچکے تھے۔

بہت بے دلی سے اس نے لیپ ٹاپ بند کیا اور پھر کھائی پہ بندھی گھڑی دیکھی۔ رات کے نو بج رہے تھے۔ ماموں کا گھر یہاں سے دس منٹ کی ڈرائیو پہ تھا۔ کیا وہ ابھی ہی چلا جائے؟ گاڑی آج اس کے پاس نہیں تھی۔ سروس کے لیے دی ہوئی تھی، اسے کل ملنا تھی، اگر ہوتی تب بھی وہ ٹیکسی پر ہی جاتا، کیونکہ وہ ان کو یہی تاثر دے گا کہ وہ ترکی سے آج آیا ہے، دو ہفتے قبل نہیں۔ البتہ وہ ان کے گھر کے گاؤں میں۔ واپس آجائے گا، کہہ دے گا کہ وہ ہوٹل میں رہائش پذیر ہے وغیرہ وغیرہ۔ کوراسٹوری تو اس کے پاس ہمیشہ تیار ہوتی تھی۔

وہ اٹھا، اپنی جیکٹ پہنی، جو گزر کے تھے باندھے اور والٹ اٹھا کر جانے لگا، پھر خیال آیا کہ وہ خط کے لفافے اٹھا لے جن کو اسے پرانی تاریخوں میں اسٹیپل کروا کر میڈیکل سیکرٹری کو بھیجنا تھا۔ یہ کام ماموں کے گھر جانے سے زیادہ ضروری تھا، پہلے اسے یہی کرنا چاہیے۔ پانی کی ڈبی دروازے کی اوپری جگہ پہ احتیاط سے رکھ کر، اس کی ڈور پھنسا کر وہ باہر نکل آیا۔ ٹیکسی نے اسے ماموں کے سیکٹر کے مرکز پہ اتارا۔ یہاں سے ان کا گھر سو قدم کے فاصلے پہ تھا۔ جس دن وہ اسلام آباد پہنچا تھا، اس نے یونہی سرسری سا دورہ راستہ سمجھ لیا تھا۔ شاید اس کے لاشعور میں یہ بات بٹھی ہوئی تھی کہ اس دفعہ اسے جانا ہی پڑے گا۔

مرکز پہ ایک کوریئرسروس کی شاپ سامنے ہی تھی۔ اس کے سامنے پھول والا بیٹھا تھا۔ مختلف رنگوں اور قسموں کے پھول سجائے، وہ ان پہ پانی چھڑک رہا تھا۔ پھول..... اسے چاہیے کہ وہ ان کے گھر کچھ لے کر جائے، پھولوں سے بہتر کوئی تحفہ نہیں تھا۔ وہ ہمیشہ ہی ایک بہت قیمتی اور خوب صورت تحفہ ہوتے ہیں۔ اس نے سوچا وہ لڑکے کو گلہ ستہ بنانے کا کہہ دے اور تب تک وہ اندر کوریئرسروس سے لفافے اسٹیپل کروا لے۔

”بات سنو!“ اس نے پھول بیچنے والے لڑکے کو پکارا۔ وہ چو پانی کا چھڑکاؤ کر رہا تھا، فوراً اُپلٹا۔

”جی صاحب!“ اپنے سامنے موجود آدمی کو دیکھ کر، جو سیاہ جیکٹ میں ملبوس، پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑا تھا، وہ جلدی سے پانی کا برتن رکھ کر مڈب سا ہوا، اس کے پاس آیا۔

”گلاب کے پھول ہیں تمہارے پاس؟“

”کون سا رنگ چاہیے صاحب؟“

”سرخ! اس نے بنا سوچے کہہ دیا۔ لڑکے نے ذرا تاسف سے سر ہلایا۔

”صاحب! سرخ پھول ختم ہو گیا ہے۔ تھوڑے سے سفید گلاب پڑے ہیں۔ وہ کروں؟“

”نہیں، نہیں۔“ اس نے قدرے برہمی سے لٹی میں سر ہلایا۔ سفید گلاب، دشمنی کی علامت۔ مئی کو پتا چلے، وہ پہلے ہی دن ماموں کے

گھر سفید گلاب لے گیا ہے تو وہ از حد خفا ہوں گی۔

”مجھے سرخ ہی چاہئیں۔ کہاں سے ملیں گے۔“

”صاحب! میرے پاس سرخ اسپرے ہے، ان سفید پھولوں کو اسپرے کروں؟ قسم سے صاحب اتنی مہارت سے کروں گا، بالکل پتا

نہیں چلے گا۔“

”ہاں یہ ٹھیک ہے، یہی کرو۔“ اس نے اثبات میں سر کو جنبش دی۔ نقلی سرخ رنگ کے گلاب، سفید گلاب سے پھر بھی بہتر تھے۔



ایک سو سا بی
ڈاٹ کام

باب 11

پھولوں والا لڑکا جلدی جلدی ہاسکٹ سے سفید گلاب نکالنے لگا۔

”تم گلدستہ بناؤ، میں آتا ہوں۔“ اس کی رفتار دیکھ کر وہ جان گیا کہ ابھی اسے کافی وقت گئے گا، اس لیے وہ اندر کوریئر شاپ کی طرف بڑھ گیا۔ اسے اگر کسی شے سے اذہد چڑھتی تو وہ وقت ضائع کرنے سے تھی۔

کوریئر شاپ میں دو افراد کھڑے اپنے اپنے لفافے جمع کر رہے تھے۔ ڈیسک کے پیچھے بیٹھا، پی کیپ پہنے لڑکا کمپیوٹر پر مصروف نظر آ رہا تھا۔ وہ خاموشی سے جا کر ایک کونے میں کھڑا ہو گیا۔ دفعتاً ملازم لڑکے نے ٹائپ کرتے ہوئے سر اٹھا کر دیکھا۔ جہاں پہ نظر پڑتے ہی اس کے چہرے پہ شناسائی کی رتق ابھری۔ وہ جلدی جلدی کام پٹناتے لگا۔

دونوں افراد کو فارغ کر کے وہ اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔

”جی احمد بھائی! کوئی خدمت؟“

”ہاں، چھوٹا سا کام ہے۔“ وہ جیکٹ کی جیب سے چند صاف لفافے نکالتے ہوئے اس کے سامنے کاؤنٹر پہ آیا۔
 ”ان کو کچھ بیک ڈش میں اسٹیپ کرنا ہے اور کچھ کو آگے کی ڈش میں۔ یہ دیکھو۔۔۔۔۔“ وہ اسے کام سمجھانے لگا۔ مٹھنفر اس کو جانتا تھا، اس سے پہلے وہ جہاں کا اس سے ہٹ کر بھی ایک اضافی کام کر چکا تھا، نہ بھی کر چکا ہوتا، جب بھی اس کے کارڈ کے باعث کبھی دیتا۔

”انٹری نہیں کرنی بھائی؟“ جب وہ لفافے واپس جیکٹ میں رکھنے لگا تو مٹھنفر حیرت سے بولا۔

”اول ہوں۔۔۔۔۔ میں تمہیں کسی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ بسا کام ہو جائے گا اور گھر میں سب ٹھیک ہے؟“

”جی بھائی!“ مٹھنفر اسے گھر کی باتیں بتانے لگا۔ اس کا وہ بھائی جس کو جیل سے نکلوانے میں جہاں نے مدد کی تھی، اب کام پہ لگ گیا تھا اور وہ اس بات سے کافی آسودہ لگ رہا تھا۔

”میں چلتا ہوں تمہارا بھی آف کرنے کا نام ہو رہا ہے۔“ اس کی بات سنا کر وہ تھک کر اس نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔
 وہ ماموں کے گھر پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مٹھنفر سے مصافحہ کر کے وہ باہر آیا۔

سٹ روڈ کا ابھی بوکے پلاسٹک کور کے گردور بن باندھ رہا تھا۔

”اُسپرے نہیں کیا؟“ اس نے سفید گلاب کے پھولوں کو، کچھ کراچی سے لے کر اٹھائی۔

”میں نے ابھی دیکھا صاب! اُسپرے ختم ہو گیا ہے۔ آپ ایسے ہی لے جائیں۔ دیکھیں! یہ بزرپے ساتھ میں لگائے ہیں، کتنے اچھے لگ رہے ہیں۔“

”اچھا، زیادہ بیکمرٹ دو۔ کتنے پیسے ہوئے؟“ ناگوار سی سے نوکتے ہوئے اس نے ہنر دکھایا۔ اندر سے چند نوٹ نکالتے ہوئے اس کی نگاہ اپنے سرس کاؤ پر پڑی۔ کیا ماموں کو یہ دکھانا تھا؟ نہیں، ابھی بہت جلدی ہوگا۔ پہلے اسے ان کا اعتماد جیتنا ہوگا اور وہ ان کی نازک اندام، مغروری بنی۔۔۔۔۔ ان سب لوگوں کی زندگی کا حصہ بننا مشکل لگ رہا تھا۔

بوکے چھوٹا سا تھا۔ اس کو پہلو میں لٹکے ہاتھ میں لاپرواہی سے پکڑے وہ مزک کنارے چلنے لگا۔ ماموں کا گھر یہاں سے قریب تھا۔
 مگر وہ کچھ دیر مرکز کی سڑکوں کے کنارے چلنا چاہتا تھا۔ ابھی وہ صرف اپنی سوچوں کو مجتمع کرنا چاہتا تھا۔

وہ کیا چاہتا تھا۔ وہ خود بھی یقین نہیں تھا۔ یا پھر وہ جو چاہتا تھا، اسے کہنے سے ڈرتا تھا۔ ماں سے کہنے کا تو وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا مگر خود سے تو کہہ ہی سکتا تھا اور اصل بات وہی تھی، جو مانیہ نے آج دوپہر میں کہی تھی۔ وہ اپنے ماموں سے ڈرتا تھا۔ وہ ان کے طبع سے ڈرتا تھا۔ اتنے سالوں بعد بھی وہ ان کے سامنے سر اٹھانے سے ڈرتا تھا۔ مگر کبھی نہیں، وقت بدل گیا ہے۔ فرقان ماموں اور سلیمان ماموں نرم ہو گئے ہیں۔ البتہ پچھلے برس ہونے والی سلیمان ماموں سے ملاقات کے بعد اسے کوئی خوش فہمی نہیں رہی تھی کہ ان کے مزاج کی سختی اور غرور ختم ہو گیا ہے۔ وہ ایسے ہی تھے۔ فرق یہ تھا کہ اب سلیمان ماموں کو اپنی بیٹی کی فکر تھی، اب وہ بیٹی والے تھے۔ ان کا ہاتھ نیچے تھا اور اس کا اوپر۔ پہلے کی بات اور تھی۔ تب ان

کی بیٹی چھوٹی تھی۔ انہیں مستقبل کی فکر نہیں تھی لیکن اب اس کی شادی کی عمر تھی۔ رشتے بھی آتے ہوں گے۔ اب وہ اس فرض سے سبکدوش ہونا چاہتے ہوں گے اور ان کی پہلی ترجیح ان کا بھانجا ہی تھا۔ کوئی بھی اپنی خوشی سے بچپن کا نکاح نہیں توڑتا۔ سلیمان ماموں سے بھی اسے یہ امید تھی کہ وہ اس رشتے کو ختم کرنا چاہتے ہوں گے نہ وہ خود چاہتا تھا۔ لیکن بھانا..... یہیں آ کر وہ رک جاتا تھا۔ یہ رشتہ بھانا بہت مشکل تھا۔

وہ ایسی چھوٹی سوچ کا حامل آدمی تو تھا نہیں کہ پرانے انتقام لینے کے لیے ان کی بیٹی کو لکائے رکھتا۔ یہ بھی ٹھیک تھا کہ وہ ان سے مل لے تاکہ دونوں فریقین دیکھ لیں کہ یہ رشتہ چل سکتا ہے یا نہیں۔ اگر اسے محسوس ہوا کہ وہ بھاسکتا ہے تو می کو آگاہ کر دے گا اور اگر اسے لگا کہ وہ نہیں بھاپائے گا تو..... وہ پھر اسی مقام پر آ کر رک گیا۔ می ہرٹ ہوں گی۔ یہ وہ آخری چیز تھی جو وہ نہیں چاہتا تھا۔ اتنے سال اگر اس نے جان بوجھ کر ماموں کی فیملی سے لاتعلقی اختیار کیے رکھی تو اس لیے کہ دور اندر وہ یہ رشتہ نہیں چاہتا تھا۔

سڑک کنارے سرگھٹا کر چلتے ہوئے اس نے خود سے بچ بولنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ خود ہی یہ رشتہ نہیں چاہتا تھا۔ اس کی یہ ساری بے رخی، لاتعلقی اور اعراض برتا، سب لا شعوری طور پر اسی لیے تھا کہ وہ لوگ تنگ آ کر خود ہی رشتہ ختم کر دیں اور وہ ماں کو دکھ دینے کے بوجھ سے آزاد ہو جائے۔ یہ انک بات تھی کہ یہ خود کو دکھ دینے کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ جو بھی یہ رشتہ ختم کرے، ذمہ دار تو وہی ہوتا۔ اس کے خشک رویے کے باعث ہی یہ رشتہ ٹوٹے گا۔

لیکن وہ لوگ اس سے اور کیا توقع رکھتے ہیں؟ کس نے کہا تھا کہ نہیں کہ اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کا رشتہ طے کر دیں؟ اسے کبھی کبھی ان سب ذمہ داران پر از حد غصہ چڑھتا تھا۔ می یہ البتہ نہیں چڑھتا۔ کبھی بھی نہیں۔ وہ صرف اپنے بھائیوں کے ساتھ تعلق قائم رکھنا چاہتی تھیں۔ انہوں نے جو کچھ کیا، بس رشتے بچانے کے لیے کیا۔ یہی کیا۔ وہ جان بوجھ کر ماں کو خشک کا فائدہ دے دیا کرتا تھا مگر ماموں کو نہیں۔ بے انصافی ہے تو بے انصافی سہی۔

بہت دیر وہ سڑکوں پہ بے مقصد چلتا سوچوں میں غلطال رہا۔ وہ ابھی ان کے گھر نہیں جانا چاہتا تھا مگر ماں کے سامنے اس کے ”میں ابھی دینی طور پہ تیار نہیں“ اور ”یہ بہت جلدی ہے، مجھے سوچنے کا وقت دیں“ جیسے بھانے نہیں چلتے تھے۔ اسے ایک دفعہ جانا ہی پڑے گا۔ گھڑی کی سوئیاں دس سے اوپر آ چکی تھیں۔ جب اس نے خود کو سلیمان ماموں کے گھر کے بیرونی گیٹ کے سامنے کھڑے پایا۔ گیٹ بند تھا۔ اندر گھر کی بتیاں جل رہی تھیں۔ اس کی نگاہیں ساتھ والے گیٹ پر پھیلیں۔ یہ فرقان ماموں کا گھر تھا۔ وہ پہلے ایک دن آ کر یہ گھر دیکھ گیا تھا اور پھر نفیس بک پر وکیل نے ان دونوں گھروں کے اندر باہر کی اتنی تضاد پر لگا رکھی تھیں کہ اسے اندرونی نقشہ بھی حفظ تھا۔

وہ ان دونوں وسیع و عریض اور خوب صورت بنگلوں کے سامنے سڑک پہ گویا کسی دور پہ پہ کھڑا تھا۔ اندر جائے، یا یہیں سے پلٹ جائے؟ اسے صرف ایک بہانہ درکار تھا، اس گھر اور اس کے کیمینوں سے دور بھاگنے کا۔ صرف ایک وجہ وہ ڈھونڈ لے اور واپس پلٹ جائے لیکن کوئی وجہ تھی ہی نہیں۔ اسے اندر جانا ہی تھا۔

دفعتاً فرقان ماموں کے گیٹ کے پیچھے کھڑا ہوا اور پھر بولنے کی آوازیں، قریب آتے قدم۔ وہ غیر اختیاری طور پہ تیزی سے ایک طرف ہوا۔ کالونی میں نیم اندھیرا سا تھا۔ گھروں کی بیرونی بتیاں بھی اس جگہ کو روشن کرنے میں ناکام تھیں۔ وہ فرقان ماموں کے گیٹ کے دائیں طرف ایک گھاس سے بھرے جنگل کی اوٹ میں ہو گیا۔

گیٹ سے فرقان ماموں چند افراد سمیت باہر نکل رہے تھے۔ شلوار قمیض میں ملبوس مسکراتے ہوئے وہ خوش اخلاقی سے اپنے مہمانوں کو چھوڑنے باہر آئے تھے۔ مہمان تین مرد حضرات تھے، جن کی کار سڑک کے پار ایک خالی پلاٹ کے سامنے کھڑی تھی۔ یہاں سے زرا دور، نہ جانے کیوں ماموں اب ان افراد کے ساتھ باتوں میں مگن اسی طرف جا رہے تھے، پیچھے گیٹ کھلا رہ گیا تھا۔ گاڑ، چوکیدار، فی الوقت کوئی بھی نہ تھا۔ شادی قریب تھی۔ سو مصروفیت نے ملازموں کو بھی گھر رکھا ہوگا۔

وہ اندھیری جگہ پہ دم سادھے کھڑا فرقان ماموں کو دیکھتا رہا۔ دل میں ایک عجیب سی ہوک اٹھی تھی۔ پرانی باتیں پھر سے یاد آنے لگی تھیں۔ اس نے بے اختیار سر جھٹکا اور جیسے الٹی یادوں کو رفع کرنا چاہا۔

ماموں اب اپنے مہمانوں کی گاڑی کے ساتھ کھڑے ان سے کچھ کہہ رہے تھے۔ اسے یوں وقت ضائع ہونے پہ الجھن ہو رہی تھی۔ چند منٹ تو وہ کھڑا رہا، مگر جب اسے لگا کہ ماموں اور ان کے مہمانوں کی گفتگو لمبی ہوتی جا رہی ہے تو وہ جنگلے کے عقب سے نکل آیا۔ وہ لوگ بہت دور تو نہیں تھے۔ البتہ ایسے رخ سے کھڑے تھے کہ کسی کا بھی چہرہ گیٹ کی جانب نہیں تھا۔

وہ فرقان ماموں کا سامنا کیے بغیر اندر جانا چاہتا تھا۔ کیا حرج تھا اگر وہ یوں ہی اندر داخل ہو جائے۔ فرقان ماموں کو متوجہ کرنا اور ان کے سوالات کا جواب دینا؟ نہیں، ابھی نہیں۔

بہت آرام اور آہستہ سے وہ کھلے گیٹ کے اندر چلا آیا۔ سردی بڑھ گئی تھی۔ لان خالی تھا۔ سب اندر تھے۔ اس نے گردن اٹھا کر دیکھا کہ درمیانی دروازہ تلاش کیا۔ وہ سامنے ہی تھا۔ اس پہ کھنٹی گئی تھی لیکن اس نے پہلے دروازہ دھکیلا تو وہ کھل گیا۔ اسے جانا تو سلیمان ماموں کی طرف تھا، سو اٹھ کر اپنے سوہنہ دروازے سے گزر کر سلیمان ماموں کے لان میں داخل ہو گیا۔

اسنے برسوں سے بنا اجازت دوسروں کے گھروں، لاکرز، موہاٹلز اور ای میلوں میں خاموشی سے داخل ہونے اور نکلنے کی عادت کے باوجود وہ آفیشل کام کے بغیر ٹریس پاننگ نہیں کیا کرتا تھا۔ اب بھی یہ کرتے وقت اس کے ذہن میں یہی بات تھی کہ وہ اس کے ماموں کا نہیں، بلکہ سرکار کا بھی گھر ہے۔ اندر جا کر وہ بتا دے گا کہ وہ کس طرح داخل ہوا۔ بات ختم!

سلیمان ماموں کا ہر ابھر لان بھی سنسان اور سرزد ہوا تھا۔ اسے پچھتاوا ہوا کہ اس نے پھول اٹھانے کا تکلف کیوں کیا۔ خواہ وہ ایک بوجھ اٹھائے پھر رہا ہے۔ اس نے غلطی سے لان کی میز پر رکھ دیا اور خود گھر کے داخلی دروازے کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

کھنٹی باہر گیٹ پہنچی اندر اس داخلی دروازے پہ نہیں۔ اب کیا صرف دروازہ کھٹکھٹانے پہ کوئی نکلے گا؟ بہت تذبذب سے اس نے داخلی دروازے پہ دستک دی۔ البتہ وہ خود بھی جانتا تھا کہ اندر کمروں میں موجود افراد اس وقت یہ دستک نہیں سن پائیں گے۔ وہ جان بوجھ کر اس طرح کر رہا تھا، تاکہ اسے ان سے ملنا نہ پڑے اور وہ کہہ سکے ”مئی میں گیا تھا، مگر آپ کے بھائیوں نے دروازہ ہی نہیں کھولا، میں کیا کرتا، سو واپس آ گیا۔“

حسب توقع دروازہ کسی نے نہیں کھولا۔ وہ سرد پڑتے ہاتھ جیکٹ کی جیبوں میں ڈالے گھر کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتے یوں ہی جائزہ لینے لگا۔ اس گھر میں کون کون ہے۔ مہمان بھی آئے ہوں گے شادی کے۔ کوئی جاگ رہا ہے یا نہیں اور ایسی ہی باتوں کا سرسری سا معلوم کرنے وہ گھوم پھر گھر کو دیکھنے لگا۔ تمام کھڑکیاں بند تھیں۔ البتہ لان کے داخلی رخ پہ کھنٹی ایک کھڑکی کے ددشتے کے پٹ کھلے تھے۔ اتنی سردی میں کون کھڑکی کھول کر بیٹھا ہے؟

وہ اچنبھے سے بنٹنوں کی طرف آیا۔

دشتے کھلے تھے، البتہ جالی بند تھی۔ اس کے پیچھے پردے بھی گرے تھے۔ دو پردوں کے درمیان ایک درزی تھی، جس سے کمرے کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ یہاں وہ عادت سے مجبور تھا۔ نجالب دانت سے دبائے، اس نے احتیاط سے گردن ڈراؤنی کر کے اندر دیکھا۔ کمرے میں مدھم روشنی پھیلی تھی۔ صرف ایک ہی بلب جل رہا تھا۔ روشنی کا دوسرا منبع بیڈ کے نیچے پر رکھا لیپ ٹاپ تھا۔ جس کے سامنے وہ کہنوں کے بل اونڈی لیٹی تھی۔ اسکرین کی روشنی اس کے چہرے کو چمک رہی تھی۔ وہ ٹھوڑی سی تھیلی رکھے، دوسرے ہاتھ کی انگلی لیپ ٹاپ کے بچ بیڈ پہ پھیر رہی تھی۔ یہ وہی تھی، جس کو اس نے دوپہر میں دیکھا تھا۔ اس نے وہی سیاہ لباس پہن رکھا تھا۔ سلی بال ملائی سے بنی جلد۔

اس کی کزن، اس کی بیوی، کیسا عجیب رشتہ تھا کہ دل میں کوئی احساس نہیں جاگتا تھا۔ نہ ہی اس سے ملنے کی کوئی خواہش تھی۔ نہ جانے کیوں، وہ واپس ہوا تھا۔ جس طرح لوگ مڑمڑ کر اسے ہونٹ کی لابی میں دیکھ رہے تھے، اسے وہ سب کچھ ناگوار لگا تھا۔ اس کا لباس گو کہ ایسا نہ تھا، آستین پوری تھیں، قمیض لمبی تھی، نیچے کھلا ٹراؤز تھا۔ مگر اس کے کپڑوں کی فال ہی کچھ ایسی تھی اور کچھ اس کا انداز کہ وہ توجہ کھینچتے تھے۔ اسے ایسی لڑکیاں کبھی بھی اچھی نہیں لگتی تھیں۔ اسے یہ لڑکی بھی قطعاً اچھی نہیں لگتی تھی۔

رات کی مقدس خاموشی میں بنٹنوں کی آواز نے ارتعاش پیدا کیا تو وہ چونکا۔ وہ اب اٹھ کر بیٹھے ہوئے بے چینی سے موبائل پہ کال ملا رہی تھی۔

”ہیلو زارا؟ شاید رابطہ مل گیا تھا۔ تب ہی وہ دبے دبے جوش سے چبکی۔ ”کیسی ہو؟ سوتو نہیں گئی تھیں؟ حیا بول رہی ہوں۔“

جہان نے سوچا، وہ کیوں سردی میں باہر کھڑا کسی کے کمرے میں جھانک رہا ہے؟ اس کو مئی نے ماموں وغیرہ کے سارے نمبرز دے رکھے تھے، پھر وہ ان کو کال کر کے بتا کیوں نہیں رہا کہ وہ ان کے گھر آ چکا ہے۔ اگر اس کی نیت اندر جانے کی ہو تو وہ لاک توڑ کر بھی اندر داخل ہو جاتا۔ ساری بات نیت کی تھی۔

”ساری باتیں چھوڑا اور میرے پاس جو بڑی خبر ہے وہ سنو اور تم یقین نہیں کرو گی، میں جانتی ہوں۔“

وہ اندر موجود لڑکی کی باتیں بے توجہی سے سن رہا تھا۔ موبائل جیب سے نکالتے ہوئے وہ سلیمان ماموں کو فون کرنے کے بارے میں

سوچ رہا تھا۔ اس نے نمبر ملایا، نمبر بند کر دیا۔ نمبر ملایا، نمبر بند کر دیا۔

”کیوں یو بیویات دارا کہ مجھے یورپی یونین نے اسکارشپ کے لیے سلیکٹ کر لیا ہے؟“

موہاں کی اسکرین پر اہلی سے نمبر لکھتا وہ جیسے چونکا تھا۔ یورپی یونین کا اسکارشپ، ارمس منڈس آپیکس پر پروگرام؟ ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ اپنی دوست سے جو گفتگو کر رہی تھی، اس میں یہی نام اس نے لیا تھا۔ کیا وہ اسکارشپ کے لیے کہیں جا رہی تھی؟ اس نے موہاں واپس جیب میں ڈالا۔ اس کی ساری حیات اندر ہوتی گفتگو پہ لگ گئیں۔

”بالکل سچ کہہ رہی ہوں دارا۔“ اب وہ کسی یونیورسٹی کی طرف سے آنے والی ای میل کا بتا کر اپنی دوست کو مطمئن کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ بالکل دم سادھے کھڑے کیا۔ اسے صرف یورپ کی اس یونیورسٹی کا نام سننے میں دلچسپی تھی، جہاں وہ جا رہی تھی۔

”نہیں، آئین کی Deusto نہیں، بلکہ ترکی کی سہانچی یونیورسٹی نے ہمیں سلیکٹ کیا ہے اور اب ہم ایک سمسٹر پڑھنے پانچ ماہ کے لیے استنبول جا رہے ہیں۔“

باہر مردی اور تاریکی میں کھڑکی کے ساتھ کھڑے جہان کو ہنس ہوا، کسی نے اس کا سانس روک دیا ہو۔ ترکی؟ استنبول؟ پانچ ماہ؟ اس نے بے یقینی سے پردوں کی درز سے جھلکتے منظر کو دیکھا۔ اس کا دماغ جیسے سن ہو گیا تھا۔

وہ اب اپنی دوست کو سہانچی میں ہیڈ اسکارف پہ پابندی کے بارے میں بتا رہی تھی۔ اس کی توجہ پھر بھٹک گئی۔ اسے لگا اسے پیشانی پہ پسینہ آ گیا ہے، جبکہ آستین سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے وہ ذرا پیچھے کو ہوا تو ساتھ میں لگے گلوں سے ہاتھ نکرایا۔ بے خیالی میں ہونے والے اس عمل سے کھلاڑھک گیا۔ نیچے گھاس تھی، اس لیے وہ ٹوٹا نہیں، مگر چوں کی ہلکی سی کھڑکھڑاہٹ بھی اندر سنائی دی تھی، تب ہی اس نے اس لڑکی کو چونک کر کھڑکی کی جانب دیکھتے دیکھا۔

وہ بہت احتیاط سے ایک طرف ہو گیا۔ وہ اتنی بے وقوف یا لا پرواہ نہیں تھی، اس کی حیات کافی تیز تھیں۔ اسے اب یہاں سے چلے جانا چاہیے، اس سے قبل کہ وہ پکڑا جائے۔

”ابا نے مجھے کبھی اسکارف لینے یا سر ڈھکنے پہ مجبور نہیں کیا، تھینک گاڈ.....“ وہ کھڑکی کی طرف نہیں آئی، بلکہ سلسلہ کلام وہیں سے جوڑے کہنے لگی۔ وہ دوسری دفعہ چونکا تھا۔ تھینک گاڈ؟ اس بات پہ تھینک گاڈ کہ اس کے باپ نے کبھی اسے سر ڈھکنے کو نہیں کہا؟ عجیب لڑکی تھی یہ۔ چند لمحوں میں اس نے فیصلہ کر لیا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اسے اندر نہیں جانا۔ اسے ان لوگوں سے ابھی نہیں ملنا، اسے پہلے اپنی ”بیوی“ سے بات کرنی ہوگی۔ اسے ان سے ملنے اور ان کو اپنی جانب سے کوئی بھی امید دلانے سے قبل اس لڑکی کو جاننا اور اعتماد میں لینا ہوگا۔ یہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ کسی نہ کسی طرح اس کو ترکی کا اسکارشپ حاصل کرنے سے روکنا تھا۔ اللہ، اللہ، اگر وہ ترکی آگئی تو وہ بری طرح سے بھنسنے جائے گا۔ کیسے سنبھالے گا وہ سب کچھ؟

اس نے گردن موڑ کر لان کی میز پر رکھے گلدستے کو دیکھا اور پھر کچھ سوچ کر جیب سے لفافوں کا بنڈل نکالا۔ وہ لفافہ جس پہ ایک روز قبل کی مہر درج تھی، اس نے وہ علیحدہ کیا، پھر اندرونی جیب سے پین نکالا۔

چند لمبے سوچنا رہا، پھر لفافے کے اندر رکھا جو کور سفید مونا کاغذ باہر نکالا اور اس پہ لکھا، ”دیکھو تم سہانچی“ یہ اس کو چونکانے کے لیے بہت ہوگا۔ کسی اور مقصد سے لیے گئے لفافے پہ اس کا نام لکھ کر اس نے تھیک سے اسے بند کر دیا۔

اندروہ اپنی دوست کو ابھی تک برسوں ہونے والی مہندی کے بارے میں بتا رہی تھی۔ وہ دس بے قدموں چٹا لان میں کبھی کرسیوں تک آیا، میز پہ رکھا ہو کے اٹھایا اور متلاشی نگاہوں سے گھر کو دیکھا۔ کدھر رکھے وہ اس کو؟ کوئی ایسی جگہ ہو جہاں سب سے پہلے حیا دیکھے۔ اس کے ماں باپ نہیں۔

حیا..... یہ نام بھی کتنا غیر مالوس تھا نا۔

اسے یہ گھر کے اندر رکھنا چاہیے۔ مگر کچھ ایک دروازہ عموماً باہر کی طرف کھلتا ہے، شاید وہ کھلا ہو۔ یہی سوچ کر وہ محو کر گھر کے دوسری طرف آیا۔ مگر کدھر وہی دروازہ بند تھا لیکن ایک کھڑکی جو باہر کی طرف کھلتی تھی، اس میں سے وہ یہ بو کے اندر رکھ سکتا تھا۔ کھڑکی اس طرح سے بنی تھی کہ باہر کی طرف شیشے کے پتے تھے اور اندر کی طرف گرل تھی۔ گرل کا ڈیزائن کچھ ایسا تھا کہ وہ بو کے اس کے اندر سے گزار کر سامنے کاؤنٹر پہ رکھا جا سکتا تھا۔ لیکن اس کے لیے پہلے شیشے والے پتے کو کھولنا ہوگا۔

اس نے بس دو دفعہ کچھ بچا اور پٹ کی کنڈی اکھڑ گئی۔ ویسی چیزیں، خیر اسے صرف پھول اندر رکھنے سے غرض تھی۔ نہایت آہستگی سے گلدستہ اور بند لٹافہ گرل میں سے گزرا کر اس نے کاؤنٹر پر رکھا، پھر ہاتھ واپس سمجھ لیا۔ شیشے والا پٹ احتیاط سے بند کرتے ہوئے وہ پلٹ گیا۔

صبح جو بھی وہ پھول دیکھے گا، لٹافہ نے پورے نام پڑھ کر ان کو حیا کے حوالے کر دے گا۔ وہ ضرور سوچے گی کہ رات کو ان کے گھر کے اندر کون پھول رکھ کر جا سکتا ہے۔ اس سے آگے کیا ہوگا، یہ اسے ابھی طے کرنا تھا، لیکن جو بات اسے مطمئن کرنے کے لیے کافی تھی، وہ یہ تھی کہ وہ اس زبردستی کی ملاقات سے بچ گیا۔ ایک ان چاہے، مجبوری کے بندھن سے فرار کی مہلت میں چند دن کا اضافہ ہو گیا۔ اب وہ می کو کہہ سکتا تھا کہ وہ اس لیے انور نہیں گیا کیونکہ ان کی بیٹی ترکی آ رہی ہے اور یہ بات می کو پریشان کر دینے کے لیے کافی تھی۔

گھر سے نکلنے سے قبل کچھ سوچ کر وہ پورچ میں کھڑی گاڑیوں کی طرف آیا تھا۔

☆

☆

☆

فریح نے گردن موڑ کر پکھا دیکھا، کچھ غصہ سے اسے دیکھا۔

”پولو!“

”میرا خیال ہے، ہم ادھر بیچ پیٹھ جاتے ہیں۔“ نر اعدادی سنجیدگی سے کہتے ہوئے اس نے ہاتھ سے سڑک کنارے بنی بیچ کی طرف اشارہ کیا۔

”لڑکے! صبر سے پاس زیادہ وقت نہیں ہے، جو کہنا ہے کہیں کہو۔“

”ٹھیک ہے۔ اب آپ میری بات سنیں۔“ کنڈھوں کو ذرا سا اچکا کر وہ اس کے سامنے کھڑا کہنے لگا۔ ”آپ نے مجھے پناہ گزین کی اولاد کہا تھا۔“

”اب بھی کہتی ہوں اور بہت جلد تمہیں اس جگہ سے نکلوا کر بھی دکھاؤں گی۔“ اس نے ہلکی سی استہزاء سے مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

”لیڈی فریح! پناہ گزین کی اولاد ہونا بہتر ہوتا ہے، اپنے شوہر کے چھوٹے بھائی کے ساتھ تعلقات استوار کرنے اور ہر روز بعد رات کے ساڑھے بارہ بجے سلیکٹ شاپ میں وہ کرنے سے، جسے گناہ کہتے ہیں۔“

اپنی زندگی میں پہلی دفعہ اس نے کسی گلابی، سنہری سے انسانی چہرے کو سفید پڑے دیکھا تھا۔ ایسا جیسے کسی نے سفید پینٹ کر دیا ہو۔

فریح کا سارا خون ہی بخود گیا۔ کتنے ہی بل تو وہ شل کھڑی رہی۔

”اب آپ میری بات سنیں۔ مجھے اور میری فیملی کو اگر آپ نے یہاں سے نکلوانے کی کوشش کی تو میں آپ کے شوہر کے پاس چلا جاؤں گا اور یہ مت سوچئے گا کہ وہ میری بات نہیں مانیں گے۔ میں ان کو وہ ثبوت بھی دکھاؤں گا، جو میں نے اکٹھے کیے ہیں۔ یہ مت بھولے گا کہ یکسر ابر گھر میں ہوتا ہے۔“

فریح نے شاید کبھی نہیں سوچا تھا کہ وہ یوں پکڑی جائے گی۔ وہ اتنی ششدر تھی کہ جواباً کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ وہ اسے یوں ہی ہکا بکا جھوڑ کر پلٹ آیا۔ اس کا اپنا دل بھی زور سے دھک دھک کر رہا تھا۔ بہت دنوں سے اس نے فریح کے سامنے خود پہ اعتماد قائم کیا تھا اور یہ یکسرے والی بات تو ایک خالی دھمکی تھی، اس کے پاس کوئی ثبوت نہ تھا۔ سامنے کوئی مرد ہوتا تو رکھ کے دو تھپڑ لگاتا اور بک بھک کر چلتا کرتا، مگر فریح کا غرور کچھ ایسے گھائل ہوا تھا کہ وہ سنسجیل ہی نہ سکی اور وہ دبی مسکراہٹ کے ساتھ واپس آ گیا۔

پھر دو بار وہ کبھی کرامت بے کی دکان پہنچ گیا۔ علی کرامت کے گھر جانا بھی اس نے ترک کر دیا۔ اس کی عزت نفس کو گوارا نہیں تھا کہ اب وہ ان کے گھر جائے۔ لیکن اکثر اسکول سے جاتے ہوئے بس اسٹاپ پہ ٹھیل کا انتظار کرتے وہ علی کرامت کو اپنی ڈاکٹرمی کے ساتھ آتے دیکھتا تو پھر کافی دیر ان کو دیکھتا رہتا۔ نقاب سے بھی ان کی آنکھوں کی مسکراہٹ اور زنی چھٹی نہ تھی۔

عمر حاقان اکثر غصے سے کہتا نظر آتا کہ اس کی چچی ایک بد صورت، سیاہ فام عورت ہے۔ مگر جہاں کو وہ عورت بہت خوب صورت لگتی تھی۔ مرہ جمیل۔ اس کی مرہ جمیل۔ اس نے بہت عرصے بعد بلا خرابیک دن وہ مرہ جمیل والا کارڈ ان کو دے ہی ڈالا۔ وہیں بس اسٹاپ پہ کھڑے کارڈ پلٹ کر دیکھتے وہ بے اختیار ہنس دی تھیں۔

پھر بہت عرصہ نہیں گزرا، جب اس نے سنا، نانا کی طبیعت خراب تھی۔ می کو اس خبر نے بے چین کر دیا تھا۔ وہ بار بار پاکستان فون کرتیں۔ اسے نہ بتاتیں، مگر وہ دروازے کی اوٹ میں کھڑا استہزار ہوتا۔

”پلیز بھائی! مجھے اس طرح منع مت کریں۔ میں اب اسے ملنا چاہتی ہوں۔ بس میں اور جہان آئیں گے، کسی کو پتا نہیں چلے گا، پلیز آپ مجھے آئے دیں۔“

وہ آنسو پونجی منٹ بھرے لہجے میں کہہ رہی ہوئیں۔ ایک شام اس نے ہفت بجتے گھر کے ابا کے گھرے کا ایکسٹینشن ریسیور بٹا دیا، جب اباسور ہے تھے اور می لوگ روم میں بیٹھی پاکستان بات کر رہی تھیں۔

”کوئی ضرورت نہیں ہے سین ابا بالکل ٹھیک ہیں۔ تم یہاں آنے کا مت سوچو۔“ دوسری طرف فرکان ماموں کہہ رہے تھے۔

”مگر میرا دل کہتا ہے کہ وہ ٹھیک نہیں ہیں۔ میں آنا چاہتا ہوں۔“

”ہرگز نہیں۔ تمہارے اس مفرد شوہر نے سارے زمانے میں ہمیں بدنام کر کے رکھ دیا ہے۔ ہم پہلے ہی لوگوں سے اس بات پر منہ چھپاتے پھرتے ہیں کہ ہمارا بہنوئی مفرد ہے اور سیاسی پناہ لے کر رہ رہا ہے۔ اب تم آؤ گی تو ساری دنیا کیا کہے گی؟“

”مجھے اب اسے زیادہ کسی کی پروا نہیں ہے اور سکندر میرے ساتھ تو نہیں آ رہے۔ میں بس ایک دن کے لیے آ جاتی ہوں، اگر رشتہ داروں سے سامنا ہو گیا، جب بھی وہ مجھے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اب اسے ملنے آنے پر کون مجھ پر اٹل اٹھا سکتا ہے بھائی؟“ می کو ماموں کی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

”میری بات سنو سین! ہم نے تمہارے شوہر کے اس کارنامے کے بعد لوگوں سے کہہ دیا ہے کہ سکندر ذلت و دشمنی کے باعث ساری زندگی پاکستان کا رخ نہیں کر سکتا۔ آخر کار نامہ بھی تو خاصا شرمناک انجام دیا ہے نا۔ ہم نے یہ بھی کہا ہے کہ ہم نے تم لوگوں سے قطع تعلق کر لیا ہے۔“

فون لائن پر چند لمحے تو ایک ششدر سی خاموشی چھا گئی، پھر می کی ذوقی آواز سنائی دی۔

”آپ ایسا کیسے کر سکتے ہیں بھائی؟ میں آپ کی بہن ہوں، آپ مجھے یوں ڈس اون نہیں کر سکتے۔ ہمارے..... ہمارے بچوں کا رشتہ ہوا ہے۔“

”سلیمان کی بیٹی ابھی بہت چھوٹی ہے۔ اس رشتے کی بات بعد میں دیکھی جائے گی۔ ویسے بھی یہ تم نے اپنی خود غرضی کے باعث کیا۔ تم جانتی تھی کہ سکندر نے کیا کیا ہے اور تمہیں ڈر تھا کہ ہم لوگ تمہیں چھوڑ نہ دیں، اس لیے تم نے یہ رشتہ کیا۔“

”ہاں! میں نے دکھائی خود غرضی۔ ہاں! میں نے چھپائی حقیقت۔ مگر میں نے یہ رشتہ جوڑنے کے لیے کیا۔ صرف اس لیے کہ میں آپ سے نہ کٹوں۔ اب آپ مجھے میرے باپ سے ملنے سے روک رہے ہیں۔ اس لیے کہ آپ لوگوں کے سامنے جھوٹے ثابت نہ ہو جائیں؟“

می دہلی دہلی چیختی تھیں۔

”اگر تم اس طرح آؤ گی تو نہ صرف ہم میں سے کوئی تمہیں لینے نہیں جائے گا، بلکہ ہم واقعتاً تمہارے ساتھ قطع تعلق کر لیں گے اور جب اباجان کو یہ معلوم ہوگا تو ان سے کیا گزرے گی، یہ سوچ لینا اور یہ بھی کہ اگر ان کو کچھ ہوا تو اس کی ذمہ دار صرف اور صرف تم ہوگی۔“

”بھائی!“ می کہتی رہ گئیں مگر دوسری طرف سے فون رکھ دیا گیا تھا۔ اس نے می کے ریسیور کھنکھانے کا انتظار کیا۔ پھر آہستہ سے فون رکھ کر باہر آیا۔ می صوفے پر بیٹھی، ہر ہاتھوں میں دیے، دہلی دہلی سکینوں سے رو رہی تھیں۔

اس نے نشو کے ڈبے سے دو ٹشو کا لے اور ان کے سامنے لا کر دیے۔ می نے پیکا پیکا چہرہ اٹھایا۔

”می! آپ ماموں کی بات نہ سنیں، ہم پاکستان ضرور جائیں گے۔ اگر وہ ہمیں لینے نہیں آئیں گے تو ہمارے پاس ان کا ایڈریس ہے، ہم کب کر کے ان کے گھر چلے جائیں گے۔“

وہ بس نم آنکھوں سے اسے دیکھتی رہیں۔ شاید انہیں معلوم تھا کہ وہ دوسرے فون پر سب سنتا رہا ہے۔

”ہم ان کے گھر جائیں گے، مگر ہم وہاں کچھ کھائیں گے نہیں۔“ اس نے جیسے انہیں یاد دلایا۔ وہ آنسوؤں کے درمیان ہلکا سا مسکرائیں اور اثبات میں سر ہلا دیا۔ تب اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ کیوں مسکرائی ہیں۔ بہت سال بعد اسے احساس ہوا کہ وہ شاید اپنے کم عمر بیٹے کی خود

داری اور عزت نفس کے پاس پھر سے مسکرائی تھیں۔

می نے ماموں کی ایک نہیں سنی۔ انہوں نے پیسے جوڑنے شروع کیے۔ وہ زہور جونہوں نے اپنی بیٹی کے لیے رکھا ہوا تھا، وہ بھی بیچ دیا۔ اب وہ صرف روگائی کے انتظامات میں لگی تھیں۔ ابا کی طبیعت بہت بگڑتی جا رہی تھی۔ می کو ان کے ساتھ کسی کے رہنے کا انتظام بھی کرنا تھا۔ ابھی روگائی میں دو دن تھے کہ ماموں کا فون آ گیا۔ نانا جان کا انتقال ہو گیا تھا۔

مئی کے لیے نانا کے انتقال کی خبر کا صدمہ اس صدمے سے کہیں چھوٹا تھا جو انہیں یہ جان کر لگا تھا کہ نانا کا انتقال اس روز نہیں، بلکہ ایک ہفتہ قبل ہوا تھا، مگر چونکہ مئی کے آنے سے ماموں کی عزت اور شان پہ انگلی اٹھائی جانے کا خدشہ تھا، اس لیے ان کو اطلاع ہی دیر سے دی گئی، تاکہ وہ ان کی وفات کی رسومات میں بھی شامل نہ ہو سکیں۔

وہ انٹرنیٹ کا دور نہیں تھا، خط اور فون کا زمانہ تھا، مگر مئی کا نمبر اور ایڈریس (بہت دفعہ گھر بدلنے اور دیگر رشتہ داروں سے رابطہ نہ رکھنے کے باعث) فقط ماموں کے پاس تھا۔ اس لیے کسی اور سے بھی اطلاع نہ پہنچ سکی۔

اس روز اس نے پہلی دفعہ اپنی بہت صبر والی مضبوط ماں کو، جن کی سسکیوں کی آواز سانس کی آواز سے اونچی نہیں ہوتی تھی، پھوٹ پھوٹ کر بچوں کی طرح روتے دیکھا۔ ان کو جیسے سب کچھ لٹ گیا تھا۔ ان کے پاس رونے کو بہت سے غم تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کس کس بات کا ماتم کریں۔ باپ کے مرنے کا، یا بھائیوں کے رو پے کا۔

دور و تنگ وہ ٹیک سے کچھ کھا بھی نہ سکیں۔ وہ بس خاموشی سے ان کے ساتھ بیٹھا رہتا تھا۔ تیسرے روز وہ علی کرامت کی مٹی کو بلا لایا۔ وہ آئیں اور مٹی کو تسلی دینے لگیں۔ مٹی ذرا سنبھل گئیں۔ انہوں نے کھانا بھی کھالیا۔ مگر ان کے جانے کے بعد وہ اس سے بولیں۔

”سنو جہان! میرا خیال تھا کہ تم راز رکھنا جانتے ہو۔ ہمارے مسئلے اور ہماری پریشانیوں بھی راز ہی ہوتی ہیں۔ ان کا دوسروں کے سامنے اشتہار نہیں لگاتے بیٹا! جو انسان اپنے آنسو دوسروں سے صاف کرواتا ہے، وہ خود کو بے عزت کر دیتا ہے اور جو اپنے آنسو خود کو پونچھتا ہے، وہ پہلے سے بھی زیادہ مضبوط بن جاتا ہے۔“

اس نے محنت سے سر ہلا دیا۔ یہ بات اس نے اپنے ذہن میں، دل میں اور ہاتھ کی لکیروں میں نقش کر لی کہ اسے اپنے مسئلے خود ہی، اکیلے اور تنہا حل کرنے ہیں۔ کبھی بھی لوگوں کو بتا کر نہ بھردی لینی ہے اور نہ ہی تحسین مانگنی ہے۔

مئی نے پاکستان جانے کا ارادہ بدل دیا۔ نانا جان رہے نہیں اور جن لوگوں کے دل میں ان کی اور ان کے شوہر کی عزت و حرمت نہ تھی، ان لوگوں کے درمیان جا کر وہ کیا کرتیں؟

دوبارہ وہ اس کے سامنے نہیں روئیں، مگر اب وہ بہت دھکی رہنے لگی تھیں۔

ابا کی طبیعت ان ڈراؤنے خوابوں سے بگڑنے لگی تھی، جو ان کو اب قریباً ہر رات ستاتے تھے۔ کچھ خواب تو اسے بھی آتے تھے، مگر اس کے خواب میں اس کو ملتا مست نہیں کیا جاتا تھا، بس وہ آواز..... وہ پاک اسپائی، وہ گھوڑا، وہ فوارہ..... وہ سارا منظر پھر سے تازہ ہو جاتا، ایسے جیسے غم تازہ ہوتے ہیں۔ معلوم نہیں ابا کیا دیکھتے تھے، مگر وہ اکثر راتوں کو جاگ کر چیخنا چلانا شروع کر دیتے تھے۔ کبھی کبھی وہ مٹی کے پیرے پہ کوئی نشان دیکھتا تو جان جاتا کہ ابا نے ہاتھ میں اٹھائی چیز ان کو دے ماری ہوگی، مگر مٹی کوئی شکایت نہیں کرتی تھیں۔ یہ وہ سکندر احمد شاہ نہیں تھے جنہوں نے اپنے ملک سے غداری کی تھی۔ یہ ایک جینی مریض قابل رحم آدمی تھے اور اب انہیں مٹی کی ضرورت تھی۔

پھر کچھ عرصہ وہ ہسپتال بھی داخل رہے، پھر جب واپس آئے تو ان کو مستقل رکھنا پڑا۔ یہ دوا انہیں ان کو سارا دن خاموش اور بے سکون رکھتیں، چاہے وہ جاگ رہے ہوتے یا سو رہے ہوتے۔ کچھ ہی عرصے بعد ابا ایک انسان سے ایک ایسے مریض بن گئے تھے جو کمرے تک محدود ہو گئے۔ ہاں، ہر پندرہ، بیس دن بعد ایک دورہ ان کو پڑتا اور وہ توڑ پھوڑ کرتے، چیختے چلاتے، مگر مٹی سنبھال لیتیں۔ اپنے مسئلے خود ہی حل کرتے کرتے، وہ پہلے سے بہت مضبوط ہو گئی تھیں۔



کرامت بے کی دکان چھوڑنے کے کچھ عرصہ بعد اس نے ایک چابی ساز کے پاس نوکری کر لی تھی۔ شام میں اب وہ اس کی دکان پہ جاتا جو ان کے گھر سے دس منٹ کے پیدل راستے پر تھی۔ اگر اسے کسی کام میں مزا آتا تھا تو وہ چابیاں بنانے میں تھا۔ کچھ عرصہ تو وہ صرف سیکتا رہا۔ یہاں تک کہ عام چابیوں کے بعد وہ چائیز، تالوں اور پیچیدہ اقسام کے سیف کی کنجی سازی سیکھنے لگا۔ اس کے پاس لائبریری سے لگی ان کتابوں کا ذخیرہ ہوا کرتا تھا، جن میں لاک توڑنے یا کنجی سازی کے متعلق کوئی بھی معلومات ہوتی۔ بہت مہارت سے بنا ضرب لگائے تالا توڑنا، چاہے وہ ماسٹر کی سے یا لوہے کی پن سے، وہ اس فن میں طاق ہوتا جاتا تھا۔

ان سب مشغلوں کا اثر اس کی پڑھائی پہ البتہ ضرور پڑا۔ وہ کبھی بھی بہت لائق قسم کا طالب علم نہیں بن سکا۔ اس کے گریڈز ہمیشہ میڈیم رہے۔ وہ ڈین تھا، مگر اس کو پڑھائی میں دلچسپی نہ تھی۔ دوسرے کام اسے زیادہ دلچسپ لگتے تھے۔

اس کی چودھویں سالگرہ گزرے زیادہ وقت نہیں بیٹھا تھا۔ جب فرقان ماموں نے اطلاع دی کہ وہ اور سلیمان ماموں ترکی آرہے ہیں۔ خون، پانی سے کاڑھا ہوتا ہے، اس نے یہ دیکھ لیا۔ مٹی پرانی تنغیاں بھلا کر ان کے آنے کی تیار یوں میں لگ گئیں۔ انہوں نے جیسے دل سے ماموں کو معاف کر دیا تھا۔ ان کے خیال میں ماموں ان کے اس سوال کے جواب میں یہاں آرہے تھے جو چند روز پہلے انہوں نے فون پر ان سے پوچھا تھا کہ اگر وہ اور جہان، سکندر شاہ کو لے کر پاکستان..... آئیں اور ان کا مقدمہ لڑیں تو کیا ماموں ان کو مورل سپورٹ دیں گے۔ مالی مدد کا ایک ٹکائی نہیں چاہیے تھا انہیں، بس ماموں کا ساتھ دے کر تھا۔ فرقان ماموں جواباً خاموش ہو گئے تھے، پھر انہوں نے بتایا کہ وہ اور سلیمان کچھ روز تک آئیں گے، تب اس بارے میں بات کریں گے۔

مٹی کی اور بات تھی، مگر اس کا دل اپنے ماموں سے اتنا بدظن ہو چکا تھا کہ اسے ان کے بارے میں کوئی خوش فہمی نہ رہی تھی۔ وہ خاموشی سے اپنا کام کرتے ہوئے مٹی کو مستعار ہوتا جواب اٹھتے بیٹھے کہا کرتیں۔

”ہم پاکستان ضرور واپس جائیں گے، اتنے برس ہو چکے ہیں، لوگ بھول بھال گئے ہوں گے۔ اب یہ جلا وطنی ختم ہونی چاہیے۔ بھائی ضرور میرا ساتھ دیں گے۔ میرے بھائی بہت.....“

اور مٹی دھونڈ دھونڈ کر ماموں کی خوبیاں گنوا تی رہتیں۔ اس نے بہت عرصہ بعد انہیں اس طرح خوش اور نہ امید دیکھا تھا۔ وہ انہیں کہہ نہیں سکا کہ اپنے مسائل کے حل کے لیے انہیں اب دوسروں کی طرف نہیں دیکھنا چاہیے۔ انہیں اپنی کئی بات یاد رکھنی چاہیے، مگر مٹی بھائیوں کے نرم رویے دیکھ کر انہیں دوسروں کی فہرست سے نکال کر انہوں میں لے آئی تھیں۔

اس میں بہت نہیں تھی کہ یہ سب گھر کر ماں کو مغموم کرے۔ ابا کا ہونا، نہ ہونا برابر تھا، مگر مٹی اس کے لیے سب کچھ تھیں۔ ان کی مشقت، محنت، قربانیاں اور ایک کمزور عورت سے ایک مضبوط عورت میں ارتقا کا عمل جو اس نے عمر کی منزلیں طے کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس نے بہت دعا کی کڑی نہ ہوں، مگر اسے لگتا تھا کہ مٹی غلط لوگوں سے امید لگا کر کبھی ضرور ہوں گی۔ لیکن جو ہوا، وہ اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔

دونوں ماموں ابھی گئے دوپہر کے کھانے کے بعد جب وہ برتن اٹھا کر انہیں کچن کے سنک میں دھونے کے لیے جمع کر رہا تھا تو مٹی اور ماموں کے درمیان ہونے والی گفتگو اسے صاف سنائی دے رہی تھی۔

”بالکل، میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ اب تم لوگ پاکستان آ جاؤ۔“ صوفے پر بہت کدھر سے بیٹھے رعب دار سے فرقان ماموں کہہ رہے تھے۔ ان کی بات پر کچن میں کھڑا جہان تو ایک طرف، مٹی بھی حیرت زدہ رہ گئیں۔ اتنی جلدی ماموں مان جائیں گے، ان دونوں نے نہیں سوچا تھا۔

”تم لوگ ہمارے ساتھ آ کر رہو۔ وہ سب تمہارا ہی ہے سین! پرانی باتیں بھول جاؤ، آگے کی سوچو۔ جہان کی پوری زندگی پڑی ہے۔ وہ بھی وہیں پڑھ لگا، پھر ہائی اسکول کے بعد ہم اسے باہر بھیج دیں گے، کسی بہت اچھی یونیورسٹی میں۔ آخر وہ ہمارا بیٹا ہے اور پھر ہمارا دادا بھی تو بنے گا۔“

فرقان ماموں نے کہتے ہوئے ایک نظر سلیمان ماموں پر ڈالی۔ انہوں نے تائیدی انداز میں سر کو اثبات میں جنٹش دی۔ وہ ایسے ہی تھے، بڑے بھائی کے ادب میں ان کی ہر بات کی تائید کرنے والے۔

”تم جہان کی زندگی کا سوچو سین! اس کو ایک بہترین مستقبل دو، ہم اس کے بڑے ہیں، ہم اس کو باپ بن کر پالیں گے۔“

باپ بن کر؟ وہ بالکل ٹھہر گیا۔ اس نے قل بند کر دیا۔ لاؤرنس میں خاموشی تھی، مگر ایک آواز اب بھی آ رہی تھی۔ جو بندل منہ سے قطرے ٹپکنے کی ہوتی ہے، جو اس کی ماں کی ساری امیدوں، خوابوں اور توقعات کے بے بنی تھی۔ اسے ماموں کی بات ٹھیک سے سمجھ میں نہیں آئی تھی، مگر کئی دن سے خود کو بھلانے والی اس کی ماں فوراً سمجھ گئی تھی۔

جب مٹی بولیں تو ان کی آواز میں بھائیوں کی محبت کو ترسی، رشتوں پر مان رکھنے والی عورت نہیں، بلکہ ایک خوددار عورت کی جھلک تھی، جس کے نزدیک اپنے گھر کی خودداری سب سے بڑھ کر تھی۔

”میرے بیٹے کا باپ ابھی زندہ ہے بھائی! اور اس کی ماں کے ہاتھ بھی سلامت ہیں۔ میں خود محنت کر کے اسے پاکستان بھی لے جا سکتی ہوں اور سکندر کا کیس بھی لڑ سکتی ہوں۔ مجھے سکندر کو مظلوم ثابت نہیں کرنا، بلکہ بیماری کے باعث سزا میں کمی کی اپیل کرنی ہے اور مجھے آپ سے مورل سپورٹ کے علاوہ کچھ نہیں درکار تھا۔“

”تم ایک انتہائی ضدی عورت ہو۔“ فرقان ماموں ایک دم بھڑک اٹھے تھے۔ ”جس معرور اور بدو باغ آدمی نے ہمیں کہیں کا نہیں

چھوڑا، تم اس کے پیچھے اپنی زندگی برباد کر رہی ہو؟ تم اس کو چھوڑ کیوں نہیں دیتیں؟“

”وہ آدمی میرا شوہر ہے اور بیمار ہے۔ وہ مجھ پہ انحصار کرتا ہے اور آپ کہتے ہیں، میں اسے چھوڑ دوں؟“

”اور جو اس نے کیا، وہ؟“

”اس کا فیصلہ کرنے والے آپ یا میں نہیں، عدالت ہے اور اب تو وہ بیمار ہیں۔ ان کو میں کس طرح اکیلا چھوڑ سکتی ہوں؟ نفرت سناہ سے کی جاتی ہے، سناہ گار سے تو نہیں۔“

”یعنی کہ تم اس کو جرم سے بری الذمہ قرار دے رہی ہو؟“ ماموں کی آواز بلند ہو رہی تھی۔

”میں یہ نہیں کہہ رہی، لیکن آپ یہ کیوں نہیں دیکھتے کہ ہم نے جلا وطنی کاٹی ہے اور کئی برس کاٹی ہے۔ اب وہ بیمار ہیں۔ سکندر وہ انسان نہیں رہے جنہوں نے جرم کیا تھا، وہ صرف ایک مریض رہ گئے ہیں۔ آپ مجھ سے یہ کہہ بھی کیسے کہتے ہیں کہ میں انہیں چھوڑ دوں؟“ ممی کی آنکھیں حیرت اور دکھ سے بھر گئیں۔

”اگر تم یوں اس کا ساتھ دو گی تو تم ہر رشتہ کھودو گی۔ سب تم سے دور ہو جائیں گے سین! تم غلط کر رہی ہو۔“ سلیمان ماموں نے دھیمے مگر افسردہ انداز میں کہا۔

”اگر میری فیملی کو کاٹ کر سب مجھ سے خوش رہتے ہیں تو مجھے یہ خوشی نہیں چاہیے، نہ ہی ایسے رشتے۔“ انہوں نے اپنی آنکھ سے ایک آنسو نہیں پھینکے دیا۔ رندمی ہوئی آواز میں وہ سر اٹھا کر مضبوطی سے بولی تھیں۔

”تم ہماری بات مان لیتیں۔ سکندر سے طلاق لے کر ہمارے ساتھ چلیں تو ہم تمہارے بیٹے کو بھی پڑھاتے اور اسے سر اٹھا کر جینے کے قابل بناتے لیکن اگر تم ہماری بات یوں رد کر دو گی تو ہم بھی کبھی تمہارا ساتھ نہیں دے پائیں گے۔“ فرقان ماموں کا انداز دونوں اور مزید سخت ہو گیا تھا۔ وہ ترکی فتح حاصل کرنے آئے تھے تاکہ جب بہن کو اپنے ساتھ واپس لے کر جائیں تو سر اٹھا کر لوگوں سے کہہ سکیں کہ انہوں نے ایک قابل نفرت آدمی کو اپنے خاندان سے نکال پھینکا اور پھر بہن، بھانجے کے سر پہ ہاتھ رکھنے پائیں تحسین و تحنفے بھی مل جائیں مگر ممی کو اپنے اور اپنے بیٹے کے لیے یہ مظلوم و ترم آمیز کردار منظور نہ تھا۔ وہ سر اٹھا کر جینا چاہتی تھیں۔

”پہلے بھی آپ نے کب میرا ساتھ دیا جو اگر اب نہیں دیں گے تو کوئی فرق پڑے گا۔“

”تم رشتوں کو کھو کر بچھتاؤ گی۔“

”میں رشتوں کو جان کر بھی بچھتا رہی ہوں بھائی! کہتے ہی سیاست دان ہیں جو ملک سے غداری کر کے باہر چلے جاتے ہیں، مگر ان کی واپسی پہ آپ ہی ان کو دوث دیتے ہیں۔ کیونکہ وہ امیر لوگ ہوتے ہیں، ہم آپ کی نظروں میں معیوب اس لیے ہیں کیونکہ ہم غریب ہیں۔ ہمارے پاس ترکی میں لمبی چوڑی جائیداد نہیں ہے۔ کوئی بہت اونچا سوشل اسٹینڈس نہیں ہے اگر ہوتا تو آپ کبھی ہم سے یوں قطع تعلق نہ کرتے۔“

”تمہیں کیا لگتا ہے، تم یہاں رہو گی تو کیا عزت سے رہو گی؟ نہیں۔ تم ہمیشہ معیوب ہی رہو گی۔ ایک مفرد قومی مجرم کی بیوی بن کر ذلیل ہو گی ہمیشہ۔“

فرقان ماموں غصے سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ سلیمان ماموں بھی ساتھ ہی اٹھے۔ ان کے چہرے سے عیاں تھا کہ وہ بڑے ماموں سے متفق ہیں۔ البتہ ان کو اس طریقہ کار سے اختلاف تھا لیکن وہ کچھ بھی کرنے سے قاصر تھے۔

”اور تم.....“ بڑے ماموں کی نظر بچن کے دروازے میں کھڑے اس دبیلے پتلے لڑکے پہ پڑی تو انہوں نے اس کی طرف انگلی اٹھائی۔

”تمہیں کیا لگتا ہے، تم یہاں عزت سے جی سکو گے؟ کبھی نہیں۔ تم ذلیل ہو گے۔ تم خوار ہو گے، کیونکہ تمہارا باپ تمہارے نام پہ ایک شرم ناک دھبہ ہے۔ تم بھی سر اٹھا کر نہیں جی سکو گے۔ تمہارے باپ کا نام تمہارا سر ہمیشہ شرم سے جھکا رہا ہے گا۔ تم کتوں کی سی زندگی گزارو گے۔ کبھی عزت اور وقار سے اپنے ملک کا رخ نہیں کر سکو گے۔“

وہ غصے میں بولنے کا پنے لگے تھے اور کانپ تو اس کا دل بھی رہا تھا۔ وہ بہت ہراساں سا دروازے کو مضبوطی سے پکڑے کھڑا تھا۔

”بس کریں بھائی! میرے بیٹے کو یوں نارچ مت کریں!“ اس نے اپنی ماں کو اپنے سامنے آ کر کھڑے ہوتے دیکھا۔ اس کا قد اپنی ماں سے ذرا سا اونچا تھا، پھر ممی وہ اس کے سامنے ایک ڈھال تھیں۔

”کیوں؟ اسے بھی تو پتا چلنا چاہیے کہ اس کی ماں نے اس کے لیے کتنا غلط فیصلہ کیا ہے۔ میں نے تمہیں ایک آپشن دیا تھا، جو تمہارے

بیٹے کے لیے اپنے ملک عزت سے لوٹنے کا واحد راستہ تھا، مگر تم نے وہ ٹھکرادیا۔ تم نے اپنی ضد کی وجہ سے اس کی زندگی بھی جہنم بنا دی ہے۔
 ”میں اس کی زندگی جہنم نہیں بننے دوں گی۔ سنا آپ نے؟ یہ سرائٹا کر بیٹے گا۔ یہ بھرا احمد کا پوتا ہے۔ یہ ان ہی کی طرح فوج میں جائے گا۔ مجھے آپ کی کسی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود بھیجوں گی اپنے بیٹے کو فوج میں اور آپ، لکھیے گا، میرا بیٹا ایک دن سرائٹا کر ضرور بیٹے گا۔“ اس نے اپنی نرم خویاں کو اپنے سامنے دو حائل بن کر کہتے سنا۔

”فوج؟ مائی فٹ!“ فرقان ماموں نے میز پر کھانا پنا سگریٹ لائٹر اٹھاتے ہوئے استہزاء پر سر جھٹکا۔ ”تم بھول رہی ہو سبین! تمہارا بیٹا“
 ”غدار کا بیٹا“ ہے اور غدار کے بیٹے کو فوج میں کبھی نوکری نہیں ملتی۔ ارے! وہ تو اسے چھاؤنی کے قریب بھی نہیں پھینکے دیں گے۔ اس لیے ایسی کوشش بھی مت کرنا اور اگر کرنے کے بعد بے عزت کر کے نکالے جاؤ تو مدد کے لیے میرا دروازہ نہ کھٹکھٹانا۔“

ہاتھ کرتے ہوئے انہوں نے اپنی شعلہ بار نکالوں کا رخ جہان کی طرف کیا جو بالکل دم سا دمے اُنہیں دیکھ رہا تھا۔ میرا اسی طرح اُلفت شہادت اٹھائے انہوں نے اسے ان آخری الفاظ سے شذیبہ کیا جو ایک عمر اس کے ذہن میں گونجتے رہے تھے۔
 ”تم لوگوں نے ہمارا ساتھ نہیں دیا۔ اب جب تمہیں دو چاہیے ہو تو ہمارے پاس مت آنا۔ ہمارا درمت کھٹکھٹانا، لیکن مجھے یقین ہے کہ تم بہت جلد پچھتاؤں کا شکار ہو کر ہمارے دروازے پر ضرور آؤ گے۔“ اتنا کہہ کر وہ باہر نکل گئے۔ ملال زدہ سے سلیمان ماموں بھی ان کے پیچھے ہو لیے۔

میری ہاتھوں میں لیے صوفے پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گئیں اور وہ اسی طرح بت بنا چکن کی چوکھٹ پہ کھڑا رہا۔ فرقان ماموں کے الفاظ نے اس کا اندر باہر توڑ کر رکھ دیا تھا۔ اتنی ذلت، اتنی بے عزتی، کتوں کی سی زندگی گزارنے کی بددعا..... ماموں نے اپنی زخمی اتنا کی تسکین کے لیے کیا کچھ نہیں کہہ دیا تھا۔ تب اسے لگتا تھا کہ وہ کبھی سرائٹا کر نہیں جی پائے گا۔ وہ فوجی چھاؤنی کے قریب بھی نہیں پھٹک سکتا، پاک اسپانی مینا تو پھر دور کی بات تھی۔ یہ احساس ہی اس کے سارے خوابوں کو ڈوب گیا۔ کئی دن تک تو وہ اور می نازل ہی نہیں ہو سکے۔ دونوں چپ چپ سے رہتے تھے، ایک دوسرے سے نگاہیں چرائے، اپنے کام پھناتے رہتے، آدہ بہت تکلیف دہ دن تھے۔

مگر می روئیں نہیں۔ انہوں نے اپنا کام بڑھا لیا۔ اس نے بھی اپنے کام کا دائرہ کار بڑھا دیا۔ ابا کی بیماری بھی بڑھتی گئی۔ کبھی کبھی تو وہ بہت ہی قابو سے باہر ہو جاتے۔ چیخنے چلاتے، ہاتھ میں آئی چیز دے مارتے، ان بلیو پرس کا ذکر کرتے جو انہوں نے آگے بھیجے تھے۔ اس پاک اسپانی کا ذکر کرتے، جس کو انہوں نے نقل کیا تھا، مگر اب می اور وہ انہیں سنبھال لیا کرتے۔ بس خود کو سنبھالنے میں انہیں بہت عرصہ لگا تھا۔ کہنے والے تو کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں، مگر سننے والوں کے لیے وہ باتیں ساری زندگی کے لیے ایک جہنم بن جاتی ہیں۔

وقت پھر بھی گزرتا گیا۔ باسٹوس کے بل تلے پانی بہتا گیا۔ سمندری ہنگے استنبول کے اوپر پرواز کرتے رہے۔

وہ ہائی اسکول کے آخری سال میں تھا، جب بیون نے آ کر اسے اطلاع دی کہ ہاؤس ماسٹر کے آفس میں کوئی ملاقاتی اس کا منتظر ہے۔ وہ الجھتا ہوا کلاس سے نکلا اور ہاؤس ماسٹر کے آفس کے دروازے تک آیا۔

اندر جیسے کوئی طوفان بدلتیری مچا ہوا تھا۔



ہاؤس ماسٹر کے آفس کے اندر جیسے کوئی طوفان بدلتیری مچا ہوا تھا۔

کھلی درازیں، بکھرے کاغذ، ہر چیز الٹ پلٹ پڑی تھی۔ ہاؤس ماسٹر احمیت طور پر بیٹانی کے عالم میں ایک دراز کھنگال رہے تھے۔ ان کا اسٹنٹ دوسری دراز کی چیزیں نکال نکال کر باہر رکھ رہا تھا۔ ذرا دور رکھی..... کرسی پر ایک صاحب خاموشی سے بیٹھے تھے۔

”آخر چابی گئی کدھر؟“ احمیت بے جھنجھلا کر کہہ رہے تھے۔ جہان کی نظریں دیوار کے ساتھ لگے لاکر پہ پھسل گئیں، جو مقفل تھا۔ یقیناً

اس کی چابی نہیں مل رہی تھی۔

”بولو! بتاؤ، اب میں ہیڈ ماسٹر کو کیا کہوں کہ میرے اسٹنٹ کی لا پرواہی کی وجہ سے لا کر نہیں کھل رہا اور فائل نہیں نکالی جاسکتی؟“ اپنی

جھنجھلاہٹ اور پریشانی میں انہوں نے دروازے میں کھڑے لڑکے کو نہیں دیکھا تھا۔

”سرا! میں نے یہیں رکھی تھی، میں ڈھونڈ رہا ہوں۔ ابھی.....“ اسٹنٹ کی بات کو فون کی گھنٹی نے کاٹا۔ اس نے جلدی سے

ریسیور اٹھایا۔

جنت کے پہنچے، جی، سراسر! بس امت ہے آپ کے پاس فائل لارہے ہیں۔ جی، بس ایک منٹ!“ بمشکل اپنی گھبراہٹ پہ قابو پاتے اس نے فون پہ کہا اور پھر ہاؤس ماسٹر کو دیکھا، جن کے سرخ پڑتے چہرے کے تاثرات ناقابل بیان ہو رہے تھے۔

”نمر!“ اس نے فلی کی پشت سے دروازہ بجایا۔

انہوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ جیسے انہیں بھول گیا تھا کہ اسے وہاں کیوں بلایا گیا تھا۔ کرسی پہ بیٹھے صاحب نے بھی گردن پھیر کر اسے دیکھا تھا۔

”میں مدد کروں؟“

”کیا؟“ ان کے چہرے پہ الجھن درآئی۔

وہ خاموشی سے آگے آیا اور لا کر کے کی ہول کو فلی سے چھو کر جیسے کچھ محسوس کیا۔ کمرے میں ایک دم خاموشی چھا گئی۔ ساری کھڑکھڑ، متحرک ہاتھ، سب گھبر گیا۔

اس نے پینٹ کی جیب سے تین پنیں نکالیں، پھر ان میں سے ایک الگ کی اور باقی والی جیب میں ڈال دیں۔ آگے ہو کر اس نے وہ پن ترجمی کر کے کی ہول میں ڈالی، پھر گردن اٹھا کر وال کلاک کو دیکھا۔

وہ تینوں نفوس جیسے دم سادھے اس کو دیکھ رہے تھے۔ وہ محلاب دانت سے دبائے، اپنے ہاتھ کو مخصوص ستون میں اوپر نیچے کر رہا تھا، جیسے موسیقی کا کوئی ردھم ہو۔ چند لمحوں کے اور کلک کی آواز کے ساتھ لاک کھل گیا۔ اس نے پھر گردن موڑ کر وال کلاک کو دیکھا۔ ایک منٹ اور گیارہ سیکنڈ گئے تھے۔ اسے یابوی ہوئی۔ شاپ پہ اس طرز کا سیف کھولنے میں اسے کم سے کم پچاس سے پچپن سیکنڈ لگتے تھے۔

اس نے ہینڈل کھمایا۔ سیف کا دروازہ کھولا اور بہت ادب سے پیچھے ہٹ کر کھڑا ہوا۔

”تم نے..... تم نے یہ کیسے کیا؟“ ہاؤس ماسٹر ششدر تھے۔

”سرا! اگر آپ میری کہانی سننے میں وقت ضائع کریں گے تو فائل ہیڈ ماسٹر کے پاس کب پہنچے گی؟“ کسی اچھے چابی سازی کی طرح اس نے اپنا راز نہیں کھولا۔

”اوہ ہاں!“ وہ پیشانی کو ہاتھ سے چھوئے اٹھے۔ ”تمہارا شکر یہ یک مین!“

ان کے جانے کے بعد وہ ان صاحب کی جانب متوجہ ہوا جو کرسی پہ بیٹھے بہت دلچسپی سے اسے دیکھ رہے تھے۔

”میں جہان سکندر ہوں۔ آپ مجھ سے ملنے آئے ہیں؟“ انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

”اسکول ریکارڈز میں تمہارا نام جہان سکندر احمد لکھا تھا، حالانکہ سکندر کا سرنیم ”شاہ“ ہے۔“

”احمد میرے دادا کا نام تھا، میں ان کا نام ساتھ لگاتا ہوں، مگر آپ میرے ابا کو کیسے جانتے ہیں؟“

بات کرتے ہوئے اس کے اندر کچھ قہقہے پھیل سی ہوئی تھی۔ فرقان ماموں سے آخری ملاقات پھر سے تازہ ہو گئی۔ ان لوگوں کا سامنا کرنا جو اس سے اس کے باپ کے حوالے سے واقف ہوں، بہت اذیت ناک تھا۔

”ہم باہر چل کر بات کر سکتے ہیں؟“ وہ کرسی چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے تو وہ پلیٹ گیا۔

”میں تمہارے ابا کا ایک زمانے میں بہت اچھا دوست رہا ہوں۔ کرنل رؤف گیلانی، شاید تم نے میرا نام سنا ہو؟“ باہر اسکول کے فٹ بال کے میدان کے کنارے پہ اس کے ساتھ چلتے ہوئے انہوں نے بتایا۔ اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے غور سے ان کو دیکھا۔

وہ سفید اور کوٹ میں ملبوس اچھے قد کا ٹھکے مندب سے انسان لگتے تھے۔ مگر ان کے چہرے پہ ایک نقاہت تھی اور ان کی آواز سے کمزوری جھلکتی تھی۔ اگر وہ ابا کے دوست تھے تو ان کو اتنا معر نہیں لگنا چاہیے تھا، جتنے وہ لگ رہے تھے۔ شاید بیمار تھے۔ اسے بے اختیار داد کا چہرہ یاد آیا جو ان کی زندگی کی آخری رات اس نے دیکھا تھا۔ تھکا زدہ، بیمار چہرہ۔

”تمہارے ابا قصور وار تھے مگر انہوں نے بہت کچھ میرے اوپر ڈال دیا اور ملک سے فرار ہو گئے۔ میں نے بے قصور ہوتے ہوئے بھی کئی سال نار چرپیل میں سزا کاٹی۔ تین برس ہوئے میں باعزت بری کر دیا گیا ہوں۔ سارے چار جزی ہٹ گئے ہیں۔ میرے بچے پھر سے سر اٹھانے کے قابل ہو گئے ہیں اور اب جب کہ میں علاج کے لیے لندن جا رہا تھا تو سوچا ایک دن کے لیے ترکی آ جاؤں۔ اس لیے نہیں کہ میں سکندر کی بربادی کا تمہا شادیکموں، بلکہ اس لیے کہ میں تمہیں دیکھ سکوں۔“

وہ خاموشی سے سنتا رہا۔ جس شخص نے ان کی زندگی کے کئی برس برباد کر دیے۔ اس کے بیٹے کو وہ کیوں دیکھنا چاہتے تھے، وہ سمجھنے سے قاصر تھا۔

”میرا بیٹا عمار بھی تمہاری عمر کا ہے۔ اس نے بھی بہت رُاوَت گزارا ہے۔ میری بیوی نے بھی سزا کاٹی ہے۔ وہ بھی اٹنے بے قصور تھے جتنے تم اور تمہاری والدہ۔“

”ہم سکندر شاہ کے گھروالے ہیں اور ہم یہ سب ڈیزر کرتے ہیں۔ مجھے آپ کی ہمدردی نہیں چاہیے سزا“ اس کی آواز میں تعجب کی کھل گئی تھی۔

”نہیں، تم یہ ڈیزر نہیں کرتے تھے۔ جلا وطنی کی سزا سب سے اذیت ناک سزا ہوتی ہے۔ تم لوگوں نے بہت عرصہ یہ سزا کاٹی ہے۔ کیا اب وہ وقت نہیں آ گیا کہ تم سزا اٹھا کر جیو، جیسے اب عمار جیسے گا؟“

”اس کے فادر بے قصور تھے، میرے قصور وار ہیں۔ میں کبھی سزا اٹھا کر نہیں جی سکتا، میں جانتا ہوں۔“ وہ دونوں ایک درخت تلے نصب بنچ پہ بیٹھ گئے تھے۔ سامنے سرسبز سامیان تھا، جس پہ سورج کی کرنیں ترچھی ہو کر پڑ رہی تھیں۔ استنبول میں سرما کا سورج ایسا ہی ٹھنڈا ہوتا تھا۔

”مجھے تم سے ہمدردی نہیں ہے۔ مجھے صرف تمہارا خیال ہے۔ میں نے اپنے گھروالوں کی اذیت دیکھی ہے بنچ! اور میں آج تمہاری ماں سے جب ملا تو میں نے انہیں بھی اسی اذیت میں دیکھا۔ وہ سکندر کو نہیں چھوڑ سکتیں، مگر تم تو اپنے ملک واپس جاسکتے ہو۔“

”میں نے اس بارے میں سوچنا چھوڑ دیا ہے۔ میں جانتا ہوں، میں کبھی فوج میں نہیں جاسکتا۔ مجھے وہ کبھی چھاؤنی کے قریب بھی نہیں چھلکنے دیں گے۔ میں پھر سے ذلیل ہونے وہاں نہیں جانا چاہتا۔“

وہ بہت تکلیف سے بول رہا تھا۔ فرقان ماموں کی باتیں کسی انی کی مانند ابھی تک دل میں گڑی تھیں۔

”یہ تمہیں کس نے کہا کہ تمہیں فوج میں کمیشن نہیں مل سکتا؟“ وہ حیران ہوئے۔

”کیونکہ میں ایک غدار کا بیٹا ہوں اور غدار کے بیٹے کو فوج میں بھرتی نہیں کیا جاتا۔“

”مجھے افسوس ہے کہ تمہیں کسی نے غلط گائیڈ کیا ہے۔ ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ میں تمہیں نامور ملکی غداروں کے نام گنوا سکتا ہوں۔ جن کے خاندان کے کتنے ہی لڑکے فوج میں کام کر رہے ہیں۔ اگر تم قابل ہو اور تم ایک دفعہ پھر سزا اٹھا کر جینے کا حوصلہ رکھتے ہو تو تمہیں چاہیے کہ تم اپنے ملک واپس آ جاؤ۔“

وہ کتنی ہی دیر بیٹھے اسے سمجھاتے رہے کہ اسے ایک دفعہ کوشش کرنا چاہیے اور پھر ملک کے لیے قابل قدر خدمت سرانجام دے کر وہ اپنے خاندان کے نام پہ لگا دھبہ مٹا سکتا ہے۔ اچھائی برائی کو ڈھانپ دیتی ہے۔ ان کا اپنا بیٹا بھی اگلے سال آرمی میں کمیشن کے لیے درخواست دینے جا رہا تھا، وہ بھی ہائی اسکول ختم کر کے ان کے پاس آ جائے اور ساتھ ہی امتحان دے۔

وہ خاموشی سے سنتا رہا۔ اگر اسے کوئی شک و شبہ تھا کہ وہ دھوکے سے اس کے باپ کو ملک واپس لے جانے اور سزا دلوانے کے لیے یہ سب کر رہے تھے تو وہ زائل ہو گیا۔ پھر بھی اس نے ان کو کوئی خاص جواب نہیں دیا۔ وہ اس نچ سپوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ فرقان ماموں کی خواہش کے مطابق وہ کنوں کی طرح ذلیل ہو کر زندگی گزار تو رہے تھے، باعزت جیسے کا حق ان کو نہیں تھا۔

سہ پہر میں جب وہ گھر لوٹا تو مومی نے کرٹل گیلیانی کی آمد کا بتایا اور یہ بھی کہ وہ ان سے اسکول کا پتا پوچھ کر گئے تھے۔ ان کی فلائٹ شام میں تھی اور وہ آج ہی اس سے ملنا چاہتے تھے۔ پھر اس نے بھی سب کچھ بتا دیا۔

”مگر میں ادھر نہیں جاؤں گا۔ مجھے فرقان ماموں کے گھر نہیں جانا۔ میں ان لوگوں سے پھر کبھی نہیں ملنا چاہوں گا۔“ اس نے اپنے تئیں بات ختم کر دی تو مومی خاموش ہو گئیں۔

لیکن سوچیں خاموش نہیں ہوئیں۔ خواب خاموش نہیں ہوئے۔ وہ خواب کسی بوجھ کی طرح دل کو گھیرے رہا۔ کچھ دن بعد نیند میں وہ خود کو وہیں پاتا۔ اٹلا کہہ میں وہ بڑا اسادالان، فوارہ اور ساتھ کھڑا گھوڑا اور جب وہ پلٹنے لگتا تو اسے پکارا جاتا۔ شعور کی منبر لیں طے کرتے کرتے وہ خواب جو آواز میں ”خوف“ تھا، اب ”دکھ“ بنتا گیا۔ جانے وہ کون تھا، اس نے اپنے ہاتھوں سے اس وجہہ آدی کو دفنایا تھا، مگر وہ کبھی اس کے خاندان کو نہیں تلاش کر سکے گا۔ اس کی بیوی، بچے، برسوں اس کی راہ نکلیں گے۔ حکومت، فوج، انجینی، کسی کو علم نہیں ہو سکے گا کہ وہ کہاں دفن تھا۔ جاسوس کی زندگی، جاسوس کی موت، یہی تھی جاسوس کی قسمت۔

پھر کیوں جوانوں میں یہ ہمت ہوتی تھی کہ وہ اپنی گردنیں اللہ کے پاس رہن رکھو ادیں؟ وہ کہاں سے یہ جذبہ اپنے اندر لاتے تھے کہ بنا

وردی، بناتھو اور بناتھس کے خود کو کسی عظیم مقصد کے لیے صرف کر دیں؟ چپ چاپ اپنا فرض نبھائیں اور چپ چاپ مرجائیں؟ بلاشبہ وہ عظیم لوگ تھے اور وہ ان میں سے کبھی نہیں ہو سکتا تھا۔ بعض دفعہ انسان اپنے خواب کسی شے میں ڈال کر ان کو سیل بند کر دیتا ہے۔ موم کی ایسی سیل جو کوئی کھول نہ سکے۔ اس نے بھی اپنے خواب مہر بند کر دیے تھے۔

یہ چند ماہ بعد کی بات تھی۔ ابھی اس کا ہائی اسکول ختم نہیں ہوا تھا کہ ایک ٹرپ اٹھا کیہ کے لیے پلان ہونے لگا۔ تاریخی اور قدیم شہر اٹھا کیہ جانے کے لیے تمام طلبہ و طالبات بہت پُر جوش تھے۔ وہ بھی تھا مگر اس کی وجہ کچھ اور تھی۔ اس کو اپنے خوابوں سے پیچھا چھڑانے کا راستہ نظر آ گیا تھا۔ می اس نے بہت اصرار سے اس فارم ہاؤس کا پتا پوچھ لیا جس کے والان میں فوارے کے ساتھ کچھ ”آمار“ ثبت تھے۔ وہ ان آمار کو کھوجنا چاہتا تھا۔ اس نے می کو کچھ نہیں بتایا۔ نہ ہی ابا کا راز اور نہ ہی اپنا راز وہ جو کہ اس فارم ہاؤس کے مالک کو یہ کہانی سنانے کا تھا کہ وہ اس جگہ کو اکثر خواب میں دیکھتا ہے، شاید یہاں کوئی دفن ہے۔ وہ اسے راضی کر لے گا، وہ اس جگہ کی کھدائی کرے، پھر جب وہ لوگ اس پاک اسپانی کی نفس ڈھونڈ لیں گے تو وہ پاکستانی سفارت خانے اطلاع کر دے گا۔ شاید اس کی نفس واپس پاکستان بھجوانے کی کوئی سبیل نکل آئے۔

اس وجہ بہ صورت پاکستانی اسپانی کو اس کے خاندان کو واپس لوٹانے کا اس سے بہتر لائحہ عمل اسے نہیں معلوم تھا۔ بلا خروہ اس قرض کو اتار دے گا جو دادائے کہا تھا کہ اس کے کندھوں پہ آگرا ہے۔ بلا خروہ ابا کے راز کے بوجھ سے نجات حاصل کر لے گا۔ اسے یقین تھا کہ وہ نفس آج بھی ویسی ہی گرم اور نرم ہوگی۔ اس کا خون اب بھی بہہ رہا ہوگا اور اس کی گردن پر اب بھی پسینے کے قطرے ہوں گے۔ شہید مرتے تھوڑی ہی ہیں۔ وہ تو ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔

بہت دقتوں سے وقت نکال کر، ڈھونڈ ڈھانڈ کر اس فارم ہاؤس پہنچا۔ اندر کا راستہ اسے ابھی تک یاد تھا۔ بس اس گیٹ کو عبور کر کے ذرا آگے جا کر دائیں طرف مڑ جائے گا تو وہاں سے فوارے والا والان صاف نظر آئے گا۔ گیٹ سے وہ جگہ نظر نہیں آتی تھی۔ ملازم نے اسے اندر آنے دیا اور فارم کے مالک کو بلانے چلا گیا۔ جہاں ادھر نہیں رکا، وہ تیز قدموں اور دھڑکنے دل کے ساتھ بھاگتا ہوا آگے آیا اور عمارت کے دائیں جانب سے آ مراتا کہ والان..... مگر.....

وہ والان کے سین سرے پہ ٹھک کر رک گیا۔ پھر بے یقینی سے پلکیں جھپکیں۔ چند لمحوں کے لیے ہر طرف سناٹا چھا گیا تھا۔ اس نے ہر چیز سوچی تھی، سوائے اس کے کہ آٹھ برس بیت چکے تھے۔ سامنے، جہاں پہلے مٹی کی کاوسج احاطہ اور درمیان میں فوارہ تھا، اب وہاں ایک گہرا اور خوب لمبا چوڑا سالا ب تھا۔

وہ بے دم سا گھنٹوں کے بل زمین پہ آگرا۔ سالا ب؟ اتنا بڑا سالا ب؟ اس کو تعیر کرنے کے لیے تو کئی فنٹ نیچے تک زمین کھودنی پڑی ہو گی، تو کھدائی کے دوران اس نفس کا کیا بنا ہوگا؟

”آپ کو یقیناً خواب میں ایسا کچھ نظر آتا ہوگا، مگر یقین کریں! چار سال پہلے اس پوری جگہ کی کھدائی میرے سامنے ہوئی تھی۔ میں ایک دن بھی مزدوروں کے سر سے نہیں ہٹا اور ہم نے بہت نیچے تک زمین کھودی تھی۔ یہاں سے کچھ نہیں ملا تھا۔ انسانی لاش تو دور کی بات، کپڑے کا ٹکڑا بھی نہیں ملا“

جب فارم کا مالک آیا تو اس کی کہانی سن کر بہت دھوکے سے بتانے لگا۔ اس کے لہجہ اور آنکھوں سے سچائی جھلک رہی تھی۔ ”ہاں! صرف ایک بات تھی۔“ وہ کہتے کہتے ذرا رکا، اور پھر جیسے یاد کر کے بولا۔ ”اس جگہ کی مٹی بہت اچھی تھی۔ اس سے عجیب سی خوشبو آتی تھی۔ ایسی خوشبو جو ہم نے کبھی نہیں سونگھی تھی۔ اس کی وجہ میں شاید کبھی معلوم نہ کر سکیں۔“

بہت سے آنسو اس نے اپنے اندر اتارے تھے۔ وہ خوشبو کی وجہ جانتا تھا، مگر وہ نہیں جانتا تھا کہ پاک اسپانی کی نفس کہاں گئی مگر یہ تو طے تھا کہ اس زندگی میں وہ کبھی نہیں جان پائے گا اور طے یہ بھی تھا کہ اس نے اس پاک اسپانی کو ہمیشہ کے لیے کھودیا ہے۔

اس واقعے نے اسے ایک بات سمجھا دی تھی۔ وہ جو سمجھتا تھا کہ جا۔ وں لاوارث خاموشی سے مر جاتا ہے تو وہ غلط تھا۔ اللہ بہت غیرت والا ہے۔ کسی کا احسان نہیں رکھتا۔ جو آدمی اس کے لیے جان دے دے، وہ اسے لاوارث چھوڑ دے گا؟ اس کو اپنی زمین میں باعزت جگہ بھی نہیں دے گا؟ یہ نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ نہیں ہوتا تھا۔

اس روز اسے شدت سے فرقان ماموں کی باتیں یاد آئیں مگر آج ان باتوں کی تکلیف پہلے سے کہیں زیادہ محسوس ہوئی تھی۔ وہ کہتے تھے۔ ”تم ذلیل ہو گے، تم خوار ہو گے، تم کبھی سر اٹھا کر نہیں جی سکو گے۔ تم کتوں کی سی ذلیل زندگی گزارو گے۔“

مگر اب بلا خراس کے خوابوں پہ لگی منہم کی مہر پکھل گئی تھی۔ سارے خواب پھر سے لفافے سے باہر آ گئے تھے۔ نہیں، وہ ان کی باتوں کو درست ثابت نہیں ہونے دے گا۔

وہ واپس جائے گا اور وہ بہت محنت کرے گا۔ وہ اپنے ملک سے وفاداری کا عہد نبھائے گا۔ یوں مفرور مجرموں کی طرح ایک دوسرے ملک میں ساری زندگی چھپ کر نہیں گزار دے گا۔ اس نے کوئی جرم نہیں کیا تھا۔ وہ سر اٹھا کر کیوں نہیں جی سکتا؟ نہیں۔ وہ کتوں کی سی ذلیل و رسوا کن زندگی نہیں جیے گا۔ وہ حشر کے بڑے دن اپنے دادا کو کیا چہرہ دکھائے گا۔ اسے سرخرو ہونے کے لیے وہی نوکری کرنی تھی جو اس کے باپ نے کی مگر اسے اپنے خاندان اور دادا کے نام پر سے ذلت کا دھبہ اتارنے کے لیے وہ نہیں کرنا تھا، جو اس کے باپ نے کیا۔ اس کو یہ ثابت کرنا تھا کہ اچھائی، برائی کو رفع کر دیتی ہے۔ اور وہ یہ سب کر کے دکھائے گا۔ وہ فرقان ماموں کو یہ ثابت کر کے دکھائے گا کہ وہ اپنے باپ جیسا نہیں ہے۔ ایک دن آئے گا، جب وہ ان کے سامنے سر اٹھا کر کھڑا ہوگا اس دن سرخرو ہو جائے گا، اس کی ماں اور دادا سرخرو ہو جائیں گے۔

اپنے تمام تر عزم و ہمت کے باوجود ایک بات طے تھی۔ اگر وہ پاکستان جائے گا تو کرنل گیلانی کے پاس جائے گا، یا کسی اور کے پاس یا فٹ پاتھ پر رات بسر کر لے گا مگر ماموں کے گھر نہیں جائے گا۔

”تم نے ہمارا ساتھ نہیں دیا۔ اب جب تمہیں مدد چاہیے ہو تو ہمارے پاس مت آنا۔ ہمارا درمت کھٹکنا نا۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ تم بہت جلد بچھتاؤں کا شکار ہو کر ہمارے دروازے پر ضرور آؤ گے۔“ یہی کہا تھا نا انہوں نے۔ اب اس کی عزت اسی میں تھی کہ وہ ماموں کی طرف نہ جائے۔ اس کے لیے یہ عزت نفس کا مسئلہ تھا، مگر یہی سب کسی اور وجہ سے چاہتی تھیں۔

”میں ہمیشہ سے چاہتی تھی کہ تم بھی فوج میں جاؤ اور میں تمہارے اس فیصلے سے بہت خوش ہوں مگر میں نہیں چاہتی کہ تمہارے ماموں اس بارے میں کچھ جانیں۔ میں اپنے بھائیوں کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ اس چیز کو اپنی شکست سمجھتے ہوئے ہر ممکن کوشش کریں گے کہ تمہیں کامیاب نہ ہونے دیں۔ تم ان کے سہارے کے بغیر کچھ بن جاؤ، اور سب سے بڑی بات، آرمی میں کوئی عہدہ پاؤ، وہ یہ کبھی برداشت نہیں کریں گے۔ وہ تمہارے خلاف ہو کر تمہیں اپ سیٹ کر دیں گے۔“

”پھر ہم اسے راز کیسے رکھیں گے؟“

اس کی بات پومی مسکرائی تھیں۔

”کم آن جہان! تمہیں راز رکھنے آتے ہیں۔“

”مگر انہیں پتا چل جائے گا می!“

”دیکھو! ایک نہ ایک دن ان کو پتا تو لگنا ہی ہے مگر تب تک تمہیں اس قابل ہو جانا چاہیے کہ تم ان کے سامنے سر اٹھا کر کھڑے ہو سکو۔

ویسے بھی ہر سال سیکڑوں کیڈٹ بھرتی ہوتے ہیں، تمہارے ماموں کو کیا معلوم کہ ان کے نام کیا ہیں اور وہ کون ہیں؟“

اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ یہ اتنا مشکل بھی نہیں تھا، جتنا وہ پہلے سمجھ رہا تھا۔

”ہمارا استنبول میں کوئی رشتہ دار نہیں ہے۔ حلقہ احباب بھی تھوڑا سا ہے۔ میں سب کو کہہ دوں گی کہ تم انفرہ گئے ہو، وہاں کالج میں داخلہ لے لیا ہے۔“

”نہیں! انفرہ میں سلجوق عمران کے کزنز پڑھتے ہیں، وہ میرے ہم عمر ہیں، انفرہ کہا تو پول کھل جائے گا۔ یونان ٹھیک رہے گا۔“ می

نے نم مسکرائی آنکھوں سے اسے دیکھا تھا۔

”ہاں، تمہیں راز رکھنے آتے ہیں۔“

می کے بقول، ماموں کے آس پاس خاندان میں دور دور تک کوئی فوج میں نہ تھا۔ وہ سب کاروباری لوگ تھے۔ ان کے حلقہ احباب

میں اگر کوئی آرمی فیملی تھی بھی تو سکندر شاہ کے مشہور زمانہ کیس کے بعد فرقان ماموں وغیرہ اب ایسے دوستوں سے احتراز برتتے ہیں۔ کرنل گیلانی

ویسے بھی لاہور میں رہائش پذیر تھے، یوں جب وہ پاکستان گیا تو اسے اپنے ماموں کے شہر نہیں جانا پڑا تھا۔

ان سب احتیاطی تدابیر کے باوجود اسے علم تھا کہ جلد یا بدیر فرقان ماموں جان لیں گے کہ وہ ادھر ہی ہے اور اس وقت کا سوچ کر وہ

خوف زدہ ہو جاتا تھا۔ می کے سامنے وہ ہمیشہ یہی ظاہر کرتا تھا کہ وہ یہ سب اپنی انا کے لیے کر رہا ہے۔ یہ بھی ایک وجہ تھی، اس کی عزت نفس بلاشبہ

بہت مجروح ہوئی تھی، مگر یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ وہ اپنے ماموں کے سامنے خود کو بہت کمزور محسوس کرتا تھا۔ وہ واقعی ان کے سامنے سر نہیں اٹھا سکتا

تھا۔ اسے یہی خوف تھا کہ وہ اسے اس کے باپ کا قطعہ دیں گے اور ایک دفعہ پھر نوٹ جائے گا۔

رؤف گیلیانی بہت اچھے اور دھیمے مزاج کے حامل انسان تھے۔ وہ ان کی بہت قدر کرتا تھا۔ اس کے باپ کی ساری زیادتیاں نظر انداز کر کے انہوں نے اسے اپنے گھر جگہ دی اور پھر ہر موقع پر اس کی مدد کی۔ صرف مالی مدد وہ ان سے نہیں لیتا تھا، مگر اخلاقی طور پر وہ ہمیشہ اس کا سہارا بنے رہے۔ وہ اور حماد اکٹھے کیڈٹ بھرتی ہوئے تھے اور ترقی کی منازل انہوں نے اکٹھے طے کی تھیں۔ وہ سکندر شاہ خدار کا بیٹا ہے، یہ بات کبھی بھی اس کے لیے تازیانہ نہیں بنائی گئی۔ اب رؤف گیلیانی، ان کی بیگم ارسلہ، حماد اور اس کی چھوٹی بہن نورالبعین (یعنی) اس کے لیے دوسری فیملی کی طرح تھے۔ چھادنی میں عمومی طور پر آپ کے اپنے کردار اور اعمال کو آپ کی پہچان کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا، نہ کہ آپ کے پرکھوں کے کردار اور اعمال کو۔ اس نے اپنا نام جہان ایس احمد لکھنا شروع کر دیا۔ زیادہ تر وہ اپنے سرنیم احمد کے ساتھ ہی پکارا جاتا تھا مگر جب کبھی پورا نام لکھنا یا بتانا ہوتا، وہ جہان سکندر احمد ہی لکھا اور بتایا کرتا۔

کرئل گیلیانی کہتے تھے، مسلمان اپنی زندگی میں اپنے باپ کے نام سے ہی پکارا جانا چاہیے اور باپ کا نام اسے کبھی اپنے نام کے آگے سے ہٹانا نہیں چاہیے، چاہے باپ جیسا بھی ہو۔ بہت عرصے بعد اس نے بلا خراپے احساس کمتری کو دبا لیا تھا۔ رشتے ختم نہیں کر سکا تھا۔ ختم کرنے اور دبانے میں خلیج جتنا فرق تھا، اور یہی فرق اس کی ذات میں ایک خلیج چھوڑ گیا تھا۔ وہ چلا گیا تو می نے مصلحتاً ماموں سے ٹیلی فونک رابطہ استوار کر لیا، تاکہ اگر کبھی وہ یہ خبر جان لیں تو می کو معلوم ہو جائے اور ایک دفعہ فرقان ماموں نے باتوں باتوں میں کہہ بھی دیا کہ کسی نے ان سے استفسار کیا تھا کہ کیا کرئل سکندر کا بیٹا لاہور میں پوسٹل ہے؟ تو جواباً ماموں نے بہت فخر سے بتایا کہ ذلت و شرمندگی کے مارے سکندر شاہ کا خاندان کبھی بھی پاکستان کا رخ نہیں کرے گا۔ آخر کار نامہ بھی تو خاصا شرمناک سرانجام دیا تھا انہوں نے۔ وہ کوئی اور جہان ہوگا۔

ممی خاموش ہو گئیں، پھر انہوں نے ماموں کو یہی کہا کہ وہ کوئی اور ہی ہوگا۔ ماموں کے ذہن میں ایک غلط تصور قائم تھا کہ خدار کا بیٹا فوج میں کبھی بھرتی نہیں ہو سکتا، اس لیے انہوں نے اس معاملے کی بھی چھان بین نہیں کی۔ شاید کچھ عرصے بعد وہ جان بھی لیتے، مگر تب تک اس کا تبادلہ وہاں ہو گیا، جہاں کبھی کوشش کرنے سے بھی پوسٹ نہیں ملتی اور جو خود کو ”خفیہ والوں“ میں شامل کروانے کی رتی بھر بھی کوشش نہ کرے، وہ وہاں بھیج دیا جاتا ہے۔ اب اس جاب کی ضرورت تھی کہ وہ اپنا سوشل سرکل محدود رکھے۔ منہ بند اور آنکھیں وکان کھلے رکھے اور اپنے کام کو بھی خفیہ رکھے۔ بلا خروہ پچیس برس کی عمر میں، چھ ماہ کی ٹریننگ چار ماہ وں میں مکمل کر کے ایک ایجنٹ بننے جا رہا تھا۔ ”پاکستانی جاسوس“ جس کا وہ ہمیشہ خواب دیکھا کرتا تھا۔ اب اسے امید تھی کہ شاید وہ برسوں دیکھا جانے والا خواب اسے دکھائی دینا بند ہو جائے۔ گو کہ اس کی شدت میں کمی آ چکی تھی مگر بہر حال وہ اب بھی اس کے ماضی کا آسب بن کر اس کے ساتھ تھا۔

فوج اور انجینیئری میں (اس زمانے میں) آپ کا ایک ہی ہدف، ایک ہی دشمن، ایک ہی تعصب، ایک ہی نفرت کا منبع ہوتا تھا۔

Dear Neighbours!

جس رات اسے پہلی دفعہ غیر قانونی طور پر بھارت جانا تھا، اس سے پچھلے روز اس کے انسٹرکٹر کی موجودگی میں، مروجہ اصول کے مطابق ڈاکٹر نے اس کی دائمی طرف کی ایک ڈاڑھ نکال کر اس کی جگہ ایک خاص پلاسٹک کی بنی مصنوعی ڈاڑھ لگا دی تھی، جس میں سائنڈ سے بھرا کپسول تھا۔ سائنڈ جو کنگ آف پوائزنز تھا۔ یہ کپسول ایک شیشے کے خول میں بند تھا اور زبان کی مدد سے باہر نکل آتا تھا۔ اگر غلطی سے نکل لیا جائے تو جب تک شیشہ نہ ٹوٹے، یہ بے آسانی کوئی نقصان دینے بغیر جسم سے گزر جاتا ہے۔

لیکن اگر چہ لایا جائے تو شیشہ ٹوٹ جائے گا اور انسان چند بل میں مر جائے گا۔ یہ اس لیے تھا کہ اگر کبھی وہ گرفتار ہو جائے اور تشدد برداشت نہ کر سکے اور اسے خدشہ ہو کہ مزید تشدد کی صورت میں وہ اپنے راز اگل دے گا تو بہتر تھا کہ وہ اپنی اس زہر بھری ڈاڑھ کو نکال کر چبائے اور خاموشی سے جان دے دے۔

یہ اس سے بہتر تھا کہ وہ تفتیشی افسران کے سامنے بولنا شروع کرے، اپنے ساتھیوں کی جان خطرے میں ڈالے اور ملک کو نقصان پہنچائے۔ مر جانا، راز اگل دینے سے ہمیشہ بہتر ہوتا ہے۔

وہ سو سال انڈیا میں ایک دوسری شناخت کے ساتھ رہا۔ کور شناخت وہ جعلی شناخت ہوتی ہے جس کے ذریعے جاسوس اس معاشرے میں متعارف ہوتا ہے۔ ہر کور کے ساتھ ایک لیجنڈ بھی ہوتا ہے۔ لیجنڈ اس فرضی ماضی کو کہا جاتا ہے جو اس جعلی کور کے پیچھے گھڑا جاتا ہے، مثلاً یہ

آدمی کہاں پیدا ہوا، کہاں سے گرجوٹ ہوا، سابقہ بیوی کا نام، وغیرہ وغیرہ۔

آپ کے پیچھے آپ کی ابھنی اس لیجنڈ کو اسے اچھے طریقے سے بھاتی ہے کہ اگر کوئی آپ کے بارے میں تحقیق کرنے نکلے تو اس کو آپ کی جائے پیدائش کے ہسپتال میں آپ کا نام رجسٹر میں لکھا بھی مل جائے گا، مگر بجائے شوقیت بھی وہ دیکھ لے گا اور آپ کی سابقہ بیوی سے ملاقات بھی ہو جائے گی۔ یہ سب تاش کے پتوں کے گھر کی مانند ہوتا تھا، جس کو بعض دفعہ ایک پھونک ہی اڑا کر کھیر دیتی تھی۔ اس چیز کو ایجنٹ کا کور بلو (Cover Blow) ہونا کہتے تھے۔

سوا سال اس کا اپنی ماں سے کوئی رابطہ نہیں ہوا۔ اس کا پاکستان میں صرف ایک شخص سے رابطہ تھا، جو اس کے ”باس“ تھے۔ وہ لوگ اپنا باس اس کنٹرولر یا ہینڈلر کو کہتے تھے جو ہر وقت جاسوس سے رابطے میں رہتا تھا۔ مئی کو کوئی پیغام دینا ہوتا تو باس تک پہنچا تیس اور وہ اس تک پہنچاتے۔ باس کی ہر بات ماننا فرض تھا۔ بعض دفعہ اچھے بھلے حالات میں بھی دود و مادہ خاموشی سے گھر میں بیٹھنے اور اپنی سرگرمیاں محدود کرنے کا حکم ملتا اور نہ چاہتے ہوئے بھی وہ کرنا پڑتا۔ بعض دفعہ مسلسل کام کرنا ہوتا، بس جو ادھر سے حکم آئے، وہی کرنا ہوتا تھا۔ ہوتے ہیں نا کچھ لوگ جو اپنی گردنیں اللہ کے پاس رہن رکھوا دیتے ہیں۔ اس نے بھی رکھوا دی تھی۔

اور اپنی گردن رہن رکھوانا کیا ہوتا ہے، یہ اس کو تب علم ہوا تھا، جب سوا سال تک ریڈیٹنٹ اسپاٹی کے طور پر کام کرنے کے بعد ایک دن بہت اچانک وہ گرفتار ہو گیا تھا۔



اس نے ہمیشہ گرفتاری کے امکان کو مد نظر رکھا تھا مگر ”را“ کی تحویل اور تشدد کیا ہوتا ہے، یہ اسے تب معلوم ہوا جب اس نے خود کو ان کی حراست میں پایا۔

ایک مقامی ہینک کے باہر وہ وقت مقررہ پہ ”دوست“ سے ملنے آیا تھا۔ دوست سے مراد اس کا کوئی فریڈ یا عزیز نہیں جس سے اس کی دوستی تھی بلکہ وہ اپنے ملک کے ایجنٹس کو ”دوست“ کہا کرتے تھے۔ اس مقامی دوست کو اس تک چند اشیاء پہنچانی تھیں۔ وقت جگہ سب کچھ دوست کا مقرر کردہ تھا۔ وہ پہلے بھی اس ساتھی جاسوس سے کئی بار مل چکا تھا۔ وہ تیس تیس برس کا خوش شکل سا پاکستانی تھا، جو بھارت میں بھارتیوں کی طرح ہی رہ رہا تھا۔ اس کو دیکھ کر کبھی جہان کو نہیں لگا تھا کہ یہی دوست اس کو یوں دھوکا دے گا۔

وقت مقررہ پہ اسے بلا کر وہ خود نہیں آیا۔ وہ اس جگہ کے قریب ہی انتظار کرتا رہا، جب تک دوست نے نہیں آ جانا تھا، وہ ادھر سے نہیں جاسکتا تھا، مگر پھر ایک دم سے پیچھے سے کسی نے اس کے سر پہ کچھ دے مارا اور وہ ضرب اتنی شدید تھی کہ وہ چند لمحوں کے لیے واقعتاً سنبھل نہ سکا اور بس..... وہ چند لمحوں سے زندگی کے بدترین دور میں لے گئے۔

را کی تحویل جو جنم سے بھی بدتر تھی۔ وہ اس کے بے ہوش ہوتے وجود کو گھسیٹے، دھکیلتے اس کو اپنے ساتھ لے گئے۔ ہاتھ، آنکھیں سب باندھ دیا تھا۔ وہ اندھا، مفلوج ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ اتنے سارے اہلکار تھے اور وہ اکیلا تھا۔ وہ ان سے نہیں لڑ سکتا تھا۔ اس پہلی ہی ضرب نے اسے بے بس کر دیا تھا۔

کہیں کسی عمارت کے اندر ایک کال کوٹھڑی فرائیل میں لے جا کر اس کی آنکھوں سے پٹی اتاری گئی، پھر ایک آفیسر نے اس کو بالوں سے پکڑ کر چہرہ اونچا کیا، منہ پر لگی ٹیپ اتاری اور پلاس کی قسم کے آلے سے اس کے ہر ایک دانت اور داڑھ کو باری باری کھینچا۔ جیسے وہ آلہ نقلی ڈاڑھ پہ آیا، زہر بھری ڈاڑھ کھینچ کر الگ ہو گئی۔

یہ نقلی ڈاڑھیں لگانے کا طریقہ دنیا کی ہر انٹیلی جنس ایجنسی میں پایا جاتا ہے، سو ہر ایجنٹ کو گرفتار کرتے ہوئے وہ سب سے پہلے اس کی ڈاڑھ الگ کرتے ہیں۔ سو انہوں نے پاکستانی جاسوس کو گرفتار کرتے ہی سب سے پہلے اس کا فرار کا واحد راستہ ختم کیا، پھر دوبارہ اسے اس کی آنکھوں پر اپنی باندھ کر اسے اپنے ساتھ چلاتے باہر لے گئے۔

ایسی جیلوں میں قیدی کے فرار کا ہر امکان ختم کرنے کے لیے، کہ کہیں وہ اپنے سیل سے تفتیشی سیل کا فاصلہ اور سمت نہ جان لے اور اس طرح فرار ہونے کا کوئی منصوبہ ترتیب دے لے، اسے ہر چند قدم بعد لٹو کی طرح گھمایا جاتا تا کہ وہ سمت کھو دے اور پھر وہ آگے چلاتے۔ اسے تربیت کے دوران بتایا گیا تھا کہ ایسے میں کیا کرنا چاہیے۔ اپنے قدم گھٹنے چاہئیں، اور آس پاس کی خوشبو گھنٹی چاہیے۔ آوازیں سننی چاہئیں۔ اس نے یہی کیا۔ ہر طرف کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی آواز تھی۔ پھر جب قریباً ساٹھ قدم ہو گئے تو وہ اسے ایک کمرے میں لائے، کرسی پہ بٹھایا اور ہاتھ پاؤں

کری کے ساتھ باندھے پھر آنکھوں سے پٹی اتاری۔

تاریکی سے تیز روشنی اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ سامنے میز پر ایک بڑے ریفلکٹر میں لگا بلب روشنی کے مارچہ کے لیے استعمال ہو رہا تھا۔ اس کی روشنی سے آنکھوں میں تکلیف ہوتی تھی۔ اس نے بے اختیار چہرہ پیچھے کر کے آنکھیں کیسٹریں اور سامنے دیکھنا چاہا۔ میز کے اس پار ایک آدمی کرسی پر بیٹھا تھا جو اپنے حلیے سے کوئی اعلیٰ افسر لگتا تھا۔ میز پر ایک پیئر سے ملتی جلتی چیز بھی رکھی تھی۔

ایک طرف دیوار میں شیشہ لگا تھا۔ جہان نے ذرا سی گردن موڑ کر ادھر دیکھا، اسے اس آئینے میں اپنا عکس نظر آیا تھا، مگر وہ جانتا تھا کہ یہ اس کی طرف سے آئینہ تھا، جب کہ اس کی دوسری طرف یہ شیشے کا کام دے رہا تھا۔ یعنی اندر بیٹھے آدمی کو اس میں اپنا عکس نظر آئے گا، لیکن جو آئینہ سرز اور سائیکل فرسٹ اس شیشے کے پار کھڑے ہوں گے، وہ اس کو شیشے کی طرح سے استعمال کرتے ہوئے اس میں سے اندر کا منظر دیکھ رہے ہوں گے۔ وہاں ہونے والی تمام گفتگو انگریزی میں ہوتی تھی۔ انہوں نے اس پہلی گفتگو میں اس کو بتایا کہ اس کے پاس فرار کا راستہ نہیں ہے۔ ان کی جیلوں سے مردہ یا پانچ ہو کر ہی لوگ نکلتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ وہ پاک اسپاکی (پاکستانی جاسوس) ہے، اس لیے وہ سب جج جج بتا دے۔ اس صورت میں وہ اس کے ساتھ رعایت برتیں گے۔

وہ جانتا تھا کہ اس کی گرفتاری دوست کے کہنے پہ عمل میں آئی ہے، اور صاف ظاہر تھا کہ وہ بخوبی واقف ہیں کہ وہ جاسوس ہے لیکن اس کے پاس جو اسمگلر والا کور تھا، (یہ کہ وہ ایک اسمگلر ہے اور اس دوست نے کسی پرانے بدلے کے باعث اسے جاسوس کہہ کر پھنسا دیا ہے) کہ وہ کور اسے اب مرنے تک قائم رکھنا تھا۔

اس کا اندر پوشرع ہو چکا تھا۔

نام؟ فرید حیات۔

قومیت؟ پاکستانی۔

دین؟ اسلام۔

شہر؟ سیالکوٹ

کس نے تربیت دی؟

”ہدی ہشتی اسمگلرز ہیں ہم، ہمارے باپ دادا ہماری تربیت کرتے ہیں۔“ اس نے اپنی ازلی بے نیازی سے کہا۔

”میں بھی جانتا ہوں اور تم بھی جانتے ہو کہ تم جھوٹ بول رہے ہو۔ ایک موقع اور دیتا ہوں۔“ اس رعب دار آفیسر نے غصے سے کہا

تھا۔ ”بتاؤ، بھارت کس لیے آئے تھے؟“

”ہیر وڈن اسمگلنگ کے لیے۔“

افسر اٹھا، اور وہ شے اٹھا کر پوری قوت سے اس کے سر پر ماری۔ ایک، دو، تین پوری تین ضربوں کے بعد اس کا دماغ جیسے ٹھوم گیا۔ وہ

سر کے پچھلے حصے میں پڑنے والی بدترین ضرب تھی۔

”ہاں اب بولو! کس لیے آئے تھے؟“

”تمہاری ماں سے ملنے۔“

ایک دفعہ پھر اس آدمی نے اس کے سر پر وہ چیز ماری۔ ایسے لگتا تھا جیسے کھال تک کٹ گئی ہو۔ اذیت ہی اذیت تھی۔ وہ کرسی پر پیچھے

بندھے ہاتھوں کے ساتھ، آنکھیں تختی سے پیچھے ذرا سا کر رہا تھا۔

درو..... تکلیف..... جلن۔

”اب بتاؤ! کس لیے آئے تھے؟“ وہ پھر پوچھ رہے تھے۔

ہر بار اس نے وہی جواب دیا۔ ان گنت دفعہ انہوں نے سوال دہرایا اور اتنی ہی ضربیں اس کے سر پر پڑیں۔ پھر وہ بے ہوش ہو گیا۔

جب ہوش آیا تو وہ واپس اپنے سیل میں زمین پہ لیٹا تھا۔ سر اتنا دکھ رہا تھا کہ لگتا تھا ابھی پھٹ جائے گا۔ کپٹی کے قریب سے خون نکل

کر چہرے پہ جم گیا تھا۔ سر میں گومز اور جسم پہ کئی جگہ نیل تھے جیسے اس کے بے ہوش ہونے کے باوجود انہوں نے تشدد ختم نہیں کیا تھا۔

اس نے آنکھیں بند کیں تو وقت جیسے کئی برس پیچھے استنبول پہنچ گیا۔ وہ ہاتھ میں پکڑی روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے بگلوں

کی طرف اچھالتے ہوئے سمندر کنارے چل رہا تھا۔ دادا بھی ساتھ تھے۔ وہ ہمیشہ کی طرح آگے نکل گئے تھے۔ پھر ایک دم وہ پیچھے مڑے اور اسے دیکھ کر مسکرائے۔

”کل تمہاری ماں کی سالگرہ ہے۔ اسے تو یاد بھی نہیں ہوگا۔ ہر وقت کاموں میں جوا لکھی رہتی ہے۔ یوں کرتے ہیں۔ اس کے لیے کوئی تحفہ لے جاتے ہیں۔“

”ٹھیک۔“ اس نے اثبات میں سر ہلادیا۔

”مگر اس کو بتانا مت۔ کل اسے سر پر انزدیں گے۔ نہیں بتاؤ گے نا؟“ پھر رک کر انہوں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا تمہیں راز رکھنے آتے ہیں جہان؟“

جہان نے آنکھیں کھولیں۔

”ٹھنڈے فرش پر دکھتے جسم کو اس نے محسوس کیا اور دھیرے سے بڑبڑایا۔“ مجھے راز رکھنے آتے ہیں دادا! “

اس کا وہ بدترین درد جو پھر ہمیشہ اس کے ساتھ رہا تھا، اس کا آغاز اسی جیل سے اسی روز ہوا تھا۔

پھر چند گھنٹے بیتے تو ایک ڈاکٹر آ گیا۔ اس نے اس کے زخموں پہ دوا لگائی۔ کھانے کو اسپرین کی دو گولیاں دیں اور چند مزید درو کی دوائیں اس اینٹ کے ساتھ رکھ دیں جس کو تکیہ بنا کر وہ آنکھیں موندے فرش پہ لیٹا تھا۔

رات میں وہ ڈاکٹر دوبارہ آیا۔ اب کی بار اس کی موجودگی میں ہی چند تفتیشی اہلکار اسے اپنے مخصوص کمرے میں لے جانے کے لیے آئے تو ڈاکٹر نے انہیں سختی سے جھڑک دیا۔

”تم دیکھ نہیں رہے، اس کا سر کیسے زخمی ہے۔ مجھے اس کو زندہ رکھنے کا حکم ہے، میں اس کو زندہ رکھوں گا۔ اپنی تفتیش بعد میں کرنا۔ آج تم نے مزید اس کو مار چر کیا تو یہ مر جائے گا۔“

جہان نے ذرا کی ذرا آنکھیں کھول کر ڈاکٹر کو دیکھا جو ان اہلکاروں پہ غصہ ہو رہا تھا۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے واپس ہو لیے۔ ڈاکٹر اب تاسف سے سر جھٹکتا اس کے سر کی پٹی کرنے لگا تھا۔

”یہ انسان نہیں ہیں، یہ درندے ہیں۔“ وہ ساتھ ہی زیر لب انگریزی میں کہہ رہا تھا۔ جہان بس اپنی نڈھال، نیم وا آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا۔

”تم فکر مت کرو، میں تمہاری ہر ممکن مدد کروں گا۔“ پھر وہ اس کے قریب جھکتے ہوئے دھیمی آواز میں بولا۔ ”میں مسلمان ہوں۔ اگر تمہیں قرآن یا جابائے نماز چاہیے تو اس کا بندوبست بھی کر دوں گا۔“

جہان چند لمحے خاموش نظروں سے اسے دیکھتا رہا، پھر بولا۔

”کیا تم مجھے سورۃ الایمان لا کروے سکتے ہو؟“

”ہاں، بلکہ میں تمہیں پورا قرآن منگوا دیتا ہوں۔“

”منگوا دو۔“ وہ ہولے سے مسکرایا اور آنکھیں پھر سے موند لیں۔

کیسا مسلمان تھا یہ ڈاکٹر جسے یہ نیک معلوم تھا کہ قرآن میں الایمان نام کی کوئی سورۃ نہیں ہے..... گدھانہ ہو تو۔

وہ جانتا تھا کہ یہ مجرموں، خصوصاً جاسوسی کے مجرموں کی تفتیش کا پرانا طریقہ تھا۔ ایک آفسر آپ پہ بے حد سختی اور نار چر کرتا ہے، جبکہ دوسرا آپ کی طرف داری کرتا ہے۔ خود کو آپ کا ہمدرد ثابت کرتا ہے، تاکہ ایسے حالات میں جب انسان کو اپنے قریب کوئی نظر نہ آئے، وہ خود کو مدد کے لیے آنے والا فرشتہ ثابت کرے اور اہم معلومات اگلا لے۔

بہر حال اسے اردو ترجمے والا قرآن، نماز والی ٹوپی اور جائے نماز لادی گئی۔ وضو کا پانی بھی دیا گیا۔ یہ اس کال کوٹھڑی کا واحد روزن تھا اور نہ وہ دن بہت تاریک تھے۔ اپنے ملک سے دور ایک دشمن ملک میں دشمنوں کے درمیان زخمی ہو کر قید رہنا، یہ اس دنیا کا سب سے تکلیف دہ امر تھا۔

وہ روزانہ اس کو تفتیشی کمرے میں لے جاتے۔ کبھی بازوؤں کے درمیان راڈ پھنسا کر دیوار سے لگا کر بیٹا جاتا، کبھی الٹا لٹکا کر گرم پانی کی بالٹی میں سر ڈبوایا جاتا۔ اس کے پاس کہنے کو بس ایک ہی بات تھی۔

”I am not a spy“

(میں جاسوس نہیں ہوں)

وہ چونکہ ایک دوست کے ہاتھوں پکڑوایا گیا تھا، اس لیے ان کو اس بات میں قطعاً کوئی شک نہ تھا کہ وہ جاسوس نہیں ہے۔ ان تکلیف دہ، پر تشددوں میں جہان نے اس ساقی ایجنٹ سے بہت نفرت کی تھی جس نے چند ہی سوں کے لیے اسے اور نہ جانے کتنے لڑکوں کو پکڑوایا تھا۔ اس نے واقعتاً قسم اٹھائی کہ زندگی میں اگر کبھی اسے موقع ملا تو وہ اس آدمی سے بدلہ ضرور لے گا لیکن یہ موقع اسے کبھی نہیں ملا تھا۔ وہ اپنے اس دوست کا نام جانتا تھا، نہ ہی کوئی دوسری شناخت اور اس دنیا کے ساڑھے چھ ارب انسانوں میں اس ایک آدمی کو وہ تلاش نہیں کر سکتا تھا۔ ہاں اگر کبھی وہ واپس جاسکا تو اس کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ یہ الگ بات تھی کہ ایسی کوششیں عموماً کامیاب نہیں ہوا کرتیں اور یہ بھی کہ واپسی ان دنوں بہت ناممکن سی چیز لگتی تھی۔

قریباً بارہ دن بعد اس نے سورج اس وقت دیکھا جب وہ اسے اس کے سیل سے نکال کر باہر برآمدے میں لائے، جہاں لوہے کے بڑے بڑے بلاک پتی گرمی میں تپ رہے تھے۔ وہ اس کو باری باری ان بلاکس پہلنا تے تھے۔ جلن، آگ، تپش... جلنے سے زیادہ بڑا عذاب بھی کوئی ہو سکتا ہے بھلا؟ اس کی انا اور مردانگی کو گوارا نہ تھا کہ ان لوگوں کے سامنے اس کے لبوں سے اف تک نکلے، مگر بعض اوقات کرانے اور درد سے بلبلا اٹھنے سے وہ خود کو روک نہیں پاتا تھا۔ تب اسے بہت غصہ، بہت بے بسی محسوس ہوتی تھی۔

مگر ایک بات طے تھی۔

He will not sing.

(وہ اپنی زبان نہیں کھولے گا!)

پھر وہ اندھیر دن اور رات اس کے اندر سے ہر چیز آہستہ آہستہ نکلنے لگے۔ اپنی ذات کا وقار اور عزت نفس تو وہ کھو چکا تھا، پھر جب ہر روز وہ اسے پناہ تشدد کر کے نیم جاں حالت میں سیل کے سخت فرش پہ پھینک کر چلے جاتے تو اندر موجود ہر جذبہ فرش کی گرمی میں بھسم ہونے لگتا۔ جیل جانے سے قبل وہ اتنا تلخ اور بے حس نہیں تھا۔ زندگی اور زندگی کی تمام تر نرمی اس کے اندر موجود تھی۔ مگر ان تاریک دنوں نے ہر چیز اپنے اندر جذب کر لی۔ وہ دن اور رات کا حساب نہ کر پاتا۔ آہستہ آہستہ رات دن برابر ہو گئے۔

اس نے وقت کا حساب مکمل طور پر کھو دیا۔ جب کھانا آتا تو معلوم ہوتا کہ رات ہو گئی ہے۔ کھانے کی پلیٹ جو پہرے دار دروازے کی درز سے جان بوجھ کر یوں ترچھا کر کے تھما تا کہ اس کے پکڑتے پکڑتے پلیٹ زمین پہ گر جاتی۔ اسے اس گندی زمین سے سانس اٹھا کر کھانا پڑتا جس کو چباتے ہوئے بھی اندر ریت اور پتھر محسوس ہوتے تھے۔

جب کبھی پاکستان یا انڈیا کا بیچ لگا ہوتا تو پہریدار کنفری سننے ہوئے، زرد زور سے پاکستان، محمد علی جناح، اور مسلمانوں کو گالیاں دیتے، ایسے ایسے الفاظ سے انہیں نوازتے کہ اس کا خون کھول اٹھتا، مگر وہ اپنی جگہ سے ایک انچ نہیں ہلتا۔

زندگی، خواہشات، امیدیں، امنگیں، اس کے اندر سب کچھ مر گیا تھا۔ ساری دنیا اور اس کی ہر چیز من گھڑت فسانہ تھی۔ اگر کہیں کوئی حقیقت تھی تو وہ یہ تنگ، تاریک، غلیظ ساسل تھا۔

وہ اس روز بھی فرش پہ لیٹا چھت کو خالی خالی نگاہوں سے تنگ رہا تھا۔ اسے مٹی یاد آ رہی تھیں۔ وہ ہر روز رات کو سونے سے پہلے سوچتی ہوں گی کہ ان کا بیٹا کہاں ہے۔ وہ ان سے عرصے سے رابطے میں نہیں تھا مگر اب تک تو شاید ان کو علم ہو گیا ہو کہ وہ زیر حراست ہے۔ کیا وہ پھر بھی ان سے بارہ مل سکے گا؟ کیا وہ پھر بھی پاکستان کو دیکھ سکے گا؟ اس نے سوچنا چاہا تو ہر طرف مہیب اندھیرا نظر آیا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ کبھی عدالت میں پیش نہیں کیا جائے گا، نہ ہی اس کا ملک کبھی اسے تسلیم کرے گا۔ کوئی ملک اپنے جاسوس کو تسلیم نہیں کرتا۔ مگر یہ اس کا اپنا انتخاب تھا۔

اس نے خود یہ زندگی جیتی تھی اور اس تمام اذیت کے باوجود وہ جانتا تھا کہ اگر اسے دس زندگیاں دی جائیں، تب بھی وہ یہی جاب پنے گا۔ اسے اپنے کام سے محبت تھی۔ وہ بچھتا نہیں رہا تھا۔ مگر وہ یہ ضرور سوچتا تھا کہ اس پاکستانی جاسوس کے گھر والوں نے نہ جانے کتنا عرصہ اس کا انتظار کیا ہوگا، جس کو اس نے اپنے ہاتھوں سے دفنایا تھا لیکن اسے لاوارث نہ چھوڑا جائے۔ بچھلی رات بھی پہرے داروں نے سیل میں دسپنو لیے چھوڑ دیے تھے، جنہیں اس نے ہاتھ میں پکڑ کر اپنے جوتے کی نوک سے مارا تھا۔ اگر کل کو اس کے سوتے ہوئے وہ اس کو مار دیں اور اس کی لاش کو دریا میں بہا دیں تب وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اسے نہ نام چاہیے تھا، نہ شہرت، نہ ستائش، اسے بس ایک عزت دار جنازہ چاہیے تھا۔

وہ بہت اذیت ناک روز و شب تھے۔

اسی وقت، جب وہ سوچوں میں غلطاں تھا، پہرے دار اس کے سیل میں لا کر کسی کو پھینک گئے تھے۔ اس نے آنکھیں کھول کر گردن ذرا سی موڑ کر دیکھا۔

وہ ایک کم عمر لڑکی تھی، جو بے تحاشا رو رہی تھی۔ اس نے پاکستانی طرز کی شلوار قمیض پہن رکھی تھی اور دو ہاتھ بٹھا ہوا تھا۔ چوٹی سے الجھے ہوئے بال نکل رہے تھے۔ اس کے حلیے سے لگ رہا تھا، اسے شدید ظلم و تشدد کا نشانہ بنایا گیا ہے۔

”کون ہو تم؟“ وہ بولا تو اس کی آواز جیسی تھی۔ وہ اسی طرح لینے ہوئے گردن ذرا سی موڑے اسے دیکھ رہا تھا۔

”میں نے کچھ نہیں کیا۔ ہم پوری فیملی کرکٹ بیچ دیکھنے آئے تھے۔ انہوں نے ہمیں جانے نہیں دیا۔ یہ کہتے ہیں، ہم پاکستانی

ہا سوں ہیں۔“

وہ دو دوے دوے اسے اپنے بارے میں بتانے لگی۔ اسنے میں دن ہو گئے تھے، ان لوگوں کی قید میں اور وہ بہت دھمی دھمی۔ وہ چپ چاپ اس کی روداد سن رہا تھا۔ ابھی وہ بول ہی رہی تھی کہ سپاہی دوبارہ آئے اور اسے کھینچتے، تھینچتے ہوئے باہر لے جانے لگے۔ وہ بے اختیار خوف سے روٹی چلاتی، جہاں کود کچھ کرا سے مدد کے لیے بلاتی رہی۔

جہاں نے گردن واپس موڑ کر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

تین دن تک روز رات کو وہ اس لڑکی کو لے جاتے۔ ٹارچہ سیل قریب ہی تھا۔ وہاں سے اس کی دردناک چیخیں، آہیں، سسکیاں، یہاں تک صاف سنائی دیتیں۔

صبح کے قریب وہ اسے سیل میں واپس پھینک جاتے، اس حالت میں کہ وہ مزید زخمی ہوتی اور مزید رو رہی ہوتی۔

تیسری صبح وہ اٹھا، اپنے روم کو بھلائے، اس نے پانی کے برتن سے ایک گلاس بھر اور اس کے قریب لے کر آیا۔ وہ بند آنکھوں سے نڈھال سی کرا رہی تھی۔ اس نے اس لڑکی کی آنکھوں کو دیکھا تو ایک دم جیسے کوئی یاد ہو چھانے لگی۔

فریج ابلکان رضا..... خوب صورت اور طرحدار فریج.....

وہ ایک روزان کے گھر گیا تو اس نے لاؤنج میں بیٹھی فریج کو آئینہ پکڑے، موچنے سے اپنی ہنڈوؤں کو تراش دیکھا تھا۔ علی کرامت کی ممی اپنی ہنڈوؤں کو نہیں تراشی تھیں۔ ان کے ابو قدرتی تھے مگر اچھے لگتے۔

”آپ کیوں مسز فریج کی طرح اپنی آئی بروڈ کوھیپ نہیں دیتیں؟“ اس نے ان سے پوچھ ہی لیا تو وہ ہنس کر بولیں۔

”اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی چیزیں اپنی مرضی سے رد و بدل نہیں کرتے جیسا! اللہ تعالیٰ کو یہ اچھا نہیں لگے گا۔“

وہ اس نیم بے ہوش بڑی لڑکی کی ہنڈوؤں دیکھ رہا تھا۔ بالکل فریج کی طرح کمان کی شکل میں بنی ابو بہت صاف تھیں۔ اگر وہ ایک ماہ سے زیر حراست تھی تو ابھی تک ابو کی بھیپ خراب کیوں نہیں ہوئی تھی؟ کیا اسے جیل میں ابو تراش ملا کرتا تھا؟

”لعنت ہے!“ اس نے گلاس پورا پورا اس کے چہرے پہ انڈر لایا اور اٹھ کر واپس اپنی جگہ پہ آ گیا۔ وہ کراہ کر روتی مگر زیادہ حرکت نہیں کی۔

ایسے اسٹول پر بیٹھیں stool pigeons اکثر جیل میں مطلوبہ ملزم کے ساتھ ڈالے جاتے تھے تاکہ وہ اپنے اوپر ہونے والے مظالم کی داستان اور اپنی چیخیں سنا کر ملزم کو ڈرا سکے اور وہ اپنی زبان کھول دے یا کم از کم اس کی ہمدردی لے کر وہ اسٹول پر بیٹھیں اس کے بارے میں کچھ جان سکے۔

وہ اب دن رات اپنے فرار کے متعلق سوچا کرتا تھا۔ وہ جیل اتنے زیادہ پہروں میں بند تھی کہ وہاں سے بھاگنا ناممکن تھا۔ کرے تو کیا کرے؟ وہ اسے پولی گراف میٹ پہ لے کر گئے تھے، اور اس کو تربیت کے دوران اس مشین کو دھوکہ دینا سکھایا گیا تھا، سو وہ اس کو نہیں توڑ سکے، لیکن اسے خوف تھا کہ مخصوص آنکشمش دے کر وہ اس سے بہت کچھ اگلا لیں گے۔ پھر اس کی ایجنسی اس کا کبھی اعتبار نہیں کرے گی۔ وہاں یہی کہا جائے گا، وہ خدار کا بیٹا تھا، وہ باپ جیسا ہی نکلا۔ کیا کرے، کدھر جائے؟

پھر کئی دن بعد ایک روز وہ اسے سیل سے نکال کر ایک مختلف کمرے میں لے آئے جہاں الیکٹریک شاکس کا انتظام تھا۔ بجلی کے جھٹکے لینے کا مطلب تھا، ساری عمر صحت کے مختلف مسائل کا شکار ہو کر وہ فوج کے لیے ناکارہ ہو جائے۔ اس نے سوچنے میں بس ایک منٹ لگایا۔

”اوکے، اوکے! آئی ایم اے اسپاٹی۔“ اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر اعتراف کر لیا۔ ”مجھے شاکس مت دو، میں سب جانتا ہوں۔“

تفتیشی ٹیم دوبارہ بیٹھی۔ ریکارڈنگ کا انتظام ہوا۔ سوال و جواب اور بیان دوبارہ لیے گئے۔ اس نے اپنے سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق ان کو بتانا شروع کیا کہ وہ سولین جاسوس ہے۔ اپنی ایجنسی کا نام اسے نہیں معلوم، اور چند دوسری کہانیوں کے بعد اس نے بتایا کہ اس ماہ کی تیرہ تاریخ کو اس کو اپنے ساتھی جاسوس سے ملنا ہے۔ وہ ان کو وہاں لے جائے گا، تاکہ وہ اس ساتھی کو گرفتار کر لیں اور اس کے ساتھ رعایت برتیں۔ وہ جانتا تھا کہ اس جیل سے وہ نہیں بھاگ سکتا، ہاں کھلی فضا میں شاید یہ ممکن ہو۔ اس نے کہا کہ اگر تیرہ تاریخ کو وہ نہیں آیا تو پھر ایک یا دو ہفتے بعد اسی جگہ پہ وہ دوبارہ آئے گا۔

خوب وارن کرنے اور مصوٹ بولنے یا فراہم کرکوشش میں ملنے والی سزا کے بارے میں ڈرا دھمکا کر وہ یہ خطرہ لینے کو تیار ہو گئے۔ اس کے پاس بھی اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا، اور ان کے پاس بھی اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ انہیں ایک پرجوم جگہ پہ لے آیا مگر وہاں اتنی سکیورٹی اور مکمل انتظامات تھے کہ ادھر سے فرار ہونا کسی اسپائیڈر مین کے لیے تو ممکن تھا، مگر انسان کے لیے نہیں۔ اس نے وہاں ادھر ادھر ٹپلتے ہوئے بہت دفعہ کوشش کی کہ کہیں کوئی معمول مل جائے، مگر یہ ناممکن تھا۔ وہ چپ چاپ واپس آ گیا۔

اگلے ہفتے وہ پہلے سے زیادہ سکیورٹی کے ساتھ اسی جگہ پہ لے جایا گیا۔ اس کا کوئی دوست ادھر نہیں آتا تھا۔ سو کوئی نہ آیا۔ تین گھنٹے اس بل پہ ادھر ادھر ٹپل کر وہ اس سے ہٹ کر ایک بک اسٹال پہ چلا آیا۔ ہر طرف سادہ کپڑوں میں موجود سکیورٹی اہلکار اس پہ نگاہیں مرکوز کیے ہوئے تھے۔ وہ ایک رسالہ اٹھا کر اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ اس کا ارادہ تھوڑے بھر مزید ٹپل کر یہاں سے واپس ہو لینے کا تھا۔ کون سا کسی نے آنا تھا۔ اب اتنی گرمی میں وہ کیوں خوار ہوتا رہے؟

رسالہ دکھ کر وہ مرنے ہی لگا تھا کہ شاپ سے نکلتی تین لڑکیاں ہنستی، باتیں کرتی ہوں ایک دم اس کے سامنے آئیں کہ وہ ان سے نکرا گیا۔ ”اوہ!“ جس لڑکی سے وہ بکرا یا تھا، وہ ایک دم اتنی بوکھلائی کہ اس کی کتابیں اور فائل نیچے جا گریں۔ وہ جلدی جلدی معذرت کرتا اس کی کتابیں اٹھانے لگا۔

وہ کان یونیفارم میں لباس لڑکیاں تھیں۔ جس سے وہ بکرا یا تھا، اس نے سر پہ دو پٹالے رکھا تھا۔ سفید دوپٹے کے بالے میں چمکتا چہرہ بہت معصوم، بہت گھبرایا ہوا لگ رہا تھا۔ جہان کے ساتھ جھک کر اس نے اپنی فائل اٹھائی اور کچھ اس طرح سے اٹھائی کہ اس پہ لکھے الفاظ واضح ہو گئے۔ وہ بہت کوشش سے اپنی حیرانی ظاہر کیے بغیر اٹھا۔ دل ایک دم زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ لڑکیاں جلدی جلدی اپنی چیزیں سنہال کر واپس مزگنیں۔ وہ خود کو بے سکون رکھتے ہوئے پھر سے بک ریک کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ایک کتاب اٹھا کر اس نے چہرے کے سامنے تان لی تاکہ اس کے تاثرات اس کے منہ پر نہ پڑیں۔

اس لڑکی کی فائل پہ ایک آفیسر کا نام، رینک اور اس کی تفتیشی ٹیم میں شمولیت کا دن لکھا تھا۔ ساتھ میں پہچان کے لیے جہان کا اپنا کوڈ نمبر اور اس کے کوڈ نیم کا مخفف بھی لکھا تھا۔ اے آر پی۔

Agent Rose Petal

اس میں اور گلاب کی پتھری میں کوئی مماثلت نہیں تھی۔ یہ بس ایک کوڈ نیم تھا، جیسے عموماً ہوا کرتے تھے۔ شاید جس نے الاٹ کیا تھا، اس کے سامنے اس وقت روز ٹپل ٹشو کا ڈبا رکھا ہو، بہر حال اس لڑکی کی فائل پہ لکھے یہ الفاظ پہچان کے لیے کافی تھے۔ اس نے کتاب واپس رکھتے ہوئے سرسری سے انداز میں دکان کے شیشے کے دروازے کو دیکھا جہاں دو مخالف سمت جاتی تین لڑکیوں کا عکس نمایاں تھا۔ اسی بل فائل والی لڑکی نے گردن ڈراموز کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک مسکراہٹ تھی۔

مرہ جیلہ

خوب صورت صورت

اگلے ہی لمحے مرہ جیلہ واپس پلٹ گئی۔ وہ تینوں لڑکیاں اب بس پوائنٹ کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ وہ سب کچھ اتنے عام سے انداز میں ہوا تھا کہ ان درجنوں مگر انوں نے بھی کچھ محسوس نہیں کیا۔ ایک گھنٹے بعد وہ واپس چلے آئے۔

اب اس کے پاس مزید ایک ہفتے کا وقت تھا۔ اگلے ہفتے اس کو آخری دفعہ ان لوگوں کو اسی جگہ پہ لے کر جانا تھا۔ اس کے تعاون کے پیش نظر ہفتے دس دن اس پہ تشدد نہیں کیا گیا تھا۔ کھانا بھی قدرے بہتر مل رہا تھا۔ شاید وہ سمجھے کہ اگر وہ راز اکل دے تو وہ اس کو چھوڑ دیں گے۔

حالانکہ وہ جانتا تھا کہ تب بھی وہ مارا جائے گا مگر اب اسے امید تھی۔ اسے لاوارث نہیں چھوڑا گیا تھا۔ اسے بس اس آفیسر کا انتظار کرنا تھا جو چند دنوں میں ادھر آ جائے گا اور فرار میں اس کی مدد کرے گا۔

اور پھر ایک روز وہ آفیسر اس کی تفتیش پہ تعذبات ہو ہی گیا۔ اس کو امید تھی کہ وہ اس کی مدد کرے گا، مگر اس نے اس پر تفتیش اور تشدد کے پہاڑ توڑ ڈالے۔ وہ اس پہ چلا تا تھا، اس کو گالیاں دیتا تھا، اور بہت ظلم کیا کرتا تھا۔ جیسے اس قیدی کی زبان کھلوانا اس کے کیرئیر کا مسئلہ تھا۔ وہ اس آفیسر کے بارے میں شش و پنج میں مبتلا ہو گیا۔ ہو سکتا ہے وہ لڑکی بھی ان ہی بھارتیوں کی بھیجی گئی ہو تاکہ وہ اس آفیسر کو اپنا ہمدرد خیال کر کے اس سے دل کی بات کر بیٹھے۔

مگر پھر اس لڑکی کی فائل پہ اس کا کوڈ نمبر کیسے لکھا تھا؟
وہ کوڈ نمبر پاکستان میں بہت اہم جگہ محفوظ تھا، وہ یوں کسی کو نہیں مل سکتا تھا؟ وہ کیا کرے؟
صبر... اور انتظار!!!

اور ایسی ہی ایک شام جب بھارت اور پاکستان کے کرکٹ میچ میں پاکستان جیت گیا، تو اس آفیسر نے غصے اور اشتعال میں تمام گارڈز کو اس پہ کھلا چھوڑ دیا، وہ اس کو سپینے رہے، مارتے رہے، بٹھنڈوں سے، مکوں سے، لالٹوں سے، اور گالیاں دیتے رہے۔
وہ سہتا رہا۔

اور جب یہ سیشن ختم ہوا تو وہ سب باہر چلے گئے۔ آخری جانے والوں میں وہ آفیسر تھا۔
جب اس نے ورد سے کراتے سر کو سیدھا کیا، اور نیم جاں آنکھوں کو کھول کر دیکھنا چاہا تو اس کے سیل کی چابی اس کے ساتھ گری پڑی تھی۔

یہ یقیناً بظاہر ان گارڈز کی دھکم پیل میں گری تھی۔
مگر وہ جان گیا تھا کہ وہ آفیسر ان کا اپنا تھا۔
اب وہ یہاں سے نکل سکتا تھا۔
اور اس آفیسر پہ کوئی شک بھی نہیں کر سکتا گا۔

اس نے اپنی اچھی جہان، دونوں کی چھڑی چھڑی چاہی تھی۔
کبھی زندگی نے موقع دیا تو وہ اس ہندو آفیسر کے احسان کا بدلہ ضرور پورا کرے گا۔ کاش وہ اس کے لیے کچھ کر سکتا.....
تین دن تک اس نے خاموشی سے انتظار کیا۔ چابی اس نے چھپالی تھی۔ جب زخم ذرا بھر گئے، تو ہولی آگئی۔
تہوار کا دن۔

سب اس روز مگن تھے۔
وہ اپنا کام کر سکتا تھا۔
اور وہ موقع کا انتظار کرتا رہ گیا جب اچانک سے ہر طرف شورا اٹھا۔ دھکم پیل، افراتفری۔
کہیں کسی کمرے میں آگ لگ گئی تھی۔ لوگ بھاگ رہے تھے۔ اور وہ جان گیا تھا کہ اس کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے۔
باقی سب تاریخ کا حصہ بن گیا۔

اس افراتفری میں سیل سے نکلنا، ایک آفیسر کو گرا کر اس کا لباس، اور کارڈ ہتھیانا کچھ مشکل نہ تھا۔
یہاں تک کہ وہ اس بلڈنگ سے باہر نکل آیا۔

پورے ایک ماہ دس دن بعد اس کو اس عقوبت خانے سے رہائی ملی تھی۔ چند دن بعد ہی وہ راجستھان کے قریب کی سرمد عبور کر کے اپنے ملک واپس پہنچ چکا تھا۔

ڈیڑھ برس بعد وہ جن حالات سے گزر کر پاکستان پہنچا، وہ ناقابل بیان تھے۔ جب وہ واپس لاہور پہنچا تو اس کے زخم ابھی بھرے نہیں تھے۔ مسلسل علاج اور دیکھ بھال کے بعد ظاہری زخم تو مندل ہو گئے مگر وہ سر کا بدترین درد اس کے ساتھ رہا۔ اس نے بھی اپنے اس سردرد کو ظاہر نہیں کیا، وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی بیماری یا معذوری اس کے سروں ریکارڈ کو خراب کرے اور وہ میدان جنگ سے واپس پیرکوں میں بھیج دیا جائے۔ ان کی

بجسی کا ایک مشہور ماہر بقول تھا کہ ”ہم زمانہ امن میں جنگ کرتے ہیں اور زمانہ جنگ میں اپنی کی ہوئی جنگ کا نتیجہ لیتے ہیں۔“ ابھی وہ مزید جنگ کرنا چاہتا تھا۔

☆ ☆ ☆

(”جنت کے سچے“ ایک فرضی داستان ہے مگر جیل کے دوران تشدد کے مختلف طریقے بونہاں، ہان، کیتے گئے ہیں وہ بالکل درست اور حقیقت پر مبنی ہیں۔ یہ چند واقعات ابوجناح، ابووقار کی کتاب ”غازی“ میں بیان کی گئی تھی داستان جو سلیم نامی ایک حقیقی جاسوس کی داستان ہے سے متاثر ہو کر لکھے گئے ہیں، جس کے لیے ہم اس کتاب کے لکھاریوں کے احسان مند ہیں، اور سر سلیم کے ایصال ثواب اور مغفرت کے لیے دعا گو ہیں۔)

☆ ☆ ☆

مگر اس جنگ اور قید نے اسے ایک مختلف انسان بنا دیا تھا۔ جہاں ایک طرف وہ اسپتالوں میں رہا رہا تھا، Reliabile Under Torture (ریلیابل انڈر ٹورچر) کی ڈگری میں آ گیا تھا، وہاں دوسری طرف اس کے اندر بہت کچھ مگر گیا تھا۔ وہ جو ایک فیملی بنانے کی، ایک حسین لڑکی سے شادی کر کے اپنے بچوں کی خوشیاں دیکھنے کی خواہش ہوتی ہے، وہ خواہش مگر تھی۔ وہ دنیا سے بے اعتبار ہو چکا تھا۔ اس کے اندر اتنی ہی بس چکی تھی کہ اب وہ ایک فیملی میں نہیں رہا تھا۔ وہ بس ایک ایجنٹ تھا۔ یہی اس کی زندگی، اس کی محبت، اس کی فیملی تھی۔ جب حکومت نے لاکھوں روپے خرچ کر کے اس کو ملک کی خدمت کے قابل بنایا تھا تو یہ بہتر تھا کہ وہ یہی کام کرے۔ ماموسوں سے بغض و عناد، انتقام لینے کی خواہش، سب جیل نے نکل لیا تھا۔ اگر کچھ بچا تھا تو وہی ایک احساس کمتری جو ماموس کا سامنا کرنے کا سوچ کر اسے ہمیشہ محسوس ہوتا تھا۔ بس، پورے کچھ نہیں۔

رہائی کے کچھ عرصے بعد وہ می کے پاس تری گیا تو ایک اچھی خبر اس کی منتظر تھی۔ می نے اپنی جمع پونجی ملا کر جہانگیر والا گھر سے خرید لیا تھا۔ دادا کا بنایا گھر، ان کا اپنا گھر۔ مگر اب اس کو اس گھر نے بھی بہت زیادہ خوشی نہیں دی۔ وہ تو بس ایک خواہش تھی، پوری ہو گئی۔

قریباً تین برس قبل وہ اپنے ترک پس منظر کے باعث تری بھیجا گیا وہاں وہ دو کورز کے ساتھ رہ رہا تھا۔ ایک اپنی پاکستانی شناخت ”جہان سکندر“ اور دوسری ایک انڈین شناخت ”عبدالرحمن پاشا“

اپنے کام کے سلسلے میں آج کل وہ اسلام آباد پولس آیا ہوا تھا اور می کے مسلسل زور دینے پر وہ بلا خراموں کے گھر جانے کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ ہوٹل میں اپنی منگودہ کو اتفاقاً دیکھ لینے کے بعد اس کا علاوہ مزید ڈول ہو گیا تھا اور بعد میں بھی شاید وہ ماموسوں سے ملنے کی کوشش کرتا مگر وہ لڑکی استنبول آ رہی تھی، یہ خیال اسے پریشان کرنے کے لیے کافی تھا۔ اسے کچھ نہ کچھ یاد آ کر تھا جس سے وہ اس لڑکی کو روک پائے مگر کیا، یہ ابھی اسے طے نہ تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ مینس کی ٹوٹی ہوئی جھکا چہرے پر پانی کے چھینے ڈال رہا تھا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ مکروہ صورت اس کی جلد سے ہر نشان چھوڑ کر چکی ہے تو اس نے چہرہ اٹھا کر ہاتھ مردم کے آئینے میں دیکھا۔ ماتھے پر سامنے کو گرتے اس کے گہرے بھورے بال گیلے اور منہ دھلا دھلا ہوا چمکا تھا۔ اس نے اسٹینڈ سے ٹکٹا تولیہ اتار اور چہرے کو گڑتا باہر آیا۔

لاؤنج میں بی وی چل رہا تھا۔ اس کا لیپ ٹاپ بھی آن پڑا تھا۔ صوفے پر بیٹھے ہوئے اس نے تولیہ ایک طرف ڈالا، پھر لیپ ٹاپ گود میں رکھتے ہوئے اپنا موبائل نکالا۔ اسے می کو لون کرنا تھا۔

دوسری جانب گھنٹی جاری تھی۔ وہ منتظر اسے سنا گیا۔ ذہن کے پردوں پر آج کے واقعات پھر سے چلنے لگے تھے۔

گذشتہ رات ماموسوں کے گھر سے نکلے ہوئے اس کے ذہن میں ایک لاکھ لاکھ تفصیل پارہا تھا۔ جو آخری چیز وہ اپنی مشکل زندگی میں نہیں چاہتا تھا، وہ اپنی بیوی کا اس شہر میں آ کر رہنا تھا، جہاں وہ پہلے ہی ایک مقیم ایجنٹ کی حیثیت سے روزنہ گیارہ گز رہا تھا۔ اب اسے کسی طرح اس لڑکی کو روکنا تھا۔ جب اس نے بکن میں سفید پھول رکھے تھے تو اس کے ذہن میں مکمل لاکھ لاکھ نہیں تھا مگر پھر بھی وہ جاتے وقت اس کی کار پاپک، جی بی ایس ٹریس چسپاں کر آیا تھا۔ وہاں کھڑی دو گاڑیوں میں سے چھوٹی ولی پتینا ہی تھی۔ وہ اس لڑکی نے نظر رکھنا چاہتا تھا اور آج کل اس کے پاس اتنا ڈھیر سارا وقت تھا کہ وہ اسے نظر رکھ سکے اور پتا نہیں کیوں، جب بھی وہ اس کے بارے میں سوچتا اس کو وہ لڑکی کے نام سے ہی سوچتا تھا اس کا نام نہیں لیا کرتا تھا۔ کچھ تھا، جو اسے پسند نہیں آ رہا تھا۔

وہ امریکی سفارت خانے کی سینڈ سیکر ٹری کی وجہ سے آج کل لاہر تھا۔ وہ بھارتی نرملہ لائبریری شہری تھی اور اس کی پاکستان سے دو ماہ بعد روانگی تھی۔ جہاں کی دلچسپی کی بات تھی کہ اس کی اگلی پوسٹنگ استنبول میں امریکی سفارت خانے میں ہو رہی تھی۔ اگر اس تک رسائی حاصل کر لے تو استنبول میں اس کے بہت سے کام آسان ہو سکتے تھے۔ مسئلہ بس اتنا تھا کہ وہ اس کی کار تک بھی رسائی حاصل نہیں کر پا رہا تھا۔ وہ اپنی کار کا شیشہ صرف اور صرف کسی خوبصورت اہمکار کے لیے کھلتی تھی کیونکہ اسے خوبصورتی کی بددعا سے ڈر لگتا تھا۔ غالباً خاندانی وہم تھا، جسے وہ آفیسر امریکا میں اسے برس رہنے کے بعد بھی نہیں ختم کر سکتی تھی۔ صرف اس کی کار کے انتظار میں اب اسے روز شام میں خوبصورتی کا روپ دھار کر ان راستوں پر پھرنا تھا جہاں سے وہ گزرتی تھی۔

کسی دوسرے کے لیے شاید یہ بہت عجیب بات ہو، مگر اس کے لیے نہیں تھی۔ اس کے نزدیک خواجہ سرا بننا بالکل ایسے تھا، جیسے کسی ڈاکٹر کے لیے مکمل سفید آؤر آل کی بجائے آف وائٹ اور آل پہننا۔ ایسی تبدیلی جو محسوس ہوتی نہ ہی بری لگتی۔ اپنے کیریئر کے دوران وہ اتنا کچھ بن چکا تھا کہ بہت عرصہ ہوا وہ جس ہی ختم ہو چکی تھی جو عجیب و غریب حلیے کا احساس دلاتی۔

اپنے ذاتی کاموں کے لیے البتہ ایسے حلیے اس نے کبھی نہیں بدلے تھے، لیکن اب اس کی زندگی ذاتی رہی ہی نہیں تھی۔ اگر آج وہ حیا کی گاڑی کو ٹریس کر کے اس سے ملنے گیا تھا، تب بھی اس کے ذہن میں اپنی اسی ”جعلی“ زندگی کی فکر تھی جو وہ استنبول میں گزار رہا تھا۔ وہ آنکس کریم پارلر جہاں وہ اس لڑکی کی گاڑی کی موجودگی کا علم ہونے کے باعث آیا تھا، اس جگہ سے زیادہ دور نہ تھا، جہاں آج کل اس کی ڈیوٹی تھی۔ وہاں خواجہ سرا اکثر نظر آتے تھے، اور اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ ان میں سے شاید ہی کوئی اصلی خواجہ سرا ہو۔ آدھے پروفیشنل اور باقی آدھے خفیہ والے ہوتے تھے، جو ایسے روپ دھار کر حساس جگہوں کی نگرانی کیا کرتے تھے۔

وہ اس لڑکی کو تریس جانے سے روکنا چاہتا تھا اور کل تک تو وہ اس سے ملنا بھی نہیں چاہتا تھا، مگر آج پتا نہیں کیوں، اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ اس سے بات کرے۔ وہ اسے کبھی نہیں پہچان سکتی۔ اسے یقین تھا وہ کیا، مگر ابھی اسے اس حلیے میں نہیں پہچان سکتی تھیں۔

اس روز اس لڑکی نے ہلکے آسمانی رنگ کا لباس پہن رکھا تھا۔ بال حسب معمول کھلے تھے۔ وہ سلسل پیتے ہوئے سوچ میں گم، غائبانہ شیشہ بند کرنا بھول گئی تھی۔ وہ اس کے شیشے پہ جھکا تو وہ چونک گئی اور پھر اس نے اس کے سفید، گلابی چہرے کو خوفزدہ ہوتے دیکھا۔ تمام تر گھبراہٹ کے باوجود اس نے ٹھنڈا ٹھار سلسل جہاں کے منہ پہ الٹ دیا۔ تب وہ پیچھے ہوا تھا۔ اسے سلسل نے پیچھے نہیں دھکیلا تھا، بلکہ اس کی جرأت پہ وہ حیران ہوا تھا۔ گذشتہ روز اگر اسے لگا تھا کہ وہ کوئی بہت ہی نازک سی لڑکی ہے، تو ایسا نہیں تھا۔ وہ کافی بڑا اعتماد اور ایک دم سے رد عمل ظاہر کر دینے والی لڑکی تھی۔ چلو، کوئی تو اچھی بات تھی۔

وہ وہاں سے سیدھا اپنے اپارٹمنٹ آیا تھا اور اب حلیہ ٹھیک کر کے می کو فون کر رہا تھا۔ می نے فون اٹھاتے ہی سب سے پہلے وہی پوچھا جس کی اسے توقع تھی۔

”تم ماموں سے ملنے گئے تھے؟“

”جی، ہم۔۔۔۔۔“

”ابھی میری سائنہ بھی مجھ سے بات ہوئی ہے، انہوں نے تو نہیں بتایا۔“ وہ حیران ہوئیں۔

”آپ دو منٹ تسلی سے میری بات سنیں گی؟“ پورے دو منٹ اس کی بات تسلی سے سن لینے کے بعد بھی می بولی تھیں۔

”تم آج چلے جاؤ، آج فرقان بھائی کے گھرات میں کھانا بھی ہے۔ سب اکٹھے ہوں گے۔ تم ان سے ایک دفعہ مل لو، پھر بعد میں حیا کو اعتماد میں لے کر بتا دینا۔ بات ختم۔“

اور اس کے جوابات میں آیا، اٹھا کر میرے اوپر دے مارنا ہے۔ اس نے بے اختیار سوچا تھا، پھر چند منٹ لگے اسے می کو راضی کرنے میں اور بمشکل وہ اس بات پہ متفق ہوئیں کہ ابھی ماموں سے ملنے کے بجائے بہتر ہے کہ پہلے وہ ماموں کی بیٹی سے ملے، ہو سکے تو اسے روک دے اور اگر اس کے رکنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی اور وہ پانچ ماہ کے لیے استنبول آ رہی ہے، تو پھر اسے ان لوگوں کو اپنے بارے میں آگاہی نہیں دینی چاہیے۔ یہ اس کی جاب کے اصول کے خلاف تھا۔ اسے ترکی میں اپنے ارد گرد کو کوئی ایسا شخص چاہیے تھا جو اس بات سے واقف ہو کہ اس کا نام عبدالرحمن پاشا نہیں، یا جہان سکندر نہیں، بلکہ میجر جہان سکندر احمد ہے۔ اس نچ پہ کچھ کر می راضی ہو گئیں۔

”ٹھیک ہے، تم کرو جو تم کرنا چاہتے ہو میں انہیں نہیں بتاؤں گی کہ تم اسلام آباد میں ہو۔“ وہ خوش نہیں تھیں مگر خفا بھی نہیں تھیں۔ اس نے سکون کی گہری سانس اٹھ لی تھی۔ اب اس کے پاس اپنے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرنے کے لیے چند روز تھے۔

فون بند کرنے کے بعد وہ فوراً اٹھا اور اپارٹمنٹ مقفل کر کے باہر آیا۔ می نے فرقان ماموں کے گھر پہلی دنز کا بتایا تھا۔ اگر وہ یہی بات کارڈ پہ لکھ کر ایک روز برائی تاریخ کے مہرزہ لفافے میں ڈال کر گلاب کے پھولوں کے ہمراہ اس کے گھر دے آئے تو یقیناً وہ اس کی توجہ پالینے میں کامیاب ہو جائے گا۔ اس کے بعد ہی وہ اس کی کوئی بات سنے گی۔

آج بھی وہ اسی پھول والے کے پاس آیا تھا، اور آج بھی اس کے پاس سرخ گلاب نہیں تھے۔ اس نے دل ہی دل میں پھول والے اور سرخ گلاب، دونوں پہ لعنت بھیجتے ہوئے سفید گلاب خرید لیے۔ بار بار وہ موبائل پہ اپنے ٹریسر کا اسٹیشن چیک کرتا تھا۔ اس کی کار ابھی تک گھر

اپنی مصروفیات میں سے اس لڑکی کے لیے وقت نکالنا ایک دم ہی اسے بہت دلچسپ لگنے لگا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ دواور کی مہندی کی دو پہر تھی۔ جب می کا فون آیا۔ وہ اس وقت آفس سے نکل رہا تھا، یہاں سے اسے اپنی وہ کار لینے جانا تھا، جو اس اسلام آباد میں استعمال کرنی تھی۔ می کا نمبر اسکرین پر چلا، سمجھا دیکھ کر وہ ذرا چونکا۔ شاید می نے ذہن بدل لیا تھا، ورنہ وہ اس طرح اچانک کال نہیں کرتی تھیں، ماسوائے ہنگامی صورت حال کے۔

”بہی می! خیریت؟“ اپنے دفتر کی مین بلڈنگ سے دور ہٹ کر سڑک کنارے چلتے وہ ان سے بات کرنے لگا۔
”تم آج جا کر ماموں سے مل لو۔“

وہی ڈھاکہ کے تین پات، وہ جی بھر کر سہ زار ہوا۔

”می! کل رات ہم نے کس بات پہ اتفاق کیا تھا، آپ بھول گئیں؟“

”جہان! میری بات سنو۔ مجھے خدشہ ہے کہ سلیمان بھائی حیا کی شادی کہیں اور نہ کر دیں۔“

”تو کر دیں!“ وہ یہ نہ کہہ سکا، گو کہ وہ یہی کہنا چاہتا تھا مگر جب بولا تو آواز میں پتائیں کہاں سے خفگی درآئی تھی۔

”وہ اس طرح کیسے کر سکتے ہیں کسی اور سے اس کی شادی؟ ہمارا نکاح ہوا تھا، ممکن نہیں جو وہ اپنی مرضی سے توڑ دیں۔“

”وہ خلع بھی لے سکتے ہیں اور تم جانتے ہو ایک دو پیشیوں میں فیصلہ ہو جایا کرتا ہے بچپن کے نکاح کا اور اگر انہوں نے ایسا کیا تو اس کے ذمے دار ہم ہوں گے۔“

”از روہ خود کسی چیز کے ذمے دار نہیں ہیں؟“

”جہان سکندر! میں نے تمہاری پرورش اس منقسم مزاج سوچ کے ساتھ تو نہیں کی تھی۔“ انہیں جیسے دکھ ہوا تھا۔ وہ فوراً نام ہوا۔

”اچھا، آئی ایم سوری۔ میرا مطلب تھا کہ اگر ہم اس رشتے پہ خاموش ہیں تو بات وہ بھی نہیں کرتے۔“

”وہ بیٹی والے ہو کر کیسے خود سے بات کریں؟ کیسے کہیں کہ ہماری بیٹی کو رخصت کروا کر لے جاؤ؟ ایسے اپنی بیٹی کو کوئی ہلکا نہیں کرتا۔“

”ہاں، میرے ماموں کا غرور اور اتنا.....“ اوہرمی کہہ رہی تھیں۔

”وہ ہماری طرف سے مایوس ہو چکے ہیں، اسی لیے سلیمان بھائی حیا کے لیے آنے والے رشتوں پہ غور کر رہے ہیں۔“ وہ ایک دم

بالکل چپ ہو گیا۔

”آپ کو کس نے کہا یہ؟“ یہ تو طے تھا کہ وہ بلا تحقیق کسی بات پہ یقین نہیں کر سکتا تھا۔

”صائمہ بھابی نے ابھی فون کر کے بتایا ہے۔ ان کے بقول سلیمان بھائی کو ہمارا انتظار بھی نہیں ہے۔ انہوں نے فرقان بھائی سے

خود کہا ہے کہ ان کے کسی دوست نے اپنے بیٹے کے لیے حیا کا رشتہ بھجوا دیا ہے اور آج وہ فرقان بھائی کو اس لڑکی سے ملوائیں گے۔ شاید ان کے کسی

برنس پارٹنر کا بیٹا ہے، باہر سے پڑھ کر ابھی آیا ہے فرقان بھائی نہیں ملے ابھی اس سے۔“

وہ بالکل خاموشی سے سنتا رہا۔ اسے یہ سب بہت بُرا لگ رہا تھا۔ کیوں، وہ خود سمجھنے سے قاصر تھا۔

”تم آج چلے جاؤ۔ میں اس رشتے کو توڑنا نہیں چاہتی جہان!“ وہ بے بسی سے کہہ رہی تھیں۔

”جب وہ لوگ مجھے بے حد غیر اہم سمجھ کر میرے منتظر ہی نہیں ہیں تو کیا فائدہ جانے کا؟“

”بھابی بتا رہی تھیں، حیا ہمارا چوہر ہی تھی۔ اسے انتظار ہوگا۔“

”کیوں؟ وہ بے اختیار کہہ اٹھا۔“

”لڑکیوں کے دل بہت نازک ہوتے ہیں بیٹا! میں کبھی کبھی خود کو اپنی جتنی کی مجرم سمجھتی ہوں۔“

”آپ پریشان نہ ہوں، میں یہ رشتہ نہیں ٹوٹنے دوں گا۔“

”یعنی تم جارہے ہو؟“ وہ جیسے کھل اٹھیں۔

”اب یہ بھی نہیں کہا تھا میں نے۔ بس آپ مجھ پہ بھروسہ رکھیں، میں سب فکس کر لوں گا۔“

اور می خاموش ہو گئیں ان کو شاید اس کی اس قابلیت پر بھروسہ تھا کہ وہ اپنے ارد گرد موجود ہر خراب چیز کو کھس کر لیا کرتا تھا۔ رشتوں اور چیزوں میں فرق ہوتا ہے۔ شاید می نے یہ بھی سوچا ہو۔

آج اس کو دیکھتے ہی بھول والے لڑکے کا چہرہ جگمگا اٹھا۔

”صاب! آج سرخ گلاب بہت سارے ہیں۔“

”مگر مجھے سفید ہی چاہئیں۔“ اس نے بڑھکے ہوئے دھوکہ انداز میں سنجیدگی سے کہا۔ لڑکے کا چہرہ جیسے اتر سا گیا، مگر پھر بھی وہ

جلدی جلدی سفید گلابوں کو اکٹھا کرنے لگا۔

سفید گلاب بے شک بہت سے لوگوں کے نزدیک دشمنی کی علامت تھے مگر بہت سے اسے امن اور صلح کی نشانی ہی گردانتے تھے۔

وہ آج ان کے گھر کے اندر نہیں گیا، بلکہ ان کے گھر کے مقابل ایک زیر تعمیر بنگلے میں چلا آیا۔

سرے، اینٹیں، آدھی بنی دیواریں، وہ گھر رات کے وقت ویران پڑا تھا۔ مزدور وغیرہ کب کے جا چکے تھے اور اب وہاں اوپری منزل کے کمرے میں بیٹھ کر با آسانی سامنے سلیمان ماموں کے گھر کے کھلے گیٹ سے سب دیکھ سکتا تھا۔

مہندی کا فنکشن دونوں گھروں کے قریب ہی ایک کھلے پلاٹ میں شان داری قاتیں لگا کر کیا گیا تھا۔ اسے تقریب میں کوئی دلچسپی نہیں تھی، وہ صرف سلیمان ماموں کے کھلے گیٹ کو دیکھ رہا تھا جہاں بہت سے لوگ آ جا رہے تھے۔ خواتین کی تیاری اور الٹے سیدھے فیشن! وہ روایات اور قد ریں جن کا ذکر می اکثر کیا کرتی تھی، وہ اسے اپنے خیال کی خواتین میں کہیں نظر نہیں آئی تھیں۔ دوا کی بہن تو شاید باقاعدہ اسکراف لیا کرتی تھی مگر وہ بھی اسے سلور لیٹنگ میں بناسر ڈھکے ادھر ادھر پھرتی نظر آ رہی تھی۔ پتا نہیں کیوں شادیوں پر لوگ سب بھلا دیتے ہیں؟ اسے افسوس ہو رہا تھا۔

بہت دیر بعد جہاں نے بلا خراسے دیکھ ہی لیا۔ وہ اپنی می کے عقب میں چلتی برآمدے سے اترتی ڈرائیو سے نکل آ رہی تھی، جہاں

سلیمان ماموں ایک فیملی کے ہمراہ کھڑے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ وہ واقعی بہت خوب صورت تھی۔ سنہرا الہنگا اور ریکا اسے مزید حسین بنارہا تھا مگر وہ اسے پھر بھی ”مرہ جیلہ“ نہیں لگتی تھی۔

سلیمان ماموں اب اس کا تعارف ان لوگوں سے کروا رہے تھے جو ان کے ساتھ کھڑے تھے۔ صاحب، خاتون، اور غالباً ان کا بیٹا۔

اس نے اپنے سیل فون میں دور میں کالیں نکالا اور ان کو فوکس کیا۔ اب وہ ان کے چہرے صاف دیکھ سکتا تھا۔ وہ تینوں مہمان بہت دلچسپی سے اسے دیکھ رہے تھے، بالخصوص ان کا بیٹا۔ اس کی نظریں تو بہت ہی..... اسے پتا نہیں کیوں پھر سے غصہ آنے لگا اور تب ہی اس نے حیا کے چہرے کی جوت کو ماند پڑے دیکھا۔ وہ خوش نہیں لگ رہی تھی۔ ذرا سی دیر میں ہی وہ ان کے پاس سے ہٹ آئی۔ گیٹ سے باہر آ کر اس نے انگلی کی نوک سے آنکھ کا کنارہ صاف کیا۔

اس نے موبائل کے مٹن کو چند ایک دفعہ دبایا۔ وہ اس کی تصویر لینا چاہتا تھا۔ وہ اس کی کوئی تصویر اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا۔ وہ ان لوگوں سے مل کر خوش نہیں تھی شاید یہی وہ رشتے والے تھے، جن سے آج سلیمان ماموں نے نرقان ماموں سے ملوانا تھا۔ وہ اس پر خوش اس لیے نہیں تھی کہ یہ رشتہ اس کے لیے ان چاہتا تھا۔

دل کے کسی کو نے میں اسے ایک گونہ اطمینان سا نصیب ہوا۔ جیسے تسلی سی ملی ہو، جیسے ڈھارس سی بندھ گئی ہو، وہ اب پہلے جتنا ناخوش

نہیں تھا۔

وہ بہت دیر ادھر ہی بیٹھا رہا۔ اسے فنکشن دیکھنے کی آرزو نہ تھی، بس وہ اس کی واپسی کے انتظار میں وہیں موجود تھا۔ وہ اسے ایک دفعہ

پھر دیکھنا چاہتا تھا۔ کافی دیر گزری، تب وہ اسے واپس آتی دکھائی دی۔ وہ گھر کے اندر جا رہی تھی۔ کیا اسے اس سے ملنا چاہیے؟ یا اس کے ترکی آنے کا انتظار کرے؟ وہ یہی سوچ رہا تھا جب اس کا فون بجا۔

اس نے سیل فون کی اسکرین کو دیکھا، پھر بے اختیار چونکا۔ یہ اس کی ترکی والی وہ تم تھی جو پوسٹ پیڈ تھی اور کبھی اس کے اور کبھی می کے

زیر استعمال رہتی تھی۔ یہ نمبر ماموں کے پاس تھا اور اس میں ماموں کا نمبر محفوظ بھی تھا اور اب اس نمبر سے کال آ رہی تھی۔ ماموں کے گھر سے کال؟ وہ لمبے بھر کو گڑبڑا سا گیا۔

مگر اس نے فون اٹھا لیا چونکہ یہ ترک نمبر تھا اس لیے وہ ایک ہی لمحے میں خود کو ترکی لے گیا۔ ایک پیشہ ور ایجنٹ ہونے کے ناطے اس کو

یہ ظاہر نہیں کرنا تھا کہ وہ ترکی سے باہر ہے اور اس کا نمبر روٹنگ ہے۔

وہ حقیقی، ناقابل یقین..... اور وہ می کا پوچھ رہی تھی۔ وہ ان کی منتظر تھی، مہی ٹھیک کہتی تھیں۔ اس سب کے باوجود جب وہ بات کرنے لگا تو اس کا لہجہ خشک ہی تھا۔ وہ اتنی جلدی کسی کے ساتھ زنی سے یا کھل کر بات نہیں کرتا تھا اور اس کو تو وہ ویسے بھی کوئی امید نہیں دلانا چاہتا تھا۔ پھر بھی، جب بات کے اختتام پہ اس نے حیا کی آواز کو بھیجتے ہوئے سنا تو اس کا دل کھٹکا۔

فون بند کرتے ہی اس نے وہ خط کا لافہ نکالا جو وہ پھولوں کے ساتھ رکھنے کے لیے لایا تھا۔ ابھی اندر موجود سفید موٹے کاغذ پہ اس نے لکھا نہیں تھا اور اب اسے معلوم تھا کہ اس کو کیا لکھنا ہے۔

”اس لڑکی کے نام جو کبھی کسی ان چاہے رشتے کے بننے کے خوف سے روتی ہے، تو کبھی کسی بن چکے ان چاہے رشتے کے ٹوٹنے کے خوف سے۔“

یہ آخری بات محض اس کا گمان تھا، مگر کیا پتا صحیح بھی ہو۔ اس نے بی کیپ سر پہ لی اور مفلگر کردن کے گرد یوں لپیٹا کہ اگر اب وہ خود کو کوریئر سروس میں کہہ کر گھر کے کسی ملازم کے حوالے وہ پھول کرے تو کل کودن کی روشنی میں وہ اسے پہچان نہیں پائیں گے۔ پھول اور خط ایک ملازم کے حوالے کر کے وہ واپس چلا آیا۔ وہ صرف حیا کو چونکنا چاہتا تھا اور اسے امید تھی کہ اس کا مقصد پورا ہو جائے گا۔



وارد کی بارات کے روز اس کا قطعاً ارادہ نہ تھا کہ وہ آج بھی حیا کے لیے اصرار جائے گا۔ آج ویسے بھی اسے اپنے کام بہت تھے۔ سیکنڈ سیکریٹری تک رسائی وہ ابھی تک حاصل نہیں کر سکا تھا، مگر وہ جانتا تھا کہ یہ کام وقت طلب ہوتے ہیں۔ صبر، انتظار اور خاموشی، یہ تین چیزیں اس نے اپنی جاسوسی مہمات کے دوران سیکھی تھیں۔ آج بھی اس کا کام نہیں ہو سکا تھا اور وہ واپس گھر جا رہا تھا، مگر صرف آخری منٹ میں اس نے یونہی سرسری سالیمن ماموں کے گھر کا جائزہ لینے کا سوچا۔ معلوم نہیں وہ بار بار وہاں کیوں جاتا تھا۔

جب وہ ان کی گلی کے دہانے پہ پہنچا تو اس نے زن سے اپنے سامنے گزرتی گاڑی میں حیا کو دیکھا۔ وہ بے اختیار چونکا تھا۔ اس گاڑی میں اسے وہی کل والی فیملی نظر آئی تھی اور وہی بے باک لگا ہوں والا افضل انسان گاڑی چلا رہا تھا۔

آخر وہ ان کے ساتھ کیوں جا رہی تھی۔

وہ فارغ تھا، اگر نہ ہوتا تب بھی ان کے پیچھے ضرور جاتا۔ جو بھی تھا، وہ اس کی بیوی تھی اور وہ اس وقت کچھ ایسے لوگوں کے ساتھ تھی، جو اسے پہلی نظر میں ہی اچھے نہیں لگتے تھے۔ کل اسے وہ ان سے مل کر ناخوش لگی تھی، مگر آج وہ ان ہی کے ساتھ تھی۔ وہ کل غلط تھا یا آج؟ وہ یہی دیکھنا چاہتا تھا۔ اور جب اس نے میرج ہال کے ایک طرف حیا کو گاڑی سے اتر کر دوبارہ فرنٹ سیٹ پہ بیٹھتے دیکھا تو اسے دھچکا سا لگا تھا۔ وہ کیسے یوں کسی کے ساتھ بیٹھ سکتی تھی؟ کیا وہ ہر ایک کے ساتھ بیٹھ جانے والی لڑکی تھی؟ اسے شدید غصہ آیا تھا۔ ایک تو اس کا لباس، پھر وہ اتنا میک اپ کرتی تھی۔ اتنی تک سک سے تیار ہوتی تھی، اوپر سے رات کا وقت۔ اس کا دل چاہتا تھا وہ ابھی اس کو ہاتھ سے پکڑ کر اس آدمی کی کار سے نکال لے اور اگر اس نے وہ عجیب ساحلیہ نہ اپنایا ہوتا تو شاید وہ یہ کر بھی دیتا۔

جب وہ گاڑی سے نکلنا تھا تو فرانی پان بھی ساتھ ہی اٹھالیا جو اپنے اس گیٹ اپ کے ساتھ وہ رکھا کرتا تھا۔ کاملیٹ اس کے ہر ”کو“ میں نمایاں ہوتی تھی۔ اور جب اس نے اس نوجوان کے سر کے پچھلے حصے پہ فرانی پان مار کر اسے گرایا تو بھی اس کا غصہ کم نہیں ہوا تھا۔ اور وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا، کوئی حق نہیں جتا سکتا تھا، مگر وہ اس لڑکی کو گردن سے پکڑ کر میرج ہال کے دروازے تک چھوڑ سکتا تھا۔

اور یہ اس نے کیا۔ اپنے لباس کا وہ گھٹیا سے رنگ کا دوپٹا بھی اس پہ اچھال دیا مگر جب جانے لگا تو ایک دفعہ بہت سنگتی لگا ہوں سے اسے دیکھتے ہوئے اگر وہ بولا تو صرف ایک لفظ، جو اس کی زبان پہ آیا تھا۔ ”بے حیا۔“

ہاں وہ اسی قابل تھی۔ پچھلے دروازے میں اگر اس کے دل میں کوئی نرم گوشہ جاگا تھا تو اب وہ ختم ہو چکا تھا۔ جیسے کوئی دل سے اتر جاتا ہے، جیسے کسی کے بارے میں انسان شک و شبہ میں پڑ جاتا ہے۔ وہ اس وقت ایسا ہی محسوس کر رہا تھا۔

اب وہ اس سے نہیں ملنا چاہتا تھا اور اگر وہ اسے استنبول آنے سے روک سکا تو ضرور روک گا لیکن وہ ان کے گھر نہیں جائے گا۔ اس کا فیصلہ آسان ہو گیا تھا۔ ہر مشرقی مرد کی طرح اس کی بھی خواہش تھی کہ اس کی بیوی ہر کسی کی گاڑی میں بیٹھ جانے والی لڑکی نہ ہو اور آج جو اس نے دیکھا، اس سے نہ صرف وہ بدظن ہوا تھا بلکہ وہ اس لڑکی کے بارے میں شدید قسم کے شک و شبہ میں پڑ گیا تھا۔

یہ بھی تو ممکن تھا کہ وہ اس لڑکے کو پسند کرتی ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کی جرأت نے اسے بوکھلادیا ہو اور وہ فطری رد عمل کے تحت بھاگی ہو مگر کم از کم ایک بات واضح تھی کہ پسندنا پسندنا ایک طرف، مگر وہ کسی کو اپنے قریب آنے نہیں دیتی تھی۔ لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے اس لڑکے کے والد کے رشتہ پیچھے سے حیا کی رضا شامل ہو اور اسی لیے وہ جہان یامی کی آمد کا پوچھ رہی تھی تاکہ جلد از جلد یہ رشتہ منطقی انجام تک پہنچ جائے اور وہ اپنی مرضی سے کسی اور سے شادی کر سکے۔

”لعنت ہے مجھ پر جو میں نے سلیمان ماموں کی بیٹی اور فرقان ماموں کی بیٹی سے اچھی امید رکھی۔“

دل میں آئے بغض کو ختم کرنے کے لیے اسے بہت سادقت چاہیے تھا۔ وہ ایسا آدمی نہیں تھا کہ چند گھنٹوں بعد غمناک ہو کر سوچنے پہ دل صاف کر لے۔ برسوں اس نے اس دنیا میں کام کیا تھا، جہاں ہر شخص کے دوسے زیادہ چہرے ہوتے تھے۔ دوسرے انسانوں پر سے اعتبار تو وہ بہت پہلے کھو چکا تھا، اب اپنی بیوی پر سے بھی کھو دیا تھا۔ اچھا ہی ہوا کہ وہ ماموں سے ملنے نہیں گیا۔ امید دلائے بغیر رشتہ ختم کرنا زیادہ بہتر تھا۔ بس چند دن وہ اس لڑکی پر مزید نظر رکھے گا۔ آخر اسے مئی کو اس رشتے کو توڑنے کے لیے ٹھوس وجوہات بھی تو دینی تھیں۔

ایک دفعہ پھر وہ اپنی سوچ میں ”حیا“ سے واپس ”اس لڑکی“ تک آ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ نو جوان جس کے ساتھ اس نے اس لڑکی کو بیٹھے دیکھا تھا اور بعد ازاں اسے فرائی پان بھی دے مارا تھا وہ اس کے ذہن سے نکل نہیں پار تھا۔ اگلے کچھ دن وہ بہت مصروف رہا اور اسے اپنے ماموں کے گھر کے قریب سے بھی گزرنے کا وقت نہ ملا لیکن شک کا جو کھکا اس کے دل میں پڑ گیا تھا، اس کی تصدیق کے لیے اس نے حیا کے ای میل ایڈریس پر ”کلون“ لگا دیا تھا (اس کا ای میل ایڈریس مئی نے رجیل سے لے کر دیا تھا اسے) اس کلون ہیکر کے باعث اس ای میل ایڈریس میں جیسے ہی کوئی میل آتی یا باہر جاتی تو اگلے ہی سینڈ وہ اسے اپنے فون پر موصول ہو جاتی۔ وہ اس لڑکے کا نام نہیں جانتا تھا اور اتنا وقت بھی نہ تھا کہ اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنا پھرے۔ اسے بس یہی معلوم کرنا تھا کہ اس کی منکوحہ کسی اور کے ساتھ وابستہ تو نہیں۔ اگر ہے تو بہت اچھا، کوئی ٹھوس چیز اس کے ہاتھ لگ جائے پھر مئی کو راضی کر لے گا۔ ابھی تک اسے کوئی خاطر خواہ کامیابی نہیں ملی تھی، مگر اس کا تذبذب بہر حال ختم نہیں ہوا تھا۔

داور کی شادی کو آٹھ دن گزر چکے تھے۔ اس سہ پہر جب وہ اپنے اپارٹمنٹ کا لاک کھول رہا تھا، اس کا موبائل بجا۔ دروازہ احتیاط سے کھولا اس کا کھول کر اندر داخل ہوتے ہوئے اس نے آنے والا پیغام کھولا۔ وہ حیا کی ایک ای میل کی کاپی تھی، جو اس نے ابھی ابھی بھیجی تھی۔ دروازہ دوبارہ اندر سے لاک کرتے ہوئے جہان نے موبائل کی اسکرین پر چمکتا پیغام پڑھا۔

”ڈیٹیل رسپانس سینفر فار سائبر کرائم، اس نے اچنبھے سے اس ایڈریس کو دیکھا جس کو ای میل بھیجی گئی تھی۔ اس کو کیا ضرورت پڑ گئی جابر کرائم ہیل کھیل کرنے کی؟

میل میں ایک ویب سائٹ پر کسی ویڈیو کا پتا لکھا تھا اور ساتھ میں ایک مختصر سی شکایت تھی، جس کے مطابق اس کے کزن کی مہندی کی تقریب جو کہ چند روز قبل منعقد ہوئی تھی، کی کوئی فیملی ویڈیو انٹرنیٹ پر ڈال دی گئی تھی۔ وہ اس کے خلاف پرائیویسی ایکٹ کے تحت شکایت کر رہی تھی کہ اسے فوری طور پر ہٹایا جائے۔

جہان نے ویڈیو کے پتے کو چھوا، مگر بہت بھاری ہونے یا نیٹ کی رفتار کم ہونے کے باعث کھل نہ سکی۔

خبر ویڈیو بعد میں دیکھ لے گا، ابھی اسے اس کی مدد کرنی چاہیے۔ یہ تو طے تھا کہ جس سائبر کرائم میل سے اس نے رجوع کیا تھا، وہ ایک غیر فوجی ایجنسی کا میل تھا اور وہ میل کا جواب تین چار دن بعد ہی دیا کرتے تھے اور ان کا طریقہ کار ذرا پیچیدہ تھا۔ وہ پہلے شکایتی فارم بھیجتے، جو ایف آئی آر کے مترادف ہوتا اور پھر ایک دفعہ بیان لینے کے لیے ایجنسی کے تھانے ضرور بلایا کرتے تھے۔ اب یہ خاندانی لڑکیاں کدھر تھانے کچہری کے چکر کا قاتی پھریں گی، اس لیے اسے کچھ کرنا چاہیے۔ اس سے لاکھ گلے شکوؤں کے باوجود وہ اس کی مدد کرنا چاہتا تھا۔

مئی سے اس نے حیا کا موبائل نمبر بھی ای میل ایڈریس کے ساتھ لیا تھا۔ (مئی سے حیا کا کوئی خاص رابطہ تو نہ تھا، بس ایک دفعہ فاطمہ مائی نے حیا کے موبائل سے کال کیا تھا تو نمبر آ گیا) اس نے چند لمحوں سوچا اور پھر اپنے لینڈ لائن سے اس کا نمبر ڈائل کیا۔ یہ سرکاری فون تھا، اس کا نمبر کسی سی ای ایل آئی نہیں آتا تھا۔ صرف ”پرائیویٹ نمبر“ لکھا آتا تھا۔

آواز بدلنا کبھی بھی اس کے لیے مسئلہ نہیں رہا تھا۔ ان کو اس چیز کی بہت اچھی تربیت دی جاتی تھی، مگر صرف آواز بدلنے میں

غلطی کا، یا پکڑے جانے کا احتمال کافی زیادہ تھا۔ اس لیے اس نے Voice changing application بھی آن کر دی۔ یہ خود کار نظام اس کے لبوں سے نکلے ہر لفظ کو ریکارڈ کے دسویں حصے بعد جیا کی سماعت تک ایک مختلف مردانہ آواز میں پہنچاتا تھا۔

جب وہ اس سے مخاطب ہوا تو اس کی آواز دھیمی تھی۔ خوب صورت، مگر مدہم سا گمبیر پن لیے۔ صوفے پر نیم دراز ہوئے، وہ بہت اطمینان سے ایسی باتیں کر رہا تھا، جو اس لڑکی کو چونکانے کے لیے کافی تھیں۔ ویڈیو ہٹانے کا وعدہ لے کر اس نے وہی بات کہی جو سابقہ کرکٹ والے بھی لازماً کہتے..... ہمارے آفس آکر باقاعدہ رپورٹ کریں۔ اس بات پر وہ باقاعدہ شہنائی مانی پھر جلدی سے فون بند کر دیا۔ جہان نے قدرے اچنبھے سے ریسیور کو دیکھا۔ وہ اتنی گھبرائی ہوئی کیوں لگ رہی تھی؟ شاید مسئلہ سنگین تھا۔ اسے وہ ویڈیو دیکھ لیٹی چاہیے۔

قریباً دس منٹ بعد وہ اپنے ٹیپ ٹاپ پہ اس ویڈیو کو کھول رہا تھا۔ جیسے ہی صفحہ لوڈ ہوا اور ویڈیو کا نام جھلک گیا، وہ ایک دم چونک کر سیدھا ہوا۔ جیسے جیسے ویڈیو چلتی جا رہی تھی، اس کے چہرے کے تاثرات سخت ہوتے گئے۔ پیشانی کی رگیں تن گئیں اور آنکھوں میں شدید غصہ آ رہا۔

یہ تھا اس کے ماموں کا عزت دار خاندان؟ فرقان ماموں اور سلیمان ماموں کی عزت و عصمت والی بیٹیاں؟ وہ مکمل طور پر زنانہ فنکشن نہیں تھا۔ اسے پیچھے پس منظر میں ویڈیو زور ڈی بجے بھی نظر آ رہے تھے۔ وہ بھی تو مرد تھے۔ ان سے کوئی پردہ نہیں؟ کوئی شرم، لحاظ نہیں؟ کیسے لوگ تھے یہ؟ کیا ہو گیا تھا پاکستان کو؟

دکھ، طیش، استعجاب۔ ایک دم وہ بہت اپ سیٹ ہو گیا تھا۔ بے حد غصے سے اس نے لیپ ٹاپ بند کیا اور اٹھ کر کمرے میں بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ بیل میں گزر رہے وہ ایک ماہ وں دن اس کے اندر بہت کچھ بھر گئے تھے اور گو کہ وہ اس تلخی کو دبا گیا تھا، مگر ختم نہیں کر پایا تھا اور دبائے اور ختم کرنے میں خلیج بھر فرق ہوتا ہے۔

اسے اتنا غصہ تو اس لڑکی کو اس کاڑی میں بیٹھتے دیکھ کر بھی نہیں آیا تھا جتنا اس واہیات ویڈیو کو دیکھ کر آ رہا تھا۔ یہ لڑکی اس جیسے آدمی کے ساتھ تو کبھی خوش نہیں رہ سکتی تھی۔ وہ یہ نہیں سوچ رہا تھا کہ وہ بہت باکردار اور اچھا تھا۔ بس وہ دونوں دو مختلف طریقوں سے پروان چڑھنے والے دو مختلف انسان تھے۔ دریا کے دو کنارے اور اب تو وہ می کی خوشی کے لیے بھی اس کے ساتھ باقاعدہ شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اسے بچھتا ہوا کہ اس نے ”میراج احمد“ یعنی اپنا نام فون پہ کیوں بتایا۔ بہر حال اس غلطی کو وہ کور کر لے گا۔ وہ اسے معلوم نہیں ہونے دے گا کہ وہی میراج احمد ہے۔ یہ بعد کی بات تھی۔ ابھی مسئلہ اس کے اسرار شپ کا تھا۔ جب یہ طے تھا کہ وہ اس کے ساتھ رشتہ نہیں رکھنا چاہتا، تو پھر وہ کیوں اگلے پانچ ماہ استنبول میں اس کے لیے بلکان ہو؟ ممی کا خیال تھا کہ وہ آئے گی تو ان ہی کے پاس رہے گی۔ اس صورت میں تو اور بھی مسئلہ ہو گا کہ وہ استنبول میں دو شناختوں کے ساتھ رہا تھا۔ کبھی جہانگیر میں رہنا پڑتا تو کبھی بیوک ادا میں۔ اگر وہ دونوں بھی اس کے گھر رہی تو جان جائے گی کہ اس کی سرگرمیاں مشکوک ہیں۔ ایسے میں اس کے لیے خود کو چھپا کر رکھنا مشکل ہو جائے گا اور اب جب کہ اسے زندگی میں شامل نہیں کرنا تو پھر رازوں میں بھی شریک نہیں کرنا۔

وہ یہی بات بار بار سوچے جا رہا تھا۔



ان کے ہاں کام کرنے کے دو طریقے بتائے جاتے تھے۔ بالواسطہ اور بلاواسطہ۔ بلاواسطہ طریقہ وہ عموماً پہلے استعمال کرتا تھا، اگر وہ

ناکام ہو جائے تب بالواسطہ راستہ چننا جاتا۔

فی الحال وہ یہی چاہتا تھا کہ کسی طرح وہ لڑکی ترکی نہ آئے۔ اس کی وجہ اس نے اپنے آپ کو یہی بتائی کہ وہ یہ صرف اور صرف اپنی دوسری زندگی میں کوئی گڑبڑ ہونے سے بچاؤ کے لیے کر رہا ہے۔ وہ آئے گی اور پھر وہ اس سے ملے گی، اس سے امیدیں وابستہ کر لے گی یا شاید وہ طلاق لینا چاہے، اس صورت میں ممی ہرٹ ہوں گی، آف..... ان سارے مسئلوں سے بچنے کا ایک ہی طریقہ تھا۔ کچھ ایسا ہو جائے جس سے وہ رک جائے اور استنبول جانے کا پروگرام منسوخ کر دے۔

حماد اس کے آفیشل کام میں آج کل اس کی مدد کر رہا تھا۔ وہ اپنے ایکسیڈنٹ کے بعد لمبی چٹھی پہ تھا، اس لیے بہ آسانی اس کے ساتھ کام کر سکتا تھا۔ اس نے حماد سے مدد لینے کا سوچا۔

”دیکھو! میں صرف تمہاری تسلی کے لیے تمہاری مدد کرنے پہ تیار ہوں، ورنہ میرا ذاتی خیال ہے کہ تمہاری بیوی ترکی پڑھنے جا رہی ہے، تمہاری مگرانی کرنے نہیں۔ اس کو کبھی بھی تمہاری سرگرمیوں پہ شک نہیں ہوگا۔ تم ہر چیز ٹھیک سے سنبھالنا جانتے ہو۔

اصل بات یہ ہے کہ تم اس کو وہاں اپنے قریب نہیں دیکھنا چاہتے، تمہیں ڈر ہے کہ کہیں تم اس سے محبت نہ کرنے لگ جاؤ اور اس صورت میں تمہیں اپنے ماموں کے سامنے ہارنا پڑے گا۔ تمہارا دل اس رشتے کو رکھنے پہ راضی ہے، مگر دماغ جو آج بھی اپنے ماموں سے انتقام لینے کا خواہش مند ہے، خائف ہے کہ کہیں دل کے جذبات انا پہ حاوی نہ ہو جائیں۔ پھر بھی میں جو کر سکا، کروں گا۔“

حماد نے بہت اطمینان سے کہا تھا۔ جہاں تنگی سے سر جھٹک کر رہ گیا، جیسے اسے سچ سن کر بُرا لگا ہو۔ بہر حال، وجہ جو بھی ہو، وہ پاکستان سے روانگی سے قبل اس دروسر سے چھٹکارا چاہتا تھا۔ دوسری طرف اس نے وہ ویڈیو انٹرنیٹ پر ڈالنے والے کو بھی ٹریس کر لیا تھا۔ وہ وہی مودی میکر تھا جو مہندی کی تقریب کی ویڈیو بنانے وہاں گیا تھا اور یہ کام اس نے اپنے موبائل کے کیمرے کے ذریعے ایک ویڈیو سے لیا تھا۔ اس نے اپنی انجمنی کے سامبر کرائم ہیل والوں کے حوالے اس آڈیو کو کر دیا تھا، اور اس نے جس جس کو وہ ویڈیو دی تھی، وہ بھی نکلوا لی تھی۔ پھر بھی، اگر نیٹ پر سے کسی نے اسے اپنے کمپیوٹر میں محفوظ کر لیا ہو تو اس کا کوئی ریکارڈ نہ تھا۔ کہیں نہ کہیں تو وہ ویڈیو ضرور ہوگی۔ ساری دنیا سے تو وہ نہیں نکلوا سکتا تھا۔ بہر حال اس نے اس مودی میکر کے اکاؤنٹ کو اپنی دسترس میں لے لیا تھا۔ ویڈیو اس نے ہٹائی نہیں کہ ہٹانے کی صورت میں وہ لڑکی کبھی اس سے ملنے نہ آتی۔ مگر اس کا صفحہ ہلاک ضرور کر دیا، یوں کہ اس کے ماموں کے گھر کے ٹیکسٹر کے علاوہ وہ ملک میں کہیں بھی نہیں دیکھی جاسکتی تھی۔ اسے پورا یقین تھا کہ اپنی ویڈیو ہٹوانے کے لیے وہ اس کے پاس ضرور آئے گی۔

اگلے روز اس کو حماد کے ساتھ چار پانچ گھنٹے سڑک پہ میڈیم سیکنڈ سیکریٹری کی کار کے انتظار میں گزارنے تھے۔ وہ ایک ایسی مرکزی شاہراہ تھی جہاں ہر مل رش ہوتا تھا۔ اس کو وہ ہومی امید تھی کہ شاید وہ بھی یہاں سے گزرے۔ وہ عموماً ہر وقت باہر نکلتی ہوتی تھی۔ وہ گھر میں بیٹھنے والی لڑکیوں میں سے نہیں تھی۔

اس سڑک پر تو تیس گھر قریب میں ایک ذیلی سڑک پر وہ ایک ٹریفک جام میں ضرور پھنسی ہوئی تھی۔ جہاں اور حماد کا کام آج بھی نہیں ہو سکا تھا سو اس نے سوچا، وہ یہ دوسرا کام بننا ہی دے۔ پاکستان میں اس نے عورتوں کو اگر کسی شے سے بہت ڈرتے دیکھا تھا تو وہ خوبہ سرا کی بددعا تھی، بالخصوص سفر سے پہلے اگر خوبہ سرا بددعا دے دے تو اس بدشگونی کے بعد لوگ سفر ترک کر دیا کرتے تھے۔ وہ اس وقت بددعا کے اس اصل کو بھول جایا کرتے تھے کہ بددعا چاہے نیک آدمی دے، یا فاسق، چاہے معذرو دے یا صحت مند، وہ تب تک آپ کو نہیں لگ سکتی، جب تک آپ اس کے اہل نہ ہوں اور اگر آپ اس کے اہل نہ ہوں تو وہ دینے والے پہ پلٹ آتی ہے مگر اسے امید تھی کہ اس کی بیوی بھی ان ہی ضعیف العقیدہ لوگوں میں سے ہوگی جو خوبہ سرا کی بددعا سے ڈرتے تھے۔

وہ صرف پانچ منٹ اس کام کے لیے نکال سکتا تھا، اسے واپس جا کر رپورٹ کرنی تھی۔ مگر جب ان دونوں نے اسے متوجہ کیا تو وہ ایک دم اتنے غصے میں آگئی کہ ان کی کوئی بات سنی ہی نہیں۔ حماد تو جانے کون سی باتیں لے کر بیٹھ گیا۔ مگر وہ کچھ سننے پہ تیار نہ تھی۔ اس نے جیسے بھلا دیا تھا کہ ڈولی نے اس پہ کبھی کوئی احسان کیا تھا۔ وہ کوئی بات سننے پہ تیار ہی نہ تھی، بلکہ مسلسل ان کو ہٹنے اور جانے کا کہہ رہی تھی۔ یہاں تک ہوتا تو ٹھیک تھا، مگر وہی اس لڑکی کی ایک دم سے ری ایکٹ کر دینے کی عادت۔

اس نے حماد کی انگلیاں ٹٹھنے میں دے دیں۔

وہ ذرا سا زخم اتا تکلیف وہ نہ ہوتا، اگر حماد کا وہ ہاتھ فریکچر کے بعد اب تندرستی کی طرف نہ بڑھ رہا ہوتا۔ ایسے میں اس کی وجہ سے وہ ہاتھ زخمی ہوا۔ اسے شدید غصہ آیا۔ دوسری طرف اس کا دوسرا کام بھی نہیں ہو سکا تھا، ان دونوں باتوں پہ وہ شدید غصے کا شکار ہو رہا تھا۔

وہ اسے نہیں روک سکا۔ اسے اپنی یہ بے بسی غصہ دلاری تھی۔ اس رات وہ بہت دیر تک اس بارے میں سوچتا رہا تھا۔ وہ منظر جب وہ اس لڑکے کی کار میں بیٹھ رہی تھی اور وہ ویڈیو۔ وہ کبھی بھی فراموش نہیں کر پارہا تھا۔ اسے اس لڑکی سے کوئی تعلق نہیں رکھنا تھا، پھر بھی ایک دفعہ وہ اس سے ملنا چاہتا تھا۔ اگر وہ اسے کسی طرح اس کا رشتہ لینے سے باز رکھ سکتا تھا تو یقیناً وہ اسے تنہا میں نہیں دیکھے گا۔ اس لیے یہ ملاقات اہم اور ضروری تھی۔

وہیں بستر پہ لیٹ لیٹ اس نے اپنے لینڈ لائن سے اس کا نمبر ملایا۔ کافی گھنٹیوں بعد اس نے فون اٹھایا اور چھوٹے ہی لٹنے کے لیے رضامندی ظاہر کر دی۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ غیند سے بیدار ہوئی ہو اور اس کے انداز سے یہ بھی ظاہر تھا کہ وہ گھر والوں کو بتائے بغیر ملنے آئے گی۔ پتا نہیں اس نے ان سفید پھولوں کے بارے میں اپنے گھر میں کیا بتایا ہوگا۔ شاید اس نے کوئی بہانہ نہ کر دیا ہو۔ شاید پھول چھپا دیے ہوں۔ کوئی بعید نہیں کہ وہ کل اپنے ابا کو ساتھ لے آئے۔ ویسے اسے امید نہیں تھی کہ وہ گھر والوں کو درمیان میں لائے گی۔ جو بھی تھا، وہ لڑکی کافی باہمت اور اپنے مسائل خوب حل کرنے والی لڑکی لگتی تھی۔

اس سے ملنے کے لیے ایک جعلی سیف ہاؤس کا انتظام زیادہ مشکل نہیں تھا۔ سب انتظام اس نے خود ذاتی طور پر کیا تھا۔ البتہ یہ طے تھا کہ وہ اس سے اسکرین کے پیچھے سے بات کرے گا۔ جیسے بعض اوقات کچھ لوگوں کو تفتیش یا پوچھ گچھ کے لیے بلا کر بات کی جاتی تھی۔ اس نے اپنا درست نام بصر احمد بتا کر البتہ غلطی کی تھی۔ ہو سکتا ہے فرقان ماموں کی وہ بات کہ سکندر کا بیٹا لاہور میں پوسٹل ہے، اس نے سن رکھی ہو اور وہ اس بارے میں شبہات کا شکار ہو۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے دادا کا نام بھی معلوم ہو اور اب اگر ایک ممبر احمد اس کے سامنے خود کو چھپاتا ہے تو وہ دو جمع دو کر کے یہ جان سکتی تھی کہ وہ کون ہے۔

وہ اتنی ذہین تھی یا نہیں۔ وہ نہیں جانتا تھا۔ وہ خود ایک کاسلیف پسند تھا۔ اس کی کورا سنوری میں کوئی خامی، کوئی جھول نہیں ہونا چاہیے، یہ اس نے اپنی جاب کے دوران سیکھا تھا۔ اس کے پاس حیا کو دینے کے لیے کوئی ٹھوس وجہ ہونی چاہیے تھی کہ وہ کیوں اس سے اسکرین کے پیچھے بات کر رہا ہے اور وجہ بہت سادہ ہی تھی۔

وہ اسے یہ بتا کر دے گا کہ اس کا چہرہ جھلسا ہوا ہے۔ اسکرین چونکہ فروسٹڈ گلاس کی تھی تو اس کے پیچھے اگر وہ احمد کا آدھا جھلسا چہرہ دکھتی تو جھلسا آدھا نہ نمایاں نہ ہوتا، دھندلے لیشے کے باعث اسے کافی گہرے رنگ کا برن بنانا تھا۔ وہ یہی قیاس کرے گی کہ وہ اپنے احساس کسری کا شکار ہے اور اسی لیے ایک خوب صورت لڑکی کے سامنے آنے سے خائف ہے۔ ایک کامل اور محسوس وجہ۔

اس کے علاوہ ایک وجہ اور بھی تھی۔ اگر وہ اس کی بات نہیں سمجھتی اور اسے لار شپ سے پیچھے نہیں ہٹتی تو وہ ایک آخری کوشش کے طور پر حماد کو اس سے بات کرنے کو کہے گا اور حماد کے نزدیک اس مسئلے کا سب سے بہترین حل یہی تھا کہ وہ خود کو ممبر احمد ظاہر کر کے اس سے مل لے اور کسی بھی طرح اسے سمجھا دے کہ اس کے شوہر کے لیے یہ درست نہیں ہوگا کہ وہ وہاں جائے اور یہ کہ اس کا شوہر کہیں اس کی وجہ سے مصیبت میں نہ پڑ جائے۔ ابھی اسے گفتگو کا پورا متن طے ہونا باقی تھا، مگر یہ طے تھا کہ وہ یہ کوشش ضرور کرے گا۔ اس کا کوئی رشتے دار ان کے قریب استنبول میں رہے۔ یہ اس کے لیے کوئی خوش آئند بات نہیں تھی۔

”مجھے لگتا ہے تم اپنی سزے آنے سے خائف اس لیے ہو کہ تم کہیں ان کی محبت میں مبتلا نہ ہو جاؤ۔ کہیں تم ان سے متاثر نہ ہونے لگو اور کہیں تمہارے پاس ان کو اپنی زندگی سے نکلنے کی وجہ ختم نہ ہو جائے۔“ حماد اس کا مکمل ساتھ دے رہا تھا، مگر ساتھ میں وہ مسکرا کر ایسا تبصرہ بھی کر دیا کرتا تھا۔ وہ سر جھٹک کر نظر انداز کر دیتا۔

جب وہ ممبر احمد کے اس خود ساختہ آفس آئی تو چیکنگ کے بہانے اس کا موبائل اس سے لے لیا گیا اور اس میں ایک بہت وسیع ریخ کا حامل جی پی ایس ٹریکنگ ڈیوائس ڈال کر واپس کر دیا گیا۔ اگر وہ ترکی چلی جائے تب یہ ڈیوائس اس کے بہت کام آئے گا۔

جب وہ اندر آئی اور جہاں اس سے مخاطب ہوا تو سب سے پہلے اس نے اسے یقین دلایا کہ اس ویڈیو کو وہ شہر کے ایک ایک بندے سے نکلوا چکا ہے۔ یہ سچ تھا۔ کم از کم شادی کے فنکشن کی صودی بنانے والے جس صودی میکر کی یہ حرکت تھی، اس نے پوچھ گچھ پر اس شخص تک ان کو رسائی دے دی تھی، جس کو اس نے ویڈیو دی تھی، پھر بھی وہ جانتا تھا کہ اگر ان لوگوں نے ویڈیو مزید آگے کی ہو، یا لوگوں نے انٹرنیٹ سے ڈاؤن لوڈ کر لی ہو، یا کسی بھی دوسری صورت میں کہیں نہ کہیں وہ ویڈیو پھر در کسی کے کمپیوٹر میں پڑی ہوگی۔

لیکن بعض باتیں انسان غیر ارادی طور پر کہہ دیتا ہے۔ جیسے جب اس نے بتایا کہ اس نے صرف صبر نہ کر سکنے کے باعث ملاقات کا بہانہ بنایا تھا تو لمحے بھر کو وہ خود بھی حیران رہ گیا۔ ان پچھلے چند دنوں میں دیکھے جانے والے ناقابل برواشت مناظر کے باوجود وہ اس لڑکی سے بغیر کسی وجہ کے ملنا چاہتا تھا؟ یا پھر جو وجوہات اس کے پاس تھیں، وہ محض اس کے قریب رہنے کا جواز تھا؟ شاید حماد ٹھیک کہتا ہے۔ پھر بھی وہ جانتا تھا کہ وہ دونوں دو بہت مختلف سے لوگ کبھی بھی ایک نہیں ہو سکیں گے۔

اس ملاقات میں اس نے اس لڑکی سے چند ایک سوال پوچھے، جن پر حسب عادت وہ تپ اٹھی۔ یہاں تک کہ جب وہ اسے نصیحت کرنا چاہا رہا تھا، اس نے ٹھیک سے جواب بھی نہیں دیا، نہ ہی اس کی بات میں دلچسپی لی۔ تب اس نے وہ سوال کیا، جس سے وہ شادی کے بارے میں اس کی ترجیحات جان سکے۔ وہ جانتا تھا کہ وہ فوراً انکار کر دے گی، مگر کس وجہ کی بنا پر؟ اور جب اس نے وجہ بتائی تو لمحے بھر کو وہ خود بھی چونک کر رہ گیا۔ وہ جتنے یقین اور اتھاقاق سے ”میرا شوہر، میرا شوہر“ کہہ رہی تھی۔ وہ پھر سے اپنے بارے میں بے یقین ہونے لگا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے فرقان ماموں کے وہ الفاظ ہر آنے جانوں سے نکلے، اب اس کی پاکستان واپسی کے بارے میں کہے تھے۔ وہ صرف یہ جانتا چاہتا تھا کہ وہ اس کے لبا کے بارے میں کتنا جانتی ہے؟ مگر وہ حسب عادت بھڑک کر اٹھ گئی۔

تب اس نے اپنے قریب رکھے سرخ گلابوں کے کبے میں (کہ آج اسے واقعتاً سفید گلاب نہیں ملے تھے، نہ اس نے تنگ و دو کی تھی۔) ایک تنگ سا کارڈ لکھ کر ڈالا۔

”آ نے کا شکریہ۔ اے آر پی۔“

کارڈ اس نے پھولوں کے اندر رکھ دیا۔ اس کے ساتھی نے بعد میں باہر جا کر حیا کو پھول دینے چاہے، مگر اس نے تو ان کو دیکھا تھا۔ نہیں اور چلی گئی۔ وہ جیسے بہت غصے میں تھی۔

ان تمام دنوں میں یہ وہ پہلا دن تھا، جب جہان نے اس پہ بہت وقت صرف کیا تھا۔ گو کہ وہ بنیادی طور پہ اتنا چوکس آدمی تھا کہ اسے وقت نکالنا آتا تھا، مگر ابھی تک جو وہ خود سے کہہ رہا تھا کہ وہ یہ صرف اسے اس کا لرشپ لینے سے روکنے کے لیے کر رہا ہے۔ خود بھی نہیں سمجھ پایا کہ اگر وہ اس کے سامنے آئی بیٹھی تھی تو اس نے ہر بات کہہ دی، سوائے اس کا لرشپ نہ لینے کے۔ وہ اس بارے میں ایک لفظ بھی نہیں کہہ سکا۔ کیوں؟ شاید اس لیے کہ ان کی گفتگو جس تلخ موڑ پہ آ رہی تھی، اس کے بعد اس کو کسی کام سے منع کرنے کا مطلب تھا کہ وہ جان بوجھ کر وہی کام کرے گی۔

مگر وہ ایک دفعہ پھر سے کوشش کرنا چاہتا تھا۔ اگلے دو دن وہ اپنے کام پیک اپ کرتا رہا۔ اس کا کام ٹھیک سے نہیں ہو پایا تھا کیونکہ میڈیم سینڈ سیکریٹری واپس جاری تھیں کسی میننگ کے سلسلے میں۔ اس کے پیشے میں اکثر ایسا ہی ہوتا تھا۔ بہت دن بہت مبرم عمل سے کسی معلومات کے ملنے کے انتظار کے بعد ایک دم سے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا تھا۔

تیسرے روز وہ رات میں پھر جناح سپر مارکیٹ کے ایک دیران سے چوڑے پہ اسے ملا تھا۔ دنیا کے ہر حساس ادارے میں سب سے زیادہ قدیم اور کسی حد تک گھسا پٹا طریقہ جو کسی بھی شخص کا احسان و اعتماد جیتنے کا بتایا جاتا تھا۔ وہ یہی تھا کہ پہلے آپ اپنے مطلوبہ شخص کو کسی مصیبت میں گرفتار کروائیں، پھر عین وقت پہ پہنچ کر خود کو ہیرو ثابت کر دیں۔ اگر اگلا شخص عقل مند ہوا تو آپ کی حرکت جان جائے گا اور کبھی بھی آپ کا احسان مند نہیں ہوگا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ کتنی عقل مند ہے۔ البتہ وہ یہ نہیں جان پائی کہ لڑکے اسے کس کے کہنے پہ ستارہ تھے۔ اسے اس روز وہ ذرا غائب دماغ لگی تھی۔ جیسے کہ بات پہ لکھی ہوئی ہو۔ وہ اپنے شوہر کو ڈھونڈنا چاہ رہی تھی۔ آج پھر اس کی گفتگو میں شوہر کا تذکرہ تھا۔ وہ اب بھی نہیں سمجھ پارہا تھا کہ وہ اپنے شوہر کا انتظار کیوں کر رہی ہے؟ تاکہ رشتہ ختم کر سکے؟ یا پھر رشتہ نبھاسکے؟

جو بھی تھا، وہ میجر احمد کا اسپریشن اس پہ بہت اچھا ڈالنا چاہتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اسے شک بھی پڑے کہ وہی ڈولی دراصل میجر احمد ہے۔ چوڑے پہ جانے سے قبل اس نے چند ایک رسمی فقرے ریکارڈ کر کے اس ریکارڈنگ کا ٹائم لگا دیا تھا۔ عین وقت ہونے پہ حیا کا فون بج اٹھا۔ وہ یہ بھی دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ میجر احمد کی احسان مند ہے بھی یا نہیں، مگر اس نے عادت کے مطابق پوری بات سننے بغیر ہی جھڑک کر فون رکھ دیا۔ وہ میجر احمد کو پسند نہیں کرتی، وہ جان گیا تھا۔

پھر اسے وہ گاڑی والا لڑکا یاد آتا تو لگتا کہ وہ واقعی جہان سے رشتہ ختم کرنا چاہتی ہے۔ شاید میجر احمد کے سامنے وہ اپنے شوہر کا ذکر صرف دھمکی کے طور پہ کر رہی تھی تاکہ وہ اسے تنگ نہ کر سکے۔

جب وہ جانے لگی تو اس نے وہی کہا جو وہ کہنا چاہتا تھا۔ شاید اس کی بددعا ان کو روک جائے۔ پھر وہ چوڑے کی دیوار کے عقب میں جا کھڑا ہوا تھا۔ تب بھی اسے امید تھی کہ وہ مڑ کر ضرور آئے گی۔ یہ دیکھنے کہ وہ کون ہے اور کیوں ہے؟ مگر وہ ذرا سی رکی، مڑ کر دیکھا اور پھر واپس آگے بڑھ گئی۔ اس کا ذہن واضح طور پہ کہیں اور الجھا تھا۔

جہان کا کام نہیں ہو سکا تھا۔ اب مزید یہاں ٹھہرنا بے کار تھا۔ اس کو اب واپس جانا تھا۔ پندرہ جنوری کو اس کی فلائٹ تھی۔ اس کے پاس اب صرف ایک دن تھا۔ صرف اور صرف اپنے دل کو مطمئن کرنے کے لیے وہ ایک آخری کوشش کرنا چاہتا تھا۔

”میں صرف تمہاری تلی کے لیے ان سے بات کر لوں گا، ورنہ مجھے یقین ہے کہ تم اب خود نہیں چاہتے کہ وہ رک جائیں۔ اگر ایسا ہوتا تو تم اس کے لیے کوئی موثر طریقہ اپناتے۔ ان کے پیروں میں مسئلہ کرواتے۔ ان کے والدین کو کسی طرح اپروچ کر کے انہیں باز رکھنے کا کہتے۔ مگر تم جو بھی کر رہے ہو، وہ اس لیے نہیں ہے کہ ان کو روک سکوں، بلکہ اس لیے ہے تاکہ تم ہر دوسرے دن ان سے ملنے یا ان کو دیکھنے کا موقع پیدا کر لو۔ تمہارا دل کہتا ہے کہ تم یہ رشتہ نبھاؤ اور یہ کہ وہ ضرورت کی آئیں تاکہ تم ان کو بہتر طور پہ جان سکو مگر تمہارے دماغ میں تمہارے ماموں کے خلاف جو عناد بھرا ہے۔ وہ تمہیں یہ رشتہ توڑنے پر اکساتا ہے۔ تم خود بھی کنفیوژڈ ہو جہاں! کہ تمہیں کیا کرنا ہے مگر کبھی کبھی انسان کو خود سے بچ بول لینا چاہیے۔ اس سے بہت سی کنفیوژن ختم ہو جاتی ہے۔“

مگر وہ حماد کی ایسی ساری باتیں نظر انداز کر رہا تھا۔ اب بھی وہ اسی بات پر قائم تھا کہ وہ اپنی بیوی کو اپنے قریب ترکی میں نہیں دیکھنا چاہتا۔ چونکہ اب اس کو روانگی کا محکم مل چکا تھا اور کل دوپہر میں اس کی فلائٹ تھی۔ سو وہ ایک آخری کوشش آج کے دن کرنا چاہتا تھا۔

حماد کو آج اپنی امی اور بہن یعنی کے ساتھ شاپنگ پر جانا تھا۔ وہ لوگ اس کی شادی کی شاپنگ کر رہے تھے۔ دوسری طرف جہان اپنے اپارٹمنٹ میں بیکنگ کر رہا تھا۔ ساتھ میں وہ اپنے ٹریسٹر کا اسٹیلٹس ضرور چیک کرتا تھا۔ صبح وہ ڈیوٹیک انگریز میں تھی، پھر ہنڈی چلی گئی شاید۔

اس نے وہاں سے کچھ اٹھانا ہو، کیونکہ پھر وہ واپس ڈیوٹیک انگریز چلی گئی تھی۔ ابھی دوپہر پوری طرح سے نہیں چھائی تھی، جب جہان نے اسے ایف سیون کی طرف جاتے دیکھا۔ کل رات بھی وہ جناح سپر میں تھی، سو آج بھی شاید وہیں جاری ہو۔ اس لڑکی کو شاپنگ کا بہت شوق تھا۔ بہر حال اس نے حماد سے بات کی۔ وہ لوگ ایف ٹین جارہے تھے، مگر چونکہ وہ حیا سے بات کرنے کے لیے راضی تھا، اس لیے وہ جناح سپر چلا آیا۔

حماد اس سب کو ایک اتفاقیہ ملاقات کی طرح پلان کرنا چاہ رہا تھا چونکہ یہ طے تھا کہ وہ اسے اپنے میجر احمد ہونے کا تاثر دے گا۔ اس لیے یہ غلط لگتا کہ جو شخص اپنی بد صورتی کے باعث پہلے اس کے سامنے نہیں آ رہا تھا۔ اب بالمشافہ ملاقات پر راضی ہو گیا تھا۔ اپنی جاب میں وہ اکثر ایسے اتفاقیہ مواقع پیدا کرتے رہتے تھے۔ ان کے نزدیک وہ لوگ احمق تھے، جو موقع ملنے کا انتظار کیا کرتے تھے۔ مواقع ڈھونڈنے نہیں، پیدا کیے جاتے ہیں۔ اب ایک بہت معصوم سے اتفاق میں وہ ایک ہی دکان میں اس سے ٹکرا جاتا۔ وہ یقیناً اس کا آدھا جھلسا چہرہ دیکھ کر چوکی، اسی پل میں اسے احمد بھائی کہہ کر پکارتی۔ یعنی کو وہ پہلے ہی سمجھا چکا تھا کہ آج وہ اسے مارکیٹ میں احمد بھائی کہہ کر پکارے گی۔ کیونکہ وہ کسی کو یہ تاثر دینا چاہتا ہے کہ اس کا نام حماد نہیں احمد ہے۔ یعنی اپنے بھائی کی ان مشکوک حرکتوں کی عادی تھی۔ وہ شانے اچکا کر رہی ہو گئی۔ جو بھی تھا۔ اپنے بھائی کی مدد کر کے اسے ہمیشہ خوشی ہوتی تھی۔

”میں فیملی کے ساتھ مارکیٹ میں ہوں، لیکن مجھے نہیں معلوم کہ وہ کس شاپ میں جائیں گی؟“ حماد نے وہیں سے اسے فون کیا تھا۔ وہ اس وقت اپنا بیگ پیک کر رہا تھا۔

”وہ جو سعید بیک بینک والا پلازہ ہے، اس میں جہاں ایک خالی چوڑا سا بنایا ہے۔“

”ہاں، مگر پھر کوئی بک فیزر لگا ہوا ہے۔ وہ خالی نہیں ہے۔“

”اس کے آس پاس کوئی کپڑوں یا جوتوں کی ایسی شاپ ہے جس پہ سیل لگی ہو؟“ وہ سوچ سوچ کر بول رہا تھا۔ اس نے اتنے دنوں میں ایک چیز کا اندازہ کر لیا تھا کہ وہ لڑکی کپڑوں، جوتوں کی بہت شوقین تھی۔

”ہاں..... آگے ایک جگہ سیل لگی ہوئی ہے۔“

”تم وہاں جاؤ، وہ ادھر ضرور آئے گی۔“ وہ بہت وثوق سے بولا تھا۔

وہ کپڑے تہہ کرتے ہوئے پھر اسی بیج پہ سوچنے لگا۔ کیا وہ واقعی چاہتا تھا کہ وہ نہ جائے، یا پھر بس اس کی ہر بل خبر رکھنے کا بہانہ ڈھونڈ رہا تھا؟ ”جہاں! تم کثیف ڈھڑو“ اس نے خود کو سرزنش کی۔

پورا گھنٹہ بھی نہیں گزرا تھا جب حماد کو دوبارہ فون آیا۔ وہ لیپ ٹاپ سامنے رکھے کچھ ٹائپ کر رہا تھا۔ حماد کا نمبر فون پہ دیکھ کر ایک دم اس کا دل بہت اداس ہوا۔ یقیناً حماد نے اس سے بات کر لی ہوگی اور اب وہ ترکی نہیں آرہی ہوگی۔ اس نے کال موصول کی۔

”اچھی بے عزتی کروائی آج تم نے میری۔“ حماد ایک دم شروع ہوا۔ جہان سیدھا ہو بیٹھا وہ سخت غصے میں اس کو ملامت کیے جا رہا تھا۔

”میرے بھائی! ہوا کیا ہے؟“

”بھابھی نے مجھے پہچان لیا۔ انہوں نے پوری شاپ میں سب کے سامنے اعلان یہ بتایا کہ میں ہنگی بنا سڑک پہ گداگری کر رہا تھا۔ لعنت ہے مجھ پہ اور لعنت ہے اس دن پہ جب میں نے تمہاری مدد کرنے کا سوچا۔“

”اس نے..... اس نے کیسے پہچانا؟“ جب اس کے منہ پہ سلسل گرا تھا۔ تب بھی اسے جھٹکا لگا تھا اور اب بھی ایسا ہی جھٹکا لگا تھا۔

”میرے ہاتھ پہ جو نشان ہے اور انگلیوں پہ جو انہوں نے اس دن زخم دیے تھے۔ ان ہی سے انہوں نے پہچان لیا اور میری فیملی کے سامنے اچھی خاصی میری بے عزتی کر دی۔“

”تو تم نے اس سے بات نہیں کی؟“

”میں اس سارے ہنگامے کے بعد کیا بات کرتا؟ میں تو جلدی سے وہاں سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا، مگر وہ شاپ کیپر آ گیا۔ اس دن

ٹائیہ اور میں نے ہمیں سے شاپنگ کی تھی۔ وہ ہمیں جانتا تھا۔ بس شکر تھا کہ اس نے میرا نام نہیں لیا۔ مگر.....“ غصے سے بولتے بولتے وہ ایک دم رکا۔
”تم جو چاہ رہے تھے کہ میجر احمد کا امپریشن اچھا پڑے، وہ اب نہیں ہو سکے گا، کیونکہ میں نے سنی سے کہا تھا کہ وہ مجھے احمد کہہ کر پکارے گی اور اس نے تمہاری سزے لڑتے ہوئے بھی میری ہدایت یاد رکھی۔“
”اس سے بہتر تھا، میں تمہیں کام نہ ہی کہتا۔“

”جہان! ایک منٹ، مجھ سے بول لو، خیر ہے، مگر خود سے جھوٹ مت بولو۔ سچے دل سے تسلیم کر لو کہ تم کبھی ان کو روکنا نہیں چاہتے تھے۔ تم اب بھی چاہتے ہو کہ وہ تمہارے استنبول ضرور آئیں۔ اس لیے اس بارے میں پریشان مت ہو اور جانے کی تیاری کرو۔ ویسے اچھی خاصی خوش اخلاق بیگم ہیں آپ کی۔“
اس کی آخری بات پہ وہ بے اختیار ہنس دیا تھا۔

حماد ٹھیک کہتا تھا۔ اسے اپنے اندر کی کنفیوژن ختم کر دینی چاہیے۔ وہ اس کے ترکی آنے سے پریشان تھا مگر ناخوش نہیں۔ اس نے بلا خر خود سے سچ بول ہی لیا۔ وہ کسی لڑکی کے اپنے اعصاب پہ حاوی ہو جانے سے ڈرتا تھا۔ لڑکی بھی وہ جو سلیمان ماموں کی بیٹی تھی۔ مگر اسے ایسا نہیں سوچنا چاہیے۔ جب اسے ماموں سے انتقام لینا ہی نہیں ہے تو پھر ان کے خلاف دل میں عناد کیوں رکھے؟ اور شاید وہ خود بھی یہ رشتہ نہ چاہتی ہو۔ جہان کو اس کا اس لڑکے کی گاڑی میں بیٹھنا یاد تھا۔ ”پلو ٹھیک ہے، وہ آجائے گی تو کبھی نہ کبھی وہ اس سے یہ بات بکیر کر لے گا۔“
اب وہ مطمئن تھا۔

☆ ☆ ☆

آفس میں نیم اندھیرا پھیلا تھا۔ کھڑکیوں کے باہر شام اتر آئی تھی۔ وہ ابھی تک اسی پوزیشن میں بیٹھی ایک تک لیپ ٹاپ کی اسکرین کو دیکھ رہی تھی۔ آنسو اس کے گالوں پہ لڑھک لڑھک کر اب سوکھ چکے تھے۔ کہیں پس منظر میں فون کی ٹکھنی بج رہی تھی مگر وہ اس جانب متوجہ نہیں تھی۔ وہ صرف اس ایک شخص کو دیکھ رہی تھی، جو اس سے ہم کام تھا۔ بہت مختصر الفاظ میں اپنی کہانی سناتے ہوئے بھی درمیان میں اٹھ کر وہ کافی ہالایا تھا۔ فارغ تو وہ بیٹھ ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ اسے جانتی تھی۔ مگر آج جب اس نے ویڈیو کے کھلتے ہی جہان کو بیوک ادا کے سفید محل میں موجود عبدالرحمن پاشا کے کمرے کی کمپیوٹر چیئر پہ بیٹھتے دیکھا تھا تو اسے لگا تھا وہ اس شخص کو نہیں جانتی، نہیں پہچانتی۔ وہ اس ویڈیو میں اور اسے آرپی کے کمرے میں کیا کر رہا تھا؟ مگر پھر جیسے جیسے وہ سنی گئی، اس کے اعصاب سن پڑ گئے۔

پہلے اسے شاک لگا، پھر غصہ چڑھا، مگر ایسا غصہ جو شطرنج میں اپنے ذہن مقابل کی چال پہ مات کھا جانے سے چڑھتا ہے اور پھر اس کی جگہ دکھنے لے لی۔ پہلی دفعہ اسے احساس ہوا تھا کہ جب تک انسان دوسرے کی جگہ پہ کھڑا نہ ہو، اسے پوری بات سمجھ میں نہیں آتی۔

ٹیلی فون کی ٹکھنی ابھی تک بج رہی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ویڈیو کو ہٹا دیا۔ ابھی وہ آدھی بھی نہیں ہوئی تھی اور ابھی تک جہان نے اس آدمی کا ذکر نہیں کیا تھا۔ جس کے چہرے پہ جیانے کافی اٹی تھی۔ اگر اس کا وہ غریب سارے سٹورٹ اور جہان ہی عبدالرحمن پاشا تھا۔ عائنے اور بہارے کا عبدالرحمن پاشا۔ تو پھر بے چارہ وہ کون تھا، جس پہ اس نے کافی اٹی تھی؟ اور وہ جس کو اس نے جہان کے ساتھ پیشہ نری میں دیکھا تھا۔

مگر ایک منٹ..... اس نے دونوں کنپٹیوں کو انگلیوں سے دباتے ہوئے سوچنا چاہا..... اس کو کس نے کہا تھا کہ وہ عبدالرحمن ہے؟ کسی نے نہیں۔ اس نے آنے کے ساتھ اس کی تصاویر دیکھ کر ان خود یہ فرض کر لیا تھا کہ وہی عبدالرحمن ہوگا۔ تب وہ نہیں جانتی تھی کہ آنے کا ایک دوسرا بیٹا بھی ہے۔ ان کا اصلی بیٹا، گمشدہ بیٹا، جو عرصہ پہلے والد اور چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ ہاں، وہی تو تھا ان کا گمشدہ بیٹا۔ تب ہی تو اس کی تصاویر گھر میں ہر جگہ لگی ہوئی تھیں۔ پاشا بے (مسٹر پاشا) اسی نام سے جہان اسے ریسٹورنٹ میں پکار رہا تھا، جب اس نے ان کی باتیں سنی تھیں۔ عبدالرحمن پاشا اور پاشا بے دو الگ الگ لوگ تھے۔

فون مسلسل بجے جا رہا تھا۔ اس نے آکٹا کر میز پہ رکھے فون کو دیکھا۔ ابا کی سیکریٹری کو کہا بھی تھا کہ اسے مت ڈسٹرب کرے، مگر کوئی سننے تو اس نے ریسورٹھا یا۔

”جی؟“

”میم..... ولید صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ وہ اصرار کر رہے ہیں۔ میں.....“
”انہیں بھیج دیں!“ اس نے ناگواری کی اچھی لہر کو دبا کر کہا اور فون رکھا۔ صرف اس فصول آدمی کی وجہ سے اس کا کردار جہان کی نظروں

میں مفلک ہو کر رہ گیا تھا۔ صرف یہی نہیں، وہ کہنی کے ساتھ بھی وفادار نہیں تھا۔ آج تو وہ اچھی طرح خپنے کی اس سے۔

اس نے آفس کالاک کھولا اور نقاب کی پٹی سر کے پیچھے باندھ لی۔ پھر لیپ ٹاپ بند کر کے فلیش ڈرائیو ڈبی میں واپس ڈال دی۔ باقی ویڈیو گھر جا کر دیکھے گی۔ ویسے بھی شام ہونے کو آئی تھی۔ وقت کا کچھ بٹا ہی نہیں چلا تھا۔ ابھی تک اس کے اعصاب شل تھے۔

دروازہ کھلا اور ولید لمبے لمبے ڈگ اٹھا تا اندر داخل ہوا۔ اس کے لبوں پہ ہمیشہ کی طرح استہزائیہ مسکراہٹ بکھری تھی۔ وہ کرسی پہ ٹپک لگائے دونوں ہاتھوں پہ کہنیاں جمائے آتے دیکھتی رہی۔

”کیسی ہیں آپ میڈم ایم ڈی؟“ اس کے سامنے کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے وہ بولا۔

”آپ بتائیں، کیا کام تھا؟“ وہ خشک لہجے میں بولی۔ وہ رات پھر سے تازہ ہو گئی تھی۔ کیا سوچتا ہوگا جہان اس کے بارے میں؟ اف! ”کل بورڈ آف ڈائریکٹر کی مینٹنگ میں ہم آپ کے خلاف قرارداد لا رہے ہیں۔“ وہ پتہ دینے والی مسکراہٹ کے ساتھ کہتے ہوئے

اس کی میز سے پیپر ویٹ اٹھا کر انگلیوں میں گھمائے لگا۔

”کیسی قرارداد؟“ اس نے حتی الامکان لمبے کونائل رکھنے کی سعی کی۔

”آپ جانتی ہیں کہ تمام ڈائریکٹرز آگرمل کرایم ڈی کے خلاف قرارداد لائیں۔۔۔۔۔ عدم اعتماد کی قرارداد تو ایم ڈی کو ہشایا جا سکتا ہے۔“

وہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔ شاید ولید نے تازہ تازہ کہنی لا پڑھا تھا۔ ورنہ اسے یہ خیال پہلے دن آ جانا چاہیے تھا۔ ”کل آپ اس آفس سے باہر ہوں گی۔ جی جی جی۔۔۔۔۔ مجھے افسوس ہو رہا ہے مگر ہم نے بہت برداشت کر لیا آپ کو۔ آپ جیسی عورتوں کی جگہ گھر میں ہوتی ہے یا مدر سے میں، ادھر نہیں۔“

وہ اب بھی لب بھینچنے سے دیکھتی رہی۔

”آپ یوں کریں، اپنی ضروری اشیاء سیٹ لیں۔ آخر کل آپ کو یہ جگہ چھوڑنی جو پڑے گی۔ میں یہی بتانے آیا تھا ادھر۔“ وہ فاتحانہ

انداز میں کہتا اٹھ کھڑا ہوا۔

”مینیس!“ اس نے انگلی سے ایک دم اتنے تخم سے اشارہ کیا کہ وہ بے اختیار اگلے ہی بل واپس بیٹھا۔

”اب میری بات سنیں۔“ حیا دونوں سختیاں میز پر رکھے، کرسی پڑا آگے ہوئی۔

”میں نے منگل والے روز میڈ آر کنٹیکٹ اور آپ کی گفتگوریکارڈ کی تھی، سننا چاہیں گے؟“

ولید کے چہرے کے تاثرات ناقابل فہم ہو گئے۔ اس نے سوالیہ ابرو اٹھائی۔

”کون سی گفتگو؟“

”انجمن بنا آپ کو فائدہ نہیں دے گا۔ میں جانتی ہوں کہ اس ٹریڈ سینٹر کے پروجیکٹ پلان میں آپ کے کہنے پہ آر کھیکٹ نے

گڑ بڑ کی تھی۔ صرف یہی نہیں، بلکہ جس کہنی کو وہ پروجیکٹ مل گیا تھا۔ ان کے مالکان سے آپ کے گہرے روابط ہیں۔ یہ ساری آپ کی اپنی کبھی

باتیں ہیں۔ میرے پاس ثبوت ہے۔“ وہ کہہ رہی تھی۔ ولید کے لب بھینچ گئے اور ابرو تن گئے۔

”آڈیو کی چیز کا ثبوت کبھی نہیں ہو سکتی مادام!“

”مجھے کورٹ میں کسی کو کچھ نہیں دکھانا۔ مجھے صرف اپنے ابا کو یہ سب بتانا ہے۔ ویسے بھی وہ اب ٹھیک ہو رہے ہیں۔ اسی ہفتہ دوبارہ

جوائن کر لیں گے۔ آج جب گھر جا کر میں ان کو آپ کی اصلیت بتاؤں گی تو وہ اپنی بیٹی کی ہر بات فوراً مان لیں گے۔ ہماری کہنی لاء کے مطابق اگر

ایسا ٹریزن ثابت ہو جائے تو نہ صرف آپ کے شہر زفر پر ہو سکتے ہیں بلکہ ابا کو آپ جانتے ہی ہیں، وہ اپنے ساتھ دعا کرنے والوں کو یوں ہی نہیں

چھوڑتے ہیں۔ سڑک پہ لے آئیں گے وہ آپ کو۔“

ولید کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔

”میں تمہیں جان سے مار دوں گا۔“ وہ غصے سے غرایا تھا۔

”میں نے کہنی کے ساتھ کوئی دغا نہیں کیا۔ اگر تم نے اپنے ابا کو کوئی اتنی سیدھی بات بتانے کی کوشش کی تو مجھ سے رُک کوئی نہیں ہوگا۔“

اس نے مسکرا کر سر اٹھا کر ولید کو دیکھا۔ کسی سے تو وہ بھی ڈرتا تھا۔

”میں ذکیہ لوں کا تمہیں۔“ ایک شعلہ بارنگاہ اس پہ ڈال کر وہ مڑا اور تیز تیز چلتا باہر نکل گیا۔

اس آدمی کو وہ سمجھانے کے لیے اس کے ساتھ بیٹھی تھی اور اس کی اس ایک حرکت نے اسے جہان کی نظروں میں مشکوک بنا دیا تھا۔ جب جہان اس سے ملے گا تو وہ سب سے پہلے یہی بات کلیئر کرے گی۔

جہان؟ وہ ایک دم چونکی۔ یہ ویڈیو تو اس نے لا کر سے ایک ماہ قبل نکالی تھی، یہ ساری باتیں تو پرانی ہو گئیں۔ وہ ابھی کہاں تھا؟ چکی نے پزل باکس اسے تھماتے ہوئے کہا تھا کہ جب تک وہ اسے کھول پائے گی تب تک وہ شاید اس دنیا میں نہ رہے۔ نہیں وہ یوں ہی کہہ رہا ہوگا۔ اس نے سر جھٹکا۔ وہ جہان کو ڈھونڈ لے گی۔ وہ اسے کہیں نہ کہیں ضرور مل جائے گا۔

اس نے موہاں نکالا۔ صبح سے وہ سالنٹ پر تھا اور اماں کی کئی مسڈ کا ٹر اوٹ بیچ آئے پڑے تھے۔ اس نے بیچ کھولا۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ انہیں اب کی گاڑی اور ڈرائیور چاہیے تھے۔ اس لیے انہوں نے آفس فون کر کے دونوں کو منگوایا تھا۔ ایک اور پیغام میں انہوں نے بتایا کہ وہ ظفر کو اس کی گاڑی کے ساتھ بھیج رہی ہیں، وہ اسے گھر لے آئے گا۔

بس کار بھیج کر ظفر کو واپس جانے کا کہہ دیتیں، ضروری تھا کہ تایا اب کا ملازم بھی ادھار لینے کا احسان لیا جائے؟ اسے خواہواہ کو فٹ ہوئی۔ بہر حال اس نے سر جھٹک کر فون بک میں سے عائشہ کے گھر کا نمبر ڈھونڈ کر ملایا۔ کوئی جواب نہیں۔ پھر اس نے حلیہ آگنی کا نمبر ملایا۔ وہ یقیناً ان سے ہوئی گریڈ کا نمبر لے سکتی تھی، جہان وہیں ہوگا۔

”آلو؟“ وہ اداس، مگر باریک سی آواز، اسے خوش گوار حیرت کا جھٹکا لگا۔

”بہارے! میں حیا بول رہی ہوں۔“

”اوہ حیا..... تم کہاں چلی گئی تھیں؟“ وہ جیسے بہت اداس سی لگ رہی تھی۔

”میں گھر آ گئی مگر تم..... مجھے پتا چلا تھا کہ تم لوگ ملک چھوڑ کر چلے گئے ہو۔“

”سب چلے گئے ہیں، میں نہیں گئی، میں اکیلی رہ گئی ہوں۔“ وہ جیسے آنسو پیتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ”عائشہ بھی نہیں ہے، آنے بھی نہیں ہے، سب چلے گئے۔“

”عجب..... عبدالرحمن؟ وہ کہاں ہے؟“ اس کی آواز میں لرزش درآئی تھی۔

”وہ صبح آیا تھا۔ مجھے اتنا سارا ڈانٹ کر گیا ہے، اس نے کہا وہ جا رہا ہے اور یہ بھی کہ وہ اب مجھ سے ملنے نہیں آئے گا۔“

”کدھر..... کدھر گیا ہے وہ؟“ ایک دم بہت سے آنسو اس کی پلکوں پر آ کر کے تھے۔

”مجھے نہیں پتا مگر.....“ وہ جیسے ذرا اٹھری۔ ”اس نے کہا تھا کہ اس نے تمہیں آنے سے کچھ دن پہلے بتا دیا تھا کہ وہ کدھر جائے گا۔“

”تمہیں پتا ہے کیا؟“

”نہیں۔“ وہ حیران ہوئی۔ ”اس نے تو مجھے نہیں بتایا۔“ آنکھیں اس نے ہاتھ سے مڑ کر صاف کیں۔

”مگر تم فکر مت کرو، بہارے! میں اگلے ہفتے ترکی آؤں گی نا، مجھے اپنی کلیئرٹس کروانی ہے، تب میں اور تم مل کر اسے ڈھونڈیں گے۔ ہم

اسے ڈھونڈ لیں گے، تم میرے آنے تک وہاں ہوگی نا؟“

”مجھے نہیں پتا۔ مجھے کچھ نہیں پتا۔“ وہ جیسے سارے زمانے سے خفا ہو رہی تھی۔

اس نے فون بند کر دیا۔ کتنی ہی دیر وہ سر ڈیسک پر کدھر کر آنکھیں بند کیے بیٹھی رہی۔ اس کا ذہن صرف ایک بات پر مرکوز تھا۔ جہان نے

اسے جانے سے قبل نہیں بتایا کہ وہ کہاں جا رہا ہے، پھر اس نے بہارے کو ایسا کیوں کہا؟ یہ ویڈیو تو پرانی تھی جبکہ بہارے نے جانے سے کچھ دن قبل

کے الفاظ استعمال کیے تھے۔ کب بتایا جہان نے اسے؟

جب وہ اپنی چیزیں سمیٹ کر اٹھی تو بھی اس کا ذہن الجھا ہوا تھا۔

شام ڈھل چکی تھی۔ سب جا چکے تھے۔ وہ شاید اکیلی رہ گئی تھی۔ جب وہ لفٹ میں داخل ہونے لگی تو تایا فرقان بھی ساتھ ہی داخل

ہوئے۔

”آپ ابھی تک یہیں ہیں؟“ وہ ان کو دیکھ کر ذرا حیران ہوئی تھی۔

”ہوں! کچھ کاغذات لینے آیا تھا۔“ وہ اسی سرد مہر لہجے میں بولے۔ تناؤ اور برف کی دیوار ابھی تک بیچ میں حائل تھی۔ اسے پھر سے

اماں پر غصہ آیا کہ کیا ضرورت تھی ظفر کو بلوانے کی۔ وہ گاڑی چھوڑ کر چلا جاتا۔ وہ خود رانیو کر کے آ جاتی۔ ان کا احسان لینا ضروری تھا؟ اور جہان اس

نے کب بتایا تھا کہ وہ کدھر جا رہا ہے؟

لفٹ گراؤنڈ فلور پر رکی تو اس نے پیچھے ہٹ کر بتایا کدھر جا رہا ہے، وہ نکل گئے تو وہ سست روی سے ابھی ابھی سی چلتی جا رہی تھی۔

جہان نے کب بتایا؟ جمبولے پہ اس رات؟ یا ہسپتال میں جب وہ دونوں ابا کے ساتھ تھے؟ یا.....

”بات سنو میری!“ ولید پتا نہیں کہاں سے سامنے آیا تھا۔ حیا بے اختیار ایک قدم پیچھے ہوئی۔ لابی خالی تھی۔ سوائے شیشے کے

دروازے کے ساتھ کھڑے گاؤں کے، جوان کوئی دیکھ رہا تھا۔

”کیا ہے؟“

”اگر تم نے سلیمان انکل سے کچھ کہنے کی کوشش کی تو میں تمہارے ساتھ بہت بُرا کروں گا۔“ انگلی اٹھا کر چپا کر بولتا وہ اسے تنبیہ کر

رہا تھا۔ حیا نے کوفت سے اسے دیکھا۔

”یہ دھمکیاں کسی اور کو دو۔ میں جا رہی ہوں گھر اور میں ابا کو سب صاف بتا دوں گی۔ کر لو جو تم کو کرنا ہے!“ اپنی ساری فرسٹریشن

باہر نکال کر وہ اس کے ایک طرف سے نکل کر آگے بڑھ گئی۔ ولید کچھ کہے بنا تیز قدموں سے چلتا اس کے دائیں طرف سے گزر کر باہر نکل گیا۔

وہ گاؤں کو معمول کی ہدایات دینے کے بعد باہر کی سڑکیاں اترنے لگی۔ باہر آسمان نیلا ہٹ بھری سیاہی سے بھر رہا تھا۔ وہ اب بھی

جہان کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اس نے کب بتایا تھا اسے کہ وہ کہاں جا رہا ہے؟

وہ میڑھیاں اتر کر اب ایک طرف بنے پارکنگ ایریا کی طرف بڑھنے لگی۔ اس کی گاڑی دوسری جانب کھڑی تھی۔ اس تک پہنچنے کے

لیے اسے چند قدم اس لمبی، چوڑی سی روش پہ چل کر جانا تھا۔ وہ بہت غائب دماغی سے قدم اٹھا رہی تھی۔

اگر جہان کہہ رہا تھا کہ اس نے حیا کو بتایا تھا تو اس نے بتایا ہوگا۔ وہ سیدھی طرح کوئی بات بھی نہیں کہتا تھا۔ اس کی ہر بات پھیلی ہوتی

تھی۔ آخر کب بتایا اس نے؟ روش پہ چلتے ہوئے اس نے ذہن پزوورڈ اٹنے کی کوشش کی۔

کہیں دور اسے کوئی پکار رہا تھا۔ اس کے نام کی پکار بار بار بڑبڑاتی تھی۔ وہ اتنی ابھی ہوئی تھی کہ سن نہیں پائی۔ تیز روشنی سی اس کے پیچھے

سے آ رہی تھی۔ ساتھ میں ٹائمر کی آواز۔

ایک دم جیسے کسی خواب سے جاگ کر وہ چونک کر پلٹی۔ وہ ولید کی گاڑی تھی اور وہ تیز رفتاری سے اسے روش پہ چلاتا آ رہا تھا اس کے اوپر

چڑھانے کے لیے۔

”ولید رکو!“ اس کے لبوں سے کراہ تک نہ نکل سکی۔ سانس رکا اور ساتھ میں پورا وجود شل ہو گیا۔ وہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہ سکی۔ تیز ہیڈ

لائٹس اتنے قریب تھیں کہ اس نے اپنے بچاؤ کے لیے صرف چہرے کے آگے دونوں ہاتھ کیے۔

دوسرے ہی لمحے بہت زور کی ٹکر نے اسے سڑک کے دوسری جانب لڑھکا دیا۔

گاڑی زن سے آگے بڑھ گئی۔



باب 12

ہوٹل گریڈ کی بالائی منزل کے اس پر قیث پاور آفس میں پرنفیم کی خوشبو کے ساتھ سگریٹ کی مہک بھی پھیلی تھی۔ وہ ریو الونگ چیئر پہ بیٹھا، لیپ ٹاپ پہ ہوٹل کے ریکارڈز چیک کر رہا تھا۔ قریب رکھا ایش ٹرے سگریٹ کے ادھ جلتے کڑوں اور رکھ سے بھر چکا تھا۔ یہ اس کی واحد بری عادت تھی جسے وہ بہت چاہ کر بھی نہیں چھوڑ سکا تھا۔

اس کی غیر موجودگی میں ہوٹل عثمان شیردیکھتے تھے۔ وہ ایک اچھے اور ایمان دار آدمی تھے۔ ان کا بیٹا سفیر بھی ہوٹل میں کام کرتا تھا۔ لیکن جہان کی کوشش ہوتی، وہ اس لڑکے کو ایڈمنسٹریشن کے معاملات سے دور ہی رکھے۔ سفیر قدرے غیر ذمے دار اور فطرتاً لالچی واقع ہوا تھا۔ عثمان شیرکل پاکستان جا رہے تھے۔ سوان کی غیر موجودگی میں اسے سفیر کو ذرا کھینچ کر رکھنا تھا۔ کل! ہاں کل جا رہے تھے عثمان شیر پاکستان! ڈائمنس دیکھتے ہوئے وہ ایک دم چونکا۔

عثمان شیرکل پاکستان جا رہے تھے؟ اور ان کی واپسی بھی جلد ہی متوقع تھی۔ کیا وہ ان ہی تاریخوں میں واپس آئیں گے، جب پاکستان سے دوا کی کھینچ اسٹوڈنٹس جیاسلیمان اور خدیجہ رانا استنبول آئیں گی؟

کچھ دیر وہ اسی سوچ پر سوچتا رہا، پھر سیل فون اٹھا کر دیکھا۔ حیا کی امی میلو میل باکس پہ لگے کلون کے باعث اسے ملتی رہتی تھیں۔ اس نے آج کی میلو چیک کیں۔ تازہ ترین میل اس کے کلٹ کی کاپی اور الیکٹرونک فارم تھا جو ڈورم الاٹمنٹ کے لیے حیا نے پر کر کے بھیجا تھا۔ اسے یہ میل صبح ملی تھی۔ وہ مصروفیت کے باعث پڑھ نہیں سکا تھا۔ اب پڑھی تو بے اختیار چہرے پہ مسکراہٹ آ گئی۔

اسموکلنگ، ڈرنکلنگ، سب کرتی ہوں۔ سخت جھگڑا لو ہوں۔
پاکل لڑکی۔ کیا، کیا لکھ کر سناغی والوں کو بھیج رہی تھی۔ انہیں واقعتاً اب اسے خونخوار قسم کی لڑکیوں کے ساتھ ڈورم دینا تھا۔ اس نے اسی مسکراہٹ کے ساتھ سر جھٹکا اور پھر کلٹ والی میل چیک کی۔

پانچ فروری کو ان دونوں لڑکیوں کی فلائٹ تھی۔ ابھی اس میں پورے دو ہفتے تھے۔

اب کیا کرنا چاہئے اس کو؟

بالآخر ایک فیصلے پہ پہنچ کر اس نے فون اٹھایا اور عثمان صاحب کی ایکسٹینشن ملائی
”آلو؟“

”عثمان ہے۔ آپ نے واپس کب آنا ہے۔“ بنا تمہید کے اس نے کام کی بات پوچھی۔ بلاوجہ کی تمہیدوں سے تو اسے نفرت تھی۔

”پندرہ، بیس دن تک“ کیوں؟

”پندرہ یا بیس؟“

”آٹھ فروری کی فلائٹ ہے، آپ حساب لگا لیں تقریباً.....“ وہ جیسے خود بھی گننے لگ گئے

”کیا آپ اتحاد ایئر لائنز کی پانچ فروری کی فلائٹ لے سکتے ہیں۔ اصل میں ایک چھوٹا سا مسئلہ ہے، میرے ایک دوست کی بہن اپنی فریڈ کے ساتھ استنبول آرہی ہے۔“

پھر اس نے مختصر الفاظ میں ان کو سمجھایا کہ ان کے درمیان کچھ فیملی کلیش ہے۔ وہ ان کے بارے میں فکر مند ہے کہ پہلی دفعہ استنبول آنے کے پیش نظر ان کو یہاں کوئی مسئلہ نہ ہو، سو وہ چاہتا ہے کہ عثمان شیر ان سے اپنا تعارف کروادیں، تاکہ اگر وہ کبھی مشکل میں ان سے رابطہ کرے، تو وہ فوراً عبدالرحمن کو بتائیں۔ لیکن ظاہر ہے اس کا نام درمیان میں نہیں آنا چاہیے۔ سخت قسم کا گیواشیو ہے۔

متوقع طور پہ عثمان شیر نے فوراً حامی بھر لی۔

فون رکھتے ہوئے وہ اب پہلے سے زیادہ مطمئن تھا۔ پتا نہیں وہ کب اس سے اور می سے رابطہ کرتی ہے۔ اس دوران کہیں اس کو کوئی مسئلہ نہ ہو۔ وہ اس کی بیوی تھی۔ اس کی ذمہ داری اور اگر وہ جان بھی لے کہ عثمان شیر، عبدالرحمن پاشا کے کہنے پہ یہ سب کر رہے تھے تب بھی وہ نہیں جان سکتی تھی کہ عبدالرحمن پاشا کون تھا۔ آخر جان بھی وہ کیسے سکتی تھی؟

عبدالرحمن پاشا اور عبدالرحیم پاشا، یہ دونوں حبیب پاشا کی پہلی بیوی کی اولاد تھے۔

حبیب پاشا ایک درمیانے درجے کے بھارتی برٹس مین تھے۔ وہ کچھ وجوہات کی بنا پر پہلی بیوی اور دو بیٹیوں کو چھوڑ کر کئی برس قبل استنبول آ گئے تھے۔ ترکی میں انہوں نے امت اللہ نامی ترک خاتون سے شادی کی اور پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ ان دونوں کا ایک ہی بیٹا تھا۔ طیب حبیب پاشا، المعروف پاشا ہے۔

(عربی اور اردو کے وہ نام جن کے آخر میں ب آتا ہے۔ ترک زبان میں وہاں سے ب ہٹا کر پ یا P لگا دیا جاتا ہے۔ وہ عرب کو Arap، ازبک کو Zeynep اور طیب کو Tayyip لکھتے ہیں۔ مگر ہم اسے طیب ہی لکھیں گے۔)

(بیوک ادا میں امت اللہ کا خاندانی گھر، وہ عثمانی طرز کا سفید گھر تھا۔ طیب حبیب ابھی چھوٹا تھا جب حبیب پاشا کا انتقال ہو گیا۔ تب امت اللہ اپنے بیٹے کو لے کر اناطولیہ کے ایک گاؤں چلی گئیں جہاں ان کے رشتے دار رہتے تھے۔ یوں وہ گھر بند ہو گیا۔ کئی برس وہ بند رہا۔ پھر طیب حبیب نوجوانی کی دہلیز عبور کرتے ہی فکر معاش کی خاطر اوالار (شہزادوں کے جزیروں) پہنچا گیا۔ اس نے وہ گھر کھولا اور پھر ایک شہزادے کی طرح جینے کی خواہش کے ساتھ بیوک ادا میں رہنے لگا۔

دوران اناطولیہ کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں بیٹھی اس کی سادہ سی ماں نہیں جانتی تھی کہ وہ اوالار میں کیسے لوگوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہے۔ امت اللہ نے بہت دفعہ چاہا کہ وہ بیٹے کے پاس بیوک ادا چلی آئیں، مگر طیب حبیب نے ایسا کبھی نہ ہونے دیا۔ اس کی کمزوری اس کی ماں تھی۔ جو اسے بہت عزیز بھی اور وہ جانتا تھا کہ جس دن اس کی ماں کو ظلم ہوا کہ وہ مافیا کا حصہ بن چکا ہے، اس دن اس کی ماں مرجائے گی۔



ترک ڈرگ اور آرم اسمگلنگ مافیا اپنی مثال آپ تھا۔ برطانیہ میں پہنچائی جانے والی اسی فیصد ڈرگز ترکی کے راستے ہی آتی تھیں۔ البتہ اوالار کا مافیا اٹالوی Sicilian طرز کا مافیا نہیں تھا۔ اٹالوی مافیا فیملیز مضبوط اور منظم طریقے سے ایک علاقے میں کام کرتی ہیں۔ لوگ کسی منظم فوج کی طرح درجہ بدرجہ اس میں عہدے پاتے ہیں۔ اس طرح کی مافیا فیملیز کو ٹریک کرنا اور پکڑنا پولیس کے لیے آسان ہوتا ہے۔ اگر اٹالوی یا سسلین فیملی کے کسی ممبر کو کچھ بھی ہو جائے، فیملی وہیں رہتی ہے اور اپنا کام جاری رکھتی ہے۔

ترک مافیا ایسا نہیں تھی۔ وہ روس کے قریب ہونے کے باعث روسی مافیا کی طرح کام کرتے تھے۔ روسی فیملیز ایک علاقے میں اٹھتی تھیں۔ کچھ عرصہ وہاں وارداتیں کرتی تھیں اور پھر غائب ہو جاتیں۔ کچھ عرصے بعد چہروں کے نقاب بدل کر وہ کسی دوسرے علاقے میں اٹھتیں اور یوں ان کا کام جاری رہتا۔ ان پہ ہاتھ ڈالنا پولیس کے لیے بہت مشکل ہوتا تھا۔ اٹالوی مافیا کی طرح وہ قدیم طرز کے جرائم میں نہیں، بلکہ جدید جرائم (جیسے سائبر جرائم، جعلی کمپنیاں، کرپٹ کارڈ، فراڈ، اسمگلنگ وغیرہ) میں ملوث ہوتی تھیں۔

”یونان سے ترکی اور ایران کے راستے ایشیائی ملکوں بالخصوص پاکستان میں بڑے پیمانے پر اسلحہ اسمگل کیا جاتا تھا اور بعد میں یہی اسلحہ دہشت گردی کی وارداتوں میں استعمال ہوتا تھا۔ جس کی وجہ سے متاثرہ ممالک کی ایجنسیوں کے قابل احتجاج ان فیملیز میں Penetrate کر کے، ان کا اعتماد جیت کر، ان کی شب منٹس کی جبری کیا کرتے تھے۔ کسی کو نہیں معلوم ہوتا تھا کہ کون سا آدمی اصل مافیا فیملی ممبر ہے یا کسی دوسرے ملک کا جاسوس۔

طیب حبیب نے اپنی مافیا فیملی میں جگہ بنانے کے بعد دولت تو بہت کمائی، ساحل کنارے ایک اونچا سا ہوٹل بھی کھڑا کر لیا۔ مگر وہ ان لوگوں میں سے تھا جو بہت زبوں حالی کے بعد لکشی کو اپنے قریب پاتے ہیں تو اپنا ماضی اور احساس کمتری چھپانے کے لیے خود پہ کسی جدی پشتی رئیس کا خول چڑھا لیتے ہیں، بلکہ خول چڑھانے کی کوشش ہی کرتے رہتے ہیں۔ کیونکہ فیشن خریدنا سکتا ہے، مگر اسٹائل نہیں۔ طیب حبیب بھی کوہ اور ہنس کے درمیان پھنس کر رہ گیا تھا۔ زندگی کا ایک لمبا عرصہ چھوٹے لوگوں کے ساتھ گزارنے کے باعث وہ ذہنی طور پہ آج بھی اسی کلاس میں تھا۔ بھاتاؤ کر کے خریداری کرنے والا کسی ڈھابے نما ہوٹل کے شیف کے ساتھ بیٹھ کر ملکی حالات پر تبصرہ کرنے والا۔ خود بھی وہ ہوٹل میں اپنے پاور آفس کی بجائے نیچے کچن میں پایا جاتا تھا۔ ہوٹل کو اس نے کبھی اپنی مافیا سرگرمیوں کا مرکز نہیں بنایا تھا اور وہاں ایک شریف آدمی کے طور پہ جانا جاتا تھا۔ اس کی اسی فطرت کے باعث اس کے درکرز اس سے خاصے بے تکلف تھے۔ یہاں پہ آکر اس کے مصنوعی خول میں دراڑیں پڑنے لگتی تھیں۔ تب ہی اس نے خود کو پاشا بے کہلوانا شروع کر دیا۔

ترکی میں عموماً پہلے نام کے ساتھ ہی پکارا جاتا ہے، جبکہ اوالار میں آخری نام (سر نیم) کے ساتھ ”مسٹر“ کہلوانا، خود پسندی اور

تکبر کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ مگر طیب حبیب کبھی نہیں جان سکا کہ انسان کا لہہ اپنے نام یا لقب کی کی وجہ سے نہیں، اس کے اخلاق اور کردار کی وجہ سے بڑا ہوتا ہے۔

طیب حبیب نے اپنی مافیا فیملی میں ایک عرصہ بطور فیملی ممبر کام کیا، مگر پھر زیادہ پیسے کے لیے اس نے جہان کی ایجنسی سے ڈیلنگ شروع کر دی۔ بہت جلد وہ ان کے مہرے کے طور پر کام کرنے لگا اور پھر اس نے اپنے تمام اختیارات استعمال کرتے ہوئے اپنے ایک ساتھی ایجنٹ کو اپنے سوتیلے بھائی کی حیثیت سے اپنی فیملی میں متعارف کروایا۔ عبدالرحمن پاشا، جو واقعی اس کے سوتیلے بھائی کا نام تھا۔ جہان سکندر نے یہ نام استعمال کر کے بہت جلد طیب حبیب کی فیملی میں اپنا مقام بنالیا۔ فیملی سے مراد اس کا خاندان نہیں، بلکہ مافیا کا گروہ تھا اور چونکہ یہ اطالوی مافیا نہیں تھا اور اس میں Capo اور man-made نہیں ہوتے تھے۔ سو اس روسی مافیا میں اپنی جگہ بنانا بہت مشکل ثابت نہیں ہوا۔ پیسہ اس دنیا کے اکثر مسائل کا ریڈی میڈ حل ہوتا ہے، زندگی اور خوشی کے علاوہ اس سے ہر چیز خریدی جاسکتی ہے۔

طیب حبیب اور عبدالرحمن ایک ذیل کے تحت بھائیوں کی طرح کام کرنے لگے تھے۔ طیب اسے اپنی ماں سے ملوانے بھی لے گیا تھا اور وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ایک سادہ لوح عورت کو اپنے نرم رویے اور محبت بھرے انداز سے کیسے اپنے لیے مہم کرنا ہے۔ امت اللہ اس کے بارے میں بس اتنا جانتی تھیں کہ وہ ان کے بیٹے کا دوست ہے اور اس نے ان کے بیٹے کی جان بچائی ہے جس کے باعث وہ اس کی احسان مند تھیں۔ چونکہ وہ بیوک ادا میں نہیں رہتی تھیں، اس لیے طیب کو یہ سب ان کو بتانے میں عار محسوس نہیں ہوئی تھی۔ وہ سب سے جھوٹ بول سکتا تھا۔ مگر آنے سے یہ بات نہیں چھپا سکتا تھا۔

حبیب پاشا کے انتقال پر ان کے دونوں بیٹے انڈیا سے یہاں آئے تھے اور پچھلے درمیان میں کتنے برس گزر جائیں، آنے کو ان کی شکلیں اور رنگ اچھی طرح یاد تھا۔ وہ جانتی تھیں کہ یہ عبدالرحمن ان کے شوہر کا بیٹا نہیں ہے، مگر جب ان کا اپنا بیٹا بھند تھا کہ اپنے دوست کو اپنے بھائی کے طور پر متعارف کروانے میں اس کا فائدہ ہے تو وہ بھی اس بات کو بھاننے کے لیے راضی ہو گئیں۔ ویسے بھی عبدالرحمن ایسا بیٹا تھا جیسا وہ طیب حبیب کو بنانا چاہتی تھیں۔ اس کے اقدار، تہذیب، اخلاق، غرض ہر شے آنے کے لیے فخر کا باعث تھی۔

کافی عرصہ ان دونوں نے بیوک ادا میں ایک ساتھ کام کیا۔ البتہ طیب حبیب یہ نہیں جانتا تھا کہ عبدالرحمن ٹریڈل ایجنٹ کے طور پر کام کر رہا ہے۔ ادا میں اپنا نام بنانے کے لیے اسے ترک خفیہ ایجنسی کی مدد چاہیے تھی۔ تاکہ گرفتاری کی تلوار پر لٹکانا بند ہو جائے۔ بدلے میں وہ مافیا کی معلومات ترکوں کو دیتا تھا اور اگر اسے ترکوں کی کوئی خبر ملتی تو اسے مافیا تک پہنچا دیتا تھا۔ یوں وہ ایک خالص ٹریڈل ایجنٹ تھا۔ جو صرف اپنی ایجنسی کے ساتھ وفادار تھا۔ تاش کے چوں کا گھر اس نے بہت محنت سے کھڑا کیا تھا اور اسے معلوم تھا کہ جس دن یہ پتے ذرا سی جھوک سے اٹھے، اس روز وہ اپنی جان بچانے کے لیے ترکوں اور مافیا، دونوں سے بھاگ رہا ہوگا۔ مگر پھر خطرات کے بغیر زندگی بھی کوئی زندگی ہوتی ہے؟

اس نے نامحسوس انداز میں طیب حبیب کے ہوٹل گریڈ میں عمل دخل شروع کر دیا تھا۔ وہ طیب حبیب سے برعکس شخصیت کا مالک، ورکرز سے خاص فاصلہ رکھنے والا باس تھا۔ اس کے بیش قیمت سوٹ، دو قیمتی پتھروں والی انگوٹھیاں جو بظاہر سونے کی لگتیں اور گلاسز، ہر شے طیب سے بہت مختلف اور پرفیکٹ ہوا کرتی تھی۔

پاکستان سے اسے اجازت تھی کہ وہ چاہے تو یہاں شادی کر سکتا ہے، وطن واپسی پر اس کی بیوی کو پاکستانی شہریت دی جائے گی، مگر وہ اس منہج پر نہیں سوچا کرتا تھا۔

پھر ایک روز طیب حبیب اچانک سے یونان میں گرفتار ہو گیا۔ اس میں جہان کا تصور نہیں تھا۔ ہاں وہ طیب کو چھڑانے کے لیے بہت کچھ کر سکتا تھا۔ لیکن اس نے نہیں کیا۔ اس کے پاس نے کہہ دیا کہ وہ خاموشی سے اپنا کام کرے اور طیب کو اس کے حال پر چھوڑ دے۔ اس نے بھی چھوڑ دیا۔ اپنی مرضی اس کام میں وہ نہیں چلا سکتا تھا۔ طیب نے کئی دفعہ اسے پیغام پہنچایا کہ وہ اس کے لیے کچھ کرے۔ مگر اس نے منی ان سنی کر دی۔ البتہ ایک بات جہان نے اس کی مانی اور وہ یہ تھی کہ اس کی ماں کو کچھ خبر نہ ہو کہ وہ جیل میں ہے۔ اس نے سب کو کہہ دیا کہ وہ خود بھی لاعلم ہے کہ پاشا بے کہاں ہے۔

اس کام میں اس کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ آنے کبھی ایسا تصور بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ وہ گواہ تھیں کہ عبدالرحمن، پاشا بے سے بہت محبت کرتا ہے اور اس پر پانی کی طرح پیسہ بہاتا ہے۔ ان کو معلوم تھا کہ ان کے بیٹے کے ہوٹل کو ترقی صرف اور صرف عبدالرحمن کے تجربے و سرمائے کی وجہ سے ملی ہے۔ وہ بھلا کیسے اس پر شک کر سکتی تھیں۔ بس وہ بہت اداں، بہت پریشان رہنے لگی تھیں۔ وہ ان کے لیے دکھی تھا، مگر اسے حکم نہیں تھا کہ وہ سب چھوڑ چھوڑ کر پاشا بے کے لیے یونان چلا جائے۔

پھر گرد و دواخ میں ہر جگہ اس نے کہنا شروع کر دیا کہ پاشا بے کام کے باعث یونان منتقل ہو گیا ہے۔ یہ گرفتاری صیغہ راز میں تھی۔ سو اس کی اس بات سے سب مطمئن تھے اور سب کچھ ٹھیک جا رہا تھا۔

طیب حبیب پاشا کے جانے کے بعد اس نے ہوٹل کا کنٹرول سنبھال لیا تھا۔ پہلے اس نے ملازمین کو قابو کیا۔ لوگ لالچ یا خوف سے ہی قابو ہوتے ہیں۔ اسی طرح ان سے کام لگایا جاتا ہے۔ جس کو وہ لالچ دے کر وفادار بنا سکتا تھا۔ اس کو ویسے بنایا اور پھر ہر ایک وکر کی زندگی کے سیاہ اور اوراق چھانے، تاکہ جب کبھی کوئی نیزہ پن کرے پتو وہ اس کی رسی کھینچ سکے۔ اب وہ ہوٹل گریڈ کا بلاشرکت غیرے مالک تھا اور اس نے اوبالار میں اپنی ایک شہرت بنائی تھی۔

اور پھر تہہ آنے کے ساتھ وہ دولڑکیاں آگئیں۔

وہ امت اللہ حبیب کی رشتے کی پوتیاں تھیں۔ ان کے ماں، باپ کا ایک حادثے میں انتقال ہو گیا۔

وہ گاؤں میں آنے کا واحد رشتے دار گھرانہ تھا، ماں باپ کی وفات کے بعد ان کا اکیسے گاؤں میں رہنے کا جواز نہیں بنتا تھا تو امت اللہ ان کو ساتھ لے آئیں۔

جہاں کو آج بھی وہ دن یاد تھا، جب وہ پہلی دفعہ ان دولڑکیوں سے ملا تھا۔ آنے نے اس کو فون پہ بتایا تھا کہ وہ ان بچیوں کو ساتھ لا رہی ہیں۔ وہ اس وقت ہوٹل میں تھا۔ بعد میں جب گھر پہنچا تو بنا چا پ اندر داخل ہوتے ہوئے وہ لاؤنج میں بیٹھی دولڑکیوں کو دیکھ کر خنجر گیا۔ ایک اسکارف لپیٹے بڑی لڑکی تھی اور دوسری گھٹنگریالی پونی والی چھوٹی بچی۔ وہ بچی پانی پی کر گلاس رکھ رہی تھی۔ جب اس نے بڑی لڑکی کو تاسف سے نفی میں سر ہلا کر کہتے سنا۔

”بہارے گل! پانی پی کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں۔ یاد ہے ہمارا وہ چوڑا پانی کنوری سے پانی چونچ میں لینے کے بعد گردن اٹھا کر آسمان کو دیکھ کر پہلے شکر ادا کرتا تھا اور پھر گردن جھکا کر دوسرا گھونٹ پیتا تھا۔“

چھوٹی بچی نے اس سے بھی زیادہ تاسف سے پیشانی پہ ہاتھ مارا

”مگر عائشہ گل! وہ تو اس لیے گردن اونچی کرتا تھا تاکہ پانی حلق سے نیچے اتر جائے، مجھے بابا نے خود بتایا تھا۔“

اسے جیسے اپنی بڑی بہن کی کم علمی پہ بہت انوس ہو رہا تھا۔

”تم نہیں سدھو گی۔ بڑی لڑکی گلاس اٹھا کر بچن کی طرف چلی گئی۔ وہ جولابی کے دروازے کی اوٹ میں کھڑا تھا۔ باہر نکل کر سامنے

آیا۔ کسی مقیم ایجنٹ کے لیے کوفٹیل میں کسی نفرز کو اضافہ خوش آمد بات نہیں ہوتی۔ وہ بھی ان کے آنے سے خوش نہیں تھا۔

چھوٹی بچی نے آہٹ پہ چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ پھر بے اختیار اس کے جوتوں کو۔ اس کی بھوری سبز آنکھوں میں حیرت ابھر

آئی۔ وہ واقعی گاؤں کی لڑکیاں تھیں۔ جن کو نہیں معلوم تھا کہ استیبول کی ہائی ایلٹیٹ گھر میں جوتے پہن کر داخل ہوتی ہے۔

”مرحبا..... کیا تم آنے کے بیٹے ہو۔“ اگلے ہی لمحے وہ حیرت بھلائے، دلچسپی سے اسے دیکھتی اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

”ہوں..... اور تم۔“ وہ گردن ذرا جھکا کر اس ننھی لڑکی کو دیکھ رہا تھا

”میں بہارے گل ہوں۔ انا تولیہ کی بہارے گل“

”تمہارا مطلب ہے گل بہار۔“ اس نے سوالیہ انداز اٹھائی۔ ترکی میں گل اور بہار کو کبھی بہارے گل کہہ کر نہیں ملاتے تھے۔ بلکہ گل بہار

کا مرکب بنایا جاتا تھا۔

”نہیں! میں بہارے گل ہوں۔ یہ ایرانی نام ہے اور اس کا مطلب ہوتا ہے گلاب کے پھول پہ آئی بہار۔ پتا ہے میرا نام یہ کیوں ہے۔“

”کیوں۔“

”کیونکہ میری آنم (ماں) کا نام آئے گل تھا۔ یعنی چاند کا پھول، میری نانی کا نام غنچے گل تھا اور میری بہن کا نام ہے عائشہ

گل۔ یعنی وہ گلاب جو ہمیشہ زندہ رہے۔“ اس نے بہت سمجھ داری سے کسی رٹے رٹائے سبق کی طرح اپنی نام کی وجہ تسمیہ بیان کی جو شاید محض ہم آواز کرنے کے لیے رکھا گیا تھا۔

”بہت دلچسپ..... ترکی کے سارے پھول تو تمہارے خاندان میں ہیں۔ تمہارے بابا کا نام کیا ہوگا پھر۔ شاید کو بھی کا پھول۔“ وہ ذرا

مسکراہٹ دبا کر بولا تو بہارے گل کی آنکھیں حیرت سے ہوا ہوئیں۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے ان میں شرارت کی چمک ابھری اور وہ مسکرائی۔

”نہیں ان کا نام غفران تھا۔“

”بہارے محل!“ اسی ہل اس کی بہن مکن سے باہر نکلے۔ ”جلدی سے ناخن کاٹ لو۔ لمبے ناخن بلیوں کے اچھے لگتے ہیں بڑکیوں کے نہیں۔“ پھر اس پہ نگاہ بڑی توسعیدگی سے مہربانہ کر آگئے نکل گئی۔

بہارے محل نے انہوں سے اپنی بہن کو جاتے ہوئے دیکھا۔ پھر اس کی طرف چہرہ کر کے بہت رازداری سے بتایا۔

”برامت ماننا، میری بہن آدھی پاگل ہے۔“

”اور شاید بہت عرصے بعد وہ بہت زور سے ہنسا تھا۔“

اسی دن اس کی اس جھوٹی سی شرارتی اور ذہنی لڑکی سے ایک وابستگی ہی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ اس کی ہر بات پہ نہیں ہنستا تھا۔ نہ ہی بہت زیادہ بے تکلف ہوتا تھا۔ مگر اس بچی کو تو جیسے وہ پسند آ گیا تھا۔ وہ اسٹڈی میں بیٹھا کام کر رہا ہے تو وہ دبے پاؤں آ کر اس کے قریب بیٹھ جائے گی۔ صبح وہ ہوٹل جانے کے لیے تیار ہو رہا ہے۔ تو وہ کبھی اس کے جوتے پاش کر کے لادے گی تو کبھی گلاس صاف کر کے۔ بعد میں اسے معلوم ہوا کہ وہ کام عائشے کرتی تھی بلالازمہ، مگر مجال ہے جو بہارے محل نے کبھی کسی اور کو کریڈٹ لینے دیا ہو۔ وہ اپنی بہن سے بہت مختلف، ذرا باغی طبیعت کی مالک تھی۔ عائشے ایسی نہیں تھی۔ وہ کم ہولنے والی، دھیمی اور بنجیدہ مزاج کی، ایک فاصلے پر رہنے والی لڑکی تھی۔ ان دونوں کی بات چیت ڈانٹنگ فیملی پر ہی ہو پاتی، یا یوں ہی گزرتے ہوئے۔

مگر وہ شروع سے ہی اس کی طرف سے لاشعوری طور پہ فکرمندر رہنے لگا تھا۔ وہ اسے واقعی طیب حبیب کا سوتیلا بھائی سمجھتی تھی۔ لیکن جو بھی تھا وہ اس گھر کی مالکن بن گئی تھی۔ (یہ سفید عمل آنے نے عائشے کے نام کر دیا تھا اور اس نے اعتراض نہیں کیا تھا) وہ قانونی طور پہ آنے اور طیب حبیب کی اصل وارث تھی۔ مگر کبھی وہ ہوٹل کے معاملات میں دخل دینے لگے تو وہ کیا کرے گا۔ بیس سال کی لڑکی سے اسے یہ امید نہیں کرنی چاہیے تھی۔ مگر اس کا ماننا تھا کہ انسان کا کچھ پتا نہیں ہوتا اور لوگوں پہ اعتبار تو وہ ویسے ہی نہیں کرتا تھا۔)

پھر کچھ عرصہ گزرا اور عائشے کے کانوں میں بھی لوگوں کی باتیں پڑنے لگیں۔ آنے تو عبادت میں مشغول رہنے والی، ایک بہت ہی غیر سوشل خاتون تھیں۔ ان کی طرف سے اس کو فکرمند نہیں تھی۔ مگر جب عائشے ابھی ابھی رہنے لگی اور ایک دن صبح اس نے جہان کو کہا کہ شام میں وہ اس سے کچھ بات کرنا چاہتی ہے تو وہ اچھا کہہ کر باہر نکل گیا۔ مگر اندر سے وہ ذرا پریشان ہو گیا تھا۔

تاش کے پتوں کا گھر بکھیرنے کے لیے آنے والا جھونکا عمو ما وہاں سے آتا ہے جہاں سے کبھی امید بھی نہیں کی جاسکتی۔ اب اسے اس لڑکی کو اچھے سے سنبھالنا تھا، تاکہ وہ اس کے لیے کوئی مسئلہ نہ پیدا کرے۔

انسانوں کو قابو ان کی کمزوریوں سے کیا جاتا ہے اور اگر آپ چاہتے ہیں کہ کوئی آپ کے معاملے میں دخل نہ دے تو آپ کو نامحسوس طریقے سے اس شخص کو اس کے اپنے معاملات میں الجھانا و مصروف کرنا پڑتا ہے۔ عائشے کی کمزوری اس کا دین تھا۔ وہ بہت مذہبی اور practising قسم کی مسلمان تھی۔ اسے یاد تھا ایک روز وہ سوتی رہ گئی اور اس کی فجر جھوٹ گئی تو وہ پچھلے بانجھے میں بیٹھ کر کتنا روئی تھی۔ سو اس شام جب وہ اس سے بات کرنے آئی تو وہ اسٹڈی میں قرآن کھولے بیٹھا تھا۔

قرآن پڑھنے کا جو وقت اسے جیل میں ملتا تھا، پھر دوبارہ کبھی نہیں مل سکا تھا۔ اب کبھی کبھی وہ قرآن پڑھ پاتا تھا۔ اب بھی عائشے آئی تو جہان نے اس کی بات سننے سے قبل اپنی کہنی شروع کر دی۔ وہ جانتا تھا کہ عائشے کے نزدیک اس کا رف لینا زندگی اور موت کا مسئلہ تھا اور بہارے محل اس چیز سے سخت بے زار تھی۔ اس نے سورہ الاحزاب کھولی اور اس سے پوچھنے لگا کہ کیا وہ جانتی ہے سورہ الاحزاب میں آیت حجاب کیوں اتری ہے۔ اور یہ کہ یہ بھی ایک پہیلی۔ ویسے تو سورہ نور میں بھی آیت خمار ہے، مگر اصل آیت حجاب سورہ الاحزاب میں ہے۔ کیا وہ یہ پہیلی حل کر سکتی ہے۔ یہ بات بہت پہلے اس نے کسی اسکار سے سنی تھی۔ البتہ اس نے اسکار کا پورا لیکچر نہیں سنا تھا۔ اس لیے وہ خود نہیں جانتا تھا کہ ان دو چیزوں میں کیا تشبیہ ہے۔

مگر عائشے اپنا مسئلہ بھول کر اسی بات میں اٹک گئی۔

اس کے بعد جہان نے اسے اپنے متعلق پہلی خبروں کو ڈھنسنوں کی پھیلائی ہوئی افواہیں سمجھ کر نظر انداز کرنے پر بہت اچھے سے قائل کر لیا۔ عائشے جب اس کے پاس سے اٹھ کر گئی تو اس کا ذہن مشکوک و شبہات سے خالی تھا، اور وہ صرف سورہ الاحزاب کی پہیلی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ پھر وہ روز صبح پچھلے بانجھے میں قرآن اور ایک کاپی لے کر بیٹھ جاتی اور قلم سے اس کاپی پہ خدا جانے کیا، لکھتی رہتی۔ ایک دن اس نے آخر جہان کو وہ پہیلی بھی اپنے طور پہ حل کر کے بتادی۔ اب وہ اسے دوبارہ کیسے مصروف کرے۔ خیر، اس نے حل

نکال لیا۔ عثمان شہیر کی بیگم جلدی کے بچوں کو قرآن پڑھایا کرتی تھیں، اس نے عائشہ کو وہاں بھیج دیا اور وہ تو جیسے اپنے سے لوگ ڈھونڈ رہی تھی، وہ روزِ جمعہ ادھر جانے لگی۔ (بہارے نے البتہ جانے سے صاف انکار کر دیا تھا۔)

عائشہ کو مصروف کرنے کے لیے اس نے یہ بھی چاہا کہ وہ کالج میں داخلہ لے لے۔ مگر ان دنوں کا تعلیمی سال اپنا گاؤں چھوڑنے کے باعث ضائع ہو گیا تھا۔ سو وہ دنوں میں صرف اس کے وہ اگلے سال داخلہ لیں گی۔

پھر ایک روز اس نے بہارے کے پاس ایک پائینز پرل باکس دیکھا تو بہارے نے بتایا کہ ایک چینی بوڑھے نے عائشہ کو یہ فن سکھایا تھا۔ یہ بات بہت حوصلہ افزا تھی۔ اس نے عائشہ کو سمجھایا کہ اسے وہ باکس دوبارہ سے بنا کر بیچنے چاہئیں۔ اس مقصد کے لیے کافی وقتوں سے اس نے عائشہ کے لیے بالخصوص بیوک ادا کے جنگل میں لکڑی کاٹنے کا پرست بنوا دیا تھا۔ بلا آخر وہ دنوں لڑکیاں اپنے اپنے کاموں میں اتنی مصروف ہو گئی تھیں کہ ان کے پاس عبدالرحمن پاشا کے معاملات میں مداخلت کا وقت نہیں رہا تھا۔ عائشہ تو جیسے اب اس پہ شک نہیں کر سکتی تھی۔ جو شخص قرآن کو اتنی گہرائی سے پڑھتا ہو، وہ بھلا برا آدمی کیسے ہو سکتا تھا۔

چند روز مزید آگے سرکے۔ ہر کام چناتے ہوئے اس کے لاشعور میں دنوں کی گنتی جاری رہتی تھی۔

پانچ فروری، یعنی اس کی بیوی کے استنبول آنے میں کتنے دن رہ گئے ہیں۔ دس، نو، آٹھ

پھر اسے یہ احساس ہونے لگا کہ وہ اس کے بارے میں فکر مند بھی رہنے لگا ہے۔ ہاں ٹھیک ہے، اتنا خیال تو اسے استنبول میں مقیم اپنی سگی ماں کا بھی تھا کہ وہ ان کے متعلق باخبر رہا کرتا اور بار بار ان کے بارے میں پتا کرتا رہتا تھا۔ اب اس کی بیوی کا بھی حق تھا کہ وہ اس کا خیال رکھے۔ پاکستان میں وہ ایک طرح سے فارغ تھا۔ وہاں ہر وقت گرفتاری کا خدشہ نہیں ہوتا تھا۔ مگر استنبول میں وہ اپنی بیوی کی ہر موپہ نظر نہیں رکھ سکتا تھا۔ مگر کھنا ضرور چاہتا تھا۔ کوئی ایسا آدمی جو قابل اعتبار ہو۔ جو اس کی نگرانی کر سکے۔

ہاشم الحسنان کا نام اس کے ذہن میں سب سے پہلے آیا تھا۔ ہاشم اس سے پہلے بھی اس کے ایسے کئی کام کر چکا تھا۔

جہان نے فوراً اس سے رابطہ کرنا چاہا تو اس کی بیوی نے بتایا کہ وہ دہی گیا ہوا ہے۔ ہاشم چھوٹے موٹے جرائم میں ملوث رہنے اور استنبول میں جیل ریکارڈ رکھنے کے باعث یہاں کوئی ڈھنگ کی نوکری نہیں کر سکتا تھا۔ پتا نہیں دہی میں اس کا کون بیٹھا تھا، مگر وہ ادھر چلا گیا تھا۔ البتہ وہاں بھی اس کی کوئی خاص کمائی نہیں ہو رہی تھی۔ شاید اس کا بچہ بیمار تھا اور اس کو کافی رقم کی ضرورت تھی۔ جہان نے اسے بلوایا۔ مگر اس نے ہاشم کو ابوظہبی سے اسی فلائٹ پہ استنبول آنے کا کہا۔ وہی فلائٹ تھی جو حیا اور اس کی دوست کو لینی تھی۔

وہ چاہتا تھا کہ ہاشم ایئر پورٹ پہ اسے سفید پتھروں کا گلہستہ پہنچا سکے۔ یہ اس لیے تھا تا کہ حیا ان سفید پھولوں کے بھیجنے والے کو نہ بھولے۔ مگر یہ نہیں ہو سکا۔

ہاشم نے واپس آ کر اسے بتایا کہ جب وہ فون پہ بات کر رہا تھا تو دہی لڑکی اس کے پاس کارڈ ڈالنے کا طریقہ پوچھنے آئی تھی۔ ایسے میں وہی اس کو چند منٹ بعد پھول لا کر دے، یہ ٹھیک نہیں تھا۔ ہاشم کی بات پہ وہ گہری سانس لے کر خاموش ہو گیا۔

زندگی میں ہر چیز پھر اپنی مرضی اور پلاننگ سے تو نہیں ہوتی نا!

پانچ فروری کو حیا نے آنا تھا، اور اسی صبح ایک سر پرانہ اس کے آفس میں اس کا منتظر تھا۔

طیب حبیب پاشا!

وہ واپس آ گیا تھا۔

جانے وہ کیسے فرار ہو کر واپس پہنچا تھا۔ مگر وہ بہت برے حال میں تھا۔ استنبول میں اس کے دشمن بڑھ گئے تھے اور وہ ان سے بچنے کے چکر میں بالکل ہفرور مجرم کی طرح گویا خانہ بدوش کی زندگی گزار رہا تھا۔ وہ جہاز سے سخت بدگمان تھا کہ اس نے اس کی کوئی مداخلت نہیں کی۔ پاشا بے بار بار یہی کہہ رہا تھا کہ جہان نے اس کو دھوکا دیا ہے۔ (وہ اس کی دوسری شناخت سے واقف تھا۔ کیونکہ برگرنگ اس ریسٹورنٹ تھا۔ جہاں حالات خراب ہونے کی صورت میں جہان چلا گیا کرتا تھا۔) اب اس کا اصرار تھا کہ جہان اور اس کی انجینیئر اپنا وعدہ پورا کرے اور اس کو اپنے خاندان سمیت کسی دوسرے ملک میں سیٹل کروادے۔ جہان جانتا تھا کہ انجینیئر یہ کروادے گی۔ مگر پھر بھی وہ چاہتے تھے کہ پاشا بے راہبر کرے۔ مگر پاشا بے کو بہت سا پیسہ اور نئی زندگی، بہت جلدی چاہیے تھی۔

وہ بہت لڑبھڑک رہا تھا کہ وہاں سے گیا اور اس کے جانے کے بعد جہان فیری لے کر استنبول آ گیا۔ برگرنگ اور ہوٹل گرینڈ یہ دو واحد جگہ ہیں

تھیں جہاں پاشا بے اس سے ملنے آ سکتا تھا اور ایسے جھڑے کو برگرنگ پکرنے کا عمل تھا، مگر بھول کر بیٹھ نہیں۔
مئی سے وہ آج ملا تھا۔ وہ اس کے آنے پہ حسب توقع بہت خوش تھیں۔ مگر زیادہ خوشی اپنی بیٹی کی آنے کی تھی۔ وہ چاہتی تھیں کہ کل یا پرسوں وہ جا کر حیا کو ہاسٹل مل آئیں۔ پتا نہیں وہ خود اصرار آئے یا نہیں۔

اس نے کہہ دیا کہ وہ نہیں جائے گا۔ اس کا ذاتی خیال تھا کہ سلیمان ماموں کی بیٹی اتنی جلدی تو خود ان سے ملنے نہیں آئے گی۔ مگر اگلے ہی دن اس کا خیال غلط ثابت ہوا۔ وہ کچن میں کھڑا مئی کا کیبنٹ جوڑ رہا تھا (ایسے کام مئی اس کے لیے رکھ دیا کرتی تھیں!) جب اس کا فون بجا۔ جہان نے فون نکال کر دیکھا۔ یہ اس کا بی بی ایس ٹریسر الرٹ تھا جو اگر اس کی حدود میں آتا تو بجنے لگتا۔ یعنی اگر اس سے ایک فاصلے تک حیا آئے گی تو ٹریسر جہان کو اطلاع دے دے گا۔ یہ اس نے اس لیے کر رکھا تھا تاکہ کبھی اگر وہ اپنے کسی خاص مہمان کے ساتھ کسی جگہ موجود ہے اور اسی جگہ پہ اتفاقیہ یا غیر اتفاقیہ طور پہ حیا آجائے، تو وہ بروقت اطلاع پالے۔

اس وقت اس کا ٹریسر اسے بتا رہا تھا کہ وہ اس کے قریب ہی ہے اور جس سڑک پہ وہ ہے، وہ جہانگیر کو بی آتی ہے۔
وہ دوسرے ہی دن اس کے گھر آ رہی تھی؟

ویری اسٹریچ!

اس نے مئی کو کچھ نہیں بتایا۔ مگر اپنے گھر سفید پھول ضرور منگوا لیے۔ وہ اسے ڈراستانا چاہتا تھا۔ جس لڑکی کے لیے وہ اتنا عرصہ خوار ہوا تھا۔ اسے تھوڑا سا خوار کرنے میں کیا حرج تھا۔ چلو دیکھتے ہیں کہ وہ کیسا رد عمل دیتی ہے!
کھنٹی ہوئی، تو اس نے خود جا کر دروازہ کھولا۔ پہلی دفعہ وہ اس سے بطور جہان سکندر کے مل رہا تھا۔ وہ آج بھی سیاہ رنگ میں ملبوس تھی، (اس رات کی طرح جب وہ ان کے گھر گیا تھا)، ڈائریس، انگلیاں چمٹاتی ہوئی، اس کے جوتوں کا رخ سارا وقت دروازے کی سمت ہی رہا، جیسے وہ وہاں سے بھاگ جانا چاہتی ہو۔ جیسے وہ اپنی مرضی کے بغیر، اچانک لائی گئی ہو اور پھر۔

وہ اس سے اسی خشک طریقے سے ملا جیسے وہ اپنے ماموں کی بیٹی سے مل سکتا تھا، جیسے اسے ملنا چاہیے تھا۔ پھر بھی اسے امید تھی کہ اس کے ”کون حیا سلیمان“ کہنے کے جواب میں وہ شاید کہہ دے، ہنہاری بیوی اور کون۔ مگر وہ بہت نروس اور الجھی لگ رہی تھی۔ وہ جہان سے اتنی مختلف تھی کہ وہ پھر سے بدول ہونے لگا۔ پتا نہیں کیا بنے گا ہمارا؟؟؟

☆ ☆ ☆

مئی اس سے مل کر خوش ہوئیں۔ ہونا بھی چاہیے تھا، مگر سارا ماحول تب بدلا جب وہ اسے اپنے باپ اور تایا والی طنزیہ ٹون میں ان کو احساس دلانے لگی کہ وہ رشتے داروں کے ساتھ بنا کر نہیں رکھتے۔ وہ بظاہر کام کرتے ہوئے سب سن رہا تھا۔ غصہ آیا، افسوس بھی ہوا، اگر مئی سامنے نہ ہوتیں تو وہ اسے بتاتا کہ کس نے کس سے رشتہ توڑا تھا۔

پھر اس لڑکی نے ابا کے آری سے تعلق کا پوچھا۔ یا تو وہ نہیں جانتی تھی، یا پھر طنز کرنے کا کوئی اور بہانہ۔ اس کے اندر مزید تنگی بھرتی گئی۔ وہ شاید واقعی یہ رشتہ نہیں رکھنا چاہتی تھی۔ پہلے اس کا ارادہ محض سفید پھول بھیجنے کا تھا، مگر اس ساری تلخ گفتگو کے بعد جب وہ پھول لینے گیا تو داخلی دروازے کے اندر کی طرف رکھے اسٹینڈ سے قلم کا غذا اٹھایا، اور مونے گتے کے گرومری لکھنے کے پیڈ پہ ویلنٹائن کا پیغام لکھ کر انڈر ڈال دیا۔ یہ اس کا طریقہ تھا بدلہ لینے کا۔ اور وہ بھی جیسے وہاں سے بھاگنا چاہتی تھی۔ ایک منٹ نہیں رکی پھر۔ کھانا بھی اٹھوڑا چھوڑ دیا اور چلی گئی۔ اپنے کمرے کی کھڑکی سے وہ اسے اس وقت تک جاتے دیکھتا رہا جب تک کے وہ سڑک پہ دور نہ چلی گئی۔

بعد میں مئی بہت خفا ہوئیں۔ وہ اپنے بیٹے اور اس کے انداز کو بہت اچھے سے پہچانتی تھیں۔ مگر وہ ان کی سرزنش اور ساری خشکی کو سنی ان سنی کر گیا۔ اسے لگا اسے سلیمان ماموں کی بیٹی کے ساتھ یہی کرنا چاہیے تھا، لیکن پھر بعد میں اسے پتا نہیں کیوں افسوس ہونے لگا۔ اس میں اضافہ تب ہوا جب مئی نے فاطمہ مامی سے فون پہ بات کی تو انہوں نے بتایا کہ حیا کو اس کی دوست اچانک سے وہاں سے لے گئی تھی۔ اس وقت جلدی میں تھی۔ بعد میں تسلی سے اس نے ہفتے کسی دن آئے گی، تحائف وغیرہ اسی لیے نہیں لاسکی۔ سو وہ مغرور لڑکی اپنی مرضی سے واقعی نہیں آتی تھی۔ خیر، اب کیا ہو سکتا تھا؟

وہ آج کل استقلال اسٹریٹ میں ہی ہوتا تھا۔ یہ لگی مافیاء راج کے لیے خاصی مشہور تھی۔ چھوٹے چھوٹے بھکاری بچے جو بھیک مانگنے کے بہانے سیاحوں کے قریب آتے اور پرس جھپٹ کر بھاگ جاتے۔ ان بچوں سے لے کر ڈرگز بیچنے والوں تک، سب آگنا نزد کرانم کا حصہ تھے۔ برگرنگ طیب حبیب کا تھا۔ مگر اس کا انتظام بھی جہان ہی سنبھالتا تھا۔ جب اسے deactivate ہونا پڑتا تو وہ یہیں

آکر چھپ جاتا۔ لیکن میں کھڑے ہو کر عام سے محلے میں سارا دن چند دور کرکڑ کے ساتھ کام کرتے ہوئے یہ اندیشہ بھی نہ تھا کہ کوئی اداکار کا بندہ وہاں آ کر اسے پہچان لے گا۔ استنبول بہت بڑا شہر تھا۔ اتنا بڑا کہ انسان اس میں گم ہو جائے۔ سو یہ تاش کے چوں کے سارے گھر بہت اچھے سے چل رہے تھے اور اس کا ارادہ اس دفعہ حیا کے اپنے گھر آنے پہ اس سے ملنے کا تھا تا کہ وہ ذرا تیز سے بات کر کے اپنے پچھلے رویے کی معذرت کر لے۔ مگر اس سے پہلے پاکستان سے کال آگئی۔

پاکستان کی کال تو حکم کا دوجہ رکھتی تھی۔ ایسا حکم جس پہ آنکھیں بند کر کے عمل کرنا ہوتا۔ چاہے آپ مر بھی رہے ہیں، آرڈر آرڈر ہوتا تھا۔ اب اسے کہا گیا تھا کہ اسے دو دن کے لیے اسلام آباد آنا تھا۔ ویک اینڈ تک وہ واپس آ جائے گا۔ کوئی اہم بریفنگ تھی۔ اب جس طرح بھی آئے فوراً آئے۔

اس سہ پہر اس نے اپنا ٹریسر چیک کیا تو حیا ناظم سے قریب ہی تھی۔ گورسل بس اس کو ناظم پہ اتارتی تھی۔ وہ گورسل کا سارا شیڈول نیٹ پہ دیکھ کر حفظ کر چکا تھا۔ یعنی ابھی وہ ناظم پہ اترے گی۔ اگر وہ وہیں اس سے مل لے اور اسے ویک اینڈ پہ گھر آنے کا کہہ دے تو وہ اس کی موجودگی میں ہی آئے گی۔ اگر غیر موجودگی میں آئی تو اب کا بھر سنا نہ تھا۔ وہ جانتے تھے کہ وہ پاکستان جاتا ہے اور وہ اداکار بھی جاتا تو بھی ان کی زبان پہ اس کے لیے محض گالیاں اور لعنتیں ہوتیں کہ وہ پاکستان کیوں جاتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ حیا ایسی کوئی بات سنے۔

اس لیے اس برستی بارش میں وہ اس کے لیے ناظم آیا تھا۔ اور چونکہ اس سے مل کر وہ فیڑی لے کر اداکار چلا جائے گا۔ تب ہی اس نے اپنا بریف کیس بھی ساتھ رکھ لیا تھا۔ اس وقت وہ ایک مکمل انگریز ٹولنگ رہا تھا، اور ابھی وہ حیا کو اپنا بیوی کو بتانا چاہتا تھا، کہ وہ بیوک اداکار کے ایک ہوٹل میں کام کرتا ہے۔ برگرنگ والی بات ابھی وہ نہیں بتائے گا، اس نے طے کر رکھا تھا۔

وہ جب میٹرو کی سیزنجوں پہ تھی تو جہان نے دور سے اسے لڑکھڑاتے ہوئے دیکھا۔ تب اس نے اس کی ایک تصویر کھینچی تھی۔ کبھی بعد میں وہ اسے وہ تصویر دکھائے گا کہ ہاں وہ اس وقت بھی اس کے ساتھ تھا جب اس کی جوتی نوٹی تھی۔ وہ اسے پسند کرے یا نہ کرے، وہ اس کے ساتھ تھا۔

اندر ترین میں وہ اتفاقاً یہ طور پہ اسے ملا اور پہلی بات اس نے حیا کو ویک اینڈ پہ گھر آنے کی کہی۔ وہ اس کے رویے پہ حیران تھی۔ (وہ خود بھی حیران تھا!)۔ البتہ اس سارے میں صرف ایک بات اسے مسلسل ڈسٹرب کر رہی تھی کہ میٹرو میں کچھ لوگ مزمر کر اس کی بیوی کو دیکھ رہے تھے۔ بات سرخ کوٹ کی نہیں تھی۔ بات سرخ کوٹ کے ساتھ گہری سرخ لپ اسٹک کی تھی۔ مگر شاید وہ نہیں جانتی تھی کہ اکیلی لڑکی جمع سرخ کوٹ جمع گہرا میک اپ، برابر ہیں کس کے استنبول میں!

اور سرخ نیل بھی تو تھی۔ وہ ٹوٹے جوتے کے ساتھ بیٹھی رہے، اور ایسے ہی چل کر مارکیٹ تک جائے تو پھر لعنت ہے جہان سکندر پر۔ ساری باتیں ایک طرف، وہ ننگے پاؤں پورے استنبول میں پیدل چل سکتا تھا، مگر حیا نہیں۔ اس نے فوراً سے اپنے جوتے اتار دیے۔ وہ پہلے سے زیادہ حیران تھی۔ (اب کی بار وہ حیران نہیں تھا۔ ایسے ہی تو ایسے ہی تھی!)

رہے ٹورنٹ میں اس نے یوں ہی مذاقاً اس کے کوٹ کا حوالہ دیا تا کہ وہ واپس جا کر کسی سے اس بات کا مطلب پوچھے اور آئندہ اس طرح کا لباس پہن کر نہ نکلے۔

مگر ساری گڑبج ہوئی جب کافی کا کپ لیوں تک لے کر جاتے ہوئے اس نے حیا کو عبدالرحمن پاشا کے بارے میں استفسار کرتے سنا۔ کافی کی بھاپ نے لمحے بھر کو اس کے چہرے کو ڈھانپ لیا تھا اور کوہ ایک سینکڑ میں ہی سنجھل چکا تھا۔ مگر وہ سینکڑ بہت بھاری تھا۔ اگر اس وقت وہ اس کا چہرہ دیکھ لیتی تو ایک ہل نالگتا اسے جاننے میں کے اس کے سامنے بیٹھا گدھا ہی عبدالرحمن تھا۔ گدھا ہی تو تھا وہ کہ وہ جان ہی ناپایا کہ اس کی بیوی اس کے کور سے واقف ہے!

وہ کیسے جانتی تھی؟

اس نے بالخصوص اس سے ہی عبدالرحمن پاشا کا کیوں پوچھا؟

وہ اندر تک گڑبڑا گیا اور بات کو ادھر ادھر گھماتے ہوئے شاید لمحے بھر کو وہ ذہنی طور پہ اتنا الجھ گیا تھا کہ ٹل کی فائل میں اپنا کریڈٹ کارڈ رکھتے ہوئے یہ خیال نہ کر سکا کہ اس پہ عبدالرحمن پاشا لکھا ہے۔

یہ خیال اسے تب آیا جب اس نے حیا کو غصے سے اپنے ملک کی حمایت کرتے ہوئے فائل کی طرف ہاتھ بڑھاتے دیکھا۔ اللہ اللہ، آج کا دن ہی خراب تھا۔

اسی وقت قریب سے دو بیڑز ایک ساتھ گزر رہے تھے۔ میزوں کے میز پوش زمین تک گرتے تھے۔ ایسے میں جب اس نے اپنے بریف کیس کے ساتھ رکھی طے شدہ چھتری کو راستے پہ ذرا ساسر کا یا تو اس کی یہ حرکت نہ حیا نے دیکھی، نہ ہی سز لپلیٹر sizzler platter اٹھائے ویڑنے اور نتیجتاً سب کچھ الٹ گیا۔ اس سارے میس میں حیا کو بل والی بات بھول چکی تھی۔ اس نے بہت آرام سے فائل سے کریڈٹ کارڈ نکال کر کرنسی نوٹ رکھ دیے۔ ہاں مگر حیا کا ہاتھ جلا تھا، اور پتا نہیں کیوں تکلیف اسے ہوئی تھی۔ لیکن وہ اپنی حد سے آگے نہیں بڑھ سکتا تھا۔

اور پتا نہیں وہ اس کے بارے میں کتنا جانتی تھی؟ کہیں وہ اس کے ساتھ کوئی ٹیم تو نہیں کھیل رہی تھی؟ اس دنیا میں کچھ بھی ممکن تھا۔ یہی جاننے کے لیے اس نے واپسی پہ حیا سے کہا کہ وہ کچھ ٹھیک سے گھٹنے پہ لگائے، کیونکہ اس کی کور اسٹوری میں جھول ہے۔ اس نے کور اسٹوری کے الفاظ کہتے ہوئے بغور حیا کا چہرہ دیکھا کور اسٹوری جاسوں ہی بنایا کرتے ہیں، لہذا اگر وہ کچھ جانتی تھی تو اس بات پر ضرور چوکی، مگر وہ نہیں چوکی۔ اسے ذرا اطمینان ہوا۔ وہ اتنا مشہور نہیں تھا کہ باہر سے آنے والا کوئی سیاح پہلے ہی روز اسے جان لے، مگر شاید اس نے کسی ایسے شخص سے عبدالرحمن پاشا کے بارے میں سنا ہو جو اس کو ذاتی طور پہ جانتا ہو۔ بہر حال پہلے اس نے سوچا تھا کہ اسے کہہ گا کہ وہ ادالار میں کام کرتا ہے۔ مگر اب یہ خطرے والی بات تھی۔ سو اس نے دوسرا کورڈ ڈھونڈا۔

وہ بے چارہ تو استقلال اسٹریٹ کا ایک معمولی ساربنٹو نوٹ اوزر تھا۔ حیا نے یقین کر لیا۔



پاکستان جانے سے قبل وہ می سے کہہ کر گیا تھا کہ اگر وہ اس کی غیر موجودگی میں آ جاتی ہے تو وہ ابا کو اس سے ملنے مت دیں۔ وہ بہت تاکید کر کے گیا تھا۔ پھر پاکستان جا کر وہ ذرا مصروف ہو گیا اور یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ ارم کے پاس جاسکے، مگر وہ ”دولی“ کو ارم کے پاس بھیجنا چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے ایک پروفیشنل کو اس کام کے لیے بھیجا تھا۔ اسے معلوم تھا ارم ضرور حیا کو فون کر کے بتائے گی۔ وہ صرف یہ چاہتا تھا کہ حیا اسے نہ بھولے۔ کہیں دور انداز کو یہ ان سیکوریٹی تھی کہ وہ اسے بھول جائے گی اور اس خیال کے بعد دل جیسے خالی ہو جاتا تھا۔

ویک اینڈ پہ وہ واپس آ گیا۔ ابھی ایئر پورٹ کے راستے میں تھا، پرانے شہر میں، جب حیا کا اس کو فون آیا۔ وہ ان کے گھر آ رہی تھی۔ وہ پتا نہیں کیوں ذرا مسرور ہوا۔ اسے اچھا لگ رہا تھا کہ وہ ان کے گھر آ رہی تھی۔ مگر جب تک وہ پہنچا، وہاں ایک ناگوار واقعہ رونما ہو چکا تھا۔ کتنی ہی دفعہ وہ کہہ کر گیا تھا کہ ابا کو اس سے مت ملنے دینا، مگر می بھی تو اس کی بات پہ دھیان نہیں دیتی تھیں۔ اسے سخت مصدا اور انسوس تھا۔ پتا نہیں ابانے کیا، کیا کہہ دیا ہوگا۔ وہ اکثر اس پاک اسپانی کا ذکر کرتے جس کو انہوں نے مارا تھا۔ می تو ان باتوں کو پاگل پن پہ محمول کرتیں۔ مگر وہ ان کا پس منظر جانتا تھا۔ سو اس کو تکلیف ہوتی۔ البتہ کوئی دوسرا ان باتوں سے کھٹک بھی سکتا تھا۔

حیا شاید ابا کے بارے میں نہیں جانتی تھی ہاں، ماموؤں نے اس بات کو ہر ممکن طور پہ دبائے کی کوشش کی ہوگی سو اس نے گھر کی بیرونی سیڑھیوں پہ بیٹھے ہوئے حیا کو ابا کے بارے میں بہت کچھ بتا دیا، اور یہ بھی کہ ”ہم پاکستان نہیں جاسکتے۔“ بات ٹھیک بھی تھی، وہ، می اور ابا اکٹھے پاکستان بھی نہیں جاسکتے تھے، مگر وہ جانتا تھا کہ وہ اس کے الفاظ کی پہیلیاں نہیں پکڑ سکتی۔

مگر اس واقعے نے اس کا سارا موڈ برباد کر کے رکھ دیا تھا۔ پھر بھی وہ جاتے ہوئے اس کو کہہ کر گیا تھا کہ وہ کھانا ضرور کھا کر جائے۔ پچھلی دفعہ بھی وہ نہیں کھا کر گئی تھی وہ اس کا مداوا کرنا چاہتا تھا۔

حیا کو وہیں جھوڑ کر وہ ادالار چلا آ گیا۔ بول جانے کی بجائے وہ سیدھا اپنے کمرے میں آیا تاکہ ذرا حلیہ ٹھیک کر کے باہر نکلے۔ تب ہی عائشہ نے دروازہ کھٹکنا دیا۔ وہ اس سے کچھ بات کرنا چاہتی تھی۔

جب وہ بولنا شروع ہوئی تو اس کی وہ خوش گمانی کہ اس نے عائشہ کو اپنے کاموں میں مصروف کر دیا ہے ہوا میں اڑ گئی۔ یہ لڑکی واقعتاً اس کے لیے مصیبت کھڑی کرنا چاہتی تھی۔

”کیا پاشا بے کاتم سے کوئی رابطہ ہے۔“

”میں نے تو پچھلے برس سے اسے نہیں دیکھا۔“ اس نے شانے اچکا کر لاپرواہی سے کہا۔

وہ چند لمبے لمبے سانس دیکھی رہی، پھر ایک دم زور سے اس کے منہ پر پھنپھار مارا۔ اسے عائشہ سے کبھی یہ امید نہیں تھی۔ لمبے بھر کو وہ خود بھی سانس لے رہ گیا۔

”تم دنیا کے سب سے بڑے جھوٹے ہو۔ تم نے خود اس کو نکالا ہے۔ مجھے کبریٰ خانم کے بیٹے نے بتایا ہے کہ کچھ دن پہلے وہ تمہارے آفس میں آیا تھا اور تم دونوں جھگڑ رہے تھے۔ تم جانتے ہو اس کی وجہ سے آنے کتنی تکلیف میں ہیں اور تم پھر بھی ان کو دکھ میں دیکھ رہے ہو۔ ان کو بتا کیوں نہیں دیتے کہ پاشا بے زندہ ہے، وہ ٹھیک ہے۔ تم سچ کیوں نہیں بولتے؟“ وہ بیگنی آنکھوں سے کہتی، اپنا سرخ پڑتا ہاتھ دوسرے ہاتھ سے دبا بھی رہی تھی۔ اس کا اپنا ہاتھ بھی بہت دکھ گیا تھا، اور وہ جیسے یہ سب کر کے ذرا خوفزدہ بھی ہو گئی تھی۔

”مجھے تمہاری کسی بات کا اعتبار نہیں رہا اب۔ تم ہماری زندگیوں سے دور کیوں نہیں چلے جاتے۔ اور تم کسی دن سارا مال سمیٹ کر دور چلے بھی جاؤ گے، میں جانتی ہوں۔ اور پھر کیا ہوگا۔ آئے، وہ کتنا ہرٹ ہوں گی، اور میری بہن!“ اس کی آواز میں دکھ کی جگہ غصے نے لے لی۔

”میری بہن سے بے تکلف مت ہوا کرو۔ میں نہیں چاہتی کہ وہ تمہاری وجہ سے ہرٹ ہو۔ سنا تم نے!“ وہ سرخ ہاتھ کی انگشت شہادت اٹھا کر تنبیہ کرتے ہوئے بولی تھی۔

جہاں نے اسی کے انداز میں ہاتھ اٹھا کر دو ازبے کی طرف اشارہ لیا۔

”نفل جاؤ اس کمرے سے۔ ابھی اسی وقت نفل جاؤ۔ میں تمہاری شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔“

وہ مزید کوئی لفظ کہے بنا گیلے چہرے کے ساتھ بھاگتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ اس کے جانے کے بعد جہاں نے ہاتھ سے اپنے رخسار کو چھوا۔

کیا یہ صلہ ہوتا ہے قربانیوں کا۔ ساری زندگی غارت کر دو اور بدلے میں کیا ملے؟ کالیاں؟ تھپڑ؟ لعنت ملامت؟ مگر نہیں، انسان تو کبھی کسی چیز کا صلہ نہیں دیا کرتے، پھر ان کے رویے کا فسوس کیا کرنا۔

رات کھانے کے بعد وہ بہت سوچ کر عائشے کے پاس پہنچنے باغیچے میں آیا۔ وہ اپنی درک نیل پہ کام کر رہی تھی، اسے بس نظر اٹھا کر دیکھا اور خاموشی سے کام کرنے لگی۔

وہ اسے مزید جھوٹ بول کر نہیں رام کر سکتا تھا۔ سو اس نے سچ کی ذرا سی ملاوٹ کر کے اسے بتایا کہ وہ دراصل ترک انٹیلی جنس کے لیے کام کرتا ہے، اس کی اور پاشا بے کی یہی ذیل تھی، اسی لیے وہ ساتھ کام کرتے ہیں، مگر پاشا بے گرفتار ہو گیا تھا اور اگر آنے کو یہ بتایا جاتا تو وہ زیادہ ہرٹ ہوتیں۔ ہاں وہ پاشا بے سے اس دن جھگڑا ضرور تھا مگر صرف اس لیے کہ وہ چاہتا تھا کہ طیب حبیب پاشا آنے سے آکر مل لے، مگر پاشا اپنی مجبوریوں کا رونا روئے جارہا تھا جن کی وجہ سے وہ آنے سے نہیں مل سکتا۔

”کون سی مجبوریاں۔ اگر وہ جیل سے رہا ہو گیا ہے، تو وہ یہاں کیوں نہیں آتا۔“ وہ متذہب سی پوچھ رہی تھی۔

”دیکھو! وہ رہا نہیں ہوا، وہ سفر دے رہا ہے، وہ انڈیڈ ٹراؤنڈ ہے، اس طرح آزاوی سے نہیں گھوم پھر سکتا۔ مگر بہت جلد وہ واپس آ جائے گا، لیکن یہ جیل والی بات تم وعدہ کرو کسی کو نہیں بتاؤ گی۔“ اس کے سنجیدگی سے کہنے پہ عائشے نے وعدہ کر لیا اور معذرت بھی کر لی۔ مگر اس نے عائشے کی معذرت قبول نہیں کی۔

آخر اس نے بہت سختی سے کہا کہ ”مجھے تمہارے رویے سے دکھ پہنچا ہے۔ میں اپنا کام ختم کر کے تمہارے خاندان کا سارا پیسہ تمہیں لوٹا کر یہاں سے چلا جاؤں گا اور تم یا تمہاری بہن سے بے تکلف نہیں ہوں گا، لیکن تمہاری اس بدتمیزی کو بھلانے کے لیے مجھے کچھ وقت گئے گا۔“

”سوری!“ اس نے ندامت سے سر جھکا دیا۔ وہ بنا کچھ کہے اٹھ آیا۔ ایک دفعہ پھر وہ عائشے کو مصروف کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

اب کتنے ہی دن تو وہ اس ندامت سے ہی باہر نہیں نکل پائے گی۔ گند، ویری گند!

..... ویلنٹائن کی رات اس نے ہاشم کے ذریعے حیا کے کمرے کے باہر پھول رکھوائے تھے، البتہ آج اس نے کاغذ پہ اپنے پیغام کے ساتھ نیچے لائٹس سے اے آر پی بھی لکھ دیا تھا۔ ساتھ میں اس نے کاغذ کو ذرا لائٹ کی خوشبو کا اسپرے کر کے بند کیا تھا تا کہ کھولنے پہ وہ گیلا ہی محسوس ہو، اور وہ اسے آنچ ضرور دکھائے۔ پتا نہیں وہ ”اے آر پی“ سے کیا اخذ کرتی ہے۔ اس نے اے آر پی کے نام کی تختی ادالار میں اپنے آفس کے باہر بھی لگا رکھی تھی۔ لوگ اس کو عبدالرحمن پاشا کا مخفی ہی اخذ کرتے تھے جبکہ وہ اس سے اپنے کو ڈیم Agent Rose Petal مراد لیا کرتا تھا، شاید اس لیے کہ عبدالرحمن پاشا کی حیثیت سے کام کرتے ہوئے بھی وہ کبھی نہ بھول سکے کہ اس کی ہدایت کیا ہے۔

مگر ایک بات اسے تنگ کر رہی تھی۔ حیا کو کس نے بتایا کہ عبدالرحمن پاشا کون ہے؟ وہ ادالار میں مشہور تھا مگر استنبول تو ایک پوری دنیا تھی، وہاں اس کو کم ہی لوگ جانتے تھے۔ یقیناً وہ کسی ایسے شخص سے ملی ہوگی، جس کا عبدالرحمن پاشا سے خاصی میں کوئی واسطہ نہ ہوگا۔ جو بھی

تھا، دنیا واقعی گول تھی۔ مگر وہ صرف یہ جانتا تھا کہ کیا وہ یہ جانتی ہے کہ جہاں ہی عبدالرحمن ہے۔ وہ ایک دن اسے ضرور بتا دے گا مگر اس دن کے آنے تک اسے اس چیز کو راز رکھنا ہوگا جب تک وہ یہ نہ جان لے کہ وہ دونوں زندگی کے سفر میں ایک ساتھ چل سکتے ہیں یا نہیں۔ ہاں تب تک وہ ایک اچھے ایجنٹ کی طرح اپنے اڈا اور والے کو راز کو استقلال اسٹریٹ والے کو راز سے الگ رکھے گا۔

ہمارے سے اس نے بے تکلف ہونا واقعی چھوڑ دیا تھا۔ عاتق سے وہ خود سے مخاطب بھی نہیں ہوتا تھا۔ آج کل ویسے بھی اڈا اور حالات اتنے اچھے نہیں جا رہے تھے کہ وہ زیادہ وقت ادھر گزارتا۔ اسے معلوم تھا طیب حبیب پاشا پھر کسی دن جھگڑا کرنے پہنچ جائے گا۔ لالچی انسان صبر نہیں کر پا رہا تھا۔ اور پھر ایک دن وہ خود تو نہیں آیا مگر اپنی ایک ساتھی عورت کو برگرنگ اس سے بات کرنے بھیج دیا۔ پاشا بے فوری طور پہ کسی دوسرے ملک میں سیٹل ہونا چاہ رہا تھا مگر اس کی فعلی سمیت یہاں سے ابھی بھیجنا جہاں کے لیے مسائل پیدا کر سکتا تھا۔ وہ کافی دیر اس کی ساتھی خاتون سے بحث کرتا رہا کہ وہ انتظار اور اعتبار کرنا سیکھ جائے مگر گفتگو سے تلخ ہوتی جا رہی تھی۔ ساتھ ہی بار بار اس کا موبائل الرٹ دے رہا تھا۔ بلا خراس نے گفتگو درمیان میں روک کر موبائل دیکھا۔ اس کا ٹریسر الرٹ اس کی بیوی قریب میں ہی تھی۔ استقلال اسٹریٹ کے دہانے پر۔

”اللہ اللہ، یہ ساری عورتوں کا لڑنے کے لیے آج کا دن ہی ملا تھا؟“ وہ جی بھر کے زار ہوا تھا۔ یہی ڈر تھا اسے۔ اپنی ذاتی اور کاروباری زندگی کو الگ الگ رکھنے کی کوشش میں کچھ غلط نہ ہو جائے۔ اس کے کاروباری لوگ اس کی ذاتی زندگی سے وابستہ کسی لڑکی کو دیکھیں، دوسرے معنوں میں اس کی کوئی کمزوری پکڑنے کی کوشش کریں، یہ وہ آخر چیز تھی جو وہ چاہتا تھا۔ تب ہی وہ فوراً نباہتا (پاشا بے کی ساتھی خاتون) سے کھلی فضا میں بات کرنے کا کہہ کر باہر نکلتا تھا مگر پھر بھی اس کا سامنا حیا سے ہو گیا، کیونکہ وہ سامنے سے آ رہی تھی۔

وہ اکیلی تھی، اور اس کو دیکھ کر اس کے چہرے پہ پشیمانی آ گئی تھی۔ وہ جیسے اس کو اپنے سامنے پا کر بہت خوش ہوئی تھی۔ وہ یقیناً اسی سے ملنے آئی تھی، مگر وہ نہیں چاہتا تھا کہ نباہتا اس کے بارے میں کچھ جانے، اسی لیے اسے سختی سے حیا سے بات کر کے اسے خود سے دور کرنا پڑا۔ مزید مسائل پانے کا وہ متحمل نہیں تھا۔ مگر اس کا انا دل بہت دکھ گیا تھا۔ واپس مڑنے سے پہلے اس نے آخری پل میں حیا کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تھے۔ وہ بری طرح ہرٹ ہوئی تھی اور یہ بات اب جہاں کو بہت ہرٹ کر رہی تھی۔

کچھ دن اس نے صبر کیا، پھر سوچا جا کر اس سے معذرت کر لے۔ پتا نہیں کیوں، مگر وہ اس لڑکی کو دکھ نہیں دینا چاہتا تھا۔ بھٹان دونوں کا رشتہ قائم ہو یا نہ ہو، وہ اس کو ہرٹ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس کے ڈورم کا نمبر وغیرہ سب جانتا تھا مگر پھر بھی اس نے می سے پاکستان فون کروا کر فاطمہ مامی سے ڈورم بلاک اور کمرے کا نمبر معلوم کروایا تھا، تا کہ وہ بعد میں وضاحت کر سکے کہ اسے ڈورم نمبر کس طرح پتا چلا۔

جب وقت ملا تو ایک شب وہ سو فحاشی چلا آیا۔ حیا کے ڈورم بلاک کی بیرونی میزریاں چڑھتے ہوئے اس نے ایک لڑکی کو کتابیں تھامے فون کان سے لگائے، زینے اترتے دیکھا۔ اس کا روم میں لپٹا دو دو حیا چہرہ اور سر کی آنکھیں۔ وہ بظاہر تیزی سے اوپر چڑھتا گیا، مگر اس کی بہت اچھی یادداشت اسے بتا رہی تھی کہ اس لڑکی کو اس نے پہلے بھی دیکھ رکھا ہے۔ مگر کہاں، کب اور کیسے۔ وہ یہی سوچتا ہوا اوپر آیا، اور انہی سوچوں میں غلطی اس نے اپنے اڑی بنا چا پ پیدا کیے انداز میں چلتے ہوئے کاسن روم کا دروازہ دراز در سے دھکیلا۔

اور پھر جو ہوا، وہ بہت برا تھا۔

حیا تھا کہ میں جنم بریڈ ہاؤس کی ڈرے پکڑے دروازہ بند کر رہی تھی، اسے غیر متوقع سی ٹکری اور ڈرے زمین بوس ہوئی۔ وہ سخت متاسف و ششدر رہ گیا۔ بہت محنت سے بنائی گئی چیز کو صرف اس کی لمبے بھر کی غفلت نے تباہ کر دیا گیا تھا وہ الیکسکو زکنا چاہ رہا تھا، اس نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا تھا، مگر وہی اس کی بیوی کی ایک دم سے ری ایکٹ کر دینے کی عادت! پہلے سلسل، پھر حماد کی انگلیاں اور اب جنم بریڈ کا ٹکڑا اٹھا کر اس نے جہاں کے منہ پہ دے مارا مگر اسے زیادہ تکلیف اس کے الفاظ نے پہنچائی۔ وہ اس کی زندگی سے نکل جائے کیونکہ وہ اس کے لیے دکھ اور عذاب کے سوا کچھ نہیں لاتا؟ وہ واقعی چاہتی تھی کہ وہ اس کی زندگی سے نکل جائے؟

وہ جمیل تک اس کے پیچھے گیا، اس نے اسے بتانے کی کوشش کی کہ اپنی تیز زندگی میں بہت تیز چلتے ہوئے وہ اس کا بہت سا نقصان کر بیٹھا ہے، مگر وہ اس کی کوئی بات نہیں سننا چاہتی تھی۔

اس کے جانے کے بعد بہت دیر تک وہ جمیل کے کنارے بیٹھا رہا۔ آج وہ بہت فیسے میں تھی اور یہ طعنے صرف جنم بریڈ ہاؤس کے ٹوٹنے کا نہیں تھا۔ کیا ان دونوں کے درمیان کچھ باقی تھا۔ اس نے کہا اس کی زندگی میں جنم بریڈ ہاؤس سے بڑے مسائل ہیں، کیا وہ اس سفید بھولوں کے پیچھے والے سے بھی پریشان تھی؟ وہ خواہ مخواہ اس کو اذیت دے رہا تھا۔ کیسے وہ کچھ ایسا کرے کہ حیا کے مسائل حل کر لے یا کم از کم وہ اس

پہ اتنا بھروسا تو کرے کہ اپنے مسائل شیر کرے۔ ہاں ایک کام ہو سکتا تھا۔ اگر وہ اپنی موجودگی میں عبدالرحمن پاشا کی طرف سے اسے کال کرے تو شاید وہ اس کو بتادے کہ یہ آدمی اسے ستا رہا ہے۔ جب وہ اس کو اکٹھے بیٹھ کر حل کر لیں گے مگر وہ اس پہ اعتبار تو کرے نا!

اس نے ریکارڈ ڈکال کا ٹائم سیٹ کیا، اور پھر حیا کے ڈورم تک گیا۔ اسے کال کی، اور حسب توقع اس نے کال اٹھالی۔ لیکن جیسے ہی حیا کو پتا چلا کہ وہ اس کے کمرے کے باہر ہے، وہ ایک دم بھاگتی ہوئی باہر آئی۔ وہ حواس باختہ بھی ہوئی تھی، اور شرمندہ بھی۔ جیسے وہ سب کرنے کے بعد اسے بچھڑا دیا تھا۔ مگر یہ بات کہہ بھی نہیں پاری تھی۔ جہاں نے سوچا، چائے کے ساتھ ڈسکس کر لیتے ہیں، سو وہ دونوں کچن میں چلے آئے۔ اگر جو بہار محل اسے یوں کام کرتے ہوئے دیکھ لیتی، تو غش کھا کر گر پڑتی۔ مگر یہاں تو وہ برگرنگ کا ہیڈ شیف تھا۔ اور اس کام میں اسے زیادہ آرام دہ احساس ہوتا تھا، شاید اس لیے کہ یہ اس کی فطرت کے زیادہ قریب تھا۔

وہ دونوں کچن میں تھے، جب اس کی ٹائمز کال بج اٹھی۔ اس نے سوچا تھا کہ دس سیکنڈ کی ریکارڈنگ کے بعد اسے فون حیا کے ہاتھ سے لے لینا ہے، اسی لیے کال دس سیکنڈ کی ریکارڈنگ کروائی تھی، اور پھر اس نے ایسا ہی کیا، مگر اس کے باوجود حیا نے اس کو کچھ نہیں بتایا۔ وہ یا تو اس پہ بھروسہ نہیں کرتی تھی یا پھر اپنے مسائل خود حل کرنا چاہتی تھی۔

اب وہ پچھلی باتیں بھلنا چاہ رہا تھا۔ چاہتا تھا کہ حیا اس پہ بھروسہ کرنے لگے۔ اس کے ساتھ کچھ تو شیر کرے۔ سو اس نے ایک اور کوشش کرنی چاہی۔ حرج ہی کیا تھا آخر! ویسے بھی اس دن کے روئے کی معذرت ابھی فرض تھی۔ اسی لیے اس نے ہفتے کی رات کا ڈنر پلان کیا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ اس پہ کتنا اعتبار کرتی ہے۔ وہ اس کو پھول بھیجے گا، وہ پھول لے کر جہاں کے سامنے کیا رد عمل دے گی۔ اگر وہ اسے سچ سب کچھ اول تا آخر بتا دیتی ہے تو وہ اسے سچ بتا دے گا۔ ہاں وہ اسے اسی وقت سب کچھ سچ بتا دے گا۔ ایک ایک بات۔ ٹائمس اسکاؤز کے گرد کسی تارک کو شے میں بیٹھ کر وہ اپنی زندگی کے بہت سے پہلوؤں پہ اس کے سامنے روشنی ڈال دے گا، ہاں ٹھیک ہے، وہ ایسا کر دے گا۔ اس سے زیادہ اس ڈرامے کو وہ نہیں چلانا چاہتا تھا۔ اور آج تو اصولاً وہ اتنی پریشان ہوگی کہ لازمی اس "اے آر پی" کا سہ باب کرنے کی سعی کرے گی۔ کیونکہ وہ پہلے گاڑی بھی تو بھیجے گا، تاکہ وہ مزید پریشان ہو جائے۔ بس یہی چاہتا تھا کہ وہ اس کا ارادہ ڈنر پہ وہ سارا نہیں کری ایٹ کرنے کا ہرگز نہیں تھا، مگر جس چیز نے اسے غصہ چڑھایا وہ یہ تھی کہ وہ عبدالرحمن کی بھیجی ہوئی کار میں بیٹھ گئی۔

وہ اتنے آرام سے یوں کسی کی گاڑی میں بیٹھ گئی؟

گاڑی بھیجتے ہوئے ہاشم کو تاکید کی تھی کہ وہ عبدالرحمن کا نام صرف اس کے پوچھنے پہ لے گا، ورنہ وہ "جہاں سکندر، ٹائمس" کہے گا اور کوئی بھی عقلمند اس کی طرح کنفرم کیے بغیر نہیں بیٹھے گی کسی کے ڈرائیور کے ساتھ۔ مگر جب وہ اسی گاڑی میں آئی تو اسے بے اختیار دھکا سا لگا تھا۔ کیا وہ واقعی ہر ایک کی گاڑی میں بیٹھنے والی لڑکی تھی؟

بے اختیار اسے وہ رات یاد آئی جب اس نے حیا کو اس لڑکے کی گاڑی میں بیٹھنے دیکھا تھا۔ جو نرم گوشہ پھر سے اس کے دل میں بننے لگا تھا، وہ ہل بھر میں دب گیا۔ کوہ کوہ کہہ رہی تھی کہ وہ اسے جہاں کی گاڑی ہی بھیجی تھی مگر اتنی بھی کیا لاپرواہی کہ آپ یونہی ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ جاؤ۔ اسے سخت غصہ چڑھا تھا، مگر پھر، وہی حیا کی عزت۔

وہ غصے میں ہاتھ مار کر گلدان توڑ کر چلی گئی۔

اسے ذرا سا افسوس ہوا مگر یہ کوئی غلطی تو نہ تھی۔ اگر اس کی جگہ وہ گاڑی کسی اور نے بھیجی ہوتی تو.....

اس نے گلدان کے پیسے ادا کیے، اور تب دیکھا کہ وہ اپنا موبائل بھی ادھر ہی بھول گئی تھی۔

اس نے موبائل اٹھایا اور برگرنگ آگیا۔ یہ حیا کا ترک سم والا موبائل تھا جس کو وہ عموماً اپنے ساتھ رکھتی تھی۔ اب کل وہ ادالار جائے گا تو وہاں رکھے سروسٹیلنس آلات میں سے ایک اچھا سائریس اس میں بھی لگا دے گا۔ یہی سوچ کر وہ اس کا موبائل لیے بیوک ادا آگیا۔

ہوٹل میں کچھ مسئلے بڑھ گئے تھے۔ اس طرح کا موقع چھ سات ماہ قبل آیا تھا اور ایسے وقت میں پیچھے سے آپ کا باس آپ کو deactivate ہو جانے کی ہدایت کر دیا کرتا ہے، اس کو بھی یہی ہدایت مل گئی تھی یعنی اب کچھ دنوں کے لیے وہ منظر سے غائب ہو جائے۔ یوں وہ آفیشلی کچھ ہفتوں کے لیے اغایا جانے کا کہہ کر ادالار سے پیک اپ کرنے لگا تھا۔ درحقیقت جانا اس نے بس استقلال اسٹریٹ تک تھا، مگر آنے کو یہی بتایا تھا کہ وہ انڈیا جا رہا ہے شاید اس دفعہ وہاں نہ آ سکے۔ وہ دفعہ جانے سے قبل یہی کہا کرتا تھا، وہ نہیں چاہتا تھا کہ اگر اسے کچھ ہو جائے یا داپسی کا حکم نہ ملے تو کوئی ایک عمر اس کی راہ دیکھتا رہے۔ اور پھر دنیا میں تو سب کچھ ممکن تھا نا!

وہ ہوٹل میں ہی تھا جب اسے حیا کی دوست ڈی جے کا فون آ گیا۔ وہ دونوں لڑکیاں بیوک ادا جانا چاہتی تھیں اور ان کو کہنی چاہیے تھی۔ اب وہ چاہتی تھیں کہ جہان ان کے ساتھ ادلا راتیک آئے۔

اب وہ کیا کرے؟

”جہان سکندر“ کو پچھلے تین برس سے ادلا نہیں گیا تھا۔ وہاں تو ہمیشہ عبدالرحمن پاشا جاتا اور رہتا تھا مگر حیا ناراض تھی، اسی لیے اس نے اس دن کا انتخاب کیا جس کی صبح اسے ادلا رچھوڑنا تھا۔ حیا کی ناراضگی دور بھی تو کرنی تھی۔ پتا نہیں کیوں کرنی تھی، مگر کرنی تھی۔

ورمیان کے دو دن اپنے سارے کام پیک اپ کرتے ہوئے بھی وہ اپنے اور حیا کے رشتے کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ (نامحسوس طریقے سے وہ پھر سے ”اس لڑکی“ سے حیا پآ گیا تھا۔)

تب کچھ سوچ کر اس نے حیا کو فون کیا۔ عبدالرحمن پاشا کے نمبر سے۔ اس سے ملنا چاہتا ہے، یہ بات سن کر وہ کیا کہے گی۔ اب بلا خر اس نالک کو ختم ہونا چاہیے۔ میجر احمد کو جب اس نے انکار کیا تھا تب وہ جہان جیسے بے مروت اور اکھڑا دی کوئیں جانتی تھی، مگر اب وہ جانتی تھی۔ کیا اب وہ کسی امیر آدمی کی ساری جاہ و شہرت دیکھ کر بھی اسی معمولی سے ریسٹورنٹ اونر کی وجہ سے اس کو انکار کرے گی۔ اور ہر دفعہ یہ ”وجہ“ جہان کیوں ہو۔ وہ لڑکا جس کے ساتھ وہ گاڑی میں بیٹھی تھی، اس کا ذکر کیوں نہیں کرتی وہ۔

وہ انسانوں سے اتنا بے اعتبار اور مشکوک ہو چکا تھا کہ اتنا سب کچھ دیکھنے کے باوجود اس کا دماغ یہ بات ماننے کو تیار نہیں تھا کہ وہ لڑکی اس جیسے آدمی کے ساتھ رشتہ رکھنا چاہتی ہوگی۔ مگر حیا نے اس دفعہ بھی رکھائی سے بات کر کے فون بند کر دیا۔ چلو ایک آخری آکوش، اور پھر عبدالرحمن اس کا پیچھا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دے گا۔

☆ ☆ ☆

آنے ان لوگوں میں سے تھیں جو اس کی منشی میں تھے۔ اس نے آنے کی مدد چاہی۔ ان کو ایک اسکرپٹ یاد کروایا کہ اس لڑکی کو آپ نے یہ اور یہ کہنا ہے، اگر وہ ہاں کہے تب یہ کہنا ہے، اگر ناں کہے تب یہ۔ آنے کو اس نے یہ بتایا تھا کہ وہ اس لڑکی کو پسند کرتا ہے، مگر وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے۔ آنے مان گئیں۔ ویسے بھی جو باتیں انہوں نے اسے کہنی تھیں، ان میں کچھ بھی جھوٹ نہیں تھا۔ عبدالرحمن نے واقعی اسے اس چہرہ پر لیج والے دن دیکھا تھا، ڈولی اس کے آبی گھر کا پرانا خادم تھا۔ خادم یعنی سرونٹ۔ سول سرونٹ، گورنمنٹ سرونٹ۔ وہ بے چارہ میجر جیسے اس نے بے عزت کیا تھا وہ کنٹرل گیلانی کا بیٹا تھا اور حیا کی ویڈیو ہٹانے کے لیے اس نے جہان کی مدد کی تھی۔ بہر حال، اہم بات یہ تھی کہ وہ انکار کرتی ہے یا سوچنے کے لیے دقت مانگتی ہے۔

اس نے سوچا تھا کہ بیوک ادا کی گلیوں میں اپنے رف سے جہز، سویٹر اور بکھرے بالوں والے حلے میں پھرتے ہوئے اسے اپنا کوئی شناسا نہیں ملے گا، آخر بیوک ادا کے سات ہزار ہائشی افراد میں سے ہر شخص تو اس کا جاننے والا نہیں تھا، مگر وہ غلط تھا۔ وہ ان لڑکیوں کے ساتھ ادلا آ گیا، اور جب وہ تینوں ٹپلتے ہوئے مین بازار میں پہنچے تو سڑک کے عین وسط میں مجمع سا لگا تھا۔ بہارے گل کارڈ کارڈ پٹ شو۔

اف!!!!

حیا لڑی ہے۔ بے اختیار اس کی تصاویر بنانے لگیں اور وہ ذرا سا رخ موڑے، ناگواری سے سارا تماشا دیکھنے لگا۔ وہ اس طرح کھڑا تھا کہ بہارے کی اس کی جانب پشت تھی۔ اب وہ ڈی جے اور حیا کو فوراً چلنے کا کہہ کر خود کو مشکوک نہیں کر سکتا تھا۔ سوان کو صرف پا کر اس نے موبائل پر عائشہ کو منبج لکھا۔ ”تمہاری سات دن کی تربیت کا یہ اثر ہوا ہے کہ تمہاری بہن پورے ادلا کے سیاحوں سے تصاویر بنوا رہی ہے۔“ اسے معلوم تھا کہ عائشہ سامنے دکان میں ہی ہوگی جہاں وہ اپنے پزل باکسز بیچا کرتی تھی۔ پچھلے سات دنوں سے وہ بہارے کو زبردستی اپنے ہمراہ حلیہ عثمان کے گھر قرآن پڑھنے لے جاتی تھی۔ اور اس وقت وہ عموماً اس دکان پر اپنے باکسز دینے آیا کرتی تھی۔ یہ اتفاق نہیں تھا، وہ بس غلط جگہ پہ غلط وقت پہ آ گیا تھا۔ ”میں کچھ دوستوں کے ساتھ ہوں، مجھے پہنچانا نہیں۔“ ایک دوسرا پیغام احتیاطاً منبج کر اس نے موبائل بند کر دیا۔ مگر وہ نہ بھی کہتا، تب بھی عائشہ ایسی لڑکی نہیں تھی کہ پھرے مجمع میں اسے پکار لے۔ اس کی پہلی بات پہ وہ ہرٹ ہوئی تھی، تبھی نور اپنی بہن کو لینے پہنچی اور اس وقت اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ مجمع چھٹنے لگا اور اس سے پہلے کہ بہارے گل اسے دیکھتی، وہ دونوں لڑکیوں کو لیے پلٹ گیا۔ تبھی یہ حیا کے ہمراہ، بیوک ادا کی گلیوں سے گزرتے ہوئے، عائشہ سلسل اسے پیغامات منبج رہی تھی۔

”آنے نے کہا تھا تم نے صبح کی فلائٹ سے انڈیا جانا ہے، مگر تم تو نہیں ہو۔ کیا خیریت ہے۔ اور کیا یہ وہی لڑکی ہے جس کا ذکر آنے کر رہی تھیں۔“

وہی عائشہ کی تفتیش کرنے کی عادت۔ اس کو یقیناً آنے نے بتایا تھا کہ وہ کسی سے محبت کرنے لگا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ وہ حیا کے ساتھ بات کرتے ہوئے اسے جواباً یہی بتا رہا تھا کہ وہ بعد میں وضاحت کرے گا اور ابھی وہ نماز پڑھنے ان کی مسجد ہی آئے گا اور اگر حسب معمول دونوں ہمیں مسجد میں ہوں تو اسے مت پہنچائیں اور وہ بہارے کو اس معاملے سے دور رکھے۔

”ہم مسجد میں ہیں مگر اندروالے کمرے میں، تم آ جاؤ۔ ہم نہیں ویسے ہی نہیں پہنچاتے تو اب کیا کہیں گے۔“

عائشہ کا ناراض سا جواب آیا تھا۔ اس نے مزید اسے ٹیکسٹ نہیں کیا۔ چھوڑ دو، بولنے دو جو بولتی ہے، سوچنے دو جو سوچتی ہے۔

اپنے سفید محل کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس نے برائے بات سرسری سا اشارہ ان گھروں کی جانب کیا تھا۔ حیا اس کی بات کو بڑے لے رہی تھی مگر وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا کہ وہ ان جیسا کوئی گھرا پئی تنخواہ سے نہیں بنا سکتا تھا۔ وہ فلموں میں ہوتا ہے کہ اسائنمنٹ ختم ہونے کے بعد ایجنٹ کو نوٹوں سے بھر کر برف کیس ملا کر دیتا ہے، اصل میں صرف پیٹھ پہنچے تھی ملتی تھی اور کچھ نہیں۔

انڈیا اور پاکستان میں اسپانز سے زیادہ انڈر paid شاید ہی کوئی ہو۔ معمولی تنخواہ اور آپ کے گرفتار ہونے یا مرنے کی صورت میں فیملی کو مالی امداد (ایک بہت قلیل مالی امداد) دینے کا وعدہ! بس یہی ملا کرتا تھا۔ بعد میں جب ایجنسی سے تبادلہ ہو کر واپس فوج میں چلا جائے گا اور اگر اس مستقل سرور سے کوئی بڑا مسئلہ پیدا نہ کیا تو ترقی ملنے کے بعد شاید وہ ”غریب آدمی“ نہ رہے، لیکن ابھی وہ غریب آدمی ہی تھا۔

مسجد سے نکلتے ہوئے حیا نے پوچھا کہ اس نے دعائیں کیا مانگا تو اس نے کہا، اس نے زندگی مانگی اور وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ زندگی دو ہمیشہ مانگا کرتا تھا مگر ابھی اس نے یہی مانگا تھا کہ تھوڑی دیر بعد اس کی بیوی ایک امیر آدمی کا عائشہ محل دیکھنے کے بعد اپنے غریب شوہر کو چھوڑنے کا نہ سوچے۔ اپنوں کا کوئی ایسے امتحان لیتا ہے بھلا۔ اسے خود پہ افسوس ہوا۔ مگر یہی تو وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ اس کے اپنوں میں سے ہے۔ نہیں البتہ وہ اس کی ”زندگی“ والی بات نہیں سمجھ سکتی۔ وہ اس کی پسیلیوں کی زبان نہیں سمجھتی تھی۔

”حیا“ عبرانی زبان کے لفظ ”حوا“ سے نکلا ہے جو کہ ماں حوا علیہ السلام کا نام تھا۔ حوا کا معنی ہوتا ہے، زندگی۔ سو حیا کا بھی یہی معنی ہے۔ اسی لیے عربی میں حیا کا لفظی معنی تروتازگی و شادابی کہا جاتا ہے کیونکہ یہ دونوں چیزیں زندگی کی علامت ہوتی ہیں۔ اسی سے لفظ ”حیات“ (زندگی) اور اللہ تعالیٰ کی صفت ”الحی“ ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے۔ اس کا اصطلاحی معنی عموماً شرم اور modesty chastity اس لیے کیا جاتا ہے کیونکہ شرم انسان کی اخلاقی زندگی اور کردار کو تروتازہ اور زندہ رکھتی ہے، حیا میں انسان کے لیے زندگی ہوتی ہے، مگر وہ نہیں سمجھ سکتی۔ وہ اس کی زبان سمجھ ہی نہیں سکتی تھی۔ چلو سمجھ نہ کبھی وہ اسے اپنی زبان بھی سمجھا دے گا۔

اس نے عادت کے مطابق سب کچھ پلان کیا تھا۔ بندرگاہ پہ جس بچے کو حیا کا پرس چھیننے آنا تھا، وہ اس کی ہدایت کے مطابق بالوں میں لگانے والی موتیوں کی مالا میں لے کر ہی آیا تھا۔ جس واحد چیز کے لیے وہ رکے گی، وہ اس کے بالوں کی خوب صورتی میں اضافہ کرنے والی کوئی چیز ہی ہونی چاہیے تھی اور مٹنی جلدی روغن ظاہر کرنے والی وہ لڑکی تھی، وہ جانتا تھا کہ وہ اپنے پاسپورٹ اور آئی ڈی کارڈ کے لیے ضرور بھاگے گی۔ ہاں اسے اچھی طرح پتا تھا کہ حیا کے اس گولڈن کلچ میں اس کے کون کون سے کاغذ ہیں۔

حسب توقع وہ اس بچے کے پیچھے بھاگ پڑی۔ کبھی جو یہ لڑکی روغن ظاہر کرنے سے پہلے ومنت سوچے؟ مگر پتا نہیں کیوں اسے اس کی یہی باتیں اچھی لگنے لگی تھیں۔ کم از کم وہ باہر سے بھی وہی تھی جو اندر سے تھی۔ ہاں، وہ اس پر یقین کرنے لگا تھا۔

جب وہ دونوں دوبارہ تھانے میں ملے تو وہ رو رہی تھی۔ پتا نہیں وہ کس بات پر رو رہی تھی، اسے ابھی جہان کی بات نہیں ہوئی تھی، وہ نہیں جانتا تھا کہ اس نے آنے کو کیا کہا ہوگا۔ مگر اس روز پہلی دفعہ اس نے پورے استحقاق سے اپنی بیوی کو جھڑکا تھا۔ اسے لگا تھا، حیا نے اپنے غریب شوہر کو نہیں چھوڑا۔ اس کا کارواں اس لڑکے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کو عبدالرحمن یا اس کی جاہ و شہمت سے بھی کوئی سروکار نہیں ہے۔ وہ واقعی جہان کے ساتھ رہنا چاہتی ہے، سو بس، یہ ڈراما ختم۔

رات آنے سے بات پہ اسی شے کی تصدیق کرنے کے بعد اس نے ہاشم کو کہا کہ وہ مزید اس لڑکی کا پیچھا نہیں کرے گا۔ معاملہ ختم ہو چکا ہے۔ بہت آدرا لیا اس نے۔ اس سے زیادہ آدرا مانے گا تو اس کا گناہ گار ہو جائے گا۔

ہاشم فون پہ اپنے بیٹے کی بیماری کا ذکر کر رہا تھا، مگر اس نے کوئی دلچسپی نہیں لی۔ ہوٹل گریڈ کا پیسہ اس کا ذاتی چیسہ نہ تھا، ذاتی تو اس کے پاس کچھ نہیں تھا اور ہاشم سدا کا جوا ری، اپنی ساری جمع پونجی تو وہ جوئے میں لٹا آتا تھا پھر وہ کیوں اس کی مدد کرے۔ اپنے تئیں اس نے بات ٹھمر کر دی۔ جب ہی عائشہ کا نتیجہ آیا۔

”میں نے آنے سے پوچھا تھا، وہ کہہ رہی ہیں کہ تم صبح کی فلائٹ سے انڈیا چلے گئے تھے۔ ویسے اتنے سارے لوگوں سے ایک وقت میں اتنے سارے جھوٹے بولتے ہوئے تمہیں کبھی افسوس نہیں ہوتا؟“

”نہیں۔“ اس نے ایک لفظی جواب بھیج کر اسے آر پی والی سم بند کر دی۔ یہ عائشہ بھی نا، کسی دن مردائے گی اسے۔

..... اگلے ہی روز اس نے ہاشم کو اوالا بھیجا۔ وہ اس وقت تک اس دکان پہ کھڑا رہا جب تک کہ عائشہ نہیں آگئی۔ عائشہ کے آتے ہی ہاشم اس سے ملا، اور اس نے پیچھے چوکھٹوں والے پزلر باکس کا آرڈر لکھوا دیا اور چوکھٹے بھی وہ جن پہ ترک کی بجائے انگریزی حروف تہجی ہوں۔ ساتھ میں اس نے عبدالرحمن کو بتانے سے سختی سے منع بھی کیا۔

وہ صاف تھی۔ اسے وہ پزلر باکس حیا کو دینا تھا۔ جیسے وہ اپنی معلومات اور کلاسیفائیڈڈ انکوائسٹس ایک ایجنٹ سے دوسرے کو منتقل کرتے تھے کہ کہیں کسی لاکر میں کچھ چھوڑ دیا، یا ریشیشن کین میں، اور بعد میں کسی دوسرے ایجنٹ نے آ کر اسے اٹھا لیا، تاکہ کسی ایجنٹ کو معلوم نہ ہو سکے کہ اس کا دوسرا ساتھی کون ہے اور پکڑے جانے کی صورت میں وہ اپنے ساتھی کے لیے کوئی خطرہ نہ بنے۔ اس نے بھی اپنی اصلیت بتانے کے لیے کسی ایسے ہی ٹریڈر مٹ کا سوچا تھا۔ خود اسے سانس نہ کبھی نہیں بتائے گا۔ اس کی بیوی کو اس کو سمجھ کر، اسے خود ڈھونڈنا چاہیے نہیں وہ اسے آزمائیں رہا تھا، وہ تو بس اپنے انداز میں بات پہنچا رہا تھا۔

ہاں مگر جب وہ پزلر باکس اس تک پہنچے گا اور بالفرض کسی طرح اس نے اوالا تک اس باکس کے بنانے والوں کو ٹریس کر لیا تو وہاں سے وہ محض اتنا جان پائے گی کہ یہ کام عبدالرحمن کے علاوہ کسی کا بھی ہو سکتا ہے۔ بس عبدالرحمن اس میں ملوث نہیں ہے۔ حیا اس کو تلاش کرے، یہ وہ چاہتا تھا، مگر وہ اس کی جاسوسی کرے، یہ وہ ہرگز نہیں چاہتا تھا۔

اگلے چند روز خیریت سے گزر گئے۔ وہ ڈی ایکٹیویٹ ہو کر بس اپنے ریسٹورنٹ اور گھر تک محدود ہو گیا تھا۔ انہی دنوں اسے اس لڑکی کا خیال بار بار آتا رہا جو اس نے سبھاچی میں دیکھی تھی، وہ اس کو پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ اسے یاد تھا کہ پچھلے سال سبھاچی کے کچھ اسٹوڈنٹس انٹرن شپ پروگرام کے تحت ہوٹل گریڈ آئے تھے اور چند ہفتے انہوں نے وہاں کام کیا تھا۔ اس نے کمپیوٹر میں سارا ڈیٹا کھولا اور ایک ایک انٹرنی کو چیک کرتے ہوئے بلا خرد اسے مل ہی گئی۔

ہالے نور چوگ لو۔ روی فورم کی ایک کارکن۔ اس کا فیلڈ ریکارڈ بھی کافی اچھا تھا۔ وہ اس کی ایمپلائی تھی، اور اپنے ہر ایمپلائے کا سارا بائیوڈیٹا وہ اپنے پاس رکھتا تھا۔ اپنے ہر ملازم کو وہ پہچانتا تھا۔ مگر اس کے ہر ملازم نے اسے نہیں دیکھ رکھا تھا۔

وہ ہوٹل مالکان کی طرح پرائیویٹ لفٹ استعمال کرتا تھا اور نچلے درجے کے عہدوں پہ کام کرنے والے ملازموں کی اس سے کوئی ملاقات نہ تھی اور انٹرنیز سے کہاں اس کا رابطہ ہو پاتا تھا۔ پھر بھی، شاید یونہی آتے جاتے اس لڑکی نے اسے دیکھ رکھا ہو۔ وہ اسی ڈورم بلاک سے نکل رہی تھی جو حیا کا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ وہاں کسی کام سے آئی ہو اور اس کا اپنا بلاک کوئی دوسرا ہو اور اس کا حیا سے کوئی رابطہ نہ ہو اور اس نے کبھی ہوٹل گریڈ کے اوپر کو نہ دیکھ رکھا ہو۔ پھر بھی آئندہ وہ سبھاچی جاتے ہوئے احتیاط کرے گا ورنہ نیا ذاتی بہت چھوٹی تھی۔

چھ دن بعد ایک صبح جب وہ برگرنگ کے کچن میں کام کر رہا تھا تو ایک دم سے اس کے سر میں بہت شدید درد اٹھنے لگا۔ یہ درد اسے بہت چڑچاہی بنا دیتا تھا۔ سارا موڈ خراب ہو جاتا۔ اب بھی یہی ہوا۔ وہ دلچسپی بھرے انداز میں زور سے کھٹ کھٹ کرتا گوشت کاٹ رہا تھا۔ پچھلے ایک ہفتے سے قبضہ فافا کے کچھ لوگ اس کو تنگ بھی کر رہے تھے۔ ریسٹورنٹ کی لیز کا معاملہ تھا اور پاشا بے کے ساتھ ان کی کوئی تلخی ہو چکی تھی۔ ایسے میں اسے اپنے ریسٹورنٹ کی سیکورٹی کے لیے اہلائی کرنا تھا، مگر اس سے قبل وہ کوئی ٹھوس واقعہ ایسا چاہتا تھا کہ جس سے اس کا کس آسان ہو جائے۔ ارادہ تھا کہ آج سہ پہر میں کچھ اپنے آدمیوں سے ریسٹورنٹ میں توڑ پھوڑ کروا کر سیکورٹی کلیم اور انشورنس کلیم دونوں حاصل کر لیں گے۔ ایسے وقت میں اسے موقع ملے ہٹ جانا چاہیے۔ اور ابھی وہ یہ سب سوچ ہی رہا تھا کہ حیا اور ڈی جے آئیں۔

وہ ٹاپ تھی جانا چاہتی تھیں۔ تموڑی سی پس و پیش کے بعد وہ ان کے ساتھ چل پڑا۔ سر کا درد بخار میں تبدیل ہوتا گیا، مگر وہ ان کا ساتھ دیتا رہا۔ پھر ڈی جے کو بھی سر درد کی شکایت ہونے لگی، وہ واپس جانا چاہتی تھی۔ اس کے جانے کے بعد وہ دونوں ٹاپ تھی کے عقبی

برآمدے میں آ بیٹھے۔ حیا نے کہا بھی کہ وہ واپس چلا جائے، مگر ابھی ریسٹورنٹ پہ staged اسراٹ ہوتا تھا، ابھی وہ کیسے واپس جاسکتا تھا۔ البتہ سردرو کے باعث وہ حیا کی شال تان کر لیٹ گیا۔ اس کو نیند ویسے بھی مشکل سے آتی تھی، پھر ابھی ایک پبلک پلیس پر وہ کیسے سو سکتا تھا۔ بس یونی لیٹا رہا۔

تب ہی اس نے محسوس کیا کہ اس سے ایک ذیہ نہ بچنے بھی حیا نے گردن موڑ کر اسے دیکھا ہے شاید یہ جاننے کے لیے وہ سو رہا ہے یا نہیں۔ وہ ذرا سا کھٹک گیا۔ اس نے آنکھوں سے بازو ذرا تر چھا کر کے دیکھا، حیا کی جہان کی طرف پشت تھی، وہ موبائل پہ کی کونج کر رہی تھی۔ جہان نے ذرا سی گردن اٹھا کر دیکھا تو اسکرین پہ اوپر اٹھایا کانبر نظر آ رہا تھا۔

اسی کانبر۔

وہ چپاٹ تو نہیں دیکھ سکا مگر یہ وہی نمبر تھا جس سے چند روز قبل اس نے حیا کو سنج کیا تھا۔ اے آر پی تو اس کا چچا چھوڑ چکا تھا، پھر وہ اس سے کیوں رابطہ کر رہی تھی۔ اسے کچھ عجیب سا لگا۔ برائیاں لگا مگر چھاپی نہیں لگا۔

چند منٹ ٹھہر کر اس نے بائیں ہاتھ سے جینز کی جیب سے موبائل نکالا۔ (حیا اس کے دائیں جانب، ایک زینہ نیچے بیٹھی تھی، سو دیکھ نہیں سکتی تھی۔) اس نے اسی طرح لینے لینے اٹھیں سم آن کی، پھر ذرا سا چہرہ موڑ کر ”کچھ سنج اسٹوڈنٹ“ کا نمبر ڈائل کیا۔ وہ جانتا تھا وہ اس کے سامنے بات نہیں کرے گی اور واقعی وہ کال آتے ہی اٹھ کر منڈیر تک چلی گئی۔ وہیں شال گردن سے اوپر تک لیے، آنکھوں پہ بازو رکھے، وہ ہینڈز فری سے اس سے کچھ دیر بات کرتا رہا۔ حیا اگر اس سارا وقت میں اسے دیکھ رہی ہوتی جب بھی نہ جان پاتی کہ اس کے سبب بل رہے ہیں۔ اور اس نے فون کیوں کیا؟

وہ چاہتی تھی کہ عبدالرحمن اس کے کزن کی مدد کرے۔ اس کی بات سن کر جہان بے اختیار اس پڑا۔ مدد کا وعدہ کر کے اس نے فون بند کر دیا۔ حیا واپس آ کر بیٹھ گئی۔ کچھ مضطرب سی تھی۔ خیر۔ پلان کے مطابق اسے ریسٹورنٹ سے کال آنے لگی۔ انہیں جانا پڑا۔ جب وہ واپس ریسٹورنٹ پہنچے تو ڈیوڑھی پھوڑ دیکھ کر اسے احساس ہوا، حیا اسے عبدالرحمن پاشا کی حرکت سمجھ رہی تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات کچھ ایسے ہی تھے۔ چلو، یہ بھی ٹھیک تھا۔ اسے سبق مل گیا ہوگا کہ اپنے مسائل حل کروانے کے لیے دوسروں کا رخ بھی نہیں کرتے۔

☆ ☆ ☆

وہ دوبارہ پھر سب انجی نہیں گیا۔ بہار کے دن شروع ہوئے اور سارا استنبول مہکنے لگا۔ ایسے ہی ایک دن وہ گھر پہنچا تو حیا آئی ہوئی تھی۔ مگر اسکی نہیں تھی۔ اس کے ہمراہ تین لڑکیاں تھیں اور ان تین لڑکیوں میں ہالے نور کو دیکھ کر اس کا لمحہ بھر کو سانس ہی رک گیا۔ ہالے نے اس کے سلام کا جواب دے کر بغور اس کو دیکھا تھا۔ وہ بنا مزید کچھ کہے کہ جن میں چلا آیا۔

یہ لڑکی جس کا تعلق ہوٹل گریڈ سے رہ چکا تھا اس کو اس گھر میں زیادہ دیر نہیں ٹھہرنا چاہیے تھا۔ اب ان کو کیسے نکالے یہاں سے؟ بڑی مصیبت سے بہتر چھوٹی مصیبت ہوتی ہے۔ اس نے چھوٹی مصیبت لے لی۔ اس نے ترک میں وہ تکلیف دہ الفاظ جب کہے تو حیا کڈرہ ہی گئیں، مگر وہ لڑکی بھی چونک گئی، لاؤنچ تک کچن کی ساری باتیں سنائی دے رہی تھیں۔ پانچ منٹ بھی نہیں گزرے اور وہ چاروں وہاں سے چلی گئیں۔

”یہ کیا بد تمیزی تھی جہان۔“ مئی ابھی تک ششدر تھیں۔

”وہ اسکا رف و لی لڑکی مجھے کی اور حوالے سے جانتی تھی، ہماری بیوی کی وجہ سے میرے کھد کھنسان پہنچا تو میرا کورٹ مارشل ہو جائے گا مئی“

”اوہ! وہ خاموش ہو گئیں، مگر وہ خوش نہیں تھیں۔

اس نے سوچا تھا، وہ پھر حیا سے معذرت کر لے گا، جیسا کہ ہمیشہ ہوتا تھا۔ مگر موقع ملنے سے قبل ہی وہ انفرہ چلا گیا۔ وہاں کچھ کام تھا اور جس دن وہ واپس آ رہا تھا، اسے ایئر پورٹ پہ حیا کا میٹج ملا۔

ڈی جے ہاتھ فرسٹ ایڈ میں ایڈمٹ تھی، اسے برین ہمرج ہوا تھا۔

وہیں ایر پورٹ سے اس نے ہاتھ فرسٹ ایڈ میں ایک جاننے والے کو فون کیا۔ ڈی جے کا بھری اینورزم پھناتا تھا اس نے جلدی سے حساب لگایا۔ اس سب کا مطلب تھا کہ اس کے پاس صرف چند گھنٹے تھے۔ اسے یاد آیا وہ ٹاپ تھی میں سردرد کی شکایت کر رہی تھی۔

وہ پرانے چہرے والے ایر پورٹ (صیبہ گورجن ہوالانی) سے آیا تھا، سو لہذا استنبول پہنچتے ہی وہ سیدھا کا قسم آیا اور وہاں سے حیا کے پاس۔ اس کے حساب کردہ گھنٹے ختم ہونے کو تھے۔ کسی بھی وقت وہ ڈی جے کی موت کی خبر دے دیں گے، پھر ہاڈی کیسٹرنس کروانے میں وقت لگے

گا، ہاڈی پاکستان جائے گی، ظاہر ہے حیا بھی ساتھ ہی جائے گی یعنی دو تین دن تو کہیں نہیں گئے، اور موت کی خبر ملنے کے بعد وہ کچھ نہیں کھائے گی۔ حقیقت پسندی سے تجویز کرتے ہوئے اس کو صرف حیا کی فکر تھی۔ وہ جلدی سے کینٹین گیا اور اس کے لیے جوں اور سینڈویچ لایا۔ اسی اثناء میں ڈاکٹر باہر آ گیا اور خبر بھی باہر آ گئی۔ پھر بھی اس نے یہ خبر حیا کو بت دی جب وہ تھوڑا بہت سینڈویچ کھا چکی تھی۔ اور کاش وہ، وہ آخری بندہ ہوتا جو اس کو یہ خبر دیتا۔

وہ دو تین دن بہت تکلیف دہ تھے۔ اسے ڈی جے کی موت کا بہت افسوس تھا، لیکن اپنی جاب کے دوران اتنے لوگوں کو اپنے سامنے مرتے دیکھا تھا کہ ڈاکٹر کی طرح وہ بھی ذرا immunel ہو چکا تھا۔ مگر حیا کو روتے دیکھ کر اسے تکلیف ہو رہی تھی۔ وہ جو سمجھتا تھا کہ جیل کے ان تاریک دنوں نے اس کے اندر سے ساری حسدیت کو نگل لیا ہے، تو شاید وہ غلط تھا۔ اسے تکلیف ہو رہی تھی، بہت زیادہ۔ ڈی جے کی موت سے بھی زیادہ۔

ہاڈی کانسٹنٹن ملے سے قبل وہ حیا کے ہمراہ سہانچی گیا تھا، (ہالے نور سمیت اسٹوڈنٹس کی اکثریت اسپرنگ بریک پہ جا چکی تھی)۔ ڈی جے کی چیزیں اس نے حیا کے ساتھ ہی پیک کروائی تھیں۔ اس کے رجسٹر اکٹھے کرتے ہوئے وہ بھی آواز میں کہہ رہی تھی کہ ڈی جے اپنے نوٹس یا رجسٹر نوٹو کالینز پہ بھول جاتی تھی، اس لیے وہ نوٹو کالینز تک گیا تا کہ اس کا اگر کچھ رہ گیا ہے تو وہ بھی اٹھا لائے، مگر جب وہاں رکھے ڈی جے کے رجسٹر کا پہلا صفحہ اس نے پلٹا یا تو اس پہ بڑا بڑا کر کے یونانی فلسفی ہرقلیٹس کا ایک قول لکھا تھا۔

Into The Same River No Man Can Enter Twice Hearclitus.

وہ کچھ دیر سوچتا رہا، پھر رجسٹر وہیں چھوڑ کر واپس آ گیا۔ حیا اس وقت ذہنی طور پہ اتنی ڈسٹرب تھی کہ اس کو کچھ پوچھنے کا ہوش نہیں تھا۔ بعد میں وہ واپس آ کر یہ رجسٹر لے گی تو اس قول کو خسرو پر بھگے گی، وہ اسے اپنے پزل باکس کے اوپر پھیلی کے طور پہ لکھ سکتا تھا۔ ڈی جے فلسفے کی طالبہ تھی تو شاید حیا بھی اس فلاسفی کے پس منظر سے واقف ہو..... شاید.....

مئی کے مجبور کرنے پہ وہ اپنے کنٹرولر سے اجازت لے کر حیا کے ہمراہ پاکستان آ گیا۔ وہی موقع جس سے وہ بھاگتا تھا، بالآخر سامنے آ ہی گیا تھا مگر صرف حیا کے لیے اس نے یہ کر لیا۔ اپنے ماموؤں کے سامنے آج بھی وہ خود کو کمزور محسوس کرتا تھا۔ ان کی باتیں سننا، ان کے تیور برداشت کرنا، وہ کچھ بھی تو نہیں بھولا تھا۔ لیکن اب اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔

حیا تو سیدھی اپنی امی کے ساتھ ڈی جے کی طرف چلی گئی، وہ سلیمان ماموں سے ملا، اور کچھ دیر حیا وغیرہ کے لاؤنج میں ان کے ساتھ بیٹھا رہا۔ ماموں ذرا رکھائی سے ملے تھے۔ سرواندا ز ٹھیک ہے، وہ بھی تو اسی طرح ملا تھا۔

”سین ٹھیک ہے؟ اس کو بھی لے آتے؟“

”ابا کی وجہ سے نہیں آ سکتی تھیں وہ۔“

”اچھا!“ اور خاموشی۔ بس اسی طرح کی چند باتیں کر کے ملازمہ نے اسے اس کا کمر اکھا دیا۔ وہ نیچے والا ایک کمرہ تھا، اس نے پوچھا کہ اگر اسے کوئی اوپر والا کمرہ مل جائے تو؟ ملازمہ نے فوراً اس کا سامان اوپر والے گیٹ روم میں رکھ دیا۔

وہ کسی کے بھی گھر رہتا، ہمیشہ اوپر والی منزل میں ٹھہرتا۔ اوپر سے نیچے پورے گھر کا جائزہ لینا آسان ہوتا ہے، آپ کا پیور اما وسیع رہتا ہے، فرار کا راستہ بھی مل جاتا ہے۔ اس پاس کے گھروں پہ نظر رکھنا بھی اہل تھا۔

☆ ☆ ☆

دو پہر میں وہ نہیں سکا، بس میسر سے ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ مسجد کدھر ہے، کالونی سے نکلنے کے راستے بیکسر کے مرکزی سمت۔

دو پہر میں حیا اور اس کی امی واپس آ گئیں۔ اس نے کھڑکی سے دیکھا تھا۔ حیا ہارلنگ رہی تھی مگر وہ اس طرح جا کر پوچھ بھی نہیں سکتا تھا۔

شام میں ذرا دیر کو آنکھ لگی ہی تھی کہ حیا کی امی، فاطمہ ممانی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ فرقان ماموں وغیرہ آئے تھے نیچے۔

”میں آ رہا ہوں بس فریش ہو کر۔“

”اوکے! اچھا.....“ وہ رکس ”نور بانو بتا رہی تھی کہ آپ کو نیچے والا کمرہ پسند نہیں آیا؟ یہ ٹھیک ہے؟“

”جی۔“ اس نے تردید کے بغیر بس اثبات میں سر ہلایا۔ وہ تو ایسا ہی تھا، مگر فاطمہ ممانی کو شاید کچھ لہجہ سا ہوا تھا مگر بولیں کچھ نہیں۔

کچھ دیر بعد وہ کمرے سے بنا چا پ کے نکلا تو ابھی سیڑھیوں کے گول چکر کے اوپر ہی تھا جب لاؤنج سے ملحقہ کچن کی آدمی کھلی دیوار کے پار فاطمہ ممانی حیا سے بات کرتی نظر آئیں۔ اس نے دانستہ طور پہ رک کر سنا۔

”یہ بین کا بیٹا ذرا پروڈ نہیں ہے؟“

چلو جی۔ پہلے اس کا باپ مفرد تھا، اب وہ مفرد ہو گیا۔ جوانی مرضی سے رہنا چاہے، وہ مفرد ہو گیا! وہ تو مفرد نہیں تھا۔ اسے تو کسی چیز کا مفرد نہیں تھا۔ پتا نہیں کیوں وہ اس کے بارے میں ایسے اندازے قائم کر رہے تھے۔

”نہیں، وہ شروع شروع میں ایسا ہی رہتا ہے“ حیا کہہ رہی تھی۔

”اور بعد میں؟“

”بعد میں بھی ایسا ہی رہتا ہے، اس شروع اور بعد کے درمیان کبھی نارمل ہو جاتا ہے!“

یہ بیٹوں کے وسط میں دیوار پر ایک لمبا سا آئینہ آویزا تھا جس میں اسے وہ دونوں نظر آ رہی تھیں، اور یہ الفاظ کہتے ہوئے حیا کا چہرہ سیاٹ تھا۔ اسے برا لگا مگر پتا نہیں کیوں اب وہ اس کو مار جن دینے لگ گیا تھا۔ ایسے ہے تو ایسے سہی۔

لان میں فرقان ماموں اور صائمہ مانی آئی ہوئی تھیں۔ جب وہ چلتا ہوا لان کے دربانے تک آیا تو وہ لوگ اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

”تمہیں کیا لگتا ہے تم یہاں عزت سے جی سکو گے؟ کبھی نہیں۔ تم ذلیل ہو گے۔ تم خوار ہو گے“

وہ آوازیں آج بھی اس کے ساتھ تھیں۔ وہ لوگ بہت عزت سے اب اس سے مل رہے تھے۔ سلام دعا، می کا حال، گلے، شکوے۔

”تمہارا باپ تمہارے نام پر ایک شرم ناک دھبہ ہے۔ تم کبھی سر اٹھا کر نہیں جی سکو گے۔ تمہارے باپ کا نام تمہارا سر ہمیشہ شرم سے جھکا تا رہے گا“

وہ ان کے سامنے کرسی پر بیٹھا تھا۔ فاطمہ مانی اس سے چائے کا پوچھ رہی تھیں، اس نے وہی کہا جو ایک ترک لڑکے کو کہنا چاہتے تھے۔ پیل نی۔

”تم کتوں کی سی زندگی گزارو گے۔ کبھی عزت اور وقار سے اپنے ملک کا رخ نہیں کر سکو گے“

وہ اب اس سے اس کی جاب اور دوسری مصروفیات کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ وہ جھوٹے چھوٹے جواب دیتا رہا۔ حیا اس سارے وقت لائقیت سے بیٹھی رہی، بس ایک دو دفعہ بولی، مگر وہ اسے نظر انداز کر رہی تھی۔ یہ الگ بات تھی کہ اپنے تئیں جہان اسے نظر انداز نہیں کر رہا تھا، وہ تو ہمیشہ سے ہی اتنا ہی خاموش اور ریزہ ریزہ تھا۔ البتہ اپنے ماموں کے لئے اس کے دل میں نرم گوشہ نہیں تھا۔ ہاں نہیں تھا وہ بہت اعلیٰ ظرف۔ جن باتوں نے ایک عرصہ اس کو ڈسٹرب رکھا، ان کے کہنے والے تو بڑے مزے سے اپنی زندگی میں گن تھے۔ کسی کو کوئی غرض نہیں تھی کہ بین سکندر اور جہان سکندر کا کیا بنا ہے، کیونکہ ان کے ناموں کے ساتھ سکندر لگتا تھا۔

وہ پہلی ملاقات میں ان سے کوئی خاص بات نہ کر سکا۔ اس سے ہوئی ہی نہیں! کچھ زخم بھرنے میں بہت وقت لگتا ہے، اور اس کا وقت ابھی پورا نہیں ہوا تھا۔

چونکہ وہ ترک شہری کے طور پر آیا تھا، اس لیے اس کی حرکات و سکنات اپنے کور کے مطابق تھیں۔ بھلے وہ انگریزی میں بات کرنا ہو، گھاس پہ جوتوں سمیت نہ چلنا ہو، یا بنا جوتوں کے گھر میں داخل ہونا، وہ وہی بنا رہا جو وہ لوگ اس کو سمجھتے تھے۔

انھنے سے قبل فرقان ماموں اپنے گھر آنے کی دعوت دے کر گئے تھے۔

”تم نے میری بات نہیں مانی، اب جب مدد چاہیے ہو تو میرے طرف مت آنا۔“

وہ آوازیں پیچھا نہیں چھوڑتی تھیں۔

سلیمان ماموں نے ان کے جاتے ہی قطعیت سے کہہ دیا تھا کہ اب حیا واپس نہیں جائے گی۔ اس نے کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا، البتہ وہ جان گیا تھا کہ وہ واپس جانا چاہتی ہے۔ ہاں، واپس تو اسے جانا ہی تھا۔ وہ کرے گا اس بارے میں بھی کچھ۔

☆ ☆ ☆

اس پہلی ملاقات سے اس نے یہ افذ کیا کہ فرقان ماموں کی باتیں اور طنزیہ انداز اس کی توقع کے مطابق ہی تھا، البتہ سلیمان ماموں یوں طنز نہیں کرتے تھے، بس اکھڑے اکھڑے سے رہتے تھے۔ وجہ شاید ان کا گزشتہ دفعہ استنبول کا دورہ تھا، جب وہ اولار میں ہونے کے باعث ان کے لیے جہانگیر نہیں آ سکا تھا۔ اور جب آیا تو تھوڑی دیر ہی بیٹھ سکا۔ یہ وہ وقت تھا جب اس کے دل کے اندر ان کے لیے موجود شکوے ختم نہیں ہوئے تھے اور اپنے اکھڑے کے باعث سلیمان ماموں بھی بدظن ہو چکے تھے، وہ جانتا تھا۔ اور ان کا رویہ اب بھی ویسا ہی تھا، حیا کے ساتھ پاکستان آنے، یعنی ان کی بیٹی کا اتنا خیال رکھنے پر بھی وہ اس سے راضی نہ تھے۔ فرقان ماموں کی اسے کوئی پروا نہ تھی، مگر سلیمان ماموں..... پتا نہیں

کیوں وہ ان کی پرواہ کرنے لگ گیا تھا۔

شاید اس لیے کہ پاکستان آ کر اس پہ ایک انکشاف بہت شدت سے ہوا تھا کہ وہ جو ہمیشہ ”میرے دونوں ماموں“ اور ”میرے ماموں“ نے، جیسے صیغوں میں سوچتا تھا، تو وہ غلط تھا۔

وہ زمانے گئے جب دونوں ماموں ایک فریق تھے۔ اب وہ دو فریق تھے۔ سلیمان ماموں تو بڑے بھائی کی بہت عزت کرتے تھے، مگر ذریعہ فرقان ماموں اور صائمہ مامی کی گفتگو سے ہی یہ بات واضح تھی کہ اگر وہ حیا سے رشتہ توڑے گا تو وہ ہرگز ناخوش نہیں ہوں گے کیونکہ ان کے اور سلیمان ماموں کے درمیان اب وہ پہلے والا ایک نہ تھا۔ اتنے بزرگ ایک ساتھ رہنے کے باعث ہونے والی چھوٹی موٹی تلخیاں نے ان کے آپس کے رشتے میں بھی بہت سی دراڑیں ڈالی تھیں۔ ہاں بظاہر سب ٹھیک تھا، سلیمان ماموں کی طرف سے بھی سب ٹھیک تھا، البتہ فرقان ماموں اور صائمہ ممانی حیا کی زندگی میں آنے والی ہر تکلیف پہ اس کے ساتھ نہیں ہوں گے، وہ جان گیا تھا۔ وہ بیٹھ کر تماشا دیکھنے والوں میں سے تھے۔ یہ بات کاش اسے پہلے پتا چل جاتی، مگر کیسے چلتی؟ وہ اور میری تو ابھی تک کئی سال پیچھے کھڑے تھے۔

اور اب اگر وہ فرقان ماموں کے اس برسوں پرانے رویے کی وجہ سے سلیمان ماموں سے تعلق خراب کرتا ہے تو یہ نا انصافی تھی۔ اب جب کہ یہ فیصلہ ہو گیا تھا کہ وہ یہ شادی قائم رکھنا چاہتا ہے تو پھر اسے اپنا رویہ بھی ٹھیک کرنا ہوگا۔ جتنے دن وہ یہاں ہے، وہ اس کی پوری کوشش کرے گا، اس نے خود سے عہد کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

اگلے روز زہد ماموں کی بیٹی کی مہندی تھی۔ وہ ایسے ہی ریش سے بھاگتا تھا، مگر یہاں اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ بھی فنکشن اینڈ کرے۔ اس پہ متزاور، فاطمہ ممانی اس کے لیے کچھ کرتے وغیرہ لے آئی تھیں، پیسے البتہ انہوں نے اس کے بہت اصرار پہ بھی نہیں لیے۔ اب اس کو وہ پہننا ہی تھا۔

صبح حیا کمرے سے باہر نہیں آئی تھی۔ وہ کافی دیر اس کا انتظار کرتا رہا، کہنا کچھ بھی نہیں تھا، بس اسے دیکھنا تھا، مگر وہ شاید سو رہی تھی، سو بالآخر اس نے وہیں اوپر والے کمرے سے اسے کال کی۔

وہ اسے اس پزل باکس کے بارے میں بتانا چاہتا تھا مگر محال ہے جو وہ لڑکی کسی کی بات پوری سنے۔ اس نے حسب معمول اس کو اخٹ ملامت کر کے فون بند کر دیا۔ اب کیا کرے؟ خیر، پزل باکس اس تک وہ پہنچائی دے گا کسی نہ کسی طرح۔

حما دے تو سننے سے ہی انکار کر دیا۔

”معاف کرنا مگر میں ان کی خوش اخلاقی سہ نہیں پاؤں گا، مجھے معاف رکھو بھائی!“

مگر وہ جانتا تھا کہ جب وہ اصرار کرے گا تو حما کو مانتے ہی بنے گی۔ اور یہی ہوا۔

وہ مان گیا۔ بس یہ آخری دفعہ ہے، پھر نہیں۔

شام میں وہ پھر سے حیا کو ڈھونڈ رہا تھا۔ دونوں کی کوئی خاص بات نہیں ہو سکی تھی پاکستان آ کر۔ اب اس کے پاس یہی بہانہ تھا کہ وہ اس سے فلائیٹ کا پوچھ لے گا۔ گریٹ!

وہ اس سے یہی پوچھنے فرقان ماموں کے گھر آیا تھا، اور اسے اس وقت وہ بیڑھیوں سے اترتی دکھائی دی۔ بہت سی لڑکیاں اچھے کپڑے پہنتی ہیں، مگر اس کی چال کی بے نیازی، کسی ملکہ کی طرح کچھ اترا، وہ واقعی بہت خوبصورت تھی۔ مگر.....

ہاں یہی ”مگر“ ہر دفعہ آ جاتا تھا۔ جس وقت وہ بیڑھیاں اتر رہی تھی، وہاں آس پاس کتنے ہی کزنز گھوم رہے تھے۔ سب اس کو گاہے بگاہہ دیکھ رہے تھے، اور یہیں آ کر اس کی پیشانی پہ بل پڑ جایا کرتے تھے۔

وہ اس سے کوئی بد تمیزی نہیں کرتا چاہتا تھا، مگر اس وقت جب وہ بات کرتے ہوئے اس کے ساتھ آکھڑی ہوئی تو زہد ماموں کی چھوٹی بیٹی ثناء ان کی تصویر کھینچنے لگی۔ وہ جانتا تھا کہ یہ لڑکی فوراً سے یہ تصویر فیس بک پہ لگا دے گی، اور ایسی بداعتیالی وہ افورڈ نہیں کر سکتا، سو ثناء کو ذرا سا ڈانٹ دیا۔ اب وہ دوبار اس کی تصویر کھینچنے کا سوچے گی، یہی نہیں۔

اور حسب معمول، اس کے کسی اور مقصد کے لیے کیے جانے والے عمل سے آخر میں ہرٹ حیا ہوئی تھی۔

☆ ☆ ☆

مہندی کے فنکشن میں وہ فرقان ماموں کے ساتھ بیٹھا رہا تھا۔ وہ ایک دفعہ پھر وہی پرانے قصے لے کر بیٹھ گئے تھے۔ کس طرح انہوں نے سین کی مدد کرنی چاہی، مگر کس طرح سین نے مدد نہیں لی۔ وہ خاموشی سے سر ہلاتا رہا۔ کوئی اعتراض نہیں، کوئی اختلاف نہیں۔ کمانڈو ٹریننگ کے دوران ایک مرحلہ ایسا ہوا کرتا تھا جس پر لڑکے ضبط ہار دیتے تھے، وہ تب ہارتے جب ٹرینرز ان کے منہ پہ تھوکتا۔ اس کے ایک دوست نے ایسے موقع پر اپنے ٹرینر کو ملنا چھوڑ دیا، مارتا تھا، سو اسی وقت اسے بتا دیا گیا کہ وہ کمانڈو نہیں بن سکتا۔ جہان کے منہ پہ بھی آفیسر نے تھوکا تھا، وہ خاموشی سے کھڑا رہا۔ ایک دفعہ، دودھ، کئی دفعہ تھوکا گیا، گالیاں دی گئیں، مگر اس نے مبر نہ ہارا، اور وہ پاس ہو گیا۔ اب بھی اس نے خود کو ایسے ہی پاس کر دیا تھا۔



فنکشن کے دوران بد مزگی اس وقت پھیلی جب ایک دم سے لائٹ چلی گئی۔ اس کے ماموں کے گھر میں لائٹ کا مسئلہ کبھی نہ ہوتا اگر جزیرہ جواب نہ دیتا۔ ایک دم سے محکمہ پبلک گنج کٹی تھی۔ میکنک کا انتظار، شور، افراتفری۔ کوئی خود ہوتا تھا حیران لانے کے لیے تیار نہیں تھا، بس میکنک آئے گا تو ٹھیک کر لے گا۔ وہ کچھ دیر بیٹھا رہا، پھر اسے کوفت ہونے لگی۔ یہ لوگ دوسروں پر اتنا انحصار کیوں کرتے ہیں؟ اپنے مسئلے خود کیوں نہیں حل کرتے؟ وہ اٹھا، اور چپ چاپ جزیرہ کا معائنہ کرنے لگا۔ ذرا سا مسئلہ تھا، اور طوفان ایسے چاڑھا تھا سب نے۔ پانچ منٹ بھی نہیں لگے اسے سب ٹھیک کرنے میں اور تب تک وہ پورے نمچے کی توجہ پا چکا تھا۔ یہ چیز زیادہ کوفت دلانے والی تھی۔ وہ ہاتھ دھونے کے بہانے جلد ہی اندر چلا گیا، البتہ وہ جانتا تھا کہ سارا وقت حیا بہت مسرور انداز میں اسے دیکھتی رہی تھی۔ وہ جیسے اس پر فخر کر رہی تھی۔

بعد میں سب مرد لاؤنج میں بیٹھ گئے، تو وہ بھی وہیں بیٹھا رہا۔ لاشعوری طور پر وہ حیا کا منتظر تھا۔ کب وہ آئے گی، اور وہ اسے دیکھ سکے۔ بہت دیر بعد وہ نظریں اسے زائد ماموں کی چھوٹی بیٹی بھی تھی، دونوں بچن میں جاری تھیں۔ اسے ابھی حیا کو دیکھ لینے کی ٹھیک سے خوشی بھی نہیں ہوئی تھی کہ اس نے غصہ کیا، جب وہ چلتی ہوئی جاری تھی تو سب کزنز اسے ہی دیکھ رہے تھے، یہاں تک کہ داؤد بھی۔ اسے غصہ چڑھا، اتنا شدید کہ حد نہیں۔ مگر وہ کیا کر سکتا تھا۔ وہ تو اپنی ماں تک پہنچا ہوا نہیں کر سکا تھا کبھی، اپنی بیوی پہ کیا کرتا؟

پھر ایک دم سے کہیں سے زائد ماموں کی بیٹی جس کی شادی تھی، تن تنہا کرنی آئی اور داؤد کے اونچا ہونے کے سبب اس کو سنا کر واپس ہو لی۔ وہ واقعی شاکدہ رہ گیا، اور کچھ پچھلا غصہ بھی تھا، وہ ایک دم سے کھڑا ہو گیا۔ باقی سب بھی اس کے پیچھے باہر آئے تھے۔

کسی نے البتہ اس لڑکی کو نہیں ٹوکا۔ کسی نے اسے نہیں ڈانٹا۔ کسی نے اسے وہ باتیں نہیں سنائیں جو انہوں نے کئی برس پہلے اس کی ماں کو سنائی تھیں۔ تب بھی فرقان ماموں لوگ ان کے لاؤنج میں تھے، تب بھی وہ یونی اٹھے تھے اور باہر نکل گئے تھے، مگر اب نکلنے سے قبل کسی نے کچھ نہیں کہا تھا۔ کیا فرق تھا دونوں واقعات میں؟

مئی نے ان کی بے عزتی نہیں کی تھی، وہ گواہ تھا۔ مہوش نے داؤد کی بلکہ سب کی بے عزتی کی، وہ اس کا بھی گواہ تھا۔ پھر کیوں مہوش کو ایک لفظ بھی نہیں کہا گیا؟

کیونکہ وہ اثر و رسوخ والے باپ کی بیٹی تھی، کیونکہ اس کا باپ سامنے بیٹھا تھا، کیونکہ اس کا ہونے والا شوہر بہت امیر کبیر تھا۔ اور مئی کے پاس ان میں سے کچھ بھی نہیں تھا اس وقت۔

اور ہاں، یہ اس کا ہونے والا شوہر، چلو وہ بھی دیکھے گا کتنا عرصہ اس کے امیر ہونے کا ڈھکوسلہ چلتا ہے۔ جس طرح اس لڑکے کا بڑا بھائی بار بار اپنی دولت کی وجہ بتا رہا تھا، صاف ظاہر تھا کہ وہ ایک دم سے آئی ہوئی بلیک مٹی کی صفائی دے رہے ہیں۔ گدھے!

مہوش کی بدتمیزی کے بعد جب سب بنا کھانا کھائے وہاں سے اٹھ آئے تو اس کے ذہن میں صرف یہی تھا کہ سلیمان ماموں نے کھانا نہیں کھایا۔ حیا نے باہر کھالیا تھا، مگر ماموں..... وہ ان کی اتنی پرواہ کیوں کر رہا ہے؟ پتا نہیں مگر جو بھی ہو، ماموں ماموں تھے۔ سو حیا کے ساتھ مل کر اس رات اس نے صرف سلیمان ماموں کے لیے پاستا بنایا تھا۔ اور یوں ان دونوں کے درمیان سرد مہری کی دیوار بھی اس سے کھیل گئی تھی۔

ماموں حیران تھے، مگر زیادہ ظاہر نہیں کیا۔ وہ اس سے خفا رہتے تھے وہ جانتا تھا مگر اب شاید حالات بدل جائیں۔ شاید.....

اگلے روز صبح کی بہت منت کر کے اس نے وہ باکس حیا تک پہنچا دیا۔ اس کے اندر جواہر کے ایک لاکر کی بارکود سلف اور اندرونی تجوری کی چابی تھی۔ لاکر ابھی خالی تھا، مگر وہ واپس جاتے ہی کچھ ریکارڈ کر کے اس میں رکھ دے گا، اس نے سب سوچ رکھا تھا۔ بس اس کے لیے اسے حیا کو واپس لے جانا ہو گا۔

لازماً۔

ان چند دنوں میں اس کے باقی رشتہ داروں سے بھی تعلقات بہتر ہوتے گئے۔ مہوش کی چھوٹی بہن سے لے کر سلیمان ماموں تک، اب کوئی اس سے ناراض نہ تھا۔ جب وہ بعد میں اپنی جاب کے متعلق بتائے گا تو ان کا کیا رد عمل ہوگا، وہ سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ بعد کی بات بعد میں دیکھی جائے گی، ابھی تو اسے سب سہٹ رکھنا تھا۔

اس رات حیانے پزل باکس اسے ہی لا کر تھا دیا۔ پہلے تو وہ واقعی غمزہ بڑا گیا کہ وہ جان چکی ہے، اور اب اس کا حساب لینے آئی تھی، مگر نہیں، وہ صرف باکس کھولنے میں مدد چاہ رہی تھی۔

پاگل لڑکی، یہ راز داری سے رکھنے والی چیز تھی، وہ کیا اب ہر کسی سے یوں ہی مدد مانگتی پھرے گی۔

اس کا علاج کرنا ضروری تھا۔ سو اس نے فوراً چھرا اور تھوڑا مانگا۔ حیانے گھبرا کر باکس واپس لے لیا۔ چلو اس کو اس کی توڑ کر نہ کھولنے والی خواہش کا اتنا احترام تو تھا ہی۔ اب اس کے لاکر سے ویڈیو کالنے کے لیے ضروری تھا کہ وہ واپس استنبول جائے۔ ایک وقت تھا جب وہ اسے روکنا چاہتا تھا، مگر آج وہ خود سلیمان ماموں کے پاس گیا تاکہ ان کو سمجھا سکے۔

وہ کمرے میں اکیلے تھے، وہ سامنے کرسی پر بیٹھ گیا، چھوٹی چھوٹی باتوں سے آغاز کیا، وہ خاموشی سے اسے سنتے رہے۔
”تم اور کیا کرتے ہو، ریسٹورنٹ کے علاوہ؟“

انہوں نے سادہ سے انداز میں پوچھا تھا، مگر وہ ذرا دیر کو ٹھٹھکا۔ وہ کچھ جانتے تو نہیں تھے؟ آری کے بارے میں کچھ نہیں جان سکتے تھے، مگر کہیں اس کے عبدالرحمان شاہوالے کور کے بارے میں تو کچھ نہیں جانتے تھے؟ یا شاید روئیل نے امریکہ والی بات کا ذکر کیا ہو، مگر نہیں... وہ ان کی تسلی کرتا گیا، پورے اعتماد کے ساتھ۔ پھر اس نے حیا کی بات کی۔ اور جب یہ کہا کہ اگر وہ واپس نہیں جائے گی تو کبھی ڈی جے کے دکھ سے نہیں سنبھل پائے گی تو سلیمان ماموں نے بس اس کے چہرے کو فوراً سے دیکھتے ہوئے اجازت دے دی۔ انہیں اس کا حیا کے لیے فکر مند ہونا اچھا لگا تھا۔

☆ ☆ ☆

سب ٹھیک جا رہا تھا۔ وہ دونوں واپس آئے تو اس کا ارادہ تھا کہ وہ کچھ دن اسے اپنے گھر رکھنے کا کہے گا۔ آہستہ آہستہ وہ اس کا لاکر ڈھونڈ لے گی اور اس سے پہلے کہ کسی دوسرے کے منہ سے وہ کچھ سنے، وہ ویڈیو اسے مل جائے گی۔ پھر وہ مل کر کچھ فیصلہ کریں گے کہ آگے زندگی انہیں کیسے گزارنی ہے۔ سب کچھ ٹھیک جا رہا تھا۔

پاکستان سے واپسی پر اس کے سر کا درد بڑھتا ہی گیا تھا، اور اس کے باعث اسے بخار ہو گیا تھا۔ پہلے دن تو حیا چلی گئی، اس نے کہا تھا وہ کل آئے گی، ابھی وہ سب انجی دیکھنا چاہتی تھی۔ ڈی جے کی وجہ سے یقیناً.....

جس رات کے لیے حیانے آنے کا کہا تھا، اس شام سے ہی اس کا سر درد ورنہ ناقابل برداشت صورت اختیار کر گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا، ابھی سر پھٹ جائے گا۔ وہ اپنا کام خود کر لیتا تھا، مگر آج عرصے بعد اس نے می سے کہا کہ وہ اسے دودھ گرم کر کے لادیں اور ساتھ میں نیند کی گولی بھی۔ می فوراً دونوں چیزیں لے آئیں۔ ذرا پریشان بھی ہو گئیں۔ ان کو فکر نہ کرنے کا کہہ کر اس نے دوا لی اور پھر لیٹ گیا۔ حیا آئے گی تو وہ اٹھ جائے گا۔ ابھی تھوڑا سا سولے۔ نیند میں جاتے ہوئے بھی اس کے اندر متضاد ہی جنگ چھڑی ہوئی تھی کہ وہ اپنا ایم آر آئی پھر سے کروائے، یا اس درد کو نظر انداز کرتا رہے؟

وہ کسی بری خبر سے ڈرتا تھا۔

اس کا کیریئر..... اس کی منزل..... تاکہ وہ فوجی قرار دیکر ریٹائرمنٹ.....

رات کا جانے کون سا پہر تھا جب اس کی آنکھ مسلسل بجی گھنٹی سے کھلی۔ اس نے اٹھنا چاہا تو سر بے حد زور پی ہور ہا تھا۔ بمشکل وہ کبھی کا سہارا لے کر سیدھا ہوا، اور فون دیکھا۔

سفیر عثمان

جب اس نے فون کان سے لگایا تھا تو اس کی آنکھوں کے سامنے بار بار اندھیرا چھا رہا تھا اور جب اس نے سفیر کی بات سنی، تو اسے جیسے زور کا چکر آیا تھا۔

”آبی (بھائی) ایک لڑکی کا فون آیا ہے، وہ اپنا نام جیتا رہی ہے، اور وہ کہہ رہی ہے کہ اس کو اغوا کر لیا گیا ہے!“
وہ رات شاید اس کی زندگی کی طویل ترین رات تھی۔ انڈیا میں راکہ تحویل میں گزری راتوں سے بھی زیادہ تلخ، زیادہ تکلیف دہ اور زیادہ بھیاں تک۔

اسے لگا تھا، وہ جیا کو کھو چکا ہے۔ صرف اس لیے کہ وہ اس کی غمگینی نہیں کر سکا۔ وہ اس کی حفاظت نہیں کر سکا، وہ لوگ اسے اغوا کر چکے تھے۔ صرف اس لیے کہ اس رات عبدالرحمن پاشا سو گیا تھا۔ وہ اس کو لے گئے تھے۔ وہ کیا کرے؟ وہ کدھر جائے؟ وہ کیا کرے گا اب؟
وہ بمشکل بستر سے اٹھا، چہرے پہ پانی بھی نہیں ڈالا، بس جبکٹ اٹھائی، پستول جیب میں رکھا، اپنا خاص چاقو جراب کے ساتھ باندھا، اور فون ہاتھ میں لیے باہر بھاگا گاڑی تک آتے آتے اس کو چکر آ رہے تھے۔
باہر سردی تھی۔ ہڈیوں کو حمادینے والی سردی۔ اور اندھیرا۔ دنیا جیسے ختم ہو کر برف کا ڈھیر بن گئی تھی۔ وہ رات برف جیسے رات تھی۔ سرد اور کہہ آلود۔ سفید اور ٹھنڈی۔

کارا اشارت کرتے ہوئے اس نے سفیر کو کال بیک کیا۔

”کچھ بتایا اس نے؟ وہ کدھر ہے؟“

”یوسفورس برج کہا تھا، میں کال بیک کر رہا ہوں مگر کال نہیں جا رہی۔ اس کا نمبر رو مگ پ ہے، اور ڈیٹلس ختم ہو گیا ہوگا۔“
مگر مسئلہ یہ تھا کہ یوسفورس برج بھی تو دوتھے۔ ایک فرسٹ یوسفورس برج جس کو عرف عام میں ”یوسفورس برج“ کہا جاتا تھا اور دوسرا سیکنڈ یوسفورس برج جس کا عام نام سلطان احمد برج تھا۔ یہ پل سلطان احمد مسجد (نئی مسجد) کی پشت پہ ہی تھا۔
چونکہ جیانے سفیر کو پاکستانی موبائل سے کال کی تھی، اس لیے اس نے سب سے پہلے اپنے ٹریسر کا اسٹیشن چیک کیا۔ وہ واقعی سلطان احمد برج کے قریب میں ہی کہیں تھا۔ دوسرا ٹریسر جواب نہیں دے رہا تھا۔ وہ سمجھ نہیں سکا کہ جیانے اسے کال کیوں نہیں کی۔ اس نے عثمان شبیر سے مدد مانگی، مگر اس سے کیوں نہیں۔ نہ جہان سے، نہ عبدالرحمن سے۔ کیوں؟ ان سے کیوں نہیں؟
لیکن ابھی یہ ثانوی باتیں تھیں۔ اسے جلد از جلد حیا کو ان لوگوں کے شکنجے سے نکالنا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ کون ہوں گے۔

وہ آرگنائزڈ کرپٹن تھے جو لڑکیوں کو اغوا کرتے تھے، اور استنبول میں ان کے بہت سے گروہ کام کر رہے تھے۔ ترکی اس شے کے لیے خاصا بدنام تھا۔ روس، یوکرین اور المالدو کی لڑکیاں نوکری کے لالچ میں ادھر لائی جاتی تھیں اور بیچ دی جاتی تھیں پھر برادری ان سے وائٹ سیلوری کرانی جاتی، یعنی کال گرلز بنادیا جاتا اور ان سے پیسے وصولے جاتے۔

جتنا وہ سمجھ پایا تھا، وہ کسی شب پہ تھی۔ وہ لوگ اسے کہیں دور لے جا رہے تھے۔ سلطان احمد برج پہ پہنچ کر اس بات کی تصدیق بھی ہوگئی۔ ایک شب سائے ہی تھا۔ اس کا ٹریسر بھی وہیں کا اشارہ دے رہا تھا۔ وہ وہیں تھی۔ جہاں پل پہ کھڑا تھا تو وہ چند کوس دور تھی۔ برف کی طرح ٹھنڈی رات میں وہ اس کے پاس ہوتے ہوئے بھی بہت دور تھا۔ سلیمان ماموں سے حیا کا خیال رکھنے کا وعدہ بھی نہیں نبھاسکا تھا وہ۔ بے بسی کی انتہا تھی۔
اس نے جھٹنے سر اور تناؤ کا شکار اعصاب کے ساتھ سوچنے کی کوشش کی، اب وہ کیا کرے؟ وہ اکیلا آدمی ان کے کسی شب پہ حملہ تو نہیں کر سکتا تھا۔ اسے پولیس کی مدد چاہیے تھی۔ اسے فورس چاہیے تھی۔ ایسے لوگ جو اس کے کہے سے آگے پیچھے نہ بنیں، سانپ بھی مرے اور لاش بھی نہ ٹوٹے۔ اسے صرف حیا کو بچانا ہی نہیں بلکہ میڈیا اور تفتیشی افسران کی نظر سے اس کو دور بھی رکھنا تھا۔

اس کہہ آلود، بیستہ رات میں وہیں کھڑے کھڑے اس نے اپنے تمام کاغذات استعمال کیے۔ بے حد شدید سردی اور بار بار دھندلی پڑتی بصارت کے ساتھ وہ پل کے اس پار کھڑا تھا۔ ایک خوف جو ہر سو اس کے ساتھ تھا۔ کہیں وہ در نہ نہ کر دے، کہیں کچھ برائہ ہو جائے۔ بہت عرصے بعد اس نے خود کو اتنا بے بس اور مضطرب محسوس کیا تھا۔ وہ عبدالرحمان پاشا تھا، مگر وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا، کیونکہ عبدالرحمان پاشا ایک بڑے نام کے سوا کچھ نہ تھا۔
استنبول میں خفیہ پولیس کی ایک برانچ ”فرسٹ ٹیم“ کہلاتی تھی، یہ سادہ کپڑوں میں سڑکوں پہ پیڑول کرنے والے اہلکار تھے۔ بہت قابل تھے اور ان سے اس کی اچھی شناسائی تھی۔ ایک آفسر کے لیے تو اس نے نئی کام بھی کر کے دیے تھے صرف اس لیے کہ کل کو وہ اس کے کام کر کے دے گا، اور اب وہ وقت آن پہنچا تھا جب اسے احسان کا بدلہ احسان سے چاہیے تھا۔

فرسٹ ٹیم کا وہ یونٹ جلد ہی جگہ پہ پہنچ گیا۔ ایک ایک منٹ قیمتی تھا۔ انہوں نے علاقے کو گھیر کر باری باری، خاموشی سے شب پہ اترنا شروع کر دیا۔ چند بندے پکڑے، چند لوگ رگیا، کسی کے سر پہ پستول رکھ کر لڑکیوں کا پوچھا، اور بالاخر ان کو وہ راہداری مل ہی گئی جہاں ایک کمرے میں

لڑکیاں بند تھیں۔

وہ اس کمرے کا دروازہ کھول کر داخل ہونے والوں میں سب سے آگے تھا۔ اندر ایک دم روشنی کی گئی، اندھیرے میں بے ہوش، نیم جان پڑی لڑکیاں بہت بری حالت میں تھیں۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا اور حیا کو ڈھونڈنا چاہا۔ کئی لڑکیوں کے چہرے دائیں بائیں ڈھلکے ہوئے تھے، اس نے ایک ایک چہرے کو موڑ کر دیکھا۔ حیا کہیں بھی نہیں تھی۔

یہ کیسے ہو سکتا تھا؟

آفیسر اپنی کارروائی کر رہے تھے، وہ کمرے سے باہر بھاگا۔ ایک آفیسر اس کے پیچھے آیا تھا۔ وہ پوچھ رہا تھا کہ اسے اس کی لڑکی ملی یا نہیں۔ وہ جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ بس اس نے موبائل سے ٹریسر کا آئٹمز چیک کیا۔ وہ اس پاس ہی تھی۔ مگر کدھر؟ شپ کے ایک بندے کو ایک ہلکار نے اپنے نرغے میں لے رکھا تھا۔ وہ ان سے ان کے بڑوں کا پوچھ رہے تھے۔ وہ ہکلاتے ہوئے ایک اندر کی سمت جاتی راہداری کا بتانے لگا۔ جہان نے پوری بات نہیں سنی۔ وہ اس طرف بھاگا۔ ساتھ ہی اس نے حیا کو کال ملائی۔ حیا کا فون رومنگ پہ تھا، اور کال نہیں جاسکتی تھی کہ بیٹلس ختم تھا، مگر اس نے سسٹم بیک کر کے کال ملائی، اور یہ سب تب ہوا جب وہ اور ساتھی آفسر دوڑنے قدموں سے اس راہداری میں بھاگتے جا رہے تھے۔



اور تبھی اس نے ایک کمرے کے پیچھے سے حیا کی چیخیں سنیں۔ وہ رک گیا۔ اس آواز کو وہ اچھے سے پہچانتا تھا۔ یہ حیا ہی تھی۔ اس کا دماغ گول گول گھومنے لگا۔ وہ دیوار پر چیخ رہی تھی۔ اسے لگا وہ اس کو کھو چکا ہے۔ وہ ناکام ہو چکا ہے۔ وہ اسے محفوظ نہیں رکھ سکا۔ وہ اپنی بیوی کی حفاظت نہیں کر سکا۔

وہاں مزید لوگ بھی آگئے تھے۔ دو آفیسرز کمرے کے دروازے کی درز سے اندر دھواں پیدا کرنے والے بم جھوڑنے لگے، وہ ہر چیز سے بے نیاز زور زور سے دروازے کو بوٹ سے ٹھوک مارنے لگا۔ وہ چیخ رہی تھی، کمرے میں یقیناً دھواں بھر رہا ہوگا، اور وہ چیخے جا رہی تھی۔ ایک مردانہ آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔

زوردار ٹھوک کے ساتھ دروازہ کھلا، اور وہ لوگ کسی بہتے سیلاب کی طرح اندر داخل ہوئے، عین اسی وقت اس آدمی نے اس کی بیوی کو آتش دان پہ پھینکا تھا۔

وہ اس کی زندگی کا سب سے تکلیف دہ منظر تھا۔ کمرے میں بہت سادھواں پھیلا تھا۔ وہ برف کی رات نہیں تھی۔ وہ آگ کی رات تھی اور وہ کرسی پہ بندھی، زخمی، دکھائے گئے بازو کے ساتھ، آگ کے قریب اونڈھے منہ گری ہوئی تھی۔ اس کے لباس کا دامن جل رہا تھا، مگر باقی اس کا لباس ٹھیک تھا۔

ایک آفیسر تیزی سے اس کے لباس کو بھانے لگا۔ جہان حیا کی طرف نہیں گیا، وہ تیزی سے اس پستہ قد روی کی جانب بڑھا تھا جس نے اس کی بیوی کو لٹشہ دکان نشانہ بنایا تھا اس کی ہمت بھی کیسے ہوئی کہ وہ اس کی بیوی کو ہاتھ بھی لگائے؟

سردرد، بخار، فرسٹیشن اور غصہ، ایک جنون تھا جو اس پہ سوار ہو گیا تھا۔ اس نے اس روی کو گردن سے پکڑا اور پھر اسے دھکیلتے ہوئے اس کا سر دیوار سے دے مارا۔ روی نے جواب میں اس کے سینے پہ زور سے لات ماری، وہ لمحے بھر کو سنبھل نہیں پایا، اور پیچھے جا کر لگا۔ سر پہ چوٹ لگی، پہلے سے موجود روجھے پھٹنے کے قریب آگیا۔ مگر اگلے ہی بل وہ دیوانہ وار آگے بڑھا اور روی کو پھر سے گردن سے دبوچا۔ اسی جنون آمیز انداز میں اب وہ اس کا سر بار بار دیوار سے مار رہا تھا۔ بوہان ہوئے روی نے جوابی حملہ کرنے کی کوشش کی مگر وہ نہیں رکا۔ اگر اس کا دوست آفیسر اس کو نہ پکڑتا تو شاید وہ اس کو جان سے مار چکا ہوتا۔ بشکل ان لوگوں نے ان دونوں کو چھڑایا۔

اپنے ہونٹ سے سناخون جب تک کی آستین سے صاف کرتے ہوئے وہ خود کو آفیسر کی گرفت سے چھڑاتا ہوا تیزی سے حیا کی جانب بڑھا۔ تب تک وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ شاید اس نے دھوئیں سے بھرے کمرے میں بھی اسے دیکھ کر پہچان لیا ہو، گو کہ یہ مشکل تھا، مگر یہ وقت یہ باتیں سوچنے کا نہیں تھا۔ وہ ابھی صرف اور صرف اس کی خیریت چاہتا تھا۔ وہ زخمی تھی۔ اس کا خون نہیں نکل رہا تھا، مگر اس کو جلا یا گیا تھا، دانغا گیا تھا، اور اس کے سر پہ گرم بائگ لگا تھا۔ اسے جلد زار جلد طبی امداد چاہیے تھی۔

اگر وہ عبدالرحمن پاشا نہ ہوتا تو وہ سیکورٹی آفیسر بھی بازیاب ہونے والی لڑکیوں کی تعداد چونتیس سے تینتیس لکھنے پہ اور اسے

خاموشی سے اپنی دوست کو اپنے ساتھ لے جانے کی اجازت نہ دیتا۔ ٹرسٹ ٹیم نے اس کے ساتھ تعاون کیا تھا، البتہ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کیس کی مزید تفتیش کے لیے اسے بار بار بلایا جائے گا، پھلے اسے سینکڑوں دفعہ بلوائیں مگر حیا کو نہیں۔ وہ اسے ان سب سے دور کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس کے لیے یہی کر سکتا تھا۔

اس سب کے باوجود وہ جانتا تھا کہ وہ اس پر کوئی احسان نہیں کر رہا۔ یہ سب اس کی اپنی وجہ سے ہی ہوا تھا۔ اس نے ہاشم کو گرفتار شدگان میں دیکھا تھا، اور جیسے کسی نے اس کے اوپر دیکتے کوئلے انڈیل دیے تھے۔ ہاشم، جس کو اس نے جانا کا تعاقب کرنے کو کہا تھا۔ وہ ہاشم اس کی بیوی کو بچ آیا تھا۔ یہ سب اس کا اپنا قصور تھا۔ اس نے غلط آدمی پر بھروسہ کیا، اس نے اپنی وجہ سے حیا کو اتنا نقصان اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ وہی ذمے دار تھا اس سب کا۔

اپنے آپ کو ملالت کرتا وہ حیا کو وہاں سے لے آیا تھا۔ ایک ہی جگہ تھی جہاں وہ اس کو لے جاسکتا تھا۔ جہاں گھیرمی کے پاس بھی نہیں، ممی یا کسی بھی رشتے دار کو کچھ پتا لگے، یہ نہیں ہونا چاہیے تھا، چاہے وہ ممی ہی کیوں نہ ہوں۔ اب ایک ہی جگہ تھی۔

بیوک ادا۔

عائشے گل!

وہ اسے ہسپتال نہیں لے جانا چاہتا تھا۔ اگر وہ اسے خود ہسپتال لے جائے گا تو صبح تک پورے ادالا کو خبر مل جائے گی۔ اپنے کسی آدمی پر اسے بھروسہ نہ تھا کہ وہ حیا کو کسی دوسرے کے ساتھ ہسپتال بھیج دے۔ کبھی بھی نہیں۔ وہ اتنا ہرٹ تھا، اتنا پریشان تھا کہ وہ آخری جگہ جہاں سے بات باہر نہیں نکلے گی اسے ادالار میں اپنا گھر ہی لگتی تھی۔

حیا کے زخم ایسے نہ تھے کہ اسے فوری طبی امداد کی ضرورت پڑتی۔ وہ خود بھی اس کی پٹی کر سکتا تھا، مگر سارا مسئلہ اس کے بالوں کا تھا، اگر وہ خراب ہو گئے تو وہ ساری زندگی خود کو معاف نہیں کر سکے گا۔ ابھی جلد از جلد اس کے بالوں پر سے وہ دیکس اتارنا تھا، اور اس سلسلے میں عائشے اس کے لیے کچھ کر سکتی تھی۔

عائشے کو یقیناً ان کاموں کا تجربہ نہ ہوگا، وہ کوئی پیرامیڈیکل اسٹاف نہیں تھی، وہ تو چھوٹی سی لڑکی تھی، مگر وہ ایک بات جانتا تھا۔ وہ اس لڑکی پر بھروسہ کر سکتا تھا۔ آگے عائشے کیسے حیا کے بال ٹھیک کر سکتی تھی، یہ عائشے کا مسئلہ تھا۔ خوف اور اچانک پڑی افتاد انسان کا اصل پونٹیکل اس کے سامنے لاتے ہیں، اور وہ اس طرح کے شدید حالات میں ایسے کام کر جاتا ہے جو عام زندگی میں اسے لگتا ہے کہ اس سے کبھی نہیں ہو پائیں گے۔ اس وقت بھی اسے عائشے سے اسی پونٹیکل کی امید تھی۔ وہ عبدالرحمان کے لیے کچھ نہ کچھ کر لے گی۔

عائشے اور بہارے اس روزا کیلے تھیں۔ آنے کچھ رشتے داروں سے ملنے شہر سے باہر گئی تھیں۔ وہ پچھلے دروازے سے گھر میں داخل ہوا تھا، اور اس بے ہوش، زخمی لڑکی کو اس نے بالائی منزل پر بنے اپنے نقیش سے بیڈروم کے بیڈ پر لیٹا دیا۔ تب بھی وہ بے ہوش تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اسے کون اتر کر لایا ہے، اس برف اور آگ کی رات میں!

وہ تیزی سے زینے پھلانگتا نیچے آیا اور عائشے کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ دھڑ، دھڑ، دھڑ، اس نے دروازہ پیٹ ڈالا تھا۔

”کیا ہوا؟ کون؟“

عائشے سر پر اس کا راف پیٹی، نیند سے گھبرا کر اٹھی اور باہر نکلی تو اسے سامنے دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

”تم۔ تم انڈیا سے آئے۔“

اور تب اسے یاد آیا کہ ادالار والوں کے لیے وہ انڈیا میں ہی تھا۔

”آج ہی آیا تھا۔ مجھے تمہاری مدد چاہیے۔ اوپر آؤ۔“ ہنیز اور سوئیٹر، بکھرے بال، راف حلیہ، عینک غائب، یہ وہ عبدالرحمن تو نہیں تھا جسے وہ جانتی تھی۔

مگر جیسے کہ اس نے کہا، وہ دونوں بنیں اٹھ کر اوپر اس کے ساتھ آئیں۔ سارا معاملہ ان کو سمجھا کر جہان نے جب مدد کے لیے کہا تو عائشے مذہب سے بیڈ پر پڑی حیا کو دیکھنے لگی۔

”تم اسے ہسپتال لے جاؤ۔ یہی ٹھیک رہے گا، مجھے تو کچھ نہیں سمجھا رہا۔“

”نہیں! کل صبح ہم ڈاکٹر گھر پہ بلا لیں گے، ابھی مجھے صرف اس کے بال بچانے ہیں۔ تم کسی طرح یہ ویکس اتار دو!“

”تمہیں کیوں لگتا ہے، میں یہ کرسکوں گی۔ تم خود ہی تو کہتے ہو عائشہ کل کبھی کچھ نہیں کر سکتی۔“ اس نے ملال سے کہتے ہوئے بے ہوش پڑی لڑکی کے چہرے کو دیکھا۔ وہ اکثر یہ بات کہہ دیا کرتا تھا تاکہ عائشہ سب کچھ کرنا سیکھ جائے۔

”پلیز عائشہ! کچھ کرو۔ مجھے کسی پہ اعتبار نہیں ہے اور اگر تم کچھ نہ کر سکتی ہو تو میں فوراً لینے تمہارے پاس کیوں آتا۔“

وہ اس کے سامنے کھڑا، بہت ٹوٹے ہوئے لہجے اور ستے چہرے کے ساتھ کہہ رہا تھا۔

”اوکے! ہم کوشش کرتے ہیں۔“ اس کے انداز میں کچھ تھا کہ عائشہ سویٹری آستین پیچھے چڑھاتی اٹھی اور غنودہ لڑکی کے سر ہانے آ بیٹھی۔ بہارے البتہ صوفی پٹنٹی، ہتھیلیوں پہ چہرہ گرائے گہری سوچ میں گم تھی۔

”کچھ بھی کرو، مگر مجھے اس کے بال واپس چاہئیں۔“ وہ صوفی پہ بیٹھتے ہوئے بھر سے جیسے منت کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پہ یہ زمانوں کا کرب و تکلیف رقم تھی۔ ”اس کے بال بہت خوب صورت ہیں اور مجھے وہ واپس چاہئیں۔“

”کیا وہ تمہیں اچھی لگتی ہے۔“ بہارے نے بہت سوچ کر سوال کیا، عائشہ نے تادیبی نظروں سے اسے گھورا، مگر وہ جہان کی طرف متوجہ تھی۔

وہ چند لمحوں سے دیکھتا رہا۔ پھر آہستہ سے سر اثبات میں بلایا۔

”بہت زیادہ“

”اور اگر اس کے بال خراب ہو گئے تو وہ تمہیں اچھی نہیں لگے گی۔“

”بہت ہو گیا، بہارے کل!“ عائشہ نے سختی سے ٹوکا تو بہارے نے منہ بسور کر سر جھٹکا۔

”وہ مجھے تب بھی اچھی لگے گی۔“ کچھ دیر بعد وہ مضبوط لہجے میں بولا تو بہارے نے ناک سکیڑ کر چہرہ پھیر لیا۔ اسے جیسے یہ بات بالکل بھی پسند نہیں آئی تھی۔

عائشہ اب اس کے بالوں کو چھو کر دیکھ رہی تھی۔

”ویکس..... ویکس کھینچ کر اتاری جائے تو بالوں کو نقصان دے گی، لیکن.....“ اس نے ذہن پہ زور ڈالنا چاہا۔ ”لیکن اگر اس کو

ہم کھلا کر اتاریں، تو یہ اتر جائے گی، مگر Scalp کو جو نقصان پہنچا ہوگا، وہ۔“

”تم Scalp کے زخموں کی فکر مت کرو، صرف یہ ویکس اتار دو۔“

”ہاں! بعض دفعہ ہاتھ پہ بھی گرم گرم ویکس گر جاتی ہے، اتنا نقصان نہیں ہوتا جو بھی زخم ہیں، وہ بھر جائیں گے مگر اس کو کیسے

کھلائیں؟“ وہ بے بسی سے بولی۔ ”آخر کوئی چیز ہے جو ویکس گھول سکتی ہے؟“ عائشہ جسے ہوئے ویکس کو ہاتھ سے چھو کر دیکھتی سوچ میں پڑ گئی۔

”گرم پانی؟“ وہ بولا، مگر عائشہ نے نفی میں سر ہلایا۔

”ہم اس کا چہرہ بچائے بنا بال گرم پانی میں نہیں ڈال سکتے۔ ویکس اس کی مانگ پہ گری ہے۔ ہمیں بہت اہلتا ہوا گرم پانی چاہیئے ہوگا،

مگر اس کے چہرے کو وہ جلادے گا! صرف بالوں پہ کچھ لگانا ہے!“ پھر وہ ایک دم چونکی ”شیپو۔ ہاں شیپو ہے جو ویکس کو گھول سکتا ہے۔ شیپو بالوں پہ

لگی چیزوں کو گھول سکتا ہے۔ مگر.....“ وہ جوش سے کہتی بہتی رہی۔ جہان اور بہارے منتظر سے اسے دیکھ رہے تھے۔

”مگر مسئلہ یہ ہے کہ عموماً تمام شیپوز میں ویکس پہلے سے موجود ہوتی ہے، ہمیں کوئی ایسا شیپو استعمال کرنا ہوگا۔ جس کے اجزاء میں

ویکس نہ شامل ہو۔ ایسا کون سا شیپو ہے جس میں ویکس نہیں ہوتی؟“

”سن سلک!“ وہ ایک دم سر اٹھا کر بولا۔ ”سن سلک میں ویکس نہیں ہوتی۔“

”تمہیں کیسے پتا۔“ بہارے نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

”جب میں جیل میں تھا تو وہاں ایک دفعہ ہاتھ روہ میں سن سلک کی بوتل قسمت سے مجھے دی گئی تھی، میں نے اس کے سارے اجزاء

ترکیبی حفظ کر لیے تھے، مجھے یاد ہے ان میں ویکس نہیں تھی۔“

”تم جیل میں بھی رہ چکے ہو؟“ عائشہ کو جہاں شک لگا، وہاں بہارے مارے ایکساٹمنٹ کے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”واقعی تم جیل میں بھی رہ چکے ہو؟“ وہ بے حد متاثر ہو چکی تھی

”ہاں! بس ایک دفعہ غلطی سے۔ بس ایک رات کے لیے۔ جاؤ تم سن سلک لے کر آؤ، میں اسٹڈی میں ہوں، مجھ سے یہ سب نہیں

دیکھتے سر کے ساتھ وہ ٹھیک سے بات بھی نہیں بتا پا رہا تھا۔ سواٹھ کر اسٹڈی میں جا بیٹھا اور سگریٹ جلا لی۔ وہ آگ اور برف کی رات تھی۔ یہ خیال ہی کہ حیا کو نقصان پہنچا ہے، اس کے سارے جسم کو برف کی طرح ٹھنڈا اور مردہ کر دیتا تھا۔ اور پھر وہ آگ یاد آ جاتی جو اس لڑکی نے سہی تھی۔ سب اس کا قصور تھا۔ اس آگ اور برف کی رات پہ وہی قصور وار تھا۔ اس کا دل بہت بری طرح سے دکھا ہوا تھا۔

اندر عائشے نے پوری مستعدی سے کام شروع کر دیا تھا۔ سب سے پہلے اس نے نشور دل لیا، اور بہت سا نشو اچھے سے حیا کے سر پہ اس جگہ لینا جہاں دیکس گری تھی۔ پھر اوپر سے اس نے ہینر ڈرائیر چلا دیا۔ تیز گرم ہوا نشو سے گزر کر بالوں کو چھونے لگی۔

عائشے اسی طرح حیا کے سر ہانے کا پٹ پہ گھنٹوں کے بل بیٹھی، ہینر ڈرائیر پکڑے اس کے بالوں کے قریب آگے پیچھے کر رہی تھی۔ آہستہ آہستہ نشو تلے جی دیکس پکھل کر نشو میں جذب ہونے لگی۔ جیسے ہی نشو کا وہ ڈھیر گیلہ ہو گیا، بہارے نے جلدی سے اسے حیا کے بالوں سے اتار اور ٹوئری میں پھینکا۔ تب تک عائشے نیارول کھول کر حیا کے بالوں پہ لپٹنے لگی تھی۔

یوں تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ نشو بدل دیتیں۔ بہت سارا دیکس یوں ہی اتر گیا، یہاں تک کہ اب دیکس کی آخری تہہ بالوں پہ جمی رہ گئی جس سے بال نظر آ رہے تھے۔ پتلی مگر سب سے مشکل تہہ۔

اس کے لیے اس نے شیمپو استعمال کیا۔ تو لیے کو اس کی گردن پہ آگے پیچھے پھیلا کر (کہ وہ عبدالرحمن کا بیٹہ تھا اور اس پہ ایک داغ بھی وہ برداشت نہیں کرتا تھا) اس نے سر سے حیا کے بالوں کو گیلہ کر کے نرمی سے ان پہ شیمپو کا مساج شروع کیا۔

”ای!“ درمیان میں ایک دفعہ اس کی آنکھ بھی کھل گئی، شاید پانی اس کی آنکھوں پہ گر رہا تھا۔ اس نے فوراً بہارے کو آہستہ سے کہا۔
”عبدالرحمن کو کہہ کر آؤ کہ وہ جاگ گئی ہے!“ عائشے کے ہاتھ ابھی بھاگ سے بھرے، حیا کے بالوں پہ تھے۔ بہارے سر ہلا کر تیزی سے باہر بھاگی۔

وہ اسی طرح اسٹڈی میں بیٹھا، کھڑکی سے باہر تاریک رات کو دیکھتا، سگریٹ پھونک رہا تھا۔ بہارے بھاگ کر اس کے پاس آئی۔
”وہ اٹھ گئی ہے، بس تھوڑی سی زیادہ نہیں۔ اب کیا کریں؟“

اس کے پکارنے پہ وہ چونکا۔ پھر چند لمحے خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھا، پھر فوراً اٹھ کر باہر گیا۔ اس کا رخ ایک کی طرف تھا۔ جب وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک Sleep Spray تھا۔

”اس کو اس کے تکیے پہ اسپرے کر دو، وہ پھر سے سو جائے گی!“
اس نے اسپرے بہارے کو دے دیا۔ وہ اسپرے پکڑے سر ہلا کر واپس اندر بھاگ گئی۔

اس کی ہدایت کے مطابق عائشے نے سلیپ اسپرے حیا کے تکیے پہ کر دیا۔ وہ جو ہلکی ہلکی جاگنے لگی تھی، پھر سے غنودگی میں چلی گئی۔ صبح فجر سے قبل اس کے بال تھوڑے بہت ضیاع کے بعد واپس اپنی حالت پہ آچکے تھے۔ دوسری طرف وہ بھی واپس اپنی حالت پہ آچکا تھا۔ البتہ اس نے ایک کام اور کیا تھا کہ جو تصاویر اس کے پاس حیا کی تھیں، وہ اس نے اسٹڈی کے کمپیوٹر سے پرنٹ آؤٹ کر کے اسٹڈی کی دیواروں پہ آویزاں بیننگز کے فریم میں اصل بیننگ اور شیشے کے درمیان لگا دی تھیں، تاکہ یوں لگے کہ وہ تصاویر ہی فریم کی گئی ہیں۔ جب وہ ادھر رہے گی اور کسی دن وہ اس کمرے میں آکر یہ دیکھے گی، تو جان لے گی کہ وہ برا آدی نہیں تھا۔ وہ اس کے بہت سے لمحوں میں اس کے ساتھ تھا، اور اس کا خیال رکھتا تھا۔

”صبح تم ڈاکٹر کو لے آنا، باقی سارے کام وہ کر دے گی، مگر ایک بات۔“
صبح جب وہ دونوں کمرے سے نکلے تو وہ اپنے مخصوص حلیے میں، سوٹ میں ملبوس، بال جیل سے پیچھے کیے، عینک لگائے، بریف کیس اٹھائے، واپس جانے کے لیے تیار کھڑا تھا۔

”کیا؟“

”تم اس کو نہیں بتاؤ گی کہ میں یہاں آیا تھا۔ بہارے اگر تم نے منہ سے ایک لفظ بھی نکالا تو میں تم سے کبھی بات نہیں کروں گا۔“
”اوکے!“ میں کیا کہہ رہی ہوں!“ وہ نرموٹھے پن سے شانے اچکا کر بولی۔

جب بہارے منظر سے ہٹ گئی تو اس نے عائشے کو مخاطب کیا۔

”تم نے مجھے بہت بڑا فیور دیا ہے۔ تم اس کے بدلے مجھ سے کچھ بھی مانگ سکتی ہو۔ میں انکار نہیں کروں گا!“ وہ سنجیدگی سے بولا تھا۔ عائشہ کھلے دل سے مسکرا دی۔

”میں صرف اتنا چاہتی ہوں کہ زندگی میں دوبارہ کبھی اگر تمہیں کسی بڑے فیور کی ضرورت پڑے تو تم مجھ سے ضرور مانگو۔“
 ”بالکل۔ میں دوبارہ بھی مانگوں گا۔ وہ کیا ہوگا، میں نہیں جانتا مگر ضرورت پڑنے پر میں تمہارے پاس ضرور آؤں گا۔ ایک اور بات۔“
 ”قدرے رک کر اس نے کچھ بتانا شروع کیا جس کو سن کر عائشہ کے چہرے کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔
 ”وہ تمہاری بیوی ہے۔ اور وہ تمہیں کسی دوسرے نام سے جانتی ہے۔ پھر تم نے آنے سے کیوں کہا کہ تم اس سے شادی کرنا چاہتے ہو؟“ وہ سچ بولنے والی لڑکی ایک دم ششدر رہ گئی تھی۔

”میں صرف یہ جانتا چاہتا تھا کہ وہ کسی امیر آدمی کے لیے اپنے شوہر کو چھوڑ سکتی ہے یا نہیں۔ یہ اتنا بڑا مسئلہ نہیں تھا۔“ وہ اب عائشہ کے سوالات سے جان چھڑاتا چاہ رہا تھا۔

”انہوں کو ہر وقت آزما تے نہیں ہیں عبدالرحمن“

”جو بھی ہے، تم ہمارے کو یہ سب مت بتانا۔ میں نہیں چاہتا کہ حیا کسی اور کے منہ سے میرے بارے میں یہ سب سنے۔ ایسی صورت میں وہ کبھی میرا اعتبار نہیں کرے گی۔ میں اسے خود سب بتا دوں گا، مگر کچھ دقت بعد۔“

”تم بہت جھوٹ بولتے ہو۔“ عائشہ نے دکھ سے اسے دیکھا۔ اور جواب اس کے تاثرات پھر سے ساٹ ہو گئے۔
 ”پوری رات جس شخص کو عائشہ نے دیکھا تھا، وہ چلا گیا تھا، اور پرانا عبدالرحمن واپس آ گیا تھا جو اس پھٹکی بابت ابھی تک اس سے خفا تھا۔ بس ایک ہی لمحے میں وہ ساری رات کے لیے بنا بکھرا سا عبدالرحمان غائب ہو گیا تھا۔

”کوشش کرنا وہ کچھ دن تمہارے پاس ٹھہر جائے۔ میں جا رہا ہوں، فنون کرتا رہوں گا۔“ سنجیدگی سے کہہ کر وہ پلٹ گیا تھا۔ عائشہ ملال سے اسے جاتے دیکھتی رہی۔ اب اسے وہی کرنا تھا جو وہ کہہ رہا تھا۔



چونکہ اسے واپس انڈر گراؤنڈ ہو جانا تھا، اس لیے اگلے ہی روز اس نے عائشہ کو کال کر کے بتایا کہ وہ واپس انڈیا جا رہا ہے۔ حسب معمول وہ مان گئی۔ اب وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ جتنے دن حیا اس گھر میں رہے، امت اللہ حبیب واپس آئیں۔ ان کے ہوتے ہوئے کوئی نہ کوئی ایسی بات ہو جائے گی کہ وہ عبدالرحمن کی اصلیت جان جائے گی۔ وہ اچھی خاصی ذہین لڑکی تھی۔ وہ اس کو انڈر اسٹیٹسٹ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اگر کسی دوسرے کے منہ سے وہ سنے گی تو وہ اس کا اعتبار کھو دے گا۔ اس لیے بہتر تھا کہ جب تک وہ اپنا پزل باکس نہ کھولے تب تک وہ عبدالرحمن کی حقیقت سے بے خبر رہے۔ اس لیے اس نے آنے کے ذمہ کچھ کام ایسے لگا دیے جو ان کو چند دن مزید مصروف رکھیں گے۔ بس یہ چند دن ہی تو رہے گی حیا عائشہ کے گھر۔ پھر بھٹلے آنے واپس آ جائیں، خیر تھی!

تیسرے روز اس نے عائشہ کو انڈین نمبر سے کال کی۔ وہ حیا سے بات کرنا چاہتا تھا، وہ اس کی آواز سننا چاہتا تھا۔ اس کے دل کو اس دن سے اب تک ترانہ نصیب نہیں ہوا تھا۔

مگر وہ اس کی بات سننا ہی نہیں چاہتی تھی۔ اگر وہ اسی میں خوش تھی تو ٹھیک ہے۔ اس نے کہلوادیا کہ وہ ادالا نہیں آئے گا، وہ آرام سے ادھر رہے۔ اگر یہی حیا کے سکون کا باعث تھا تو وہ ایسے ہی کرے گا۔

مگر ان دنوں بار بار اس رات کے مناظر اس کی آنکھوں کے سامنے آتے اور اس کو تکلیف دیتے تھے۔ حیا کے بازو پہ داغا، WHO اور ساتھ میں آخری سلاخ کے دو حرف RE جو جلد ہی سلاخ بنالینے کے باعث ٹھیک سے داغ نہ جا سکے تھے، اور آبلے سے بن گئے تھے، وہ منظر بہت اذیت رساں تھا۔ اگر وہ دلفظ ٹھیک سے داغ دیے جاتے، تو؟ وہ کتنا عرصہ اسے اذیت دیتے، کوئی اندازہ نہیں کر سکتا تھا۔ ہاں ٹھیک ہے، ہر جہی ہے وہ مٹ جاتے، مگر جب تک نہ مٹتے، تب تک تو وہ اسے اذیت دیتے نا! کاش وہ ذرا پہلے پہنچ گیا ہوتا۔ کاش وہ اس کو جملے کی تکلیف سے بچا پاتا۔ کاش!

مئی البتہ ذرا پریشان تھیں کہ حیا کہنے کے باوجود کیوں نہیں آئی۔ اس صبح جب وہ گھر پہنچا تو می نہیں تھیں انہوں نے رات کو اسے جاتے نہیں دیکھا تھا سو ان کو معلوم نہیں تھا کہ وہ رات کہاں رہا تھا۔ دوپہر میں دونوں کی ملاقات ہوئی تو می نے بتایا کہ وہ حیا کے ہاسٹل گئی تھیں، اور

ایک اسٹوڈنٹ نے بتایا کہ شاید اسے اپنی میزبان فیملی کی طرف رکنا تھا۔ اس کے دونوں نمبرز بند آ رہے تھے، یہی بات ممی کو پریشان کر رہی تھی۔ اس نے ممی کو کچھ نہیں بتایا، اس کو راز رکھنے آتے تھے، بس اس نے تسلی دی کہ فون خراب ہوگا۔ وہ فکرنہ کریں۔ البتہ عائشہ کو اس نے فون پر تاکید کی کہ وہ حیا سے کہے، وہ اپنے گھر فون کر لے۔ اگلے روز اس نے واقعی فون کر لیا، اب سرکاری طور پر جہان سکندر کے ہاں اس کا نمبر آ گیا تھا مگر وہ اس کو وہاں فون کرے، یہ مناسب نہیں تھا۔ اس نے ہوٹل گریڈ میں ایک بندے سے کہلو کر حیا کے لیے نیا موبائل اور سیم بھی دلوا دی تھی، اور ظاہر ہے، یہ نمبر بھی اس کے پاس تھا، لیکن اگر جہان اسے فون کرے تو اس کو نمبر کہاں سے ملا جیسے سوال کی کو لاجیکل وضاحت نہ بنتی تھی۔ عبدالرحمن سے بات وہ کرنا نہیں چاہتی تھی، جہان اسے کال کر نہیں سکتا تھا، پھر وہ کیسے اس کی آواز سنے۔ کیسے اس سے بات کرے۔

میجر احمد..... ہاں، میجر احمد بھی تو ہے، وہ اسے کال کر سکتا تھا کیونکہ میجر احمد عموماً ہر بات جانتا ہوتا تھا۔ شاید تب وہ اس کی آواز

سن سکے۔

اور یہ کوشش کامیاب رہی۔ کتنے دنوں بعد اس نے حیا کی آواز سنی تھی۔ وہ حسب معمول میجر احمد سے بے زار تھی، مگر یہ طے تھا کہ وہ اس پر اعتبار کرتی تھی تب ہی وہ اس سے پوچھ رہی تھی کہ بلیک میکرز کو کیسے قابو کیا جاتا ہے، اسے کون بلیک میل کر رہا تھا؟ اس کا دھیان ہاشم کی طرف گیا، خیر اگر وہ عبدالرحمن پاشا تھا تو وہ ہاشم کو کئی سال تک جیل سے باہر آنے نہیں دے گا۔ پھر اس نے اندھیرے میں تیر چلا کر اسے بتایا کہ وہ پوچھنا بکس کھول چکی ہے۔ تب وہ ہنس دیا۔ اس کا لاکر ابھی تک خالی تھا، جب اس نے ویڈیو رکھی ہی نہیں تو کیسا انکشاف۔ وہ تلملا کہ فون رکھنا چاہتی تھی، مگر وہ اس کو مزید سننا چاہتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ سو گئی مگر وہ اس کی خاموشی سننا رہا۔ اس وقت وہ اپنے ریٹورنٹ کے کاؤنٹر پر بیٹھا ریٹرنڈ کے فرض سرجنامہ دے رہا تھا۔ وہ اپنے کام بٹھا رہا، اور دوسری جانب اسے حیا کے سانس لینے کی ہلکی ہلکی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ ابھی آدھا گھنٹہ گزرا تھا کہ اسے لگا اس کے تنہے گئیے ہوئے ہیں۔ تکلیف کی ہلکی سی لہر اٹھی، اور سر کا وہی درد ہر چیز پر چھانے لگا۔

اس نے ہاتھ سے ناک کو چھو کر دیکھا۔ خون۔ پہلی دفعہ سردی اس کی نکیر پھوٹی تھی، ہاتھ روم میں جا کر مین کے سامنے ناک اور سر کو دھوئے ہوئے بھی اس نے فون کا آپتیکر آن رکھا۔ وہ سو رہی تھی، اور وہ مین نے پنڈھال سا جھکا، گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ تین گھنٹے اور بیس منٹ کے بعد کال خود بخود دکٹ گئی۔ چونکہ وہ انٹرنیٹ سے کنکٹ کر کے کال کر رہا تھا، اس لیے وہ گھنٹے بعد کنکٹ کی بجائے کافی دیر سے کئی۔ موبائل بند کرتے ہوئے بلا آخراں نے فیصلہ کر لیا کہ اسے اپنا چیک اپ کروالینا چاہیے۔ کہیں نہ کہیں کچھ غلط تھا۔

اگلی صبح حیا نے اسے نمبر بھیج دیا۔ اس نے نمبر ملنے ہی اسے فون کیا۔ کرنے کی بات کوئی نہیں تھی، بس وہ اس سے بات کرتے رہنا چاہتا تھا۔ اگلے روز وہ صرف اس سے ملنے ادا لار آیا۔ اس نے عائشہ سے کہہ دیا تھا کہ وہ جب پورٹ پہ آئے تو ہمارے کو ساتھ نہ لائے۔ عائشہ ظاہر نہیں کرے گی، مگر بہارے چھوٹی بیٹی، تو قحطی۔ سو عائشہ نے ایسا ہی کیا۔

کھلی فضا میں کرسیوں پر بیٹھے، ناشہ کرتے، اس نے چند ایک بار کریدنے کی کوشش کی مگر حیا نے نہیں بتایا کہ عائشہ بہارے سے اس کی دوستی کیسے ہوئی، اور نہ ہی یہ کہ اس کے ختم کیسے آئے۔ وہ ابھی اس پر اعتبار نہیں کرتی تھی۔ البتہ وہ دوبارہ اس کے فون کے بارے میں پوچھنے لگی تھی۔ گو کہ اس نے اسے دو ایک بار منٹ دیا تھا کہ وہ اجیشل گفٹ تھا، اور اجیشل سے مراد ”اجیشل سرومز“ ہی تھیں مگر وہ ابھی تک پوچھ نہیں پائی تھی۔ خود سے پوچھی وہ نہیں بتائے گا۔ وہ پہلے خود پوچھے گی، جب ہی وہ اسے ڈھونڈ پائے گی۔ البتہ تب وہ ذرا سا سنبھلا جب حیا نے کہا کہ اس کا چہرہ اپنے پاس کے ذکر پہ جھکنے لگتا ہے۔ یہ اس کے اختیار میں نہیں تھا۔ اپنا ملکہ، اپنی جاب، سب بہت یاد آتا تھا۔ مگر کیا اس کی صحت اسے مزید نوکری کرنے کی اجازت دے گی۔ یہیں وہ الجھ جاتا تھا۔

وہیں اس کے ساتھ بیٹھے، اس کو ممی اور عائشہ دونوں کے ٹیکسٹ موصول ہوئے تھے۔ صرف ممی کے پیج کا اس نے حیا کو بتایا، اور عائشہ

کا پیغام پڑھ کر وہ صرف مسکرایا۔

”تم نے ٹھیک کہا تھا۔ اتنے سارے لوگوں سے ایک وقت میں اتنے سارے جھوٹ بولتے تمہیں بالکل افسوس نہیں ہوتا۔ اب تو مجھے یقین ہو چلا ہے کہ تم کبھی انڈیا گئے ہی نہیں تھے۔ تم استنبول میں ہی تھے۔“

”یہ لڑکی بھی نا۔“ اس نے مسکرا کر سر جھٹکنے ”شکریہ“ لکھ کر جوابی پیغام بھیج دیا۔

اس روز ساحل سمندر پہ چلتے ہوئے غیر ارادی طور پر اس کے لبوں سے روجیل کا ذکر نکل آیا تھا۔ روجیل سے تین، ساڑھے تین برس

قبل اس وقت ملا تھا جب وہ ایک چھوٹے سے کام کے سلسلے میں وہاں ایک تعلیمی ادارے میں گیا تھا۔ تب ایک طالب علم نے اندھا دھند فارنگ

شروع کردی تھی، اور ایک گولی اس کو بھی لگ گئی تھی۔ چونکہ وہ لیسٹلر کام کے سلسلے میں وہاں تھا، سو وہ جلد از جلد موقع سے فرار ہو گیا۔ خراب ہوتے زخم کے باعث اس کو کسی قابل اعتماد شخص کے پاس پناہ لینا تھی، اور چونکہ امریکہ آنے سے قبل وہ وہاں موجود ہر شے سے ڈار کا ہتکھوج کر لایا تھا، اس لیے وہ روئیل کے پاس چلا گیا تھا۔ یہ بات اس نے روئیل کو صیغہ راز میں رکھنے کو بھی تھی، اور جواب میں وہ یہ بات راز رکھے گا کہ وہ لڑکی روئیل کے ساتھ رہ رہی ہے۔ اس ڈیل کے بارے میں وہ حیا کو تو نہیں بتا سکتا تھا سو بات ٹال گیا۔ اب وہ پوچھتی رہے اپنے بھائی سے۔ اسے کیا؟

سائل پہ جیانا نے سیپ چنے کی بات کی تھی۔ اس بات نے اسے اطمینان دلایا کہ اب وہ، وہ کام کر سکتا تھا جو وہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ عائشہ بہارے کے ساتھ سیپ چنے کی عادی ہوئی تھی۔ عائشہ کے اکثر سیپ موتی سے بھرے لٹکے تھے جبکہ بہارے کے اکثر خالی۔ جب جہان نے عائشہ کی سالگرہ پہ پچھلے برس ایک قیمتی انگلیشی بطور تحفہ دی تو دو ماہ بعد جب ”عبدالرحمن پاشا“ کے پاسپورٹ کے مطابق اس کی سالگرہ آئی تو عائشہ نے اسے اپنے ایک سیپ سے اکٹھے لٹکے تین موتی دیے تھے۔ وہ موتی ایک ایک ننھی سی قدرتی خراش لیے ہوئے تھے۔ یعنی کہ ان کو پہچانا آسان تھا۔ اس نے عائشہ کو گو کہ اس لڑائی کے بعد بتادیا تھا کہ وہ جلد یا بدیر ان کو چھوڑ دے گا مگر اب جب تک وہ یہاں ہے، اس کو خود کو ان دو معصوم لڑکیوں سے دور رکھنا چاہیے۔ اس طرح کی جذباتی وابستگیاں مستقبل میں ان دونوں کا دل بہت بری طرح سے توڑ سکتی تھیں۔ چھوٹا زخم، بڑے زخم سے بہر حال بہتر ہوتا ہے۔ اس نے سوچا وہ عائشہ کو چھوٹا زخم دے دے، ہٹا کہ وہ مستقبل میں کبھی اس سے کوئی امید نہ رکھے۔

وہ تین موتی آج وہ اپنے ساتھ لایا تھا، البتہ اس نے کسی اور طرح سے ان کو حیا کو دینے کا سوچا تھا، مگر جب وہ سیپ کھولنے کے لیے چھرا لینے دو ریشمے ان نورسٹس کے پاس گئی تو جہان نے رخ موڑ کر، اپنی جراب کے ساتھ بندھا چاٹو نکالا، اپنے سیپ کو اڑھا کاٹا، اور تینوں موتی اندر کچھ اس طرح سے ڈالے کہ جب وہ حیا کے سامنے سیپ کاٹے گا تو وہ یہی سمجھے گی کہ موتی اندر قدرتی طور پر موجود تھے۔ اگر وہ یہ کام عائشہ کے ساتھ کرتا تو وہ بھانپ لیتی، اس کو سیپوں کا تجربہ تھا، مگر حیا نہیں جان سکتی تھی۔ اس کو یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ مواقع کا انتظار کرنے والوں میں سے نہیں تھا۔ وہ موقع خود پیدا کرنے پر یقین رکھتا تھا۔

حیا اس کے نکلنے تین موتی دیکھ کر بہت حیران ہوئی تھی۔ اور متاثر بھی۔ وہ خاموش مسکراہٹ کے ساتھ اپنے لیے خاموش ستائش وصول کرتا گیا۔ کوئی اگر اس سے متاثر ہو رہا تھا تو اس کا کیا جاتا تھا بھلا؟؟؟

..... یہ چند روز بعد کی بات ہے، ایک روز ایک بہت ضروری کام آن پڑا۔ اسے اچانک سے کچھ بہت اہم بیہرہ کی ضرورت پڑ گئی جو ادالار میں اس کے کمرے میں رکھے تھے۔ اس نے عائشہ کو صبح میں فون کر کے پوچھا، مگر وہ مدد کرنے سے قاصر تھی۔

”تمہارا بریف کیس تمہاری الماری میں ہوگا، اور وہ لاک ہوتی ہے۔ چابی بھجوا دو تو میں نکال سکتی ہوں“ اس کا انداز سپاٹ تھا۔ ”تم رہنے دو میں خود کچھ کر لوں گا۔“ عائشہ کے لہجے کی خشکی وہ سمجھتا تھا۔ وہ یقیناً حیا کے پاس ان تین موتیوں کو دیکھ کر بہت ہرٹ ہوئی ہوگی۔ مگر ان دونوں کے لیے یہی بہتر تھا۔ جو بھی تھا، وہ سمجھتا لڑکی تھی، اس نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔ وہ اس کا اشارہ سمجھ گئی تھی۔

ویسے بھی دلوں کا سکون محبت پالنے میں نہیں، اللہ کے ذکر میں ہوتا ہے، اور وہ جانتا تھا کہ عائشہ کو دل کا سکون ہمیشہ نصیب رہے گا۔ اسی شام عائشہ اور بہارے کو ایک جاننے والوں کے گھر فونگنی میں جانا پڑ گیا۔ سہ شام میں جب وہ ادالار آیا تو وہ دونوں گھر نہیں تھیں۔ جہان گھر کے عقبی دروازے کو کھول کر ایک الگ تھلگ بنے بنے زینے سے اوپر اپنے کمرے میں آ گیا۔ کمرے کی ایک چابی عائشہ کے پاس اور دوسری اس کے پاس ہوتی تھی۔

اندر آ کر اس نے کمرہ لاک کر دیا، پھر وہ اپنے کام میں لگ گیا۔ الماری سے اپنا بریف کیس نکال کر بیڈ پر رکھا اور اسے کھول کر مطلوبہ فائلز دیکھنے لگا۔ وہ جانتا تھا حیا نے بھی یہی کیا، مگر وہ بھلا اوپر کیوں آئے گی۔ اتنا بڑا گھر اس کے لیے کافی تھا۔ اسے پتا ہی نہیں لگے گا کہ وہ اس وقت اوپر ہی موجود ہے۔

یہی سوچ کر اس نے نوٹ پیڈ اٹھایا، اور فائل میں سے کچھ نام دیکھ کر اس پہ لکھنے لگا۔ پہلے ہی لفظ پر بین کی روشنائی ختم ہو گئی۔ کیا مصیبت ہے۔ اس نے بین کو زور زور سے جھٹکا تو بریف کیس اوپر فائلز پر سیاہی کے موٹے موٹے قطرے گر گئے۔ اس نے تاسف سے سر جھٹکتے ہوئے لکھنا شروع کیا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو قلم سے لکھ کر لائحہ عمل ترتیب دینے پر یقین رکھتے تھے۔ لکھے بغیر اسے اپنی سوچ گئی بات بھی بعض اوقات سمجھ نہیں آتی تھی۔

ابھی فہرست درمیان میں تھی کہ سیاہی پھر سے سوکھنے لگی۔ اس نے دوبارہ قلم جھٹکا، موٹی موٹی بوندیں پھر سے بریف کیس پہ گریں۔

اس سے قبل کہ وہ عبدالرحمن پاشا کی نفاست پسندی کے قتل پہ افسوس کرتا، کمرے کے دروازے کے لاک میں چابی گھمائے جانے کی آواز آئی۔
لے بھر کو تو وہ واقعی سکتے میں رہ گیا۔ عائشے بہارے واپس آ گئیں یا وہ جیتھی؟

وہ جو بھی تھی، ایک ایک کر کے چابیاں لگا رہی تھی۔ وہ عائشے نہیں ہو سکتی تھی، عائشے کو پتا تھا کہ دروازہ کون سی چابی سے کھلتا ہے۔ اللہ اللہ!
دوسری چابی تک اس نے آنا فانا کر برف کیس بند کیا، اور الماری میں ڈالائیں سری چابی تک وہ باتھ روم میں جا کر دروازے کے پیچھے کھڑا
ہو چکا تھا۔ چوٹی چابی پہ دروازہ کھل گیا۔

وہ جیسا ہی تھی، اور وہ اندر کمرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ اس نے باتھ روم کے دروازے کی درز سے دیکھا، وہ اب الماریاں کھول
رہی تھی۔ جلدی میں وہ نہ برف کیس بند کر سکا تھا نہ ہی آخری الماری، سو حیا سے بالآخر آخری الماری کھل گئی تھی، اور اب وہ اس کا برف
کیس نکال کر بند پڑے آئی جہاں چند لمحے قبل وہ بیٹھا تھا۔ اصولاً اس جگہ کو گرم ہونا چاہئے تھا، بلکہ چادر پہ تختیں بھی پڑی تھیں، مگر وہ برف
کیس کی جانب اتنی متوجہ تھی سو محسوس نہ کر سکی۔
اتنی لڑکی!

اندر تو اس کے ڈاکومنٹس تھے، مگر رنگ کی فائلز بھی تھیں۔ وہ ایسے پکڑے نہیں جانا چاہتا تھا۔ اگر وہ ایسے پکڑا گیا تو وہ کبھی اس
کا یقین نہیں کرے گی۔ اور..... اوہ نہیں..... اس کا Pager بھی اندر تھا۔ وہ اس کا جیجر ہی نہ کھول لے۔ اسے شدید غصہ آیا۔ خود پر بھی
اور حیا پہ بھی۔ مگر وہ جانتا تھا کہ اسے کیسے وہاں سے نکالنا ہے۔ اس نے اپنے موبائل سے جیجر کو ہپ دی۔ نتیجتاً جیجر بجنے لگا۔ حسب توقع حیا
نے گھبرا کر برف کیس بند کیا، اور الماری میں ڈالا۔ وہ واقعی گھبرا گئی تھی سو چند لمحوں بعد وہ کمرے سے باہر تھی۔

دروازہ دوبارہ اندر سے لاک کرتے ہوئے اس نے دوسرے نمبر سے اسے گھر پہ فون کیا یا انجوشی گھنٹی پہ حیا نے بھاگ کر فون اٹھایا۔

”اگر آئندہ آپ نے میرے کمرے کی تلاشی لی تو اپنے پیروں پہ گھر نہیں جائیں گی!“

بہت غصے سے اس کو کھری کھری سناتے ہوئے وہ یہی سوچ رہا تھا کہ اب اس لڑکی کو اس کے گھر سے چلے جانا چاہیے۔ حیا وہاں رہ کر
صحت یاب ہو، یہ چاہتا تھا، مگر وہ اس کی جاسوسی کرے، یہ وہ ہرگز نہیں چاہتا تھا۔

پھر رات میں یہی بات اس نے عائشے سے کہی کہ اب حیا کو وہاں سے چلے جانا چاہیے۔

”ابھی اس کی اسپرنگ بریک بھی ختم نہیں ہوئی، دو چار دن تو وہ اوپر بھی ٹھہر سکتی ہے، اس سے زیادہ وہ نہیں رکے گی، اور میں اپنی مہمان
کو خود سے جانے کے لیے نہیں کہوں گی۔“

مگر یہ دو چار دن بھی جہاں کے لیے کسی سزا سے کم نہیں تھے۔ وہ جانتا تھا کہ حیا صرف اولا ر میں دو جو بات کی بنا پہ رکی ہوئی ہے۔
ایک یہ کہ اسٹینبل میں وہ زخموں والا چہرہ لے کر نہیں جانا چاہتی، اور دوسرا تجسس۔ وہ اس شخص کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جانتا چاہتی تھی جو کافی
عرصہ سے ڈسٹرب کرتا رہا تھا۔ ہاں ٹھیک ہے اس نے حیا کو بہت تنگ کیا تھا مگر اب تو وہ بے چارہ باز آ چکا تھا۔ مگر حیا باز نہیں آئی تھی۔

دو روز قبل کی ڈانٹ بھلا کر اس دن حیا نے خود اس کو کال کر کے اس سے بات کی تھی۔ اسے بہارے کے لیے اسے جیلری شاپ کا پتا
چاہیے تھا۔ جو اب اس نے پتا دینے کی بجائے واؤ چر ز بھجوا دیے۔ کون سا اس کا اپنا پیسہ تھا۔ سب انہی لڑکیوں، آنے اور پاشا بے کا ہی تو تھا، سو اس نے
وہی کیا جو ٹھیک تھا۔

زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ ایک روز بیوک ادا فون کرنے پہ اسے حیا کا ”ہیلو“ سنائی دیا۔ اس نے جلدی سے بنا کچھ بولے پہلے وہ اس
کنورٹر آن کیا، اور پھر بات کرنے لگا۔ مگر جو بات حیا نے آگے سے کہی، وہ اسے غصہ دلانے کے لیے کافی تھی۔

بلا خروہ جان ہی گئی تھی کہ عبدالرحمن پاشا کا ایک دوسرا بھائی بھی تھا۔ وہ پاشا بے کا نام نہیں لے رہی تھی، مگر تاہم یہی وہ جانتی ہی ہوگی
یقیناً۔ ساتھ میں وہ اخبار میں اس کے متعلق آرٹیکل لکھنے کی بات بھی کر رہی تھی۔ اس سے لے جہاں کی برداشت کی حد ختم ہو گئی تھی۔ یہی ڈر تھا
اسے، وہ دو زنگیاں بیچ نہیں کر پائے گا۔ اور اب وہی ہو رہا تھا۔ اس سے زیادہ حیا بیوک ادا میں رہے، اسے گوارا نہیں تھا۔ دو روز بعد یوں بھی پہنچے
اپنے عبدالرحمن پاشا کے کے کو کو کو یکٹیوٹ کرنا یعنی بیوک ادا واپس جا کر وہاں کچھ دن رہنا تھا، سو اب ان دونوں کو وہاں نہیں اکٹھا ہونا چاہیے۔ حیا کو
اس نے پرسوں کا کہا مگر خود گلی ہی صبح وہ بیوک ادا آ گیا۔ آتے وقت اس نے حیا کو سنج کر دیا تھا۔ اس کا ارادہ آج ایک مقامی ”دوست“ سے ملنے کا
تھا۔ آرومی (وہ مقام جہاں دو جاسوس ملتے ہیں) اس کی اپنی طے کردہ تھی، اور وہ عیسیٰ کی پہاڑی تھی۔ وہاں اسے اپنے ساتھی کو چند چیزیں پہنچانی

تھیں۔ اس کے بعد وہ دو پہر میں حیات سے ملے گا، اور اسے واپس چلنے پر راضی کرے گا۔ ویسے بھی سلیمان ماموں نے دو دن بعد استنبول آنا تھا۔ اچھا بہانہ تھا۔ اب وہ واپس آ جائے گی، اور وہ آرام سے بیٹھ کر کام کر سکے گا۔ ویسے بھی حالات جیسے جارہے تھے، لیکن لگتا تھا ترکی میں اس کا قیام جلد ختم ہونے والا ہے۔ ایسے میں اسے اپنی فکر نہیں تھی۔ مہی، ابا اور حیا کی فکرتھی۔ وہ تینوں اس کی فیملی تھے۔ مہی کو ان تین برسوں میں وہ استنبول چھوڑنے پر راضی نہیں کر سکا تھا۔

پاکستان وہ جانیں سکتے تھے، اس نے بہت کوشش کی کہ وہ جرمنی ابا کو لے کر چلی جائیں، مگر پہلے وہ نہیں مانتی تھیں۔ البتہ اب اس کے یہاں کام کرنے کے بعد کسی بھی طرح سے یہ خطرے والی بات تھی کہ اس کے ماں باپ یہاں ہیں۔ بلاخر مہی راضی ہوگئی تھیں کہ وہ ابا کے ساتھ جرمنی چلی جائیں گی، مگر جب تک جہان ادھر ہے، وہ سینکڑیں رہیں گی۔

وہ پندرہ جون تک ادھر ہی تھا۔ پندرہ جون کو ایک اہم کنسائنٹ کے لیے اسے انفرہ جانا تھا، اور کام کچھ اس قسم کا leak out تھا کہ اس کے بعد پہلا شک اسی پہ جائے گا۔ اس لیے اسے کچھ عرصے کے لیے روپوش ہو جانا تھا۔ اس نے یہاں اتنے دشمن بنا لیے تھے کہ اس کے روپوش ہو جانے کے بعد کہیں کوئی اس کے قریبی عزیزوں کو نقصان نہ پہنچائے، اس لیے بہتر تھا کہ جانے سے قبل وہ اپنے گھروالوں کو محفوظ مقام پر منتقل کر دے، مہی، ابا اور حیا اس کی پہلی ترجیح تھے۔ پاشا بے کی فیملی دوسرے نمبر پہ تھی۔ سب کو وہ یہاں سے بھیج دے گا، مگر حیا کا سسٹر پانچ جولائی کو ختم ہونا تھا۔ اسے وہ پندرہ جون سے پہلے پہلے کیسے بھیجے گا۔

اپنے آفس میں بیٹھے ہوئے کام شروع کرنے سے قبل وہ اس الجھن میں گرفتار تھا۔ مسائل کا حل وہ عموماً نکال ہی لیا کرتا تھا مگر یہاں وہ قدرے محضے میں تھا۔ سگریٹ سلگاتے ہوئے اس نے ساتھ میں کافی بھی منگوائی تھی، اور جب تک دیت کافی لے کر نہیں آئی، وہ یہی سوچتا رہا کہ حیا کو یہاں سے کیسے بھیجے۔ ایک حل تھا بالواسطہ۔ یعنی جہان اسے کہے کہ وہ واپس چلی جائے، اور دوسرا تھا بلاواسطہ، یعنی میجر احمد عبدالرحمن پاشا میں سے کوئی کہے۔ مگر وہ کسی کی کیوں مانے گی۔

جب اس کی سیکریٹری دیت فردوس کافی لے کر آئی تو کچھ سوچ کر اس نے یہ بات دیت سے پوچھ لی۔

”کسی غیر ملکی کو ترکی سے واپس بھیجنا ہوتا کیا کیا جائے۔“

دیت ایک ایماندار اور مستعدی ورکرمی۔ وہ اس کو اپنے پاس کی حیثیت سے پسند کرتی تھی مگر کبھی کبھی باتوں کے دوران وہ پاشا بے کا ذکر کر دیا کرتی۔ ”آپ کے چھوٹے بھائی بھی بہت اچھے تھے۔“ یہ فقرہ وہ اکثر دیت سے سنا کرتا تھا۔ طیب حبیب شاہی کا رڈ کے اعتبار سے اس سے دو سال چھوٹا دیکھنے میں کئی سال بڑا اور درحقیقت ہم عمر ہی تھا۔ دیت پاشا بے کی طبیعت کی بے تکلفی پسند تھی، کیونکہ وہ خود چاہے عبدالرحمن ہو یا جہان ہو، اس کی طبیعت اور مزاج ایک سے ہی رہتے تھے۔ وہ عبدالرحمن پاشا کے روپ میں بھی اتنا ہی سنجیدہ مزاج، خاموش طبع اور قدرے تلخ تھا جتنا وہ فطری طور پہ تھا۔ دیت اس کو پسند کرتی تھی، مگر چونکہ پاشا بے کے برعکس جہان نے ہوٹل کرینڈو کو غیر قانونی سرگرمیوں کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا تھا، اس لیے دیت اس قسم کے لوگوں کی ہوٹل آمد پڑا ابھی ابھی رہتی تھی۔ خبر، اس کی ساری دیکھتی رہیں وہ جانتا تھا، اسے معلوم تھا کب کس کو کہاں سے دیا جائے۔

دیت کے پاس اس مسئلے کا سادہ ساحل تھا جو معلوم نہیں اس کے ذہن میں کیوں نہیں آیا۔ وہ کہہ رہی تھی کہ اس لڑکی، جسے ترکی سے بھیجنا ہے، کی واحد کشش اگر یہاں اس کا شوہر ہے تو اسے شوہر سے بدگمان کر دیا جائے، اس کا شوہر کسی سے بھی اپنے کسی مشتبہ عمل کا ذکر کر سکتا تھا، اور اس لڑکی کو Setup کر کے وہ گفتگو بظاہر اتفاقیتہ طور پر یہ سنوائی جائے تو وہ فوراً اپنے شوہر سے دور جانے کی کوشش کرے گی۔

دیت شاید ساری بات کسی اور نقطہ نظر سے کہہ رہی تھی۔ مگر اس کا ذہن ایک ہی بات پہ انک کر رہ گیا تھا۔ معصوم سا اتفاق۔ درست ٹائمنگ، ہاں، وہ حیا کو جانتا تھا۔ وہ ایک دم سے رد عمل دے دینے والی، ایک دم سے بڑے فیصلے لے لینے والی لڑکی تھی۔ جس چیز سے وہ بچتا رہا تھا، کہ کہیں وہ پکڑا نہ جائے، اگر وہ چیز ہو بھی جائے، اور وہ ان خود جان جائے کہ جہاں ہی عبدالرحمن ہے، تو وہ وقتی طور پر بے شک اس کا اعتبار رکھو دے گا، لیکن بعد میں جب وہ ساری حقیقت جان لے گی تو وہ بدگمانی دور ہو جائے گی۔ پندرہ جون سے چند دن قبل ہی اس کے امتحان ختم ہونے تھے، اگر وہ یہ سب اس کے امتحان ختم ہونے کے فوراً بعد پلان کرے تو وہ اپنا آخری مہینہ کسی دوسرے ملک میں گزارنا پسند کرے گی، نہ کہ ترکی میں ایک دو چہروں والے انسان کے ساتھ۔ وہ فوراً اس سے دور جانے کا سوچے گی۔ وہ ہمیشہ یہی کرتی تھی۔ جب وہ ایک دفعہ استقلال اسٹریٹ میں ریسنورنٹ میں ڈنر کے لیے گئے تھے، وہ ڈنر جو جنر بریڈ ہاؤس توڑنے کی معذرت کے طور پہ تھا، تب بھی غصے میں وہ فوراً اس کے پاس سے چلی گئی تھی۔ وہ غصے

میں ہمیشہ یہی کرتی تھی۔ وہ اب بھی یہی کرے گی۔ بھلے وہ برا بن جائے، مگر اسے اپنی بیوی کا تحفظ اپنی ذات سے زیادہ عزیز تھا۔ وہ ترکی میں اسے اکیلے چھوڑ کر کبھی نہیں جاسکتا تھا۔ جانے سے قبل اس کو یہ مسئلہ بنانا تھا۔

دیمت کو اپنے انداز میں مستنبہ کر دینے کے بعد وہ کچھ دیر سوچتا رہا کہ سیٹ اپ کس کے ساتھ ترتیب دیا جانا چاہیے۔ وہ کون ہوگا جس کو اس کے ساتھ دیکھ کر وہ اس سے دور جانے کا سوچے گی۔ طیب حبیب پاشا، وہ بہت متجسس تھی، ناصر عبدالرحمن کے گندہ بھائی کے بارے میں تو چلو اس طرح وہ اس کا تجسس دور کر دے گا۔ پاشا بے سے اسے ملنا ہی تھا، باقیوں کی طرح اس کے لیے بھی وہ انڈیا میں تھا، اور چونکہ پاشا بے اس سے ناراض بھی بہت تھا، اس لیے پہلے جہان کو اپنے اور اس کے تعلقات درست کرنے تھے۔ وہ اس سے بہت خفا سہی، مگر وہ اس کو ”نہ“ نہیں کر سکتا تھا۔ لالچی انسان کبھی اپنے عبدالرحمن پاشا جیسے بھائی کو نہ نہیں کیا کرتا۔

طیب حبیب پاشا کے لیے استنبول میں دو ہی جگہیں محفوظ تھیں جہاں وہ عبدالرحمن سے مل سکتا تھا۔ ایک برگرنگ، اور دوسرا ہوٹل گرینڈ، وہ جانتا تھا کہ طیب حبیب استنبول میں ہی ہے، اور چونکہ وہ خود بیوک ادا آچکا تھا، اس لیے اس نے مناسب انداز سے اسے پیغام لکھا۔ آیا کہ وہ طیب ہوٹل گرینڈ آئے گا، یا وہ خود برگرنگ آجائے۔

اسے معلوم تھا کہ طیب حبیب انکار نہیں کرے گا، اور اس نے انکار نہیں کیا۔ اسے عبدالرحمن کی ضرورت تھی۔ اس نے برگرنگ پہ چند روز بعد ملنے کی حامی بھری۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ ابھی استنبول سے باہر ہے، واپس آتے ہی اس سے ملے گا۔ اب نہ معلوم یہ سچ تھا یا نہیں، بہر حال اسے اب طیب حبیب کا انتظار کرنا تھا۔

کافی پی کر اس نے ایک میننگ بلای تھی۔ ابھی اس سے فارغ ہوا ہی تھا کہ قانون آنے لگا۔ پتا نہیں یہ کیسا رشتہ تھا جس کا وہ اس سے ذکر نہیں کرتا تھا مگر اس کا قانون کاٹ بھی نہ سکا۔ میننگ اس وقت برخواست ہو رہی تھی، سب اٹھ رہے تھے، کانفرنس روم میں شور مچا رہا تھا جب اس نے حیا کی کال وصول کی۔ حیا کو اس نے سچ ہی بتایا کہ وہ دوست سے ملنے آیا تھا۔ غلٹ میں بات ختم کرتے ہوئے اس نے قانون کان سے ہٹایا اور بورڈ ممبران سے اختتامی الفاظ با آواز بلند کہتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ اپنی چیزیں اٹھاتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ قانون ابھی تک آن تھا۔ اس نے جلدی سے کال کاٹی، وہ ترک میں بات کر رہا تھا، حیا نے کچھ بھی نہیں سنا ہوگا یقیناً سو اسے پریشانی نہیں ہوئی۔

واپس اپنے آفس میں آ کر بیٹھے اسے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی جب اس کے موبائل پہ ٹریس رالٹ بجنے لگا۔ وہ چونک سا گیا۔ اس کا ٹریس رالٹ علاقے کے قریب تھا۔ کیا حیا آس پاس تھی۔ وہ کیوں ادھر آ رہی تھی۔

ابھی دوست سے ملاقات میں کافی وقت تھا اور ہوٹل کا کام وہ بعد میں دیکھ لے گا، پہلے اسے اپنی بیوی کو ہینڈل کرنا تھا۔ لباس بدل کر، جیمز والا رف چلیے بنا کر، سر پر پی کیپ لیے، وہ اپنے آفس کی پرائیوٹ لفٹ سے نیچے آیا، اور آخری فلور پہ پیچھے کی طرف سے باہر نکل آیا۔ قریب سے اس نے دیکھی لی، اور اسے پھولوں کی مارکیٹ کا چکر لگانے کو کہا۔ جب اسے بلا خروہ پھولوں کے اسٹال پہ نظر آگئی، تو وہ کبھی سے اترا، اور واپس ہوٹل کے عقبی پارکنگ ایریا تک آیا۔ ایک کام کرنا وہ بھول گیا تھا، اور بھلے وہ دیکھتی رہے، یہ کام اسے کرنا تھا۔ اس نے اپنے گاڑ کو اپنے والٹ میں لگی حیا کی ایک تصویر دکھائی۔

”یہ لڑکی کبھی تمہیں اپنے آس پاس نظر آئی ہے۔“

”نہیں سرا“ گاڑ نے نفی میں سر ہلایا۔

”ٹھیک ہے، اگر یہ کبھی ہوٹل میں داخل ہونے کے لیے اس طرف آئے تو اس کو اندر مت جانے دینا، اور فوراً مجھے اطلاع کرنا۔“

”تمام، تمام!“ (اوکے، اوکے)، گاڑ نے فوراً تابعداری سے سر ہلایا۔ جہان نے والٹ جیب میں واپس ڈالا، اور پلٹ آیا۔ ابھی اسے اپنی بیوی کو رکتے ہاتھوں پکڑنا تھا جو اس کی جاسوسی کر رہی تھی۔ پھر اسے اچھا خاصا شرمندہ کر کے، تاکہ وہ دوبارہ اس کا تعاقب کرنے کی کوشش نہ کرے، وہ عیسیٰ کی پہاڑی کی طرف جاتے راستے پہ چل دیا۔ مگر چونکہ وہ پہلے اس کو کہہ چکا تھا کہ وہ دو تین سال بعد ادھر آیا ہے، اس لیے اس بات کو نبھانے کے لیے وہ کبھی کبھی ظاہر کر دیتا تھا کہ اسے راستہ یاد نہیں۔ توقع کے عین مطابق وہ اس کی طرف سے مطمئن تھی۔

”وہاں عیسیٰ کی پہاڑی کے سبزہ زار پہ بیٹھے، اس نے نوٹ کیا تھا کہ حیا نے ان تینوں متویوں کو بہن رکھا تھا، اور یہ گردن والی چین تو بہارے کی تھی، وہ اسے پہچانتا تھا۔ البتہ ایک فرق اس نے محسوس کیا تھا۔ وہ عموماً گردن سے گردو پٹ لیا کرتی تھی، البتہ آج اس نے اپنی شال شانوں کے گرد اچھے سے لپیٹ رکھی تھی۔ یا تو عائشہ کی کنبی کا اثر تھا، یا پھر وہ اسے حلیہ عثمان کے پاس لے گئی ہوں گی۔ جو بھی تھا، اسے یہ نامحسوس تبدیلی

اجہی گئی تھی۔ اگر یہ نہ ہوتی، تب بھی وہ اسے اس کی تمام خوبیوں اور خامیوں سمیت قبول کر چکا تھا۔“

جب ادھر بیٹھے حیا نے اس سے کبھی جملے کا زخم محسوس کرنے کا پوچھا تو لمحے بھر میں جیل میں بیٹے وہ تاریک دن اور اندھیری راتیں اس کے ذہن میں اُٹھ آئیں، مگر وہ بات ٹال گیا۔ اسے اپنے زخم دکھا کر ہمدردی حاصل کرنے کا شوق ہرگز نہیں تھا۔ وہ اس سے باتیں کرتے ہوئے دور الاو کے پاس بیٹھے لڑکوں کے گروپ کو دیکھ رہا تھا۔ اسی میں ایک لڑکا اس کا ”دوست“ تھا۔ ابھی ملاقات میں وقت تھا، مگر وہ وہیں سے اسے پہچان گیا تھا۔ اس لڑکے کی عمر کم تھی، شاید بچیس برس، اس کے لیے تو وہ ایک جونیئر ایجنٹ ہی تھا۔ جونیئر مگر بہادر اور ذہین۔ اس کو پاکستان جانا تھا اور جہان سے کچھ چیزیں لے کر جانا تھا۔ دو ایک کام وہ پہلے بھی ساتھ کر چکے تھے۔ اور اپنے سینئر ایجنٹ کی وہ لڑکا ”عمر“ بہت عزت کرتا تھا۔ اس کو عمر کا اصل نام معلوم نہ تھا، ورنہ وہ کبھی اپنے ملک کی باتیں کرتے تھے، اجازت ہی نہیں تھی مگر وہاں بیٹھے، حیا سے اس کی رپورٹ کا پوچھتے ہوئے بھی وہ عمر کی موجودگی سے ہی بہت اچھا محسوس کر رہا تھا۔ اپنے ملک کی تو ہوا بھی اپنی گنتی ہے، یہ تو پھر ہم پیشہ، ہم وطن تھا۔

”میں عبدالرحمن پاشا کے گمشدہ بھائی یہ رپورٹ لکھ رہی ہوں۔“ کسی اور دھیان میں اس نے حیا کی بات سنی اور اگلے ہی لمحے وہ سیدھا ہو بیٹھا۔ وہ کیا کہہ رہی تھی۔ جب فون پہ حیا نے کہا تھا کہ وہ کچھ لکھ رہی ہے تو وہ اسے یونہی خالی خوبی سی دھونس بھجھتا تھا، مگر اب جو کچھ وہ بتا رہی تھی، اس نے لمحے بھر کو جہان کا سانس ہی روک دیا۔

بات رپورٹ کی نہیں تھی، اس کی رپورٹ نہ کبھی لکھی جاتی تھی نہ کسی نے شائع کرنی تھی۔ بات یہ تھی کہ اس کو یہ ساری باتیں کون بتا رہا تھا۔ اگر عائشہ نے بتایا ہے تو پھر یہ بات خطرے کی علامت تھی کہ عبدالرحمن کے گھر سے باتیں باہر نکل رہی تھیں۔ پاشا نے اپنی زندگی شروع کرنے جا رہا تھا۔ ذاتی اختلاف ایک طرف، وہ ان کا ایجنٹ تھا اور اس کی حفاظت کو یقینی بنانا ان کا فرض۔ اب اس کے گھر سے، اس کی بیوی کی طرف سے کوئی ایسی بات باہر نکلے جو پاشا بے کوفتصان پہنچائے یہ اس کو مضطرب کر دینے کے لیے کافی تھا۔ حیا اور عائشہ پھر یہ باتیں اور لوگوں سے بھی کہتی ہوں گی، ایک طرف جہان سے تو ذرا کہیں کیا ہوگا نا۔ یہ باتیں ادالار میں نہیں پھیلنی چاہئیں۔ دنیا ویسے تو جھوٹی تھی ہی، مگر بیوک ادا تو بہت جھوٹا تھا۔ بہت مشکل سے اس نے بات کا رخ پھیرا۔ چونکہ وہ حیا سے ایسی بات کی توقع نہیں کر رہا تھا، اس لیے وہ خود بھی ذرا سا پریشان ہو گیا تھا۔ وہ اس کے ساتھ پہاڑی کے نیچے تنک آیا تھا، پھر وہ سامان لینے چلی گئی تو وہ واپس اوپر آیا، عمر سے ملا، امانت پہنچائی اور واپس بندرگاہ پہ آ گیا۔

کل وہ دوبارہ بیوک ادا آئے گا، پھر عائشہ سے سننے گا مگر آج کل اسے وہ ویڈیو لاکر میں رکھ دینی چاہیے۔ ہو سکتا ہے وہ پزل باکس کھول چکی ہو، اور اب جب کہ وہ اسٹینبل جا رہی تھی تو وہ جلد یا بدیر لاکر ڈھونڈ ہی لے گی۔

اگلے روز وہ بیوک ادا آ گیا۔ وہ ہونٹ میں تھا جب عائشہ نے اسے متوجہ کیا کہ حیا کل چلی گئی تھی سو وہ گھر آ سکتا ہے۔ عائشہ جانتی تھی کہ وہ اسی کے ساتھ گئی ہے مگر اسے اطلاع دینے کا مقصد اسے گھر ملانا تھا۔ آنے بھی گزشتہ رات آ گئی تھیں۔ وہ زیادہ دیر تک ان کو ادالار سے دور نہیں رکھ سکتا تھا، سو اچھا ہوا کہ حیا ان کے آنے سے قبل جا چکی تھی۔

عائشہ کو اس نے گھر میں داخل ہوتے ہوئے سلام بھی نہیں کیا، نہ ہی اس کے مخاطب کرنے پہ ٹھیک سے بات کی۔ عائشہ کو موتیوں والی بات معلوم ہو چکی تھی، اور اس نے یہی قیاس کیا کہ عبدالرحمن اس سے اسی تھپڑ پہ ابھی تک خفا تھا، تب ہی سوائے اس رات کے، اس نے عائشہ سے ٹھیک سے بات نہیں کی تھی۔ وہ پھر سے معذرت کرنے آئی تھی مگر، جہان کے حیا کو پاشا بے کے متعلق بتانے پہ جھڑکنے پہ وہ خفا ہو کر واپس چلی گئی۔ وہ اسٹڈی سے مطلوبہ اشیاء لے کر پلٹنے ہی لگا تھا کہ اس کی نظر میز پر رکھے پزل باکس پہ پڑی۔ وہ ایک دم ٹھہر گیا، پھر باکس اٹھا کر دیکھا۔ جلی ہوئی اطراف، ابھری ہوئی سطور، پیچھے چوکھٹے، الٹ پلٹ کر دیکھنے سے، ہی وہ جان گیا تھا کہ یہ وہی پزل باکس ہے۔

جب اس نے عائشہ سے باکس منگوایا تھا تو اس کی شکل یہ نہ تھی، اور اس کا کوڈ عائشہ پہ سیٹ تھا۔ چونکہ وہ انگریزی حروف تہجی پہ بنایا گیا تھا، اس لیے عائشہ کے نام کے سچے انگریزی کے حساب سے تھے، ورنہ مرک میں اس کا نام Aysegul لکھا جاتا تھا۔ (اس میں انگریزی حرف ”S“ کے نیچے تھمی سی لکیر ہوتی تھی۔ ترک اگر عام ”S“ لکھتے تو اسے سین کی آواز سے پڑھتے، لیکن اگر ایس تلی لکیر ہوتی تو اسے شین کی طرح پڑھا جاتا۔)

بعد میں جہان نے اس کو کھول لینے کے بعد اس کا کوڈ ناقص سیٹ کر دیا تھا۔ وہیں اسٹڈی میں کھڑے کھڑے اس نے کوڈ برکو اوپر نیچے کیا، ناقص پہ باکس کھل گیا۔ اندر اس کے لاکر کی سلپ، چابی اور کاغذ ویسے ہی پڑے تھے، اس نے پھر سے باکس بند کیا، سلائیڈز آگے پیچھے کیں اور وہیں کھڑے کھڑے سوچنا چاہا کہ اس لاپرواہی کی وہ اپنی بیوی کو کیا سزا دے۔ حد ہوگئی، جو چیز اس نے بہت احتیاط سے اس تک پہنچائی تھی، اس کو

یوں ادھر بھول کر چلی گئی تھی۔ غصہ اسے آیا مگر وہ رہ گیا۔

اب وہ کیا کرے۔ یہ باکس یہیں پڑے رہنے دے۔ مگر ایسی صورت میں ملازمہ یا عائشہ کے ہاتھ لگ سکتا تھا، اور عائشہ سے وہ ویسے ہی ذرا محتاط رہتا تھا۔ پھر کیا کرے۔ عائشہ کو باکس دے دے کہ اسے بحفاظت حیات تک پہنچا دے۔ جو بھی تھا، عائشہ امانت دار لڑکی تھی، امانت کو کھول کر نہیں دیکھے گی۔

”مگر نہیں،“ ہاشم نے باکس بنواتے وقت یہی کہا تھا کہ عبدالرحمن کو اس بات کی خبر نہیں ہونی چاہیے۔

پھر عبدالرحمن، جو کہ اس چیز میں ملوث ہی نہیں تھا، وہ باکس واپس حیات تک کیوں پہنچائے گا۔ اس کی کورا اسٹوری میں بھول آ رہا تھا۔ کچھ دیر وہ وہیں کھڑا سوچتا رہا، پھر ایک دم سے اسے خیال آیا۔

بہارے گل۔ وہ ہر کسی سے راز رکھ سکتی تھی سوائے اپنی بہن کے۔ وہ اپنا سارا کھانا پینا اپنی بڑی بہن کو ضرور بتاتی تھی۔ اس نے ذہن

میں ایک لائحہ عمل ترتیب دیا، اور باکس پکڑے باہر آیا۔

”یہ تو حیا کا ہے۔“ اس کے استفسار پہ بہارے نے حیرت سے باکس کو دیکھتے ہوئے بتایا۔ ”وہ یہیں بھول گئی؟ کل اس کا کزن آیا تو اسے جلدی میں جانا پڑا، تمہیں پتا ہے اس کا کزن بہت ہنڈم ہے“ اس نے بڑے اشتیاق سے بتایا۔

بہارے نے حیا کے کزن کو کہاں دیکھا۔ اسے لہجہ بھرا ہوا مگر جان بوجھ کر اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے اس نے بہارے سے سوالات پوچھنے شروع کیے۔ باکس کس نے حیا کو دیا، کس نے بنایا وغیرہ۔ وہ جانتا چاہتا تھا کہ کیا پکڑا جاسکتا تھا یا نہیں۔ مگر لگتا تھا حیا کو صرف باکس کھولنے میں دلچسپی تھی، اس نے بھیجنے والے کی زیادہ تحقیق نہیں کی تھی۔

اس نے بہارے سے کہہ دیا کہ وہ باکس اب اس کے پاس رہے گا، اور وہ جانتا تھا بہارے بہت دیر تک یہ راز نہیں رکھ سکے گی۔ وہ عائشہ کو ضرور بتائے گی۔ آنے کہتی تھیں، یہ دونوں آنے گل کی بیٹیاں ہیں، ان کی ماں نے ان کو کچھ کھلایا نہیں جب تک کہ اس پہ اللہ کا نام نہ پڑھ لیا ہو، اس لیے یہ نہ کبھی خیانت کر سکتی ہیں، نہ کسی کو دھوکہ دے سکتی ہیں۔ بہارے کو لاکھ اپنی بہن کے درس سے چڑ ہو، وہ آخر میں بھی عائشہ کی بہن۔ وہ حیا کی امانت، مہمان کی امانت اس تک ضرور واپس پہنچائے گی۔ ساتھ میں یہ بھی بتائے گی کہ عبدالرحمن اس باکس کو اس سے دور کرنا چاہتا تھا، شاید یہی سن کر حیا اگلی دفعہ اس کو کہیں رکھ کر بھولے گی نہیں۔

جب وہ واپس پلٹا تو اس کو معلوم تھا، بہارے اس کے پیچھے دبے قدموں ضرور آئے گی۔ اس کو میز تلے بورڈوں کے چابی کے سوراخ اور دیواروں کے پیچھے سے ہاتھیں سننے کا بہت شوق تھا۔ اس لیے جب وہ اپنے کمرے میں گیا تو اس نے دروازہ ذرا سا کھلا رہنے دیا، اور بہارے کے سامنے لمبا لاک کر کے چابی دروازے میں ڈال دی۔

اب وہ پہلی فرصت میں جا کر اپنی بہن کو یہ بات بتائے گی، اور عائشہ فوراً سے پیشتر حیات تک اس کا باکس واپس پہنچا دے گی۔ اور کم از کم اس سے وہ اتنا تو جان لے گا کہ بہارے گل راز رکھ سکتی ہے یا نہیں۔ اپنی بہن سے تو شاید بالکل نہیں۔

اسی رات اپنے کمرے میں اس نے وہ ویڈیو ریکارڈ کی، اور اس میں وہ سب کہہ دیا جو وہ کہنا چاہتا تھا۔ اگر کچھ نہیں بتایا تو اب کے ہاتھوں مارے جانے والے جاسوس کا قصہ کہ وہ ابا کا راز تھا، اور فریخ کی جاسوسی کا قصہ کہ وہ فریخ کا راز تھا، اور اپنے سرور کا قصہ، کہ وہ اس کا اپنا راز تھا اور راز نبھانے اسے بہت اچھے سے آتے تھے۔

اس رات وہ سوئیں سکا۔ صبح جب وہ واپس استنبول آیا تو سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ جواہر جا کر اس نے اپنے لاکر میں یو ایس بی فلیش رکھی، اور پھر واپس ریٹورنٹ آ گیا۔ پوری رات کی بیداری کے بعد اب وہ پچھلے کمرے میں ایک صوفے پہ بیٹھا اور سرموئی کی پشت سے لگایا تھا کہ آنکھیں بند ہونے لگیں۔ ابھی اسے نیند میں گئے چند منٹ ہی گزرے تھے کہ موبائل بجنے لگا۔ بدقت اس نے آنکھیں کھولیں، سیدھا ہوا اور جیب سے فون نکال کر دیکھا۔ کچھ منٹ کال کر رہی تھی۔ ایک تو یہ کچھ منٹ اسٹوڈنٹ ٹھیک سے چین بھی نہیں لینے دیتی۔ ایک لمحے کے لیے جہان نے سوچا کہ نظر انداز کر دے، پھر پتا نہیں کیوں وہ نہیں کر سکا، اور کال اٹھالی۔

”آپ کا مطلوبہ نمبر اس وقت سو رہا ہے، براہ مہربانی کافی دیر بعد رابطہ کریں۔“ شکر یہ! وہ بولا تو اس کی آواز خمار آلود تھی۔

”جہان! اٹھو اور میری بات سنو۔“ وہ بہت جھلا کر کہہ رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ جہان ابھی اسی وقت نام میں مرمر اوبھل پہنچے، سلیمان

ماموں کے کوئی دوست آئے ہوئے تھے۔ وہ سخت کبیدہ خاطر ہوا۔

”میں نہیں آ رہا، مجھے آرام کرنے دو۔“ جواب میں وہ بے حد تنہا ہوئی اور اپنا پسندیدہ ”جہنم میں جاؤ“ بول کر فون رکھ دیا۔ جہان نے پھر سے مصروفی کے پشت سے ٹکا کر آنکھیں موند لیں، مگر اب نیند کا آنا ناممکن تھا۔ کچھ دیر بعد حیا کا پھر سبج آیا۔ وہ اسے بلیو موشن بلار ہی تھی۔ اس کو جوابی ٹیکسٹ کر کے چیئر پر ہوئے وہ اٹھا شرٹ بدلی، چہرے پہ چھینے دارے، اور چابی اٹھا کر ریسٹورنٹ سے باہر آ گیا۔ حیا نے سبج پہ بلیو موشن کا کہا تھا، اور نیلی مسجد کے باہر کے سبزہ زار پہ نصب پنچوں پہ ہی وہ اسے دور سے نظر آ گئی۔ ایک لمحے کے لیے تو وہ اسے واقعی پہچان نہیں پایا تھا۔

حیا نے سر پہ دوپٹا لے رکھا تھا۔ گہرے سبز رنگ کا۔ رپٹا جس کو وہ مستقل چہرے کے گرد ٹھیک کر رہی تھی۔ چونکہ اسے دوپٹا لینے کی عادت نہیں تھی، اس لیے وہ بار بار سر سے بھسل جاتا تھا۔

نیلی مسجد کے باہر کبوتر پھر پھر اڑتے ہوئے اڑ رہے تھے۔ کتنی ہی دیر تو وہ اس منظر کو ٹھہر کر دیکھ گیا۔ ایک دم سے اسے کچھ یاد آیا تھا۔ جب وہ انڈیا میں تھا، اور اس بک اسٹال کے ساتھ وہ لڑکی لٹی تھی، جسے ظاہر ہے کہ اس کے اپنوں نے ہی بھیجا تھا، اور وہ اسے اس آئی سر کا نام دکھا رہی تھی۔ جو اس کی مدد کرے گا، اور بعد میں اس کی مدد سے وہ جیل سے فرار ہوا تھا، اس لڑکی کے سر پہ بھی ایسے ہی سفید دوپٹا تھا۔ خوب صورت، بہت خوب صورت جیسی غلی کر امت کی می تھیں، جیسی آنے گل کی بیٹیاں تھیں، اور اب جیسی اس کی بیوی تھی۔ یہی تو چاہا تھا اس نے، کہ اس کی بیوی ایسی ہو۔ بھلے وہ چہرہ بڑھکے، مگر باقی ہر طرح سے خود کو ڈھکے اور آج اس کی ساری خواہشیں پوری ہو گئی تھیں۔ اس کو بھی ایک مرمر جیل مل گئی تھی۔

اور تب ہی اس کی نگاہ حیا کے مقابل بیٹھے نو جوان پہ پڑی۔ اوہ ریسٹورنٹ سے وہ فرانگ پان کیوں نہیں لایا۔ آخر یہ شخص یہاں کیا کر رہا تھا۔ ایک لمحے کو اسے شدید غصہ چڑھا، مگر جب اس نے دوبارہ حیا کو دیکھا تو جیسے بہت سے مناظر اس ایک منظر کی روشنی میں غائب ہو گئے۔ دوا کی مہندی کی ویڈیو، حیا کا اس آدی کی کار میں بیٹھنا، بارش میں سرخ کوٹ میں ناقص پہ چلتی لڑکی۔

سارے منظر غائب ہوتے گئے، ایسے جیسے وہ کبھی تھے ہی نہیں۔ پیچھے صرف ایک منظر بچا۔ بار بار چہرے کے گرد دوپٹا ٹھیک کرتی، خفا اور اس کی بیٹی لڑکی جو ذرا غصے سے سامنے بیٹھے شخص کو کچھ کہہ رہی تھی۔

جب وہ ان کے قریب آیا تو وہ چونکی، اور ایک دم اس کا چہرہ جیسے کھل اٹھا۔ وہ حیران تھی، اور خوش بھی۔ وہ اتنی بے اختیار ہو کر ابھی کہ موبائل جو شاید اس کی گود میں تھا، زور سے نیچے جا گرا۔

”جہان! یہ ابا کے دوست کے بیٹے.....“ وہ تعارف کرانے لگے، اب وہ کیا بتاتا کہ وہ اس آدی کو پہلے سے جانتا ہے، مگر ولید کو وہ ضرور کچھ بتانا چاہتا تھا۔ سلیمان ماموں اور حیا سے بہت ہی اپنائیت سے بات کرنے کے بعد اس نے لغاری صاحب کی سوالیہ نگاہوں کے جواب میں مسکراتے ہوئے ہی اپنائیت سے سارے رشتوں کی وضاحت ایک فقرے میں کر دی۔

”میں جہان سکندر ہوں، سلیمان ماموں کا بھانجا اور دادا، حیا کا ہر بیٹنڈ۔“ اور اس ایک فقرے نے اس کے اپنوں کو جو حیرت بھری خوشی عطا کی، اس سے سلیمان ماموں کا دادا اور بھانجا اور حیا کا ہر بیٹنڈ بالآخر یہ بات جان گیا کہ وہ سب یہ رشتہ چاہتے تھے۔ ساری ناراضیاں دور ہوئیں سارے گلے ختم ہوئے۔ اس نے اپنی بیوی کو اس شخص کے سامنے مان دیا جس کے اور اس کی بیوی کے درمیان کبھی کچھ نہیں رہا تھا، وہی نہیں سکتا تھا۔

شام کو جب ماموں اور می لاؤنچ میں تھے، وہ کچن میں حیا کی مدد کر رہا تھا۔ تب اس نے حیا کا پلان جاننے کی کوشش کی۔ وہ اسے ترکی سے بھیجنا چاہتا تھا، مگر حیا نے ابھی کچھ طے نہیں کیا تھا کہ اسے ترکی میں رہنا ہے یا کسی دوسرے ملک۔ جہان نے لندن جانے کی بابت پوچھا۔ نیلی مسجد میں اس کے اعتراف کے بعد وہ ایم کی تنک ذرا ششدر تھی، سو فوری فیصلہ نہیں کر سکی۔ می اور ابا کو وہ لندن میں سیٹل کر رہا تھا، اگر حیا لندن جانے پہ راضی ہو گئی تو وہ اسے ان کے ساتھ لندن بھیج دے گا، لیکن اگر وہ نہیں راضی ہوتی تو وہ دوسرا طریقہ استعمال کرے گا۔

شام میں ان کی گفتگو ہوئی۔ می کو جیسے پتا چلا کہ اس نے سب کے سامنے یہ اعتراف کیا ہے، وہ بہت خوشی سے دو آنکھیاں نکال لائیں جو انہوں نے اس موقع کے لیے عرصے سے سنبھال کر رکھی تھیں۔

وہ واقعی اس روز مطمئن تھا۔ جب رات میں وہ ماموں کو چھوڑ کر گھر واپس آیا تو اس کا ارادہ اپنی بیوی کے ساتھ اچھی سی کافی پیئے اور کوئی اچھی سی مووی دیکھنے کا تھا۔ نیلی والا احساس بہت عرصے بعد دل میں جا گا تھا، وہ اس احساس کو جینا چاہتا تھا۔

”تمہارے لیے فون آیا تھا کوئی لڑکی تھی، نام تو نہیں بتایا مگر کہہ رہی تھی کہ تمہارا پارسل اسے نہیں ملا، کسی غلط ایڈریس پہ چلا گیا ہے۔“

”اور کسی نے واقعاً اس کا سانس روک دیا۔ اس کا گھر ایک سیف ہاؤس کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ وہ جانتا تھا وہاں شام سے ایک ”کانٹیکٹ“ کی کال ہی آسکتی تھی، اور اس کو پارسل نہ ملنے کا مطلب بہت واضح تھا۔ جو کچھ اس نے یہاں سے بھیجا تھا، واپس نہیں پہنچا تھا، بلکہ کسی غلط ایڈریس پہ چلا گیا تھا۔ اس نے ایک سیکنڈ کے جزاویں حصے میں پیغام کوڈی کوڈ کیا۔ اس کا بھیجا ہوا لڑکا، واپس نہیں پہنچا تھا۔ بلکہ گرفتار ہو گیا تو یقیناً بہت امیر جنسی پچوائش تھی، اس لیے پیغام اس کے گھر چھوڑ دیا گیا تھا۔ عین ممکن تھا کہ پیغام جس نے بھیجا ہوا، وہ بھی جلدی جلدی اپنی جگہ سے بیک اپ کر کے نکل رہی ہو۔ خدایا یہ کیا ہو گیا تھا۔

اس کا لڑکا پکڑا گیا تھا۔ جیل تشدد، اذیت اس کے ہر طرف وہی تنگ تاریک سیل چھانے لگا۔ ایسے میں کافی، مودوی، سب فضول تھا۔

پوری رات وہ اسی صوفے پہ بیٹھا بینڈ لڑکی کال کا انتظار کرتا رہا مگر کال نہیں آئی۔ دو راتوں کی بے خوابی کے باعث صبح تک اس کی آنکھیں سرخ پڑنے لگی تھیں، مگر وہ وہیں بیٹھا رہا۔ ہر کوئی جیل سے فراخ نہیں ہوا پاتا۔ لوگ برسوں جیل میں سزا اور تشدد کاٹ کر وہیں خاموشی سے جان دے دیتے ہیں۔ ایک اور اسپائی ضائع ہو گیا۔ ایک اثنا ضائع ہو گیا۔ اس کی اذیت کی کوئی حد نہیں تھی۔

اس سارے میں حیا کا خیال اس کے ذہن سے بالکل نکل گیا۔ صبح ہوتے ہی وہ واپس چلی گئی۔ جہان نے روکا بھی نہیں۔ اس کے پاس کرنے کو بہت سے دوسرے کام تھے۔

اگلے روز وہ یوک ادا چلا گیا۔ حیا، پزل باکس، جواہر کالا کر، اس نے سب کچھ ذہن سے جھٹک کر خود کو ہٹل گرینڈ میں مصروف کر لیا۔ ریسٹورنٹ میں اس نے بتا دیا تھا کہ اگر اس کی دوست (حیا) شام میں آئے تو کہنا، جہان جلدی اٹھ کر چلا گیا ہے، اگر صبح میں آئے تو کہنا، وہ آیا ہی نہیں۔ چند روز وہ واقعی نہیں آئی۔ عمر کی گرفتاری کی بھی تصدیق ہو گئی۔ پھر انہی دنوں وہ بالاخر خود کو رخصتی کر کے انقرہ لے آیا۔ یہاں اسے اپنا چیک اپ کرانا تھا، ہر کا بدترین درد جو سر سے ہوتا ہوا گردن تک جاتا، اسے اب اس کا علاج چاہیے تھا۔ جیل سے رہا ہونے کے بعد اس نے گردن کے ایک طرف کا ایم۔ آر آئی کروا دیا تھا مگر برین ایم آر آئی اس نے نہیں کروا دیا تھا۔ اپنا درد اس نے ہر جگہ چھپایا تھا، تب اتنی تکلیف ہوتی بھی نہیں تھی۔ یہ وقت کے ساتھ ساتھ بڑھی تھی۔ پانچ سال جہان نے اس اذیت کے ساتھ گزارے تھے، اب بالاخر وہ اس کا سامنا کرنا چاہتا تھا۔

ایم آر آئی سے قبل، سہ ماہہ ایکس رے سے، ہی سارا معاملہ صاف ہو گیا۔ اس کو ایکسرے دکھانے سے قبل ڈاکٹر نے پوچھا تھا۔

”کیا کبھی تمہیں سر پہ کوئی چوٹ آئی تھی؟ کوئی ایکسیڈنٹ جس میں سر کی چیز سے ٹکرایا ہو۔“

”ہاں! میری لڑائی ہوئی تھی کچھ لوگوں سے، انہوں نے مجھے سر پہ ایک تلے کی طرح کی چیز سے مارا تھا جس سے سر سے خون بھی نکلا تھا۔ مگر خون اتنا زیادہ نہیں تھا۔ آنکھ کے قریب زخم سا ہوا تھا جس سے تھوڑا سا خون نکل کر نپٹی ہی تک گرا تھا۔“

”مجھے افسوس ہے، لیکن.....“ ساتھ ہی ڈاکٹر نے اس کا ایکسرے اس کے سامنے رکھا۔ ”شاید جس چیز سے انہوں نے تمہیں مارا تھا، اس پہ چھوٹی سی کیل لگی ہوئی تھی۔ ایک اعشاریہ ایک انچ کی کیل جو تمہاری آنکھ کے قریب تھس گئی تھی۔“

اس نے بے اختیار آنکھ کے قریب چہرے پہ ہاتھ رکھا وہ ایک object Foreign کے ساتھ پچھلے پانچ برس سے رہ رہا تھا اور اسے کبھی بتا نہیں چل سکا۔

”اب کیا ہوگا۔“ اسے سمجھ نہیں آیا کہ وہ ماضی کا افسوس کرے یا مستقبل کے لیے پریشان ہو۔ اسے واقعی کچھ نہیں سمجھ میں آ رہا تھا۔

”ہمیں سرجری کے ذریعے یہ فارن آجیکٹ ریموڈ کرنا پڑے گا، مگر۔“ ڈاکٹر متذبذب سارک گیا۔

”آپ بتا دیں جو بھی بتانا چاہتے ہیں۔ میں تیار ہوں۔“ بمشکل اس نے خود کو کمپوز کر لیا تھا۔

”دیکھو! میڈیکل ہسٹری میں بہت سے ایسے کیسز آئے ہیں جس میں لوگ برسوں فارن آجیکٹ کے ساتھ رہتے ہیں اور انہیں علم بھی نہیں ہوتا۔ وہ آدمی جس کے گلے کے قریب چاقو کا پھل، اور میرا مطلب ہے واقعی چاقو کا پھل گھس گیا تھا، چار برس تک اس کو علم ہی نہیں ہوسکا کہ اس کے گلے میں کچھ ہے اور جرمی کی ایک عورت تیس بیٹیتیس برس تک اپنے برین میں آٹھ سینٹی میٹر میٹل مینسل لیے رہی۔ سرجری سے ایسی بہت سی چیزیں نکالی جاتی رہی ہیں، مگر، وہ پھر رکا۔“ یہ ننھی سی کیل تمہاری optic nerve کے بالکل ساتھ پھنسی ہے۔ چند ملی میٹر بھی آگے پیچھے ہوتی تو تم اندھے ہو جاتے۔ اب اس سرجری کا کم از کم میں رسک نہیں لوں گا، اس کی کامیابی کا چانس کم اور

تمہارے اندھے ہونے کا چانس زیادہ ہے۔

”وہ خاموشی سے عادتاً فخریال دانت سے دبائے سن گیا۔ کبھی وہ سوچتا تھا، وہ بہت خوش قسمت ہے کہ وہ بغیر کسی مستقل الجھنی کے جیل سے باہر آ گیا اور فوج کے لیے ناکارہ نہیں ہوا۔ مگر وہ غلط تھا۔ جیل افسران نے اسے پہلے دن کہا تھا کہ کوئی ان کی جیل سے مردہ یا پالاج ہوئے بغیر نہیں جاتا۔ وہ ٹھیک کہتے تھے۔ وہ بالکل ٹھیک کہتے تھے۔“

”پھر میں کیا کروں۔“ بہت دیر بعد اس نے پوچھا تو ڈاکٹر نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”تم دوسری رائے کے لیے کسی اور کے پاس جاسکتی ہو۔ باہر چلے جاؤ۔ جرمنی بہتر رہے گا۔ یقیناً کوئی مجھ سے اچھا سرجن یہ رسک

لینے پہ تیار ہو جائے گا۔“

وہ رات بہت تکلیف دہ تھی۔ ایک طرف یہ سر درد اور اب کسیر پھوٹا اور دوسری طرف اندھے ہونے کا خدشہ وہ کس کا انتخاب کرے۔ کیا اس کیل کو سر میں پڑے رہنے دے۔ یا پھر نکلوانے کا خطرہ مول لے لے۔ اور اگر وہ اندھا ہو گیا یا پالاج تو کیا ہوگا۔ کیریئر ختم، ملک کی خدمت ختم، حکومت کا لاکھوں روپیہ خرچ کر کے اس کو تربیت دلانا ختم، زندگی ختم۔

صبح وہ سیدھا ریٹائرمنٹ آ گیا۔ آج پہلی دفعہ اس کا دل کسی کام کے لیے نہیں چاہ رہا تھا۔ زندگی پہلے بھی بے یقین تھی مگر اب تو مزید بے یقین ہو گئی تھی۔ کیریئر کا ختم ہونا اس کے لیے زندگی کے ختم ہونے کے برابر تھا۔ مگر پھر بھی وہ یہ رسک لے گا۔ خطرہ لیے بغیر بھی کوئی زندگی ہوتی ہے بھلا۔

”جہاں بھائی، وہ آپ کی دوست آئی تھی رات کو۔“ کاؤنٹر پہ جزدقی بیٹھنے والے لڑکے نے بتایا تو وہ چونکا۔

”جیا۔“ کیا کہہ رہی تھی۔

”اپنی دوست کے ساتھ آئی تھی، آپ کا پوچھا پھر چل گئی۔ کافی دیر بعد دونوں دوبارہ آئیں، ان کے شاہ کوئی پیچھے لگا ہوا تھا، انہوں

نے بیک ڈور کا رستہ مانگا۔ پھر وہ وہیں بینٹری میں بیٹھی رہیں۔ سوا ایک بجے وہ پیچھے سے نکل گئیں۔“

”اور کچھ۔“

”اور پاشا بے بھی آئے تھے۔“ اب کدہ بری طرح چونکا۔

”کیا کہہ رہا تھا وہ۔“

”آپ کا انتظار کرتے رہے۔ میں دروازے کے پاس گئی یہ بیٹھے رہے۔ اچھے موڈ میں نہیں تھے۔ آپ سے ملنا چاہتے تھے۔“

”کیا وہ دونوں لڑکیاں اس کی موجودگی میں آئی تھیں۔“ بہت دن اپنے مسکوں میں الجھنے کے بعد آج اسے حیا کی پھر سے فکر ہوئی تھی۔

”جی۔۔۔۔۔ وہ دونوں دروازے کے پاس کھڑی باتیں کر رہی تھیں۔ وہ ساتھ ہی بیٹھے تھے، انہوں نے چہرے کے آگے اخبار کر رکھا

تھا۔ مجھے نہیں لگتا کہ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا ہوگا۔ پھر جب وہ دوسری دفعہ آئیں تب تک وہ جا چکے تھے۔

”اچھا۔“ وہ مطمئن ہو کر اندر چلا گیا۔ پاشا بے نے حیا کو دیکھ لیا، وہ تب بھی وہ ہرگز نہیں جان سکتا تھا کہ وہ جہاں کی بیوی ہے۔ اسے

جاننا بھی نہیں چاہیے تھا۔ کمزوریوں کو کیسے پکڑا جاتا ہے، جہاں سے بہتر کون جانتا تھا، اس لیے کوئی اس کی اپنی کمزوری پکڑے، یہ وہ نہیں چاہتا تھا۔

بس اب وہ جلد از جلد حیا کو یہاں سے بھیج دے گا۔ استنبول غیر محفوظ تھا، کم از کم اس کی فیملی کے لیے۔

مگر اسے واپس بھیجنے سے قبل ضروری تھا کہ وہ اپنا پزل باکس کھول لے اور لا کر بھی۔ وہاں موجود گاڑ کو اس نے ہدایات دے دی

تھیں۔ جب بھی کوئی نمبر کالا کر کھولنے آئے گا، گاڑ اس کے ایک نمبر پہ میج کر دے گا۔ چند میسے لے کر گاڑ اس کام کے لیے راضی تھا۔ اور ابھی

تک لا کر کھولنے کوئی نہیں آیا تھا۔

جب وہ دوبارہ بیوک ادا گیا تو اس نے اپنی الماری چیک کی۔ پزل باکس وہاں نہیں تھا۔ وہ عائشے نے رکھ لیا حیا تک واپس پہنچ گیا۔

یہی پوچھنے کے لیے اس نے بہار کے کو بلا یا۔

وہ سر جھکائے اوپر آئی اور صاف صاف بتا دیا کہ پزل باکس اس نے حیا کو دے دیا ہے۔ چند لمبے دیکھ کہہ نہیں سکا۔ اس کا اندازہ

ٹھیک تھا۔ بہار نے گل عائشے سے راز نہیں رکھ سکتی تھی۔ یقیناً اس نے سب سے پہلے عائشے کو بتایا ہوگا۔

اس نے بہار سے یہ غصہ نہیں کیا۔ غصے والی بات ہی نہیں تھی۔ وہ اس کے سامنے ایک بچے کے بل بیٹھا اور اس سے اپنے راز کے

بارے میں پوچھنے لگا۔

”پھر تو مجھے تمہارے دوسرے وعدے کا بھی اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔“

اور اب تو اسے اس وعدے کی پہلے سے بھی زیادہ ضرورت تھی۔ وہ اس پاک اسپائی کو جنازہ نہیں دے سکتا تھا جس کو اس نے ابا کے ساتھ دفنایا تھا، مگر شاید بہارے اس کو جنازہ دے سکے۔ یہ الگ بات تھی کہ کور blow ہونے پہ سب لوگ آپ کو پہچاننے سے بھی انکار کر دیتے ہیں۔ مگر بہارے مصرتھی کہ ایسا نہیں ہوگا۔

”پورا دالار، بلکہ پورا ترکی تمہیں چھوڑ دے، مگر بہارے گل تمہیں کبھی نہیں چھوڑے گی۔“

”مگر بہارے گل کے چہرے پہ شدید غصہ ابھر آیا جب جہان نے اس کی ”نئی دوست“ کا ذکر کیا۔ وہ حیا کو بہت پسند کرتی تھی، مگر عبدالرحمن اس میں دلچسپی رکھتا ہے، یہ بات اس کو پسند نہیں تھی۔“

”وہ اپنے کزن کو پسند کرتی ہے اور اس کا کزن بہت ہنڈم ہے۔“ اس نے اپنے طور پہ عبدالرحمن کو دوبارہ سے مقابلے کا احساس دلایا۔ بہارے نے حیا کا کزن کہاں دیکھا، یہ وہ عائشے سے بعد میں پوچھے گا مگر پہلے اس نے عبدالرحمن کے متعلق حیا کی رائے جانی چاہی تو وہ فوراً بولی۔

”یہ سچ ہے، اسے تم بالکل پسند نہیں ہو۔“

تب وہ بہارے کے سامنے سے اٹھ گیا۔ وہ زیادہ دیر کے گا تو بہارے سمجھے گی، عبدالرحمن نے اسے معاف کر دیا، جبکہ وہ عائشے کی طرح اسے بھی یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ وہ خفگی اتنی جلدی بھلانے والوں میں سے نہیں ہے۔

تب بہارے نے اسے پہیلی لکھنے والے کی بات پوچھا۔ وہ ذرا چونکا، پھر لاعلمی ظاہر کی، مگر اس کی اگلی بات نے جہان کو واقعتاً چونکا دیا۔ اس نے کیوں نظر انداز کر دیا کہ جو باکس اس نے بہارے کو دیا تھا اور وہ جو حیا کو دیا تھا، دونوں کی پہیلیوں کی لکھائی کا انداز ایک سا تھا۔ جبکہ ایک میجر احمد نے دی تھی اور دوسری عبدالرحمن نے۔ دونوں کو ایک سا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ حیا نے محسوس کر لیا تو عائشے نے بھی کر لیا ہوگا۔ عبدالرحمن کا اصل تعارف میجر احمد عائشے کو نہیں پتا چلنا چاہیے۔

شام میں وہ عائشے کے پاس بالخصوص اسی مقصد کے لیے آیا مگر حیا نے اس کے سامنے کسی میجر کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔ وہ مطمئن ہو گیا۔

پھر خیال آنے پہ پوچھا

”بہارے کہہ رہی تھی۔ حیا کا کزن کافی ہنڈم ہے۔ تم تو اس دفعہ اسے ساتھ نہیں لائی تھی جب میں حیا سے ملنے آیا تھا۔ پھر بہارے کو کیسے پتا چلا۔“ عائشے کا چہرہ خفت سے گلابی پڑ گیا۔

”نہیں، وہ دراصل حیا نے اسے کہا تھا کہ اس کی اپنے کزن سے شادی ہو چکی ہے تو بہارے مجھ سے بار بار پوچھتی تھی کہ اس کا کزن کیسا ہے۔ میں نے کہہ دیا کہ بہت اچھا ہے جو بچ تھا وہی کہا۔“ وہ ذرا گڑبڑا کر سر جھکے لکڑی کو چمیدنے لگی۔

”تھینک یو عائشے! تم نے ہمیشہ میرا ساتھ دیا۔ میں کبھی تم سے کوئی اور فیور مانگوں تو کیا تم دو گی۔“ بنا کسی تاثر کے اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔ عائشے نے سر اٹھا کر اسے دیکھا، چند لمحے دیکھتی رہی، پھر گردن اثبات میں ہلا دی۔

”تم مجھ پہ بھروسہ نہیں کرتے مگر تمہیں کرنا چاہیے۔“ پھر جیسے وہ کچھ اور کہتے کہتے رک گئی، اور سر جھٹک کر دوبارہ سے کام کرنے لگی۔ وہ یقیناً موتیوں کے بارے میں پوچھنا چاہتی تھی۔ مگر کیا فائدہ۔

پھر ایک روز اس نے حیا کو میجر احمد کی طرف سے فون بھی کر لیا۔ اس کی باتوں سے اسے نہیں لگا کہ وہ باکس کے عبدالرحمن کی طرف سے ہونے کے بارے میں جان چکی ہے۔ اس روز وہ ذرا جھنجھلائی ہوئی تھی۔ شاید وہ تنگ آ گئی تھی، چلو خیر، جلد یا بدیر یہ کھیل ختم ہونے والا تھا۔

چند روز اسی روٹین میں گزر گئے۔ صبح ہوئی گرینڈ، اور دوپہر کی فیری لے کر اسنبول آ جانا۔ طیب حبیب واپس اسنبول آ چکا تھا اور اس نے بار بار کی مداخلت شروع کر دی تھی۔ جو وعدے کیے تھے پورے کرو۔ وہ جواب میں اسے ٹال نہیں رہا تھا، مگر صرف تھوڑا سا وقت مزید مانگ رہا تھا۔ اپنی جگہ طیب حبیب بھی ٹھیک تھا۔ اس کی زندگی اسنبول میں تنگ ہو چکی تھی۔ اس کے دشمن، عبدالرحمن کے دشمنوں سے زیادہ تھے۔ مگر وہ کیا کرتا کہ ہر چیز اس کے ہاتھ میں نہ تھی۔ سارے احکامات پیچھے سے آتے تھے، سو وہ طیب حبیب کو جھڑک کر خاموش کروا دینے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ طیب بکتا بکتا مگر پھر خاموش بھی ہو جاتا۔ وہ عبدالرحمن کو انکار نہیں کیا کرتا تھا۔ اپنے غصے کا اظہار کر دینے کے بعد پسپائی بھی اختیار کر لیا کرتا۔ اس کو معلوم تھا کہ اس کی بقا عبدالرحمن کے ساتھ میں ہے۔ اس کی دشمنی میں نہیں۔

چند روز بعد اسے احساس ہوا کہ حیا کو اپنے فون میں اس کے ٹریسر کے بارے میں علم ہو گیا تھا، کیونکہ اس روز جب وہ اچانک سے

برگرنگ آئی تو وہ ذرا حیران ہوا۔ وہ چاہتی تھی کہ آج وہ دونوں مل کر استقلال اسٹریٹ کو چلنے چلنے ختم کر لیں۔ وہ کام چھوڑ کر باہر آیا اور ساتھ میں اپنا فون بھی چیک کیا۔ اس کا ریسیور اسے بتا رہا تھا کہ ٹریس سب انسٹی میں ہی ہے، جبکہ حیا کا فون اس کے ہاتھ میں ہی تھا۔ اچھا تو اس نے ٹریس فون سے نکال لیا تھا۔ شاید ایسی لیے اس نے صبح میجر احمد کے نمبر پر ٹیکسٹ کیا تھا کہ وہ کوئی خاص بات کرنا چاہتی ہے۔ جہاں نے سوچا تھا، فارغ ہو کر اسے کال کرے گا مگر فراغت سے قبل ہی وہ خود آگئی تھی۔

وہ دونوں ہلکی پھلکی باتیں کرتے استقلال اسٹریٹ میں آگے بڑھنے لگے۔ جہاں کو یاد تھا، جب حیا کا جنجر بریڈ ہاؤس توڑنے پہ وہ اس کے ڈورم کے باہر کھڑا رہا تھا، تب اس نے اسے ٹائمڈ کال کی تھی۔ شاید اس کی موجودگی میں کال آنے پہ حیا اسے اپنا یہ مسئلہ بتا دے۔ اس روز وہ بات ادھر ادھر کر گئی تھی۔ آج، اس کے ساتھ جدیسی میں چلنے ہوئے اس نے پھر سے وہی کرنے کا فیصلہ کیا۔ کیا اب ان دونوں میں اتنا اعتبار قائم ہو چکا تھا کہ حیا اسے کچھ بتا دے۔

وہ جوس لینے ایک کیفے میں گیا اور کال کا ٹائم سیٹ کر کے، جوس لیے باہر آ گیا۔ اس نے ریکارڈنگ نہیں لگائی تھی۔ جب حیا کال اٹھائے گی تو رابطہ منقطع ہو جائے گا۔ وہ سمجھے گی دوسری جانب سے کال دیا گیا ہے۔ وہ سننا چاہتا تھا کہ اس کال کی وہ کیا وضاحت دیتی ہے۔ وہ دونوں اب گلی میں کافی آگے تک بڑھ گئے تھے۔ حیا نے اس سے لندن جانے کا پوچھا ضرور، مگر خود اس کا اپنا ارادہ بیوک میں ادا میں رہنے کا تھا۔

”میں اپنی دوستوں کے ساتھ بیوک ادا میں رہنا چاہتی ہوں۔“ وہ بے نیازی سے شانے اچکا کر کہتی چل رہی تھی۔ اس روز بھی اس نے اسکارف چہرے کے گرد لپیٹ رکھا تھا۔ جو وہ چاہتا تھا وہ اس نے کبھی حیا سے نہیں کہا پھر بھی وہ ہو گیا تھا۔ اس سے آگے وہ کیا چاہتا تھا۔ بس اعتبار کا ایک رشتہ جب وہ پیدا ہو جائے گا تو وہ اسے خود سے بتا دے گا کہ وہ ان جنت کے چٹوں میں کتنی خوب صورت لگتی ہے۔ ابھی جہاں نے اس کو ایک ٹرک دکھا کر اخبار تہہ کر کے پکڑا ہی تھا کہ حیا کا موبائل بج اٹھا۔ حیا نے فون نکال کر دیکھا، پھر کال کاٹ دی۔

”میجر احمد کی کال تھی، کچھ کام تھا ان سے۔“ وہ سرسری سے انداز میں بولی اور اسے سمجھ میں نہیں آیا وہ اس کو کیا کہے۔ وہ اتنی صاف گوئی سے بتا دے گی، اس نے توقع نہیں کی تھی۔

اس کے پوچھنے پہ حیا نے بس اتنا بتایا کہ میجر احمد کون ہیں، مگر آگے پیچھے کچھ نہیں۔ سچ بتانے اور اعتبار کرنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ ان کے درمیان سچ بولنے کا تعلق قائم ہو چکا تھا، مگر اعتبار کا شاید نہیں۔ نہ اس نے حیا کو خود سے اپنے بارے میں سب سچ بتایا تھا، نہ ہی حیا نے اسے وہ تمام واقعات بتائے تھے جو اس کے ساتھ پچھلے چند ماہ سے ہو رہے تھے۔

جب وہ واپس چلی گئی تو وہ ریٹائرمنٹ آ گیا۔ اس کا دل مطمئن تھا بھی اور نہیں بھی۔ حیا نے اس سے جھوٹ نہیں بولا، مگر اس پہ اعتبار بھی نہیں کیا۔ وہ لندن بھی اس کے ساتھ نہیں جانا چاہتی تھی۔ وہ بیوک ادا میں رہے، یہ وہ نہیں چاہتا تھا، مگر جب دونوں کے درمیان اعتبار کا رشتہ تھا ہی نہیں، تو وہ کس مان پہ اس سے کچھ منوا سکتا تھا۔

وہ ترکی صرف جہاں کے لیے آئی تھی، وہ جان گیا تھا۔ اب وہ اس کو یہاں سے صرف اپنی وجہ سے ہی بھیج سکتا تھا۔ تب ہی حیا کا فون آنے لگا۔ اس نے کال کاٹ کر خود فون کیا۔ یہ پہلی دفعہ تھی جب حیا نے خود اس سے بات کرنی چاہی تھی۔ زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ اب وہ اسے بتا رہی تھی کہ اس نے جہاں سے میجر احمد کا تذکرہ کیا تھا۔

”کیوں۔ آپ نے کیوں بتایا۔“ وہ یہی جاننا چاہتا تھا۔

”شوہر کو علم ہونا چاہیے کہ اس کی بیوی کس سے بات کرتی ہے۔“ اس کے جا کر کہنے پہ وہ بے اختیار مسکرا دیا۔

اب وہ اسے وہ باتیں بتا رہی تھی جو اس نے ادا لار میں عبدالرحمن اور طیب حبیب کے بارے میں سنی تھیں۔ وہ تحمل سے اس کی سنتا اور پھر اسے سمجھا تا رہا۔ اسے صرف یہ جاننے میں دلچسپی تھی کہ حیا نے یہ ساری باتیں کس سے سنی تھیں۔ کس بات کے جواب میں وہ ”میں نے سنا ہے کہ.....“ کہہ ہی رہی تھی کہ جہاں نے اس کی بات کاٹی۔

”کس سے سنا ہے۔“ اتنی تیزی سے پوچھنے پہ وہ بے اختیار کہہ اٹھی۔

”کبریٰ خانم سے۔ ادا لار میں“

تو یہ کبریٰ خانم تھیں۔ عائشے سے ان کی اچھی سلام دعا تھی، اور ان کا بیٹا ہوٹل گریڈ میں ایک معمولی سی ملازمت کرتا تھا۔ ان خاتون سے تو وہ ذرا واپس جا کر گھٹنے لگا۔ ابھی اسے حیا کے ذہن سے اس خیال کو نکالنا تھا۔ جو بھی تھا، وہ مجراحمہ پہ بھروسہ کرتی تھی۔ اس روز پہلی دفعہ اس سے حیا نے پوچھا تھا کہ وہ جنت کے پتے کسے کہتا ہے۔ جواب میں وہ اسے وہ سب بتاتا گیا جو اس نے علی کرامت کی کمی سے بچپن میں سنا تھا۔ وہ احموری، پوری باتیں، وہ نرم سا احساس، وہ دل میں اترتے لفظ، وہ ہر چیز دہراتا گیا، یہاں تک کہ وہ کہہ اٹھی۔

”آپ اچھے انسان ہیں، اچھی باتیں کرتے ہیں۔“

آہ کاش، وہ اسے بتا سکتا کہ اس نے اس اچھے انسان کو کب، کب، اور کیا کیا اٹھا کر دے مارا ہوا ہے۔



..... بیوک ادا کے ساحل پہ پلہریں پتھروں سے سرخ رہی تھیں۔ ان کا شہر اس اونچے سفید قصر عثمانی کے اندر تک سنائی دے رہا تھا۔ محل اندھیرے میں ڈوبا تھا ہوائے اس کی اسٹڈی کے جہاں وہ کرسی کی پشت سے سر نکالے بیٹھا تھا۔ سامنے لیپ ٹاپ کی چمکتی اسکرین پہ وہ پیغام کھلا تھا جو اس کے ”ابنوں“ کی طرف سے آیا تھا۔ اس کا کام ادوار میں آخری مراحل میں تھا۔ تاش کے پتوں کے گھر کا آخری مرحلہ۔ پھر اسے روپوش ہو جانا تھا۔ کچھ عرصہ روپوش رہ کر وہ دوبارہ استنبول آئے گا، ایک آخری کام نبھائے گا اور پھر واپسی۔ اپنے ملک واپسی۔

جب سے اس نے میل پڑھی تھی، وہ انگوٹھیں اور گلاسز خود سے علیحدہ کر کے میز پر رکھ دی تھیں اور یہ سگریٹ نوشی، اس سے بھی اس کو جلد از جلد چھٹکارا حاصل کر لینا چاہیے۔ اب عبدالرحمن پاشا کو چھوڑنے میں کم وقت رہ گیا تھا۔

اس کے سر کا درد دوبارہ سہا گیا تھا اور بہت سوچنے کے باعث اعصابی دباؤ بھی محسوس ہو رہا تھا۔ جرمنی میں اس نے پندرہ جون کے بعد کی ایک تاریخ بھی اپنی سرجری کے لیے لے لی تھی۔ ڈاکٹر نے اسے امید دلائی تھی کہ آپریشن کی کامیابی کا چانس اتنا ہی تھا جتنا نا کامی کا۔ چونکہ وہ بیوک ادا سے پیک اپ کرنے سے قبل آپریشن کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتا تھا، اس لیے اس نے تاریخ بعد کی لی تھی۔ یہ اس کے کام کا آخری مرحلہ تھا۔ انڈیا میں آخری مرحلے میں سب کچھ بگڑ گیا تھا، آخری مرحلے پہ اس کے دوست نے جس کے پاس وہ مدد کے لیے گیا تھا اس کو پکڑوا دیا تھا۔ سر کا درد ہمیشہ اسے اس دوست کی یاد دلاتا تھا۔ اس نے جہان کے ساتھ اچھا نہیں کیا تھا۔

لوگ بعض دفعہ آپ کے ساتھ بہت برا کر جاتے ہیں، اتنا برا کہ بس!

تمام سوچوں کو ذہن سے جھٹک کر اس نے فون اٹھایا اور آپریشن سٹوڈنٹ کا نمبر نکالا۔

”میرے پاس آپ کے لیے ایک سرپرائز ہے۔ اسے آرہی۔“

مختصر پیغام لکھ کر اس نے حیا کو بھیج دیا۔ جب وہ جواب دے گی تو وہ اس کو برگرنگ پہ بلائے گا۔ وہاں پاشا بے کو بھی وہ بلا لے گا۔ اسے پتا تھا کہ حیا کو وہ منظر کیسے دکھانا ہے۔ جب وہ اپنے شوہر کو اس ”گشہ شہزادے“ کے ساتھ دیکھے گی، تو جہان کا کام آسان ہو جائے گا یا تو وہ جان لے گی کہ وہی عبدالرحمن ہے یا پھر وہ اسے طیب حبیب کا دوست سمجھے گی، دونوں صورتوں میں وہ اس سے دور چلی جائے گی۔ بھلے ترکی سے نہ جائے، بس استنبول سے چلی جائے۔ بعد میں ہمیشہ کی طرح وہ معذرت کرنے اس کے پاس چلا جائے گا اور اسے منالے گا۔ مگر وہ ویڈیو۔

اس نے گہری سانس لے کر موبائل رکھ دیا۔ ویڈیو ابھی تک لاکر میں تھی۔ اگر وہ جانے سے قبل اسے نہیں نکال پاتی تو وہ ویڈیو واپس رکھ لے گا۔

حیا یہ سب 9 جون سے 15 جون تک کے وقت میں سیٹ اپ کرنا ہوگا ابھی نہیں۔

وہ ریسٹورنٹ آیا تو طیب حبیب اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے مطالبے وہی تھے اور جہان کا رویہ بھی ویسا ہی تھا۔

”چند دن انتظار کر لو، میں تمہاری فیملی کو باہر بھیجوا دوں گا۔ میں نے بات کی ہے، بہت جلد سب کچھ سیٹل ہو جائے گا۔“ وہ بے تاثر

لہجے میں کہتے ہوئے رجسٹر چیک کر رہا تھا۔ آج پاشا بے نے جو اب غصہ نہیں کیا نہ ہی اسے لعن طعن کی، بس اتنا کہا۔

”میں امید کرتا ہوں تم میرا کام جلد از جلد کر دو گے جہاں بے، آخر فیملی سب کے لیے اہم ہوتی ہے۔ میرے لیے بھی اور تمہارے لیے بھی۔“

لے بیٹھی۔

اس کے آخری الفاظ پہ جہان نے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا۔ پاشا بے نے کوٹ کا کارڈرست کیا، اور الوداعی مسکراہٹ کے ساتھ پھلے

دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

شایدہ صرف دھمکی دے رہا تھا۔ وہ اس کی فحشی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ ایسے ہی اسے دھمکانا چاہ رہا تھا۔ جہاں سر جھٹک کر کام کرنے لگا۔

انسان کا اپنی انفرادی صلاحیتوں پر حد سے احتیاط و بعض دفعہ اسے دوسروں کو اظہارِ تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ اس کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا مگر ابھی وہ یہ نہیں جانتا تھا۔

شام میں وہ معمول کے مطابق ریسٹورنٹ کے کچن میں کھڑا گوشت کاٹ رہا تھا، جب اس کا موہاٹل بٹکے سے، عبادہ نون سے سمجھ گیا کہ پیغام کس کی طرف سے تھا۔ مگر اس نے فون جیب سے نہیں نکالا۔ قریب ہی اس کے دوشیف کام کر رہے تھے۔ ایک تو پرانی ورکر تھی مگر دوسرا ترک لڑکا تھا۔ اس کو جہاں نے حال ہی میں رکھا تھا اور وہ جانتا تھا کہ وہ ترک اب بھی کام کر رہا ہے۔ اسے یہاں کام کر رہا ہے۔ اس کو رکھنے کا فائدہ یہ تھا کہ اب وہ اپنی مرضی کی باتیں ترکوں تک پہنچا سکتا تھا۔ ٹرپل ایجنٹ بن کر کام کرنا اس طرح اور بھی آسان تھا۔

اس نے ہاتھ صاف کیے، گوشت رکھا اور خاموشی سے ہاتھ روہم کی طرف چلا گیا۔ اندر آ کر اس نے دروازہ بند کیا اور پیغام کھولا۔ چند لمحوں میں اس نے پیغام ڈی کوڈ کیا اور پھر، جیسے ہر طرف اندھیرا مچا گیا۔

وہ لڑکا، عمر، وہ نہیں رہا تھا۔ اسے کس نے مارا، کب اور کہاں مارا، کچھ معلوم نہ تھا وقت جیسے ایک دفعہ پھر برسوں پہلے کے اظہار میں پہنچ گیا تھا۔ وہ اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے مٹی کھود رہا تھا، وہ مٹی جس سے آج بھی خوشبو آتی تھی۔ کیا عمر کون ہونے کے لیے مٹی ملی ہوگی۔ کیا اسے خود وہی مل پائے گی۔

اس کے دل میں تکلیف اٹھ رہی تھی، شدید تکلیف۔ اس نے فون جیب میں ڈالا تو نئی کھولی اور سنک پہ جھٹک کر چہرے پہ پانی کے چھینٹے مارے، پھر سر اٹھا کر آئینے میں خود کو دیکھا۔ شدت ضبط سے اس کی آنکھیں سرخ پڑ رہی تھیں۔

دوا کہتے تھے کہ مومن کے لیے دنیا قید خانہ ہوتی ہے۔ وہ ٹھیک ہی کہتے تھے۔ اس وقت برگرنگ ایک قید خانہ ہی تھا۔ وہ سارا کام چھوڑ کر کہیں دور جانا چاہتا تھا، وہ بوسفورس کے کنارے بیٹھ کر ڈھیر سا رونا چاہتا تھا۔ اگر دوا ہوتے تو کہتے فوجی روپا نہیں کرتے۔ کاش وہ ان سے پوچھ سکتا کہ اگر فوجی کا دل درد سے پھٹنے لگے اور جیسے سارے جسم میں ٹوٹے کاچ اترے رنگیں، تو پھر وہ کیا کرے، کیا دوائیں روئے سے بہتر دوا بھی کوئی ہوتی ہے۔

”سلام..... جہاں کہاں ہے۔ بلند آواز سے اٹھل پھٹل سالوں کے درمیان وہ باہر کہیں پوچھ رہی تھی، جیسے وہ دوڑ کر آئی تھی، جہاں نے ہولے سے نفی میں سر جھٹکا تو لیے سے چہرہ خشک کیا اور نرم آنکھیں رگڑتا ہوا آیا۔“

وہ فریڈم فلوٹلا کے اسٹریٹ پر نمیش کے لیے آئی تھی اور اب وہ چاہتی تھی کہ وہ بھی ان کے ساتھ چلے۔ جہاں اس سے نظریں ملاتے بغیر سر جھٹکائے گوشت کے ٹکڑے اٹھائے لگا۔ کنکھیوں سے وہ دیکھ رہا تھا کہ حیانے نقاب لے رکھا تھا۔ اس کے نقاب کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ اس نے نانا نقاب لینا سیکھا ہے، مگر پھر بھی نقاب نیٹ تھا۔ اسے کیا ہو گیا تھا؟ وہ اتنا بدل کیسے گئی تھی؟ وہ بھی ایک دم سے نہیں، آہستہ آہستہ۔ مگر یہ تبدیلی کتنی اچھی لگتی تھی اس میں۔ ابھی وقت تھا نہیں تھا اس خوشی کو جینے کا، ابھی اور موقع تھا، دل میں کچھ سرا گیا تھا۔

حیا بول رہی تھی مسلسل اور وہ کنکھیوں سے صرف اسے نہیں بلکہ پیچھے کام کرتے اپنے نئے شیف کو بھی دیکھ رہا تھا جس کے ڈریسنگ بناتے ہاتھ درست پڑ گئے تھے۔ بچہ ذرا کچا تھا مگر اسے کچا کام نہیں کرنا تھا۔ یہاں کبھی مٹی ایک ایک بات کہیں اور پہنچانی جاتی تھی، اور یہ پاگل لڑکی ترک فوج کے ایک کارندے کے سامنے اسے کہہ رہی تھی کہ وہ فلسطینیوں کی حمایت کرے۔

گوکہ تربیت کے مطابق وہ کبھی کسی متنازعہ ہنگامے والی جگہوں پر نہیں جاتا تھا کوئی اور موقع ہوتا تو بھی وہ حیا کو منع کر دیتا مگر پیچھے کھڑا لڑکا سب سن رہا تھا۔ ترک فوج بے حد سیکرٹریزم کی فوج تھی جہاں عبداللہ گل، اربط اردگان کی حکومت کو ”ماڈرن مولویوں“ کی حکومت کہا جاتا تھا، وہیں ترک فوج اپنے دین سے بے حد متفاد خیالات رکھتی تھی اور اپنی بیوی کو مطمئن کرنے کے لیے وہ ترکوں کی گند بکس سے نکلنا نہیں چاہتا تھا۔ نتیجتاً وہ لڑکا تو پرسکون ہو گیا، مگر حیا بچھلی کئی دفعہ کی طرح ایک مرتبہ پھر اس کو اور اس کے ریسٹورنٹ کو جنم میں بھیج کر غصے سے وہاں سے چلی گئی۔

وہ اس کے پیچھے نہیں گیا۔ اس کا موڈ پہلے ہی بہت خراب تھا، وہ وہیں کھڑا خاموشی سے کام کرتا رہا۔ کام اسے کرنا تھا، کیونکہ حیا کی طرح وہ موڈ خراب ہونے پر دو چار چیزیں ہاتھ مار کر گراتے ہوئے، ہر کسی کو جنم میں بھیج کر کہیں دوشیف جاسکتا تھا۔ یقیناً اس معاملے میں وہ کافی خوش قسمت تھی۔

پوری رات وہ بے حد سڑب رہا، پھر صبح سب کچھ ذہن سے جھٹک کر وہ گھر سے نکل آیا۔

فیری اس نے کدی کوئے سے پکڑ لی تھی۔ کدی کوئے شہر کی شیشیں سائیک کی بند گاہ تھی اور سبائشی بھی شیشیں سائیک پہ لگی تھی۔ سودہ

منہ اندھیرے اس سے ملنے چلا گیا۔

وہ جھیل کے پاس بیٹھی تھی۔ کتابیں سامنے پھیلائے، وہ جیسے کافی دیر روتی رہی تھی۔ اسے بے اختیار وہ رات یاد آئی جب جعفر بریڈ ہاؤس ٹوٹا تھا اور وہ بھی ایسے ہی روری تھی۔ اسے ایک لمحے کو اس لڑکی پہ بہت ترس آیا جس کی زندگی اس نے اتنی مشکل بنا دی تھی۔

اس کے ساتھ چاندی کے پانی جیسی جھیل کے کنارے بیٹھے وہ بہت دیر تک اسے دھیرے دھیرے کچھ سمجھا تا رہا۔ وہ اسے خواب نہیں دکھانا چاہتا تھا، سو حقیقت میں رہ کر مستقبل کے حوالے سے باتیں کر رہا تھا۔ اٹھنے سے قبل اس نے پھر سے ”لندن چلنے کا موڈ ہو تو بتانا“ کہا تھا۔ کتنا ہی اچھا ہو کہ وہ ممی کے ساتھ لندن چلی جائے، پھر بعد میں ایک دو روز کے لیے اپنی کلیئرٹس کروانے بے شک آجائے۔ مگر اپنا آخری مہینہ وہ اس شہر میں نہ گزارے اس روز اسے لگا تھا، حیا اس کو اس کی غیر متوقع فطرت کے ساتھ قبول کرنے پہ راضی تھی، مگر اعتبار وہ ابھی تک ان دونوں کے درمیان نہیں قائم ہوا تھا۔ وہ روٹھنے اور منانے سے آگے نہیں بڑھے تھے۔

جس روز اس کے امتحان ختم ہوئے، اس سے اگلے دن وہ بیوک ادا گئی تھی۔ یہ عائنے نے اسے بتایا تھا کیونکہ اب اس کا ٹریس صرف سبائنجی میں پڑا رہتا تھا۔ اس نے دوبارہ اس کو ٹریس کرنے کی خود ہی کوشش کی یہ اتنا ضروری نہیں تھا۔

گیارہ جون کی رات وہ ممی کے ساتھ ان کی پیکنگ کروانے میں مصروف تھا جب ممی نے حیا کے بارے میں پوچھا:

”کیا وہ ہمارے ساتھ جائے گی۔“

”پتا نہیں آپ کی جتنی کہاں اپنا پروگرام میں بتاتی ہے۔“ اس نے شانے اچکا کر لاپرواہی سے جواب دیا تھا۔ پھر اس نے سوچا، وہ حیا سے پوچھ ہی لے کہ اس کا کیا پروگرام ہے۔ وہ اپنا آخری مہینہ استنبول میں نہیں تو کدھر گزارے گی۔ یہی سوچ کر اس نے میجر احمد کی طرف سے اسے بس ”کیسی ہیں آپ۔“ لکھ کر بھیج دیا۔ پتا نہیں وہ کیسی تھی۔ پورے دس دن اس نے حیا کو نہیں دیکھا تھا نہ ہی کوئی بات ہوئی تھی۔

”مجھے جنت کے ان پتوں نے دنیا والوں کے لیے اجنبی بنا دیا ہے میجر احمد!“ اس کے جواب میں بہت ٹوٹا، بکھرا پن ساتھ۔ شاید وہ رو رہی تھی۔ وہ اس کی عادت کو لٹنی اچھی طرح سے جاننے لگا تھا کہ اس کے انداز سے وہ اس کے موڈ کا اندازہ کر لیا کرتا تھا۔

وہ موبائل لے کر بکچن میں آ گیا اور بہت سوچ کر ایک ایسا جواب لکھا جو اس وقت اسے تسلی دے سکے۔ یقیناً اس کے نقاب پہ کسی نے کچھ کہہ دیا ہوگا اور وہ دل چھوڑ کر بیٹھی تھی۔ عین ممکن تھا وہ کہنے والے کو ہاتھ میں آئی چیز بھی دے مار چکی ہو یا کم از کم اسے جہنم تک پہنچا چکی ہو۔ پتا نہیں اس کی تسلی ہوئی یا نہیں، مگر اس کا مزید کوئی فیصلہ نہیں آیا۔

صبح وہ بیوک ادا نہیں گیا کیونکہ آج ہفتہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ حیا کے حوالے سے کچھ طے کر لے مگر تبھی، کام کے دوران اس کو جو اہر مال کے لاکرز کے گاڑ کا پیغام موصول ہوا۔ ایک لڑکی جو سیاہ عبا میں تھی، نو نمبر لاکر سے کچھ لے گئی ہے۔

گریٹ۔ وہ تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھا۔ اسے معلوم تھا اسے کیا کرنا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ سسلی سے واپس سبائنجی جاتی، وہ اسے اور پاشا نے دونوں کو اپنے ریسٹونٹ چیلنجے کا کہہ چکا تھا۔ پاشا نے کامسن قریب ہی تھا، سو وہ حیا سے پہلے پہنچ گیا۔

”کیا میرا کام ہو گیا۔“ پیئٹری میں جا کر اس نے پہلی بات یہی پوچھی تھی۔

”نہیں، اس میں ابھی کچھ وقت ہے، تم تھوڑا صبر نہیں کر سکتے۔“ وہ جیسے زچ ہوا تھا۔

”پھر تم کیوں ملنا چاہتے تھے۔“

”ہوٹل گریڈ کے بارے میں کچھ بات کرنی تھی۔“ اس نے پیئٹری کا دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ اپنے پرانے شیف کو وہ سمجھا چکا تھا کہ اسے کس طرح سے حیا کو پھیل طرف بھیجنا ہے۔ اب پاشا نے کو ہوٹل کے معاملات کے بارے میں بتاوا کہ نکلیوں سے اس روشن دان کو دیکھ رہا تھا جو اس نے کھول رکھا تھا۔ وہ آئے گی تو اسے سامنے شیف کے جھپٹے شیشے میں، شین دن پائلس نظر آجائے گا۔ تب وہ ان کی باتوں سے جان جائے گی کہ دونوں کے درمیان کوئی جھگڑا چل رہا ہے۔ حسب توقع پاشا بے جلد ہی، ہوٹل گریڈ کی بات ختم کر کے اپنے کام کی طرف آ گیا اور تب ہی وہ اسے روشن دان کے عکس میں نظر آئی۔

وہ جیسے ٹھٹھک کر رک گئی تھی۔ وہ بنا ظاہر کیے اپنے مخصوص انداز میں بات کہے گیا۔ اسے معلوم تھا کہ حیا اندر نہیں آئے گی، اگر اس نے دروازے پہ دستک دی یا گھنٹی بجائی تب وہ فوراً اسے جانے کا کہہ دے گا۔ وہ زبردستی تو اندر نہیں آنا چاہے گی۔ مگر جو وہ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا۔

”تمہاری بیوی باہر کھڑی ہے جہاں اسے اندر نہیں بلاؤ گے۔“ جیسے ہی پاشا بے کی نظر اس پہ پڑی وہ مسکرا کر بولا۔

جہان کو لگا، کسی نے پیٹری کا سارا سامان اس پر الٹ دیا ہو۔ وہ کیسے جانتا تھا حیا کو۔ یہ ناممکن تھا۔ وہ اسے جہان کی دوست کہتا تو وہ اتنا ششدر نہ ہوتا مگر جہان کی بیوی۔ اسے کیسا پتا چلا۔ اس بات کا ترکی میں تو کوئی ڈاکومنٹ پروف بھی نہیں تھا، پھر۔

وہ اب اسے حیا کے بارے میں اور بھی بہت کچھ بتا رہا تھا، سبائچی ایکسیجن اسٹوڈنٹ، ڈورم نمبر، وہ سب جانتا تھا۔ ان کی ملاقات بھی ہو چکی تھی۔

حیائے اثبات میں گردن ہلا کر تصدیق کی، مگر وہ انہی بے یقین نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اگر وہ دونوں مل چکے تھے تو پتا نہیں اس نے حیا کو کیا کیا بتایا ہوگا۔ سب کچھ الٹا ہو گیا تھا۔ اس نے پاشا بے کو واقعی انڈر سٹیمٹ کیا تھا۔

”اس نے بے اختیار پاشا بے کو گریبان سے پکڑ لیا۔ اگر وہ اس کی بیوی کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرنے کا سوچ بھی تو وہ واقعی اسے جان سے مار دے گا۔ حسب عادت، طیب حبیب پاشا کی مسکراہٹ کبھی۔ وہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اسے اس کی بیوی سے غرض نہ تھی، بس کام سے تھی۔ اس کے جاتے ہی وہ حیا کی طرح چلنا مگر اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ دیمت نے ٹھیک کہا تھا، بعض باتیں سیاق و سباق کے بغیر پیش کی جائیں تو ہیر و کولن بنا دیتی ہیں۔ وہ اس کا اعتبار کھو چکا تھا۔ حیائے اس کی کوئی بات نہیں سنی، وہ فوراً وہ جگہ چھوڑ کر چلی گئی۔

”وہ اسے ترکی سے بھیجتا چاہتا تھا مگر اس طرح نہیں۔ خود سے بدظن کر کے نہیں، خود کو بے اعتبار کر کے نہیں۔ سب کچھ الٹ گیا تھا۔ بہت دفعہ منصوبے لائے پڑ جاتے ہیں کوئی بھی انسان ماسٹر پلانز نہیں ہو سکتا۔ وہ بھی نہیں تھا۔“

دیمت کی بات پوری ہوئی۔ وہ شوہر سے بدظن ہو کر اس سے دور چلی گئی۔ اس نے حیا کو بہت فون کیا، مگر اس نے جہان کی کوئی بات نہیں سنی۔ وہ چلی گئی اور جیسے بوسفرس کا پانی خاموش ہو گیا، سرسری بگلے اڑنا چھوڑ گئے، ٹیوپس مرجھا گئے اور جیسے سارا استنبول اس ہو گیا۔

وہ چلی گئی اور اپنا ٹریسر سبائچی کے ڈورم میں ہی چھوڑ گئی۔ ایسا اس نے کبھی نہیں چاہا تھا، مگر ایسا ہو گیا تھا۔ دیمت کی بات پوری ہوئی تھی۔ حیا کے جانے کے بعد می اور ابا کی روانگی کے انتظامات بھی مکمل تھے۔ می مضبوط عورت تھیں۔ وہ اپنے کام اکیلے دیکھ سکتی تھیں۔ ساری زندگی انہوں نے ایسے ہی گزاری تھی، سو وہ استنبول میں اپنا کام مکمل کر کے جرمنی جانے کا ارادہ کر رہا تھا۔ یہ روپوشی کے دن تھے اور ان دنوں میں وہ سرجری کروالینا چاہتا تھا۔ دو تین مہینے بعد اسے پھر سے ترکی جانا پڑ سکتا تھا، شاید ایک آخری کام کے لیے۔ اس کے بعد ترکی کے باب کو اس کی زندگی سے نکل جاتا تھا۔

جرمنی آنے سے قبل وہ طیب حبیب پاشا سے آخری دفعہ ملا تھا۔ اس کی تمام چیزیں اس کے حوالے کرنے سے قبل اس نے صرف ایک بات پوچھی تھی۔ ”تم میری بیوی کو کیسے جانتے ہو۔ مجھے صرف سچ سننا ہے۔“

اور طیب حبیب نے سچ بتانے سے انکار نہیں کیا۔ وہ اسے کبھی انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے بقول اس رات جب وہ برگرنگ کے داخلی دروازے کے ساتھ والی میز پر چہرے کے سامنے اخبار پھیلائے بیٹھا تھا تو اس نے ان دولہائیوں کی گفتگو سنی تھی جو وہاں کھڑی تھیں۔ سیاہ اسکارف والی لڑکی دوسری کو اپنی انگلیوں دکھاتے ہوئے جہان سمندر سے اپنی منگنی اور شادی کا ذکر کر رہی تھی۔ اس لیے وہ ان کے پیچھے گیا، کافی شاپ تک مگر وہ ڈرگٹیں اور اسٹریٹ میں اس کے آگے بھاگتی واپس برگرنگ تک آئیں۔ اسے اندازہ تھا کہ وہ اسکو ان تک ضرور آئیں گی، سو وہ وہیں ان کا انتظار کرتا رہا۔ جب رات ڈیڑھ بجے والی بس انہوں نے اسکو ان سے پکڑی تو اس نے ان کا یونیورسٹی کمپس تک پیچھا کیا اور اگلے روز اس نے ایک جاننے والے سے کہہ کر وہ تمام معلومات نکلوائیں جو وہ حیا کے متعلق یونیورسٹی سے نکلوا سکتا تھا۔“

اس نے طیب کو اس کے ڈاکومنٹس دے دیے، پھر بیوک ادا جا کر آئے کو بالا خروہ سنادی جس کا انتظار کرتے انہیں ایک ڈیڑھ برس بیت چکا تھا۔ ان کا بیٹا مل گیا تھا، وہ ایران میں تھا، اور اس کے کچھ دشمن استنبول اس کی واپسی کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے تھے۔ اتنے عرصے بعد پہلی دفعہ طیب حبیب نے اپنی ماں کو فون کیا، آنے خوشی و تشکر سے بے حال تھیں۔ جب طیب حبیب نے چاہا کہ وہ بیٹیوں اب اس کے پاس ایران چلی آئیں تو آنے بخوشی راضی ہو گئیں۔ اب عائشے کی باری تھی۔ آنے نے اپنے طور پر اور جہان نے اپنے طور پر اس کو ساتھ چلنے کے لیے کہا۔ وہ صبر شکر والی لڑکی تھی، اور وہ جانتا تھا کہ وہ سمجھ چکی ہے کہ وہ وقت آن پہنچا ہے جب اس مصنوعی رشتے کی ڈور ٹوٹ جائے گی۔ عبدالرحمن ان کی زندگیوں سے نکل جائے گا اور وہ ایک دفعہ پھر ایک نارل فیملی کی طرح رہیں گے۔

عائشے نے صبر کر لیا۔ ساری اذیت دل میں دبا کر وہ روانگی کے لیے پینگ کر گئی۔

وہ ہمارے کورونے اور عائشے کی چپ سے اندر ہی اندر بہت ڈسٹر ہوا تھا۔ یہ سب اس کی وجہ سے ہوا تھا۔ اس کی وجہ سے اس کا

”کانیکٹ“ (طیب حبیب) ادھر نہیں رہ سکتا تھا۔ عائشہ اور بہارے کو عبدالرحمن کو بھلانے کے لیے ایک عرصہ ملے گا، اس کے بعد وہ ساری زندگی کسی اجنبی پر اعتبار نہیں کر سکیں گی۔ وہ اپنے اندر کی بہت ساری سنجائی ان کی زندگیوں میں چھوڑ کر جا رہا تھا، مگر وہ کیا کرتا یہی اس کی جاب تھی۔

مئی کو ابھی ترکی سے جانے میں چند دن تھے، مگر اس کا کام ختم تھا، سو وہ جرمنی چلا آیا۔ جس روز اس کی سرجری متوقع تھی، اس صبح اس نے حیا کو فون کیا۔ وہ اسے کہنا چاہتا تھا کہ وہ بیمار ہے، اس کی سرجری ہے، وہ اس کے لیے دعا کرے، مگر وہ کسی اور موڈ میں تھی۔ اسے زیادہ فکر فلیش ڈرائیو کے پاس ورڈ کی تھی۔

ایک لمحے کو اس کا جی چاہا، وہ اسے بتا دے کہ پاسورڈ، پاسورڈ ہی ہے۔ دنیا کا آسان ترین پاسورڈ۔ وہ ویڈیو کھولتے ہی اسے کال بیک کرے گی۔ وہ آج ہی، آپریشن ٹیبل پہ جانے سے قبل ہی اس کی آواز سن لے گا، مگر وہ ایسا نہ کر سکا۔ اپنی کہہ کر اس نے بہت خشک لہجے میں تمام تعلقات منقطع کرنے کا مژدہ سنایا اور فون رکھ دیا۔

بے حد اضطرابی کیفیت میں جہان نے پھر سے اس کا نمبر ڈائل کیا، مگر اب وہ فون اٹھانے سے بھی انکاری تھی۔ وہ جہان سے بھی بدظن تھی اور وہ اپنے نمبر سے کال کر کے کسی لمبی چوڑی صفائی کے موڈ میں نہ تھا، سو بدولی سے اس نے فون ایک طرف ڈال دیا۔

آپریشن سے قبل: اکثر نے آخری دفعہ پوچھا تھا۔

”یا تمہیں یقین ہے کہ تم آپریٹ کروا چاہتے ہو۔“

وہ اس وقت آپریشن ٹیبل پہ لیٹا تھا، ہسپتال کے سبز گاؤن میں بلبوس، اس کا چہرہ بھی پڑ سرودہ سالگ رہا تھا۔ آخری دفعہ اس نے آپریشن تھیز کی جھٹ، لائسنس اور تیار ہوتے ڈاکٹر زادراشاد کو دیکھا اور سر ہلا دیا۔ وہ اپنے رسک پہ سرجری کروا رہا تھا، سارے سوڈو زیاں اس کے کھاتے میں ہی لکھے جانے تھے۔

جب اسے تھیز یاد دینے ایک ڈاکٹر اس کے قریب آیا تو اس کا جی چاہا، وہ انہیں روک دے۔ وہ سرجری نہیں چاہتا تھا۔ وہ امداد نہیں ہونا چاہتا تھا۔ وہ اپنا ج نہیں ہونا چاہتا تھا، مگر الفاظ نے جیسے ساتھ چھوڑ دیا۔ چہرے پہ ماسک لگتے وقت اس کا سارا جسم سن پڑتا گیا۔ آنکھیں بند ہو گئیں۔ ہر طرح اندھیرا تھا۔ جیسے سیاہ منجھل کا کوئی پردہ ہو۔ جیسے بناتاروں کے رات کا آسمان ہو۔

کتنے گھنٹے گزرے، کتنے پہر بیتے، وہ نہیں جانتا تھا۔ جب حیات لومیس تو پٹکوں سے ڈھیر سارا بوجھ سا اتر آ۔ اس نے دھیرے سے آنکھیں کھولیں۔ وہ ہسپتال کے لباس میں ہی تھا، مگر کمر مختلف تھا۔ اس نے پٹکیں جھپکائیں۔ دھندلا منظر واضح ہوا۔ وہ اب دیکھ سکتا تھا۔

کیا اس کا آپریشن کامیاب ہوا تھا۔

سسٹر اسے جاگتے دیکھ کر فوراً ہر چلی گئی۔ اس کی واپسی اس کے سرجن کے ساتھ ہوئی۔

”ہو گیا۔“ اس نے ڈاکٹر کو دیکھتے ہوئے لبوں کو ذرا سی جنبش دی۔

”نہیں۔ ہم نے آپریٹ نہیں کیا۔“ ڈاکٹر اس کے قریب آئے، اور بتانے لگے۔ ”تم بے ہوشی کے دوران بار بار کہہ رہے تھے کہ ہم تمہیں جانے دیں تمہاری ماں کو تمہاری ضرورت ہے۔ اس کے بعد میں یہ آپریشن نہیں کر سکتا تھا۔ رسک فیکٹر تم جانتے ہو۔“

”اوہ!“ ایک تھکی ہوئی سانس لیوں سے خارج کر کے اس نے آنکھیں موند لیں۔

”تم کچھ وقت لے لو، خود کو دینی طور پہ تیار کر لو، پھر ہم سرجری کریں گے۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ہسپتال سے چھٹی ملنے پہ وہ اپنے ہوٹل واپس چلا آیا۔ ڈاکٹر ٹھیک کہتا تھا۔ اسے یہ خطرہ مول لینے سے قبل خود کو مکمل طور پہ راضی کرنا تھا۔

”ہوٹل کے کمرے میں بیٹھے، اس نے اپنا تاری والا نمبر آن کیا اور ایک ایک کر کے وائس میسج سننے لگا جو نمبر بند ہونے پہ کارلزنے ریکارڈ

کروائے تھے، جو تھا میج می کا تھا۔

”جہان! کیا تم شہر میں ہو۔ تمہارے ابا کی طبیعت بگڑ گئی ہے۔ میں انہیں ہسپتال لے کر جا رہی ہوں۔“

وہ ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھا، اور جلدی سے اٹھ کھولا۔

”جہان! تمہارے ابا کی ڈیٹھ ہو گئی ہے۔“ اسے لگا، کسی تیز رفتار ٹرک نے اسے کچل دیا ہے۔ وہ بالکل سن سنا رہا تھا۔ مئی کے میسجز کے

بعد دیگرے فون پہ چل رہے تھے۔

”میں باڈی لے کر پاکستان جا رہی ہوں۔“

”تم جہاں بھی ہو، کوشش کرنا کہ جنازے پہ پہنچ جاؤ۔“

”الفاظ تھے یا چاہا۔ اس کی ماں کو اس کی منتی ضرورت تھی، وہ منتی اکیلی ہوں گی، وہ منتی دکھی ہوں گی، سب بے حساب تھا۔ وہ مشکل وقت میں ان کے پاس نہیں جاسکا تھا۔ وہ مشکل وقت میں کبھی ان کے ساتھ نہیں ہوتا تھا۔“

ابا چلے گئے اور وہ ان کا آخری چہرہ بھی نہیں دیکھ سکا۔ زندگی بھی بعض دفعہ ہماری مرضی سے زیادہ قربانیاں مانگ لیتی ہے۔ پاکستان جلد از جلد پہنچنا آسان نہ تھا۔ اس کی آزادی کی دور کسی اور کے ہاتھ میں تھی اجازت، پروٹوکول، احتیاط اور ابا کے جنازے کے تیسرے دن اسلام آباد پہنچ سکا۔ اگر وہ ڈی ایکٹیوٹ نہ ہوتا تو شاید تب بھی نہ پہنچ سکتا۔ جب حیا کی دوست کی ڈیجھ ہوئی تھی، تب حالات فرق تھے۔ اب حالات دوسرے تھے۔

اس رات جب وہ ایئر پورٹ پہ پہنچا تو سب سے پہلے اس نے حیا کو کال کی۔ وہ اس کے گھر کا راستہ جانتا تھا مگر اس کو پہلے قبرستان جانا تھا۔ وہ پچھلی تین چار راتوں سے مسلسل حالت سفر میں تھا اور بمشکل سو پایا تھا۔ سر درد بھی ویسا ہی تھا۔ اسے اپنے باپ اور داوا سے ملے بغیر سکون نہیں مل سکتا تھا۔

حیا خاموش خاموش سی تھی۔ اس کی خفگی، گریز، تنجیدگی، وہ سب سمجھ رہا تھا۔ وہ اسے قبرستان لے گئی۔ اپنے باپ اور دادا کی قبروں کے سامنے بچوں کے بل بیٹھے، اس نے بہت سے بیٹے لکھوں کو یاد کرنا چاہا۔ تلخ باتیں، کڑوے لمحے، ادھوری یادیں، پورے دکھ۔

وہ گھر آئے تو حیا نے اسے اس کا کمرہ دکھایا۔ وہ جوتوں سمیت بستر پہ اس ارادے سے لیٹا کہ ابھی چائے پیے گا، پھر مٹی کے اٹھنے کا انتظار کرے گا۔ وہ فجر پہ اٹھیں گی تو وہ ان سے مل لے گا مگر تھکن اور سر درد کے باعث اس کی وہیں آنکھ لگ گئی۔

جب وہ جاگا تو دو پہر ہو چکی تھی۔ سائینڈ نیبل پہ ابھی تک چائے کی پیالی رکھی تھی۔ حیا اس کے لیے فوراً چائے لے آئی تھی۔ اس کا مطلب تھا، اس کی خفگی اتنی نہیں تھی کہ وہ اسے دور نہ کر سکے۔

وہ فریش ہو کر نیچے آیا تو فرقان ماموں سمیت سب وہاں تھے۔ حیا گھر نہیں تھی۔ وہ اپنی دوست کے ساتھ شاپنگ پہ گئی تھی۔ حیا اور

حیا کے شوق!

فرقان ماموں، اور صائمہ ممانی اسے باتوں باتوں میں کافی سنا گئے۔ ان کے نزدیک اس کا رویہ قابل مذمت تھا۔ جیٹا باپ کے جنازے پہ نہ پہنچے، ایسی بھی کیا مصروفیت۔ وہ خاموش رہا۔

رات کھانے پہ فاطمہ مامی نے اس کا پروگرام پوچھ کر بہت اہمیت سے کہا تھا۔

”الگ اپارٹمنٹ کی کیا ضرورت ہے۔ یہی گھر ہے بین کا۔“

وہ کتنے ہی دن بعد پہلی دفعہ مسکرایا۔ وقت کیسے بدلتا ہے، لوگ کیسے بدلتے ہیں، رشتے کیسے بدلتے ہیں۔

فاطمہ مامی کی خواہش بھی بجا تھی، مگر اسے لگتا تھا اس کے نصیب میں پاکستان میں رہنا لکھا ہی نہیں ہے۔ ہاں شاید جب وہ ترکی کے لیے ناکارہ ہو جائے تو کچھ عرصہ یہاں رہ جائے۔ مگر اپنے پلانز وہ ان لوگوں سے ابھی شیئر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

حیا اس سے ویسی ہی کھینچ کھینچ رہی تھی۔ کبھی شاپنگ کے بہانے، کبھی کسی اور کام کے لیے وہ اس کو ساتھ لے جاتا، اس سے ہلکے پھلکے انداز میں بات کرنے کی کوشش کرتا لیکن وہ ریزرو ہی رہتی۔ وہ انتظار کر رہا تھا کہ کب وہ اپنے دل کی بھڑاس نکالتی ہے، مگر وہ خاموش تھی۔ ہاں جب بھی وہ اسے دیکھ رہا ہوتا، وہ محسوس کر کے چپکتی اور فوراً اس کی طرف دیکھتی، مگر اس کے چونکنے اور گردن موڑنے تک وہ نگاہوں کا زلویہ بدل چکا ہوتا تھا۔

بلا خرفرقان ماموں کی بیٹی کی منتی کی رات اس نے حیا سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ کافی بنا کر اس کے پاس آیا تو اس نے دیکھا، حیا نے وہی موتیوں والے ایئر کنڈرین رکھے تھے جن کی وجہ سے عائشہ بہت ہرٹ ہوئی تھی۔

وہ دونوں چھت پہ جمو لے پہ جا بیٹھے تو اس نے طیب حبیب کا ذکر چھیڑا کہ وہ اس کو کیسے جانتی ہے۔

”عبدالرحمن پاشا۔ امت اللہ حبیب پاشا کا بیٹا۔“ حیا کی بات پہ وہ چونکا۔

عبدالرحمن۔ اوہ۔ وہ غلط سمجھ تھی۔ اس نے طیب حبیب کی تصویروں کو عبدالرحمن سمجھا تھا وہ تو تصاویر ہی نہیں بنواتا تھا۔ صرف ایک تصویر تھی، بہارے کے پاس اس کی ورنہ گھر میں تو ساری تصاویر طیب حبیب کی تھیں۔

جواب میں وہ اسے پوری روداد سنائے گئی۔ وہ بالکل خاموشی سے سنے گیا۔ وہ سب پہلے سے جانتا تھا، سو کیا تبصرہ کرتا۔ صرف ایک بات نئی تھی۔ حیانے پاشا بے پکانی الٹی تھی۔ ویری گڈ پاشا بے نے یہ بات نہیں بتائی تھی، مگر وہ اپنی بیوی کی خدا داد صلاحیتوں کو کیسے بھول گیا۔ حیانے ابھی تک وہ یو ایس بی فلیش نہیں کھولی تھی، سو وہ چند آدمی تھے، آدھی فرضی دھاتوں سے اس کو قیدی طور پر مطمئن کر کے بات ختم کر گیا۔ اصل بات یہ تھی کہ ان کے درمیان اعتبار کا رشتہ قائم ہو چکا تھا۔ حیانے اپنی طرف کی ساری کہانی سنا ڈالی تھی۔ وہ بھی اپنی کٹھنا سنا چکا تھا، مگر حیانے ابھی وہ سنی نہیں تھی۔

سلیمان ماموں کو جانے کس بات پر روئیل پہ شک پڑ گیا تھا انہوں نے اس سے پوچھا مگر وہ دامن بچا گیا۔ اسے اپنی ذلیل بھائی تھی۔ مگر ماموں کو ظلم ہی ہو گیا۔ ان کی روئیل سے اچھی خاصی بحث ہوئی، اور پھر وہ ایک دم ڈھسے سے گئے۔

فاطمہ ممانی اور حیا یہ وہ دن بہت بھاری تھے۔ وہ دونوں دکھ سے نڈھال تھیں۔ کیا ہوا جو سلیمان ماموں ان کے برے دنوں میں ان کے ساتھ نہیں تھے اور می توان کا ساتھ دے سکتے تھے نا۔

وہ جانتا تھا جب باپ نا کارہ ہو جاتا ہے تو رشتے دار بدل جاتے ہیں۔ اس نے حیا کو اپنے رشتے داروں سے ہوشیار رہنے کا کہا اور پھر حالات ایسے بننے لگے کہ حیانے اپنے لبا کے آفس جانا شروع کر دیا۔ اس نے جہان سے مدد مانگی مگر وہ فوراً پیچھے ہٹ گیا۔ اس کو چند دن میں واپس ترکی چلے جانا تھا، اس لیے بہتر تھا وہ خود کو اپنی بیوی کی بیساکھی نہ بنائے۔

آج کل اس نے حیا سے اس کی کار لے رکھی تھی۔ اسے اپنے کاموں کے لیے جانا ہوتا تھا، سو اسے یہ کار بھائی تھی، اور حیا کواری ٹیٹ کرنا دنیا کا سب سے آسان کام تھا۔ وہ اس کی کنکیشن سے اتنا تنگ پڑی کہ کار کی چابی از خود اس کے حوالے کر دی۔

اس رات جب وہ گھر واپس پہنچا تو دیکھا وہ میڑھیوں پر سر جھکا ئے بیٹھی تھی۔ قریب پہنچنے پر حیا کی گاڑی میں اس نے دیکھا، وہ رو رہی تھی۔ وہ ایک دم بہت پریشان ہو گیا۔ شاید اس نے ویڈیو کھول لی ہو اور اب اس سے ناراض ہو۔ وہ کچھ بھی بتائے بنا اندر بھاگ گئی۔ اس نے فوراً می کو جالیا۔ ان کی زبانی معلوم ہوا کہ فرقان ماموں نے وہی کیا تھا جو وہ ہمیشہ کرتے تھے۔ اسے بہت دکھ ہوا۔ سو صبح حیا سے بات کرے گا۔ مگر صبح وہ جلدی آفس چلی گئی۔ سو وہ پھر میں اس نے حیا کو لچ پڑا۔ اسے اپنی بیوی کو کچھ خاص بتانا تھا۔ جب وہ بتا چکا تو کھانا آ گیا۔ وہ نقاب کے اندر سے بہت اعتماد اور سکون سے کھا رہی تھی، پھر ایک دم وہ بولی

”تمہیں اچھا لگتا ہے میرا یوں نقاب لینا۔“

وہ بے اختیار چونکا اور پھر اس نے تائید تو کر دی، مگر وہ الجھ گیا تھا۔ کیا وہ نقاب اس کے لیے کرتی تھی۔ وہی پرانی شک کرنے کی عادت۔ وہ واقعتاً قدرے بے یقین ہو گیا تھا۔ پھر بھی اس نے سوچا کہ جانے سے قبل حیا سے اس بارے میں بات ضرور کرے گا۔

جس دن اس کے نانا کی برسی تھی، اس شام فاطمہ ممانی نے اسے لاؤنج میں روک لیا۔ وہ ذرا جلدی میں تھا، مگر اتنا بھی نہیں کہ ان کی بات نہ سنتا۔ ابھی اس کی فلائٹ میں وقت تھی۔ می کو اس نے صبح ہی بتا دیا تھا، اور حیا کو وہ بتا دے گا اگر ملاقات ہوئی۔ نہیں تو می بتا دیں گی۔

”کیا تم حیا کو سمجھ نہیں سکتے؟“ فاطمہ ممانی بہت مان سے اس کو کہہ رہی تھیں کہ وہ حیا کو سمجھائے تاکہ وہ اپنی ضد چھوڑ دے۔ وہ قہقہہ سے سنتا گیا۔ حیا آگئی تو ممانی چلی گئیں۔ دونوں کے درمیان ذرا تناؤ تھا۔ ان کے جانے کے بعد کچھ سوچ کر وہ اس کے پاس آیا۔

اس رات باہر بہت زور کی بارش ہو رہی تھی۔ اس برسی بارش کے دوران اس نے حیا سے جانا چاہا آیا کہ وہ اس کے لیے اپنا نقاب چھوڑ سکتی ہے۔ اس نے یہ نہیں کہا کہ وہ ایسا چاہتا ہے، بس یہی کہا کہ اگر وہ ایسا کہے۔ مگر چند ہی لمحوں میں اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ اس کے لیے یہ سب نہیں کر رہی۔ اسے جہان کی مورل سپورٹ بھی نہیں درکار تھی۔ اس نے خود کو بہت مضبوط کر لیا تھا۔

اب مزید کیا رکھنا۔ کوئی وضاحت، کوئی امید، کچھ بھی تمھارے بغیر وہ ہاں سے چلا آیا۔ اسے جانا تھا۔ اس کا کام اس کا انتظار کر رہا تھا۔ یہاں سے اسے پہلے استنبول جانا تھا۔ اگر وہاں کچھ کرنے کو زندہ گیا تو وہ وہیں چلا جائے گا جہاں کے بارے میں چند روز قبل وہ حیا کو بتا چکا تھا۔ وہ اس پاک اسپانی کی طرح کسی گمنام قبر میں نہیں دفن ہونا چاہتا تھا۔ اگر وہ واپس نہیں آتا تو کم از کم اس کی بیوی کو اتنا تو معلوم ہو کہ اس کی قبر کہاں ڈھونڈنی ہے۔

باب 13

ایک زوردار گرنے سے سڑک کے ایک جانب لڑھکادیا۔
ولید کی گاڑی زن سے آگے بڑھ گئی۔

وہ اوندھے منہ نیچے گری تھی۔ دایاں گھٹنا، دایاں پاؤں، بہت زور سے سیڑھیوں سے ٹکرایا تھا۔ وہ شاید سیڑھیوں پہ گر گئی تھی۔ پورا دماغ جیسے لمبے بھر کو شل سا ہو گیا تھا۔

”امی!“ وہ درد سے کرا رہی۔ ہونٹ اور ٹھوڑی پہ جلن سی ہو رہی تھی۔ بدقت اس نے سیدھے ہونا چاہا۔ ساتھ ہی نقاب کھینچ کر اتارا۔ ہونٹ پھٹ گیا تھا اور اس میں سے خون نکل رہا تھا۔

”حیا باجی.....“ کوئی دور کہیں اسے پکار رہا تھا۔ اپنا دکھتا سر سہلاتے ہوئے وہ بمشکل اٹھ بیٹھی۔ ولید نے اسے گاڑی تلے دے دیا تھا کیا؟ مگر وہ کمر کھاکر سڑک کے ایک طرف گر گئی تھی، سوچ رہی۔ اسے کدھے پہ شدید درد محسوس ہو رہا تھا۔ کسی نے شاید اسے کدھے سے پکڑ کر وائیں جانب دھکا دیا تھا۔

دھیرے دھیرے بیدار ہوتے حواسوں کے ساتھ اس نے گردن موڑی۔ ظفر دور سے بھاگتا آ رہا تھا۔ ولید کی گاڑی کہیں نہیں تھی۔ پارکنگ ایریا میں اندھیرا چھا رہا تھا۔ اور تب اس کی نگاہ روش پہ پڑی جہاں سے ابھی ابھی ولید کی گاڑی گزری تھی۔ صرف ایک لمحہ لگا اس کے دماغ کو سامنے نظر آتے منظر کو سمجھنے میں، اور دوسرے ہی پل اس کی ساری توانائی جیسے واپس آ گئی۔ وہ بدحواس سی ہو کر بچی۔

”تایا ابا!“ قدرے لنگڑا کر چلتی وہ ان تک پہنچی۔ وہ زمین پہ گرے ہوئے تھے۔ ان کو چوٹ کس طرح سے لگی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی، مگر ان کا سر پھٹ گیا تھا اور پیشانی سے سُرخ خون ابل رہا تھا۔ وہ نیم وا آنکھوں سے کرا رہے تھے۔

”تایا ابا..... تایا ابا.....!“ وہ وحشت سے انہیں سمجھوڑنے لگی۔ ظفر دوڑتے قدموں سے اس تک آیا تھا۔

”بڑے صاحب..... یا اللہ..... وہ آپ کو پکار رہے تھے، آپ سن نہیں رہی تھیں۔“ اس نے پریشانی سے حیا کو دیکھا پھر گڑبڑا کر چہرہ نیچے کر لیا۔

”ان کو گاڑی سے ٹکرائی ہے ظفر؟ اوہ خدایا! وہ مجھے بچاتے بچاتے۔“ شدت جذبات سے وہ کچھ بول نہیں پارہی تھی۔ اپنے ہاتھ اس نے تایا ابا کے ماتھے سے ابلتے خون پہ دبا کر رکھے تو لحوں میں ہاتھ گیلے، سُرخ ہو گئے۔ تایا بند ہوتی آنکھوں سے نقاب سے سانس لے رہے تھے۔

”وہ آپ کو آواز دے رہے تھے۔ آپ آگے سے نہیں نہیں تو وہ.....“ ظفر اسے پیش آنے والا واقعہ بتا رہا تھا مگر اس وقت یہ سب غیر ضروری تھا۔ بمشکل اس نے حواس مجتمع کر کے سوچنا چاہا کہ سب سے پہلے اسے کیا کرنا ہے۔

”ان کا..... ان کا خون بہہ رہا ہے۔ فرسٹ ایڈ باکس بھی نہیں ہے۔ کیا کروں۔“ اس نے پریشانی سے کہتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا۔ ظفر اس سے بھی زیادہ حواس باختہ لگ رہا تھا۔ آفس بلڈنگ بھی بند ہو گئی تھی۔ نہ ہوتی تب بھی یہ جگہ بلڈنگ کی پشت پہ تھی۔ آس پاس کوئی نہیں تھا جسے مدد کے لیے بلا پائی۔

”جاؤ دیکھو، گاڑی میں کوئی کپڑا ہے تو لے آؤ۔ پہلے ان کا خون روکنا ہے، پھر ہسپتال لے چلتے ہیں۔“

”ہاں نہیں جی! آپ کی گاڑی ہے، کدھر رکھا ہوگا آپ نے؟“ وہ دیکھ کر واپس آیا اور شدید بدحواسی کے عالم میں بھی اپنے قدموں کو

دیکھتے ہوئے بتا رہی۔

”اوہ خدایا..... میں کیا کروں؟“ اس نے گردن ادھر ادھر گھمائی۔ اس کا سیاہ پرس سیڑھیوں کے قریب گر پڑا تھا۔

”ظفر!“ اس نے پکارا، مگر وہ نیچے دیکھتا رہا۔

”ظفر، میری بات سنو!“ وہ دبی دبی چلائی۔

”پہلے سی منہ تے ڈھکو۔“ وہ ہکا گیا تھا۔

”افو! میری بات سنو۔ جاؤ میرا پرس اٹھا کر لاؤ۔“ کہنے کے ساتھ ہی ظفر اٹھا اور بھاگ کر اس کا پرس لے آیا۔ پرس میں کچھ بھی ایسا نہ تھا۔ تایا کے سانس کی ہلکی ہوتی آوازیں وہی سنائی دے رہی تھیں۔ خدایا! وہ کیا کرے۔ زخم شاید بہت بڑا نہ تھا، مگر بڑھاپے کو پہنچتی عمر میں یوں گرنا بہت تشویش ناک تھا۔

”تایا! پلینز آنکھیں کھولیں۔ ہم آپ کو ہسپتال لے کر جا رہے ہیں۔ مگر پلینز آنکھیں کھولیں۔“ تایا فرقان نے ذرا کی ذرا آنکھیں کھولیں اور سر کے اثبات سے جتنا چاہا کہ وہ ٹھیک ہیں، پھر آنکھیں بند کر دیں۔ وہ ان کا اہل خون کیسے روکے۔ عیاں کرنے والی لڑکیوں کی اکثریت کی طرح وہ عیاں کے نیچے دو پٹانیں جیتی تھی، سو کچھ بھی نہیں تھا کہ تایا کے زخم پہ رکھتی.... مگر نہیں۔ اس نے تیزی سے تایا کے ماتھے سے ہاتھ ہٹایا، اپنی اسٹول کی پن جھنجھی اور اسے سر سے اتارا۔ کچر میں جملے بالوں کا جوڑا ڈھیلا ہو کر گردن کی پشت پہ آگرا۔ چہرے کے گرد سے لٹس نکل کر اطراف میں جھولنے لگیں۔

تایا نے نیم وا آنکھوں سے اسے دیکھا۔ اس نے سیاہ کپڑے کو جلدی جلدی گول مول لپیٹ کر ان کے ماتھے کے زخم پہ دبا کر رکھا۔ تایا نے کرب سے آنکھیں بند کر لیں۔

”ظفر! گاڑی ادھر لے آؤ۔ ان کو جلدی سے ہسپتال لے چلتے ہیں؟“ اس نے ایک ہاتھ سے تایا کے زخم کو کپڑے سے دبائے، سر اٹھا کر ظفر کو دیکھا۔ وہ ہکا بکا سا اسے دیکھ رہا تھا۔

”ظفر! گاڑی ادھر لے کر آؤ۔“ وہ غصے سے زور سے چلائی۔ وہ اسپرنگ کی طرح اچھل کر کھڑا ہوا اور گاڑی کی طرف بھاگا۔ چند ہی لمحوں بعد وہ دونوں تایا کو سہارا دے کر کار میں ڈال رہے تھے۔

”فرخ کہاں ہے۔ کیا وہ گھر پہ تھا؟“ کار میں بیٹھے ہوئے اسے تایا کے دوسرے نمبر کے... بیٹے کا خیال آیا جو ہاؤس جاب کر رہا تھا۔

”نہیں جی، فرخ بھائی کی آج کال تھی۔ وہ ہسپتال میں ہیں۔“ ظفر نے کار اشارت کرتے ہوئے بے چینی سے بیک ویو مر میں اس کو دیکھا۔

”ٹھیک ہے ہسپتال لے چلو۔ جلدی کرو۔“ وہ پچھلی سیٹ پہ تایا کے ساتھ بیٹھی ابھی تک ان کے زخم کو سیاہ کپڑے سے دبائے ہوئے تھی۔

”مگر باجی! آپ ایسے کیسے جاسیں گی؟“ ظفر کو تایا سے زیادہ اس کی فکر تھی۔

”افو، جو کہا ہے کہ کرو.... تیز چلاؤ گاڑی۔“ ظفر چپ ہو گیا مگر وہ بے حد غیر آرام دہ تھا۔ چند ہی منٹ بعد اس نے کار گھر کے گیٹ کے سامنے روکی۔ حیانے چونک کر اسے دیکھا۔ گھر ہسپتال کے راستے میں ہی تھا مگر انہیں وہاں کرنا نہیں تھا۔

”ایک منٹ باجی، میں آیا۔“

”ظفر! وہ اچنبھے سے آوازیں دیتی رہ گئی وہ مگر گیٹ کے اندر جا چکا تھا۔

پورا منٹ بھی نہیں گزرا جب وہ دوڑتا ہوا واپس آیا۔ ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھا، دروازہ بند کیا، ایک دو پٹا اس کی طرف اچھالا اور کار اشارت کر دی۔

”اوہ ظفر!“ اس نے جیسے تھک کر نفی میں سر ہلایا پھر تہہ شدہ سفید دو پٹا کھولا اور پلیٹ کر سر پہ لے لیا۔ وہ صاعکہ تانی کا دو پٹا تھا، وہ پچپاتی تھی۔ تایا نیم وا آنکھوں سے اسے ہی دیکھ رہے تھے۔

”اتنا وقت دو پٹالانے میں ضائع کر دیا تم نے۔ خیر ظفر! میں ایسے ہی چلی جاتی۔“

جواب میں ظفر نے ہولے سے سر جھکا۔

”دو خاندانوں میں دوخت ڈال کر اب جیبا جتی کتنی ہیں کہ میں ایسے ہی چلی جاتی۔“ زرباب وہ فحش سے بڑبڑایا تھا۔ اسے ایک دم زور سے ہنسی آئی مگر بمشکل وہ دبا گئی۔ اس بدتمیز ظفر کو تو وہ بعد میں پوچھے گی۔

فرخ ہسپتال میں ہی تھا۔ تایا کو فوری طور پہ داخل کر لیا گیا۔ انہیں کار سے نکل نہیں سکتی تھی، بس اسے آگے دھکیلتے وہ خود بھی توازن برقرار نہیں رکھ پائے تھے۔ معمر آدمی کے لیے گرنا ہی بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ مگر فرخ کا کہنا تھا کہ اتنی تشویش کی کوئی بات نہیں معمولی چوٹیں ہیں، ٹھیک

ہو جائیں گی۔

ایک تو جانتیں ان ڈاکٹر زکواسے بڑے پتے پہ چڑھا کر لے کر کے بعد بھی اچھے خاصے زخم بھی کیوں تلتے ہیں۔
 ”گھرفن مت کرنا ابھی۔ سب خواہواہ پریشان ہو جائیں گے۔ ویسے بھی نائے لگوا کر ان کو گھر لے جائیں گے اور تمہیں تو چوٹ نہیں آئی؟“ فرخ اسے بتایا اب کی حالت کے بارے میں بتانے کے بعد مڑنے لگا تو ایک دم جیسے اسے خیال آیا۔
 ”نہیں! میں ٹھیک ہوں۔ تھینک یو!“ اس نے نہیں بتایا کہ اس کا دایاں گھٹنا اور پاؤں ڈھک رہا ہے۔ وہ جہاں سکندر کی بیوی تھی۔ اتنے معمولی زخموں کو لے کر کیوں پریشان ہوتی۔ جہاں..... پتائیں۔ کہاں تھا اس نے کب بتایا کہ وہ کدھر جا رہا ہے؟ اس کا ذہن پھر اس نچ پہ بھٹکنے لگا تب ہی فرخ نے کہا۔

”تم ظفر کے ساتھ گھر چلی جاؤ، اب آخریت سے ہیں۔“ اس نے شانگلی سے پٹیشن کی تھی۔ ایک زمانے میں وہ صائمہ تائی کے بقول اس کو پسند کرتا تھا مگر جب سے وہ ترکی سے آئی تھی اس کے پردے کے باعث یا پھر جہاں کی آمد کے باعث دھچکا ہو گیا تھا۔
 ”میں بتایا تو یہاں چھوڑ کر کیسے جاسکتی ہوں۔ میں تم لوگوں کے ساتھ ہی جاؤں گی۔“
 فرخ گہری سانس لے کر آگے بڑھ گیا۔ اباکو اس نے وہیں سے کال کر کے اطلاع دے دی تھی۔ یہ بھی کہہ دیا کہ ابھی کسی کو مت بتائیں۔ ذیشان انکل اباکے ساتھ ہی گھر پہ تھے۔ انہوں نے اباکو بتایا تھا کہ حیا صبح ان کے آفس آئی تھی مگر جلدی واپس چلی گئی۔ اس نے بے اختیار ماتھے کو چھوا۔ کیا وہ آج کا ہی دن تھا؟ یوں لگتا تھا کہ اس بات کو صدیاں بیت گئیں۔
 ”اوہ! اب! ان سے معذرت کر لیں۔ مجھے کچھ کام یاد آ گیا تھا۔“

پھر اس نے ان دونوں کو ولید کے متعلق بتایا۔ وہ کوئی چھوٹی بات تو نہیں تھی۔ اقدام قتل تھا اور زد میں تیا فرقان اصغر بھی آئے تھے۔ اباکا غم و غصے سے برا حال تھا۔ اس نے انہیں خود آئے اور گھر میں سے کسی کو بھی بتانے سے منع کر دیا کہ وہ لوگ بس واپس آ ہی رہے تھے۔
 رات ابھی زیادہ گہری نہیں ہوئی تھی جب وہ فرخ اور ظفر کے ساتھ تیا اباکو لے کر گھر پہنچے۔ تیا چل سکتے تھے، مگر سہارا لے کر۔ ایک طرف سے ان کو فرخ نے سہارا دے رکھا تھا۔ دوسری طرف سے حیا نے ان کا بازو تھام رکھا تھا۔ گھر کے داخلی دروازے پہ وہ بے اختیار رکی۔
 ایک دم سے بہت کچھ یاد آیا تھا۔ وہ تو اس گھر میں داخل نہیں ہو سکتی تھی۔
 ”چلو! میں زیادہ کھڑا نہیں رہ سکتا؟“ تیا نے نقاہت بھری آواز میں اسے جیسے اکٹا کر ڈانٹا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بہت سا پانی جمع ہونے لگا۔ بمشکل جی کہہ کر وہ ان کے ہمراہ چوکھٹ کے اندر آئی۔
 لاؤنج میں بیٹھے تمام افراد چونک کر کھڑے ہوئے۔

اس نے سیاہ عبا پہ سفید ستاروں والے دوپٹے سے ترچھا سا نقاب لے رکھا تھا۔ ایک وہ رات تھی جب اسی جگہ سے تیا نے اسے سب کے سامنے بے عزت کر کے نکالا تھا۔ اور ایک آج کی رات تھی جب وہ اس حالت میں اس گھر میں داخل ہوئی تھی کہ اس کا ہاتھ تیا نے پکڑ رکھا تھا، تیا کا بیٹا ان کے ساتھ تھا اور اس نے جس دوپٹے سے نقاب لے رکھا تھا وہ صائمہ تائی کا تھا۔
 ”کیا ہوا فرخ..... حیا!“ صائمہ تائی، سوچنا بھی، ارم سب پریشانی سے دوڑے چلے آئے۔ فرخ سب کے سوالوں کے جواب دے رہا تھا۔ وہ بس خاموشی سے تیا کو سہارا دے کر ان کے کمرے تک لانے میں مدد دے رہی تھی۔ تیا ابانے بیڈ پہ لیٹنے تک اس کا ہاتھ تھامے رکھا تھا۔
 سارے گھر والے پریشان اور متاسف سے ان کے گرد جمع ہو چکے تھے۔ تیا لیٹ گئے تو اس نے نرمی سے اپنا ہاتھ علیحدہ کیا اور ان کا تکیہ درست کیا۔ تب انہوں نے پوچھا۔

”کیسے ہوا یہ سب؟“ صائمہ تائی پریشانی سے پوچھ رہی تھیں۔
 ”ولید لغاری نے ہمیں کار سے نکل ماری تھی اور وہ بھی جان بوجھ کر۔“
 ”کون ولید لغاری؟“ ارم ذرا حیرت سے چونکی۔
 ”کمپنی میں ہمارا شیئر ہولڈر ہے، غیر لغاری کا بیٹا۔“ تیا کی گردن تلے نیچے رکھتے وہ سب کے سوالوں کے جواب دے رہی تھی۔
 چونکہ وہ اس کمرے میں تھی، اس لیے فرخ خود ہی وہاں سے چلا گیا تھا۔

”حیا..... پانی!“ سب کو چھوڑ کر انہوں نے اسے مخاطب کیا۔ وہ تیزی سے باہر نکلی۔ کچن میں آ کر پہلے خود پانی پیا پھر ان کے لیے پانی

لے آئی۔

”ہیٹا..... تمہاری مثال!“ انہوں نے گلاس لیتے ہوئے نگاہت زدہ لہجے میں ایک لفظی استعارہ کیا۔ مثال سے مراد اس کی اسٹول تھی۔

اس نے سمجھ کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

”وہ میں نے کھلی تاپایا! استعمال کے لیے نئی اسٹول لے لوں گی، مگر اسے اپنے پاس رکھوں گی۔“ پھر وہ نم آنکھوں سے مسکرائی اور ان کا ہاتھ پکڑ کر وہ ان کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”میں اس اسٹول کو کبھی نہیں دھوؤں گی تاپایا! اس میں بہت کچھ ہے جو میرے لیے بہت قیمتی ہے۔“

تاپایا نے ہلکے سے مسکرا کر سر کو اثبات میں ذرا سی جنبش دی اور آنکھیں موند لیں۔

صائمہ تائی حق دق ان کے ہاتھ کو دیکھ رہی تھی۔ جو حیانے اپنے دونوں ہاتھوں میں تمام رکھا تھا۔ ان کی شاید سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہوا کیا ہے اور خود حیا شاید ساری زندگی اس لمحے کی، اس قیمتی لمحے کی وضاحت کسی کو نہیں دے سکتی تھی جو خاموشی سے آیا اور تھوڑے سے خون کا خراج لے کر اسے اس کا بہت کچھ لوٹا گیا۔ خون، جو واقعی پانی سے گاڑھا ہوتا ہے۔

تاپایا سو گئے تھے۔ پچھو، سلیمان صاحب اور فاطمہ تائی ابھی وہیں بیٹھی تھیں۔ ان سب کو ظفر فوراً بلالایا تھا۔ صائمہ تائی، داور بھائی، سونیا، بلکہ پورا گھر ہی جاگ رہا تھا۔ سب تاپا کے لیے پریشان تھے۔ ابا کا غصے سے بُرا حال تھا۔ وہ اب ہر ممکن طور پر ولید کو گرفتار کر دانا چاہتے تھے اور اس کے لیے کوششیں بھی کر رہے تھے۔ وہ اب تھک گئی تھی، وہ وہاں سے اٹھ آئی۔ کچن سے گزرتے ہوئے اس نے دیکھا، ظفر چائے کے برتن دھو رہا تھا۔ اسے آتے دیکھ کر اس نے سر مزید جھکا لیا۔

”سنو ظفر!“ وہ باہر جانے سے قبل ایک لمحے کور کی۔

ظفر نے سر جھکائے ہوئے ہی ”جی“ کہا۔ جیسے آج وہ اسے دیکھ لینے پر ابھی تک شرمندہ تھا۔

”ایک چیز ہوتی ہے جسے امیر جنسی پچوائیشن کہتے ہیں اور یقین کرو ہمیں اللہ تعالیٰ کو اپنی کسی بھی چیز پچوانے کی وضاحت دینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ ہمارے حالات، ہم سے زیادہ اچھے طریقے سے سمجھتا ہے۔ اس کی شریعت بھلے کتنی بھی سخت ہے۔ مگر اندھی نہیں ہے۔“

ظفر نے سمجھنے اور نہ سمجھنے کے مابین سر اثبات میں ہلا دیا۔

کمرے میں واپس آتے ہی اس نے دروازہ لاک کیا اور پرس سے فلیش نکالی۔ لیپ ٹاپ آن کر کے گھنٹوں پر رکھا، وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ کمرے میں روشنی مدھم تھی، سوا سکرین اس کے چہرے کو بھی چمکا رہی تھی۔

اس نے ویڈیو وہیں سے شروع کی جہاں سے چھوڑی تھی۔ ایک دو تین، پھر کتنی ہی دفعہ اس نے بار بار وہ فلم دیکھی۔

فجر کی اذان ہوئی تو جیسے وہ اس کے حصار سے نکلے۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ چکا تھا۔ بار بار ایک ہی بات کہ وہ اس کا کتنا خیال رکھا کرتا تھا۔ وہ کیوں کبھی یہ نہ جان سکی کہ نرم لہجہ والا میجر احمد ہی جہاں ہے۔ بس ایک دفعہ..... جب وہ دونوں چاندی کے محسوس کی طرح جھیل کے کنارے بیٹھے تھے، تب جس طرح جہاں نری سے اسے سمجھا رہا تھا، اسے کچھ یاد آیا تھا۔ میجر احمد کا انداز..... آواز بے حد مختلف سہی، مگر اس وقت اسے دونوں کا انداز بالکل ایک سا لگا تھا۔ پھر بھی وہ نہ جان سکی۔ جب وہ انخوا ہوئی تھی، تب ہوش کھونے سے قبل اس نے فون کال کی گھنٹی سنی تھی، وہ جہاں تھا جواسے کال کر رہا تھا تا کہ وہ اندازہ کر سکے کہ وہ کس کمرے میں تھی۔ پھر جب اس نے کسی کو اس روٹی کا سر دیوار سے مارتے ہوئے دیکھا تھا، تب وہ غموگمی میں ڈوبتی جا رہی تھی۔ وہ نہیں جان سکی کہ وہ وہاں تھا۔ اس کے پاس ہمیشہ کی طرح ایک فاصلے سے اس پر نظر رکھے ہوئے۔

اور ہالے نور اس کے ہوٹل میں کام کر چکی تھی، تب ہی وہ عبدالرحمن پاشا کے ذکر پر اتنی پٹی ہو جاتی تھی۔ ساری کڑیاں ملتی جا رہی تھیں۔

”جب تک آپ یہ باکس کھولیں گی، وہ شاید اس دنیا میں نہ رہے۔“

یہ پنگی نے کہا تھا اور تب اس نے جان بوجھ کر ایسے الفاظ استعمال کیے تھے جن سے وہ سمجھے کہ ڈو کی زندگی بے یقینی کا شکار ہے۔ وہ اپنے بارے میں ہر وقت ایسی باتیں کیوں کیا کرتا تھا؟ ہر وقت موت کے لیے، دنیا چھوڑنے کے لیے تیار..... جہاں سکندر رابیا کیوں تھا؟

”اور اب وہ کہاں تھا؟“

ایک دم وہ چونک کر اٹھی۔ ہاں، بھلا اب وہ کہاں تھا۔ یہ ویڈیو ذرا پرانی تھی، اس میں بہت سی چیزوں کی وضاحت نہیں تھی، مگر وہ سب

اس وقت بے معنی تھا۔ اہم بات یہ تھی کہ وہ اس وقت کہاں تھا۔ اس نے فون نکالا اور اس کا بہ نمبر ٹرائی کیا جو وہ جانتی تھی مگر سب بند تھے۔

”شاید پچھو کو کچھ علم ہو۔“

وہ ابھی، وضو کر کے پہلے نماز پڑھی، پھر باہر چلی آئی۔ دایاں پاؤں ٹخنے اور ایڑی کے قریب سے بہت در در کر رہا تھا۔ شاید موج آئی تھی، مگر ابھی اپنی باندھنے کا مطلب اماں یا ابا کو اسے ترکی جانے سے روکنے کا بہانہ دینا تھا۔ پھپھو اپنے کمرے میں نماز پڑھ رہی تھیں۔ وہ ان کے قریب کاؤچ پر بیٹھ کر ان کو دیکھ گئی۔ وہ چہرہ ہاتھ میں چھپائے دعا مانگ رہی تھیں۔ شاید وہ اپنے بیٹے کی سلامتی مانگ رہی تھیں۔ اس کا دل جیسے ڈوب کر ابھرا۔

”ارے! تم کب سے یہاں بیٹھی ہو۔ پتا ہی نہیں چلا۔“ چہرے پر ہاتھ پھیر کر انہوں نے سر اٹھایا تو اسے دیکھ کر جیسے خوش گوار حیرت ہوئی۔

”آپ سے کچھ بات کرنی تھی پھپھو!“ وہ بولی تو اس کی آواز مدھم تھی۔ ”کیا آپ جانتی ہیں جہان کدھر ہے؟“

”وہ مجھے کبھی نہیں بتایا کرتا مگر.....“ وہ ذرا رکھیں۔ ”جانے۔“ سے پہلے اس نے کہا تھا کہ اس نے تمہیں بتا دیا ہے کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔“

”اچھا!“ اس نے انہیں سے انہیں دیکھا۔ ”اس نے کسی اور سے بھی یہی بات کہی تھی، مگر مجھے تو ایسا کچھ یاد نہیں کہ.....“ کہتے کہتے وہ ایک دم رکی۔ ایک جھماکے سے اسے یاد آیا۔ ”لندن“ وہ کتنی ہی دفعہ لندن جانے کی بات کر چکا تھا۔ وہ لندن میں تھا۔ یقیناً وہ ہیں تھا۔

”اوہ! اس نے واقعی مجھے بتایا تھا۔“ اس نے جیسے اپنی کم عقلی پر فحش سے سر ہلایا۔ ”مگر اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ واپس کب آئے گا۔“

”کہہ رہا تھا ایک آخری کام ہے، پھر وہ ترکی چھوڑ دے گا۔“ پھپھو احتیاط سے الفاظ کا چناؤ کر رہی تھیں، جیسے انہیں اندازہ نہ تھا کہ وہ کتنا جانتی ہے۔

”مجھے جانا ہے استنبول کیمینس کروانے، میں یہ کام کر کے اسے ضرور ڈھونڈوں گی پھپھو! آپ دیکھیے گا۔ میں اسے واپس لے آؤں گی۔“

”حیا! اللہ پر توکل کرو اور آرام سے بیٹھ کر انتظار کرو، وہ آ ہی جائے گا۔“

”نہیں پھپھو!“ اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ”ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جانا توکل نہیں، سستی ہوتی ہے۔ میں اس کو ڈھونڈنے ضرور جاؤں گی۔“ وہ کھڑی ہوئی اور سستے ہوئے چہرے کے ساتھ ذرا سا مسکرائی۔

”ہر دفعہ وہ میرے پیچھے آیا کرتا تھا۔ ایک دفعہ میں چلی جاؤں گی تو اس میں بُرا کیا ہے۔“

جاتے جاتے وہ ایک لمحے کو رکی۔ ”پھپھو ابا اور تایا لوگوں نے آپ کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔“

پھپھو کے چہرے پر حیرت ابھری، پھر جیسے انہوں نے سمجھ کر سر جھٹکا۔

”یہ جہان نے کہا ہو گا تم سے۔ پتا نہیں میرا بیٹا اتنی پرانی باتیں یاد کیوں رکھتا ہے؟ تم اس کی مت سنو، وہ ایسے ہی کہتا رہتا ہے۔“

”اگر اسے پتا چلے کہ آپ نے یہ کہا تو وہ کیا کہے گا؟“

”وہ کہے گا، میری مٹی کی مت سنا کرو، وہ ایسے ہی بولتی رہتی ہیں۔“ وہ ہلکے سے مسکرا دی۔ اسے یقین تھا، جہان پھپھو کے بارے میں کبھی ایسے نہیں کہہ سکتا تھا۔



ناشتے کی میز پر اماں نے سرسری سے انداز میں یہ بات اسے تب بتائی جب پھپھو اور ابا ٹھہ چکے تھے۔

”کل دوپہر عابدہ بھابھی آئی تھیں۔“

”پھر؟“ وہ جو کانٹے میں آلیٹ کا کٹڑا پھنسا رہی تھی، سر اٹھا کر انہیں دیکھنے لگی۔

”وہ رضا کے لیے تمہارا رشتہ مانگ رہی تھیں۔“

نوالہ اس کے حلق میں انک گیا۔ اسے لگا اس نے غلط سنا ہے۔

”میرا رشتہ۔ آریو سیریس؟“ وہ بے یقینی سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

”جب تم اپنی خواہو اوکی ضد کے پیچھے جہان کو یوں اپنی زندگی سے نکالو گی تو لوگ یہی کہیں گے نا۔“

وہ چمکا کر رہ گئی۔ جہان اس وجہ سے نہیں گیا تھا۔ وہ جانتی تھی مگر باقی سب تو نہیں جانتے تھے۔ ان کے ذہن ارم کی اس بڑھا چڑھا کر کی گئی بات میں انکے تھے۔ دل تو چاہا، اگر رضا سامنے ہوتا تو کچھ اٹھا کر اسے دے مارتی اور.....

”اف.....“ اس نے سر جھٹکا۔ اسے کبھی محسوس نہیں ہوا تھا کہ وہ چیزیں اٹھا کر دے مارنے کی کتنی شوقین تھی اور وہ کتنی جلدی جان گیا تھا۔

اب مزید اس سے کچھ نہیں کھایا جاتا تھا۔ اس نے پلیٹ پرے کر دی۔

”عابدہ چچی سے کہیے گا، آئندہ ایسی بات سوچیں بھی مت۔ لوگوں کو میرا اور جہان کا رشتہ بھلے کمزور لگتا ہو مگر ہمارا رشتہ بہت مضبوط ہے اماں!“

”شیورا! اماں نے جیسے اکتا کر سر جھٹکا۔ وہ وہاں سے اٹھ آئی۔

ساری رات کی بے خوابی، وہ وہیو، تاتیا کا ایکسیڈنٹ اور پھر عابدہ چچی کا یہ قصہ۔ اس کا سر درد کرنے لگا تھا۔ ارم درست کہہ رہی تھی۔ وہ لوگ جان بوجھ کر اس کے نکاح کو کمزور ثابت کرنے پہ تلے تھے۔

آج اسے آفس نہیں جانا تھا۔ اب آج خود آفس گئے تھے۔ وہ اب بہت بہتر محسوس کر رہے تھے۔ پتا نہیں ولید کے خلاف ایف آئی آر کا کیا بنا۔ کاش جہان نے اس کے سر پر فرائی پان کی جگہ پورا پریشر مگر دے مارا ہوتا تو کتنا اچھا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس نے ابا کے آفس کے دروازے پہ بدھم سی دھک دے کر اسے دھکیلا۔ وہ سامنے اپنی میز کے پیچھے بیٹھے فائلز کی درق مروانی کر رہے تھے۔ آہٹ یہ سراٹھا کر اسے دیکھا اور ہلکا سا مسکرائے۔ بیماری نے انہیں کافی کمزور اور زور کر دیا تھا۔

”آؤ بیٹھو۔“ انہوں نے سامنے کرسی کی جانب اشارہ کیا۔ وہ سیدھ میں چلتی ان کے مقابل کرسی تک آئی، پرس میز پہ رکھا اور کرسی پہ ٹانگ پہ ٹانگ رکھ کر بیٹھ گئی۔

”مارکیٹنگ فنڈ میں سے کتنی کس نے کی ہے؟“ انہوں نے سامنے کھلی فائل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ وہ اس کی کارکردگی دیکھ رہے تھے اور یقیناً انہیں اس میں بہت سی غلطیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ ”اور کیا ضرورت تھی شیئر ہولڈرز کو سالانہ dividend دینے کی؟“

”ڈائریسٹ! ایک تو میں نے بغیر تنخواہ کے اتنے دن کام کیا اور پرے ڈانٹ بھی مجھے ہی پڑے گی۔“ دو انگلیوں سے نقاب ناک سے ٹھوڑی تک اتارتے ہوئے وہ غصے سے بولی۔

”ڈائریسٹ! احسان جتانے سے ضائع ہو جایا کرتے ہیں۔“ وہ مسکرائے تھے۔

”رہنے دیں ابا! اچھا بتائیں، ولید کی ایف آئی آر کا کیا بنا؟“

”وہ پولیس کو نہیں مل رہا۔ اس کا باپ اس کو گرفتار نہیں ہونے دے گا۔ بہر حال! میں اس کو ایسے نہیں جانے دوں گا۔“ ایک دم وہ سنجیدہ نظر آنے لگے تھے۔ ”لیکن اس وقت میں نے تمہیں کسی اور بات کے لیے بلایا ہے۔“

”جی کہیے۔“ اس کا دل زور سے دھڑکا۔ ابا اپنی بیماری کے باعث بہت سے معاملات سے دور رہے تھے مگر پھر بھی ان کے کانوں تک بہت کچھ پہنچ گیا تھا یقیناً اور بلا آخر انہوں نے حیا سے دو ٹوک بات کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

”یہ جہان صاحب واپس کیوں گئے ہیں؟“

”اسے کام تھا کچھ۔ آجائے گا کچھ دن میں واپس۔“

”صائمہ بھابھی کچھ اور کہہ رہی تھیں۔“ وہ اسے سوچتی لگا ہوں سے دیکھتے ہوئے بولے تھے۔ حیا نے لاپرواہی سے شانے پکائے۔

”صائمہ تائی تو ہماری دادی بھی ساری عمر یہی الزام لگاتی رہی تھیں کہ وہ ان پہ جادو کرواتا ہیں۔ اگر صائمہ تائی کا جہان کے بارے میں تجزیہ درست مانا جائے تو دادی والا بھی درست مانا جانا چاہیے؟“ وہ بھی حیا تھی۔ اس نے ہارٹے مانتے کا تہیہ کر رکھا تھا۔

”دیکھو! مجھے تمہارے اس برتنے وغیرہ سے کوئی مسئلہ نہیں ہے، مگر اس کی وجہ سے تم نے اپنے تایا اور اماں کو بہت ناراض کیا ہے۔ تمہیں چاہیے تھا کہ تم ان کی بات کا احترام کرتیں۔ بڑوں کا حکم ماننا فرض ہوتا ہے۔“ وہ چند لمحے سوچتی لگا ہوں سے انہیں دیکھتی رہی، پھر کہنے لگی۔

”ابا! آپ کو ایک بات بتاؤں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن خطاب نے اپنے بیٹے عبداللہ سے کہا تھا کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دیں۔ ابن عمرؓ نے ایسا نہیں کیا۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کا علم ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن عمرؓ سے فرمایا کہ بیوی کو طلاق دے دو۔ یوں عبداللہ بن عمرؓ نے اپنے والد کی بات کا احترام کرتے ہوئے بیوی کو طلاق دے دی۔“ وہ لحظے بھر کو رکی۔ سلیمان صاحب سیٹ سے ٹیک لگائے، ایک ہاتھ میں چین گھما تے غور سے اسے سن رہے تھے۔

”پھر ہوا یہ کہ عمرؓ بعد ایک شخص امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور ان سے کہا کہ میرا باپ چاہتا ہے، میں اپنی بیوی کو

طلاق دے دوں۔ امام احمد رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ایسا ہرگز مت کرنا۔ اس شخص نے جواب میں یہ واقعہ بیان کیا کہ عمر رضی اللہ عنہ بن خطاب کے کہنے پر ان کے بیٹے نے تو انہی بیوی کو طلاق دے دی تھی۔ پھر مجھے کیوں ایسا نہیں کرنا چاہیے؟ اب!..... آپ جانتے ہیں اس پہ امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ نے اس شخص سے کیا کہا؟

”کیا۔“ وہ بے اختیار بولے۔ حیا بلکہ سے مسکرائی۔

”انہوں نے کہا، کیا تمہارا باپ عمر جیسا ہے؟“

آفس میں ایک دم خاموشی چھا گئی۔ صرف گھڑی کی سوئیوں کی ٹنگ ٹنگ سنائی دے رہی تھی۔

”ویل!.....“ ابانے ہولے سے سر جھکا۔ ”تم ایل ایل بی اسٹوڈنٹ ہو، میں تم سے بحث میں جیت نہیں سکتا۔ میں صرف اتنا جانتا چاہتا ہوں کہ تم نے خلع کے بارے میں سوچا ہے؟“ اس کا جیسے کسی نے سانس بند کر دیا۔ وہ لمحے بھر کوشش ہی رہ گئی۔

”تمہیں یاد ہے میں نے ترکی جانے سے قبل بھی تم سے ایسی ہی بات کی تھی؟“

”جی مجھے یاد ہے۔“ چند ثانیے بعد وہ بولی تو اس کا لہجہ بے تاثر ہو گیا تھا۔ ”اور تب میں نے آپ سے یہی کہا تھا کہ مجھے ترکی جانے دیں اگر وہاں جا کر مجھے لگا کہ وہ لوگ طلاق چاہتے ہیں تو میں اس رشتے کو وہیں ختم کر دوں گی۔“

”تو پھر؟“

”اب! ہمارے درمیان۔ یہی ذیل ہوئی تھی کہ ترکی سے واپسی تک آپ مجھے نام دیں گے۔“

”اور اب عرصہ ہوا..... تم واپس آ چکی ہو۔“

”میں واپس نہیں آئی۔“ فیصلی مجھے ابھی ترکی سے واپسی کی کیئرٹس نہیں ملی۔ پرسوں میں استنبول جا رہی ہوں، واپسی پہ ہم اس بات کو ڈسکس کریں گے۔“ وہ بہت اعتماد سے کہہ رہی تھی۔ اباشفق نہیں تھے مگر پھر بھی جیسے وقتی طور پہ خاموش ہو گئے۔

”اب! وہ..... ایک اور بات ابھی تھی۔“ بہت کر کے اس نے کہنا شروع کیا۔ ”میں سوچ رہی تھی کہ اگر کیئرٹس کروانے کے بعد میں لندن چلی جاؤں۔ زیادہ نہیں، بس ایک ہفتے کے لیے۔ میں صرف لندن دیکھنا چاہتی ہوں، پھر۔“

”کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آپ زیادہ ہی ان ڈیپنڈنٹ ہوئی جا رہی ہیں، مجھے آپ کو ذرا کھینچ کر رکھنا پڑے گا۔“ وہ لمحے بھر میں روایتی

ابا بن گئے۔

”ابا بلیر!“ اس کا لہجہ ملتی ہوئی۔

”کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کیئرٹس کروا کر سیدھا آپ واپس آئیں گی۔ جتنا گھومنا ہے استنبول میں گھوم لو۔ ترکی کے کسی اور شہر جانا ہو تو بے شک چلی جاؤ، مگر اکیلے نہیں، فریئڈز کے گروپ کے ساتھ جانا۔ لندن وغیرہ جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“

”لیکن صرف ایک ہفتے.....“

”حیا! تم نے سن لیا جو میں نے کہا۔“ ان کا لہجہ نرم تھا، مگر ابرو اٹھا کر تنبیہ کرتا انداز سخت تھا۔ وہ خفگی سے ”جی“ کہہ کر اٹھ گئی۔

☆ ☆ ☆

وہ آج پھر یونیورسٹی چلی آئی تھی۔ ڈاکٹر ابراہیم سے اس نے آج وقت نہیں لیا تھا مگر پھر بھی وہ اسے اپنے آفس میں مل گئے۔

”آپ نے ٹھیک کہا تھا سہرا! ہمیں لوگوں کو وقت دینا چاہیے۔“ ان کے بالمقابل بیٹھی وہ آج بہت سکون سے کہہ رہی تھی اور وہ اسی توجہ سے اسے سن رہے تھے۔ سامنے اس کے لیے منگوا کر رکھی کافی کی سطح سے دھوئیں کے مرغولے اٹھ کر فضا میں گم ہو رہے تھے۔ ان کے آفس کا خاموش، پرسکون ماحول اس کے اعصاب کو ریلیکس کر رہا تھا۔

یقین کریں سہرا! لوگ شروع میں آپ کے حجاب کی جتنی مخالفت کر لیں، ایک وقت آتا ہے کہ وہ اسے قبول کر لیتے ہیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ آپ کو اس میں قبول کر لیتے ہیں۔ چاہے انہیں تب بھی حجاب اتنا ہی ناپسند کیوں نہ ہو جتنا پہلے تھا۔ اب مجھے یقین آ گیا ہے کہ آہستہ آہستہ سارے مسئلے حل ہو جاتے ہیں۔“

”بالکل۔“ انہوں نے مسکرا کر دھیر سے اس بات میں سہرا کو تائید کی۔

مگر سہرا! میں جب اپنے مسئلوں سے گھبرا گئی تو آپ کے پاس آئی اور تب میں نے آپ سے کہا تھا کہ یہ ”تواصو بالصبر“ انسانوں کو

انسانوں سے ہی چاہیے ہوتا ہے۔ آپ نے میری بات کی تائید کی تھی رائٹ؟“

”جی ہاں“ وہ پوری توجہ سے سن رہے تھے۔

”پھر سر! یہ کہ میری پھپھو کہتی ہیں، انسان کو اپنے مسئلہ دوسروں کے سامنے نہیں بیان کرنے چاہئیں۔ جو شخص ایسا کرتا ہے وہ خود کو بے عزت کرتا ہے۔ کیا ایسا ہی ہے سر! کیا ہمیں اپنے مسئلے کسی سے شیئر نہیں کرنے چاہئیں؟“

وہ اپنی کافی کی سطح پر آ کر جھاگ کو دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی جس میں مختلف اشکال نظر آ رہی تھیں۔

”مگر پھر ہم“ تو اصو بلمصر“ کیسے کریں گے سر؟“ جہان کی طرف کی روداد سننے کے بعد یہ سوال اس کے ذہن میں انک کر رہ گیا تھا۔

”آپ کی پھپھو ٹوئک کہتی ہیں۔ سوال کرنا یعنی کسی کے آگے ہاتھ پھیلا نا، بھلے وہ ہمدردی لینے کے لیے ہی ہو، ہر حال میں ناپسندیدہ ہوتا ہے۔ انسان کو واقعی اپنے مسئلہ اپنے تک رکھنے چاہئیں۔ دنیا کو اپنی پراہم سائڈ دکھانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اپنے مسئلے کا واقعی اشتہار نہیں لگایا کرتے۔ مگر.....“ وہ لفظ بھر کر کے۔

وہ نامحسوس طریقے سے کرسی پر آگے کو ہونٹی۔ اسے اسی ”مگر“ کا انتظار تھا۔

”مگر انسان پہ ہر وقت ایک سائینس نہیں رہتا میرے بچے! وقت بدلتا ہے۔ مسئلے بھی بدلتے ہیں۔ بعض دفعہ انسان ایسی پھوٹیشن میں گرفتار ہو جاتا ہے جس سے وہ پہلے کبھی نہیں گزرا ہوتا۔ تب اسے چاہیے کہ اپنے مسئلے کا حل کسی سے پوچھ لے۔ انسان کو صرف تب اپنے پراہم شیئر کرنے چاہئیں جب اس کو واقعی اپنے پاس سے ان کا حل نہ ملے۔ کوئی ایک دوست، ایک ٹیچر یا پھر کوئی اجنبی، کسی ایک بندے کے سامنے اپنے دل کی بھڑاس نکال دینے میں کوئی حرج نہیں ہوتا جو واقعاً ”تو اصو بلمصر“ کرے۔ ہاں! لیکن ایک بات یاد رکھیں۔ اس شخص کو کبھی اپنی میسائجی نہ بنائیں۔ آپ کو ہر کچھ دن بعد کسی کے کندھے پر رونے کی عادت نہیں ڈالنی چاہیے۔ دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ سے بہتر ہوتا ہے۔ ہر وقت دوسروں سے تسلی لینے کے بجائے بہتر ہے کہ ہم تسلی دینے والے بنیں۔ ”تو اصو بلمصر“ صبر کی تلقین دینے کا نام ہوتا ہے، ہر وقت لیتے رہنے کا نہیں۔“

اس نے سمجھ کر سر ہلادیا۔ اس کی کافی اب ٹھنڈی پڑتی جا رہی تھی، جھاگ کی اشکال چھٹی جا رہی تھیں۔ اسے خوشی تھی کہ آج وہ سر کے پاس پھر سے نئے مسئلے لے کر نہیں آئی تھی۔

”میں سمجھ گئی اور مجھے کچھ اور بھی بتانا تھا آپ کو۔“

اسے جیسے اسی جملے پر کچھ یاد آیا۔ ”آپ نے کہا تھا میں احزاب کی پہیلی میں کچھ مس کر گئی ہوں۔ میں نے اس بارے میں بہت سوچا،

پھر مجھے ایک خیال آیا۔“

”اچھا اور وہ کیا۔“ وہ دلچسپی سے کہتے ذرا آگے کو ہوئے۔

”سر! جنگ احزاب کے ختم ہونے کے بعد بنو قریظہ اپنے قلعوں میں جا چکے تھے۔ مسلمانوں نے ان کا تعاقب کیا اور ان کو جالیا۔ اگر بنو قریظہ کا فیصلہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پہ چھوڑا جاتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ سے زیادہ ان کو وہ جگہ چھوڑ دینے کا حکم دے دیتے، مگر ان کا فیصلہ سعد رضی اللہ عنہ پہ چھوڑا گیا جو قبیلہ اوس سے تھے۔ انہوں نے بنو قریظہ کا فیصلہ یہودی اپنی سزاؤں کے مطابق کیا یعنی کہ تمام مردوں کو ہمداری کے جرم میں قتل کیا جائے۔ یہ بنی اسرائیل کے ہاں ہمداری کی سزا تھی۔ کیا میں نے یہی بات مس کر دی کہ آخر میں بنو قریظہ کو ان کے اپنے ہی سزا دیتے ہیں۔“

ڈاکٹر ابراہیم مسکرا کر سر جھٹکتے ہوئے آگے کو ہوئے۔

”یہ آپ کہاں چلی گئیں۔ غزوہ بنو قریظہ جس کا آپ ذکر کر رہی ہیں، یہ غزوہ احزاب کے بعد ہوئی تھی، یہ غزوہ احزاب کا حصہ نہیں تھی۔ آیت حجاب قرآن کی جس سورہ میں ہے اس کا نام احزاب ہے، بنو قریظہ نہیں۔ آپ کو احزاب کے دائرہ کار میں رہ کر اس کا جواب تلاش کرنا تھا۔“

”اچھا پھر! آپ مجھے بتادیں کہ میں کیا مس کر گئی ہوں۔“ اس نے غصے سے پوچھا۔ چنانچہ سر اس کو کیا دکھانا چاہتے تھے۔

”حیا! میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ سورہ احزاب اور حجاب میں مماثلت ہے۔ یہ آپ نے کہا تھا۔ آپ نے اسے پہیلی کہہ کر ایک چیلنج کے

طور پر قبول کیا تھا۔ سو آپ کو یہ پزل خود مکمل کرنا ہے۔“

”سر! تھوڑی بہت چیٹنگ تو جائز ہوتی ہے۔“

”ہرگز نہیں۔ اچھا کچھ کھائیں گی، آج تو میرے پاس ٹرکشن کینڈیز بھی نہیں ہیں۔“
”نہیں سر! بس یہ کافی بہت ہے، پھر میں چلوں گی۔ اگلی دفعہ میں آپ کے پاس اس پہیلی کا آخری ٹکڑا لے کر ہی آؤں گی۔“ وہ ایک عزم سے کہتی تھی۔

ڈاکٹر ابراہیم نے مسکرا کر سر کو جنبش دی۔ انہیں جیسے ابی اس ذہین اسٹوڈنٹ سے اسی بات کی امید تھی۔



یونیورسٹی کے فی میل کیمپس میں ایک دوسری لمبھ سے مل کر وہ انٹرنس بلاک سے نقلی تو سامنے ایک طویل روشنی جس کے اختتام پہ مین گیٹ تھا۔ اس نے گردن جھکا کر ایک نظر اپنے بیروں کو دیکھا جو سیاہ ہیل والی سینڈلز میں مقید تھے۔ ہیل کی اتنی عادت تھی کہ رکھتے پیر کے باوجود اس نے ہیل پہن لی تھی، مگر اب چل چل کر دایاں پاؤں ٹخنے اور ایڑی سے درد کر رہا تھا۔ وہ سر جھٹک کر تیز قدم اٹھانے لگی۔ طویل سڑک عبور کر کے وہ گیٹ سے باہر آئی تو کار سامنے ہی کھڑی تھی۔ ڈرائیور نے اسے آتے دیکھ کر فوراً پچھلی طرف کا دروازہ کھولا۔ وہ اندر بیٹھی اور دروازہ بند کر دیا۔ ڈرائیور الٹی بخش نے فوراً کار اشارت کر دی۔

ایچ ٹین کا وہ خالی خالی سا علاقہ تھا۔ یونیورسٹی کی حدود سے نکل کر کار اب مین روڈ پہ دوڑ رہی تھی۔ اطراف میں دور دور فیکٹریز، عمارتیں، یا انسٹی ٹیوٹس تھے۔ ابھی وہ زیادہ دور نہیں گئے تھے کہ اچانک الٹی بخش نے بریک لگائے۔ وہ جو ٹیک لگائے بیٹھی تھی، جھٹکے سے میکائی طور پہ ذرا آگے کو ہوئی۔

”کیا ہوا؟“

”یہ گاڑی سامنے آگئی۔“ الفاظ الٹی بخش کے لبوں پہ ہی تھے کہ حیانے ونڈ اسکرین کے پار اس منظر کو دیکھا۔ وہ چمکتی ہوئی سیاہ اکارڈ ایک دم سے سامنے آئی تھی۔ یوں کہ ان کا راستہ بلاک ہو گیا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ سے سیاہ سوٹ میں ملبوس شخص نکل کر تیزی سے ان کی جانب آیا تھا۔ حیا یک نکل اس سیاہ اکارڈ کو دیکھ رہی تھی۔ وہ اس گاڑی کو پہچانتی تھی۔ اس گاڑی نے تا یا فرقان کو نگر ماری تھی۔

ولید اس کے دروازے سے چند قدم ہی دور تھا۔ غصے کا ایک ابال اس کے اندر اٹھنے لگا۔

”الٹی بخش! جلدی سے ابا کو فون کرو اور بتاؤ کہ ولید نے ہمارا راستہ روکا ہے۔ میں تب تک اس سے ذرا بات کر لوں۔“ وہ دروازہ کھول کر باہر نکلی۔ ولید اس کے سامنے آکھڑا ہوا تھا۔ چہرے پہ طیش، آنکھوں میں تنفر۔

اس نے کن اکھیوں سے گاڑی میں بیٹھے الٹی بخش کو نمبر ملاتے دیکھا۔

”میرا خیال تھا آپ ملک سے فرار ہو چکے ہیں، مگر نہیں آپ تو یہیں ہیں۔“ بہت اطمینان اور سکون سے کہتی وہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔ ”خیر چند دن کا تیش ہے مسز لغاری! پھر آپ کو اقدام قتل کے کیس کا سامنا کرنا ہی ہوگا۔“

”میری بات سنو!“ ایک ہاتھ کار کی چھت پہ رکھے، دوسرے ہاتھ کی انگلی سے تنبیہ کرتا وہ بہت طیش کے عالم میں کہہ رہا تھا۔ ”تم اس مقدمے میں میرے خلاف ایک لفظ نہیں کہو گی۔ یہ ایک ایکسیڈنٹ تھا، اور تم اپنے بیان میں یہی کہو گی۔“

”میں بیان دے چکی ہوں اور تم نامزد ملزم ٹھہرائے جا چکے ہو۔“

”اپنی بکواس اپنے پاس رکھو۔ جو میں کہہ رہا ہوں، تم وہی کرو گی۔ تم یہ مقدمہ فوراً واپس لے رہی ہو، نتائج؟“ وہ بلند آواز سے بولا تھا۔ الٹی بخش فون کان سے ہٹا کر دوبارہ نمبر ملارہا تھا۔ شاید رابطہ بن گیا ہو یا رہا تھا۔

”اور اگر میں ایسا نہ کروں تو تم کیا کرو گے؟ مجھے دوبارہ اپنی گاڑی کے نیچے دینے کی کوشش کرو گے؟“ اس نے استہزاء سے سر جھٹکا۔

ولید چند لمحے سلب سمجھنے اسے دیکھتا رہا، پھر ایک طنزیہ مسکراہٹ اس کے لبوں کو چھو گئی۔

”میرے پاس تمہارے لیے اس سے بھی بہتر مل موجود ہے۔“

”اچھا اور وہ کیا ہے؟“ وہ اسی کے انداز میں بولی۔ اطراف سے گاڑیاں زن کی آواز کے ساتھ گزر رہی تھیں۔

ولید نے گاڑی کی چھت سے ہاتھ ہٹایا، جب سے اپنا موبائل نکالا، چند من پر پریس کیے اور پھر اس کی اسکرین حیا کے سامنے کی۔

”کیا اس منظر کو دیکھ کر کوئی کٹھنی بجی ہے ذہن میں؟“ ایک تپانے والی مسکراہٹ کے ساتھ وہ بولا تو حیانے ایک نگاہ اس کے موبائل

اسکرین پہ ڈالی، مگر پھر ہٹانا بھول گئی۔ ادھر ہی جم جی، منجد، شل، ساکت۔

”شریفوں کا مجرا“ اس ویڈیو کی جھلک۔ کسی نے کھولتا پیتل اس کے اوپر ڈال دیا تھا۔ اندر باہر آگ میں لپٹے گولے برسنے لگے تھے۔ بے یقینی سی بے یقینی۔

”نکل گئی نا کڑ۔ اب آئی ہونا اپنی اوقات پہ۔“ ولید نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے موبائل بند کر کے جیب میں ڈالا۔ نقاب سے جھلکتی اس کی سشدر ساکت آنکھیں ابھی تک وہیں جمی تھیں۔

”ذرا سوچو میں اس ویڈیو کے ساتھ کیا کیا کر سکتا ہوں۔“ وہ اب قدرے مسکرا کر کہہ رہا تھا۔ حیا کا شاک اسے سمجھانے کے لیے کافی تھا کہ تیرین نشانے پہ لگا ہے۔

”میں اسے اگر تمہارے خاندان کے سارے مردوں تک پہنچا دوں تو کیا ہوگا حیا بی بی! کبھی سوچا تم نے؟ کیا اب بھی تم میرا نام اس کیس میں لے سکو گی؟“

پھر اس نے مسکراتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔ ”ایسی غلطی مت کرنا ورنہ میں تمہیں کسی کومنہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑوں گا۔“ وہ جو آندھی طوفان کی طرح آتا تھا، کسی پُر سکون فاتح کی طرح واپس پلٹ گیا۔ اپنی کار میں بیٹھ کر اس نے دروازہ بند کیا۔ سائڈ مرر میں دیکھتے ہوئے ہاتھ ہلایا، سن گلاسز آنکھوں پہ لگائے اور گاڑی آگے بڑھا کر لے گیا۔

وہ ابھی تک شکل سی کار کے ساتھ کھڑی تھی۔ نقاب کے اندر لب ابھی تک ادھ کھلے اور آنکھوں کی پتلیاں ساکن تھیں۔ دل کی دھڑکن ہلکی ہو گئی تھی، جیسے کوئی لمبی پٹی کشی، سمندر کی گہرائی میں ڈوبتی چلی جا رہی ہو۔ نیچے نیچے اور نیچے نیچے..... گہرائی..... پاتال۔

”بڑے صاحب فون نہیں اٹھا رہے۔ اب کیا کرنا ہے میم؟“

الٹی بخش باہر نکل کر پوچھنے لگا۔ اس کا سارا جسم خٹکا پڑ گیا تھا۔ نیلا اور خٹکا۔ جیسے چاندی کے مجسمے کو کسی نے زہر دے دیا ہو۔

وہ گھر تک پہنچے، کیسے نیچے اتری، اسے ہوش نہ تھا۔ بہت چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے اندرونی دروازہ کھول کر اس نے لاؤنج میں قدم رکھا ہی تھا کہ سامنے کوئی کھڑ نظر آیا۔

بلیو جینز، سیاہی ٹی شرٹ، سنہری سپید رنگت، بڑی بڑی آنکھیں، وہ ہنستے ہوئے کسی سے بات کر رہا تھا، آہٹ پہ پلٹ کر حیا کو دیکھا جو میکا کی انداز میں نقاب ناک سے اتار کر ٹھوڑی تک لار رہی تھی۔

”یہ ہمارے گھر میں جامعہ حفصہ کہاں سے آ گیا؟“ وہ خوش گواریت کے زیر اثر بولا تھا۔ حیا نے دھیرے سے پلکیں جھپکائیں۔ اس کی آنکھوں نے اس شخص کا چہرہ اپنے اندر مقید کیا، پھر بصارت نے یہ پیغام دماغ کو پہنچایا، دماغ نے جیسے سست روی سے اس پیغام کو ڈی کوڈ کیا اور پھر اس شخص کا نام اس کے لبوں تک پہنچایا۔

”رو..... رو جیل۔“ چند لمحوں کے بعد اس نے اپنے شکر، ہوتے دماغ کے ساتھ اپنے بڑے بھائی کو پہچاننے میں۔

”اتنے شاکد تو ابا بھی نہیں ہوئے تھے جتنی تم ہوئی ہو۔“ وہ مسکرا کہتا آگے بڑھ کر اسے ملا۔ وہ خوش تھا، ابا اور اس کا معاملہ حل ہو گیا کیا؟ وہ کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ بس خالی خالی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”حیا! یہ نینا شامے، ادھر آ کر ملو۔“ اماں نے جانے کہاں سے اسے پکارا تھا۔ اس نے دھیرے سے گردن موڑی۔ اماں کے ساتھ لاؤنج کے صوفے پہ ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ اس کا دماغ مزید کام کرنے سے انکار کیا تھا، اس نے بس سر کے اشارے سے ان انجان لڑکی کو سلام کیا اور پھر روٹل کو دیکھا۔

”میں آتی ہوں۔ سر میں درد ہے۔ سونا ہے مجھے۔“ مبہم، ٹوٹے، بے ربط الفاظ کہہ کر وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ پیچھے سے اماں نے شاید پکارا تھا، مگر اس نے اندر آ کر دروازہ بند کیا اور کنڈی لگا دی۔ ذہن اس طرح سے ایک نقطے پہ جم جاتا تھا کہ وہاں سے آگے پیچھے نہیں جا رہا تھا۔

کسی خود کار روبوٹ کی طرح اس نے عبا کے بٹن کھولے، پھر سر سے سیاہ اسکارف علیحدہ کیا تو بالوں کا جوڑ اکھل گیا۔ سارے بال کمر پہ گرتے گئے۔ اس نے سیاہ لمبی قمیض کے ساتھ سفید چوڑی دار پا جا جاپہن رکھا تھا۔

ارد گرد ہر شے اجنبی سی لگ رہی تھی۔ وہ خالی اللہی کے عالم میں چلتی ہاتھ روم کی طرف آئی، دروازہ کھلا چھوڑ دیا اور ہاتھ روم کی ساری

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آن لائن بیسٹ سیلرز:-



لائیں جلا دیں۔

وہ اسی انداز میں چلتی شادریک آئی اور اسے پورا کھول دیا۔ پھر ہاتھ بک کی منڈیر کے کنارے پہنچ گئی۔ اس کی سیاہ لمبی قمیض کا دامن اب بیروں کو چھو رہا تھا۔

شارے لٹکی پانی کی تیز دھار بوندیں سیدھی اس کے سر پہ گرنے لگیں۔ وہ جیسے محسوس کیے ماساٹنے سنگ کے ساتھ سلیب پر رکھے پاٹ پوری بھرے شیشے کے پیالے کو دیکھ رہی تھی جس کی خوشبو پورے ہاتھ روم میں پھیلی تھی۔

انسان سمجھتا ہے، گناہ بھلا دینے سے وہ زندگی سے خارج ہو جاتے ہیں، مگر ایسا نہیں ہوتا۔ گناہ پیچھا کرتے ہیں۔ وہ عرصے بعد بھی اپنے مالک سے ملنے آ جایا کرتے ہیں۔ گناہ قبر تک انسان کے پیچھے آتے ہیں۔ اس کے گناہ بھی ایک دلدہ پھر اس کے سامنے آ گئے تھے۔ انہوں نے دنیا کے جہنم میں بھی اپنے مالک کو تلاش کیا تھا۔

موسلا دھار پانی اس کے سر سے مسلسل کرچے گر رہا تھا۔ ہال بھیک کرموٹی لنوں کی صورت بن گئے تھے۔ اس کا پورا لباس گیلیا ہو چکا تھا۔ وہ یک ٹک سامنے ٹائٹلز سے مرین دیوار کو دیکھ رہی تھی۔

ولید کے پاس وہ ویڈیو کہاں سے آئی، وہ نہیں جانتی تھی، مگر ایک بات طے تھی۔ اللہ نے اسے معاف نہیں کیا تھا۔ اس کے گناہ دھلے نہیں تھے۔ وہ آج بھی اس کے سامنے کی طرح اس کا پیچھا کر رہے تھے اور اگر وہ سب کچھ اس کے خاندان والوں کے سامنے آ گیا تو؟ پانی کی بو چھاڑا بھی تک اسے بھگور رہی تھی۔ اس کے چہرے، بالوں اور سارے وجود پہ سوئی سوئی بوندیں گر رہی تھیں۔ ایسے جیسے بارش کے قطرے ہوتے ہیں۔ جیسے سب سے نکلے موتی ہوتے ہیں۔ جیسے ٹوٹے ہوئے آنسو ہوتے ہیں۔

وہ پوری طرح بھیک چکی تھی۔ مگر ابھی تک یوں ہی شل سی بیٹھی تھی۔ یہ کیا ہو گیا تھا؟ وہ کیا کرے گی اب؟

ولید کے ہاتھ اس کی کمرز پر لگ گئی تھی۔ وہ اس کے خلاف گواہی نہ دے، تو کیا ولید بس کر دے گا؟ نہیں، وہ جان چکا ہے کہ اس کے پاس کیا "چیز" ہے۔ وہ اسے بار بار استعمال کرنا چاہے گا۔ کیا وہ اسی طرح اس کے ہاتھوں بلیک میل ہوتی رہے گی؟ اس نے کیوں ولید کو پتھر نہیں دے مارا؟ وہ کیوں ڈر گئی؟ وہ کیوں ظاہر نہیں کر سکتی کہ اسے اس بات سے فرق نہیں پڑتا؟ مگر وہ یہ ظاہر نہیں کر سکتی تھی۔ سب کچھ اتنا غیر متوقع ہوا تھا کہ انسان ہونے کے ناتے وہ مستحیل نہیں کی تھی اور ولید جیت گیا تھا۔

اسے اللہ نے معاف نہیں کیا۔ نیلی مسجد میں بیٹھ کر اس نے کتنی معافی مانگی تھی۔ کتنا نور مانگا تھا 'ذرا ب خود کو اس کی پسند کے مطابق ڈھالنے کے بعد جب اسے اپنے گناہ بھولتے جا رہے تھے تو اچانک وہ سب اس کے سامنے لاکھڑا کر دیا گیا تھا۔ وہ بری لڑکی نہیں تھی، اس کا کوئی انجیر نہیں رہا تھا۔ دکان دار سے روپے پکڑتے وقت بھی احتیاط کرتی تھی کہ ہاتھ نہ ٹکرائے، مگر خوب صورت دکھنے کی خواہش سے اس سے چند غلطیاں ہوئی تھیں اور وہ اب تک معاف نہیں ہو سکی تھیں۔

جانے کب وہ انھی، شادریک بند کیا اور بیٹھنے والوں اور کپڑوں سمیت اپنے بیڈ کے ساتھ نیچے کارپنٹ پہ آ بیٹھی۔ آنسو تھے کہ کتنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ اکڑوں بیٹھے، سینے کے گرد بازو لپیٹے سر گھنٹوں میں دیے وہ کب سو گئی، اسے پتا ہی نہیں چلا۔

☆ ☆ ☆

جب وہ انھی تو عشاء کی اذان ہو رہی تھی۔ کمرے میں تار کی پھیلی تھی۔ لباس اور بال ابھی تک نم تھے۔ ذرا حواس بحال ہوئے تو روجیل اور اس کی بیوی کا خیال آیا۔ اس نے تو اسے ٹھیک سے دیکھا بھی نہیں تھا، پتا نہیں اماں نے کیا نام لیا تھا۔

فریش ہو کر، انگوڑی لمبی قمیض کے ساتھ میروں چوڑی دار پا جاما اور میروں دو پٹالے لے کر وہ سیلے بالوں کو ڈرائر سے سکھا کر باہر آئی تو گھر میں چہل پہل ہی تھی۔ سحر اور ثنا عابدہ چچی کے ساتھ آئی ہوئی تھیں۔ ارم، ہسونیا اور صائمہ بتائی بھی لاؤنچ میں تھیں۔

روجیل کی بیوی فاطمہ کے ساتھ والے صوفے پہ دوپہر کے انداز میں بیٹھی تھی۔ یک لگا کر ناٹک پہ ناٹک رکھے۔ گلابی قمیض کے ساتھ کپیری۔ بال سیاہ ہتھکھریا لے مگر بھوری سنہری اسٹریٹنگ میں ڈالی کر دیا رکھے تھے۔

نقوش سے وہ نیپالی کم اور ذرا صاف رنگت کی ایفرو امریکن زیادہ لگتی تھی۔ رنگت گندی، رخسار کی ہڈیاں اونچی بھنوں بے حد باریک اور چہرے کی جلد عام امریکی لڑکیوں کی طرح فیس ویلکسٹ کروانے کے باعث جیسے چھلی ہوئی سی لگتی تھی۔ لبوں پہ ایک ہلکی سی مسکراہٹ..... حیا کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے وہ اچھی لگتی تھی یا بُری۔

”سوری! صبح میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی، صبح سے مل نہیں سکی۔“ انگریزی میں اس سے معذرت کرتے ہوئے اس نے ایک نظر اماں پہ ڈالی۔ اماں اتنی نارمل کیوں تھیں؟ کیا ابا اور اماں نے اس لڑکی کو قبول کر لیا تھا؟ اتنی آسانی سے؟

”اٹس اوکے!“ نہ تو انداز میں رکھائی تھی، نہ ہی والہانہ گرجوٹی۔ بس نارمل، سو برس انداز۔ جی ابھی تک کٹری تھی۔ اس سے بیٹھا ہی نہیں گیا۔ عجب بے چینی تھی۔ سو معذرت کر کے کچن کی طرف چلی آئی۔ کچن اور لاؤنج کے بیچ کی آدمی دیوار کھلی تھی، ہوا سے دور سے پھسکا کام کرتی دکھائی دے گئی تھیں۔

”تم ٹھیک ہو؟“ وہ ایک ڈش کی ڈریسنگ کرتے ہوئے آہٹ پہنٹیں۔ وہی جہان والی آنکھیں، وہی نرم مسکراہٹ۔

”جی، سوری میں دوپہر میں ڈراٹھی ہوئی تھی۔“

”تناشہ مل لیں؟“ پھسپھسے دور لاؤنج کے صوفوں پہ بیٹھی خواتین کی جانب اشارہ کیا۔ وہ چوگی۔

”اس کا نام تناشہ ہے؟“ سرگوشی میں پوچھتے وہ بظاہر چیزیں اٹھا اٹھا کر پھسپھو کو دے رہی تھی۔

”ہاں کیوں کیا ہوا؟“ وہ..... ”پھسپھو سمجھ گئی۔“ اگر رومی اس خوب صورت نام سے کچھ غلط مطلب لیتے ہیں تو اس میں اس نام کا کیا تصور؟ تصور تو روسیوں کا ہے نا۔“

”صبح مگر روئیل اچانک آ گیا، ابا کا ریمیکشن کیا تھا؟“ اب وہ ولید کی باتوں کے اثر سے ڈرائنگ تھی تو ان باتوں کا خیال آیا۔

”وہ اسی لیے بتائے بغیر آیا ہے۔ بس بھائی نے تمہارا بہت جھڑکا اور پھر روئیل نے معافی مانگ لی اور تناشہ نے بھی اسلام قبول کر لیا ہے سو بھائی مان گئے۔“

وہ بے یقینی سے انہیں دیکھنے لگی۔

”اتنی آسانی سے یہ سب کیسے ہوا؟ یاد ہے اسی شادی کی وجہ سے ابا کو ہارٹ ایٹک ہوا تھا۔“

اوون میں ڈش رکھ کر ڈھکن بند کرتے پھسپھو نے گہری سانس لی۔

”تو پھر اور کیا کرتے بھائی؟ اب وہ شادی کر ہی چکا ہے اور تناشہ کو مسلمان کر ہی چکا ہے تو بس بات ختم۔ روئیل ان کا اکلوتا بیٹا ہے۔ پہلو بھی کی اولاد۔“

اوون کا ٹائم سیٹ کر کے وہ اس کی طرف پلٹیں تو ان کے چہرے پہ ایک تھکان زدہ مگر بے شکوہ مسکراہٹ تھی۔

”وہ ان کا بیٹا ہے حیا! اور بیٹوں کے قصور جلدی معاف کر دیے جاتے ہیں۔ صلیب پہ لٹکا نہ کو صرف بیٹیاں ہوتی ہیں۔“

کچھ تھا جو اس کے اندر ٹوٹ سا گیا۔ پھسپھو اب کاؤنٹر کی طرف چلی آئی تھیں۔ اس نے بہت سے آنسو اندر اتارے اور پھر چہرے پہ ظاہری بے بسی لاکر ان کی طرف پلٹی۔

”آپ یہ سب کیوں کر رہی ہیں؟ اور نور بانو کدھر ہے؟“

”وہ ڈرائنگ روم میں بھائی وغیرہ کو چائے دینے لگی ہے۔ میں نے سوچا، میں کھانے کو آخری دفعہ دیکھ لوں کھانے کا کام عورت کو خود کرنا چاہیے تاکہ اس میں عورت کے ہاتھ کا ذائقہ بھی آئے۔“

”تو نور بانو ہے نا پھسپھو!“

”بیٹا! عورت کے ہاتھ کا ذائقہ صرف اس کی فیمیلی کے لیے ہوتا ہے۔ نور بانو کے بنائے کھانے میں اس کے اپنے بچوں کو ذائقہ آئے گا مگر اس کے مالکوں کو نہیں۔“

وہ جہان کی ماں تھیں، ان سے کون بحث کرتا؟ وہ واپس لاؤنج میں آ کر بیٹھ گئی۔ ذہن میں ولید کی باتیں ابھی تک گردش کر رہی تھیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا ہوگا؟ درمیان میں ایک دفعہ ابا اٹھ کر کسی کام سے آئے تو اسے بلا کر پوچھا۔

”الٹی بخش کہہ رہا تھا، ولید نے تمہارا راستہ روکا ہے؟“ ولید کا نام لیتے ہوئے ان کی آنکھوں میں برسی در آئی تھی۔ ویسے وہ نارمل لگ رہے تھے، جیسے تناشہ سے کوئی مسئلہ نہ ہو۔

”جی! وہ دھکی دے رہا تھا کہ اگر..... اگر ہم نے اس کے خلاف کوئی قدم اٹھایا تو ہم پر ذاتی حملے بھی کر سکتا ہے۔“ اب تک کراس نے چند فقرے جوڑے۔

”میں اس کو دیکھ لوں گا۔ اب اکیلے باہر مت جانا۔“ ابا کہہ کر آگے بڑھ گئے۔ اب کیا فائدہ؟ کل تو ویسے ہی اسے استنبول چلے جانا تھا۔ کھانے کے بعد نشانے اس سے کہا کہ وہ ترکی کی تصاویر دکھائے سب کو، وہ لیپ ٹاپ لینے کمرے کی طرف جانے لگی تو ارم ساتھ ہی آگئی۔ اس کے سر میں درد تھا اور وہ ذرا لیٹنا چاہتی تھی۔

”تم نے دیکھا، عابدہ چچی اور حشرش کیسے پھپھو کے آگے چیخے پھر رہی تھیں؟“ اس کے بیڈ پہ تکیہ درست کر کے لینی ارم بولی تھی۔ حشرش واقعی سارا وقت صرف پھپھو سے بات چیت کرتی رہی تھی۔

”جیسے مجھے ان کی پروا ہے۔“ وہ شانے اچکا کر لیپ ٹاپ اٹھائے باہر آگئی۔

جب وہ لیپ ٹاپ میز پر رکھے، اپنے ساتھ بیٹھی شا کو تصاویر ایک ایک کر کے دکھا رہی تھی تو مناشا شا کے دوسری جانب سٹنگل صوفے پہ بیٹھی تھی۔ وہ زیادہ وقت خاموش رہی تھی، بس کبھی کسی بات کا جواب دے دیتی، کبھی مسکرا دیتی، اور کبھی امریکیوں کے مخصوص انداز میں نخرے سے شانے اچکا دیتی۔

”ایک منٹ پیچھے کرنا۔“ وہ بیوک ادا کی اپنی اور ڈی جے کی تصاویر آگے کرتی جاری تھی جب اس نے مناشا کو سیدھا ہوتے دیکھا۔ وہ بے اختیار رکی، مگر مناشا کو دیکھا پھر تصویر پیچھے کی۔

وہ ڈی جے تھی۔ ادا کے بازار کا منظر۔ عقب میں جہان کھڑا کبھی بان سے بات کر رہا تھا۔ وہ کبھی کی سواری سے چند منٹ قبل کا فوٹو تھا۔ وہ تصویریں نہیں بناتا تھا، مگر اتفاق سے اس تصویر میں وہ نظر آ ہی گیا تھا۔

”یہ جہان ہے نا؟“ مناشا جیسے خوش گواریت سے بولی۔ لاؤنج میں بیٹھی تمام خواتین رک کر اسے دیکھنے لگیں۔ وہ ذرا آگے ہو کر بیٹھی، مسکراتے ہوئے اسکرین کو دیکھ رہی تھی۔

”تم کیسے جانتی ہو؟“ فاطمہ نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔

”یہ ہمارے پاس آیا تھا ایک دفعہ، ٹائٹ اسٹے کیا تھا ہماری طرف۔ بہت سوٹ ہے۔ ہے نا؟“ اس نے تائیدی انداز میں حیا کو دیکھا۔ حیا نے ایک نظر باقی سب پہ ڈالی اور پھر اثبات میں سر ہلادیا۔ وہ کتنا سوٹ ہے مجھ سے بڑھ کر کون جانتا ہے۔

”ہاں، اس نے بتایا تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ تمہیں یاد رہا۔“ پھپھو مسکرائی تھیں۔ روجیل سے وہ ان پنج تھیں مگر مناشا سے نہیں، سو انہیں اچھا لگا تھا۔

”آف کورس آنتی! اس نے بالخصوص بتایا تھا کہ وہ روجیل کی بہن کا شوہر ہے تو میں کیسے بھول سکتی تھی؟“

حشرش نے عابدہ چچی کو دیکھا اور عابدہ چچی نے صائمہ تائی کو۔ چند متذبذب نگاہوں کے تبادلے ہوئے اور جیسے لمحے بھر کے لیے خاموشی چھا گئی۔

پہلی بار اس کو مناشا بہت اچھی لگی۔ ولید کی باتوں سے چھائی کلفت ذرا کم ہو گئی اور وہ انہیں باقی تصاویر دکھانے لگی۔ پھر جب لیپ ٹاپ رکھنے کمرے میں آئی تو ارم اس کے بیڈ پہ بیٹھی اس کے موبائل کو کان سے لگائے دبی۔ دبی غصیلی آواز میں کسی سے بات کر رہی تھی۔

”یہ لڑکی بھی نا!“ حیا نے بمشکل اپنا غصہ ضبط کیا۔ ارم اسے دیکھ کر تیزی سے الوداعی کلمات کہنے لگی۔

”پلیز کال لاگ کلیمر مت کرنا۔ میرے اہم نمبر ضائع ہو جائیں گے۔“ اس نے ابھی کال کاٹی ہی تھی کہ حیا نے فون کے لیے ہاتھ

بڑھا دیا۔

ارم نے بغیر کسی شرمندگی کے فون اس کو واپس کر دیا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

حیا نے کال لاگ چیک کیا۔ اسی نمبر پہ جو اس نے اپنے موبائل کے اندر ایک میسج میں محفوظ کر رکھا تھا، ارم نے آدھا گھنٹہ بات کی تھی۔ تیس منٹ اور پچاس سیکنڈ چونکہ نمبر فون بک میں محفوظ نہیں تھا، سو ارم کو نمبر ملا تے معلوم نہ ہو سکا کہ یہ نمبر اس فون میں پہلے سے درج ہے۔ وہ تاسف

بھری گہری سانس لے کر رہ گئی۔ یہ لڑکی بتائیں کیا کر رہی تھی۔

عائشہ گل کہتی تھی۔ ”اچھی لڑکیاں اچھے دوست نہیں بناتیں۔“

کاش! وہ یہ بات ارم کو سمجھا سکتی۔

وہ واپس لاؤنج میں آئی تو باتوں کا دور ویسے ہی چل رہا تھا۔ پھر صائمہ تائی نے ایک دم اسے مخاطب کیا۔

”جہان کی واپسی کا کیا پروگرام ہے حیا؟“ شاید یہ جتنا مقصود تھا کہ اسے جہان کی خبر تک نہیں۔ اس نے بہت ضبط سے گہری سانس لی۔ سین پھپھو ابھی اٹھ کر کچن تک گئی تھیں۔

”کل میں استنبول جا رہی ہوں نا تو پھر دیکھتے ہیں کیا پروگرام ڈیسا نڈ ہوتا ہے۔“

”تمہاری کب واپسی ہوگی؟“ حشر نے بہت سادگی سے پوچھا۔ اسے لگا، سب ل کر اس کی تحقیر کر رہے ہیں۔

”کچھ کہہ نہیں سکتی۔ جہان کے پروگرام یہ منحصر ہے۔“ اس نے بے پروائی سے شانے اچکائے۔ ”شاید ہفتہ لگ جائے، پھر ہم ساتھ

ہی واپس آئیں گے۔“

اس کے لہجے کی مضبوطی پر سب نے، حتیٰ کہ فاطمہ نے بھی اسے بے اختیار دیکھا تھا۔ وہ نظر انداز کر کے ٹاک کی طرف متوجہ ہو گئی، جو پیالی میں پانی بھر لائی تھی اور اپنے پرس سے سرخ، گلابی اور کاسنی نیل پاش کی شیشیاں نکال کر میز پر رکھ رہی تھی۔ اسے ماربل نیل پاش لگانی تھی اور وہ جانتی تھی کہ حیا سے بہتر یہ کام کوئی نہیں کر سکتا۔

”لگا کر دے رہی ہوں مگر وضو کرنے سے پہلے دھو لینا۔“ سب ابھی تک اسے دیکھ رہے تھے وہ جیسے بے نیازی ہو کر ہر نیل پاش کا ایک ایک قطرہ پانی میں پڑکانے لگی۔ تینوں رنگ بلبلوں کی صورت پانی کی سطح پر تیرنے لگے۔ اس کی امیدوں اور دعوں جیسے بلبلے۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بہت بڑی بات کہہ گئی ہے۔ جہان ترکی میں نہیں تھا اور وہ اس کے ساتھ واپس نہیں آئے گا مگر وہ ان کو مزید خود پہننے کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔

”اب آگٹھا ڈالو۔“ اس کے کہنے پر شانے آگٹھا پانی میں ڈبو کر نکالا، تو ناخن پہ تینوں رنگوں کا ماربل پر نٹ چھپ گیا تھا۔

”واؤ!“ شائستہ اسٹس سے آگٹھے کو ہر زاویے سے دیکھنے لگی۔ وہ قدرتی سا ڈیزائن تھا اور بہت خوب صورت تھا۔ قدرت کے ڈیزائن بھی

کتنے خوب صورت ہوتے ہیں ناں۔ انسان کی ڈیزائننگ سے بھی زیادہ خوب صورت۔

☆ ☆ ☆

رات دیر سے وہ رو جیل کے ساتھ تایا بابا کی طرف گئی تھی تاکہ جانے سے قبل ان سے مل لے اور طبیعت بھی پوچھ لے۔ تایا کی پٹی بندھی

تھی اور وہ قدرے بہتر لگ رہے تھے۔

”تم بہن بھائیوں کا بھی آنا جانا لگا رہتا ہے۔“ انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں کہا تھا۔ وہ بیڈ پتکیوں سے ٹیک لگا کر نیم دراز تھے۔

پرسوں اگر اسے لگا تھا کہ وہ پہلے جیسے تیا فرقان بن گئے ہیں تو وہ غلط تھی گو کہ سرد مہری کی دیوار گر چکی تھی اور وہ نارل انداز میں اس سے بات چیت کر رہے تھے، پھر بھی پہلے والی بات نہ تھی۔ اس نے اپنے حجاب سے ان کے رخم کو مرہم دیا تھا، یہ بات جیسے پرانی ہو گئی تھی۔ فطرت کبھی نہیں بدلتی۔

”اور جہان کا کیا پروگرام ہے؟“

”جہان میرے ساتھ ہی واپس آئے گا۔“ تایا کے جواب میں اس نے ذرا اونچی آواز میں کہتے ہوئے قریب بیٹھی صائمہ تائی کو پھر

سے سنایا۔ تائی کو جیسے بات پسند نہیں آئی، انہوں نے رخ پھیر لیا۔

واپسی پر دونوں گھروں کا درمیانی دروازہ عبور کرتے ہوئے رو جیل نے پوچھا۔ ”صائمہ تائی صبح بتا رہی تھیں کہ جہان تمہیں تمہارے

برقعے کی ضد کی وجہ سے چھوڑ کر گیا ہے؟“

حیا نے گہری سانس لیتے ہوئے درمیانی دروازہ لاک کیا اور پھر رو جیل کی طرف مڑی۔

”تمہارے ایف ایس سی پری انجینئرنگ میں کتنے مارکس آئے تھے رو جیل؟“

”میرے مارکس؟“ وہ ذرا حیران ہوا۔ ”نوسو کا نوے۔ کیوں؟“

”اور جب تمہارے نوسو کا نوے نمبر آئے تھے تو صائمہ تائی نے کہا تھا کہ اس فیڈرل بورڈ والوں سے پیپر ز کم ہو گئے تھے، سو

انہوں نے Randomly مارکنگ کرتے ہوئے شیرینی کی طرح نمبر بانٹے ہیں اور اس بات کو خاندان والوں سے سن کر تم نے کہا تھا

کہ..... ایک منٹ، مجھے تمہارے الفاظ دہرانے دو۔“ وہ اس شام میں پہلی دفعہ سکرائی۔

”تم نے کہا تھا، صائمہ تائی اس دنیا کی سب سے جھوٹی خاتون ہیں۔“

”اوکے، اوکے، سمجھ گیا۔“ رو جیل ہنستے ہوئے سر جھٹک کر اس کے ساتھ پورچ کی طرف بڑھ گیا۔

چھ ماہ قبل اس نے ایک بھیا تک خواب دیکھا تھا۔ اس واہیات ویڈیو کی سی ڈی اس کے گھر پہنچ گئی تھی۔ ارم لاؤنچ میں زمین پہ بیٹھی رو

رہی تھی اور تاجا بابا، روئیل سب وہاں موجود تھے۔ تب اس نے سوچا تھا کہ روئیل تو امریکہ میں ہے، پھر ادھر کیسے آیا؟ مگر اب ادھر آ گیا تھا۔ اس بھانک منظر کے سارے کردار یہاں موجود تھے۔ جب وہ ترکی سے واپس آئے کی تو کیا اس کا استقبال اس خواب جیسا ہوگا؟ اس سے آگے وہ کچھ سوچنا نہیں چاہتی تھی۔

☆ ☆ ☆

استنبول ویسا ہی تھا جیسے وہ چھوڑ کر گئی تھی۔ ناظم کے مجسمہء آزادی کے پتھروں کا رنگ، ٹیولیس کی مہک، استقلال حدیسی میں چلتے لوگ، ساہی کی مصنوعی جمیل، ہر شے پہلے جیسی تھی۔ بس ڈی بے نہیں تھی اور جہان نہیں تھا، مگر ان دونوں کا عکس استنبول کے ہر گلی کوپے اور باسٹروس کے نیلے جھاگ کے ہر پبلے میں جھللا رہا تھا۔ اس شہر نے اس کی زندگی بدل دی تھی اور اب بدلی ہوئی پوری زندگی میں وہ اس شہر کو بھول نہیں سکتی تھی۔ بیوک ادا کی بندرگاہ سے چند کوس دور وہ پتھروں کے ساحل پہ ایک بڑے پتھر پہ بیٹھی، ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کی انگلی میں پڑے ٹیلیفون بینڈ کو گھماتی سمندر کو دیکھ رہی تھی۔ پرسوں جب وہ استنبول آئی تھی، تب سے اب تک وہ جہان کا ہر نمبر ملا چکی تھی، مگر سب بند تھے۔ وائس بیج اس نے پھر بھی نہیں چھوڑا تھا۔ کیا کہے؟ الفاظ ہی ختم ہو جاتے تھے۔ کلائرنس کے تمام معاملات اس کی توقع سے جلدی حل ہو گئے تھے۔ ویرا اس نے بڑھوایا تھا۔

پہلے اسے لگا کہ وہ دیر سے واپس آئی ہے مگر فلسطینی لڑکے اور اسرائیلی نالی بھی ابھی گئے نہیں تھے۔ ان کی آج رات کی ملاقات تھی اور فریڈم فلوٹا نے جو دوستی توڑی تھی، وہ اب تک جڑ نہ پائی تھی۔ صبح ادا لا آنے سے قبل اس نے مقسم کو پھر سے عایا کے لیے شکر یہ کہا تھا۔ وہ جواباً مسکرا کر رہ گیا تھا۔ بلا خراج شام ان کا ترکی میں یادگار سسر اختام پذیر ہو جاتا تھا۔ خود اس کا کیا پروگرام تھا، وہ ابھی کچھ فیصلہ نہیں کر پائی تھی۔ جہان لندن میں ہی تھا اور وہ ادھر چائیں سکتی تھی اور اس کو لیے بغیر وہ واپس جانا نہیں چاہتی تھی۔ کیا کرے؟

ایک لہر تیرتی ہوئی اس کے قریب آئی اور پھر واپس پلٹ گئی۔ وہ اپنے خیالوں سے چونگی۔ لہر اس کے قریب ایک چھوٹا سا سیپ ڈال گئی تھی۔

اس نے سیپ بچنے عرصہ ہوا ترک کر دیا تھا۔ خالی سیپ کھولنے سے بڑی مایوسی کیا ہوگی بھلا؟ مگر نہ جانے کیوں وہ ابھی اور ذرا آگے جا کر جھکتے ہوئے وہ سیپ اٹھالیا۔ دائیں، پیر، پیر، پیر سے اب بھی تکلیف ہوئی تھی۔

سیپ لے کر وہ واپس بڑے پتھر پہ آ بیٹھی اور دونوں ہاتھوں میں اس کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ سفید سرخی سیپ جس پہ بھوری، گلابی رکیں سی بی تھیں۔ سیپ گیلیا تھا، اور ریت کے ذرات بھی اس پہ لگے تھے۔ اس نے پرس سے نشو نکالا، سیپ کو اچھی طرح صاف کیا، یہاں تک کہ غنڈا، سخت خول چمکنے لگا اور پھر وہاں سے اٹھ آئی۔ پکنک کے لیے دور دور تک ٹویوں میں بیٹھے ساحلوں سے اسے چھری ملنے کی توقع تھی مگر ایک خانچہ فروش سامنے ہی نظر آ گیا۔ اس کے پاس چاقو تھا۔

حیا نے اس سے چاقو لیا اور وہیں اس کی ریزمی کے ساتھ کھڑے کھڑے سیپ کو کاٹا۔

اس نے طے کر لیا تھا کہ یہ اس کی زندگی کا آخری سیپ ہوگا۔ اس میں سے یا تو سفید موتی نکلے گا یا پھر نہیں نکلے گا۔ مگر ان دونوں ممکنات میں سے جو بھی ہو، وہ دوبارہ کبھی سیپ نہیں بچے گی۔

اس نے کئے ہوئے سیپ کے دونوں باہم ملے ٹکڑوں کو آہستہ سے الگ کرتے ہوئے کھولا۔ دھیرے دھیرے دونوں ٹکڑے جدا ہوتے گئے۔

وہ یک ٹک سی کھلے سیپ کو دیکھ رہی تھی۔

تیسرا امکان بھی ہو سکتا تھا، یہ اس نے نہیں سوچا تھا۔

☆ ☆ ☆

قریباً آدھ گھنٹے بعد وہ بہارے گل کے سامنے، حلیمہ آئی کے فرشی نشست والے کمرے میں بیٹھی تھی۔

”تم کہاں چلی گئی تھیں حیا! سب مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔“ وہ بہت اداسی سے کہہ رہی تھی۔ وہ دونوں آسنے سامنے زمین پہ بیٹھی تھیں۔

بہارے نے سبز فراک کے اوپر تھکھکرا لے بھورے بالوں کو ہمیشہ کی طرح، ہم رنگ پونی میں باندھ رکھا تھا، مگر اس کا چہرہ ہمیشہ جیسا نہ تھا۔

”تو تم نے اپنا پاسپورٹ کیوں جلایا؟“ اس نے جب سے حلیمہ آئی سے یہ بات سنی تھی، وہ اجنبیہ کا شکار ہو گئی تھی۔

”تا کہ وہ نیا پاپسورٹ دینے کے لیے میرے پاس آ جائے۔“ بہارے نے کہتے ہوئے سر جھکا لیا۔ حیانے الجھن سے اسے دیکھا۔ بہارے بہت سمجھ دار، بہت ذہین پتی تھی، مگر اس طرح کی بات کی امید اس نے بہارے سے نہیں کی تھی۔

”تمہیں کیوں لگا کہ اس طرح وہ واپس آئے گا۔“ وہ اس کے جھکے سر کو غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔ بہارے خاموش رہی۔

”بہارے گل! تمہیں کس نے کہا کہ ایسا کرنے سے وہ واپس آ جائے گا۔“ اب کے اس نے سر اٹھایا اس کی بھوری سبز آنکھوں میں بے پناہ اداسی تھی۔

”سفیر نے کہا تھا کہ ایسا کرو گی تو وہ آ جائے گا۔“

”اچھا!“ وہ اب کچھ کچھ سمجھنے لگی تھی۔ ”تو سفیر بے کیوں چاہتے ہیں کہ وہ ادھر آ جائے جب کہ ادھر آنا اس کے لیے ٹھیک نہیں ہے؟“

بہارے نکر نکر اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ حیانے افسوس سے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ سفیر کوئی گڑبڑ کر رہا ہے۔“

”کیا تمہیں پتا ہے عبدالرحمن کدھر ہے اور.....“ وہ ہچکچائی ”کیا تمہیں پتا ہے وہ تمہارا۔“

”ہاں مجھے سب پتا ہے اور اب اس بات کا ذکر مت کرو۔“ اس نے جلدی سے بہارے کو خاموش کر لیا۔ دروازہ کھلا تھا۔ حلیمہ آئی پکچن تک ہی گئی تھیں۔

”تم نے کہا تھا ہم مل کر اسے ڈھونڈیں گے۔“ بہارے نے بے چینی سے کچھ یاد دلایا۔

”وہ ترکی میں نہیں ہے اور ہم اسے نہیں ڈھونڈ سکتے۔ میرے ابا نے اجازت.....“ باہر آہٹ ہوئی تو وہ جلدی سے خاموش ہو گئی۔ حلیمہ آئی دوئی کی شیشی پکڑے اندر آ رہی تھیں۔ ہمیشہ کی طرح ڈوپٹہ اوڑھے، مسکراتا حلیمہ چہرہ۔ ان کو یقیناً خود بھی نہیں پتا تھا کہ ان کا بیٹا کیا کرتا پھر رہا ہے۔ کچھ تو تھا جو غلط تھا۔

”مجھے نہیں کھانی دوئی۔“ بہارے نے برا سامنہ بنایا تو وہ گہری سانس بھر کر رہ گئیں۔

”اس کوکل سے بخار ہے، پلیرز اس کو سیرپ پلا دو حیا! میں تب تک بچن دیکھ لوں۔“ انہوں نے سیرپ اس کی طرف بڑھایا تو اس نے فوراً پکڑ لیا۔

”میں پلا دویتی ہوں۔“

”تھینک یو بیٹا۔ میں تب تک کھانا نکالتی ہوں۔ تم کھانا کھائے بغیر نہیں جاؤ گی۔“ مسکرا کر کہتی، وہ باہر نکل گئیں۔ حیانے گردن ذرا اونچی کر کے دروازے کی طرف دیکھا۔ جب وہ اوچھل ہو گئیں تو وہ بہارے کی طرف مڑی۔

”کیا تم نے انہیں بتایا کہ یہ سب کرنے کو تمہیں سفیر نے کہا تھا؟“ ساتھ ہی اس نے چیخ میں بوتل سے جامی سیرپ بھرا۔ بہارے نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے منہ کھولا۔ اس نے چیخ اس کے منہ میں رکھا۔

”اللہ اللہ! میرا منہ کڑوا ہو گیا۔“ سیرپ پینے کے بعد وہ چہرے کے زاویے بگاڑے شکایت کرنے لگی تھی۔

”اللہ تمہیں سمجھے، اللہ تمہیں سمجھے!“ وہ جلدی جلدی پانی کا گلاس چیتی برا سامنہ بنائے کہہ رہی تھی۔ پانی پی کر بھی اس کی کڑواہٹ ختم نہیں ہوئی تھی۔ وہ جیسے اپنی اصل اداسی کا چڑچڑاہٹ اس سیرپ پہ نکال رہی تھی۔

”انتا بھی کڑوا نہیں تھا۔“ شہرودیرے پاس کینڈی یا چاکلیٹ ہوگی۔“ اس نے قالین پہ رکھا اپنا پرس کھولا اور اندر ہاتھ سے ٹٹولا۔ صبح پرس میں چیزیں ڈالتے ہوئے اس نے دیکھا تھا کہ اندر کینڈی رکھی تھی۔ ایک گلابی ریپر والی کینڈی اور ایک خالی ریپر۔ لہٰذا نے دونوں چیزیں باہر نکالیں اور کینڈی بہارے کو دی۔

”شکریہ!“ بہارے نے جلدی سے کینڈی کھول کر منہ میں رکھ لی۔ حیانے خالی ریپر کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اسے اس ریپر کے ساتھ ڈاکٹر ابراہیم کی باتیں بھی یاد آئی تھیں۔ احزاب کی پہیلی.....

”بہارے! تمہیں یاد ہے، عائشے نے کہا تھا کہ حجاب لینا احزاب کی جنگ جیسا ہوتا ہے۔“ ساری کڑواہٹ بھلائے، کینڈی چوستی بہارے نے سر اٹھاتے میں ہلایا۔

”پتا ہے، مجھے کسی نے کہا کہ اس میں کچھ مسنگ ہے۔ کیا عائشے کچھ بتانا بھول گئی تھی؟“ بہارے کے ہلتے لب رکے، آنکھوں میں خوشگوار سی حیرت ابھری۔

”ہاں، مجھے پتا ہے۔ عائفے نے آخر میں بتایا ہی نہیں تھا کہ.....“ وہ کینڈی والے منہ کے ساتھ جوش سے بولتی بولتی ایک دم رکی۔ اس کی آنکھوں میں بے یقینی سی اتر آئی تھی۔ ”جہمیں بگلوں نے بتایا کیا؟“

”بگلے!“ حیانے اچنبھے سے اسے دیکھا۔

”ہاں، ہاں۔“ بہارے جوش سے سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ ”جب سمندر کنارے عائفے یہ سب بتا رہی تھی تو میں نے دل ہی دل میں بگلوں کو بتائی تھی یہ بات۔“

مرمر کے بگلے اور سلطان امت مسجد کے کبوتر دل کی بات سن لیتے ہیں..... مگر تم عائفے کو نہ بتانا کہ میں نے یہ کہا ہے، وہ آگے سے کہتی ہے، دل کی بات اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں سن سکتا۔“ حیانے اختیار نہیں پڑی۔

”وہ ٹھیک کہتی ہے۔ مجھے یہ بات میرے منچر نے کہی تھی۔ بگلے اور کبوتر کیسے کسی کے دل کی بات سن سکتے ہیں بہارے!“

بہارے کو جیسے اس کا یوں کہنا بہت بُرا لگا تھا۔

”کیوں؟ کیوں وہ ماہن کے دل کی بات تو سنتے تھے نا، اسی لیے وہ کبوتر بن گئی تھی۔ تو میرے دل کی بات کیوں نہیں سن سکتے۔“

”ماہن کون؟“ وہ ذرا سا چونکی۔ اسے لگا اس نے یہ بات پہلے بھی کہیں سنی تھی۔ ماہن جو کبوتر بن گئی تھی۔

”کیا تم نے ماہن کا واقعہ نہیں سن رکھا؟“ بہارے کو اس کی لاطمی نے حیران کیا۔

”نہیں..... تم سناؤ۔“

”اوکے!“ بہارے نے کڑچ کڑچ کی آواز کے ساتھ جلدی جلدی کینڈی چبائی اور کسی ماہر داستان گو کی طرح سناتے لگی۔

”ایک دفعہ کا ذکر ہے کپادوکیہ میں ایک غروب کی بیٹی رہتی تھی، اس کا نام ماہن تھا۔ ایک دن ماہن نے دیکھا کہ اس کے قلعے کے باہر

ایک لڑکا کچھ چیزیں بیچ رہا ہے۔ اس کے پاس کڑھائی کیے ہوئے رو مال، قالین اور.....“

”ایک منٹ! اپنی کہانی میں نہیں سن سکتی۔ صرف ہائی لائٹس بتاؤ!“ اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر بہارے کو روکا۔ وہ جو بہت شوق سے سن رہی تھی، خفا سی ہو گئی۔

”بس اسے وہ لڑکا پسند آ گیا مگر غروب نے ان دونوں کو علیحدہ کر دیا۔ اس نے ماہن کو قلعے میں بند کر دیا۔ وہاں کھڑکی پر روز کبوتر آ کر بیٹھ جاتے تھے۔ انہوں نے ماہن کے دل کی بات سن لی۔ ایک دن وہ بھی کبوتر بن گئی اور صبح وہ کبوتر بن کر اڑ جاتی اور شام میں واپس آ کر پھر سے لڑکی بن جاتی۔ غروب کو پتا چل گیا تو اس نے زہریلے دانے رکھ دیے، ماہن نے وہ کھالے اور وہ مر گئی اور پھر اس کا باپ بھی پتا نہیں کیسے مر گیا۔“

آخری بات بہارے نے بہت ناراضی کے عالم میں ہاتھ جھٹکا کہ یہی تھی مگر حیانے نہیں رہی تھی۔ وہ ہاتھ میں پکڑے رپر کو دیکھ رہی تھی۔ جس رات جہان گیا تھا اس سے قبل آخری دفعہ وہ اس سے اٹالین ریسٹورنٹ میں ٹھیک سے بات کر پائی تھی اور جب اس نے جہان سے واپسی کا پوچھا تھا تو اس نے کہا تھا۔

”میرا دل چاہتا ہے میں ماہن کی طرح کبوتر بن کر کسی غار میں چھپ جاؤں۔“

اس نے شکن زدہ رپر پر ہانگی پھیری۔ اس پر بنے غار کو دیکھ کر اسے بہت کچھ یاد آیا تھا۔ اس نے آہستہ سے سر اٹھایا۔

”کپادوکیہ۔“ بہارے اٹھ کر اسے دیکھ رہی تھی۔

”مجھے کپادوکیہ جانا ہے۔ وہ کپادوکیہ میں ہے۔ مجھے اسے ڈھونڈنا ہے۔“ اس نے پرس سے موبائل نکالا اور تیزی سے فلیٹ انکوائری

ڈائل کرنے لگی۔

”کیا وہ کپادوکیہ میں ہے؟ کیا تم اب ادھر جاؤ گی؟“ بہارے بہت پُر جوش ہو چکی تھی۔ حیا ایک دم غمخیز ہو گئی۔ اسے اپنی ایکساٹمنٹ

میں بہارے کے سامنے کپادوکیہ کا ذکر نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اگر بہارے نے کسی کو بتا دیا تو..... اف، اسے تو راز رکھنا بھی نہیں آیا تھا۔ اس نے خود کو

کوسا اور فون بند کر دیا۔

”کیا میں بھی تمہارے ساتھ کپادوکیہ جا سکتی ہوں؟ بتاؤ! بہارے نے اس کے گھٹنے کو ہلا کر پوچھا۔

”شش!“ اس نے ہونٹوں پر ہانگی رکھی پھر کھلے دوازے کو دیکھا۔ اب وہ پوٹن نہیں لے سکتی تھی۔ وہ بہارے کو بتانے کی غلطی کر چکی تھی۔

”پلیز مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔ پلیز حیا!“ بہارے اب دہلی آواز میں منت کرنے لگی تھی۔ ایسا کرتے ہوئے اس نے اپنی

آنکھوں میں زمانے بھر کی اداسی و بے بسی سمیٹ لی تھی۔ ”پلیز میں وعدہ کرتی ہوں میں ابھی لڑکی بن کر رہوں گی۔ تمہیں شک بھی نہیں کروں گی۔“
 ”میں تمہیں کیسے لے جاسکتی ہوں؟“ حیانے بے چینی و تذبذب سے دوبارہ کھلے دروازے کو دیکھا۔ حلیمہ آنٹی کسی بھی وقت آ سکتی تھیں۔

”پلیز حیا..... پلیز!“ بہارے کی اداس آنکھوں میں آنسو میرنے لگے۔
 اس کا دل پیچنے لگا۔ کیا بہارے کو ساتھ لے جانا اتنا مشکل تھا؟ اور اگر وہ اسے یہیں چھوڑ گئی اور اس نے سفیر یا نسی اور کے سامنے کہا وہ کیسا ذکر کر دیا تو.....؟ جو بات جہان نے صرف اسے بتائی تھی، اس کی ہر جگہ تشویر ہو، اس سے بہتر تھا کہ وہ اس لڑکی کو اپنے ساتھ لے جائے۔
 کیا وہ درست بیچ پوچھ رہی تھی؟
 ”حیا..... بہارے! کھانا کھاؤ۔“

حلیمہ آنٹی کھانے کے لیے آوازیں دینے لگیں تو بہارے نے جلدی جلدی گلی آنکھیں رگڑ ڈالیں۔ حیا کچھ کہے بنا اٹھ کھڑی۔
 کھانے میں پلاؤ کے ساتھ مچھلی بنی تھی۔ وہ ذرا بے توجہی سے کھاتی بہارے کے بارے میں سوچے جا رہی تھی۔ سفیر اس بچی کو ایسی گھر میں روکے رکھنا چاہتا تھا، ایسا کر کے کہیں وہ جہان کو بلیک میل تو نہیں کر رہا تھا؟ اگر بہارے کسی مصیبت میں ہوئی تو جہان کو واپس آنا پڑے گا۔ وہ بہارے کے لیے ضرور آئے گا۔ اس کو جیسے جبر جبری سی آئی۔

”عثمان انگل اور سفیر کہاں ہیں آنٹی؟“ اس نے بظاہر سرسری سے انداز میں پوچھا۔
 ”ہول پہ ہیں دونوں۔ عثمان شاید آنے والے ہوں، مگر سفیر ذرا لیت آتا ہے۔“ آنٹی نے مسکرا کر بتایا تو حیانے سر ہلادیا۔ سفیر اب گھر پہنچ گیا تھا، ایسے میں وہ بہارے کو لے کر وہاں سے جاسکتی تھی۔ یہی ٹھیک تھا۔ بھلے کوئی اسے جلدی میں فیصلے کرنے والی کہے، مگر وہ ایسی ہی تھی۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ بہارے کو ساتھ لے جائے گی۔

”حلیمہ آنٹی! میں چند دن کے لیے از میر جا رہی ہوں۔ کیا بہارے میرے ساتھ چل سکتی ہے؟“
 بہارے نے تیزی سے گردن اٹھائی۔ اس کے چہرے پہ چمک در آئی تھی۔

”بہارے؟ پتا نہیں، عائشے یا اس کی دادی سے پوچھ لو، اگر ان کو کوئی اعتراض نہ ہو تو۔“

حلیمہ آنٹی نے جیسے راضی برضا انداز میں شانے اچکائے۔ انہیں لگا تھا کہ بہارے اس بات سے خوش ہے، سو انہوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔

عائشے کا نمبر بہارے سے لے کر اس سے اجازت لینا کسی کارروائی تھی۔ حلیمہ آنٹی نے بتایا تھا کہ بہارے کا پاسپورٹ عبدالرحمن ایک ہفتے تک بھجواوے گا۔ وہ کدھر تھا، وہ بھی نہیں جانتی تھیں، سو اس ایک ہفتے تک بہارے اس کے ساتھ اگر رہ لیتی ہے تو کسی کو اس بات سے کوئی مسئلہ نہ تھا۔

بہارے نے جلدی جلدی اپنا چھوٹا سا بیگ تیار کر لیا اور پھر اپنا گلابی پرس کندھے سے لٹکائے، بالکل تیار ہو کر خوشی خوشی اس کے ساتھ آن کھڑی ہوئی۔ چند منٹ پہلے کی لنگی ہوئی صورت کا اب شاید تک نہ تھا۔ چھوٹی سی اداکارہ۔

حلیمہ آنٹی سے رخصت ہو کر وہ پہلی فیری لے کر اسٹینبول واپس آئی تھیں۔ اپنے ڈورم میں آ کر اس نے ایک چھوٹے بیک میں بہارے کا سامان ڈالا اور پھر اپنے چند کپڑے اور ضروری چیزیں رکھیں۔ کم سے کم سامان بہتر تھا۔

بہارے کا نمکلس وہ گزشتہ روز خرید چکی تھی، مگر اس نے ابھی دینا مناسب نہ سمجھا۔ اسے کسی خاص موقع کے لیے سنبھال کر وہ ابھی صرف اور صرف جہان کے بارے میں سوچنا چاہتی تھی۔

”حیا! ہم اسے وہاں کیسے ڈھونڈیں گے؟“ اوپر اس کے بنگ پہنچی اسے پیچنگ کرتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

”میں ذرا کچھ فرینڈز سے مل کر آتی ہوں، وہ آج جا رہے ہیں۔“ وہ باہر چلی آئی اور کمر اغفل کر دیا۔

مقیم، حسین اور مومن گورسل اشاپ پہ کھڑے تھے۔ مالی بھی ان سے ذرا فاصلے پہ کھڑی تھی۔ سب کے بیگز ان کے پاس تھے۔

لطیف، چیری، سارہ، یہ لوگ کب کے جا چکے تھے۔

”کی حال ہے حیا؟“ مقیم نے پکارا۔

”حالی بخیر کیا تم لوگ ابھی نکل رہے ہو؟“ فلسطینیوں کے قریب پہنچ کر اس نے ان کو خطاب کیا تو آواز میں نامعلوم سی اداسی درآئی۔
”ہوں۔“ حسین نے ڈھیلے ڈھیلے انداز میں سر ہلادیا۔ زندگی میں ہر چیز کا ایک اختتام ہوتا ہے اور اب جبکہ اس ”سفر“ کا اختتام پہنچ رہا تھا۔ ایک عجیب سی کک دل میں اٹھ رہی تھی۔

”کاش! یہ سفر کبھی ختم نہ ہوتا کاش! ہم سب ہمیشہ ادھر رہتے۔“

”اور ایک ساتھ پڑھتے رہتے۔“ وہ بہت سی فی اندر اتارتے ہوئے بولی۔ مغرب کے وقت کی اداسی ہر سو چھائی تھی۔ بس اسٹاپ اور سہانچی کا سبزہ زار دریاں سا لگ رہا تھا۔

”اگر ایسا ہوتا تو اس جگہ کا چارم ہی ختم ہو جاتا، اس لیے یہی بہتر ہے کہ زندگی کے اس فیئر کا اختتام ہو جائے، تاکہ ہم ساری عمر اسے یاد رکھیں۔“ مقصم ٹھیک کہہ رہا تھا۔

”میں تم لوگوں کو یاد رکھوں گی۔ تم سب بہت اچھے ہو۔“
”جھمنکس..... اور ہاں! کیا تمہیں اپنے پزل باکس سے کوئی کارآمد چیز ملی یا وہ سب مذاق تھا؟“ مقصم کو اچانک یاد آیا۔
”ہاں! بہت اچھی چیز ملی مجھے اس سے۔ ایسی اچھی چیز جو میں نے پا کر کھودی، مگر اسے دوبارہ ڈھونڈنے کی کوشش کروں گی۔ خیر! اپنا خیال رکھنا۔“

اللہ حافظ کہہ کر ان کے پاس سے ہٹ کر وہ ٹالی کی طرف آئی۔ بے چاری ٹالی۔ کتنی بے ضرر سی تھی وہ۔ ذرا سا چھٹیڑی دیتی تھی اور وہ خواجواہ اتنی ٹینشن لے لیتی۔ اہل مکہ تو اہل مکہ ہوتے ہیں۔ ان سے کیا شکوہ اصل دکھ تو بنو قریظہ دیتے ہیں۔ ہم سارا وقت ترکی، اٹلی اور فرانس کی حکومتوں کو کجاب پے پابندی لگانے کے باعث بُرا بھلا کہتے رہتے ہیں۔ اگر اس سے آدمی توجہ اپنے خاندان کے ”بزدلوں“ کی طرف کر لیں تو کیا ہی اچھا ہو۔

اس کے پکارنے پہ ٹالی، جو رخ پھیرے کھڑی تھی، چونک کر مڑی، پھر اسے دیکھ کر مسکرا دی۔

”اوہ حیا! آج تمہارے بال کس رنگ کے ہیں؟“

”ہمیشہ کی طرح خوب صورت ہیں۔ رنگ جو بھی ہو۔“ وہ بہت خوشگوار اور بُرا اعتماد انداز میں جواب دیتی اس سے گلے ملی۔

”میں تمہیں مس کروں گی۔“

”میں بھی۔“ وہ پھر وہاں اس وقت تک کھڑی رہی جب تک کہ وہ لوگ گورسل میں سوار نہ ہو گئے۔ جب بس کیسپس کی حدود سے دور چلی گئی تو وہ واپس ڈورم میں آئی۔ بہارے منہ بسورے بیٹھی تھی۔

”حیا! ہم عبدالرحمن کو کچا دو کیہ میں کیسے ڈھونڈیں گے؟“

”میں ذرا فلاٹ بک کروالوں۔“ اس نے اُن سنی کرتے ہوئے وہیں کمرے میں ٹپکتے ہوئے موبائل پر نمبر ملایا۔ اتار کر ایئر پورٹ سے ان کو قیصری کے ایئر پورٹ ”قیصری ہوالانی“ کی صبح کی فلاٹ ملی تھی۔

”ہوالانی..... تم لوگ ایئر پورٹ کو ہوالانی کہتے ہو اور ہم ”ہوائی اڈہ۔“ اردو کے الفاظ ترک سے بھی نکلے ہیں اس لیے۔“ فون بند کرتے ہوئے وہ جیسے محظوظ ہو کر بولی۔ بہارے بہت غور سے اس کی بات سن رہی تھی۔

”لیکن اگر ڈی جے ہوتی تو کبھی ترک اردو سے نکلی ہوگی، مگر ہماری اردو اور انجیل ہے بالکل۔“ وہ دھیرے سے ہنسی اور سر جھٹکا۔ وہ ”میدان پاکستان“ پہ کوئی کمپروماز نہیں کرتی تھی۔ اس کا لہجہ کہیں کھوسا گیا۔

”ڈی جے..... وہ ہی جو مرگئی تھی نا؟“ بہارے نے بہت سمجھ داری سے پوچھا۔ وہ اپنا سوال بھول چکی تھی۔

”ہوں! اور اب وہ کبھی واپس نہیں آ سکتی۔ بعض لوگ اتنی دور چلے جاتے ہیں کہ ان سے دوبارہ ملنے کے لیے مرنا ضروری ہوتا ہے۔“ اس کے چہرے پہ تاریک سائے آن ٹھہرے۔ وہ کھڑکی کے پاس آئی اور سلائیڈ کھولی۔ باہر تاریکی میں ڈوبتے، سہانچی کے وسیع دعریض میدان نظر آرہے تھے۔

”تمہیں پتا ہے، وہ روز صبح اس جگہ کھڑے ہو کر کیا کہتی تھی؟“

”کیا؟“

”وہ کبھی تھی، گنڈار.....“ الفاظ لبوں پر دم توڑ گئے۔ جب مچھلی دفعہ وہ پاکستان سے آئی تھی، تب بھی ڈی جے کا مقولہ دہرانے سے قبل الفاظ اسی طرح دم توڑ گئے تھے۔ مگر تب وہ شدت غم تھی اور آج..... آج وہ سانسے کھڑی تھی۔ بلکہ کھڑا تھا۔

”سفیر! سفیر عثمان!“ اس نے جلدی سے سلائیڈ بند کی اور پردہ برابر کیا۔ بہارے اسپرنگ کی طرح اچھل کر بینک سے پیچھے اترتی۔

”یہ یہاں کیوں آیا ہے؟“ حیا بے یقینی سے دہراتی پردے کی درز سے باہر دیکھنے لگی۔ بہارے بھی اس کے ساتھ آ کر ایڑیاں اونچی کر کے کھڑکی سے جھانکنے لگی۔

دور سبزہ زار پہ سفیر کھڑا ایک اسٹوڈنٹ کو رد کر چیسے کچھ پوچھ رہا تھا۔ وہ اسٹوڈنٹ جو بالائی میں سر مل رہا تھا۔

”یہ ہمارے بارے میں پوچھ رہا ہے۔“ خطرے کی گھنٹی کہیں بجتی سنائی دے رہی تھی۔ بہارے نے پریشانی سے اسے دیکھا۔

”کیا وہ مجھے لے جائے گا؟“

”نہیں! تم میرے ساتھ رہو گی۔ میں کچھ کرتی ہوں۔“ اس نے موبائل اٹھایا اور جلدی سے ہالے کا نمبر ملا یا۔ ہر مشکل وقت پہ ہالے ہی کام آتی تھی۔

”سفیر! نہیں ہے۔ وہ میرا اور عائشے کا بہت خیال رکھا کرتا تھا۔ وہ بالکل ہمارے بھائی جیسا ہے۔“

”بھائی! صرف وہی ہوتا ہے، جسے اللہ نے آپ کا بھائی بنایا ہو بہارے اور جسے اللہ آپ کا بھائی نہ بنائے، وہ کبھی بھائی نہیں ہو سکتا۔ بس! تم اور عائشے..... تم لوگ بہت سادہ ہو۔“ نمبر لا کر اس نے فون کان سے لگایا۔

ہالے لائبریری میں تھی۔ اس کے کہنے کے مطابق وہ فوراً باہر آئی اور سیدھی سفیر کی طرف گئی۔ وہ اسے پہچان گیا تھا۔ ہوٹل گریڈ پر وہ اس سے مل چکا تھا۔ سفیر نے اس سے پاکستانی انکچیف اسٹوڈنٹ کا پوچھا تو ہالے نے بتایا کہ وہ تو دوپہر کی ٹرین سے از میر چلی گئی تھی۔ کس اسٹیشن سے، یہ ہالے نہیں جانتی تھی، مگر سفیر نے اسے اپنا نمبر دے دیا کہ اگر اسے حیا کے بارے میں کچھ معلوم ہو جائے تو اسے ضرور آگاہ کرے۔ ہالے نے اس کی پوری تسلی و تشفی کروا کر فون نمبر رکھ لیا۔

”اور وہ ایک چھوٹی بچی کا بھی پوچھ رہا تھا، جو غالباً یہی ہے۔ ڈونٹ ٹیل ہی حیا! کہ تم نے اسے انوا کیا ہے۔“ سفیر کے جانے کی تسلی کر لینے کے بعد اب ہالے ان کے ڈورم میں بیٹھی خوش ہوتے ہوئے اپنی کارگرزاری بتا رہی تھی۔

”میں انطاولیہ کی بہارے مل گئی ہوں۔ مجھے کوئی انوا نہیں کر سکتا۔“ بہارے باقاعدہ امان گئی۔

”پھر ہالے اکل صبح تمہارا خوش قسمت دن ہو گیا بد قسمت دن؟“ اس نے بہارے کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی پکینگ سمیٹتے ہوئے پوچھا۔ صبح وہ گورسل کی بجائے ہالے کی کار میں ایئر پورٹ جانا جاتی تھی۔ کوئی خبر نہیں، سفیر صبح پھر واپس آ جائے۔

”خوش قسمت دن۔“ ہالے نے ہمیشہ کی طرح بڑے خلوص انداز میں بتایا۔ ترک اور ان کی مہمان نوازی۔

وہ واپس جا کر ان سب کو بہت مس کرے گی، وہ جانتی تھی۔

صبح من اندھیرے ہالے لائیں لینے آ گئی۔ اس نے احتیاطاً ہالے کو بتایا تھا کہ وہ انقرہ جا رہے ہیں اور یہ کہ وہ لڑکا بہارے کا ہمسایہ ہے اور اسے اس سے کچھ تحفظات ہیں۔ جب ہالے چلی گئی تو اس نے کہا دو کیہ کے لیے دو فٹنس خرید لیے۔

”حیا!“ بہارے نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے اس کے عبا کی آستین ذرا سمجھ کر اسے متوجہ کرنا چاہا۔ ”ہم اسے کپا دو کیہ میں کیسے ڈھونڈیں گے؟“ کل سے وہ کوئی تیسری دفعہ یہ سوال دہرا رہی تھی۔

”تیز چلو بہارے! ہمیں جلدی پہنچنا ہے۔“

”حیا! ٹیل ہی ناؤ۔“ بہارے کو صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔ وہ ایک دم زور سے چیخی۔ حیا نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ وہ بہت غصے اور خفگی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اطراف میں لوگ بھی مڑ مڑ کر دیکھنے لگے۔

”سوری، سوری!“ وہ اتھارٹھا کر ان ٹھنک کر دیکھتے لوگوں سے معذرت کرتی واپس بہارے کے پاس آئی۔ اس کے سامنے بچوں کے بل بیٹھی اور گہرا سانس لے کر اس کو دیکھا۔

”تم نے کبھی سمندر سے مچھلیاں پکڑی ہیں؟“

بہارے کی آنکھوں میں انھن دہرائی مگر اس نے اثبات میں سر ہلادیا۔

”جب اتنے بڑے سمندر سے مچھلی پکڑنی ہو تو کیا کرتے ہیں بہارے! فش راڈ کی کنڈی پہ چھوٹی مچھلی لگاتے ہیں اور راڈ پانی میں ڈال کر کنارے پر بیٹھ کر انتظار کرتے ہیں۔ بڑی مچھلی خود بخود تیر کر ہمارے پاس آ جاتی ہے..... ہے نا؟“

”ہم کپادوکیہ مچھلیاں پکڑنے جا رہے ہیں حیا؟“ بہارے کو بے پناہ حیرت ہوئی۔

”نہیں، میری بہن!“ اس نے گہری سانس لی۔ کیسے سمجھائے؟ وہیں بیٹھے بیٹھے پرس کھول کر اس نے وہ ڈبلی نکالی، جسے وہ سبائچی کے ڈورم میں رکھ کر بھول گئی تھی۔

”اس ڈبلی میں ایک ٹریسر ہے جو عبدالرحمن کا ہے۔ اس ٹریسر کا ریسپورس کے پاس ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ جب میں اس کے قریب ہوتی ہوں چند میل کے فاصلے پر..... تو اس کو اپنے ریسپورس پر پیغام مل جاتا ہے کہ میں اس شہر میں ہوں۔“

”کیا ہمیں بھی پتا چل جائے گا کہ وہ کدھر ہے؟“

”نہیں بہارے! ہمیں اس کو نہیں ڈھونڈنا۔ اسے ہمیں ڈھونڈنا ہے۔ جیسے ہی اسے پتا چلے گا کہ میں اس کے قریب ہوں، وہ فوراً مجھے کال کرے گا اور میں پہلی دفعہ سمجراحم کی کال کا انتظار کروں گی۔“ اس نے آخری فقرہ دل میں کہا تھا اور کھڑی ہوئی۔

بہارے نے نیم فہمی سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس کا ہاتھ پھر سے پکڑ لیا۔ وہ شاید ٹھیک سے سمجھ نہیں پاتی تھی۔



آج سے لاکھوں برس قبل اناطولیہ کے پہاڑوں بشمول حسن داغ اور اورجینس داغ (داغ ترک میں پہاڑ کو کہتے ہیں) کا لاوا پھنسا تھا اور یوں سیال مادہ ان پہاڑوں کی چوٹیوں سے بہتا ارد گرد کے میدانوں میں دور دور تک پھیلتا گیا۔ کئی صدیاں اس لاوے کو سونگھنے میں لگیں اور قریباً تیس لاکھ برس قبل یہ لاوا مکمل طور پر خشک تو ہو گیا مگر بارش اور کٹاؤ کے بعد یہ اپنے پیچھے زرین کے چہرے پر ایک عجیب و غریب علاقہ چھوڑ گیا۔ چاند کی سرزمین سے مشابہت رکھنے والے میدان اور وادیاں، جہاں حیرت انگیز نقش و نگار بنے رہ گئے۔ جیسے ہاتھ سے کسی ماہر مصور نے بنائے ہوں۔

کپادوکیہ..... خوب صورت گھوڑوں کی سرزمین۔

کپادوکیہ کا پہلا نام کس نے رکھا، اس بارے میں کئی روایات ہیں، البتہ اس کا موجودہ نام ”کپادوکیہ“ کے بارے میں عام رائے یہی ہے کہ یہ فارسی کے ”کت پوک“ سے نکلا ہے یعنی..... (خوبصورت گھوڑوں) کی سرزمین۔

اس خشکی اور ہزے کا امتزاج لیے علاقے کی مٹی کی اوپری سطح خاصی نرم ہے، جس کے باعث گئے وقتوں کی عیسائی تہذیبوں نے یہاں پہاڑوں کے اندر غار نما بڑے بڑے گھر اور چرچ بنالے تھے۔ ان کی کھڑکیاں یوں ہوتیں کہ دور سے لگتا، جیسے کسی پہاڑی کی بہت سی آنکھیں ہوں۔ زمین کے اندر سے سینکڑوں زیر زمین شہر آج بھی یہاں موجود تھے۔

صدیوں پرانا غاروں سے بنا خوبصورت کپادوکیہ۔

ماہن کے کبوتروں کی سرزمین۔



کپادوکیہ، ترکی کے صوبے ”نوشہر“ میں واقع تھا۔ اس میں چھوٹے چھوٹے شہر تھے۔ جیسے عرگپ، گوریہ وغیرہ۔ جہاں گھر، عبادت گاہیں، ہوٹل، سب غاروں کی صورت بنے تھے۔ عرگپ سے گھنٹہ بھر کی ڈرائیو پہ قیصری کا ایئر پورٹ ”قیصری ہوالائی“ تھا جہاں ان کا جہاز اس صبح اتر تھا۔

”ہم کہاں رہیں گے حیا؟“ بہارے اس کا ہاتھ پکڑے ایئر پورٹ کے لاؤنج میں اس کے ہمراہ چلتی بار بار پوچھ رہی تھی۔

”کسی ہوٹل میں رہیں گے نا، پہلے کچھ کھا لیتے ہیں۔“

”اور اگر عبدالرحمن نے فون ہی بند رکھا ہوا ہو؟“

اس نقطے پہ پہنچ کر اس کا اپنا دل ڈوب کر ابھرا۔ یہ وہ آخری بات تھی جو وہ سوچنا نہیں چاہتی تھی۔

”اس کے سارے نمبر بند ہیں۔ مگر اس نے کوئی دوسرا نمبر آن کر رکھا ہوگا اور یقیناً جی پی ایس ریسپورس بھی آن ہوگا۔ وہ ضرور کال کرے گا۔“ اس نے بہارے سے زیادہ خود کو تسلی دی۔ ابا اور پچھو کو بھی بتا دیا تھا کہ وہ اپنی دوست کے ساتھ کپادوکیہ جا رہی ہے۔ اگر اس نے پچھو سے

رابطہ کیا تو جان لے گا ورنہ..... ورنہ نہیں۔

وہ دونوں ایئر پورٹ کے کیفے ٹیریا میں آئیں اور ایک میز کے قریب اپنا سامان رکھ کر کرسیاں کھینچیں۔ آس پاس کم ہی لوگ تھے۔ کاؤنٹر ساتھ ہی تھا اور..... استقبالیہ پر موجود لڑکے کے ساتھ دو، تین نوجوان لڑکے کھڑے ہتھ ہوتے باقی کر رہے تھے۔ ترکی میں لڑکیوں کا تنہا سفر کرنا بہت عام سی بات تھی مگر لڑکے تو لڑکے ہوتے ہیں۔ چند ہی لمحے گزرے کہ وہ ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ مسکراتے ہوئے، مڑ مڑ کر دیکھتے ہوئے۔ اگر اسے جہان کو نہ ڈھونڈنا ہوتا تو وہ کبھی ادھر نہ آتی۔ جب بار بار ان کا گردن موڑنا برداشت نہیں ہوا اور بہارے بھی ناگواری سے ناک سکونے لگی تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”آپ آرڈر نہیں کریں گی؟“ کاؤنٹر والے لڑکے نے پہلے ترک اور پھر بہارے کے ”انگش پلیز“ کہنے پہ انگریزی میں یہی بات دہرائی تاکہ جانتے ہو۔

”نہیں، ہمیں جانا ہے۔“ وہ کوفت سے کہتی اپنا سامان اٹھانے لگی۔ پتا نہیں اب آگے کیا کرنا تھا۔ ہالے کو بتایا نہیں تھا۔ سو ہوٹل کے بارے میں نہیں پوچھ سکتی تھی۔

”آپ کو ہوٹل چاہیے تو میں مدد کر سکتا ہوں۔“ ایک لڑکے نے دانت نکالتے ہوئے پیش کش کی۔

”شکریہ۔۔۔ میرے پاس ہوٹل ہے۔“ وہ رکھائی سے کہہ کر بہارے کا ہاتھ پکڑے پلٹنے ہی لگی تھی کہ وہ پھر بولا۔

”کون سا ہوٹل؟“ جتنی تیزی سے اس نے پوچھا تھا، اس سے زیادہ تیزی سے حیا کے لبوں سے نکلا۔ ”یہ اوپر والا۔“ اس نے بے ساختہ جان چھڑانے کے لیے کاؤنٹر پر رکھے گائیڈ بک کی طرف اشارہ کیا۔ جہاں پہلے صفحے پہ تین ہوٹل کی تصاویر اور معلومات درج تھیں۔ اتنے فاصلے سے اسے ہوٹل کا نام تو پڑھا ہی نہیں گیا مگر وہ سب غیر ارادی طور پہ ہوا تھا۔

چاروں لڑکوں نے بے اختیار گائیڈ بک کے صفحے کو دیکھا۔ اوپر والے ہوٹل کی تصویر پہ نگاہ ڈالی اور پھر بے ساختہ کاؤنٹر والے کے دانت اندر ہوئے، ٹیک لگا کر کھڑا کا سیدھا ہوا۔ دوسرے نے فوراً جیسے شانوں سے قمیص کی نادیہ سلوٹس ٹھیک کیں۔

”آپ..... آپ مولوت بے کی مہمان ہیں؟ پہلے کیوں نہیں بتایا۔ پلیز بیٹھیں۔“ کاؤنٹر والا گڑبڑا کر وضاحت کرتا تیزی سے باہر آیا تھا۔ حیا نے رک کر ان کو دیکھا۔ باقی تینوں لڑکے سلام جھانک کر فوراً ادھر سے رُو پکھ ہو گئے تھے۔

”میں نے مولوت بے کو ابھی آدھا گھنٹہ پہلے بازار میں دیکھا تھا۔ وہ ادھر ہی ہیں، میں انہیں فون کرتا ہوں۔“ وہ جلدی سے اپنا موبائل نکال کر نمبر ڈائل کرنے لگا۔ حیا اور بہارے نے ایک دوسرے کو دیکھا، پھر حیا نے کرسی دوبارہ کھینچ لی۔

”مولوت بے آ رہے ہیں آپ کو لینے۔“ فون بند کر کے وہ مستعدی سے میڈو کارڈ لے آیا۔ ”آپ آرڈر کریں، میں لے آتا ہوں۔“ اس کے جانے کے بعد بے چین بیٹھی بہارے گل نے اس کا ہاتھ بلایا۔

”حیا! یہ مولوت بے کون ہیں اور ہم ان کے ساتھ کیوں جا رہے ہیں؟“

”مجھے نہیں پتا۔ مجھے کچھ سوچنے دو۔“

”ہم ایسے ہی ان کے ساتھ نہیں چلے جائیں گے۔ عائشہ گل کہتی ہے اچھی لڑکیاں ہر جگہ.....“

”تم دو منٹ کے لیے عائشہ گل کے پیچھے بھول نہیں سکتیں؟ اب ہمیں کہیں تو رہنا ہے نا۔ اگر نہیں اچھے لگے یہ مولوت بے تو نہیں جائیں گے ان کے ساتھ۔“

بہارے نے خفگی سے منہ میں کچھ بددا کر رخ پھیر لیا۔

وہ خود بھی ذرا مضطرب تھی۔ پتا نہیں کون تھے وہ صاحب اور کیوں ان کو لینے آ رہے تھے۔ ایسے تو وہ نہیں جائے گی ان کے ساتھ۔ کوئی مرضی کے بغیر تو نہیں لے کر جاسکتا۔

”مولوت بے آ گئے۔“ بشکل پندرہ، بیس منٹ گزرے تھے کہ کاؤنٹر والے لڑکے نے صدا لگائی تو بے اختیار ان دونوں نے مڑ کر دیکھا۔

سامنے سے ایک ادھڑ مڑ، گور سے سے ترک صاحب چلے آ رہے تھے۔ دراز قد، بے حد اسماٹ، سر کے بال ماتھے سے ذرا کم، چہرے پہ نرم سی مسکراہٹ، نفیس سے پینٹ شرٹ میں لمبوس۔ مگر وہ شہانہ تھے۔ ایک قدرے پست قد آٹنی ان کے ایک طرف تھیں۔ دوسری جانب ایک لمبا، پتلا سا لڑکا، انیس بیس برس کا اور اس کے ساتھ اسی عمر کی لڑکی جس کے بال کندھوں سے کافی نیچے تک آتے، سیاہ اور لہردار تھے۔ اس نے کپیری کے اوپر چلی شرٹ پہن رکھی تھی اور ایک موٹی، سفید گھنے بالوں والی ایرانی بلی بازوؤں میں اٹھائے ہوئے تھی۔ لڑکی نے دور سے انہیں ہاتھ بلایا۔

”کیا یہ تمہاری رشتہ دار ہے؟“ بہارے نے اچنبھے سے اسے مخاطب کیا۔

”نہیں..... میں تو اس فیملی کو جانتی بھی نہیں۔“ وہ شذ بذب سی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”مرحبا..... ہمیں دیر تو نہیں ہوئی؟ اگر پہلے پتا ہوتا تو آپ کو اتنا انتظار نہ کرنا پڑتا۔ رینلی سوری۔“ مولوت بے استقبالیہ مسکراہٹ کے ساتھ معذرت کر رہے تھے۔ ان کی مسز خوش دلی سے سلام کرتی، ملنے کے لیے آگے ہوئیں۔ ترکوں کے مخصوص انداز میں باری باری دونوں گال ملا کر چوما اور الگ ہو گئیں۔ وہ قدم میں حیا سے کافی چھوٹی تھیں۔

”تم پہلے کال کر دیتیں تو ہم جلدی آ جاتے اور کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا؟“ اس سے الگ ہو کر وہ بہت افسوس سے کہنے لگیں۔ ”میں سونا ہوں، یہ میری بیٹی بنار ہے اور یہ فاتح ہمارے ساتھ کام کرتا ہے۔ میرا بیٹا گو خان آج کل انقرہ گیا ہوا ہے۔ ورنہ اس سے بھی ملاقات ہو جاتی۔“

”میں حیا ہوں۔“ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مزید کیا کہے۔

”میں بنار اور یہ ہماری گارفیلڈ!“ بنار نے بلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزے سے بتایا۔ ”یہ پورے ”آشیانہ“ کی لاڈلی ہے۔ آج کل ذرا بیمار ہے۔ اسے علاج کے لیے لائے تھے ادھر اور اس چھوٹی بلی کا نام کیا ہے؟“

بات کے اختتام پر بنار نے جھک کر بہارے کا گال چھوا اور چھوٹی بلی کا پہلے تو تحیر سے منہ کھل گیا، پھر بے اختیار شرمائی، یوں کہ رخسار گلابی پڑ گئے اور پلکیں جھکا کر بہت باریک، نازک سی آواز میں بولی۔

”انا طو لیکہ! یہاں سے گل۔“ حیا نے پوری آنکھیں کھول کر اس چھوٹی ادا کارہ کو دیکھا۔ جس کی یہ آواز تو خود اس نے بھی نہیں سن رکھی تھی۔

”آپ استنبول سے آئے ہیں؟“ مولوت بے پوچھ رہے تھے۔

”میں پاکستان سے ہوں اور یہ ترکی میں میری رشتہ دار ہیں۔“ ان سب کے والہانہ اور خوش خلق انداز کے آگے اس کا تھینکس کہنے کا ارادہ کمزور پڑنے لگا۔

”باقی باتیں گھر چل کر کر لیں گے۔ فاتح! آپا کا سامان اٹھاؤ۔ دیکھو وہ کتنی تھکی ہوئی لگ رہی ہیں۔ آؤ بیٹا، کار باہر ہے۔“ مسز سونا اپنے مہمانوں کو مزید تھکانا نہیں چاہتی تھیں۔ فاتح سامان لینے کے لیے آگے بڑھا تو حیا نے بے اختیار بہارے کو دیکھا۔

”چلو جلدی کرو جیا!“ تازہ تازہ تعریف سے گنار ہوئی بہارے نے اٹھلا کر اس کی آستین کھینچی۔ حیا نے گہری سانس لے کر بیک فاتح کو تھما دیا۔ کہیں تو رہنمائی تھا اور فیملی زن ہوٹل سے زیادہ اچھا ہوئی کوئی نہیں ہوا کرتا۔

وہ دونوں ان کے ساتھ چلتی باہر آئیں، جہاں ایک چھوٹی سی، نین کھڑی تھی۔ اسے بے اختیار اپنا اور ڈی بے کار ترکی میں پہلا دن یاد آیا۔ جب احمت اور چغتائی ایسی ہی دین میں انہیں لینے آئے تھے۔

مولوت بے کا ہوٹل عرکپ میں تھا۔ قریباً گھنٹے کی ڈرائیو تھی۔ کھڑکی کے اس پار کیا دو کیہ کا خشک علاقہ نظر آ رہا تھا۔ پراسرار خاموش، دنیا سے الگ تھلک، غاروں سے بنی خوبصورت گھوڑوں کی سرزمین۔ دور کہیں کوہ حسن کے دونوں پہاڑ دکھائی دیتے تھے۔ جو اپنے اندر کا سارا لاوا صدیوں قبل زمین پر اناجیل کر اب سکون سے کھڑے تھے۔

”ڈی بے کو بہت حسرت تھی کہپا دو کیہ دیکھنے کی۔“ کھڑکی کے باہر بھاگتے مناظر دیکھ کر بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا۔ پھر فوراً چپ ہو گئی۔

”ڈی بے کون؟“ بنار جو بلی کو تھپک رہی تھی، بے ساختہ پوچھ بیٹھی۔

”میری..... ایک دوست تھی۔“ اس کے جواب میں بہارے نے آہستہ سے اضافہ کیا۔ ”مرگئی ہے۔“

”اوہ!“ بنار نے تاسف سے اسے دیکھا۔

”جب تمہاری بلی مر جائے گی تو وہ ڈی بے کے پاس چلی جائے گی۔“ چند لمحے بعد بہارے نے بہت سمجھ داری سے بنار کی معلومات میں مزید اضافہ کرنا چاہا۔

”بہارے گل! بہت ہو گیا۔“ اس نے ہڑبڑا کر اسے ٹوکا۔ پھر معذرت کرنی چاہی۔ ”سوری! یہ بس ایسے ہی بولتی رہتی ہے۔“

مگر بنار اور مسز سونا ہنس پڑی تھیں۔

”یہ چھوٹی بلی کتنی پیاری ہے نا۔“ بنار نے جھک کر اس کا گال چوما۔ ”آج سے گارفیلڈ بڑی بلی اور تم چھوٹی بلی۔“

بہارے نے شراب کرب دانت سے دبائے۔ اثبات میں سر ہلایا پھر ”دیکھا تم نے“ والی فاطمہ نظروں سے حیا کو دیکھا۔ حیانے گہری سانس لے کر سر جھٹکا۔ یہ لڑکی بہت پنے گی اس کے ہاتھوں۔

”آشیانہ کیو ہاؤس“ ایک چھوٹا سا دو منزلہ ہوٹل تھا۔ منشی سی پہاڑی کو کاٹ کر بنایا گیا تھا۔ سامنے سے پیسے کوئی جگہ سا لگتا تھا۔ ایک طرف باہر سے جاتی سیڑھیاں، اوپر ٹیرس، سامنے منحن تھا۔ ٹیرس اور گراؤنڈ فلور دونوں کے برآمدے عربی تھے۔ اندر آدھے کمرے پہاڑی کو کاٹ کر بنائے گئے تھے۔ وہ کوئی بہت اونچی پہاڑی نہیں تھی۔ ہوٹل کی چھت سے بھی ذرا کم تھی۔ ہوٹل کی پشت اس پہاڑی میں گویا دھنسی ہوئی تھی۔ چھوٹا سا خوب صورت سا آشیانہ۔

مولوت بلجیج کا کپادوکیہ میں ایک خاص مقام تھا۔ وہ اس علاقے کے ڈسٹرکٹ چیف تھے۔ لوگ ان سے ڈرتے بھی تھے اور ان کی عزت بھی کرتے تھے۔ ان کے مہمانوں کے ساتھ کوئی برا سلوک نہیں کر سکتا تھا اور آج ہوٹل کے ساتوں کمرے خالی تھے۔ وہ اور بہارے ہی آشیانہ کی مہمان تھیں۔

”یہ ہے تمہارا کمرہ، مجھے لگا تمہیں یہ پسند آئے گا۔ اگر بدلنا ہو تو بتا دو۔“ متحرک سی مسز سونا ان کو اوپر ہی منزل کے ایک کمرے میں لے آئیں۔ وہ خاکی، سرسئی رنگ مرمر سے بنا کمرہ بہت خوب صورت تھا۔ کنوؤں میں زرد بلب لگے تھے۔ سارے جلا دو، تب بھی کمرے میں غار کا نیم مدھم سا اندھیرا برقرار رہتا۔ سرخ سے قالین کا کٹوا فرش پہ بچھا تھا۔ اسی سرخ رنگ کا ایک بڑا صوفہ کھڑکی کے آگے رکھا تھا۔ ڈبل بیڈ پہ بھی گہرے سرخ، میران رنگ کی چادر بچھی تھی۔ بیڈ کی عقبی دیوار پہ ایک جالی دار گلابی پردہ لگا تھا، جو آگے کو ہو کر بیڈ کی پائنتی تک گرتا اور بیڈ پہ سونے والے کو جیسے ڈھک لیتا۔

باہر ٹیرس پہ گول گول میزیں تھیں۔ جن کے گرد کرسیوں کے پھول بنے تھے۔ وہاں بیٹھ کر دیکھو تو کھلا آسمان اور سارا کپادوکیہ دکھائی دیتا تھا۔ اتنی خوب صورت جگہ پہ بھی نامعلوم سی اداسی چھائی تھی۔ جہان کے بغیر اسے سب کچھ اداس لگ رہا تھا۔ اگر اس نے واقعی ریسور آف کر دیا ہوتا.....؟

”مجھے یہ کرا پسند ہے اور میری چھوٹی بلی کو بھی۔“ بظاہر بشارت سے مسکراتے اس نے مسز سونا کو اطمینان دلایا۔

آشیانہ شہر سے ذرا الگ تھلگ تھا۔ سومولوت بے نے کہہ دیا تھا کہ وہ جہاں جانا چاہیں، وہ انہیں ڈراپ کر دیں گے۔ وہ خالصتاً مہمان نواز ترک خاندان تھا۔ وگرنہ ہوٹل کا مالک جو شہر کا ڈسٹرکٹ چیف بھی ہو، کہاں اپنے مہمانوں کو ڈرائیو کر کے لے جایا کرتا ہے۔ مولوت بے کو پورا کپادوکیہ جانتا تھا۔ ان کے مہمانوں کو کسی بھی قسم کے ٹورنگ پہ خصوصی ڈسکاؤنٹ مل جاتا تھا۔ ان کا نام ”مولوت“، اردو لفظ ”نومولود“ کا ”مولود“ ہی تھا۔ ہمارے وہ نام جو ”ڈی“ ختم ہوتے ہیں۔ ترک انہیں ”ت“ پہ ختم کرتے تھے۔ وہ احمد کو ”احمت“، بلند کو بلنت اور مولود کو مولوت پکارتے تھے۔ ایسے ہی ہمارے وہ نام جن کے آخر میں ”ب“ آتا ہے۔ ترک ان کے آخر میں ”پ“ لگایا کرتے تھے۔ یوں طیب سے بنا طیب، ایوب سے ایوپ اور نہنب سے زینب۔

وہ سارا دن کمرے میں ہی رہیں۔ پھر شام کو مسز سونا اور فاتح شہر جا رہے تھے۔ تو ان کے ساتھ چلی گئیں۔ حیا کی ٹریسروالی ڈبی پرس میں ساتھ ہی تھی۔ اگر وہ ادھر ہوا تو جان لے گا کہ وہ اس کے قریب ہے۔ پتا نہیں، دل کے رشتے زیادہ مضبوط تھے یا جی پی ایس کے۔ مگر جب رات اتر آئی اور نوں نہیں، بجا تو وہ امید کھوئے لگی۔

اگلا پورا دن بھی انہوں نے کمرے میں گزارا۔ کھانا بھی وہیں منگوا یا۔ مسز سونا کے ہاتھ کے بنے سلاوا، جیلی، جام، بالکل گھر جیسا ذائقہ۔ پھر بھی وہ بہت بے زاری محسوس کر رہی تھی۔ بہارے باہر جانا چاہتی تھی۔ مگر اس نے منع کر دیا۔

”کیا عبدالرحمن کال نہیں کرے گا؟“ اس نے صبح سے کوئی دسویں دفعہ پوچھا۔

”مجھے نہیں پتا۔ فضول باتیں مت کرو۔“ بہارے کی آنکھوں میں ناراضی درآئی۔

”تم نے اگر دوبارہ مجھ سے ایسے بات کی تو میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔“

”میں نے کہا نا فضول باتیں مت کرو!“ سختی سے جھڑک کر وہ ڈرینگ روم کی طرف جانے کے لیے اٹھی۔ بہارے ناک سکڑ کر منہ

میں کچھ بڑبڑائی۔

”کیا کہا تم نے؟“ وہ جاتے جاتے جیسے تپ کر پلٹی۔

”نہیں بتاؤں گی۔“ بہارے اسے ہی غصے سے کہتی ٹیرس کی طرف چلی گئی۔

رات میں مسز سونا نہیں بلائے آگئیں۔

”تم لوگ صبح سے کمرے سے نہیں نکلے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ حسب توقع وہ فکر مند ہوئی تھیں۔ نورسٹ سیر کے لیے نہ جائے،

عجیب سی بات تھی۔

”نہیں! اصل میں ایک دوست نے استنبول سے آنا تھا، اس کا انتظار کر رہے ہیں۔ وہ آ جائے تو مل کر آپ کا کپا دو کیہ گھومیں گے۔“

اس نے جلدی سے وضاحت دی۔ پھر ان کے اصرار پر وہ دونوں ڈنر کے لیے نیچے چلی آئیں۔

مغلی منزل کا ڈائننگ ہال پتھر کی دیواروں سے بنامہم ساروشن کمر تھا۔ دو چار میزیں، کرسیاں رکھی تھیں۔ دیواروں کے ساتھ فرش نشست کی طرز کے زمین سے دوباشت اونچے پتھر کے صوفے بنے تھے۔ جن پہ بیرون ترک قالین بچھے تھے۔ اس نے بھی اسی بیرون شید کا اجڑک کا کرنا اور سیاہ ٹراڈز رہیں رکھا تھا۔ اوپر سیاہ حجاب۔

اسے حجاب سے کھاتا دیکھ کر رڑے اٹھائے ہال میں داخل ہوئی پنا ٹھٹک کر رکی، پھر سامنے کاؤنٹر پر کھڑے فاتح کو پکارا۔

”فاتح! تم کچن دیکھ لو۔ وہ کسفر نیبل نہیں ہیں۔“ اس نے انگریزی اور ترک دونوں میں کہا، کیونکہ فاتح کی انگریزی کمزور تھی۔ فاتح

”جی آپ“ کہہ کر تابعداری سے وہاں سے ہٹ گیا۔

”جھٹنکس!“ حیا ہلکے سے مسکرائی۔ دل پہ اتنی کلفت چھائی تھی کہ مسکراتا بھی دشوار لگتا تھا۔

کھانے کے بعد وہ دونوں آگے پیچھے بیڑھیاں چڑھتی اوپر واپس آگئیں۔ اس کا پاؤں درو کر رہا تھا، سو وہ آتے ہی بستر پہ لیٹ گئی اور

پیچھے دیوار سے ٹکٹا جالی دار گلابی پردہ اپنی پائنٹی تک پھیلا دیا۔ اب جت لیٹے، اسے چھت گلابی جالی کے بار دکھائی دے رہی تھی۔

”حیا! کیا تم مجھ سے ناراض ہو؟“ ساتھ لیٹی بہارے تھوڑی دیر بعد قریب کھسک آئی۔ حیا نے گردن ذرا سی ترچھی کر کے اسے دیکھا۔

”کیوں پوچھ رہی ہو؟“

”کیونکہ عاتقے گل کہتی ہے، کسی کو ناراض کر کے نہیں سوتے۔ کیا پتا صبح ہم جاگ ہی نہ سکیں۔“

”نہیں! میں ناراض نہیں ہوں۔“ وہ گردن سیدھی کر کے دوبارہ غار کی چھت کو ٹکٹنے لگی۔ ”میں بس پریشان ہوں۔“

”تم پریشانی میں یوں ہی غصہ کرتی ہو؟“

”ہاں! اور تم کیا کرتی ہو؟“

”میں؟“ بہارے ایک دم جوش سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ”میں آسمان میں اڑتی ہوں۔ ادالار کے بگلوں اور سلطان امت مسجد کے کبوتروں

کے ساتھ۔ کیا تمہیں یہ کرنا آتا ہے؟“

حیا نے چند لمحوں کے معصوم، شفاف چہرے کو دیکھنے کے بعد نفی میں سر ہلایا۔ بچپن بھی کتنا پیارا ہوتا ہے۔ کندھے اور دل بہت

سارے بوجھ سے خالی ہوتے ہیں۔

”میں تمہیں سکھاتی ہوں۔ آنکھیں بند کرو۔“

حیا نے آنکھیں بند کیں۔ وہی ایک شخص ہر جگہ نظر آنے لگا تھا۔ تکلیف کا احساس جیسے سوا ہو گیا۔

”اب تم آہستہ آہستہ ہوا میں اڑ رہی ہو..... اوپر، بہت اوپر دیکھو! تم اڑ رہی ہو۔“ ساتھ ہی وہ دبے قدموں بستر سے اترتی۔ حیا نے

پلوں کی جبری سے دیکھا۔ وہ احتیاط سے لمبی کی چال چلتی سوچ بورد تک گئی اور پٹکھل، چلا دیا۔ پھر وہ اسی طرح واپس آگئی۔

”دیکھو! اب تم اوپر ہوا میں اڑ رہی ہو۔ دیکھو! ہوا چل رہی ہے۔ آنکھیں مت کھولنا، ورنہ یہ نیچے گر جاؤ گی۔“

”ہوں!“ اس نے بند آنکھوں سے اثبات میں سر ہلایا۔ اگر زندگی کا وہ فیز کوئی خواب تھا تو واقعی وہ نیچے گرنے کے خوف سے آنکھیں

کھولنا نہیں چاہتی تھی۔ مگر حقیقت تو ہمیشہ نیچے گرا دیا کرتی ہے۔ اس نے ایک دم سے آنکھیں کھول دیں۔

”ہا! کیا کیا کیا؟“ دیکھا! نیچے گر گئیں۔ ”بہارے نے بوکھا کرا احتجاج کیا، پھر پھرتی سے اٹھ کر پٹکھا بند کیا۔ ہوا سے گلابی پردہ پھڑپھڑانے

لگا تھا۔

”اللہ تمہیں سمجھے۔“ وہ خفگی سے کہتی واپس آ کر لیٹ گئی۔

”کیا تم نے نماز پڑھی؟“ وہ نماز کے لیے اٹھنے لگی تو بہارے سے پوچھا۔ بہارے نے جھٹ خود پہ بند کمر تان لیا۔

”ہاں! میں ابھی پڑھتی ہوں۔ اوہ! میری آنکھیں بند ہو رہی ہیں۔ کھل ہی نہیں رہیں۔ اوہ.....“ اور پھر وہ لمبے بھر میں جیسے ہوش و خرد سے بے گانہ سوچتی تھی۔ حیا سر جھٹک کر رہ گئی۔ پھر وضو کرنے لگی تو فون بجنے لگا۔ راجیل کالنگ اس نے کال موصول کی۔

”کب آ رہی ہو تم واپس؟“

”یہ مت کہنا کہ تم مجھے مس کر رہے ہو۔“ وہ کھڑکی کے آگے رکھے صوفے پر بیٹھی مسکرا کر فون کان سے لگائے کہہ رہی تھی۔

”وہ تو خیر نہیں کر رہا۔ مگر ابا چاہتے ہیں کہ میری شادی اناؤنس کریں۔ ایک ویسٹریسیشن دے کر..... لیکن جب تم اور جہان آؤ گے،

تب ہی فنکشن ہو پائے گا۔“

”ہوں! گڈ فار یو۔ بس کچھ دن تک آ جاؤں گی۔“ اس نے بہت سے آنسو اندر اتارے۔ کتنے دعوے سے کہہ کر آئی تھی کہ جہان اور

وہ ساتھ واپس آئیں گے، مگر وہ تو کہیں بھی نہیں تھا۔

فون بند کر کے اس نے وضو کیا۔ پھر وہیں جائے نماز ڈال کر نماز پڑھی۔ سلام پھیر کر وہ دعا کے لیے اٹھے ہاتھوں کو یوں ہی دیکھنے لگی۔

دعا..... کتنا عرصہ ہوا، جب اس نے دعا مانگی تھی پھوڑ دی تھی جیسے ڈی جے کے لیے مانگی، ویسے پھر کبھی نہ مانگ سکی۔ کچھ تھا جو ڈی جے

کے ساتھ ہی مر گیا تھا۔ پھر معافی مانگی، استقامت مانگی، مگر دنیا مانگنا چھوڑ دی۔ لوگ، رشتے، ناتے، یہ سب دنیا ہی تو ہے..... اور یہی سب کچھ کچا پیسہ ہوتا ہے۔ اسے بھی چاہیے تھا۔ پھر لبوں پر آ کر ساری دعائیں دم کیوں توڑ جاتی تھیں؟ ایسا کیوں لگتا تھا کہ معافی ابھی تک نہیں ملی؟

وہ گم صدمہ ہی اپنے ہاتھوں کی لکیریں دیکھنے لگی۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق بھی کتنا مبہم سا تھا۔ یہ خواہش تھی کہ میں اسے اچھی لگوں، میں

اس کی مانوں، مگر مجھے اس پہ کتنا بھروسہ ہے۔ کتنا اعتبار ہے، یہاں آ کر زندگی جیسے خالی جگہ کا سوال بن جاتی تھی۔ پورے فقرے کے درمیان ایک

خالی جگہ تھی۔ ادھر کون سا لفظ لکھنا تھا۔ اس جگہ پہنچ کر وہ لکھنا بھول جاتی تھی۔

کوئی دعا مانگے، بناوہ اٹھ کھڑی ہوئی اور میز پر رکھے موبائل کی اسکرین کو انگلی سے چھوا۔ وال پیپر جھگڑا ہوا تھا۔ کتنا زہر لگتا ہے یہ وال پیپر

بالخصوص تب، جب کسی خاص ٹیکسٹ کی توقع ہو۔ پھر جائے نماز رکھی۔ دوپٹا تار کر بالوں کو انگلیوں سے سنوارا اور ڈریسنگ روم کا پردہ ہٹا کر ادھر آئی۔

بیر برش ڈریسنگ ٹیبل پر رکھا تھا۔ وہی رات سونے سے قبل سو دفعہ برش کرنے کی عادت۔ اپنے بالوں، جلد اور خوبصورتی کی حفاظت پر اسے کوئی

سمجھوتا نہ تھا۔

برش کے ساتھ نعلی پھولوں کا گلہان رکھا تھا، جس کے اندر رشتے کی ایک ڈبلی تھی جو سنہری افشاں سے بھری تھی۔ اس نے یوں ہی وہ ڈبلی

نکالی اور کھولی۔ سنہری چم چمکتی افشاں۔ اس کی پشت سے آتی بلب کی روشنی میں وہ مزید چمک رہی تھی۔

پھر ایک دم سے ڈبلی افشاں پہ چھایا سی بن گئی۔ جیسے اس کے اور بلب کے درمیان کوئی آڑ آ گئی تھی۔ کسی خیال کے تحت اس نے سراٹھا

کر آئینے میں دیکھا۔

اس کے عکس کے پیچھے کوئی کھڑا تھا۔

افشاں کی ڈبلی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ ایک زوردار، شاکد سی چیخ حلق سے نکلنے ہی لگی تھی کہ پیچھے کھڑے شخص نے سختی سے اپنا

ہاتھ اس کے لبوں پہ جمادیا۔

”شش..... چیخنا نہیں..... آواز باہر جائے گی اور پھر یہ ساری فیملی بھاگتی ہوئی آ جائے گی۔“ وہ چہرہ اس کے قریب کیے دھیمی سرگوشی

میں بولا تھا۔

حیا کی آواز ہی نہیں، سانس بھی جیسے گر گیا تھا۔ وہ بھٹی بھٹی، بے یقین نگاہوں سے دم سادھے آئینے کو دیکھ رہی تھی۔ چند لمبے لمبے

اس کے اعصاب کو ڈھیلا پڑنے میں اور پھر اس نے ایک نڈھال سے احساس کے تحت آنکھیں بند کر کے کھولیں۔

جہان نے آہستہ سے اپنا ہاتھ ہٹایا۔

سنہری افشاں اس کے ہاتھوں سے ہوتی ہوئی قدموں میں جاگری تھی۔ اس کی انگلیاں، فرش، پیر کا گٹوٹھا، ہر جگہ سونے کے ذرات

چمکے تھے۔ ایک لمبے کوس نے دونوں ہاتھ ایک دوسرے سے جھاڑ کر افشاں اتارنی چاہی، مگر وہ پورے ہاتھ پہ پھیل گئی تھی۔ وہ دھیرے سے اس کی

جانب پلٹی۔ وہ ابھی تک شاکد اور شل تھی۔

”تم..... تم ادھر کیا کر رہے ہو؟“ خالی خالی نگاہوں سے جہان کا چہرہ دیکھتے ہوئے وہ بدقت کہہ پائی۔
 ”یہی سوال میں تم سے پوچھنے آیا ہوں۔“ تم ”ادھر کیا کر رہی ہو؟“ وہ جیسے ڈھیروں غصہ ضبط کر کے سختی سے بولا۔
 ”تم اندر کیسے آئے؟“ حیا کا دماغ ابھی تک سن تھا۔ وہ جواب دیے بنا آگے بڑھا اور ڈریسنگ روم کا پردہ برابر کر دیا۔ بیڈ روم کا منظر چھپ گیا۔ بھروسہ حیا کے مقابل دیوار سے ذرائع نگاہ کو جھڑکی جیبوں میں ہاتھ ڈالے منتظر سا کھڑا تھا۔ وہ جیسے علیحدہ جگہ تفصیل سے بات کرنا چاہتا تھا۔

اس کے حواس ڈھیرے ڈھیرے بحال ہونے لگے۔ وہ اپنے سنہری ذرات والے ہاتھ اضطرابی انداز میں ایک دوسرے سے ہلتی، ڈریسنگ ٹیبل کے کنارے پہنچ گئی، پھر کھلے بال کانوں کے پیچھے اڑے۔ سنہری ذرات سیاہ بالوں پہ بھی ٹھہر گئے، مگر اسے پتا نہیں چلا۔
 ”اگر مجھے ذرا سا بھی اندازہ ہوتا کہ تم میرے پیچھے ادھر آ جاؤ گی تو میں تمہیں کبھی نہ بتاتا کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔“
 ”تمہارے پیچھے؟“ اس نے جیسے تملاکر سر اٹھایا۔ بس ایک پل لگا تھا۔ اسے اپنے ازلی انداز میں واپس آنے میں۔ ”تم نے مجھے کب بتایا کہ تم کہاں جا رہے ہو؟ تم بھول گئے ہو شاید، تم تو بغیر کچھ کہے سے ہی آ گئے تھے۔“

”اچھا تمہیں نہیں پتا تھا کہ میں کیا دو کیہ میں ہوں؟“ وہ اسی طرح جیسوں میں ہاتھ ڈالے کھڑا بغور اسے دیکھ رہا تھا۔
 ”مجھے کیسے پتا ہو سکتا ہے؟ تمہیں لگتا ہے، میں تمہارے لیے اتنا ٹریول کر کے آؤں گی؟“ اس نے جیسے افسوس بھری حیرت سے سر جھٹکا۔ ”میں تو خود تمہیں ادھر دیکھ کر حیران ہوں..... اور تم نے مجھے کیسے ڈھونڈا؟ بلکہ ایک منٹ۔“ وہ جیسے رکی۔ ”ڈی جے اور مجھے کیا دو کیہ آتا تھا اسپرنگ بریک میں۔ اودہ! تم یہ بات جانتے تھے۔ شاید ”تم“ میرے پیچھے آئے ہو۔ کیا ایسا ہی ہے؟“ اس نے لاء پیچرز سے سن رکھا تھا کہ جب اپنا دفاع کمزور ہو تو مخالف پہ چڑھائی کر دینی چاہیے۔ وہ اپنے دفاع کے چکر میں پڑ کر پسپائی اختیار کر لیتے ہیں۔
 ”نہیں! میں اتنا فارغ نہیں ہوں کہ تمہارے لیے ادھر آؤں گا۔“

”میں بھی اتنی فارغ نہیں ہوں۔ حد ہے۔“ جہان نے ایک گہری نظر اس پہ ڈالی۔ اس کے بال دیسے ہی ماتھے پہ ذرا بکھرے سے تھے۔ شیوہ بلی کی بوجھ ہوئی تھی۔ اور سفید رسی پوری آستین کی ٹی شرٹ کو کنبوں سے موزا ہوا تھا۔
 ”اور اس کو کیوں لائی ہو؟“ اس نے ابرو سے پردے کی جانب اشارہ کیا، جس کے پار بیڈ روم تھا۔ حیا نے بظاہر لاپرواہی سے شانے اچکاۓ۔

”اس کے پاسپورٹ کا مسئلہ تھا کوئی۔ وہ بے کار ادھر رہ رہی تھی، پھر ابانے کہا تھا میں اکیلی نہ جاؤں اور میں نے سوچا کہ.....“
 ”کہ باڈی گارڈ ساتھ لے جاؤں۔ ہے نا؟“
 ”کیا ہے جہان! میں کیا دو کیہ گھوم پھر بھی نہیں سکتی اپنی دوستوں کے ساتھ؟“ وہ تنک کر کہتی، اپنی انگلی میں پلائئم بینڈ گھمانے لگی۔
 سنہری افشاں سے انگوٹھی بھر چکی تھی۔ جہان تھوڑی دیر بغور جا بھتی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔
 ”ٹھیک ہے! میں نے مان لیا کہ تم میرے لیے نہیں آئیں اور تمہیں بالکل علم نہیں تھا کہ میں ادھر ہوں۔ بہر حال اکل صبح قیصری سے ایک فلائٹ اتار کر ایئر پورٹ کے لیے نکل رہی ہے..... اور ایک صبح گورجن کے لیے۔ تم کون سی لوگی؟“ بہت سنجیدگی سے اس نے استنبول کے دونوں ایئر پورٹس کے نام لیے۔

”کیا مطلب؟ میں واپس نہیں جا رہی۔ میں نے تو ابھی کیا دو کیہ دیکھا بھی نہیں۔“
 ”ہرگز نہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ تم یہاں رہو۔ تم ادھر یوں اکیلے کیسے رہ سکتی ہو بھلا؟“
 ”یہ میرا مسئلہ ہے..... اور میں اکیلی نہیں ہوں۔ ہم دو ہیں۔ تم میری فکر مت کرو۔ وہ کرو، جس کے لیے تم ادھر آئے ہو..... اور ویسے مجھے ڈھونڈنے کے علاوہ تم یہاں کس مقصد کے تحت آئے ہو؟“

”مجھے بہت سے کام ہیں زمانے میں.....“ کہتے کہتے وہ ایک دم رکا۔ حیا کا دل زور سے دھڑکا۔ جہان نے کالہ پہ بندھی ٹھنڈی دیکھی، پھرنی میں سر ہلایا۔

”میں زیادہ دیر ادھر نہیں رک سکتا۔ تم کل واپس جا رہی ہو حیا!“
 ”میں نہیں جا رہی۔ تمہیں کیا پراہم ہے میرے ادھر رہنے سے؟“ اسی پل کمرے میں رکھے اس کے موبائل کی میسج نون بجی۔ وہ بات

روک کر ڈریسنگ ٹیبل کے کنارے سے اٹھی اور پردہ ہٹا کر میز تک گئی۔ جہاں نے گردن موڑ کر اس کے قدموں کو دیکھا۔

”پاؤں کو کیا ہوا ہے؟“

میز سے موبائل اٹھا کر ہوئے اس کا دل لمبے پھر کو تھا۔ اللہ اللہ، اس آدمی کی نظریں؟ اس سے کوئی بات مخفی کیوں نہیں رہتی؟ اس نے تو پاؤں پہ پٹی بھی نہیں باندھی تھی۔ چل بھی بالکل ٹھیک رہی تھی، پھر بھی اف!

”میرے پاؤں کو؟“ موبائل لے کر واپس مڑتے اس نے حیرت سے گردن جھکا کر اپنے پاؤں کو دیکھا۔

”اوہ! یہ افشاں مگر گئی تھی۔ وہ ہی لگ گئی ہے۔“ ساتھ ہی اس نے اٹھوٹھا قالین سے رگڑا۔ سرخ قالین کا وہ حصہ فوراً چم کرنے لگا، مگر

پاؤں سے افشاں نہیں اتری۔

”مٹھے، ایڈی کو کچھ ہوا ہے۔ موج آئی ہے یا پاؤں مڑ گیا؟“ وہ گردن ترچھی کر کے اس کے پاؤں کو دیکھتا کہہ رہا تھا۔

”نہیں! میرے پاؤں تو بالکل ٹھیک ہے۔ مگر وہ..... اب میں سمجھی۔“ موبائل پہ ہالے کا فارورڈ میسج چیک کر کے وہ سر ہلاتی اس کی طرف آئی۔ ”تم مجھے واپس بھیجنے کے لیے بہانہ ڈھونڈ رہے ہو۔“

جہاں نے نظر اٹھا کر اس کو دیکھا۔ ایک تو جب بھی وہ یوں دیکھتا، بلکتا تھا اندر تک دل کا سارا حال جان لے گا۔

”ٹھیک ہے! تم ادھر میری وجہ سے نہیں آئیں اور تمہارے پاؤں کو بھی کچھ نہیں ہوا۔ مجھے ابھی جانا ہے۔ ہم اس بارے میں بعد میں

بات کریں گے۔“

”پھر کب ملو گے؟“ وہ دروازے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ وہ بے اختیار کہہ نہی۔ جہاں نے رک کر اسے اسی طرح دیکھا۔

”جب تم میرے لیے آئی ہی نہیں ہو تو پھر دوبارہ ملنا؟“

”ابھی خود ہی تو تم نے کہا کہ بعد میں بات کریں گے ورنہ مجھے کیا۔“ اس نے خفگی سے شانے اچکائے۔ جہاں نے ذرا مسکرا کر

سر جھٹکا۔

”کل دوپہر ایک بجے شارپ..... مجھے کنویں پہ ملنا۔“

”کون سا کنواں؟“

”نادام! آپ میرے لیے نہیں، کپادوکیہ کی سیاحت کے لیے آئی ہیں تو آپ کو یہاں کی تمام ٹورسٹ اٹریکشن کا علم تو ہو گا۔ کل ہم

کنویں پہ ملیں گے..... اور دھیان رکھنا، کنواں کافی گہرا ہے۔ تمہیں کلاسٹر فوبیا تو نہیں ہے؟“ وہ جیسے یاد آنے پہ جاتے جاتے پلٹا۔ حیانے نفی میں گردن ہلاتی۔

”اوکے۔“ اس نے دروازہ کھولا۔ احتیاط سے اطراف میں جھانکا، پھر باہر نکل گیا۔ بہارے اسی طرح سو رہی تھی۔ حیانے دروازہ بند

کیا اور پھر بے اختیار دل پہ ہاتھ رکھ کر، آنکھیں بند کر کے گہرا سانس لیا۔ ایک دہلی مسکراہٹ اس کے لبوں پہ بکھر گئی۔

بہت اسامٹ بننا تھا جہاں۔ شاید وہ اس سے زیادہ اسامٹ تھی کہ اس نے اسے ڈھونڈ ہی نکالا تھا۔ ہاں اس کے سامنے یہ نہیں مانے گی

کہ وہ اس کے لیے آئی ہے۔ جس بندے نے اسے خوار کیا، اس کو تھوڑا بہت خوار کرنے کا حق تو اسے بھی تھا۔

وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے واپس آئی اور ہیز برش اٹھاتے ہوئے آئینے میں دیکھا۔ اجرک کے کرتے پہ سائے، بالوں پہ کانوں

کے قریب اور دونوں ہاتھوں پہ افشاں لگی تھی۔ ازنبلی اسٹون کے فرش پہ ڈبی ابھی تک اتنی پڑی تھی۔ وہ ڈبی اٹھانے کے لیے نہیں جھکی۔ افشاں کی

سب سے پیاری بات یہ تھی کہ اسے جتنا خود سے اتارنے کی کوشش کرو، یہ پھیلتی چلی جاتی ہے اور جس کو چھوٹی ہے، اس کو چمک عنایت کر دیتی ہے۔

”دوپہر ایک بجے شارپ۔“ اس نے ذریعہ مسکراتے ہوئے اپنے عکس کو دیکھتے برش بالوں میں اوپر نیچے چلانا شروع کیا۔ ابھی اسے

سو دفعہ برش کرنا تھا۔

☆ ☆ ☆

صبح آشیانہ کے اطراف کے پہاڑوں پہ بہت سہانی اتری تھی۔ کپادوکیہ کو جیسے اس کا حسن واپس مل گیا تھا۔

اس نے بہارے کو تیار ہونے کو کہا، پھر مزید کچھ نہیں بتایا۔ بہارے ابھی بال بنار ہی تھی۔ وہ اسے وہاں چھوڑ کر، اپنے عیال اور اس کا رف

کو پین لگاتے ہوئے نیچے چلی آئی۔ آج اس کا موڈ بہت خوش گوار تھا۔

فاتح استقبال کاؤنٹر پہ تھا۔ وہ لابی بھی چھوٹے سے پتھر لیے کمرے کی مانند بنی تھی۔ غاروں میں غار.....
 ”صبح بخیر آ!“..... جلدی سے سب کام چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

”شکریہ فاتح!“ وہ اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ ”ایک بات پوچھنی تھی۔ یہاں آس پاس کوئی کنواں ہے؟“
 ”کنواں؟“ فاتح نے اچھبے سے دہرایا۔ ”پتا نہیں کنویں ہیں بہت سے، مگر آپ کس کی بات کر رہی ہیں؟“

”کوئی ایسا کنواں جو نورسٹ اٹریکشن ہو اور جو کافی گہرا ہو۔“ فاتح کو بات سمجھانے کے لیے اسے آہستہ آہستہ الفاظ ادا کرنے پڑے۔
 ”فاتح نے تذبذب سے نفی میں سر ہلایا۔

”نہیں! یا میں ایسے کنویں کو نہیں جانتا۔ ویران کنڈر کنویں مل جائیں گے، مگر سیاحتی مرکز مشکل ہے۔“
 ”سوچو فاتح! کوئی بہت گہرا سا کنواں ہو گا اور سوچو نا۔“ اس کے دل میں بے چینی سی انگڑائی لینے لگی۔ اللہ سمجھے جہاں سکندر کو کبھی انسانوں کی زبان میں بات نہیں کرے گا۔ پھر ایک سیٹیلیٹ؟

”مجھے واقعی کسی گہرے کنویں کے بارے میں نہیں پتا۔“ وہ ذرا دیر کو رکا۔

”آپ گہرے کنویں کا تو نہیں پوچھ رہی ہیں؟“

”اتنی دیر سے میں اور کیا پوچھ رہی ہوں فاتح؟“

”نہیں، نہیں! آپ کسی کنویں کا پوچھ رہی ہیں۔ اصلی کنویں کا جو گہرا ہو..... یا آپ ”گہرے کنویں“ کا پوچھ رہی ہیں؟“
 ”دونوں میں کیا فرق ہوا؟“ اس نے سوالیہ ابرو اٹھائی۔ شاید وہ کسی منزل کے قریب تھی۔

”دیکھیں آپ!“ فاتح دونوں ہاتھ ہلاتے ہوئے نوٹی پھوٹی انگریزی میں کہنے لگا۔ ”ایک ہوتا ہے کنواں جس سے لوگ پانی نکالتے ہیں۔ ان کے بارے میں میں زیادہ نہیں جانتا۔ اور ایک ہے ”گہرا کنواں“، مگر وہ کنواں نہیں ہے۔ وہ..... وہ یلتاد شہری ہے۔“

”یلتاد شہری..... مطلب؟“ اس نے نا سمجھی سے پوچھا۔ فاتح نے بے بسی سے اسے دیکھا، پھر نفی میں سر ہلایا۔ اسی بل مسز سونا لانڈری باسکٹ اٹھائے وہاں داخل ہوئیں۔ فاتح نے فوراً انہیں پکارا۔

”سونا خانہ یلتاد شہری کو انگریزی میں کیا کہیں گے؟“

”لانڈر گر اوٹڈ شی۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”ایک منٹ مسز سونا! وہ مجھ سے کمرے میں افشاں گر گئی تھی۔ وہ صاف ہو جائے گی نا؟“

”ہاں! فکر نہ کرو۔ پناہ کر لے گی۔“ اسے مطمئن کر کے وہ باہر نکل گئیں۔

”لانڈر گر اوٹڈ شی آپ! وہ ایک زیر زمین شہر ہے، جس کا نام ”دیرین کیو“ یعنی گہرا کنواں ہے۔ آپ اس کا پوچھ رہی تھیں؟“
 حیا پر یقین نہیں تھی۔

”شاید! میں نے کپادوکیہ کے زیر زمین شہروں کا سنا تو ہے، مگر وہ تو بہت سے ہوں گے۔ کیا یہ ”دیرین کیو“ کوئی مشہور اسپاٹ ہے؟“
 ”یہ کپادوکیہ سب سے بڑا یلتاد شہر ہے آپ! مگر آپ کو کلاسٹر فونیما تو نہیں ہے؟“

وہ جیسے چونکی..... اور پھر ایک دم اس کے دل کی دھڑکن بڑھ گئی۔

”نہیں..... اور ہاں! مجھے یہیں جانا ہے۔ بالکل یہی جگہ ہے۔“ وہ جیسے بہت پُر جوش ہو گئی تھی۔
 ”پھر آپ پناہ کے ساتھ چلی جائیں، وہ آج تو شہر جاری ہے۔ گارنٹیڈ کی دو اینی ہے۔“

”ٹھیک ہے!“ وہ ایک دم اتنی خوش ہوئی کہ اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ فاتح نے ذرا اچھبے سے اسے مڑ کر جاتے دیکھا۔ آشیانہ کے کسی مہمان کو اس نے کلاسٹر فونیما نہ ہونے پر اتنا پُر جوش ہوتے پہلی دفعہ دیکھا تھا۔



ترکی کے صوبہ ”نوشہر“ کا وہی معنی تھا، جو پاکستان کے شہر ”نوشہرہ“ کا ہے۔ ”دیرین کیو“ یہاں کا سب سے بڑا زیر زمین شہر تھا۔ ایسے سینکڑوں شہر کپادوکیہ میں موجود تھے، جو کم سے کم بھی دو منزلہ تھے۔ جیسے تہہ خانے ہی تہہ خانے ہوں۔ گئے زمانوں میں کپادوکیہ کے باسیوں (عیسائی آبادیوں) نے یہ شہر بنائے تھے تاکہ جنگ کے دنوں میں ان میں پناہ لی جا سکے۔ ان کے پاس شہر کے دہانوں کو مکمل طور پر بند کرنے کا نظام

بھی موجود تھا۔ پانی، خوراک، روشن دان، نکاسی اور اخراج کا نظام، غرض یہ تمام انتظامات سے آراستہ مکمل شہر تھے۔ بس ان سے آسمان نظر نہیں آتا تھا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں عیسائی یہاں سے چلے گئے تھے۔ اب برسوں سے یہ شہر ویران تھے۔ چند سال پہلے ان کو سیاحوں کے لیے کھول دیا گیا تھا۔

”دیرین کیو“ کی آٹھ منزلیں سیاحوں کے لیے کھلی تھیں۔ دیرین کا مطلب گہرا اور کیو یعنی کنواں۔ اردو میں گہری دوتی اور دشمنی کے لیے استعمال ہونے والا لفظ ”دیرینہ“ کا ماخذ بھی یہی ”دیرین“ تھا۔

مولوت بے، اسے، بہارے اور پنا کو ایک لمبی ڈرائیو کے بعد دیرین کیو لے آئے تھے۔ وہ گاؤں کو لے کر خود شہر چلے گئے اور وہ تینوں شہر کی داخلی سڑک کی طرف آ گئیں، جہاں سیاحوں کی لمبی قطار لگی تھی۔ دیرین کیو باہر سے یوں لگتا جیسے ایک چھوٹی پہاڑی ہو جس کی دیواروں میں بہت سے سوراخ تھے۔ یوں جیسے کوئی جادوگر نے خاک چھڑا کر جگہ کی بیٹی ہو اور اس کے چنے سے بہت سی آنکھیں جھانک رہی ہوں۔ داخلی سڑک، غار کے دہانے پر پدہ چھوٹا سا راستہ تھی جس سے اندر جانا تھا۔ باہر دھوپ لگی تھی، لیکن سرنگ دور سے ہی اندھیری لگ رہی تھی۔

”یہ سوئٹزرلینڈ کا شاید ضرورت پڑ جائے۔“ پنا نے خود بھی ہلکا سا سوئٹزرلینڈ لیا تھا اور اب دوسرا اس کی طرف بڑھا رہی تھی۔ جیانے حیرت سے اسے دیکھا پھر چلپلاتے سورج کو۔

”اتنی گرمی میں؟“

”رکھ لو۔“ پنا کے دوبارہ کہنے پر اس نے سوئٹزرلینڈ کے بازو پٹا لیا، سیاہ پرس دوسرے کندھے پر تھا۔ بہارے نے پنا کی انگلی پکڑ رکھی تھی۔ بالوں کو پونی میں باندھے وہ دھوپ کے باعث آنکھیں کیڑے کھڑی تھیں۔

اپنی باری پکٹ دکھا کر وہ آگے پیچھے سرنگ میں داخل ہوئیں۔ باہر دھوپ تھی۔ اندر اندھیرا سا پھیلا تھا۔ کپادوکیہ کے غاروں اور تنگ پہاڑوں کی مہیب، پراسرار خوشبو ہر سو پھیلی تھی۔ گائیڈ ان سب سیاحوں کی رہنمائی کرتا جا رہا تھا۔ رش کا تھنا اور راہ داریاں تنگ۔ بعض جگہ تو اتنی تنگ ہوتیں کہ دونوں کندھے اطراف کی دیواروں سے ٹکراتے اور بعض جگہ گردن جھکا کر کمرے میں داخل ہونا پڑتا۔

چند راہ داریاں اور سڑکیں اسے گزر کر وہ سب سیاح ایک بڑے کمرے میں جمع تھے، جہاں شور مچا تھا۔ سیاحوں کے سوال اور انچی آواز میں بولتا گائیڈ، عجیب مچھلی بازار بنا رہا تھا۔ وہ بول رہے تھے۔ جہاں کا کوئی اتنا پتا نہیں تھا اور فی الوقت اسے یہ جاننے میں دلچسپی نہیں تھی کہ شہر کا روشن دان یا پانی کا نظام کس طرح کام کرتا تھا، سو وہ پنا کی طرف مڑی۔

”تم بہارے کا خیال رکھنا..... میں بس آ رہی ہوں۔“

”تم کہاں جا رہی ہو؟“ بہارے پریشانی سے کہہ اٹھی۔

”میں اپنے طور پر اندر سے یہ شہر دیکھنا چاہتی ہوں۔ تم پنا کو تنگ تو نہیں کرو گی؟“

بہارے نے نفی میں سر ہلا دیا، البتہ وہ اس کے جانے پر خوش نہیں تھی۔

”تم جاؤ! میں چھوٹی بمی کا خیال رکھوں گی۔“

وہ اس کمرے سے آگے کھسک آئی۔ کمرے ہی کمرے، راہ داریاں، محرابی چوٹیاں، جیسے دی می کا سینٹ ہو۔ دیواروں پر دور دور مشعلوں کی مانند بلب لگے تھے، جو اندھیر گلیوں کو دم ہمزاد روشنی بخش رہے تھے پراسرار، مگر خوبصورت۔

وہ سیاحوں کے جگمگنے سے ذرا آگے آئی تو ایک دم ٹھنڈا احساس ہوا۔ پنا ٹھیک کہتی تھی۔ اس نے گھر سے سوئٹزرلینڈ کے اوپر پہن لیا اور بن سائن سے کھلے رہنے دیے۔ وہاں آس پاس کوئی نہیں تھا اور ڈراگھٹن والی جگہ تھی تو نقاب ٹھوڑی تک نیچے کر لیا۔

وہ یوں ہی طویل راہ داریوں میں آگے چلتی جا رہی تھی کہ دفعتاً.....

”حیا!“ کسی نے اس کے کندھے کو ہلکا سا چھوا تو وہ ڈر کر دو قدم پیچھے ہٹے ہوئے مڑی۔ سانس ایک لمحے کو رکھا تھا، مگر پھر بحال ہو گیا۔

”بس! ڈر گئیں؟“

خاک کی پینٹ، بھوری آدھے آستین کی ٹی شرٹ، کندھے پر بھورا دوتی بیک اور سر پر سیاہ پی کیپ۔ وہ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے بہت سنجیدگی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ لمحے بھر کو تو کچھ کہہ نہیں پائی۔

”ہائیں! اتنی جلدی ڈر گئیں اور کل مجھے کسی نے کہا تھا کہ وہ اکیلے کپادوکیہ میں رہ سکتی ہے۔“

چونکہ ابھی وہ گزشتہ رات کی طرح نہیں ڈری تھی، سو لمبے بھر میں خود کو سنبھال چکی تھی۔
”کل کسی نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ اکیلی نہیں ہے۔“

”اوہ! تمہارا بڑی گاڑ تو بھول گیا تھا۔ ابھی کدھر ہے وہ؟“ وہ دونوں نیم روشن راہ داری کے وسط میں آسنے سانسے کھڑے تھے۔
”میں مان ہی نہیں سکتی کہ تمہیں معلوم نہیں ہے کہ وہ کہاں ہے۔“

جہان ایک نظر اس سے ڈال کر دائیں طرف ایک کمرے میں داخل ہو گیا۔ وہ اس کے پیچھے چلی آئی۔ وہ ایک بڑا سا کمرہ تھا۔ زیر زمین شہر کا کچن۔ ایک طرف زمین پہ چوکور چولہا بناتھا (جیسے پاکستان میں گاؤں میں مٹی کے چولہے ہوتے ہیں) اور دوسری طرف دیوار میں کھڑکی کی مانند چوکور بڑا سا خلا تھا۔ اسے اپنا کچن یاد آیا، جہان سے لاؤنج میں جھانکنے کے لیے آدھی دیوار جتنا خلا تھا۔
”کچھ کہا تھا میں نے کل حیا!، وہ اس کھلی بغیر پٹ کی کھڑکی کے ساتھ ٹیک لگائے جیسوں میں ہاتھ ڈالے کھڑا ہو گیا۔“
”کیا؟“ وہ انجان بن گئی۔

”تم واپس جا رہی ہو یا نہیں؟“

دیوار پہ لگے بلب کی روشنی جہان سے نکرا کر گزرتی تھی، یوں کہ سامنے والی دیوار پہ اس کا سایہ پڑنے لگا تھا۔ حیا اس کے بالکل مقابل چولہے کی چوکی پہ آکر بیٹھ گئی۔ اس کا سایہ جہان کے سامنے کے مقابل گرنے لگا۔ وہ اصل میں کافی فاصلے پہ بیٹھے تھے، مگر ایک ہی دیوار پہ گرتے آسنے سامنے بیٹھے سامنے کافی بڑے اور قریب لگ رہے تھے۔
”اور میں نے یہ بھی کہا تھا کہ میں واپس نہیں جا رہی۔“
”مگر کیوں؟“ وہ جیسے اکتا گیا۔

”کیونکہ میں تمہارے لیے نہیں، کہا دو کیہ دیکھنے آئی ہوں اور دیکھ کر ہی جاؤں گی۔“

”مگر میں چاہتا ہوں کہ تم یہاں سے چلی جاؤ۔ اتنے دن کیسے رہو گی ادھر؟“

”میں نے وہ ویڈیو کھولی تھی۔“ جہان کے چہرے کے بجائے اس کے سامنے کودیکھتے ہوئے وہ ایک دم بہت رसान سے بولی۔
”لمبے بھر کو پورے زیر زمین شہر میں سناٹا چھا گیا۔ جہان بالکل چپ ہو گیا۔ اسے لگا، وہ ابھی ہنس دے گا، پھر اسے رکنے کو کہے گا،

مگر.....

”تو؟ تمہیں ابھی تک انداز نہیں ہوا کہ میں کیوں تمہیں یہاں سے بھیجنا چاہتا ہوں؟“ وہی تنجید کی بھرا خشک انداز۔ اسے دھچکا سا لگا۔
کوئی اپنائیت، کوئی راز بانٹ دینے والا احساس نہیں۔ وہ تو ویسا ہی تھا۔

”نہیں! مجھے واپس نہیں جانا..... اور میرے یہاں ہونے سے تمہیں کیا مسئلہ ہے؟“ اس کی آواز میں دبا دبا غصہ در آیا۔
”مجھے تمہاری فکر ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم محفوظ رہو اور یہ محفوظ جگہ نہیں ہے۔“

کھڑے سامنے نے اتنے ہی غصے سے سر جھٹکا تھا۔ تب ہی زیر زمین شہر کی دیواروں نے بیٹھے سامنے کو اٹھتے اور کھڑے سامنے کے سامنے آ کر رکھتے دیکھا۔

”اور واپس جانے سے میں محفوظ ہو جاؤں گی جہان بے؟“

”ہاں! بالکل۔“ مجھے یہاں سے دو چار دنوں میں انقرہ چلے جانا ہے، پھر وہاں سے ایک اور شہر اور ادھر سے شام۔ میں شام سے چند دنوں میں اسلام آباد واپس آ جاؤں گا۔ میں تم سے وہیں ملوں گا۔ ہو سکتا ہے روہیل کے ولیمہ میں ہم دونوں ساتھ ہوں۔ اس لیے ابھی تم چلی جاؤ۔“
”کیا گاڑی ہے اس بات کی؟ ہو سکتا ہے واپسی پہ میری فلائٹ کریش کر جائے؟“

چند لمبے کے لیے وہ واقعی کچھ کہہ نہیں سکا، مگر مدھم مدھم شعل کی روشنی میں بھی حیا نے اس کی بے تاثر آنکھوں میں کچھ فحشی ہوتے دیکھا تھا۔
”ایسے مت کہہ دو۔ اس کی آواز دھیمی ہو گئی۔

”نہیں جہان بے! مجھے بولنے دو۔ ہاں! پھر کیا گاڑی ہے کہ میں وہاں محفوظ رہوں گی؟ ہو سکتا ہے کوئی پرانا دشمن مجھے گاڑی تلے پھل

دے؟“

”حیا! میں.....“

”ہو سکتا ہے یہ ہمارا آخری سفر ہو۔ کیا تب بھی تم اسے میرے ساتھ نہیں کرنا چاہو گے؟“ اس کی آواز دیرین کیونکی دیواروں سے ٹکرا کر پلٹ رہی تھی مگر اب اس میں آنسو بھی شامل تھے۔

”میں صرف تمہیں محفوظ دیکھنا چاہتا ہوں حیا“ وہ جیسے بے بسی سے بولا تھا۔
”اور تم خود؟“

”میرا کیا ہے۔ میرے لیے رونے والا کوئی نہیں ہوگا۔ مگر مجھے تمہاری فکر ہے۔ اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ.....“
”تم یہ چاہتے ہو، تم وہ چاہتے ہو، تم ہر وقت صرف اپنا کیوں سوچتے ہو جہاں! تم ہر چیز پلان کر کے کیوں رہنا چاہتے ہو؟ تم ہر وقت دوسروں کو آزماتے کیوں رہتے ہو؟“

”حیا! اسے جیسے دکھ پہنچا تھا۔ وقت پیچھے چلا گیا تھا وہ اس کا خنجر بریلے ہاؤس توڑ چکا تھا اور وہ اس پہ چلا رہی تھی۔
”نہیں! مجھے بولنے دو۔ آج مجھے بولنے دو۔ جتنا تم مجھے آزما یا۔ اس سے آدھا بھی میں تمہیں آزماؤں گا تو تم بہت مشکل میں پڑ جاتے۔“ وہ غصے سے بلند آواز میں بول رہی تھی۔ دیوار پر گرتے سائے اصل سے زیادہ قریب کھڑے تھے۔

”تم یہ سمجھتے ہو کہ ہر دفعہ تم چیزیں پلان کر دو گے اور سب تمہاری مرضی کے مطابق ہو جائے گا، پھر بعد میں لوگ تمہاری باتوں کے دوسرے مطلب ڈھونڈتے پھریں اور اس دوران کس کا دل کتنا ٹوٹے، تمہیں کب پروا ہوتی ہے۔ تم دوسروں کا کبھی نہیں سوچتے۔ مگر ہر دفعہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ ہر دفعہ دوسرے تمہاری طرف کی کہانی نہیں سمجھ لیں گے۔ یہ کر لو تو وہ ہو جائے گا، وہ کر لو تو یہ ہو جائے گا۔ میں مزید تمہارے ان پلانز کے مطابق نہیں چل سکتی۔“

بولنے بولنے اس کا سانس پھولنے لگا۔ جہاں نے ہاتھ جیسوں سے نکال کر سینے پہ لپیٹ لیے اور دائیں جو گھر سے زمین کو کھرچتا وہ سپاٹ چہرے کے ساتھ سن رہا تھا۔

”اور بھی جو کچھ اندر بھرا ہے میرے خلاف، وہ بھی کہہ دو۔“

”میرے اندر جو بھی بھرا ہوا، تمہیں پروا نہیں ہے۔ تم مجھ سے میرے ہر حقے پہ بحث کر کے چپ چاپ چلے آئے۔ اگر تمہیں میرے ہر حقے سے مسئلہ نہیں تھا تو پھر تم نے ایک دفعہ بھی کوئی امید، کوئی وضاحت کیوں نہیں دی؟ کیا یہ مناسب تھا کہ تم مجھے یوں چھوڑ کر آتے اور سارے خاندان میں میرا اتنا شائبہ؟ تم ہر دفعہ یہ سمجھتے ہو کہ بعد میں تم دوسرے کو مانا لو گے۔ کیا مانا لینے سے دل پہ لگے زخم مٹ جاتے ہیں؟ سخت لکڑی پہ بھی کلباڑی کی ایک ضرب لگاؤ تو ساری عمر کے لیے نشان رہ جاتا ہے۔ میں تو پھر انسان ہوں۔ کیا تم ساری زندگی یہی کرتے رہو گے؟“
اس کی آواز درد سے پھٹنے لگی۔ جہاں کا بے تاثر، سپاٹ ہوتا چہرہ دیکھ کر اسے اور بھی غصہ چڑھنے لگا۔ جب سے وہ غصے سے بولنے لگی تھی، تب سے اس کا چہرہ بے تاثر پڑ گیا تھا۔

”اور اگر مجھے کوئی گڑبگ ملے تو پھر کس کو وضاحتیں دینے آؤ گے؟ مگر تم نہیں سمجھو گے۔“

وہ بے بسی بھرے دکھ کے ساتھ کبھی چلتی اور تیز تیز قدموں سے چلتی باہر نکلی۔ پھولا تنفس اور آنکھوں میں جمع آنسو۔ اذیت ہی اذیت تھی۔ وہ بھی کس کو سمجھا رہی تھی؟ وہ پروا ہی کہاں کرتا تھا؟

راہ داری میں سبک قدموں سے چلتی وہ بے آواز روتی آگے بڑھتی جا رہی تھی، پھر ایک کمرے میں بیٹھنے کو دیکھی ہی چوکی نظر آئی تو جا کر ادھر بیٹھ گئی اور چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کر بے اختیار روئے لگی۔ چہرہ اس لیے ڈھانپا تھا کہ گہرے کنویں کی قدیم دیواریں اس کے آنسو نہ دیکھ سکیں، سُرنگ اس کی سسکیاں نہ سن سکے اور مصنوعی شعل کی روشنی میں اس کے ہچکیوں سے لرزتے وجود کا سایہ نہ پڑے مگر آنسو، سسکیاں اور لرزش ڈھانپ لینے سے بھی نہیں ڈھکتیں۔

وہ بھی کس کو سمجھانا چاہ رہی تھی؟ وہ کہاں اس کی مانتا تھا؟ وہ اس کے ساتھ کپا دو کیہ میں رہنا چاہتی تھی، جتنے بھی دن وہ ادھر ہے، مگر وہ اسے اب بھی ہمیشہ کی طرح زبردستی واپس بھیج دے گا۔ بے بسی سی بے بسی تھی۔

اس نے بھیجا چہرہ اٹھایا۔

سُرنگ، بحرابی چوٹیں بھول بھلیاں، سب سناں بڑی تھیں۔ وہ وہاں نہیں تھا۔ دیوار پہ گرتا سایہ اکیلا تھا۔ جہاں اس کے ساتھ نہیں تھا۔ اپنے غصے میں وہ سب بھول جایا کرتی تھی، یہ بھی کہ ایک دفعہ پھر وہ ہمیشہ کی طرح اسے چھوڑ کر آگئی تھی۔ وہ سب باتیں کہہ کر جو وہ صرف اس کو

ہرٹ کرنے کے لیے کہہ رہی تھی۔ اس کا مطلب وہ ہرگز نہیں تھا۔ اس نے دل سے وہ سب نہیں کہا تھا۔

اللہ، اللہ اس نے یہ کیا کر دیا؟ وہ اب کیسے آئے گا اسے منانے؟

”جہاں! وہ بدحواسی کے عالم میں ابھی اور راہ داری کی طرف آئی۔ وہ دائیں سے آئی تھی یا بائیں سے؟ شاید دائیں سے۔“ ہتھیلی کی

پشت سے گال رگڑتی وہ اس جانب بھاگی۔

ایک موڑ، دوسرا دائیں طرف وہ کمر اچھاں ابھی دوسارے ٹکرائے تھے، اب وہ خالی تھا۔ وہ وہاں نہیں تھا۔

”جہاں!“ آنسو پھر سے اس کی آنکھوں میں جمع ہونے لگے۔ وہ کہیں بھی نہیں تھا۔ اس نے پھر سے اسے کھودیا تھا۔

مزید اس سے دیرین کیودیکھا نہیں گیا۔ وہ الٹے قدموں واپس مڑی۔ بمشکل سیڑھیاں ملیں اور باہر جانے کا راستہ سمجھ آیا۔ گائیڈ،

سیاح، ابھی تک وہیں تھے۔ بہارے اور پناہ بھی ایک طرف کھڑی تھیں۔ اس نے بہارے کا ہاتھ تھاما اور اپنی متورم، سرخ آنکھیں چھپانے کی سعی

کیے بغیر بس اتنا بولی۔

”واپس چلتے ہیں۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

”کیا ہوا؟“ پناہ حیران اور پھر پریشان ہو گئی، مگر وہ کوئی جواب دیے بغیر کونوں کے داخلی روزن کی طرف بڑھ گئی۔ جہاں سے

سورج کی روشنی جھانک رہی تھی۔

وہ تینوں سُرنگ میں آگے پیچھے چلتی گئیں۔ غار کا اندھیرا چھٹنا گیا اور بالا خر غار کے دہانے پہ سورج سے چمکتا، روشن دن سامنے

کھڑا تھا۔

وہ کہیں نہیں تھا۔ کہیں بھی نہیں۔

پناہ نے پھر کوئی سوال نہیں پوچھا۔ بہارے جو بے چین ہو رہی تھی، اس کو بھی چپ کر دیا۔

اس کا دل بار بار پھر رہا تھا۔ وہ کیوں پھر سے اسے چھوڑ گئی۔ آخر کیوں وہ روٹھنے منانے سے آگے نہیں بڑھتے تھے؟

اپنے کمرے میں آ کر وہ سرخ صوفے پہ کھڑکی کے آگے پاؤں اوپر کر کے بیٹھ گئی اور سر گھٹنوں میں دے کر بے آواز روئے جاری

تھی۔ بہارے پتا نہیں کہاں تھی۔ وہ ہر خیال و فکر سے بے پروا بس آنسو بہا رہی تھی۔ اس کا دل بار بار اس کی خوف کے زیر اثر سکڑ جاتا تھا۔

بہارے اسے کھانے کے لیے بلانے آئی، مگر وہ نہیں ابھی۔ دوپہر کی روشنی آہستہ آہستہ بجھنے لگی اور شام کا اندھیرا کپا دیکھ پہ پھیلنے لگا۔

ہر سو پہاڑوں پہ زرد بتیاں جگمگانے لگیں۔ وہ اسی طرح صوفے پہ سر گھٹنوں میں دے بیٹھی رہی۔ آنسو بھی پانی سے بنے ہوتے ہیں اور پانی آسمانوں

سے اتارا جاتا ہے۔ سو آنسوؤں کے بعد کا ہر دم بھی وہیں اوپر سے آتا ہے۔ نیند نہ سکون نیند۔ اس پہ کب نیند طاری ہوئی، اسے پتا بھی نہیں چلا۔

ذہن میں، دل میں، آنکھوں کے پیچھے، ہر جگہ زیر زمین شہر کی سُرنگ کا منظر اُٹا رہا تھا۔ وہ غصے میں اس پہ چلا رہی تھی اور وہ دھیمے لہجے میں اسے پکار

رہا تھا۔

”جیا..... بات سنو!“

”مگر وہ اسے سننا نہیں چاہ رہی تھی۔ وہ اس سے فاصلے پہ کھڑا تھا، پھر بھی پتا نہیں کیسے، وہ اس کا شانہ ہولے سے ہلا رہا تھا۔

”جیا.....! اشوا! میری بات سنو۔“ بہت دھیرے سے وہ کہہ رہا تھا۔ چاندی کے مجسمے پھر سے واپس لوٹ آئے تھے۔ گہرے کونوں کا

اندھیرا چھٹنا گیا۔ چاندی کی جمیل ہر سو پھیلی تھی۔ اس نے ایک جھٹکے سے آنکھیں کھولیں۔

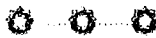
کمرے میں مدھم سی روشنی بکھری تھی۔ اس کے صوفے کے سامنے میز کے کنارے پہ بیٹھا جہاں بہت مکان سے اسے دیکھ رہا تھا۔

اسے آنکھیں کھولتے دیکھ کر وہ جھٹکے جھٹکے سے انداز میں مسکرایا۔

”دیکھ لو..... تم میرے لیے کپا دو کیہ نہیں آئیں، مگر میں ہر دفعہ تمہارے لیے آ جاتا ہوں۔ پھر بھی کہتی ہو مجھے پروا نہیں ہے؟“

وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی۔ بنا پلک جھپکے وہ یک ٹک اسے دیکھنے لگی۔ پھر اچانک ہی بہت سے آنسو اس کی آنکھوں سے نپ نپ

گرنے لگے۔



باب 14

وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی۔ سانس روکے، بنا پلک جھپکے وہ ایک نکل اسے دیکھنے لگی۔ بھرا چانک بہت سے آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ کرنے لگے۔

”جہان! آئی ایم سوری۔“ وہ بھیگی آواز میں کہتی، اسی طرح اسے دیکھ رہی تھی۔ کہیں پلک جھپکنے پہ منظر غائب نہ ہو جائے۔ ”میں نے وہ سب جان بوجھ کر نہیں..... میں بس غصے میں.....“

”میری بات سنو!“ اسی دھیسے لہجے میں کہتے ہاتھ اٹھا کر اس نے حیا کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ”تمہاری ساری باتیں ٹھیک تھیں۔ تم نے صحیح کہا تھا۔ میں واقعی بہت دفعہ بہت غلط چیزیں کر جاتا ہوں۔“

”نہیں..... میرا وہ مطلب نہیں تھا۔ میں تو.....“ اس نے احتجاجاً کچھ کہنے کی سعی کی مگر وہ نہیں سن رہا تھا۔

میں جانتا ہوں کہ میں کوئی ہر وقت بننے مسکرانے والا آدمی نہیں ہوں۔ میں پہلے بھی بہت دفعہ کہہ چکا ہوں کہ میں ایک پریکٹیکل آدمی ہوں، ایک سپر ہیرو نہیں ہوں، مجھے دوسروں کے دل رکھنے نہیں آتے، میں لوگوں پہ جلدی یقین نہیں کرتا، شک کرتا رہتا ہوں، اور میری جانب نے مجھے ذرا سبے حس بنایا ہے۔ میں اب بہت پرائیویٹ پرسن بن گیا ہوں یا شاید ہمیشہ سے ایسا تھا۔ کیا تم نے دوپہر سے کچھ کھایا؟“ اپنی رو میں کہتے، ایک دم سے اس نے پوچھا۔ اگر وہ توقف کے بعد استفسار کرتا تو وہ کہہ دیتی کہ اس نے کھایا ہے، مگر وہ حملہ اتنا شدید تھا کہ اس کا سر خود بخود گئی میں بل گیا۔

”نہیں..... ہاں..... بس مجھے بھوک نہیں تھی۔“ اس نے بات بنانے کی کوشش کی۔ اب وہ آنسو پونچھ چکی تھی، اور یہ اس کے لیے تجالٹ کا باعث ہوتا اگر وہ جان لیتا کہ حیا نے اس کی وجہ سے تب سے کچھ نہیں کھایا۔ مگر وہ جان چکا تھا۔

”نہیں تم نے کچھ نہیں کھایا۔ اور مجھے پتا ہے کہ لوگوں سے جواب کیسے اگلوئے جاتے ہیں۔“ وہ میز کے کنارے سے اٹھا اور دوسرے کونے میں رکھی انگریز ٹی کی طرف گیا۔ وہاں ایک چھوٹی سی میز پہ بہارے کے پاپ کارن کے دو پیکٹ پڑے تھے، اور اوپر دیوار میں ایک بلٹ ان مائیکرو ویو اوون نصب تھا۔

”کیسے اگلوئے جاتے ہیں؟“ اس کی پشت کو دیکھتے ہوئے وہ وہیں بیٹھے بیٹھے بولی۔ وہ اب مائیکرو ویو اوون کا ڈھکن کھولے کھڑا، پاپ کارن کا ایک پتلا سائیکٹ اندر رکھ رہا تھا جس میں صرف مکئی کے دانے تھے۔ ٹائم سیٹ کر کے اس نے اوون کا ڈھکن بند کیا، اسے اشارت کیا اور واپس اس تک آیا۔

”اگر تم کسی سے سچ بلوانا چاہتی ہو، فرض کرو اپنے لبا سے، تو ان سے سوال تب پوچھا کرو جب وہ ڈرائیو کر رہے ہوں۔ ڈرائیو کرتے ہوئے لوگ عموماً سچ بولتے ہیں۔“

”اور مجھے کیسے پتا چلے گا کہ کون سچ بول رہا ہے اور کون جھوٹ؟“ وہ بس بات کو طول دینا چاہتی تھی تاکہ جہان کچھلی بات بھول جائے اور وہ اپنے الفاظ دہرائے جانے کی شرمندگی سے بچ جائے۔

”جھوٹ بولنے والے کے چہرے پہ دس عدد بہت واضح نشانیاں آ جاتی ہیں، اس وقت جب وہ جھوٹ بول رہا ہوتا ہے۔“

اوون ”زوں“ کی آواز کے ساتھ چل رہا تھا۔ مکئی کے دانے پچھنے کی آواز وقفہ وقفے سے سنائی دے رہی تھی۔

”ایک تو ہو گئی نگاہیں چرانا، باقی نوکون سی ہوتی ہیں؟“ وہ اب صوفے پہ پاؤں نیچے کر کے، دوپٹہ ٹھیک سے شانوں پہ پھیلا کر ذرا تمیز سے بیٹھ چکی تھی۔ کھلے بال چہرے کے دائیں جانب آگے کو ڈال دیے تھے۔ جامنی پلین لمبی قمیض، زیتون رنگ دوپٹے اور چوڑی دار کی ہمر ای میں بھی اس کے چہرے کو بشاشت نہیں دے پا رہی تھی۔ متورم آنکھیں اور زرد پرتی رنگت، ساری دوپہر کی کہانی واضح تھی۔

”نگاہیں چرانا؟ نہیں، لوگ جھوٹ بولتے ہوئے نگاہیں نہیں چراتے۔ یہ غلط تاثر ہے۔ ان فیکٹ جھوٹ بولتے ہوئے لوگ آپ کی

آنکھوں میں ضرور دیکھتے ہیں، اور وہیں سے وہ پکڑے جاتے ہیں۔“

”تم نے آخری دفعہ سچ کب بولا تھا؟“ کمرے میں اب بھی ہوئی مکئی کی خستہ سی خوشبو پھیلنے لگی تھی۔

”ابھی ڈیڑھ منٹ پہلے، جب میں نے کہا تھا کہ تمہاری ساری باتیں ٹھیک تھیں۔“
چلو جی۔ وہ بھروسہ میں پہنچ گیا تھا۔

”جہاں... آئی ایم سوری... میں نے وہ دل سے نہیں کہا تھا۔“

”لیکن میں دل سے ہی کہہ رہا ہوں۔ تم نے ٹھیک کہا تھا۔ شاید یہ واقعی ہمارا آخری سفر ہو۔“

اودن میں زور کا چاند ہوا۔ شیشے کی ڈش پر رکھے پکٹ میں پڑا کوئی دانہ بھن کر چھول گیا تھا شاید۔ اس کے اندر بھی کچھ سٹکا تھا۔
”ایسے مت کہو۔“ وہ تڑپ کر اسے روکنا چاہتی تھی۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ اگر وہ نہیں چاہتا تو وہ ادھر نہیں رکے گی۔ صبح ہوتے ہی اسے چھوڑ کر چلی جائے گی۔ مگر وہ نہیں سن رہا تھا۔

”تم نے صبح کہا تھا۔ ہر وقت کی پلاننگ ٹھیک نہیں ہوتی۔ میرے منصوبے بھی بہت دلچسپ تھے۔ لیکن پڑے ہیں۔ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ اپنی ذاتی زندگی میں مجھے اس چیز سے باز آ جانا چاہیے۔ یا کم از کم اس سفر کے لیے ہی سہی۔“
وہ سانس لینے لگا۔ ”میں تمہیں ہمیشہ سے وہ سب بتانا چاہتا تھا، مگر نہیں بتا سکا۔ مجھے معلوم تھا کہ تم میری بات نہیں سمجھو گی، جیسے کل رات سے نہیں سمجھ رہے ہو، مگر تم بھی صحیح ہو۔ مجھے ہر وقت اپنی مرضی ٹھونسنی چاہیے۔“
”جہاں!“ وہ اسے مزید بولنے سے روکنا چاہتی تھی۔ اس کا اپنا دل بھی اودن کی شیشے کی پلیٹ کی طرح گول گول گھومتا کسی منجھدار میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔

”بہت دلچسپ تھا کہ میں تمہیں وہ سب بتانا چاہتا تھا جو میں نے اس ویڈیو میں محفوظ کیا تھا، مگر میں یہ نہیں کر سکا۔ میں کچھ پالنے کے بعد کھونے سے ڈرتا تھا۔ یا شاید مجھے تم پر اعتبار نہیں تھا، کہ تم مجھے سمجھو گی۔ اب شاید تم سمجھو، مگر اس وقت تم نہ سمجھتیں۔“
وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اس وقت وہ واقعی نہ سمجھ پاتی۔ مگر اب وہ ایسی باتیں نہ کرے۔ اس کا دل دکھ رہا تھا۔
”جو ہو گیا، سو ہو گیا۔ میں وہ سب دوبارہ نہیں دہرانا چاہتا۔ اب بھی مجھے تمہارے یہاں رہنے سے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میں صرف اس لیے فکر مند تھا کہ مجھے کل انفرہ جانا ہے ایک ہفتے کے لیے، پھر واپس کپادو کیا آ جاؤں گا اور کچھ دن بعد واپس اپنے ملک چلا جاؤں گا۔ مجھے صرف یہی پریشانی تھی کہ تم میرے بغیر ادھر اکیلی نہ رہو۔ ویسے بھی تم کپادو کیہ دیکھنے کے لیے آئی ہو، میرے لیے نہیں۔“ یہاں وہ ذرا تھکا کان سے مسکرایا۔ حیا کا دل چاہا، کہہ دے، نہیں میں تمہارے لیے آئی ہوں مگر انا اور خود داری دیوار میں گئی۔

”میں اکیلی نہیں ہوں۔“ کہنے کے ساتھ اس نے ایک نظر بستر پر گلابی پردے کے پیچھے سوئی بہارے پہ ڈالی۔ ”یہ لوگ بہت اچھے ہیں۔ بہت خیال رکھتے ہیں۔“ پھر ایک دم وہ چوکی۔ ”کہیں تم نے تو انہیں نہیں کہا کہ میرا خیال رکھیں؟“
”اب اتنا فارغ نہیں ہوں میں کہ ہر جگہ تم پر نظر رکھوں گا۔ مولوت بے اس علاقے کے ڈسٹرکٹ چیف ہیں، اور یہ اپنے ہر کاہک کے ساتھ ایسے ہی پیش آتے ہیں۔ مہمان نواز ترک قوم، یونو۔ لیکن تم نے اچھا کیا کہ ان کے ہوٹل آئی۔ یہ کافی محفوظ اور اچھا ہوٹل ہے۔ ایسے مشکوک نظروں سے مت دیکھو مجھے، میں نے واقعی ان کو کچھ نہیں کہا۔“ وہ ذرا تھا ہوا تو حیا نے شانے دھیرے سے اچکائے۔ اودن کب کا بند ہو چکا تھا۔
سارے کمرے میں بچے بکئی کے دانوں کی خوشبو پھیلی تھی۔

”تو کیا اب میں یہاں رہ سکتی ہوں؟“

”ہاں، جب تک چاہو رہو۔ لو۔ کل میں چلا جاؤں گا، واپسی تک اگر تم یہیں ہوتی تو ہم دوبارہ مل لیں گے۔“
”انفرہ کیوں جاتا ہے؟“ اس نے ایک فطری طور پر ذہن میں آنے والا سوال پوچھا تھا، مگر جہاں چند لمحے بہت خاموش نظروں سے

آستہ دیکھتا رہا تھا۔

”ایک کام ہے۔“

”کیسا کام؟“ اس کے انداز میں سمجھتا کہ وہ پوچھنے کا انداز لگا۔

”ایک کام ادھورا چھوڑ آ تھا، جب ابا کی ڈیوٹی ہوئی تھی تب میں اسی لیے جرمنی میں تھا۔ اب میرے پاس چند دن ہیں، تو سوچا اس کو مکمل کر لوں۔“ بات ختم کر کے وہ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا، جیسے وہ اس کے استفسار کا منتظر تھا۔ جیسے اگر وہ پوچھے تب بھی وہ نہیں بتائے گا، پھر بھی وہ جانتا تھا کہ وہ پوچھے۔

حیائے چند لمے سوچا، پھر اثبات میں سر ہلادیا۔

”اوکے!“ بات ختم۔ اس نے اس موضوع کو نہ کریدنے کا فیصلہ کیا تھا۔

”مگر اب ایسے مت کہنا کہ یہ ہمارا آخری سفر ہو سکتا ہے۔“

”غلط نہیں کہہ رہا۔ میں ترکی دوبارہ نہیں آسکوں گا ترکی کے لیے اب ناکارہ ہو چکا ہوں، سواس ملک میں ہو سکتا ہے یہ آخری.....“

”کہہ رہی ہوں ناکہ ایسے مت کہو۔“ وہ صوفیہ اپنے دونوں اطراف تھیلیاں رکھ کر اٹھنے لگی تو جہان نے رکنے کا اشارہ کیا۔

”ایک منٹ۔ میری بات ابھی ختم نہیں ہوئی۔“

وہ اٹھتے اٹھتے واپس بیٹھ گئی۔

”جینے والے ہم ساتھ ہیں، سب کچھ میری مرضی سے ملے ہوگا۔ سارے پروگرام، سارے شیڈول، کہاں ملنا ہے، کہاں جانا ہے، سب

میں ڈیٹا کر دوں گا، اور تم کسی بات سے انکار نہیں کرو گی۔“

حیائے اثبات میں سر ہلادیا۔ اس کا اجازت دینا ہی بہت تھا، اب کیا بحث کرتی۔

”کیا تم پاپ کارن کھاؤ گے؟“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ جہان نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے ہولے سے ہاتھ سے کنپٹی کو مسلا۔ شاید اس

کے سر میں درد تھا۔

”میں بس چلوں گا۔“ وہ اٹھا، دیوار میں لٹے سوئچ بورڈ پر لائٹ کا ناب گھمایا (جیسے ہمارے ہاں بچے کے ناب ہوتے ہیں)۔ کمرے

میں جتنا واحد زرد لمبہ دم ہوتا گیا۔ پھر اس نے کھڑکی کا پردہ ذرا سا سرکا کر باہر دیکھا۔

حیائے اوون کا ڈھکن کھولا، اور گرم گرم پھولا ہوا پاپ کارن کا پیکیٹ نکالا۔ جہان تب تک کھڑکی کے سامنے سے ہٹ کر دوبارہ سے

بقی تیز کر چکا تھا۔ (اگر ڈی جے ہوتی تو کہتی کہ ایسی باتیں ہماری یونیورسٹی میں بھی پائی جاتی ہیں۔ لیکن اگر وہ ہوتی تو پھر مسئلہ کیا ہوتا؟)

”آشیانہ کے نئے مہمان آگئے ہیں غالباً۔ باہر رش ہے۔ اس کے چھٹنے تک انتظار کرنا ہوگا۔“ وہ صوفیہ پہ اسی جگہ بیٹھتے ہوئے بولا

جہاں ابھی وہ بیٹھی تھی۔

”تم تھکے ہوئے لگ رہے ہو، چاہو تو لیٹ جاؤ۔ میں آتی ہوں۔“

اسے وہیں چھوڑ کر وہ ڈیرنگ روم میں آئی تاکہ وہاں سنگھار میز پر رکھا شیشے کا بڑا پیالہ اٹھالے۔ اس جگہ پہ فرش پہ ابھی تک افشاں

کے ذرات دکھائی دیتے تھے، حالانکہ پنا نے صاف بھی کیا تھا۔

پیالہ اٹھا تے ہوئے اس نے آئینے میں خود کو ایک نظر دیکھا تو جھٹکا سا لگا۔ سرخ متورم آنکھیں، زرد پڑتا چہرہ۔ اللہ، اللہ، وہ اتنی دیر

سے ایسی لگ رہی تھی؟ وہ بھی کیا کہتا ہوگا کہ وہ اس کے ”غم“ میں رو رہی تھی؟

پیالہ چھوڑ کر وہ ہاتھ روم میں گئی، سنک کے اوپر جھک کر منہ پہ پانی کے چھینٹے مارے، پھر تویلیے سے چہرہ تھپتھپایا، بال برش کیے، اور ذرا

خود کو کمپوز کرتی باہر آئی۔

جہان اسی طرح سر ہاتھوں میں دیے بیٹھا تھا۔

”جہان!“ اس نے نخطا انداز میں پکارا۔ جہان نے اسی بل سر جھکائے جھکائے، ہاتھ کی پشت سے مونوں کے اوپر چھوا۔ خون کے

قطرے۔ وہ کھڑکی کی کھڑی رہ گئی۔

”جہان، تمہارے ناک سے خون آ رہا ہے۔“

وہ بنا کچھ کہے تیزی سے اٹھا اور ہاتھ روم کی طرف لپکا۔ حیات تیسری پیچھے آئی اور کھلے دروازے سے دیکھا۔ ٹوٹی فل کھولے، وہ سنک پہ

جھکا، ناک اور چہرے پہ پانی ڈال رہا تھا۔

وہاں کھڑے ہونا اسے مناسب نہ لگا تو واپس صوفیہ پہ آ کر بیٹھ گئی۔ پتا نہیں اسے کیا ہوا تھا؟ ایسے اچانک.....؟

چند منٹ گزرے کہ وہ تویلیے سے گلیلا چہرہ خشک کرتا باہر آیا۔

”کیا ہوا تھا؟“ وہ ہلکے مندی سے اسے دیکھنے لگی۔ وہ جواب دیے بنا اس سے افاصلے پہ صوفیہ پہ بیٹھا اور تویلیہ اس کے ہاتھ پہ ڈال دیا۔

”تکسیر کیوں پھوٹی؟ اتنی گرمی تو نہیں ہے، کیا پہلے بھی کبھی ایسا ہوا ہے؟“

”کتنے سوال کرتی ہوا“ وہ جیسے اکٹا گیا۔

”جتنے بھی کروں، مجھے حق ہے اس کا۔ اب بتاؤ کیا ہوا تھا؟“

جہان نے نقاہت بھری نظروں سے اسے دیکھا، اور پھر چند لمحے تک یونہی دیکھتا رہا۔ ایسے ہی ابھی وہ انقرہ کے ”کام“ کے متعلق بات کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

”اردو میں بات کرتے ہیں جیا، وہ جاگ رہی ہے۔“

جیانے چونک کر بہارے کی طرف گردن موڑ لی چاہی تو جیسے مگڑ کر بولا

”ہاں اب تم اس کو دیکھنے لگ جاؤ تاکہ اسے پتا چل جائے کہ ہم اس کی بات کر رہے ہیں۔“

”سوری!“ اس کی گردن خفیف سی آدھے راستے سے پلٹ آئی۔ ”مگر تمہیں کیسے پتا کہ وہ جاگ رہی ہے؟“

”اس کے پاؤں کا انگوٹھا تناؤ کی پوزیشن میں ہے، پیشانی پر پڑے بل، اور پلکوں کی لرزش۔ مجھے پتا ہے وہ نہیں سوری۔ وہ مجھے دیکھتے ہی سوتی بن گئی تھی، اسے ڈر ہے کہ میں اسے ڈانٹوں گا۔“ یہ آدی بھی نا، کبھی کسی کو انساؤں کی نظر سے نہیں دیکھے گا۔

”اچھا اب بتاؤ، تمہیں کیا ہوا تھا؟“

نکسیر پھوٹنے کی وجہ کوئی عام ہی بھی ہو سکتی تھی مگر اس کا انداز اس بات کا غماز تھا کہ کچھ ہے جو وہ چھپانا بھی چاہتا ہے مگر بتانا بھی چاہتا ہے۔ چند لمحے وہ بالکل خاموش رہا کئی کے دانوں کی خوشبو ہر گزرتے پل باسی ہوتی گئی، پھر اس نے دھیرے سے کہنا شروع کیا۔

”انقرہ میں میری سرجری ہے۔ انزاکریٹل (کھوپڑی کو کھول کر کی جانے والی) سرجری۔“ اس نے رک کر حیا کے تاثرات دیکھے۔ وہ بنا پلک جھپکے، سانس روکے اسے منتظری دیکھ رہی تھی۔

”جب میں جیل میں تھا تو مجھے ادھر آکھ کے قریب ایک زخم آیا تھا۔ یہاں ایک کھل گئی تھی۔ ایک اعشاریہ ایک انچ کی کیل۔ یہ سر درد، اور کچھ عرصے سے نکسیر پھوٹنے کی تکلیف، یہ سب اسی کی وجہ سے ہے۔ اس کو نکالنے کے لیے سرجری کروانی ہوگی۔ نہ کروائی تو یہ مسلسل درد اور اس کے آگے تر یول کرنے کا خطرہ رہے گا۔ اور اگر سرجری ناکام ہوگئی تو بینائی جا سکتی ہے یا مستقل معذوری۔ جب اب کیا کیو۔ تھ ہوئی، تب میں اسی لیے جرمنی میں تھا، مگر تب میں ہمت نہیں کر سکا۔“

”اچھا!“ جہان کی توقع کے برعکس جیانے سمجھ کر اثبات میں سر ہلایا۔ کوئی شدید تاثر دینے بغیر وہ بولی۔ ”پہلے جرمنی سے کروانے گئے تھے تو اب انقرہ سے کیوں؟“

”ان دنوں میرا ترکی سے باہر رہنا ضروری تھا، جبکہ ابھی مجھے کچھ دن ادھر لگ جائیں گے، میں اس وقت کو ضائع نہیں کرنا چاہتا۔“ وہ بس خاموشی سے اسے دیکھ گئی۔

”کل میری سرجری ہے۔ میں ایک گھنٹے بعد انقرہ کے لیے نکل جاؤں گا۔ اگر سب ٹھیک ہو گیا تو واپس آ جاؤں گا، تب تک تم.....“

”جب تک میں تمہارے ساتھ ہوں گی۔ ابھی ہماری ڈیل ہوئی ہے کہ میں یہاں تمہارے ساتھ رہوں گی۔“

”نہیں، ہماری بات کپا دو کیہ کی ہوئی تھی۔“ وہ قطعیت سے کہتا منع کرنا چاہ رہا تھا مگر وہ کچھ نہیں سن رہی تھی۔

”تم نے کہا تھا ”یہاں“ اور یہاں سے مراد میں نے ترکی لیا تھا۔ ہماری ڈیل ترکی کی ہوئی تھی۔ جب تک تم یہاں، یعنی ترکی میں ہو، میں ادھر رہ سکتی ہوں۔ تم بتاؤ، کون سا ہسپتال ہے، اور کب جانا ہے؟“ وہ اتنے اٹل لہجے میں کہہ رہی تھی کہ وہ زیادہ تر ڈونڈ کر پایا۔

”اس کا کیا کروگی؟“ اس نے ذرا تذبذب سے بنا اشارہ کیے بہارے کا پوچھا۔

”فکر نہ کرو، اسے ہسپتال نہیں لاؤں گی، کچھ کر لوں گی۔ تم بس مجھے شیڈول سمجھاؤ۔“ پھر وہ اس کی کئی ہر بات نوٹ کرتی گئی۔ جب ساری باتیں ختم ہو گئیں، اور پاپ کارن کی خوشبو ہوا میں رچ بس کرنا ہوگئی تو وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ آشیانہ کے صحن کا رشب اب چھٹ چکا تھا۔

”تم ایک دفعہ پھر سوچ لو کہ تم میرے ساتھ آنا چاہتی ہو یا نہیں۔“

میں تمہیں اپنی وجہ سے مسکوں سے دو چار نہیں کروانا چاہتا۔“ دروازے پر پہنچ کر وہ یہ کہنے کے لیے رکا تھا۔

”اب جاؤ، اور میرا وقت ضائع مت کرو، مجھے صبح کے لیے پیکنگ بھی کرنی ہے۔“

اس کے باہر نکلتے ہی اس نے زور سے دروازہ بند کیا، پھر اسے لاک کیا، اور تیزی سے ہاتھ روم کی طرف آئی۔

دونوں ہاتھ بین کے دہانوں پر رکھے، چہرہ جھکائے، چند گہرے گہرے سانس لے کر اس نے خود کو کمپوز کرنا چاہا۔ اتنی دیر سے جہان کے سامنے جتنے ضبط اور مشکل اس نے جواں سُرور رکھے تھے، وہ تیزی سے اہل پڑے۔ وہ ایک دم دہلی دہلی سسکیوں سے رونے لگی تھی۔

پانچ سال..... پانچ سال سے وہ اس تکلیف میں مبتلا تھا، اور اس نے کبھی کسی کو نہیں بتایا؟ وہ کیوں ہر شے، ہر دکھ اپنے اندر رکھتا تھا؟ کیوں باقی سب کی طرح غموں کا اشتہار لگا کر ہمدردیاں نہیں سینٹا تھا؟ کتنی ہی دفعہ صائمہ بتائی، تایا فرقان، جتی کہ ابانے بھی اسے جتایا تھا کہ وہ اپنے باپ کے جنازے پہ نہیں آیا۔ وہ آگے سے چپ رہا تھا۔ ایک دفعہ بھی نہیں بتایا کہ وہ اس دفت آپریشن بمیل پہ تھا۔ کیوں تھا وہ ایسا کہ وہ محبت لینے کی کوشش بھی نہیں کرتا تھا اور پھر بھی اس سے محبت ہو جاتی تھی؟

اس کی آنکھوں سے گرتے آنسو سنک کے دہانے سے لڑھک کر جالی داؤ منور تک پھسل رہے تھے۔ وہاں ایک کونے میں خون کا ایک ننھا سا قطرہ ابھی تک لگا ہوا تھا۔ جہان نے سارا سنک صاف کر دیا تھا، مگر یہ پھر بھی رہ گیا۔ اس نے اٹھی کے پورے پہ وہ قطرہ اٹھایا اور ڈبڈبائی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

کیا اس کے ملک کے جوانوں کا خون اتنا ارزاق تھا کہ یونہی بہتا رہے اور کسی کو فرق بھی نہ پڑے؟ زندگی بھی بعض دفعہ ہم سے ہماری بساط سے بڑھ کر قربانی مانگ لیتی ہے۔

کچھ دیر بعد وہ منہ ہاتھ دھو کر باہر آئی تو وہ صوفہ جہاں کچھ دیر قبل چاندی کے مجسموں کا بیسرا تھا، اب ادھر اس کی چھوٹی بلی بیٹھی پاپ کارن کے پیالے سے، ایک ایک دانہ اٹھا کر منہ میں ڈال رہی تھی۔ اسے آتا دیکھ کر معصومیت سے مسکرائی۔

”کھاؤ گی؟“ ساتھ ہی پیالہ بڑھایا۔

”توجھنکس۔“ اس کی بھوک مرگئی تھی۔ اور بھی بہت کچھ مرسا گیا تھا۔ وہ اپنا بیگ الماری سے نکالنے لگی۔

”عبدالرحمن سے تم پہلے بھی ملی تھیں نا، اور تم نے مجھے نہیں بتایا۔“ کیا اس نے میرے بارے میں کچھ کہا؟

”بہارے ہم انفرہ جارہے ہیں۔“

پاپ کارن ٹوٹتا اس کا ہاتھ رک گیا۔ بھوری آنکھوں میں شدید تحیر درآ یا۔

”کیوں؟“

”بس، ایک کام ہے مجھے۔ کچھ پیرورک کا مسئلہ ہے۔ دو چار دن میں واپس آ جائیں گے۔“ اس کی تسلی و سمجھ کے مطابق جواب دیتی وہ اپنا سامان سینٹنے لگی۔ بہارے ابھی ابھی سی پی ٹی رہ گئی۔ پاپ کارن کا پیالہ اس نے بے دلی سے میز پر رکھ دیا۔ اسے کھانا شاید ان تینوں میں سے کسی کا نصیب نہیں تھا۔



انفرہ اتنا ہی خوبصورت، اور صاف ستھرا سا شہر تھا جتنا کہ استنبول مگر اس سے نہ وہ شہر دیکھا گیا، نہ ہی کچھ اونٹن اس پاس کیا ہو رہا ہے، اسے کچھ خبر نہیں تھی۔ اس کا دل، دماغ اور ساری توجہ بس ایک نقطے پر تھی۔ آج جہان کا آپریشن ہے۔

اس نے جہان کے ہاسپٹل سے دو بلاک چھوڑ کر ایک ہوٹل میں کمرہ لیا تھا۔ بہارے کو البتہ وہ ہاسپٹل کے اندر لے کر نہیں جاسکتی تھی، اور اسے ہوٹل میں تنہا چھوڑنے کو دل نہیں مانتا تھا۔ وہ اپنی کوس کے پاس چھوڑے؟ اور ہر مسئلہ کی طرح اس میں بھی اسے خیال کا خیال آیا تھا۔

”ہالے، میں کیا کروں؟“ فون پہ ہالے کتھوڑی بہت جمع تفریق کے ساتھ ساری بات بتا کر وہ اب اس سے مدد مانگ رہی تھی۔

”یہ تو کوئی مسئلہ نہیں۔ میری نانی انفرہ میں رہتی ہیں، جو ایڈریس تم بتا رہی ہو، وہاں سے کافی قریب گھر ہے اُن کا۔ تم صبح بجی کو وہیں چھوڑ دیا کرو۔ پھر شام میں لے جانا۔ چاہو تو تم بھی وہیں رہ لو۔“

اوہ، ہالے کی نانی۔ اسپرنگ بریک میں جب آپریشن اسٹوڈنٹس ترکی کی سیر کو گئے تھے تو ان کے ڈورم بلاک سے جو بھی انفرہ گیا، ہالے کی نانی پاس ضرور گیا تھا۔

”مگر تم نے واقعی اس کو انفرہ نہیں کیا نا؟“ وہ ہنستے ہوئے پوچھنے لگی، پھر اچانک جیسے اسے یاد آیا۔ ”وہ ہوٹل گریڈ والا لڑکا دو دفعہ آیا تھا۔ میں نے بتایا کہ تم نہیں ہو مگر وہ بھی مصر تھا اور..... ایک منٹ۔ تم تو از میر میں تھیں۔ پھر انفرہ.....؟“

”اوہ ہاں، وہ میں آج ہی ادھر آئی ہوں، مگر اسے مت بتانا۔“ اور یہ بات تو ابھی تک اس نے جہان کو بھی نہیں بتائی تھی۔ شاید اس لیے

کہ اس سے بڑے مسائل اس کے سامنے تھے۔

ہالے کی بانی صبیحہ نور اتنی ہی بے مشفق، ملنسار اور مہمان نواز خاتون تھیں جتنی کہ ترک عوام ہو سکتی تھی۔ اور ایک وہ لوگ تھے، اسلام آباد میں اس کی یونیورسٹی میں تھی ہی غیر ملکی اور بالخصوص ترک لڑکیاں پڑھنے آئی ہوئی تھیں، مجال ہے جو وہ کبھی کسی کو اپنا شہر گھمانے لے گئی ہو۔ پتا نہیں کیوں مگر ہم پاکستانی اسٹوڈنٹس کے پاس ایسے کاموں کے لیے وقت ہی نہیں ہوتا۔

سب سے اچھی بات یہ ہوئی کہ صبیحہ آئی نے بتایا، مسز عبداللہ، مہر اور عروہ کل ان کے پاس رہنے آ رہی تھیں۔ ڈی جے اور اس کی ہوٹ فیملی، پہلا کھانا، پلاؤ اور مسوری دال کا چور بہ۔ بعض لوگوں کا نام بھی کسی کتاب کے سرورق کی طرح ہوتا ہے، سنتے ہی یادوں کا ایک بے کراں سمندر ہر سوائے آتا ہے۔

صبیحہ آئی کو اپنا مسئلہ سمجھا کر، کہ ایک دوست کے لیے اسے ہاسپٹل جانا ہے اور بہارے ادھر نہیں رہ سکتی، اس نے بہارے کو طبعاً لے جا کر چند ایک ہدایات مزید کیں۔

”تم اچھی لڑکی بن کر رہو گی نا؟“

بہارے نے اثبات میں سر ہلادیا۔ البتہ وہ خوش نہیں لگ رہی تھی۔ ”تم مجھے روز چھوڑ کر چلی جایا کرو گی کیا؟ سب مجھے ایسے ہی چھوڑ کر چلے گئے۔ مجھ سے کوئی پیار نہیں کرتا۔“

اس کا پہلے سے دکھی دل مزید دکھ گیا۔ ایک دم سے اسے اس پھول سی پتی پہ بے پناہ ترس آیا۔ پاشا بے کے اعمال نے اس کی فیملی کو کسی فٹ بال کی طرح بنا دیا تھا۔ عائشہ اپنی بہن کے لیے بہت پریشان تھی، مگر وہ کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔

”میں شام میں آ جاؤں گی، اور تمہیں ایک فون بھی لا دوں گی، اس سے تم جب چاہے مجھ سے اور عائشہ سے بات کر لینا۔“

”ٹھیک ہے۔“ چھوٹی ملی مسکرا دی۔ اسے بیک گونڈ طمانیت کا احساس ہوا۔

صبیحہ آئی کے گھر سے وہ ہاسپٹل آ گئی۔ یہ ایک پرائیویٹ نیوروسنٹر تھا اور وہ ایڈمٹ ہو چکا تھا۔ اس نے لباس بھی تبدیل کر لیا تھا، اور بس سرجری کا منتظر تھا۔ ابھی اسے اوٹی میں لے کر جانے میں ذرا وقت تھا، سو آپریشن سے قبل وہ آخری دفعہ اسے دیکھنے آئی تھی۔

وہ خاموش تھا۔ چہرے پر تائثر بگمزدرد۔ اوٹی کے لباس میں تو وہ اور بھی زیادہ بڑمردہ لگ رہا تھا۔

”کیسے ہو؟“ اس کے سامنے کھڑے، وہ بس اتنا ہی پوچھ سکی۔ جہان نے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ بیڈ کے کنارے پہ بیٹھا تھا۔

”ٹھیک ہوں۔“

چند لمحے خاموشی کی نذر ہو گئے، پھر وہ بولی۔

”تم نے آخری دفعہ کب بولا تھا؟“

”ابھی ایک منٹ قبل جب میں نے کہا میں ٹھیک ہوں۔“

اس کی باتیں بھی اسی کی طرح ہوتی تھیں۔ پھیلی درپھیلی۔

”میرا بیک رکھ لو۔ اس میں میرا فون بھی ہے۔“ اس نے اپنا چہرے کا دستی بیک سائیڈ فیمیل سے اٹھا کر حیا کی طرف بڑھایا جسے حیا نے

تھام لیا۔

”مگر مجھے کچھ ہو جائے تو میرا فون کھولنا۔ ویسے وہ فنکر پرنٹ سے کھلتا ہے مگر تمہارے لیے میں نے تمہاری ڈیٹ آف برتھ تباداں

پاس ورڈ کے طور پہ لگا دی ہے۔

پورے آٹھ ہندسے، اوکے؟ تم فون بک میں پہلے نمبر کو کال کر کے سب بتا دینا۔“ اس کے ہاتھوں میں پکڑا ایک یکدم بہت بھاری

ہو گیا۔

”اس کی نوبت نہیں آئے گی۔ تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔“

جہان نے جواب نہیں دیا۔ پھر زیادہ مہلت ملی بھی نہیں۔ وہ اسے لے گئے، اور وہ ”عملیات خانے“ (آپریشن تھیٹر کا ترک نام) کے

باہر ایک کرسی پہ آ بیٹھی۔

وہ کہہ رہا تھا، اگر مجھے کچھ ہو جائے۔ اور وہ سوچ رہی تھی، اگر اسے کچھ ہو گیا تو وہ کیا کرے گی؟ زندگی میں بعض ”اگر“ کتنے خوفناک

ہوتے ہیں نا۔ ان کو آدھا سوچ کر بھی دم گھٹنے لگتا ہے۔

وہ بس جہان کا بیگ گود میں رکھے، اسے کسی واحد سہارے کی طرح مضبوطی سے تھامے، کرسی پہ بیٹھی سامنے شیشے کے بند دروازوں کو دیکھنے لگی۔

وہ کیسی عجیب سی کیفیت ہوتی ہے کہ جب دعا نہیں مانگی جاتی۔ دعا کے لیے اٹھے ہاتھوں کو دیکھ کر انہی ہاتھوں سے کیے جانے والے گناہ یاد آ جاتے ہیں۔ تب لگتا ہے کہ معافی ابھی تک نہیں ملی۔ کیا واقعی سارے گناہ معاف ہو جاتے ہیں؟ نہیں کیوں لگتا ہے کہ ہم گناہوں سے توبہ کریں گے اور پھر انہیں بھلا کر سب ٹھیک ہو جائے گا؟ گناہ ایسے نہیں پیچھا چھوڑتے۔ ان کے آثار ہمیشہ ان جگہوں پہ موجود رہتے ہیں۔ گناہ تو ساری عمر پیچھا کرتے ہیں۔ کیا ان سے کوئی رہائی تھی؟ کیا ان کی ملکیت سے کوئی آزادی تھی؟ ایسا کیوں نہ ہو۔ سکا کہ وہ عائشہ گل کی طرح ہوتی؟ ہمیشہ سے سچی، ہمیشہ سے بایا اور نیک۔

اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ اور پھر انہیں گرا دیا۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کیا مانگے۔ یہ گرہ کہاں لگی تھی؟ دعا کب رخصتی تھی؟ شاید ڈی جے کے وقت۔ ہاں تب بھی وہ ایسے ہی ایک ہسپتال کے عملیات خانے کے باہر بیٹھی تھی۔ وہ گرہ اب کیسے کھلے گی؟ فون کی گھنٹی بجی تو وہ ذرا چونکی۔ پھر موبائل دیکھا۔ ابا کا لنگ۔

”السلام علیکم ابا۔“ اس نے فون کان سے لگایا تو اپنی آواز بے حد پست اور بھاری لگی۔

”وعلیکم السلام۔ کیا حال ہے، اور کدھر ہو؟“

پھر وہ سنی علیک سلیک، حال احوال اور تمہید کے بعد پوچھنے لگے

”تم واپس کب آ رہی ہو؟“

فون کان سے لگائے، اس نے زور سے آنکھیں بند کر کے بہت سے آنسو اپنے اندر اتارے، پھر آنکھیں کھولیں۔ سامنے کا منظر

ڈبڑا گیا تھا۔

”ابا مجھے ایک ہفتہ مزید لگ جائے گا۔“

”حیا! ابا کو جیسے آتا ہے ہوئی۔“ اتنے دن ہو چکے ہیں، کیا ابھی تک تمہارا نور ختم نہیں ہوا۔“

”آپ نے خود ہی تو کہا تھا کہ..... کہ لندن جانے کی بجائے ترکی میں جتنا چاہے وقت گزار لوں۔“

”ہاں ٹھیک ہے مگر تمہاری اماں درجیل کا ولیہ کرنا چاہتی ہیں، سب تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ اور ہاں، جہان کا کیا پروگرام ہے، کیا وہ تمہیں ملا؟“ حیا نے ایک نظر آپریشن ایریا کے بند شیشے کے دروازوں کو دیکھا۔

”جی، وہ سہمیں ہے۔ وہ بھی ساتھ ہی آئے گا۔“ اس کی آواز میں خود بھی اتنی بے یقینی تھی کہ ابانے جیسے دوسری طرف استہزائیہ

سر جھٹک دیا۔

”مجھے پتا ہے وہ تمہیں نہیں ملا ہوگا۔ خیر، اس کو چھوڑو، تم جلد آنے کی کوشش کرو۔“

وہ کتنے پُر یقین تھے کہ جہان ان کی بیٹی سے قطع تعلق کرنا چاہتا ہے۔ حالانکہ وہ تھے تو سہی ان دونوں کی منگنی پہ۔ مگر نہیں۔ لوگ اپنی آنکھوں کی بجائے اپنے کانوں پہ یقین کرنے کو ترجیح دیا کرتے ہیں۔

”ابا میں جلد نہیں آ سکتی۔ ایک..... ایک دوست ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہے، اس کی انٹرا کرینفل سرجری ہے، میں اسے یہاں نہیں چھوڑ سکتی ابا۔“ آنسو بے اختیار اس کی آنکھوں سے لڑھک کر نقاب کے اندر جذب ہونے لگے تھے۔ ابا چند لمحے کو بالکل خاموش ہو گئے۔

”اس کا یہاں کوئی نہیں ہے ابا۔ اس کی ماں، رشتے دار، فیملی، یہاں اس کا کوئی نہیں ہے ابا۔ میں اسے تنہا نہیں چھوڑ سکتی۔ اس نے ان

پانچ ماہ میں استنوں میں میرا بہت خیال رکھا ہے، ہر موقع پہ اس نے میرا ساتھ دیا ہے، اب کیا میں اسے آپریشن تھیز میں چھوڑ کر آ جاؤں؟“

”اوہ آئی سی!“ وہ ذرا جھمپے پڑے ”کیا وہ لڑکی..... ہالے نور..... کیا اس کا آپریشن ہے؟“

وہ ذرا چونکی۔ ”آپ ہالے کو کیسے.....؟“ ساتھ ہی دوسرے ہاتھ سے جھگی آنکھیں صاف کیں۔

”تمہیں کیا لگتا ہے، جب تم کچن میں کھڑی ہو کر نور بانو کو ترکی نامہ سنارہی ہوتی تھی تو سارا گھر برداشت سے سننے کے علاوہ اور کیا کر

رہا ہوتا تھا؟“

”اوہ اچھا“ ہالے کا نام تو وہ بہت لیتی تھی، اب اس سے واقف تھے۔ پھر بھی اس نے تردید یا تصدیق نہیں کی۔ جھوٹ وہ بولنا نہیں چاہتی تھی اور ج کہنے کا حوصلہ نہیں تھا۔

”ابا جب تک وہ stable نہ ہو جائے، میں ادھر ہی رہوں گی۔ روئیل کو اتنی جلدی ہے تو کر لے میرے بغیر اپنا ولیمہ۔“

”اچھا ٹھیک ہے، مگر جیسے ہی وہ ٹھیک ہو تم واپس آ جانا۔“

چند مزید نصیحتیں کر کے انہوں نے فون بند کر دیا۔ حیا چند لمحوں کو دیکھتی رہی، پھر پھسوا کا نمبر ملایا۔

”ہیلو؟“ پھسوا نے تیسری تیل پہ فون اٹھالیا تھا۔

اس نے کچھ کہا جابا، مگر کہہ نہ سکی۔ حلق میں کچھ پھنس سا گیا تھا۔ آنسو بار بار اہل رہے تھے۔

”ہیلو؟ حیا؟“ پھسوا اس کا نمبر پہچاننے کے باعث اسے پکار رہی تھیں مگر اس کے سارے الفاظ مر گئے تھے۔ وہ انہیں بتانا چاہتی تھی کہ ان کا بیٹا کہاں ہے، کیسا ہے، وہ اس کے لیے دعا کریں، مگر..... کچھ کہا ہی نہیں گیا۔

”ہیلو؟“

اس نے کال کاٹ دی اور پھر فون بند کر دیا۔ جہاں نے کسی کو بھی بتانے سے منع کیا تھا، ادھر وہ اس کا اعتبار نہیں توڑنا چاہتی تھی۔ عجیب بے بسی سی بے بسی تھی۔

سیکنڈ، منٹ، گھنٹے..... وقت گزرتا جا رہا تھا۔ اس نے ذہن پہ زور دینے کی سعی کی کہ جب کسی کا آپریشن ہو تو کیا پڑھنا چاہیے؟ صائمہ تانی کہتی تھیں کہ پہلے کلمے کو ”سوالا کھ“ دفعہ پڑھنا چاہیے۔ جب بھی کوئی بیمار ہوتا یا کسی کزن کا انٹری ٹیسٹ یا ایڈمیشن کا مسئلہ ہوتا، تانی کے لاؤنج میں وہی ایک ماحول سج جاتا۔ چاندنیاں بچھا کر کھجور کی گٹھلیوں کے ڈھیر لگا دیے۔ اب سوالا کھ دفعہ یہ یا یہ پڑھنا ہے۔ پھر ساری کزنز کو زبردستی بٹھا دیا جاتا تھا تو پڑھتی ایک دفعہ اور گٹھلیاں تین گرا یا کرتی تھی۔ پھر بھی وہ مرحلہ ختم نہ ہوتا۔ ان کزنز نے تو آپس میں مذاق بھی بنالیا تھا، کہ جب پڑھی ہوئی گٹھلیوں کو لگا کر کرنے کا معاملہ ہوتا تو ارم کہتی۔ ”یہ ہیں بھئی پڑھی ہوئی گٹھلیاں، اور یہ ہیں ان پڑھ گٹھلیاں۔“

جب تک وہ لوگ اس بابرکت کلام سے بے زار نہ ہو چکے ہوتے، تب تک سوالا کھ ختم نہ ہوتا۔ تب کی بات بھلے اور تھی، مگر اب بھی وہ یہی سوچ رہی تھی کہ پتا نہیں ہم اللہ تعالیٰ کو گن گن کر کیوں یاد کرتے ہیں؟ اور اگر جو اس نے بھی گن گن کر دینا شروع کر دیا؟ پتا نہیں ہم اپنی خود ساختہ کتنی سے ”ذکر“ کو ”مستز“ کیوں بنادیتے ہیں؟

ہسپتال کا وہ کارڈ اور اب سرد پڑتا جا رہا تھا۔ جولائی کی شام بھی بہت ٹھنڈی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے سوچنا چاہا کہ وہ ”ذکر“ میں کیا پڑھے؟ بغیر حساب رکھے، بغیر گئے، توجہ اور کسوٹی سے کیا مانگے؟ مگر وہ گرہ کھلنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ ڈی جے کے بعد اس نے دعا مانگتی چھوڑ دی تھی، اور پردے کے بعد شکوہ کرنا چھوڑ دیا تھا۔ مگر ابھی وہ شکوہ کرنا چاہتی تھی۔ جیسے یعقوب علیہ السلام نے کیا تھا۔

اس نے کرسی کی پشت پہ دیوار سے سرنگ کر آ نکھیں موند لیں۔ بس یہی ایک شکوہ تھا جس پہ لب مہر بند نہیں رہے تھے۔

”میں اپنے دکھ اور اپنے ملال کی شکایت صرف اللہ سے کرتی ہوں۔“

دھات کی کرسی جیسے مقناطیس بن گئی تھی اور چاندی کے مجسمے کا قطرہ قطرہ اپنے اندر جذب کر رہی تھی۔

”میں اپنے دکھ اور اپنے ملال کی شکایت صرف اللہ سے کرتی ہوں۔“

کرسی نے اس کی ساری چاندی نچوڑ لی تھی۔ لوہے کا ایک خول باقی رہ گیا تھا جسے مقناطیسی نشست نے خود سے جوڑ لیا تھا۔

”میں اپنے دکھ اور اپنے ملال کی شکایت صرف اللہ سے کرتی ہوں۔“

اس کے قدموں میں جیسے بیڑیاں ڈل گئی تھیں۔ وہ چاہہ کر بھی نہ حرکت کر سکتی تھی، نہ ہی سانس لے سکتی تھی۔ ہر طرف جیسے اندھیرا تھا۔ اس ایک شخص کو کھو دینے کا صرف احساس بھی اس تاریک سرنگ کی طرح تھا جس کا کوئی اختتام نہ تھا۔ اس کی ساری چاندی اس اندھیرے میں ڈوب گئی تھی۔

”میں اپنے دکھ اور اپنے ملال کی شکایت صرف اللہ سے کرتی ہوں۔“

پانچ، ساڑھے پانچ گھنٹے گزرے تھے، اور تب ہی شخصے کا وہ دروازہ کھلا۔ اس نے سرجن ڈاکٹر کو اپنی جانب آتے دیکھا۔ اس کے لوہے کے خول کو کرسی کے مقناطیس نے یوں چپکا رکھا تھا کہ وہ چاہنے کے باوجود بھی اٹھ نہ سکی۔

”کیا ہواؤ اکثر؟“ اس نے خود کو کہتے سنا۔

”سرجری وحیدہ تھی، مگر کیل بہت اندر تک نہیں گیا تھا، ہم نے اسے نکال لیا ہے“ ڈاکٹر اس کو بتانے لگے تھے۔ اس کی کھوپڑی کا جو حصہ ڈیمج ہوا تھا اسے Titanium mesh کے ساتھ ری پلیس کر دیا گیا ہے، اور.....“

”وہ ٹھیک ہے یا نہیں؟“ اس نے بے قراری سے ان کی بات کاٹی۔ وہ بھی پتا نہیں کون سی زبان بولے جا رہے تھے۔

”ہاں، آف کورس وہ ٹھیک ہے۔ سرجری کامیاب رہی ہے۔ جیسے ہی انسٹیمیز یا اترے گا، اور وہ stable ہو جائے گا، تو آپ اس سے مل سکیں گی۔“

زندگی میں بعض خبریں انسان کو کیسے ملتی ہیں؟ شاید جیسے اوپر سے بہتی کوئی آبشار ہو جس کا دھارا اسے بھگودے۔ یا پھر جیسے آسمان نے سونے کے پتے گرا رہے ہوں۔ یا جیسے لہلہاتے سبزہ زار کے ساتھ کسی چشمے کے ٹھنڈے پانی میں پاؤں ڈال کر بیٹھنا ہو۔

مرہم۔ ٹھنڈ۔ سکون۔

”شکریہ..... بہت شکریہ!“ اس کی آنکھیں اور آواز، دونوں بھیگ گئیں۔ نقاب کے اوپر سے اس نے لبوں پہ ہاتھ رکھ کر جیسے اہلنے جذبات کو قابو کرنے کی کوشش کی۔ پھر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ لوگ سکون پانے پہ نڈھال سے ہو کر بیٹھ جایا کرتے ہیں، مگر وہ اس کیفیت میں اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ مقناطیس غائب ہو گیا تھا اور جاندی کا جسم بھر سے چمکنے لگا تھا۔

”اللہ آپ کو بہت خوش رکھے۔“ زندگی میں کسی کو اس کے منہ پہ اتنے دل سے اس نے شاید پہلی دفعہ دعا دی تھی۔

وہ ایک پیشہ ورانہ مسکراہٹ کے ساتھ سر کو جنبش دے کر آگے بڑھ گئے۔

جس چشمے کے دروازے سے وہ آئے تھے، اس کے پار عملے کے دو افراد ایک اسٹریچر دھکیلے لے جا رہے تھے۔ وہ دوڑ کر دروازے تک آئی، اور چہرہ چشمے کے دروازے کے قریب لے جا کر دیکھا۔

وہ جہان ہی تھا۔ لیٹے ہوئے اس کی گردن ایک طرف کو ڈھکی تھی، یوں کہ چہرہ حیا کے سامنے تھا۔ بند آنکھیں۔ نیچے گہرے حلقے۔ سر بیچوں میں جکڑا۔ ایک پٹی آنکھ کے قریب سے گزرتی تھی۔ بے ہوش۔ بے خبر۔ اسٹریچر آگے بڑھ گیا۔ وہ بس اسے دیکھتی رہ گئی۔

دونوں کے درمیان اس دفعہ بھی چشمے کی دیوار تھی، ایسی ہی جیسی بہت پہلے ان کے درمیان رہی تھی۔ تب وہ دھندلی تھی۔ آ رہا کا منظر مبہم تھا، لیکن اب وہ صاف تھی۔ تب واضح تھا۔ مگر دیوار تو دیوار ہوتی ہے، اور ہاتھ ڈھکی کیے بغیر اس دیوار کو ہٹانا ممکن بھی تو نہ تھا۔

بہت تھکی تھکی سی وہ واپس کرسی پہ آ کر بیٹھ گئی۔ اس نے ٹھیک سے دعا نہیں کی تھی، مگر اب وہ ٹھیک سے شکر تو کر سکتی تھی نا۔

☆ ☆ ☆

سلطنت ترکیہ کے دار الحکومت انقرہ پہ شام کا نیلگوں، سرمئی پن چھار ہا تھا۔ اس کے پرائیویٹ روم تک آنے سے قبل، وہ اپنے ہوٹل کے قریب ایک فلورسٹ سے سفید گلابوں کا ایک بڑا سا بوکے لے آئی تھی، اور اب اس کے کمرے میں کھڑی، ایک کارنر ٹیبل پہ رکھے گلدان میں وہ پھول سیٹ کر رہی تھی۔

سفید گلاب جب کاچ کے گلدان میں جلوہ گر ہو چکے، تو اس نے چہرہ ان کے قریب کر کے، آنکھیں موندے، سانس اندر کوتاہی۔ تازہ، دلفریب مہک سارے وجود میں اندر تک کھل گئی۔

پھر اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ سو نہیں رہا تھا، بس گردن سے ذرا نیچے تک شیٹ ڈالے، آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔ سرویسے ہی پٹی میں جکڑا تھا اور اوپر سفید جالی داری ٹوپی تھی۔

”کیا تمہیں کچھ چاہیے؟“ کہنے کے ساتھ حیا نے گلہ تے سے ایک ادھلی کھلی کلی علیحدہ کی۔

”اؤ ہوں!“ وہ بند آنکھوں سے زیر لب بڑبڑایا۔

”اوکے!“ وہ کلی ہاتھ میں لیے اس لمبے سے کاؤچ پہ آنکھی جو بیڈ کی پابندی کے قریب ہی، دیوار کے ساتھ لگا تھا۔ عبایا اس نے نہیں اتارا تھا، بس نقاب نیچے کر لیا تھا۔

”ڈاکٹر زکیر رہے تھے، تم بہت جلدی کو کر لو گے۔“ چند لمحے گزرے تو اس نے گلاب کی ٹہنی کو انگلیوں سے گھماتے ہوئے بات کرنے کی ایک اور سہی کی۔

”ہاں ہے مجھے۔“ اس نے آنکھیں نہیں کھولیں، البتہ ماتھے پہ ایک آکٹاہٹ بھری شکن کے ساتھ جواب دیا۔

وہ پرواہ کیے بغیر ہاتھ میں پکڑے سفید گلاب کو اسی طرح گھمائے گئی۔ بہت کچھ یاد آ رہا تھا۔

”تمہیں یاد ہے جب ہم پہلی دفعہ استنبول میں ملے تھے، تب تم نے پوچھا تھا کہ کون حیا۔“ ذرا سا مسکرا کر کہتے ہوئے اس نے جہان کو

دیکھا جس نے اس بات پہ آنکھیں کھول کر ایک اچھتی نظر اس پہ ڈالی تھی۔ ”جیسے کہ تم جانتے ہی نہیں تھے کہ کون ہے حیا۔“

”تو تم نے آگے سے کیا کہا؟ پھسوک بھینسی۔ یعنی پھسوسے ملنے آئی ہو۔“

”ہاں تو انہی سے ہی ملنے آئی تھی نا۔“ اسے ان باتوں کو دہرانے میں مزہ آنے لگا تھا۔

”بالکل، جیسے ابھی کہا دو کیہ دیکھنے آئی ہو۔“

”سو تو ہے۔“ اس نے ذرا سے شانے اچکائے۔ ”اور کوئی تھا جو تیا کے گھر جوڑے اتار کر داخل ہو رہا تھا، اور اپیل ٹی کے علاوہ تو اسے

کسی چائے سے واقفیت نہ تھی۔“

جہان نے آنکھیں واپس بند کر لیں۔ کاؤچ کے اس طرف شیشے کا ایک دروازہ تھا جو باہر کھلتا تھا۔ اس کے پار انقرہ کا موسم جیسے بہت

کھلا کھلا لگ رہا تھا، یوں جیسے اس دفعہ بہار جولائی میں اتری ہو۔

”اور میرا چہلہ ٹھیک کرتے وقت مجھے تم میرے الفاظ لوٹا رہے تھے، مگر مجھے کیا پتا تھا کہ کوئی میری میز بھجی پڑھتا ہے۔“

”اگر تم یہ سب کہہ کر مجھے شرمندہ کرنا چاہتی ہو تو وہ میں نہیں ہوں گا۔ سو بولتی رہو۔“

”اور کوئی کہتا تھا کہ وہ بہت غریب آدمی ہے۔“ اس نے اثر لیے بنا اپنا مشغلہ جاری رکھا۔

”سو تو ہوں۔“

”اور جب تمہارے ڈرائیور نے ”جہان سکندر“ کا نام لیا تو کیا میں اس کے ساتھ نہ آتی؟“ وہ اب پھول کوٹہنی سے پکڑے، اس کی کٹلی کو

اپنی تھوڑی پہ کر رہی تھی۔

”اس نے صرف نام لیا تھا، یہ نہیں کہا تھا کہ اسے جہان سکندر نے بھیجا ہے، تمہیں پوچھنا چاہیے تھا۔“

”اور مجھے نہیں پتا تھا کہ تم تیا فرقان سے اتنا ڈرتے ہو۔“ موسم کی شادابی اس کے چہرے پہ بھی نظر آ رہی تھی۔ مسکراہٹ دبائے، وہ

ساری باتیں دہرانا بہت اچھا لگ رہا تھا۔

”میں کسی سے نہیں ڈرتا۔“

”ویسے پھسوک بھینسی ہیں کہ جہان کی مت سنا کرو، وہ تو خواہ مخواہ کہتا رہتا ہے۔“

”مئی کی مت سننا کرو، وہ یونہی بولتی رہتی ہیں۔“

وہ ایک دم چوٹکی، پھر بے اختیار ہنس دی۔ جہان نے آنکھیں کھول کر، گردن ذرا اٹھا کر اسے تعجب سے دیکھا۔

”ہنسی کیوں؟“

”کچھ نہیں۔“ حیا نے مسکراتے ہوئے سر جھٹکا۔ ”اور یاد ہے کس طرح تم نے اور عائشہ نے ظاہر کیا تھا کہ تم ایک دوسرے کو نہیں

جانتے؟“ گلاب کی پتیوں کو اپنے رخسار اور تھوڑی پہ محسوس کرتے ہوئے اس نے اس وقت کا حوالہ دیا جب عائشہ اور وہ، جہان کے لیے بندرگاہ تک

آئی تھیں۔

”غلط، ہم نے کچھ غلط نہیں کیا تھا۔ اگر تم پوچھتی تو ہم بتا دیتے۔“

”وہ بتا دیتی، مگر تم۔۔۔۔۔“

”میرا ایک کام کرو گی؟“ اس نے بات کاٹ کر بہت سنجیدگی سے حیا کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں، کہو۔“ وہ بہت توجہ سے سنتی کاؤچ پہ ذرا آگے کو ہوئی۔ پہلے ایک دفعہ جہان نے اس سے چائے بنوائی تھی، وگرنہ وہ کوئی کام نہیں

کہتا تھا۔

”مجھے فارمیسی سے تھوڑی سی کاشن لادو۔“

”شیور۔“ وہ مستعدی سے اٹھی۔ اس کا کام کرنے کی خوشی بہت قیمتی تھی۔ دروازے تک پہنچ کر وہ کسی خیال کے تحت رکی اور پلٹ کر

جہان کو دیکھا، جواب بھی تک اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

”کس لیے چاہئے کاش؟“

”کان میں ڈالنی ہے۔“

وہ جوہر جوشی باہر جانے کے لیے تیار کھڑی تھی، پہلے آنکھوں میں حیرت ابھری، پھر تعجب، اور پھر سمجھ آنے پر ڈھیر ساری ننگلی۔ لب خود بخود بھج گئے اور پیر پختی واپس کاؤچ پر آ کر بیٹھی۔ پھر بازو سینے پہ لپیٹے، ٹیک لگائے، خاموش مگر ناراض نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔

”بہت شکریہ۔“ اس نے گردن سیدھی کر کے آنکھیں پھر سے موند لیں۔ یہ آدی بھی نا، ذرا دو چار دن مہذب بنا رہے تو شاید بیمار پڑ جائے، اس لیے اپنے اصل روپ میں بہت جلد واپس آ جاتا تھا۔

وہ اسی طرح خفا خفا بیٹھی اسے دیکھتی رہی۔

☆ ☆ ☆

صبح بہارے کو صبیحہ خانم کے پاس چھوڑنے سے قبل اس نے ایک موبائل فون سم کے خرید کر اسے ایکٹیویٹ کروا دیا تھا۔

”کیا میں تمہارے ساتھ ہاسٹل نہیں جاسکتی؟“ بہارے خفا ہوئی تھی۔ وہ دونوں ٹیکسی میں صبیحہ خانم کے گھر جا رہی تھیں۔

”تم نے کہا تھا تم اچھی لڑکی بنی رہو گی۔ اور میری ساری باتیں مانو گی۔“

”اوکے، میں کیا کہہ رہی ہوں۔“ بہارے فوراً ڈھیمی پڑ گئی۔

”اچھا! فون اپنے بیگ میں رکھو، میں تمہیں اس پہ کال کر لوں گی، اور چاہو تو اس سے عائشے کو بھی کال کر لیتا۔“

بہارے نے فون اس کے ہاتھ سے تھا، اسے الٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر ”شکریہ“ کہہ کر اپنے گلابی پرس میں ڈال دیا۔ چھوٹا سا پرس تھا مگر اس میں دنیا جہان کی چیزیں وہ لیے گھومتی تھی۔ کنگھی، ہانک، یا قینچی، اس کے پرس میں سے سب نکل آتا تھا۔

بہارے کو صبیحہ خانم کے گھر چھوڑ کر وہ دوبارہ ٹیکسی میں آ بیٹھی (جسے وہ انتظار کرنے کا کہہ گئی تھی)۔ آج مسز عبداللہ وغیرہ نے بھی آ جانا تھا سو بہارے کو کمپنی رہے گی۔

وہ ہاسٹل کے راستے میں تھی جب فون بجنے لگا۔ وہ جو کھڑکی سے باہر انفرہ کی بھاگتی عمارتیں دیکھ رہی تھی، چونک کر فون کی طرف متوجہ ہوئی۔ اماں کا لنگ۔

”حیا..... واپسی کا کیا پروگرام ہے؟“ چھوٹے ہی انہوں نے استفسار کیا تھا۔

ایک تو اس کے گھر والوں کو بھی اس کی واپسی کی بہت فکر تھی۔ سکون سے نہیں رہنے دیتا انہوں نے۔

”بس ایک ہفتہ مزید لگے گا۔“

”اب آ بھی جاؤ۔ رو جیل کا.....“

”اماں یہ دیوتا شائیں ہے جس کی وجہ سے ہمارے گھر میں طوفان آ گیا تھا؟ اب وہ اتنی اپمورٹنٹ کیوں ہو گئی ہے کہ اسے ساری دنیا سے ملوانے کی آپ لوگوں کو بہت جلدی ہو رہی ہے؟“ اسے ابھی تک ابا اور اماں کا تہہ کو قبول کرنا بھگم نہیں ہوا تھا۔

”اسی لیے تو چاہتے ہیں کہ جو لوگ باتیں بنا رہے ہیں، ان کے منہ اس طرح بند ہو جائیں۔“

وہ گہری سانس لے کر رہ گئی۔ پھوٹھوٹھیک کہتی تھیں۔ وہ بیٹے ہوتے ہیں جن کے بارے میں باتیں بنانے والوں کے منہ بند کرنے کے لیے جتن کیے جاتے ہیں۔ بیٹیوں کو تو اپنے لیے ساری جنگیں خود ہی لڑنی پڑتی ہیں۔

فون بند کر کے اس نے رو جیل کو کال ملائی۔ ٹیکسی ابھی ابھی سگنل پر کی تھی۔

”بیلو جامد حفصہ، کیسی ہو؟“ وہ دوسری جانب بہت ہی خوشگوار موڈ میں بولا تھا۔

”میری بات سنو اور کان کھول کر سنو۔“ وہ جواب میں اتنے غصے سے بولی تھی کہ ادھیڑ عمر ٹیکسی ڈرائیور نے بے اختیار بیک ویو مرر میں اسے دیکھا تھا۔

”کیا ہوا؟“ وہ چونکا۔

”تمہیں اگر اپنے ویسے کی اتنی جلدی ہو رہی ہے نا تو کرلو میرے بغیر۔ بلکہ میری طرف سے آج ہی کرلو۔ مگر اماں، ابا سے کہو، مجھے بار

بار واپس بلانا چھوڑ دیں۔ اگر تم میرا صبر سے انتظار نہیں کر سکتے تو نہ کرو۔“

”اچھا، اچھا کیا ہو گیا ہے یا رابرٹائیکس! میں تمہارے آنے تک کچھ نہیں کرنے لگا۔“

”بہت شکریہ۔ بعد میں بات کرتے ہیں۔“ وہ اسے پکارتا رہ گیا، مگر اس نے کال کاٹ دی۔ حد ہے بھئی۔

وہ ہاسٹل سے ذرا فاصلے پہ اتری تھی۔ پوری اسٹریٹ عبور کر کے آگے ہاسٹل تھا۔ وہ اراداً دکانوں کی شیشے کی دیواروں کو دیکھتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی تاکہ اگر کچھ خریدنا ہو تو یاد آجائے۔ ابھی وہ اسٹریٹ کے درمیان میں ہی تھی کہ ایک دم سے رکی۔

وہ ایک گفٹ شاپ تھی جس کے شیشے کے پار اسے کچھ دکھائی دیا تھا۔ وہ تیزی سے اس شاپ تک آئی، اور گلاس ڈور دھکیل کر اندر داخل ہوئی۔ اس دوران ایک لمحے کے لیے بھی اس نے نگاہ اس شے سے نہیں ہٹائی تھی، مبادا کہ وہ اسے کھوندے۔

اندر دروازے کے دائیں جانب ہی وہ چھت پہ نصب ایک بک سے لٹکا تھا۔ ایک بہت خوبصورت سا ونڈ چائم۔

وہ گردن پوری اٹھائے، ونڈ چائم کے اطراف میں گھوم کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ ایک فٹ لمبا تھا۔ اوپر ایک سلور گول پلیٹ تھی، جس سے لڑیاں لٹک رہی تھیں۔ پانچ لڑیاں تو دراصل لکڑی کی ڈنڈیاں تھیں جن کو سلور پاش کیا گیا تھا۔ باقی کی پانچ لڑیاں کرشل کی بنی تھیں۔ جیسے ایک دھاگے میں پنکھڑیاں پرو دی گئی ہوں۔ گلاب کی پنکھڑیاں، چاندی کی سی چمکتی، بے رنگ، کرشل کی روز پیٹلر۔ ہر دو پنکھڑیوں کی لڑیوں کے بیچ ایک سلور اسٹک لٹک رہی تھی۔

اس نے ہاتھ اٹھا کر ہولے سے نازک کالج کی لڑی کو چھوا۔ وہ اسٹک سے ٹکرائی، اور لکڑی اور کالج کی کوئی عجیب سی دھن بج اٹھی۔ موسیقی کی کسی بھی قسم سے مختلف، وہ کوئی انوکھی سی آواز تھی۔ اس کے پس سے لڑیاں جو گول گول دائرے میں گھومنے لگی تھیں، اب آہستہ آہستہ ٹھہرنے کے قریب آ رہی تھیں، اور تبھی اس نے دیکھا۔ اوپر کی سلور پلیٹ پہ انگریزی میں کھدا تھا۔

”Must every house be built upon love? What about loyalty and appreciation?”

(Omer Bin Khitab)

اس نے زیر لب اُن الفاظ کو پڑھا۔ اُسے وہ واقعہ یاد تھا۔ ایک شخص اپنی بیوی کو صرف اس وجہ سے چھوڑنا چاہتا تھا کہ وہ اس سے محبت نہیں کرتا تھا۔ اس کے جواب میں یہ الفاظ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمائے تھے، کہ ”کیا ضروری ہے کہ ہر گھر کی بنیاد محبت پہ ہی ہو؟ تو پھر وفاداری اور قدر دانی کا کیا؟“

(البیان والتا بعین 2/101-2-فرائض الکلام صفحہ 113)

”مجھے یہ چاہیئے۔ اس نے ایک دم جذبات سے مخمور ہو کر بہت زور سے سیلنگرل کو مخاطب کیا، پھر احساس ہوا کہ شاپ میں اکیلی ہی تو ہے، ہوائتا اور ہونے کی کیا ضرورت ہے۔

”مجھے یہ پیک کر دیں۔“ سیلنگرل مسکرا کر اس کی طرف آ رہی تھی، اب کہ اس نے ذرا دھیمے انداز میں اپنی بات دہرائی۔ (ذی بے ہوتی تو کہتی، ہیں ہم وہی، پاکستان کے پنڈیو۔)

پورے دس منٹ بعد جب وہ ہاسٹل کے اس پرائیویٹ روم میں داخل ہوئی تو ہاتھ میں پکڑے شاپنگ بیگ میں وہ ونڈ چائم نفاست سے پیک کر کے رکھا تھا۔

”السلام علیکم!“ عاتاد اس نے دروازہ بند کرتے ہوئے سلام کیا، مگر اگلے الفاظ لبوں میں رہ گئے۔

جہاں کمرے میں نہیں تھا۔ اس کا بستر خالی تھا۔

اس نے سب سے پہلے ہاتھ روم کے دروازے کو دیکھا جو ذرا سا کھلا تھا۔

”جہاں؟“ پرس اور شاہرہ میز پر رکھتے اس نے ذرا فکر مندی سے پکارا۔ جواب ندارد۔ اس نے ہاتھ روم کا دروازہ کھٹکھٹایا، پھر دھکیلا۔ جی

بھی تھی۔ وہ وہاں بھی نہیں تھا۔

”کدھر چلا گیا؟“ وہ متوجہ سی کاؤچ پہ آ بیٹھی۔ شاید ڈاکٹر کسی ضروری چیک اپ یا میٹ وغیرہ کے لیے لے کر گئے ہوں۔ یہ سوچ

کر ذرا تسلی ہوئی۔ کچھ دیر وہ یونہی بیٹھی رہی، پھر ونڈ چائم پیکنگ سے نکالا، اور سنکڑل دروازے تک آئی جو باہر کھلتا تھا۔ اس کے عین اوپر دیوار پہ ایک

پینٹنگ آدراں تھی۔ حیانے وہ پینٹنگ اتاری، میز پر رکھی، اور ونڈ چائم کی رنگ اس کیل میں ڈال دی۔ ونڈ چائم کی چین دروازے کے سر تک ختم ہوتی تھی، اور وہاں سے سلور پلیٹ اور لڑیاں لٹکتی تھیں۔

اس نے مسکرا کر پیچھے جا کر اپنے خفے کو دیکھا جسے وہ صرف جہان کے لیے لائی تھی۔ اچھا لگ رہا تھا۔ ارتعاش کے باعث ڈراما حرکت میں گول گول گھومتا۔ دروازہ چونکہ سلائڈنگ والا تھا، سو اس کھلنے کی صورت میں ونڈ چائم سے ٹکرانے کا خدشہ نہ تھا۔
فون کی گھنٹی بجی تو اس نے پرس سے موبائل نکالا۔ اسلام آباد پنڈی کے کوڈ کالینڈر لائن نمبر تھا اللہ، اللہ، آج تو روٹیل قتل ہو جائے گا اس کے ہاتھوں۔

”ہیلو؟“ اس نے فون کان سے لگا لیا اور بہت سے سخت جملے تیار کیے ہی تھے کہ۔۔۔۔۔

”جی میڈم ایم ڈی، کہسی ہیں آپ؟“ اس لہجے کو وہ کیسے بھول سکتی تھی؟ اس نے کھڑے کھڑے بے اختیار بیڈ کی پائنتی کے اسٹینڈ کو تھا۔

”کون بول رہا ہے؟“ بظاہر لہجے کو مضبوط اور بے پرواہ رکھے، اس نے سوال کیا۔ اسے کیسے ملا اس کا ترکی کا نمبر؟ وہ کوئی میجر احمد تو

نہیں تھا کہ۔۔۔۔۔

”آپ ہر دفعہ مجھے پہچان جاتی ہیں، اس دفعہ بھی پہچان لیا ہوگا۔ خیر، آپ کی تسلی کے لیے، ولید بات کر رہا ہوں۔“

”آپ ابھی تک گرفتار نہیں ہوئے؟ حیرت ہے!“ وہ نڈھال سی جہان کے بیڈ کی پائنتی پہ بیٹھی۔ بلیک میٹر۔۔۔۔۔ یہ خیال ہی ساری

توانائی نچوڑ گیا تھا۔

”حیرت نہ کریں، شکر کریں۔ جب تک میں باہر ہوں آپ عزت سے ہیں۔ جس دن میں نے۔۔۔۔۔“

”عزت دینے اور عزت چھیننے والا اللہ ہوتا ہے، جب تک وہ میرے ساتھ ہے، مجھے آپ کی پرواہ نہیں ہے۔“ دے دے غصے سے وہ

بولی تھی۔ ”اور آپ کو کیا لگتا ہے، آپ کوئی بھی موڈی اٹھا کر، اس پر میرا نام لگا کر پیش کر دیں گے تو ساری دنیا یقین کر لے گی؟ ان فیکٹ، آپ جو

کرنا چاہتے ہیں، کر لیں۔ مجھے کوئی پرواہ نہیں ہے۔“

”میں آپ کو آخری موقع دے رہا ہوں، آپ لوگ میرے خلاف کیس واپس لے لیں۔ اور جو پٹیاں آپ نے سلیمان انکل کو

میرے بارے میں پڑھائی ہیں نا، جس میں مجھے اور ہیڈ آر کیٹلکٹ کو آپ انوالو کر رہی ہیں، اس معاملے کو بھی یہیں ختم کر دیں ورنہ میں براپیش

آؤں گا۔“

وہ ایک ایک لفظ چبا کر کہہ رہا تھا۔

(تو اب اس نے معاملے پہ بھی اس کو آڑے ہاتھوں لینا شروع کر دیا تھا؟)

”مثلاً کیا کر لیں گے آپ؟“ اس نے پھر سے اپنے لہجے کو مضبوط بنانے کی سعی کی مگر دل کی لرزش نے ڈراما زبان کو چھوٹا تھا۔ الفاظ

لڑکھڑا گئے تھے۔

”میں کیا نہیں کر سکتا اس ویڈیو کے ساتھ؟ میں جانتا ہوں آپ کتنی خوفزدہ ہیں اس سے سو میں اس کی سی ڈی بنا کر اسے آپ کے گھر کے

سارے مردوں میں تقسیم کر سکتا ہوں، وہ شاید آپ کو کچھ بھی نہ کہیں، مگر وہ دل سے آپ کی عزت کبھی نہیں کر سکیں گے، آپ رسوا ہو کر رہ جائیں گی۔“

”جہنم میں جاؤ۔“ اس نے پھٹ پڑنے والے انداز میں کہا، اور فون بند کر دیا۔ جی کا کچ، اسٹیل اور لکڑی کے باہم ٹکرانے کی آواز

آئی۔ فضا میں ایک مدھر سا ارتعاش ہوا۔ وہ تیزی سے ملٹی۔

جہان بالکونی کے دروازے سے اندر داخل ہو رہا تھا۔ اس کا سر شاید ونڈ چائم کو چھوٹا تھا۔ ایک نظر حیا پہ ڈال کر وہ مڑا، گلاس سلائڈ بند کی،

اور پھر پلیٹ کر بیڈ تک آیا۔

”تم۔۔۔۔۔ کہاں تھے؟“ اس نے ہشکل خود کو کمبوز کیا۔ کہیں اس نے کچھ سنا تو نہیں؟

”ایک کال کرنے گیا تھا، سو جاؤ اپنا ایئر میں کر لوں۔“ موبائل بیڈ سائڈ ٹیبل پہ رکھتے ہوئے اس نے ایک نظر پھر حیا کو دیکھا۔

گہری، اندر تک اتری نظر، اور پھر خاموشی سے بستر پہ لیٹنے لگا۔

”تمہیں یوں نہیں جانا چاہیے تھا، سسر کو ہٹا چلا تو برا منائے گی، ابھی تم ٹھیک نہیں ہو۔“

”تم بتاؤ، تم ٹھیک ہو؟“ وہ اب نیچے کے سہارے لیے لیے، بہت غور سے حیا کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ بس ایک بل لگا اسے فیصلہ کرنے

میں۔ وہ بیمار تھا، پھر اس کے دوسرے مسائل بھی تو تھے، کیا اب اسے ایک نیا لٹو کھڑا کر کے اس کو مزید بو جھل کرنا چاہیے؟ کیا وہ اتنی خود غرض تھی؟
 ”ہاں، میں ٹھیک ہوں۔ اور یہ تمہارے لیے لائی تھی۔“ اس نے زبردستی مسکرائے کی سعی کرتے ہوئے ونڈ چائیم کی طرف اشارہ کیا جو جہان سے ٹکرانے کے باعث ابھی تک گول گول گھوم رہا تھا۔

”شکریہ۔“ اس نے کرٹل کے اس خوبصورت خفے کو دیکھا تک نہیں، بس اس طرح حیا کو کھوجتی نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ وہ ابھی تک بیڈی پائنتی کے ساتھ کھڑی تھی۔ اضطرابی انداز میں انگلیاں مردوڑتی، ذرا بے چین اور مضطرب سی۔

”کیا گھر سے فون تھا؟“ اس نے جیسے بہت سوچ سمجھ کر سوال پوچھا۔ حیا کا دل زور سے ہڑکا۔

(اس نے کمرے کے باہر سے کچھ تو لازمی سنا تھا ایڈیٹ نہ ہو تو۔)

”نہیں، ولید لغاری تھا۔“ اس نے سچ بول دیا۔

وہ ذرا سا چونکا۔

”وہی؟“ ابرو اٹھا کر یک لفظی استفسار کیا۔ حیا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”تم نے کہا تھا کہ آفس جایا کر، سو میں نے آفس جا کر اس کی کچھ بدعنوانیاں پکڑیں، اور ابا کو بتا دیا۔ وہ اسی پہ مجھے دھمکانے کے لیے بار بار کا لڑ کر رہا ہے۔“

ابرو اسی سے کہتے ہوئے اس نے ذرا سے شانے اچکائے۔

جہان کے چہرے پہ ناگواری ابھری، مگر جیسے ضبط کر گیا۔

”ابھی یہی کہہ رہا تھا؟“

”ہاں مگر میں اس کی زیادہ دیر نہیں سنتی۔ دو چار سنا کر فون رکھ دیتی ہوں۔ ابھی بھی پی ٹی وی ایل سے کیا تھا تو میں نے اٹھا لیا، ورنہ موبائل کے غیر شناسا نمبر تو اب اٹھاتی ہی نہیں ہوں۔“

”کیا اس نے تمہیں کبھی موبائل سے فون نہیں کیا؟“

اب کی بار وہ چونکی۔ کچھ تھا جہان کی آواز میں، کچھ ایسا جسے وہ کوئی نام نہ نہ سکی۔

”اگر تمہیں مجھ پہ شک ہے تو میرا فون چیک کر لو۔“

”نہیں ایسی بات نہیں ہے، میں اس لیے کہہ رہا ہوں کیونکہ میں نے شاید اس کا موبائل نمبر دیکھا تھا تمہارے فون میں، لیکن اگر مجھے تم پہ شک ہوتا تو اسی وقت کہتا۔“

”اس کا موبائل نمبر؟ کدھر؟“ اس نے حیرت سے دہرائے ہوئے اپنا فون اس کی جانب بڑھایا۔ جہان نے بنا کسی ہچکچاہٹ کے فون تھا، چند ایک مٹن دبائے، اور پھر اسکرین حیا کے سامنے کی۔ وہاں کال لاگ کھلا پڑا تھا۔ پچھلے ہفتے کی کوئی تاریخ تھی۔

”کیا؟“ وہ نا سنجی سے اسکرین کو دیکھنے لگی۔ وہاں کوئی غیر شناسا نمبر تھا جس پہ کال ناٹم آدھے گھنٹے سے ذرا اوپر کا تھا۔

”یہ کس کو.....“ وہ تعجب سے بڑبڑاتی، ایک دم چونکی۔ ”یہ تو ارم نے کال کی تھی..... یہ کس کا نمبر ہے؟“ اس نے فون ہاتھ میں لے کر قریب سے لاگ کو پڑھا۔

جہان بہت غور سے اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

”حیا، یہ ولید کا نمبر ہے!“

لے بھر کھوکیا کا تنفس بالکل ختم ہو گیا۔ وہ سانس روکے، حق دق سی جہان کو دیکھنے لگی۔ تو وہ ولید تھا جس کے ساتھ ارم.....؟

”ارم اور ولید..... اوہ گاڈ..... مگر تمہیں کیسے..... کیسے پتا کہ یہ ولید کا نمبر ہے؟“

جہان سے ایسے سوال پوچھنا بے کار تھا، پھر بھی وہ پوچھ بیٹھی۔ اس نے ذرا سے شانے اچکائے۔

”جب سلیمان ماموں ہسپتال میں تھے تو ان کے فون پہ اس کی کال آئی تھی، میں نے تب اسکرین پہ آیا نمبر اور نام دیکھا تھا۔ مجھے نمبرز

کبھی نہیں بھولتے۔ یہ اسی کا نمبر ہے، اب تم بتاؤ کہ ارم کا اس معاملے سے کیا تعلق ہے؟“ ایک دفعہ پہلے بھی وہ تمہارا فون لے کر گئی تھی، مجھے یاد ہے۔“

حیا کا سر جھک رہا تھا۔ وہ نیم جاں قدموں سے چلتی کاؤچ پہ آ بیٹھی۔ ارم اس کام کے لیے اپنے گھر کا کوئی فون استعمال نہیں کرتی تھی،

اس لیے نہیں کہ وہ پکڑی نہ جائے، بلکہ اس لیے کہ وہ ”ولید“ کے ساتھ پکڑی نہ جائے۔ بہت کچھ تھا جو اسے اب سمجھ آ رہا تھا۔

”ارم کا.....“ وہ پھر بولتی گئی۔ جو بھی معلوم تھا، بتاتی گئی۔ جہاں خاموشی سے سن رہا تھا۔ وہ چپ ہوئی تو وہ بس اتنا بولا

”مجھے ارم اور ولید میں کوئی دلچسپی نہیں ہے، مجھے صرف یہی بات کھٹک رہی ہے کہ اس نے بار بار تمہارا فون کیوں استعمال کیا؟“

”کیا تم مجھ پر شک کر رہے ہو؟“

”نہیں بھئی۔“ وہ جیسے اکتایا۔ ”میں ارم کی بات کر رہا ہوں۔ بجائے کسی ملازم، کسی دوست کا فون استعمال کرنے کے، اس نے تمہارا

کیوں کیا؟“

”ہٹا نہیں، مگر میں ارم سے بات ضرور کروں گی۔“ وہ ٹیک لگا کر، بالکل خاموشی ہو کر بیٹھ گئی، جیسے کچھ سوچ رہی ہو۔ اس کی نگاہیں ویڈیو چائیم کی لڑیوں پر مرکوز تھیں مگر ذہن کہیں اور بھٹکا تھا۔ وہ ویڈیو کس نے دی ولید کو؟ کس نے بتایا ولید کو کہ جیسا ویڈیو سے اس حد تک خوفزدہ ہو سکتی ہے کہ اس کو دبانے کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہے؟ حیانے ہر جگہ سے ویڈیو ہٹوا دی تھی، مگر وہ جگہیں ایسی تھیں جو رہ گئی تھیں۔ ارم اور جیسا کے لپ ٹاپس۔ جس دن ویڈیو نیٹ پہ ڈالی گئی تھی، اسی دن ان دونوں نے اسے اپنے اپنے کمپیوٹر میں ڈاون لوڈ کر لیا تھا۔ ارم نے ہی ولید کو وہ دی ہوگی، مگر اس طرح تو ارم کی اپنی بدنامی بھی ہوگی، پھر؟ ہٹا نہیں

جہاں بیٹھ یہ نیکی کے سہارے لیٹا گردن اس کی طرف موڑے، بغور اس کے چہرے کا اتار چڑھاؤ دیکھ رہا تھا۔ وہ محسوس کیے بغیر گلاس ڈور کے پار دیکھتی، کہیں اور گم تھی۔



وہ بہت اچھے سے صحت یاب ہو رہا تھا۔ ٹھیک سے چل پھر بھی سکتا تھا۔ اس کا اپنا خیال تھا کہ وہ بغیر رکے دو میل تک بھاگ سکتا ہے۔ مگر ایسا کرنے کی اسے اجازت نہ تھی۔ البتہ وہ بستر پہ لیٹنے سے سخت بے زار ہوتا تھا۔ اس صبح وہ اسے ہسپتال کے لان میں واک کے لیے لے گئی۔ وہ خاموشی سے اس کے ساتھ چلتا رہا۔ سر پہ وہی سفید ٹوپی، اور نیچے ہسپتال کا ہلکا نیلا ٹراؤزر اور شرٹ۔ عام دنوں کی نسبت وہ ذرا آہستہ چل رہا تھا، مگر اب تو اسے خود بھی لگنے لگا تھا کہ جہاں بالکل ٹھیک ہے۔

”اس روز ہم فون نمبر زبانی بات کر رہے تھے۔ تمہیں بتا ہے مجھے نمبر زبھول جاتے ہیں۔ بلکہ یاد ہی نہیں رکھ سکتی۔“ وہ دونوں ساتھ ساتھ واک کر رہے تھے جب اس نے کہا۔

جہاں نے جواب نہیں دیا۔ بس خاموشی سے قدم اٹھاتا رہا۔

صبح کی ٹھنڈی ہوا گھاس کے ٹکڑوں کے اوپر بہہ رہی تھی۔ پرندوں کے مدھر نغے، اور درختوں کے پتوں کی کھڑکھڑاہٹ۔ سب کچھ بہت پرسکون تھا۔ اتنا پرسکون کہ وہ اپنے سارے مسئلے اور پریشانیاں بھلا کر اس ماحول کا حصہ بننا چاہتی تھی۔

”میں نے تمہیں اس رات اس لیے کہا نہیں کی تھی، کیونکہ میرے دوسرے فون میں تمہارا نمبر نہیں تھا۔ مجھے نمبر زبانی یاد نہیں رہتے۔ میرے پاس عثمان شبیر کا کارڈ تھا، سو ان کو فون کیا۔“ ساتھ ہی اسے سفیر والی بات کا خیال آیا مگر ابھی وہ اسے پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی، سو اسے بعد کے لیے اٹھا رکھا۔

”اچھا۔“ جہاں نے ذرا سی سرکوشاںات میں جنبش دی، جیسے اس ساری تفصیل میں کوئی دلچسپی نہ ہو۔

”اور میں ولید کے ساتھ صرف اس لیے بیٹھی تھی کیونکہ میں اسے رشتہ بھیجنے سے منع کرنا چاہتی تھی، مگر وہ میری غلطی تھی۔“

وہ دونوں اب جنگل کے ساتھ واک کر رہے تھے۔ جنگل کے پار سڑک اور درختوں کی قطار تھی۔ جہاں جیسے اس کی بات سن ہی نہیں رہا تھا۔

”لیکن اب میں نے زندگی سے یہ سیکھ لیا ہے کہ ہمیں پسند سب کو کرنا چاہیے لیکن اعتبار بہت کم لوگوں پہ کرنا چاہیے۔ کیا دیکھ رہے ہو؟“

اپنی رو میں بولتے اسے احساس ہوا کہ جہاں رک کر ذرا سارخ موڑے، جنگل کے پار سڑک پہ کچھ دیکھ رہا تھا۔ حیانے اس کی نگاہوں کا تعاقب کیا۔

وہاں درختوں کے ساتھ پولیس ایک جگہ کوفتہ لگا کر سیل کر رہی تھی۔ لوگوں کا ذرا سارخ فیتے کے اطراف میں جمع ہو رہا تھا، اور وہ

گردنیں اونچی کر کے ممنوع قطع اراضی کو دیکھ رہے تھے۔ حیانے بھی ذرا آگے ہو کر دیکھا۔ وہاں زمین پہ ایک شخص چت گرا پڑا تھا، ہاتھ میں پستول،

کپٹی پہ گولی کا نشان اور ڈھیر سارا خون۔

”اللہ، اللہ!“ اس نے بے اختیار ہاتھ بھوس پھیر رکھا۔ ”اپنی جان خود لے لینا، مایوسی کی انتہا۔ کیوں کرتے ہیں کچھ لوگ ایسا؟“

”نہیں!“ جہان نے اسی منظر کو دیکھتے ہوئے نفی میں گردن ہلائی۔ ”میرا نہیں خیال یہ خودکشی ہے۔ کسی نے اسے قتل کر کے لاش کے ہاتھ میں پستول دے دیا ہے۔“

اللہ، اللہ، یہ فحشی مزاج آدمی بھی نا۔

”اور تمہیں کیسے پتا کہ نفی ہے، خودکشی نہیں؟“ وہ پوری اس کی طرف گھومی۔ جہان نے مڑ کر اسے دیکھا۔

”پہلی بات، پستول اس کے ہاتھ میں ہے۔“

”ہاں تو یہی بات ظاہر کرتی ہے کہ یہ خودکشی ہو سکتی ہے۔“

”ایک تو ایسی عقلمند بیوی اللہ ہر ایک کو دے۔“ جہان نے بہت افسوس بھری نظروں سے اسے دیکھتے نفی میں سر ہلایا۔ حیا کی آنکھوں

میں ناراضی ابھری

”مطلب؟“

”نیوٹن کا تھرو لاء آف مشن تو پڑھ رکھا ہو گا تم نے؟“

”اب مجھ کم عقل کو کیا پتا نیوٹن کون تھا؟“ وہ اسی فحشی سے بولی۔

”ہاں، بالکل، تمہیں تو اتنا بھی نہیں پتا ہو گا۔ بہر حال وہ جو بھی تھا، اس نے ایک قانون دیا تھا کہ۔۔۔۔۔“

”یاد آ گیا، نیوٹن وہی تھا نا جس کا سیبوں کا کاروبار تھا؟“ اب کہ اس نے ذرا معصومیت سے پوچھا۔ جہان نے ایک بے ساختہ

مسکراہٹ لبوں پہ روکی۔

”ہاں، بالکل، وہی تھا۔ بہر حال اس کا تیسرا قانون کہتا ہے کہ

ہر ایکشن کا ایک برابر اور مخالف ری ایکشن ہوتا ہے، جب انسان گولی چلاتا ہے، تو گولی آگے، اور گن پیچھے کو جھکا کھاتی ہے، خودکشی

کرنے والے نے چونکہ خود کو ہرٹ کیا ہوتا ہے، اس لیے بمشکل بیس فیصد خودکشیوں میں پستول ڈیڈ باڈی کے ہاتھ میں رہتا ہے، ورنہ عموماً وہ اس

انسان سے تیس سینٹی میٹر کے فاصلے پہ جا گرتا ہے۔“

”اچھا، مگر ہو سکتا ہے کہ یہ ان بیس فیصد کیسیز میں سے ایک ہو؟“ وہ بھی ہار نہیں ماننا چاہ رہی تھی۔ مگر وہ نہیں سن رہا تھا۔

”دوسری بات؟ یہ جو اس کا زخم کا نشان ہے، یہ ذرا فاصلے سے آیا ہوا لگتا ہے، خودکشی میں انسان کپٹی پہ پستول رکھ کر چلاتا ہے، اور اس کا

نشان بالکل مختلف ہوتا ہے۔“

پولیس آفیسر زب ڈیڈ باڈی کی تصاویر بنا رہے تھے ایک آفیسر جائے وقوعہ کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔

”تیسری بات؟“ اگر گولی اس نے خود چلائی ہے تو ہاتھ پہ گن پاؤڈر ضرور گرا ہو گا، اور اگر میں ذرا قریب سے دیکھ پاتا تو تمہیں مزید

ثبوت لا کر دیتا مگر تم تب بھی نہ مانتیں۔“

”تم بھی تو نہیں مانتے۔“ اس نے شانے ذرا سے اچکائے اور واپس مڑ گئی۔ اس کا موڈ آف ہو چکا تھا جہان سر جھٹک کر اس کے ساتھ

چلنے لگا۔

اس نے اتنا کچھ کیا، مگر وہ اب بھی یہ ماننے کو تیار نہ تھا کہ اس کی بیوی ”عقلمند“ ہے۔ چلو، کبھی کسی دن وہ اس پہ یہ ضرور ثابت کرے گی

کہ وہ جہان سے زیادہ سارٹ ہے۔ کبھی نہ کبھی اسے موقع ضرور ملے گا۔

☆ ☆ ☆

آج وہ شام میں بہارے سے مل کر واپس آ گئی تھی۔ جہان کو ذرا سا بخار تھا، سو وہ اس کے پاس رکنا چاہتی تھی۔ جہان نے بھی کوئی

اعتراض نہیں کیا تھا۔ البتہ بہارے نے ذرا سامنے بنایا تھا۔

”تم مجھے بالکل بھول گئی ہو۔“

”میں اپنی چھوٹی بلی کو کیسے بھول سکتی ہوں۔“ جاتے سے اس کے دونوں گال چومتے ہوئے حیا نے کہا تھا۔

”ہم آشیانہ واپس کب جائیں گے؟“

”کیوں تمہیں عروہ کے ساتھ مزہ نہیں آرہا؟“ اس نے مسز عبداللہ کی نواسی کا نام لیا، جو اپنی ماں اور نانی کے ہمراہ صبحیہ نور کے گھر آج کل آئی ہوئی تھی۔

”اوہ ہوں!“ بہارے نے ناک کیٹری۔ ”وہ اتنی چھوٹی اور بے وقوف ہے، مجھے اس کے ساتھ ذرا بھی مزہ نہیں آتا۔“

”ہاں تم تو بہت بڑی ہو جیسے؟“ نس کر بہارے کے سر پہ چپٹ لگاتی وہ پھر اپنی چیزیں سمیٹنے لگی تھی۔

رات تک جہان کا بخار قدرے اتر گیا تھا، اس نے ایک دفعہ کہا بھی کہ وہ چلی جائے مگر وہ اب ہٹل جا کر کیا کرتی؟ خواہ مخواہ نگرنگی رہتی، سو وہیں کاؤچ پہ بیٹھی رہی۔

گلاس ڈور کے آگے سے پردہ ہٹا ہوا تھا۔ باہر سے آتی چاندنی سے دروازے کے اوپر ٹکٹا دنڈ چائم چمک رہا تھا۔ یوں جیسے قطرہ قطرہ چاندنی پکھل کر اس کی لڑیوں سے چمک رہی ہو۔

جہان کافی دیر سے دوا کے زیر اثر سُکون سو رہا تھا، وہ دہیں کاؤچ کے سرے پہ پکی، اس کو دیکھ رہی تھی، عبا یا بھی ساتھ ہی رکھا تھا، اور اس جاسٹی قیص کے اوپر اس نے دوپٹہ لے رکھا تھا۔ جہان کا موبائل اس کے سر ہانے، سائیڈ ٹیبل پہ رکھا تھا، اس کو دیکھتے ہوئے اسے بار بار ام اور ولید کا خیال آرہا تھا۔ جہان نے کہا تھا کہ اس نے پھپھو کو حیا کے نمبر سے کال کرنے کے لیے اس کا فون اٹھایا تھا، مگر پھر کال ملا کر بند کر دیا۔ شاید اس نے ویسے ہی اس کا فون چیک کیا ہو۔ شاید اسے ایسے کاموں کی عادت تھی۔ اور اگر وہ اس کا فون چیک کر سکتا تھا، تو وہ بھی کر سکتی تھی۔ اسے متبادل پاسورڈ بھی معلوم تھا۔ جاسوس کی جاسوسی بھی دلچسپ کام تھا۔ اور پھر اسے جہان پہ کچھ ثابت بھی تو کرنا تھا نا۔

اس نے بنا کسی آہٹ کے جھک کر پیر جوتوں سے آزاد کیے، پھر ننگے پاؤں اٹھی، بغیر چاپ کے دبے قدموں چلتی اس کے سر ہانے آکھڑی ہوئی۔ اس کا فون، پانی کے جگ اور گلاس کے ساتھ ہی رکھا تھا۔ جہان سو رہا تھا۔ آنکھیں بند، ہولے ہولے چلتا سانس۔

حیا نے آہستہ سے ہاتھ فون کی طرف بڑھایا۔ ابھی وہ موبائل سے بالشت بھر دور ہی تھا کہ..... ایک جھٹکے سے کسی نے اس کی کلائی پکڑی۔

”امی!“ بوکھلا کر کراہتی، وہ ایک قدم پیچھے ہٹی۔

اس کی کلائی پکڑے، جہان کہنی کے بل ذرا سا اٹھا، اور نیند بھری آنکھوں سے اسے دیکھا۔

”کیا کر رہی تھیں؟“ وہ جیسے حیران ہوا تھا۔ اندھیرے میں بھی حیا کے چہرے پر اڑتی ہوائیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔

”تم تو سو رہے تھے!“ وہ اتنی شاذ تھی کہ پتا نہیں کیا بول گئی۔

”تم کر کیا رہی تھیں؟“

”پانی..... پانی لے رہی تھی۔“ اس کا سانس ابھی تک جیسے زکا ہوا تھا۔ جہان نے ایک نظر پانی کے جگ پہ ڈالی، پھر گردن پھیر کے کاؤچ کی میز کو دیکھا جہاں پانی کی چھوٹی بوتل رکھی تھی۔

”وہ گرم ہو گیا تھا، یہ ٹھنڈا ہے، اس لیے یہ لے رہی تھی۔“ اس کی نگاہوں کا سفر دیکھتے ہوئے اس نے جلدی سے وضاحت دی۔

جہان نے ایک خاموش نظر اس پہ ڈالی، پھر اس کی کلائی چھوڑ دی۔ اس نے جلدی سے، ذرا لرزتے ہاتھوں سے جگ سے پانی گلاس میں اٹھایا، اور گلاس پکڑے واپس کاؤچ پہ آ بیٹھی۔

”اروشیور تمہیں پانی ہی چاہیے تھا؟“ سرواپس تیکے پہ ڈالے، وہ اب اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

”ہاں، آف کورس!“ اس نے ذرا ساشانے اچکاتے ہوئے گلاس لبوں سے لگایا۔ دل ابھی تک دھک دھک کر رہا تھا۔ یہ آدمی آخر

سوتا کب تھا؟

”ویسے اگر ادھر جگ نہ پڑا ہوتا تو تم کیا کہتی؟“ وہ بہت دلچسپی سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔ پتا نہیں وہ کیا سمجھ رہا تھا۔

”ادھر جگ نہ ہوتا تو میں ادھر آتی ہی کیوں؟“ وہ پانی کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھر رہی تھی۔ آدھا گلاس تھا مگر ختم ہونے کا نام ہی

نہیں لے رہا تھا۔

”ہمارے کہاں ہے؟ آج رات“

”وہیں، نانی کے پاس!“

”اس کو ساتھ لانے کی ضرورت ہی کیا تھی؟“ وہ پھر سے کسی نئے جھگڑے کے موڑ میں تھا شاید۔

”چھوٹی سی بچی کیا کہہ رہی ہے تمہیں؟“

”اپنی بہن کی جاسوس ہے وہ۔ ایک ایک بات کی رپورٹ دیتی ہوگی اُدھر۔“

”اگر میں اسے نہ لاتی تو زیادہ برا ہو سکتا تھا۔ سفیر نے اسے کہا تھا کہ وہ اپنا پاسپورٹ جلا دے، تاکہ تم واپس آ جاؤ۔ اس نے خود مجھے

بتایا ہے۔“ گلاس میز پر رکھتے ہوئے اس نے اپنے تئیں ایک بڑی خبر دی تھی۔

”اور تم نے یقین کر لیا؟“

”کیا مطلب؟“ حیا کے لب حیرت سے ذرا سے کھل گئے۔

”اس ناگہجی لڑکی نے تمہیں بے وقوف بنایا اور تم بن گئی۔ ویری سارٹ حیا!“ اس نے پھر سے انہی تاسف بھری نگاہوں سے حیا کو

دیکھ کر نفی میں سر ہلایا جیسے جنگلے کے ساتھ کھڑے ہوئے کیا تھا۔

”جہاں، اس کو غیر نے.....“

”اس کو سفیر نے واقعی یہ کہا تھا مگر جب وہ اپنا پاسپورٹ جلا چکی تھی، تب! اور وہ بھی غصے سے کیونکہ ایسی صورت میں مجھے واپس آنا

پڑتا۔ بہارے نے تم سے جھوٹ نہیں بولا، اس نے صرف تمہیں آدھی بات بتائی ہے، بچے ایسے گول مول بات کر دیتے ہیں، تم تو بڑی تھیں۔ تم ہی

عقل کرتیں۔“

پھر وہی عقل کا طعنہ؟

”مگر تم نے کہا تھا کہ وہ لالچی ہے، اور وہ.....“

”ہاں لالچی ہے، اس لیے تو وہ نہیں چاہتا کہ عبدالرحمن واپس جائے۔ پاشا بے جیسے لوگ جب مشکل میں پھنستے ہیں تو ان کی ساری

فیملی خلیازہ بھگتی ہے۔ سب کچھ بیچ کر، نامحسوس انداز میں ایک، ایک کو باری باری اس ملک سے نکلنا ہوتا ہے۔ ایک ساتھ سب نہیں جاسکتے۔

بہارے نے سب سے کہا تھا کہ وہ آخر میں جائے گی، اور عائشے کے پاس ماننے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ مگر بہارے نے اپنا پاسپورٹ خود ہی جلا

دیا۔ نتیجتاً سفیر کی پریشانی بڑھ گئی۔ ہمارے وہاں سے نکلنے کے بعد سب کچھ اسی کا تو ہو گا۔ ہوٹل میں شیئرز، گھر میں، اور کیا نہیں ہم نے دیا اس کو، وہ

کبھی نہیں چاہے گا کہ میں یا پاشا بے کی فیملی کا کوئی شخص وہاں واپس آئے۔“

”مگر وہ ہمارے پیچھے ڈورم بلاک تک آیا اور.....“

”میں اس لڑکی کو اس کی ذمہ داری میں چھوڑ کر گیا تھا، اسے تمہارے پیچھے آنا چاہیے تھا۔ بہارے نے تمہیں ایک طرف کی بات بتائی،

اگر تم دوسری طرف کی بات سن لیتی تو اتنا مسئلہ نہ ہوتا۔“

کاؤنچ پر بیٹھی حیا کو لگا، وہ اس دنیا کی سب سے کم عقل اور بے وقوف لڑکی ہے، اسے بہارے پہ بالکل غصہ نہیں آیا۔ اپنی چھوٹی ملی

سے وہ خفا ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ مگر اسے خود سفیر سے بات کرنی چاہیے تھی، مگر نہیں..... مسئلہ یہ بھی نہیں تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ وہ بہارے کو کپا دو کیہ کے

بارے میں بتا چکی تھی، مگر یہ بات وہ اس وقت جہاں کو نہیں کہہ سکتی تھی۔ ایک دم اسے ڈھیر سارا روٹا آیا تھا۔

”میں نے وہی کیا جو مجھے صحیح لگا۔“ بہت مشکل سے یہ الفاظ کہہ کر، اور ”جہنم میں جاؤ تم سب“ کے الفاظ لبوں تک روک کر وہ اٹھ گئی۔

”تم سو جاؤ، مجھے کام ہے۔“ اور تیز تیز قدموں سے چلتی باہر نکل گئی۔ وہی غصے یا رکھ میں جگہ چھوڑ دینے کی عادت۔

باہر کا ریڈور میں ذرا آگے جا کر ایک بیچ سانسب تھا۔ وہ اس بیچ پہ دونوں کہنیاں گھنٹوں پر رکھے، ہاتھوں میں چہرہ چھپائے بیٹھ گئی۔

بار بار بدل بھرا رہا تھا۔ شرمندگی کہ وہ جان گیا تھا، وہ اس کا فون چیک کرنے آئی تھی۔ بدترین۔ کبھی سوتا بھی تھا یا نہیں؟ اتنی زور کا ہاتھ پکڑا۔ اس نے

چہرے سے ہاتھ ہٹا کر لکائی کودیکھا۔ اب کوئی اتنی سرخ بھی نہیں پڑی تھی، مگر پھر بھی اسے رونا آ رہا تھا۔

دفعتاً دائیں جانب آہٹ ہوئی۔ حیانے بے اختیار سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ کمرے سے نکل کر اس کی طرف آ رہا تھا۔ تو یہ طے تھا کہ ہر دفعہ وہ اس کے پیچھے آئے گا۔

”تم کیوں نکل آئے؟ جاؤ جا کر لیٹو۔ ابھی برس نے دیکھا تو سوباتیں سناے گی مجھے۔“ وہ پریشانی سے بولی تھی۔ جہاں جواب دیے، ہناس کے ساتھ بیچ پٹا کر بیٹھ گیا۔

”تم باہر کیوں آئی؟“ اس کی طرف چہرہ کیے، وہ ذرا دھمکے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔ کارڈور میں روشنی تھی، سفید روشنی، مگر وہ چاندی کی سی نہیں تھی۔

”کیونکہ تمہیں میں اندر بیٹھی بہت بُری لگ رہی تھی۔“

”ہاں خیر لگ تو رہی تھیں، مگر اتنی بھی نہیں کہ باہر آ جاؤ۔ میں برداشت کر رہی لیتا۔“ وہ بہت سنجیدگی سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

اگر اس وقت اس کے ہاتھ میں کوئی بھاری چیز ہوتی تو وہ اس کے پنی والے سر کا لحاظ بھی نہ کرتی۔

”تم جاؤ، میں یہیں ٹھیک ہوں۔“ وہ رخ سیدھا کیے، سامنے دیوار کو دیکھنے لگی۔

”اب نیا مسئلہ کیا ہے تمہارا؟“

”میرے مسئلے کبھی ختم نہیں ہو سکتے۔ میری زندگی بھی ایک پتیلی ہے جس کو میں کبھی حل نہیں کر سکتی۔“ پتا نہیں اسے اتنی مایوسی اور بے زاری کس بات تھی، مگر تھی ضرور۔

”تمہارا مسئلہ پتا کیا ہے؟“ وہ اس کے چہرے کو دیکھنے ہوئے کہنے لگا۔ ”تم ایک بات سمجھ نہیں پا رہی، کہ تم کسی چیز کی کتنی ہی صفائی

کیوں نہ کرو، اس پہ جالے پھر سے بن جائیں گے۔ یہ جو تم بار بار اسٹرگل کرتے کرتے تھکنے اور اداس ہونے لگتی ہونا، یہ اسی وجہ سے ہے، اور یہ سب کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس فیز میں یوں بے زار ہو کر بیٹھ نہیں جاتے، بلکہ خود کو مرنی روئل سے بچائے رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ صبر اسی چیز کا نام ہے۔ خود کو مرنی روئل سے روکنا اور مثبت سوچ پہ جمائے رکھنا۔“

جب اس نے جالے کا لفظ استعمال کیا تھا، وہ بھی چونکی تھی۔ کچھ یاد آ رہا تھا۔

”ڈاکٹر ابراہیم نے بھی ایسی ہی باتیں کہیں تھیں مجھ سے۔ مٹری کے جالوں کی۔“ وہ بولی تو اس کی آواز سے ناراضی مفقود تھی، صرف

گہری سوچ پنہاں تھی۔

سرد خاموش کارڈور میں یکدم ہلکا سا اندھیرا ہو گیا تھا، اور دور کہیں سے پھٹکی ہوئی چاندی فرش پر گرنے لگی تھی۔

”ضرور کبھی ہوگی۔ قرآن کو سمجھ کر پڑھنے والے اس کی پتیلیوں پر غور اسی طرح کیا کرتے ہیں۔“ وہ اثبات میں سر ہلا کر کہہ رہا تھا۔

کتنے عرصے بعد اسے لگا تھا، اسے میجر احمد پھر سے مل گیا ہے۔ وہی دھیمہ، بھرا ہوا الجھ، وہی باتیں۔

”تو پھر میں قرآن کی پتیلیاں کیوں حل نہیں کر سکتی؟“ سر ابراہیم کا کہنا ہے کہ سورۃ الاحزاب کی پتیلی میں کچھ ہے جو میں مس کر گئی ہوں۔“

دور کارڈور کے سرے پہ گری چاندی بہہ کر اس طرف آ رہی تھی۔ ساری دیواریں ساتھ میں چاندی کے ورق میں پلپتی جا رہی تھیں۔

”ہر آدمی ایک آیت کو اپنے طور پر دیکھتا ہے، اور خود سے ریلیٹ کرتا ہے۔ وہ اسے کسی اور اینگل سے دیکھ رہے ہوں گے، مگر وہ جو بھی

چیز ہوگی، وہ اس آیت کا آخری راز کبھی نہیں ہوگا، تمہیں ہر دفعہ وہ آیت یادہ سورۃ یا صرف وہ ایک لفظ کوئی نیا راز دے گا، اور کوئی بھی راز آخری نہیں ہوگا۔“

چاندی کا پانی سافرش پہ بہتا اب ان کے بیچ سے ذرا سا ہی دور تھا۔

”کیا تم میرے لیے اس پتیلی کو حل کر سکتے ہو؟“

”جیہا قرآن اور نماز، یہ دو وہ چیزیں ہیں جو ہر انسان کو اپنے لیے خود ہی کرنی ہوتی ہیں۔ یہ کبھی کوئی دوسرا آپ کے لیے نہیں کر سکتا۔“

چاندی کا ورق ان کے قدموں کو چھوتا ان کو بھی خود میں پسینے لگا۔ چاندی کے ٹکسے پھر سے لوٹ آئے تھے۔

”لیکن میں تمہیں قرآن کی کچھ پہیلیاں بتا سکتا ہوں، جو بہت سے لوگوں نے حل کی ہیں، جیسے..... جیسے.....“ چاندی کے مجسمے نے لمحے بھر کو، دانت سے نچلا لب دبائے، کچھ سوچا، پھر کہنے لگا۔

”جیسے تم نے سورۃ الفلق تو پڑھی ہوگی۔“

”اوہ جہان، کس کو الفلق اور انسان زبانی یاد نہیں ہوں گی؟“

”اوکے، پھر الفلق کی تیسری آیت یاد کرو، من ضر غاسق اذا وقب۔ اس آیت کا ترجمہ ہمارے ہاں عموماً یوں کیا جاتا ہے کہ میں (پناہ مانگتا ہوں) رات کے شر سے جب وہ چھا جاتی ہے۔“

”ہوں، ٹھیک!“ چاندی کی تہہ پورے کارڈ پر چڑھ چکی تھی۔ ہر سو دم ہی جگمگاہٹ تھی۔

”یعنی کہ ”غاسق“ کے شر سے پناہ مانگی گئی ہے یہاں۔ غاسق کا مطلب ہوتا ہے، اندھیرا کرنے والا، یعنی کہ رات۔ لیکن.....“ وہ لمحے بھر کو ٹھہرا۔ ”غاسق کا ایک اور مطلب بھی ہوتا ہے، وہ مطلب جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غاسق کے لیے استعمال فرمایا تھا۔ کیا تم وہ مطلب جانتی ہو؟“

”نہیں۔“ چاندی کے مجسمے نے ہولے سے نفی میں سر ہلایا۔ وہ پلک جھپکے، بنا پہلے مجسمے کو دیکھ رہی تھی، کہ کہیں وہ ٹرانس ٹوٹ نہ جائے۔ ”میں تمہیں اس کا دوسرا مطلب بتاتا، بلکہ دکھاتا ہوں۔ ادھر آؤ۔“ وہ اٹھا۔ وہ اس کے پیچھے کھڑی ہوئی۔ وہ اس کے آگے چلتا اپنے کمرے میں واپس آیا اور دروازہ بند کیا۔

کمرے میں نیم اندھیرا تھا، صرف گلاس ڈور سے چاندنی اندر جھانک رہی تھی۔ جہان اس دروازے کے پاس جا کھڑا ہوا، اور جب وہ اس کے پہلو میں آ کھڑی ہوئی تو اس نے انگلی سے باہر، اوپر کی سمت اشارہ کیا۔

”وہ ہے غاسق!“ حیانے اس کی انگلی کے تعاقب میں دیکھا۔ وہاں سیاہ آسمان پہ چاندی کی ایک نکلیا جگمگا رہی تھی۔

”چاند؟ غاسق کا دوسرا مطلب چاند ہوتا ہے؟“ اس نے بے یقینی سے دہراتے ہوئے جہان کو دیکھا۔ جہان نے ذرا سا مسکرا کر سر کو اثبات میں جنبش دی، اس کا چہرہ آدھا اندھیرے، اور آدھا سلور روشنی میں تھا۔

”چاند کے شر سے پناہ؟ مگر چاند میں کون سا شر ہوتا ہے؟“ اسے ابھی تک بات سمجھ نہیں آئی تھی۔

”ہر چیز میں خیر اور شر دونوں ہوتے ہیں۔ چاند بہت پیارا، بہت خوبصورت ہے۔ لیکن تم نے کبھی دیکھا ہے سمندر کی لہروں کا مدوجزر؟“

حیانے اثبات میں سر ہلایا۔ ہاں، یہ تو وہ جانتی تھی کہ.....

”چاند کھینچتا ہے ان لہروں کو، چاند میں بہت کشش ہوتی ہے۔“

”مگر وہ سمندر کی بات ہے، اس کا انسان سے کیا تعلق؟“ کہتے ہوئے حیانے پھر گردن پھیر کر کشش کے پار آسمان پہ جھپکتے چاند کو دیکھا۔

”حیا..... چاند سمندر کو نہیں، چاند پانی کو کھینچتا ہے۔ چاند ”ہز“ پانی کو کھینچتا ہے۔ اور.....“ اس نے ایک انگلی سے حیا کی کنپٹی کو

چھوا ”ادھر تمہارے دماغ میں بھی Fluids ہوتے ہیں، پانی ہوتا ہے، چاند اس کو بھی کھینچتا ہے۔ جن لوگوں کا دماغی نظام غیر متوازن ہو جاتا ہے، وہ پاگل کہلاتے ہیں، اور پاگل کو ہم انگریزی میں کیا کہتے ہیں؟“ وہ لمحے بھر کو رکا۔ وہ کسی ٹرانس کے زیر اثر سن رہی تھی۔

”چاند کو ہم Luna کہتے ہیں، اور پاگل کو Lunatic کہتے ہیں۔ چاند اور دماغی امراض کا بہت گہرا تعلق ہوتا ہے۔ یہ انسان

کے حواس پہ اثر انداز ہوتا ہے۔ اس لیے جو لوگ مرض عشق میں مبتلا ہوتے ہیں، یا شاعر وغیرہ، وہ چاند کا ذکر بہت کرتے ہیں۔ چاند بہت خوبصورت ہے، یہ اندھیرے میں ہمیں راستہ دکھاتا ہے۔ اس کی خیر ہمیں سمیٹنی چاہیے، مگر اس کے شر سے پناہ مانگنی چاہیے۔ کیا اب تم مانع ہو

کہ قرآن کی پہیلیاں زیادہ دلچسپ ہوتی ہیں؟“

حیانے ہولے سے سر اثبات میں ہلایا۔ اس وقت سارے جہاں میں ایسا جادوئی اثر چھایا تھا کہ اسے لگا اس کے کچھ کہنے سے وہ ٹوٹ

”اور ہاں، میں نے اپنے فون کا متبادل پاسورڈ ہٹا دیا تھا۔“ اس نے کہا، اور ایک دم سے وہ محروٹا ناچاندی چٹکائی، اور اس کی پرتیں کہیں ہوئیں تحلیل ہوتی گئیں۔

وہ جیسے کسی خواب سے جاگتی، پھر ذرا سے شانے اچکائے اور واپس کاؤچ پہ جا بیٹھی۔
جہان دھیمی مسکراہٹ سے اسے دیکھتا، بیڈ کی طرف چلا گیا۔ حیانے پھر سے گردن پھیر کر کشتے کے پار دیکھتے چاند کو دیکھا۔
وینڈ چائیم کی ہنگھڑیاں ابھی تک چاندنی میں نہائی ہوئی تھیں۔

☆ ☆ ☆

صبح اس نے بہارے کی اچھی کلاس لی تھی۔

”تم نے مجھے یہ تاثر دیا کہ سفیر نے تم سے یہ سب کہا تھا، جبکہ اس نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔ تم نے مجھے بس گائیڈ کیا۔“
”میرا مطلب وہی تھا۔“ وہ منمنائی مگر حیا اس کے سامنے کمرے میں ادھر ادھر ٹپتی سن ہی نہیں رہی تھی۔

”تم نے جھوٹ بولا مجھ سے۔ تم نے جھوٹ بولنا نہیں چھوڑا۔“

”اچھا، سوری، آئندہ نہیں کروں گی۔“ وہ بار بار سوری کرتی اس کو منانے کی کوشش کر رہی تھی، مگر حیا خفا خفا سی سامنے صوفے پہ جا بیٹھی۔
جہان کے سامنے اٹھائی جانے والی شرمندگی کا بدلہ کسی سے تو لینا تھا۔

”کیا تم مجھ سے ناراض ہو؟“ وہ اٹھ کر اس کے سامنے آکھڑی ہوئی اور ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

حیانے آبرو اٹھا کر ایک سخت نگاہ اس پہ ڈالی۔

”نہیں، میں تم سے بہت خوش ہوں اور اگر میں نے یہ سب عائشہ کو بتا دیا تو.....؟“

اس بات پہ بہارے نے اپنی سب سے معصوم شکل بنائی، اور بہت ہی ناصحانہ انداز میں بولی۔

”اچھی لڑکیاں شکایت نہیں لگایا کرتیں۔“

”ہاں مگر اچھی لڑکیاں تھپڑ بہت اچھے سے لگا سکتی ہیں، اور میں تمہیں بتا رہی ہوں، کسی دن تم میرے ہاتھوں بہت پڑو گی۔“

بہارے لپک کر اس کے پیچھے سے آئی اور اس کی گردن میں بازو ڈال کر چہرہ اس کے گال سے لگایا۔

”بہارے گل تم سے بہت پیار کرتی ہے، حیا سلیمان!“

”اچھا، بکھن مت لگاؤ، مجھے ابھی جانا ہے، پھر میں شام میں آؤں گی۔“

بہارے نے بازو ہٹا کر خفگی سے اسے دیکھا۔

”اور میں اس چھوٹی چیزیل کے ساتھ رہوں گی پھر سارا دن؟“

”میں اب تمہاری کسی بات کا یقین نہیں کروں گی۔“ اپنی مصنوعی ناراضگی کو جاری رکھتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اور چلو، اب کچھ گفتگو لینے ہیں میں نے نانی اور باقی سب کے لیے۔“

”میں اس چھوٹی چیزیل کے لیے کچھ نہیں لوں گی۔“ بہارے نے ناک سکڑتے ہوئے احتجاج کیا، مگر حیانے رک کر، گھور کر اسے

دیکھا تو وہ ”سوری“ کہتی ہوئی ساتھ چل پڑی۔

کل جہان نے ڈسچارج ہونا تھا، سوان کو واپس کپادو کیہ چلے جانا تھا۔ یقیناً یہ مسز عبداللہ کی فیملی سے اس کی آخری ملاقات تھی، اور ان پانچ ماہ میں ان کی طرف سے دکھائے گئے خلوص اور مہمان نوازی کا بدلہ تو وہ نہیں اتار سکتی تھی، پھر بھی سوچا کچھ تحائف خرید لے۔ ان کے دیے گئے تحائف بھی اس کے پاس تھے، اور تختہ تو محبت کا وہ نشان ہے جس کی واپسی ضروری ہوتی ہے۔

نانی، مسز عبداللہ اور مہرنے اپنے تحائف لیتے ہوئے اسے کہا بھی کہ اس تکلف کی کیا ضرورت تھی، مگر وہ اس کی محبت پہ مسرور بھی تھیں۔ عروہ کے لیے اس نے کیپٹن پلینٹ کا لونز کی کچھ ڈی وی ڈیزلی تھیں، اور اس معصوم بچی نے دھیمی آواز میں شکر یہ کے ساتھ انہیں وصول کیا، پھر اس نے شرمیلی مکان کے ساتھ بہارے گل کو اپنا گفٹ دکھانے کی کوشش کی مگر ادالار کی شہزادی ناک سکڑے بیٹھی رہی، جیسے اسے عروہ

میں کوئی دلچسپی نہ ہو۔ اور تب حیا کو سمجھ آیا کہ بہار سے یہ ”موڈی انداز“ کس سے کاپی کیا ہے۔ جہاں۔ وہ بھی ایسا ہی تھا اور بہار سے اس کے ہر انداز کو اپنانے کی کوشش کرتی تھی۔

سہ پہر میں وہ جہاں کی طرف چلی آئی۔ اس کے پرائیویٹ روم کا دروازہ وہ کھولنے ہی لگی تھی کہ وہ اندر سے کسی نے کھولا۔ وہ رک گئی۔ اندر سے ایک ترک لڑکی باہر آ رہی تھی۔ ساتھ ہی کمرے کا منظر نمایاں ہوا۔ وہ لوگ ایک معمر مریض کو بیڈ پہ لگا رہے تھے۔ حیا کا سانس جیسے کسی نے روک دیا۔ اس نے دوبارہ سے روم نمبر دیکھا۔

”مسٹر میرا... میرا مریض کہاں ہے؟“ ایک شناسائز دکھائی دی تو وہ دوڑ کر اس تک گئی۔ پریشانی، فکر مندی، خوف، کیا تھا جو اسے اس وقت محسوس نہیں ہوا تھا؟

”وہ صبح ڈسچارج ہو گیا تھا۔“

وہ جن دق یز کو دیکھنے لگی۔

”مگر اسے تو کل جانا تھا۔“

”ہاں مگر وہ ٹھیک تھا۔ اور تین ہفتے بعد تو بالکل پہلے جیسا ہو جائے گا۔“

”لیکن..... وہ گیا کہاں؟“ اس بات پہ نرس شانے اچکاتی، بڑے لیے آگے بڑھ گئی۔ حیا کا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے پلٹی اور واپس جانے لگی۔ اب کیا کرے گی، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

ابھی کارڈ کے وسط میں تھی کہ ایک دم سے کچھ یاد آیا۔ وہ بھاگ کر اس روم کی چوٹ تک واپس آئی۔ دروازہ ابھی تک نیم وا تھا۔ گلاس ڈور سامنے ہی نظر آ رہا تھا، اور اس کے اوپر کیل سے وہی پینٹنگ آویزاں تھی۔

”میرا..... میرا ونڈ چائٹ تھا اوجھ؟“ باہر آتی اسی نرس کو اس نے پھر روکا۔

”میں نہیں جانتی۔ وہ اپنی ساری چیزیں لے گیا ہے۔“

اور پتا نہیں وہ ونڈ چائٹ لے کر گیا بھی تھا یا اسے کہیں پھینک دیا تھا؟ جہاں سکندر کا کچھ پتا نہ تھا۔ یہ تو طے تھا کہ ان کو دوبارہ کپاؤ کیہ ہی جانا تھا، اور انقرہ دیکھنے میں تو اسے ویسے بھی دلچسپی نہ تھی، اس لیے وہ ہاسٹل سے نکل آئی۔

ہوٹل میں آ کر سب سے پہلا کام اس نے ارم کو فون کرنے کا کیا تھا۔ ”ارم وہ ویڈیو لید کوکس نے دی؟“ تمہید کے بعد اس نے تیزی سے پوچھا تھا۔ ارم ایک ٹائپ کو خاموش ہوئی۔

”جب سارے شہر میں پھیل سکتی ہے تو ہو سکتا ہے اسی ویب سائٹ پہ اس نے بھی دیکھ لی ہو۔“

”یونوائٹ ارم، میں نے تو یہ کہا ہی نہیں کہ میں کس ویڈیو کی بات کر رہی ہوں۔“

”ہمارے درمیان ایک ہی ویڈیو کا الیٹو تھا، اور ظاہر ہے تم اس کی بات.....“

”جہنم میں جاؤ تم ارم،“ وہ سنہل کر بات بنانا چاہ رہی تھی مگر حیا نے ٹھک سے فون بند کر دیا۔ اسے اس کا جواب مل گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

ہمارے درمیان ایک ہی ویڈیو کا الیٹو تھا اور ظاہر ہے تم اسی کی بات.....“ وہ کہنا چاہ رہی تھی مگر دوسری جانب سے حیا نے بہت غصے سے ”جہنم میں جاؤ تم ارم!“ کہہ کر کال کاٹ دی تھی۔ ارم نے ایک لمحے کے لیے ریور کو دیکھا، اور پھر شانے اچکاتے ہوئے اسے واپس کریڈل پہ ڈال دیا اور وہاں رکھا جائے گا کپ پھر سے اٹھالیا۔

یقیناً حیا کو معلوم ہو گیا تھا کہ وہ ویڈیو اس نے ہی ولید کو دی ہے لیکن اسے اب اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اس کے پاس کھونے کو اب مزید کچھ نہیں رہا تھا۔

اس نے جائے گا کپ لبوں سے لگایا۔ گرم، کڑوا سا سیال مانع جیسے اندر تک اترتا گیا۔

”جہنم میں جاؤ میں؟ نہیں حیا، یہ تم ہوگی جس کو اب اسی طرح بہت کچھ کھونا ہوگا جیسے میں نے گھوایا تھا۔ وہ بھی صرف تمہاری وجہ

سے۔ اب اپنی روانی کا مزہ تم بھی چکسوا۔“

وہ دل ہی دل میں اپنی گزن سے مخاطب ہوئی۔

وہ دونوں بچا زاد نہیں تھیں۔ فرسٹ کزنز۔ اور بالکل ایسی تھیں جیسی کزنز ہوتی ہیں۔ جب ماؤں کے تعلقات خراب ہوئے تو ان کے بھی ہو گئے، مگر جب فضا موافق ہوئی تو دونوں پھر سے ایک ہو گئیں۔ دوستی بھی ان کی بہت تھی، اور بڑے سے بڑے فیملی کلیش کے بعد بھی وہ پھر سے ایک ہو جایا کرتی تھیں۔ کزنز..... ایک بہت پیارا رشتہ جو بڑوں کی سیاست اور منافقت کی گرد میں بہت میلا ہو جایا کرتا ہے۔

پچھلے دو، تین برسوں میں ان کی ماؤں کے تعلقات خوشگوار رہے تھے، سوان کی دوستی بھی اپنے عروج پر رہی۔ اور یہ انہی دنوں کی بات ہے جب داور بھائی کی شادی بہت قریب تھی کہ وہ پہلی دفعہ ولید سے ملی۔

اس روز داور بھائی نے اسے یونیورسٹی سے پک کیا تھا، مگر درمیان میں ایک کام آن پڑا تو وہ آفس کی طرف آ گئے۔ اب ان دنوں ویسے بھی آفس نہیں جا رہے تھے۔ داور بھائی بلڈنگ میں چلے گئے، اور وہ باہر گاڑی میں بیٹھی رہی۔ تبھی کوئی اس کے پاس آ کر رکھا تھا۔ وہ سارٹ، گڈ لکنگ سانو جوان داور بھائی کی کار کو پہچان گیا تھا، اس لیے خیریت پوچھنے رک گیا۔

جلدی جلدی ساری بات بتا کر ام نے شیشہ اوپر چڑھا دیا۔ اگر جو بھائی نے دیکھ لیا کہ وہ بڑے سے بات کر رہی ہے تو اس کی خیر نہیں تھی۔ وہ نو جوان چلا گیا، مگر اسی دن شام میں اس نے ان کے لینڈ لائن پفون کر دیا۔

ارم کی تو جان ہی نکل گئی۔ پہلے تو وہ گھبرا گئی، مگر اس نے بہت شان سنگھی سے بتایا کہ اس کا نام ولید ہے، وہ ان کے بزنس پارٹنر کا بیٹا ہے اور اس سے کچھ بات کرنا چاہتا ہے۔

اسی وقت ابا کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ وہ اگر فون رکھتی تو ولید دوبارہ کر لیتا، اور تب ابا اٹھالیتے کہ وہ اندر آنے ہی والے تھے، سو جلدی میں اس نے یہی کہا کہ وہ بعد میں بات کرے گی، اور اتنی ہی جلدی میں ولید نے اس کا موبائل نمبر پوچھ لیا۔

ارم نے بنا سوچے سمجھے نمبر بتایا اور فون رکھ دیا۔ ابا جب تک اندر آئے، وہ اپنے کمرے میں جا چکی تھی۔ دل ابھی تک دھک دھک کر رہا تھا۔ مگر ولید نے پھر لینڈ لائن پکھی فون نہیں کیا۔ وہ اب اسے موبائل پفون کر لیتا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس کے والد اس کا رشتہ ان کے گھر میں کرنا چاہتے ہیں۔ وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ سلیمان صاحب، زاہد صاحب یا فرقان صاحب میں سے کس کی بیٹی کا ذکر کر رہے تھے۔ (یا اگر وہ جانتا تھا، تب بھی اس نے ظاہر کیا کہ وہ نہیں جانتا، لیکن اس کا خیال ہے کہ وہ ارم ہی تھی۔)

شروع میں وہ مسکندہ لپٹاؤ کا شکار رہی، مگر پھر آہستہ آہستہ اس کا ذہن خوش گمانیاں بننے لگا۔ اسے اب ولید سے بات کرتے ہوئے کسی قسم کا ڈر یا خوف محسوس نہیں ہوتا تھا۔ بعض گناہ اس لمبی سڑک کی مانند ہوتے ہیں جن پہ کوئی اسپید بریک نہیں ہوتا۔ ان پہ چلنا شروع کر دو تو بس انسان پھر چلتا ہی جاتا ہے، اور جب تک کوئی بڑا ایکسیڈنٹ نہ ہو جائے، وہ رک نہیں پاتا۔ ارم کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔

وہ حیا کے ہمراہ شاپنگ پہ جانے کا پلان کرتی تو حیا کو وہیں کسی شاپ میں چھوڑ کر قریب کسی ریسٹورانٹ میں آ جاتی جہاں ولید کو اس نے بلوایا ہوتا تھا۔ ایسا موقع کو کہ ہفتے میں ایک بار ہی آتا مگر ضرور جاتا۔ ولید ایک دفعہ ہی آفس گیا تھا، پھر نہیں گیا۔ اس کی فرقان صاحب سے کوئی ملاقات نہ تھی، آج کل ذرا فارغ تھا، اور باقاعدہ کام شروع کرنے میں ابھی وقت تھا، سو وہ اس کے لیے ڈھیر دن نکال لیا کرتا تھا۔

سب ٹھیک جا رہا تھا، مگر پھر، داور بھائی کی مہندی والے دن اس نے اماں کی زبانی سنا کہ عیر لغاری اپنے بیٹے ولید لغاری کا رشتہ حیا کے لیے مانگنا چاہ رہے ہیں، اور ارم کو، وہ مٹی کا ڈھیر بن کر ڈھسے گئی ہے۔

اس کے بعد زندگی عجیب سی ہو گئی۔ وہ اس کی پہلی محبت تھا، اور وہ اسے کسی اور کا ہوتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ وہ اس کو حیا سے جتنا برگشتہ کر سکتی تھی، اس نے کیا، اس کے نکاح کے بارے میں بھی بتایا، اور بظاہر تو ولید یہی کہتا کہ وہ حیا میں انٹرمنڈ نہیں ہے، اور پھر اس کے نکاح کا جب اس کے والد کو علم ہوا تو یہ رشتے والا معاملہ از خود خراب گیا، مگر ارم محسوس کرتی تھی کہ وہ حیا کے بارے میں سوالات بہت کرتا تھا۔ وہ کیا کر رہی ہے، کدھر ہے، اس کی پسند ناپسند، اس کی کوئی کمزوری۔ وہ سب اتنے نامحسوس انداز میں پوچھا کرتا تھا کہ وہ بتا دیتی، مگر پھر بعد میں الجھ بھی جاتی۔ وہ ولید سے کہتی رہتی کہ وہ اس کے لیے رشتہ بیچے، اور وہ ”بس چند دن اور“ کہہ کر ٹال دیا کرتا۔ مگر اس کا انداز بتاتا تھا کہ وہ ارم سے زیادہ ارم میں دلچسپی رکھتا

ہے۔ وہ اسی میں خوش تھی۔ سب سے بڑی بات جو ولید سے شادی کرنے میں تھی، وہ یہ تھی کہ اس کو اس اسکارف سے نجات مل جائے گی۔ وہ اپنی مرضی کا پہن اوڑھ سکے گی۔ اسے ابا کا خوف نہیں ہوگا۔ آزادی ایک نعمت تھی جو اس جبری پردے کے باعث اس کی دسترس میں نہیں تھی۔ مگر پھر ایک رات سب کچھ الٹ گیا۔

وہ اپنے کمرے میں کرسی پر بیٹھی، آدھی رات کے بعد تک، ولید سے فون پر بات کر رہی تھی۔ کمرہ لاک کرنا وہ بھول گئی تھی، یا پھر اب معمول سے یہ کام کر، کر کے اس کا خوف ختم ہو گیا تھا۔ یہ خوف واپس تب آیا جب اس نے ابا کو چوکھٹ میں کھڑے دیکھا۔ گھبرا کر ایک دم کھڑے ہوتے ہوئے ارم نے جلدی سے فون بند کیا مگر وہ دیکھ چکے تھے۔ ”اس ناٹم کس سے بات کر رہی ہو؟“ وہ سخت تیوروں کے ساتھ اس کی طرف آئے اور اس کے ساتھ سے موبائل قریباً چھینا۔ وہ کپکپاتے دل کے ساتھ بمشکل کھڑی ان کو کال لاگ کھولنے دیکھ رہی تھی۔ اس نے ولید کا نمبر حیا کے نام کے ساتھ محفوظ کر رکھا تھا۔ اس کی وہ تمام کلاس فیلوز جو ”چھپے دوست“ رکھتی تھیں، وہ اپنے ان دوستوں کا نام لڑکیوں کے نام سے محفوظ کرتی تھیں۔ سعد کا نام رکھ دیا سعد یہ یا فائز کا رکھ دیا فضا۔ ”حیا سے اس وقت کیا کام تھا؟“ انہوں نے نمبر دیکھا، پھر کڑی نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ناٹم کا فرق ہے، ان کی اتنی رات نہیں ہوئی۔“

”یہ حیا کا نمبر تو نہیں ہے، یہ پاکستان کا نمبر ہے۔“ وہ نمبر چیک کرتے ہوئے بولے تھے۔

”رومنگ پہ ہے اس کا فون، ابا۔ یہ اس کا دوسرا نمبر ہے۔“ وہ تھوک نگلتے ہوئے بمشکل کہہ پائی تھی۔ اسی وقت موبائل بجنے لگا۔ حیا سلیمان کا لنگ۔ ولید اسے کال بیک کر رہا تھا۔ کبھی ایسی صورت حال پیش جو نہیں آتی تھی سو وہ سمجھ نہ سکا کہ ارم نے کال ایک دم کیوں کاٹی۔ اس لمحے اس نے بہت دعا کی کہ ابا کال نہ اٹھائیں، یا ولید آگے سے کچھ نہ بولے مگر ابانے کال اٹھائی مگر کچھ بولے نہیں۔ وہ ابا سے چند منٹ دور کھڑی تھی مگر اسے ولید کا ”ہیلو..... ہیلو؟“ سنائی دیا تھا۔

”کون بول رہا ہے؟“ وہ درشتی سے بولے۔ دوسری جانب چند لمحے کی خاموشی چھائی رہی، پھر کال کاٹ دی گئی۔ ابا نے شعلہ بارنگا ہوں سے اسے دیکھتے ہوئے دوبارہ کال ملائی، مگر اس کا فون بند جا رہا تھا۔

”یہ کوئی لڑکا تھا اور تم کہہ رہی ہو کہ یہ حیا کا نمبر ہے؟“ وہ اس پر غرائے تھے۔

صائمہ بیگم بھی آواز سن کر ادھر آ گئی تھیں۔ ارم منمننا رہی تھی مگر ابا اس کی نہیں سن رہے تھے۔

”اگر حیا کے ساتھ اس وقت کوئی لڑکا تھا تو اس میں ارم کا کیا قصور ہے؟“ اماں نے بات کو نیا رخ دینے کی کوشش کی، جس پہ لمحے بھر کا

شبے میں پڑے۔

”ہو سکتا ہے حیا سبین کے گھر ہو، سبین کے بیٹے نے فون اٹھالیا ہو۔ لائیں مجھے دیں فون، میں پوچھتی ہوں حیا سے۔“

مگر ابانے اماں کو فون نہیں دیا۔ انہوں نے خود اپنے فون سے حیا کو کال ملائی۔

کسی سوکھے پتے کی طرح لرزتی ارم نے شدت سے دعا کی کہ حیا فون نہ اٹھائے یا پھر اسے بچالے۔ پہلے تو اس نے واقعی فون نہیں اٹھایا، مگر دوسری بار ملائے پھا اٹھا۔ ابا اسی طرح غصے میں بھرے کھڑے اس سے پوچھنے لگے، اور حیا نے اس کی عزت نہیں رکھی۔ اس نے صاف صاف انکار کر دیا۔

فون رکھتے ہی ابانے ایک زوردار تھپڑ اس کے چہرے پہ مارا تھا۔ تھپڑ سے زیادہ تکلیف وہ وہ الفاظ تھے جو انہوں نے اسے، اور اس ن تربیت کو کہے تھے۔ وہ اپنی عزت اور مقام ابا کی نظر سے کھو چکی تھی، اور یہ سب صرف اور صرف حیا کی وجہ سے ہوا تھا۔ کیا تھا اگر وہ جھوٹ بول دیتی، کیا تھا جو اگر وہ اسے بچا لیتی؟ مگر نہیں..... اس نے دوستی، رشتے، کسی چیز کا پاس نہیں کیا۔ اماں تھیں جو ابا کے سامنے اس کا دفاع کرنے کی کوشش کرتی رہیں، مگر ان کے جاتے ہی وہ بھی پھٹ پڑیں، کہ اپنی اولاد کو سب بہت اچھے سے جانتے ہوتے ہیں۔

زندگی اس کے بعد بہت تنگ ہو گئی تھی۔ اس کا انٹرنیٹ اور موبائل بند ہو گیا، دوستوں کے گھر جانے یا یکسمن باہر جانے پہ پابندی لگ

گئی۔ اٹھتے بیٹھتے ابا کی ناراضی، بے اعتباری سہنا، سب کچھ بہت تکلیف دہ تھا۔ اور پھر ولید سے دوری۔

اس نے بس ایک دفعہ لینڈ لائن سے ولید کے لینڈ لائن پر فون کر کے اسے صورت حال بتادی تھی، مگر دوبارہ بات نہیں ہو سکی۔ ولید نے وہ نمبر ہی بدل لیا تھا۔ اب اس کے پاس صرف اس کا آفیشل نمبر تھا جو اب اس کے پاس بھی تھا۔ وہ اب کسی کے موبائل یا لینڈ لائن سے اسے کال نہیں کر سکتی تھی، کہ سب کے موبائلز پوسٹ پیڈ تھے، اور اباسازے بل ایک دفعہ ضرور دیکھتے تھے۔ البتہ جب حیا اپنی دوست کی ڈیجھ پہ آئی تو کچھ سوچ کر اس نے حیا سے تعلقات بحال کر لیے۔

وہ حیا کے موبائل سے ولید سے بات کرے گی تو حیا چھپنے لگی، وہ نہیں۔ مگر جب حیا سب کے سامنے اپنا موبائل واپس لینے آئی اور اس کے جانے کے بعد اب کی تفتیش اور ڈانٹ کو سہنا..... اس سب نے اسے مزید ڈھیٹ بنادیا۔

حیا کے جون میں واپس آ جانے کے بعد اسے جب موقع ملا وہ حیا کا فون استعمال کر لیتی۔ بہت سی دفعہ تو حیا کو معلوم بھی نہ پڑتا تھا۔ جیسے سکندر انکل کی ڈیجھ اور سلیمان چچا کی بیماری والے دنوں میں حیا اتنی مصروف اور پریشان تھی کہ اسے پتا بھی نہ چلتا اور اس کا فون وہ استعمال کر کے واپس اسی جگہ پر رکھ بھی دیا کرتی تھی۔ پھر بھی کبھی کبھی اسے لگتا، ولید اس سے پور ہو گیا ہے۔ شاید وجہ اس کی منگنی تھی۔ زبردستی کی منگنی جو ابانے فوراً سے کروادی تھی۔ ان کو کیا لگتا تھا، وہ کسی کے ساتھ بھاگ جائے گی؟ ہونہ۔ وہ بھاگنے والوں میں سے نہیں تھی۔ اگر ولید اس کا ساتھ دیتا تو اس کے لیے وہ ابا اور بھائیوں کے سامنے ڈٹ کر کھڑی ہو جاتی، مگر ولید ساتھ دیتا تب نا۔ پھر بھی وہ اس سے بات کرنا ترک نہیں کر سکتی تھی۔ اور پتا نہیں وہ کون سا کمزور لڑکھو تھا جب اس نے باتوں باتوں میں ولید کو اس ویڈیو کے بارے میں بتا دیا تھا۔ تب تک ویڈیو ہسٹ چکی تھی، سو ولید اس کو دیکھ نہ پایا، مگر ہاں، وہ جانتی تھی کہ ویڈیو حیا نے ہوائی تھی، اور یہ بھی کہ حیا میجر احمد سے ملنے گئی تھی۔ حیا کا خیال تھا، کسی کو نہیں پتا مگر اسے پتا تھا۔ اس نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے حیا کو اس گرائونڈ کی طرف جاتے دیکھا تھا جہاں سے ایک کار نے اسے پک کیا، اور پھر اسی دن ویڈیو ہسٹ گئی۔ وہ جانتی تھی کہ میجر احمد نے حیا سے رپورٹ کرنے کے لیے آنے کا کہا تھا، ساری بات اس کے سامنے ہی تو ہوئی تھی۔ کڑی سے کڑی ملا کر اسے ساری کہانی سمجھ آ گئی تھی۔ کبھی کبھی وہ یہ بات حیا کے خلاف ضرور استعمال کرے گی، اور شاید اسی لیے اس نے ولید کو اس بارے میں بتایا تھا۔

ولید نے بہت دفعہ وہ ویڈیو مانگنا چاہی مگر وہ کیسے دے سکتی تھی؟ مگر وہ دن جب ابا کا ایکسیڈنٹ ہوا، اس سے پچھلے ہی دن اس نے سونیا کے کمرے سے نیٹ استعمال کر کے ولید سے بات کی تھی، اور وہ بھڑکھا کہ ارم وہ ویڈیو اسے دے دے تاکہ وہ اسے حیا کے خلاف استعمال کر کے اس زبردستی شادی اور ابا کی نظروں سے گرائے جانے کا بدلہ لے سکے۔ چاہے تو اپنا پارٹ ایڈٹ کر دے۔

اس خیال پر وہ ایک دم چونکی تھی۔ ہاں، یہ ہو سکتا تھا۔ وہ اپنا پارٹ edit کر سکتی تھی۔ اس کو یہ کام آتے تھے۔ اپنی تصویر یا ویڈیو وہ ولید کو دینے کا رسک بھی نہیں لے سکتی تھی۔ ریسٹورنٹس اور دیگر جگہوں پر اس نے اپنے کمرے سے اپنی اور ولید کی ڈھیروں تصاویر اتاری تھیں، مگر اس کو کبھی اتارنے نہ دی، نہ ہی وہ تصاویر اس کو کبھی بھیجیں۔ وہ تصاویر اس کے لیے ٹاپ میں ایک پاسورڈ لاکڈ فولڈر میں محفوظ تھیں۔ اب بھی اس نے خود کو نکال لیا۔ ویڈیو صرف حیا کی رہ گئی، ارم اس میں سے غائب ہو گئی، اور وہ ویڈیو ولید کو میل کرنے کے بعد اس نے حیا کے ڈرائیور کے فون سے اسے کال کر کے بتا بھی دیا۔

اس رات ابا کو زخمی حالت میں حیا اور فرخ گھر لائے تھے۔ حیا اس سارے قصے کا الزام ولید کے سر رکھ رہی تھی، مگر اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ ولید ایسا کیسے.....؟ نہیں، ہرگز نہیں۔ بہت مشکل سے۔ دور روز بعد اسے حیا کا فون استعمال کرنے کا موقع ملا اور اس نے ولید کی ٹھیک ٹھاک کلاس لینی چاہی، مگر وہ کہہ رہا تھا کہ اس نے کچھ نہیں کیا، اس کی گاڑی تو ساتھ سے گزری تھی، جب کہ فرخان اصغر کو چوٹ گرنے کے باعث آئی تھی۔ شاید وہ چکر آ کر گرے تھے۔ حیا خود تو اسے اس معاملے میں گھسیٹ رہی ہے۔ ارم نے یقین کر لیا۔ اس کے پاس یقین کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

اور آج حیا اس کو فون کر کے یہ بتانا چاہ رہی تھی کہ وہ سب جان گئی ہے۔ اس کی بلا سے۔ اب خود بھٹکتے سب۔ اس وقت حیا نے اس کا ساتھ نہیں دیا تھا، سو آج ارم بھی۔ اس کے ساتھ کھڑی نہیں ہوگی، یہ طے تھا۔

اس نے چائے کا آخری گھونٹ بھر۔ بھور مانع ابھی تک کڑوا اور گرم تھا۔ اندر تک جلا دینے والا۔ اور پھر، جلنے سے زیادہ رسوا کن عذاب کون سا ہو سکتا ہے؟

کپادوکیہ کا پراسرار حسن ویسا ہی تھا، مگر ایک دفعہ پھر اس میں اودسیاں گھل چکی تھیں۔ ”آشیانہ“ کے مکینوں نے ان کا استقبال اسی گرجوٹی اور محبت سے کیا جو ان کا خاصا تھا، مگر اس کا دل اداس تھا۔ وہ اسے کچھ بھی بتائے بغیر چلا گیا تھا، بار بار وہ اسے ستارہ تھے۔ اضطراب، بے چینی اور فکر مندی۔ دنیا بس ان تین جذبوں تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔

وہ دودن کس کرب میں گزرے، کوئی اندازہ نہیں کر سکتا تھا۔ رات میں وہ اسی صوفے پہ، جس کے عقب میں کھڑکی کھلتی تھی بیٹھ کر اسی طرح رونے لگی، مگر کوئی نہیں آیا جو اس کو کہتا کہ وہ پھر سے اس کے لیے آ گیا ہے۔

بہارے نیچے پنار کے ساتھ تھی۔ وہ سامنے ہوتی تو حیا یوں نہ روتی، مگر اکیلے میں اور بات ہوتی ہے۔ بہارے کے آنے کے بعد بھی وہ اسی طرح بیٹھی رہی، اور جب بیٹھے بیٹھے تھک گئی تو وہیں سو گئی۔ شاید کہ کوئی اسے اٹھائے۔ کوئی اس کے سامنے میز پہ آ بیٹھے، اور ہولے سے اس کا شانہ چھو کر اسے آواز دے۔ مگر خواب ہر دفعہ پورے نہیں ہوتے۔

صبح اس کی آنکھ کسی شناسا آواز سے کھلتی تھی۔ وہ آواز بہت دیر تک اس کی سماعت میں گونجتی رہی تھی، یہاں تک کہ وہ ایک دم چونک کر اٹھ بیٹھی۔ یہ آواز..... اتنی مانوس، مگر نی..... یہ تو.....

وہ تیزی سے اٹھ کر صوفے کے پیچھے آئی اور کھڑکی کے سامنے سے پردہ ہٹایا۔ کھڑکی کے باہر کسی ہلکے سے اس کا ونڈ جائم لنگ رہا تھا۔ دور کپادوکیہ کے افق پہ طلوع ہوتے سورج کی کرنوں سے اس کی کمرشل کی پنکھڑیاں سنہری پڑ رہی تھیں، جیسے سونے کے پتیلے جمول رہے ہوں۔ آئینل، کانچ اور لکڑی کے نگرانے کی آواز۔ مانوس آواز۔ اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ بے اختیار اس نے لبوں پہ دونوں ہاتھ رکھ کر جذبات کو قابو کرنا چاہا، مگر آنسو پھر سے ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگے تھے۔

وہ آ گیا تھا۔ وہ کپادوکیہ واپس آ گیا تھا اور اس طرح سے اس کو اپنی خیریت بتا رہا تھا۔ وہ اب اس کی زبان سمجھنے لگی تھی۔ دفعتاً اسے محسوس ہوا، ونڈ جائم کی ایک لڑی ساتھ کوئی کانغذ سا بندھا۔ ہے اس نے کھڑکی کا پت کھولا، اور ہاتھ بڑھا کر وہ کانغذ اتارا۔ وہ ایک ڈرگائیڈ کے کسی نور کا معلوماتی پرچہ تھا۔ اس پہ جہان نے خود سے کچھ نہیں لکھا تھا، مگر وہ سمجھ گئی تھی کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اسے کل صبح اس نور کو لینا ہے، کیونکہ وہیں وہ جہان سے مل سکے گی۔

حیا نے ایک نظر پھر اس پر پڑے۔ بنی تصاویر پہ ڈالی، اور بے اختیار ایک اداس مسکراہٹ اس کے لبوں کو چھو گئی۔ ڈی جے اور اس کا سب سے بڑا خواب۔ سب سے بڑی ایکسٹنٹ۔ ہاٹ ایئر بیلون۔



اگلی صبح ابھی سورج نہیں نکلا تھا، اور فجر کپادوکیہ کے میدانوں پہ قطرہ قطرہ اتر رہی تھی۔ حیا نے کھڑکی کا پردہ ذرا سا سر کا کر دیکھا۔ کپادوکیہ کے پہاڑ ابھی تک جامنی اندھیرے میں ڈوبے تھے۔ وہ خود بھی ابھی ابھی نماز پڑھ کر رہی تھی۔ پردہ برابر کر کے اس نے وال کلاک پہ ایک نظر ڈالی۔ صبح کے ساڑھے تین۔

بہارے ڈیرنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی مندی مندی آنکھوں سے خود کو آئینے میں دیکھتی، بال برش کر رہی تھی۔ حیا اپنے اجرک والی لمبی قمیص پہ عیا یا پہن چکی تھی، اور اب سیاہ اسکارف چہرہ کے گرد لپیٹ رہی تھی۔

”حیا، کیا وہ مجھے ڈانٹے گا؟“ برش نگھا میز پر رکھتے ہوئے بہارے نے تشویش سے پوچھا۔

”نہیں، میں ہوں نا۔ وہ کچھ نہیں کہے گا۔“

بہارے نے سر ہلا کر اپنے گلابی پرس سے بینڈ نکالا اور بال پونی کی طرح سمیٹے، پھر بینڈ لگانے سے قبل مڑ کر حیا کو دیکھا۔

”اگر میں بال نہ باندھوں تو کیا تم عائنٹ کو بتاؤ گی؟“

”ہو سکتا ہے بتا دوں۔ ویسے اگر تمہیں بال کھولنے ہی ہیں تو کھول کر ان کے اوپر اسکارف لے لو نا۔“

اس مشورے پہ بہارے نے ناپسندیدگی سے ناک سکڑی، اور ”اس سے تو پونی بہتر ہے“ والی نظروں سے حیا کو دیکھتے ہوئے بالوں کو پونی میں جکڑ لیا۔

”آبلہ..... وین آگئی ہے۔“ فاتح نے باہر سے آواز لگائی۔ حالانکہ وہ اس سے بہت بڑی نہیں تھی، پھر بھی وہ اسے آبلہ کہتا تھا۔ (ترک آپا کو آبلہ اور بھائی کو آبی بولتے تھے۔)

”ہم تیار ہیں۔“ وہ جلدی جلدی نقاب پن آپ کرتی، بہارے کا ہاتھ تھامے باہر نکل آئی۔
آشیانہ کے باہران کو ٹور کھنی کی وین لینے آئی تھی جس نے انہیں ہاٹ ایئر بیلون کی سائیٹ پہ پہنچا تھا۔ سارے انتظامات مولوت بے نے کروائے تھے، یوں ان کو ڈسکاؤنٹ بھی مل گیا تھا۔

ہاٹ ایئر بیلون فجر کے وقت اڑا کرتے تھے۔ ڈیڑھ دو گھنٹے کی فلائٹ تھی۔ یعنی کپادوکیہ کے اوپر اڑ کر وہ سارا خطہ کچھ کر واپس اتر جاتا تھا۔ وین نے انہیں بیلون سائٹ پہ جب اتارا تو فخر ابھی تک تازہ تھی۔ وہ ایک ہائی وے تھی، اور اس کے دونوں اطراف کھلا، صاف علاقہ تھا۔ (جیسے پاکستان میں موٹروے اور اس کے آس پاس کی جگہ ہوتی ہے۔) سڑک پہ ان کی وین کے ساتھ قطار میں بیسیوں وین کھڑی تھیں۔ بہت سے سیاح ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔

وہ بھی بہارے کا ہاتھ تھامے سڑک سے اتر کر بائیں طرف کے کھلے میدان میں آگئی۔ وہاں ایک قطار میں ہاٹ ایئر بیلون زمین پہ رکھے تھے۔ یوں کہ ان کی نوکریاں سیدھی رکھی تھیں، جبکہ نوکری سے تھی غبارہ، بچوں کے پلاسٹک کے ننھے سے، بغیر ہوا کے غبارے کی مانند ایک طرف ڈھلکا ہوا، زمین پہ بچہ رہ پڑا تھا۔ بڑے بڑے غبارے، اور بڑی بڑی نوکریاں۔

”اب ہم نے کیا کرنا ہے حیا؟“ بہارے کا سوال نامہ شروع ہو چکا تھا۔
”مجھے کیا پتا۔ میں تو خود پہلی دفعہ ہاٹ ایئر بیلون میں بیٹھنے لگی ہوں۔“
”اوہ..... میں بھی پہلی دفعہ بیٹھوں گی۔“ بہارے چبکی۔ حیانے چونک کر اسے دیکھا۔ بے اختیار اسے اپنی اور ڈی جے کی پہلی فلائٹ یاد آئی تھی۔

فلائٹ کے اڑنے میں وقت کم رہ گیا تھا۔ وہ دونوں گائیڈ کے کہنے کے مطابق اپنی نوکری میں جا بیٹھی تھیں۔ یہ پانچ سے سات افراد کی نوکری تھی۔ اگر خود اربچ کرتیں تو بیس افراد کی نوکری میں جگہ ملتی۔ مگر مولوت بے کی وجہ سے ”کھلے کھلے سفر کرنے“ کی خواہش پوری ہو گئی تھی۔ نوکری کے اوپر ایک آؤرٹنا چھت تھی، جس کے اوپر آگ جلانے کا انتظام تھا۔ جب آگ جلتی، تو گرم ہوا غبارے میں بھرتی، اور اسے اوپر اٹھا دیتی۔ فی الوقت ان کا نیلا اور زرد غبارہ زمین پہ بے جان سا ڈھلکا پڑا تھا۔

”وہ دیکھو!“ تبھی بہارے نے اس کی کہنی ہلائی۔ حیانے بے اختیار اس طرف دیکھا جہاں وہ اشارہ کر رہی تھی۔
دور، سیاحوں کے درمیان، وہ چلتا آ رہا تھا۔ سر پہ پی کیپ، آنکھوں پہ سیاہ گلاسز، ذرا سی بڑھی شیو۔ سفید پورے آستین کی ٹی شرٹ کو کہنوں تک موڑے، نیلی جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے، وہ سر جھکائے قدم اٹھا رہا تھا۔ یک کندھے پہ تھا، اور ماتھے پہ پٹی نظر نہیں آ رہی تھی۔ ہفتہ تو ہو گیا تھا اس کے آپریشن کو، اب تک اس کی پٹی نکل ہی جانی چاہیے تھی۔

وہ ان کے ساتھ آ کر نوکری میں بیٹھا، اور حیا کو لگا، خوبصورت گھوڑوں کی سرزمین کو اس کی ساری رعنائی واپس مل گئی ہے۔
”کیسے ہو؟“ وہ جہان کی طرح سامنے سیدھی دیکھتی، بہت آہستہ سے بولی تھی۔ بہارے ان کے مقابل ہی سر جھکائے بیٹھی تھی۔ باقی کے دو سیاح ابھی نوکری میں چڑھ رہے تھے۔

”ٹھیک ہوں۔“ وہ سامنے دیکھتے ہوئے زیر لب بولا۔
”آخری دفعہ جگ کب بولا تھا؟“

”ابھی دس سیکنڈ پہلے جب میں نے کہا کہ میں ٹھیک ہوں۔“
حیانے ذرا سی گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ وہ اسی طرح سامنے دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھ کے قریب incision کا نشان گلاسز کے سائیڈ

سے صاف نظر آ رہا تھا۔ اس نشان کے سوا پہلے سے وہ بہتر لگ رہا تھا۔

”کیا، ہمیں یہ ظاہر کرنا ہوگا کہ ہم تمہیں نہیں جانتے؟“ وہ دوبارہ چہرہ سیدھا کیے اسی طرح مدھم سا بولی تھی۔

”جب تک بیلون اوپر نہیں چلا جاتا تب تک، ہاں!“

پائلٹ اب بیلون کے اڑنے کا اعلان کر رہا تھا۔ نوکری اطراف اور چھت سے کھلی تھی سوائے اس جگہ کے جس کے اوپر آگ جلائی جا رہی تھی۔ جیسے جیسے شعلے بڑھتے گئے، گرم ہوا اس پھس ہوئے غبارے تک پہنچنے لگی۔ زمین پہ اونڈھے منہ گرا غبارہ ہولے ہولے پھر پھڑانے لگا۔

”کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ اس دن تم بغیر بتائے ہاسپٹل سے کیوں چلے گئے؟“

”نہیں!“ وہ اتنی قطعیت سے بولا کہ وہ بالکل چپ ہو گئی۔

گرم ہوا اب ڈھلکے ہوئے غبارے کو اٹھانے کی سعی کر رہی تھی۔ جیسے جیسے ہوا کا زور بڑھتا گیا، غبارہ ڈرا پھول کر سیدھا ہونے لگا۔ گرم ہوا نوکری کے اندر بیٹھے سوا حوں کو نہیں چھو رہی تھی۔ ان کے لیے تو فجر کی تازہ ٹھنڈی ہوا ہر سو چل رہی تھی۔

ان گزرے دونوں میں، جب وہ اس کے ساتھ نہیں تھی، اسے بہت سی باتوں کا خیال آیا تھا جو وہ ہسپتال میں نہیں پوچھ سکی تھی۔ معلوم نہیں یہ سوالات اس وقت کیوں یاد آتے ہیں جب مسئول ہمارے ساتھ نہیں ہوتا۔

”ایک بات پوچھوں؟“ چند لمحے گزرے تو اس نے پھر سے سلسلہ کلام جوڑا۔ بہارے اب سر جھکائے اپنے گلابی پرس سے کچھ تلاش کر رہی تھی۔

”ہوں؟“

غبارہ اب ہوا سے پھول کر، عین ان کے سروں پہ، نوکری کے اوپر، بالکل سیدھا، آسمان کی جانب رخ کیے کھڑا ہو چکا تھا۔ اعلان کرنے والا اب ان کو سفر کی مزید تفصیلات سمجھا رہا تھا جس میں اسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

”تم نے روجیل سے پیسے کیوں منگوائے تھے؟“ اب تک وہی اسے وضاحتیں دیتی آئی تھی، لیکن آج جہان کی باری تھی۔

”کچھ کاؤنٹس کا مسئلہ تھا، نگلوانہیں سکتا تھا، سورجیل سے لے لیے۔ پھر واپس بھی بھجوا دیے تھے۔“

”ایک اور بات بھی بتاؤ۔ کیا تمہیں واقعی میرا تھاب کرنا پڑا لگتا ہے؟“

”میں نے کب کہا پڑا لگتا ہے؟“ وہ دونوں دھیمی آواز میں باتیں کر رہے تھے۔ غبارہ گرم ہوا سے بھر چکا تھا، اتنا زیادہ کہ وہ زور لگا کر اب نوکری کو ہوا میں اٹھانے لگا تھا۔ جیسے ہی نوکری اوپر اٹھی، اندر بیٹھے سوا حوں میں شور مچا۔ جوش، خوشی، چمک۔ مگر بہارے گل اسی طرح اپنے پرس سے کوئی ایسی شے تلاش کر رہی تھی جو وہ ڈھونڈنا ہی نہیں چاہتی تھی۔

”میں نے تو یونہی ایک بات پوچھی تھی، اگر مجھے پتا ہوتا کہ ام من رہی ہے تو میں ایسا کبھی نہ کرتا۔“

”اور تم نے مجھے برگرنگ میں اس لیے بلایا تھا تا کہ میں تمہیں پاشا بے کے ساتھ دیکھ لوں؟“

”ہاں مگر میں چاہتا تھا کہ تم میرا مسئلہ سمجھو، نہ کہ مجھے برا سمجھو، مگر تم کسی کو جہنم میں بھیجتے ہوئے کہاں کسی کی سنتی ہو؟“ وہ سن گلاسز اتار کر سامنے شرٹ کے گریبان پہ انکاتے ہوئے بولا تھا۔ حیانے فحش سے سر جھکا۔ بس ایک بات پکڑ لی تھی اس نے، اور اب ساری زندگی اسے دہراتا رہے گا۔

نوکری ٹھپ ہوا میں چار، پانچ فٹ اوپر اٹھ چکی تھی۔ پائلٹ اپنے پروگرام کے مطابق ابھی کم اونچائی پہ فضا میں بیلون گویا تیرا رہا تھا۔ پھر کافی دیر بعد اس نے آہستہ آہستہ بیلون اوپر اٹھانا تھا۔

”بہارے گل!“ وہ اب سرد لہجے میں پکارتا، اس کی طرف متوجہ ہوا۔

بہارے نے سر اٹھایا، پھر تھوک نگلا۔

”کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم نے میری بات کیوں نہیں مانی؟“

”میں نے کیا کیا ہے؟“ وہ منہ سورے بولی تھی۔

”تم حیا کے ساتھ کیوں آئی ہو؟“

”حیا اور میں کپادوکیہ دیکھنے آئے ہیں۔ ہمیں تو پتا بھی نہیں تھا کہ تم بھی ادھر ہو۔ کیا تم ہمارے لیے ادھر آئے ہو؟“ کہہ کر اس نے تائیدی نگاہوں سے حیا کو دیکھا جس نے اثبات میں سر ہلایا۔ صبح ہی اس نے یہ بیان بہارے کو رٹوایا تھا۔

”تم ہمیشہ میرے لیے مسئلہ کھڑے کرتی ہو۔ تمہیں اندازہ ہے کہ تمہاری بہن کتنی پریشان ہے؟“ برہمی سے اسے جھڑکتا وہ جہان نہیں، عبدالرحمن لگ رہا تھا۔ یا پھر شاید ترکی میں پہلے دنوں کا جہان۔

”اگر تم نے مجھے ڈانٹا تو میں نوکری سے نیچے کود جاؤں گی۔“ وہ ناراضی سے ایک دم بولی تو حیا کا گویا سانس رک گیا۔

”بہارے.....“ اس نے اسے منہ نہ دیکھا۔

”یہ تو بہت اچھا ہوگا۔ شاباش، کوڈو۔ میں انتظار کر رہا ہوں۔“ وہ ٹیک لگا کر بیٹھا، اور کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھی۔

بہارے نے خفا خفا کھڑی ہوئی اور نوکری کی منڈیر پہ دونوں ہاتھ رکھ کر نیچے جھانکا، پھر مڑ کر ان دونوں کو دیکھا۔

”جہان..... مت کرو.....“ اس کا دل کانپ اٹھا تھا۔ وہ اٹھنے لگی مگر جہان نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکا۔

”تم درمیان میں مت بولو۔ ہاں تو بہارے خانم، میں انتظار کر رہا ہوں۔ جلدی کوڈو، میرا وقت نہ ضائع کرو۔“

ان کی طرف دوسرے سیاح قطعاً متوجہ نہ تھے۔ وہ اپنی تصاویر میں مشغول تھے۔ بہارے منڈیر پہ ہاتھ رکھے رکھے جھکی، زمین کو دیکھا جو چھ سات فٹ دور تھی، اور پھر ایک دم دھپ سے آ کر ڈاؤن بیٹھ گئی۔

”عائشہ گل کہتی ہے، خودکشی حرام ہوتی ہے۔“ منہ پھلائے وہ خفا سی بولی تھی۔

حیا کی انہی سانس بے اختیار بحال ہوئی۔ یہ چھوٹی بلی بھی نا!

”میں تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں!“ جہان نے سر جھٹکا، اور پھر گردن پھیر کر نوکری سے باہر دیکھنے لگا۔ تاحد نگاہ کپادوکیہ کی چاندی

سر زمین دکھائی دے رہی تھی۔ پہاڑ، خاک، میدان، عجیب و غریب ساخت کے نمونے جن کا بیان الفاظ میں ناممکن ہے۔

غبارہ اب درختوں کی ایک قطار کے ساتھ فضا میں تیر رہا تھا۔ درختوں کے سر اور نوکری کی منڈیر برابر سطح پر تھے۔ وہ خوبانی کے درخت

تھے۔ پھلوں کے بوجھ سے لدی شاخیں اور پکی خوبانی کی رسیلے مہک۔ کیا ہم یہ توڑ سکتے ہیں؟“ چھوٹی بلی کو اپنی ساری ناراضی بھول گئی۔

”نہیں!“ حیا نے قطعیت سے نفی میں سر ہلایا۔

”ہاں۔“ جہان کہتے ہوئے کھڑا ہوا اور منڈیر پہ جھک کر قریب سے گزرتے درخت کی ایک ٹہنی کو ہاتھ بڑھا کر پکڑا۔ ”یہ مہمان نوازی

کے درخت ہیں اور ادھر بیلون اس لیے اڑایا جا رہا ہے تاکہ تم ان کو توڑ سکو!“ حیران سی حیا کو وضاحت دیتے ہوئے اس نے ایک خوبانی کھینچ کر

توڑی۔ پھل شلخ سے الگ ہوا تو شاخ فضا میں جھول کر رہ گئی۔

بیلون آہستہ آہستہ اسی طرح ہوا میں تیرتا رہا۔ دنیا جیسے ٹرانسفارم ہو کر ہیری پوٹر کی کتابوں میں جانچنی تھی۔

”کیا تم کھاؤ گی؟“ اس نے پوچھا مگر انکار سن کر پھل بہارے کو تھما دیا۔ اس نے اپنے پرس سے پہلے رومال نکالا، اس سے خوبانی اچھے

سے رگڑ کر صاف کی، پھر کھانے لگی۔ عائشہ گل کی بہن!

”تمہیں کس نے بتایا رو جیل کے ویسے کا؟“ اسے اچانک یاد آیا، دیرین کیو کے زیر زمین شہر میں جہان نے ذکر کیا تھا۔

”جب تم اس سے فون پہ بات کر رہی تھیں تو میں وہیں تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ واپس آ چکا ہے اپنی بیوی کو لے کر؟“ کہنے کے ساتھ

اس نے ابرو سوالیہ انداز میں اٹھائی۔ حیا نے اسے دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کی آنکھ کے قریب لگائے ہوئے دیکھ کر ہی تکلیف ہوتی تھی۔

”ہم رو جیل کے ویسے تک واپس پہنچ جائیں گے نا جہان؟“

”ہاں شیور۔ بس دو دن مزید لگیں گے کپادوکیہ میں، پھر مجھے یہاں سے جانا ہے۔“

غبارہ اپنے بچوں میں نوکری کو اٹھائے، اب اوپر اٹھتا جا رہا تھا، دوسری صبح کی سفیدی آسمان پہ پھیلنے لگی تھی۔ درخت نیچے مگے تھے۔

”پھر کہاں جاؤ گے؟“

”یہاں سے انقرہ، وہاں ایک کام ہے، پھر وہاں سے ایک چھوٹا سا گاؤں ہے ترکی کے بارڈر پہ، ادھر جاتا ہے، پھر ادھر سے شام۔“

”تو انقرہ سے ڈائریکٹ شام چلے جاؤ؟“

”انقرہ اور شام کا بارڈر نہیں ملتا تھا۔“

”بارڈر سے کیوں جاؤ گے؟ ایئر پورٹ سے چلے جاؤ۔“ اپنے تئیں اس نے اچھا خاصا مشورہ دیا تھا۔ جہاں نے گردن موڑ کر ایک افسوس کرتی نگاہ سے اسے دیکھا۔

”مادام، ایئر پورٹ پہ پاسپورٹ دکھانا ہوتا ہے، اور میں ادھر ال لیگل ہوں، بارڈر کراس کر کے آیا تھا رات میں، ایسے ہی واپس جاؤں گا۔“

اس کی ریزہ کی ہڈی میں سنسنی خیز لہر دوڑ گئی۔

”تم..... تم ال لیگل (غیر قانونی طریقہ) طریقے سے بارڈر کراس کر کے جاؤ گے؟“ اس نے دبی آواز میں دہرایا۔ وہ دونوں اپنی زبان میں بہت آہستہ آواز سے باتیں کر رہے تھے۔

”مجھے قانون کی پاسداری پہ کوئی لیکچر مت دینا۔ مجھے اسی طرح واپس جانا ہے۔ ویسے بھی شام کے لیے ترکوں کو ویزہ درکار نہیں ہوتا، مگر پاسپورٹ دکھانا پڑتا ہے۔“

”اچھا ٹھیک ہے، میں سمجھ گئی۔ پھر کب جانا ہے؟“

”ابھی نہیں، کھل بتاؤں گا۔“

دور، نیچے، زمین بہت چھوٹی نظر آ رہی تھی۔ وہ اب "Fairy Chimneys" کے اوپر اڑ رہے تھے۔ فیری چمنی یا "پری بجالاری" Peri Bacalari ایک قدرتی ساخت تھی جو لاوا سوکھنے کے بعد اس سرزمین پہ چھوڑ گیا تھا۔ کافی فاصلے پہ اونچے اونچے ستون سے کھڑے تھے، جن کے سروں پہ ٹوپیاں تھیں، بالکل جیسے مشروم (کھمبیاں) ہوتے ہیں۔ بس ان کھمبیوں کی ڈنڈیاں بہت اونچی تھیں۔

”مطلب بارڈر تک ہم ساتھ جائیں گے؟“

”حیا..... ہم انقرہ تک ساتھ گئے، یہ بہت ہے، تم اب ادھر آ کر کیا کرو گی؟“ وہ جیسے اکتایا تھا۔

”ہماری بات ترکی کی ہوئی تھی۔ ذیل، ذیل ہوتی ہے۔ بس ہم بارڈر تک ساتھ ہیں۔“

”ویسے تم تو صرف کپادوکیہ دیکھنے آئی تھیں نہیں؟“

اس کے انداز پہ حیا کا دل چاہا، زور سے کہے، کہ نہیں، ہرگز نہیں مگر..... اتنا..... اتنا ہر دفعہ آڑے آ جاتی تھی۔

”ہاں، اور اب تمہاری وجہ سے میں زیادہ دن کپادوکیہ میں رہ بھی نہیں پاؤں گی، اس لیے اس کو میرا احسان گروانا۔“ وہ بے نیازی سے شانے اچکا کر بولی۔

”ہاں، میں نے یقین کر لیا۔ ویسے اب اس جگہ کو دیکھ کر بتاؤ۔ دنیا کا سب سے خوبصورت شہر کون سا ہے؟“

”اسلام آباد آف کورس!“ وہ مسکرا کر بولی۔

”تم دونوں کیا باتیں کر رہے ہو؟“ بہارے یقیناً ان سے بور ہو کر پنار کو مس کرنے لگی تھی۔ انسان کا ازل سے ابد تک کا مسئلہ۔ اپنی

تعریف کرنے والے اسے ہمیشہ اچھے لگتے ہیں۔

”میں آتا ہوں تمہارے پاس۔“ پھر وہ حیا کی طرف مڑا۔ ”اسے کچھ بھی مت بتانا۔ غلطی سے بھی نہیں۔“

”فکر نہ کرو، مجھے راز رکھنے آتے ہیں۔“

جہاں نے ایک نظر اس کو دیکھتے ہوئے تائیدی انداز میں سر ہلا دیا۔ وہ ایک نظر بہت اپنی اپنی سی تھی۔ جیسے وہ دونوں شریک راز تھے۔

اپنے تھے۔ رازوں کی اپنائیت۔ اسے بہت اچھا لگا۔

”تمہیں لگتا ہے میں بہت کم عقل ہوں۔“ وہ اسی خوشگوار موڈ میں کہنے لگی۔ ”اور تمہیں یہی لگتا ہے کہ میں تمہاری باتیں سمجھ نہیں سکتی، مگر

یونواٹ جہان، اصل میں تم ہانتا ہی نہیں چاہتے کہ تمہاری بیوی تم سے زیادہ اسماٹ ہو سکتی ہے۔“ روانی میں ”تمہاری بیوی“ کب اس کے لبوں سے نکلا، اسے پتا بھی نہیں چلا۔

جہان اس سارے معاملے میں پہلی دفعہ مسکرایا۔

”میری بیوی جتنی بھی اسماٹ ہو، مجھ سے دو قدم ہمیشہ پیچھے رہے گی۔ ویسے آپ کا پاؤں کیسا ہے؟“

”میرے پاؤں کو کیا ہوا؟ بالکل ٹھیک تو ہے۔“ اس نے شانے اچکا کر کہا، اس کا پاؤں اتنا ہی درد کرتا تھا جتنا پہلے دن کیا تھا، مگر وہ ظاہر ہونے دے، یہ نہیں ہو سکتا تھا۔

جہان نے مسکرا کر سر جھٹکا اور اٹھ کر بہارے کے ساتھ خالی جگہ پہ جا بیٹھا۔

”جہان، اسے مت ڈانٹنا، میں اسے لے کر آئی ہوں، اور پھر.....“

”جیا، تمہیں معلوم ہے تم مجھے کب، بہت اچھی لگتی ہو؟“

وہ جو بولے جا رہی تھی، ایک دم رکی، آنکھیں ذرا سی حیرت سے بھیلیں۔

”کب؟“

”جب تم خاموش رہتی ہو!“

حیا کی ہنسیوں پہنچ گئیں، اور وہ چہرہ پورا موڑ کر خاموشی سے ٹوکری کے پار دیکھنے لگی۔

وہ دونوں اب دھیمی آواز سے اپنی زبان میں بات کر رہے تھے۔ بیلون اب پرپی نکھاری کے عین اوپر ہوا میں کسی کشتی کی طرح تیر رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

رات کا کھانا ان دونوں نے آشیانہ کے قالینوں والے ڈائننگ روم میں کھایا تھا۔ جہان صبح بیلون سائیڈ سے ہی واپس ہو گیا تھا۔ اسے مومو سی امید تھی کہ شاید وہ کھانے کے وقت کہیں سے نمودار ہو جائے گا مگر ایسا نہیں ہوا۔ اس کا دل کسی پینڈولم کی طرح امید اور ناامیدی کے درمیان گھومتا رہا، یہاں تک کہ اس نے خود کو سمجھالیا کہ وہ سارا دن ان کے ساتھ نہیں رہ سکتا، اسے اپنے بھی کام تھے۔

آشیانہ میں آج دو تین مزید فیملیز آئی ہوئی تھیں، پھر بھی مولوت بے اور مسز سونا کا پہلے دن جتنا خیال رکھ رہے تھے۔ رات میں وہ سوئی تو فجر کے لیے اٹھی، پھر نماز پڑھ کر دوبارہ سے سو گئی۔ قریباً دو تین گھنٹے بعد دستک سے آنکھ کھلی۔

”آبلہ، آبلہ۔“ فاح پکار رہا تھا۔

ایک تو یہ آبلہ کا زبردستی کھائی بھی نا، آرام نہیں کرنے دے گا۔ وہ جب کھستی ہوئی دروازے تک آئی، وہ جاچکا تھا۔ دروازے کی درز سے البتہ اس نے ایک خط کا لٹافہ ڈال دیا تھا۔

اس نے جھک کر لٹافہ اٹھایا، اسے کھولا اور اندر رکھا سفید، موٹا کاغذ نکالا۔ اوہ! یہ لکھائی جو وہ ہمیشہ پہچان سکتی تھی۔

I Hope Ladies Are Rejoining At 2:00 Pm

سطر پڑھ کر وہ بے اختیار مسکرا دی۔ یعنی وہ دو بجے مل رہے تھے۔ کدھر؟ جگہ اس نے نہیں لکھی تھی، مگر وہ سمجھ گئی تھی۔ وہ ان کے پاس آئے گا پھر اسٹے وہ کہیں جائیں گے۔

بعد میں جب اس نے کمرے کا دروازہ کھولا تو سفید گلابوں کا بو کے بھی پڑا تھا، جو فاح نے لفافے کے ساتھ ہی رکھا ہوگا۔ وہ ان کو بھی اندر لے آئی، اور صوفے کے ساتھ رکھی میز کے گلداں میں سجا دیا۔

گلاب کی تازہ، دل فریب مہک دنیا کی سب سے الگ مہک ہوتی ہے۔ بچپن میں اسے گلاب کی پتیاں کھانے کا بہت شوق تھا۔ وہ نہ میٹھی ہوتیں نہ نمکین۔ بس کوئی الگ سا ذائقہ تھا۔ ابھی یہ حرکت کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اگر بہارے اٹھ کر دیکھ لیتی تو کتنی شرمندگی ہوتی؟ بہارے نے ناشتے کے بعد وہ پھول دیکھے تھے۔

”یہ کہاں سے آئے؟“

”عبدالرحمن نے مجھوائے ہیں۔“ وہ بستر سمیٹ رہی تھی۔

”کتنے پیارے ہیں..... حیا.....“ بہارے ذرا رک کر بولی۔ ”کیا تم نے کبھی گلاب کی پیتاں کھائی ہیں؟“

وہ جو بڑا کورتہ کر رہی تھی، پلٹ کر اسے دیکھا۔

”تمہیں لگتا ہے مجھ جیسی ڈینٹ لڑکی ایسا کر سکتی ہے؟“ سچ بولنے کا موڈ نہیں تھا، اور جھوٹ وہ بولنا نہیں چاہتی تھی، سوالنا سوال کر لیا۔

ڈیڑھ بجے وہ تیار سی ہو کر اپنے صوفے پہ بیٹھی تھیں۔ انتظار اس دنیا کی سب سے تکلیف دہ شے ہے۔ بار بار گھڑی کو دیکھنا۔ جانے

کب آئے گا وہ؟

اس نے پھر سے اس کا خط نکال کر پڑھا۔ 2 بجے کا وقت ہی لکھا تھا اس نے۔ وہ کاغذ واپس ڈالنے لگی، پھر پھر مگنی۔

یوں تو وہ عام سی سطر تھی، مگر کچھ تھا اس سطر میں جو غلط تھا۔ بہارے اس کے کندھے کے اوپر سے جھانک کر وہ پڑھنے لگی۔

”ہاں، یہ اسی نے لکھا ہے۔ یہ اسی کی لکھائی ہے۔ دیکھو، ہر ورڈ کا پہلا حرف بڑا لکھا ہے۔“ جو چیز اسے الجھا رہی تھی، بہارے نے اس

کی نشاندہی کر دی۔ وہ ذرا سی چوکی۔

”ہاں، مگر کیوں؟“

”جب اس نے مجھے سیاروں کے نام سکھائے تھے تو ایسے ہی لکھا تھا۔ دکھاؤں تمہیں؟“ وہ جھٹ سے اپنا گلابی پرس اٹھا لائی اور اندر

سے ایک گلابی ڈائری نکالی، پھر کھول کر ایک صفحہ حیا کے سامنے کیا۔

اس پہ لکھا تھا

"My Very Elegant Mother Just Served Us Nine Pizzas".

”یہ کیا ہے؟“ اس نے اچھبے سے وہ عبارت پڑھی۔ ہر لفظ کا پہلا حرف بڑا تھا۔

”دیکھو، ہر بڑے حرف سے سیارے کا نام بنتا ہے، ماٹی کے، انیم سے مرکری، ویری کے دی سے ونس، ای سے ارتھ، اور اس طرح یہ

فقرہ یاد کرنے سے مجھے سیاروں کی ترتیب یاد ہو گئی۔ سناؤں؟“

”نہیں، مجھے یاد رکھنے دو۔“ اس نے جلدی سے ایک قلم اٹھایا، اور جہان کے اس فقرے کے ہر بڑے حرف کو علیحدہ نیچے اتارا۔

”اس سے بھی کوئی دوسرا فقرہ بنے گا شاید.....“ الفاظ اس کے لبوں میں رہ گئے۔ وہ مجھے حروف ایک ساتھ لکھے ہوئے اس کے

سامنے تھے۔

IHLARA

”الہارا؟“ اس نے بے یقینی سے دہرا کر بہارے کو دیکھا۔

”الہارا!“ بہارے گل جیجی۔

”اللہ اللہ!“ قریباً جھگمتے ہوئے اس نے اپنا پرس اور عبایا اٹھایا، پھر گھڑی دیکھی۔ دو بجنے میں زیادہ وقت نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

داویٰ الہارا کا نام الہارا گاؤں کے نام پہ تھا جو اس وادی کے قریب واقع تھا۔ یہ داویٰ یوں تھی کہ دو یو بیکل چٹانیں چند کلومیٹر کے

فاصلے پہ آئے سانسے کھڑی تھیں، ان کے درمیان سے دریا بہتا تھا، اور جنگل بھی تھا۔ اطراف میں پہاڑ تھے۔ یہ درمیان کی داویٰ الہارا داویٰ تھی۔

سیاح اکثر کپادوکیہ میں ”عشق داویٰ“ (کو ویلی) گل شہر (روز ویلی) اور الہارا ویلی وغیرہ میں ٹریکنگ کے لیے آیا کرتے تھے۔

الہارا کا ٹریک یہ تھا کہ ایک چٹان سے دوسری چٹان تک، دریا کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے جاتا تھا۔ اصل ٹریک سولہ کلومیٹر لمبا تھا، مگر

دو شارٹ کٹ بھی بنے تھے۔ ایک سات کلومیٹر، جبکہ دوسرا ساڑھے تین کلومیٹر لمبا تھا۔

یہ اس کا اندازہ تھا کہ آپریشن کے باعث وہ بہت زیادہ پیدل نہیں چل سکتا ہوگا، اس لیے وہ انہیں سب سے چھوٹے ٹریک کے دہانے

پہل جائے گا۔ مولوت بے نے انہیں وہیں ڈراپ کر دیا تھا۔ دو کب کے بج چکے تھے، اور ان کو کافی دیر ہو چکی تھی۔ وہ ان سے پہلے کا پہنچ چکا تھا۔

سیاحوں کی چہل پہل میں بھی دور سے حیانے اسے دیکھ لیا تھا۔

ایک بڑے پتھر پہ بیٹھا، سر پہ پی کیپ، کندھے پہ بیگ اور گلاسز سامنے گرے شرٹ پہ انگی ہوئی۔ وہ انہی کو، دھوپ کے باعث آنکھیں کھیر کر دیکھ رہا تھا۔

وہ درمیانی رفتار سے چلتی، بہارے کا ہاتھ تھامے، اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وہ بھاگ کر اس کے پاس نہیں جانا چاہتی تھی۔ اسے جہان پہ غصہ تھا۔ کیا تھا اگر وہ انسانوں کی زبان میں بتا دیتا کہ اہلاراولی آ جاؤ۔ اگر جو وہ یہ کوڑ نہ جان سکتی، اگر جو وہ نہ مل سکتے تب؟ لیکن تب بھی وہ اسی پہ طبعاً دل دیتا۔ آخر وہ اس جیسی اسمارٹ تھوڑی تھی؟

وہ دونوں اس کے قریب آئیں، تو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”میری لغت میں دو بچے کا مطلب ایک بچ کر بچپن منٹ ہوتا ہے۔

اور اب ناٹم دیکھو، وہ سنجیدگی سے سرزنس کر رہا تھا۔

کاش اس کی یہ لغت کتابی شکل میں دستیاب ہوتی تو وہ اسے اٹھا کر۔ اف۔

”اچھا پھر واپس چلی جاتی ہوں۔“

”خیر اب تو میں نے اتنا وقت ضائع کر لیا۔ آؤ، اب چلتے ہیں۔“ ہاتھ سے درختوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ اسی جانب چل پڑا۔

”تم نے مجھ سے پوچھا ہی نہیں کہ میں کیسی ہوں؟“ بہارے نے احتجاجاً اپنی موجودگی کا احساس دلانا چاہا۔

”سوری۔ تم کیسی ہو؟“ بجائے جھڑکنے کے، وہ معذرت کرنے لگا۔

بہارے ”بہت اچھی“ کہہ کر اسے آشیانہ کے بارے میں بتانے لگی، جہاں دنیا کی سب سے اچھی لڑکی پنارہی تھی۔

”اچھا..... ہاں..... حیا.....“ اس کی بات سنتے سنتے اس نے ایک دم حیا کو پکارا۔ وہ سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔

”جہیں آئیڈیا نہیں ہوا کہ ہم نے ٹریک پہ جانا ہے؟ میں نے تو صبح ہی بتا دیا تھا۔“

(میری سمجھ میں اب آیا ہے، یو ایڈیٹ!)

”ہاں تو؟“

”اور تم ان جوتوں کے ساتھ آئی ہو؟“ ذرا خشکی سے کہتے ہوئے اس نے حیا کے قدموں کو دیکھا۔ حیانے اس کی نگاہوں کے تعاقب

میں گردن جھکا لی۔ اور ایک کراہ اس کے لبوں سے نکلنے نکلنے رہ گئی۔

اللہ، اللہ، وہ جلدی میں وہی سرخ تیل بہن آئی تھی۔

”ہاں، میں ان جوتوں میں بھی دو گھنٹے پیدل چل سکتی ہوں“ اور ڈی بچے نے ہی تو کہا تھا کہ انسان کو کوئی چیز نہیں ہر سکتی جب تک کہ

وہ ہار نہ مانے، پھر وہ کیسے ہار مان لیتی؟

”شیور“ تمہارا پاؤں.....“

”ٹھیک ہے میرا پاؤں۔ چلو اب!“ وہ آگے بڑھ گئی۔ بہارے نے سلسلہ کلام وہیں سے جوڑ دیا۔

وہ گھنے درختوں میں آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ دریا ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ دونوں اطراف خشک اونچی چٹانیں تھیں جن میں غاری

صورت چرچ بنے تھے۔ تھوڑی دور جا کر بنی اس کا پاؤں جواب دینے لگا تھا۔ وہ موج جس کو وہ کب سے نظر انداز کرنے لگی تھی، شاید موج سے بڑھ کر تھی۔

ابھی وہ زیادہ دور نہیں گئے تھے جب جہان نے کہا کہ ڈرا رک جاتے ہیں۔ بائیں جانب چٹان میں سیرھیاں بنی تھیں جو اوپر ایک غار

نما چرچ میں جاتی تھیں۔ وہ ان سیرھیوں پہ چڑھتے اوپر آ گئے۔ بہارے کو اس نے اپنا کیمرو دے کر چرچ کی تصاویر بنانے اندر بھیج دیا اور خود وہ

سیرھیوں کے دہانے پہ اوپر نیچے بیٹھ گئے۔

”کیا تم مجھ سے نفرا ہو؟“ وہ جو نیچے گہری داوی، دریا اور چٹانیں دیکھ رہی تھی، اس کے دوستانہ انداز پہ پلٹ کر اسے دیکھنے لگی۔

”جہیں ایسا کیوں لگا؟“

”یونی۔ حالانکہ اب تو میں تمہیں اپنے ساتھ بارڈر تک بھی لے جا رہا ہوں، مگر تم ہمیشہ خفا رہتی ہو۔“ کہنے کے ساتھ اس نے کندھے سے اپنا بیگ اتارا اور اندر سے ایک تہہ شدہ کاغذ نکالا۔

”نہیں، میں خفا نہیں ہوں اور تمہارا پروگرام.....؟“ اس نے اسے نقشہ کھول کر دونوں کے درمیان میں پھیلاتے دیکھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

”دیکھو..... یہ کپادوکیہ ہے جہاں ہم ہیں۔“ اس نے نقشے پہ ایک جگہ انگلی رکھی، حیانے اثبات میں سر ہلایا۔ اس بل واڈی اہلاراپہ ہر سو چھایا سی تن گئی تھی۔ ٹھنڈا، میٹھا سا موسم، اور نیچے بہتے دریا کا شور۔

”یہ ہرات کی اور شام کا بارڈر۔“ اس نے بارڈر کی موٹی لکیر کو انگلی سے چھو کر بتایا۔ ”یہاں ترکی کا چھوٹا سا قصبہ ہے، Kilis نام کا۔ ہم نے کیلیس جانا ہے، وہاں سے یہ بارڈر کراس کر کے میں ادھر شام کے شہر Aleppo چلا جاؤں گا۔ کیلیس سے بارڈر تقریباً 3 کلومیٹر دور ہے۔ منگل کی رات ٹھیک ڈھائی بجے مجھے یہ بارڈر کراس کرنا ہے۔ وہاں سے تم واپس چلی جاؤ گی اور پھر میں خود ہی پاکستان آ جاؤں گا۔“ اللہ، اللہ، وہ اتنی خطرناک باتیں کتنے آرام سے کر لیتا تھا۔

”کیا بارڈر کراس کرنا اتنا آسان ہوگا؟“ وہ متذنب تھی۔ دل کو عجیب سے واہے ستانے لگے تھے۔

”جیہا، ترکی اور شام کا بارڈر آسان ترین بارڈر ہے۔ یہ 900 کلومیٹر لمبا ہے۔ اب کیا سارے 900 کلومیٹر پہ پہرہ لگا سکتے ہیں بارڈر فورسز والے؟ نہیں نا۔ سو یہاں صرف خادراتاریں ہیں جن میں بہت سے سوراخ ہیں۔ ہر رات کتنے ہی لوگ اس بارڈر کو پورے پورے اٹل و عیال سمیت کراس کر لیتے ہیں۔“ وہ بہت بے نیاز سے انداز میں نقشہ پلینے ہوئے بتا رہا تھا۔ حیانے اچھنبے سے اسے دیکھا۔

”اور بارڈر سیکورٹی فورسز؟ وہ کیوں نہیں ان لوگوں کو پکڑتیں؟“

”وہ صرف ان کو پکڑتی ہیں جو خود چاہیں۔ اگر ہم نہ پکڑے جانا چاہیں تو فورسز ہمیں پکڑ سکتیں۔“

”مگر جہان، میں نے تو سنا ہے کہ اس بارڈر پہ بارودی سرنگیں ہوتی ہیں جو پاؤں پڑنے پہ پھٹ سکتی ہیں۔“ وہ جتنی پریشان ہو رہی تھی، وہ اتنی ہی سکون تھا۔

”اوہ مجھے پتا ہے کون سی سرنگ کہاں ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ فکر مت کرو۔“

وہ کچھ دیر اسی طرح کی باتیں کرتے رہے، پھر اس نے گردن اٹھا کر سورج کو دیکھا۔

”نماز پڑھ لوں میں ذرا۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ جہان نے اس کے سرخ جوٹوں کو دیکھا۔

”جب تم وضو کرنے کے لیے یہ جوتے اتارو گی تو میں انہیں دریا میں پھینک دوں گا۔“ حیانے مسکرا کر اسے دیکھا۔

”تو میں انہیں اتاروں گی ہی نہیں۔ میرا دین بہت آسان ہے۔“

وہ نیچے اتری، اور دریا سے وضو کر کے صاف جوٹوں کو پھر سے صاف کر کے انہی میں نماز پڑھی، اور جب وہ واپس آئی تو جہان اور بہارے آنے سنانے چرچ کے داخلی دروازے کے پاس کھڑے تھے۔

”تمہاری عادت نہیں گئی چھپ کر باتیں سننے کی! تم کیوں کر رہی تھیں ایسا؟“ وہ غصے سے اسے کہہ رہا تھا۔ سر جھکائے کھڑی بہارے نے منمننا چاہا۔

”میں نے کچھ نہیں سنا۔ بس تھوڑا سا خود بخود.....“

”میں تمہارا خود بخود اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ میری بات کان کھول کر سن لو۔ اگر تم نے اس بات کا ذکر کسی سے بھی کیا، تو میں بہت برا پیش آؤں گا۔ تمہیں سمجھ آیا جو میں نے کہا؟“

”میں نے کچھ نہیں سنا۔“

تبھی جہان نے حیا کو دیکھا تو سر جھٹک کر اس تک آیا۔

”کیا وہ ہماری باتیں سن رہی تھی؟“ حیانے تعجب سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں، میرا نہیں خیال اس نے کچھ اتنا خاص سنا ہے۔ بہر حال میں اسے خبردار کر دیا تھا۔“

”تم پریشان مت ہو، اگر اس نے کچھ سنا ہو تو بھی کچھ کہاں آئی ہوگی!“

جہان نے خاموش نظروں سے اسے دیکھا، اور پھر لٹی میں سر ہلایا۔

”وہ اپنی بہن کی جاسوس ہے۔ ایک ایک بات ادھر بتائے گی۔ اس پہ نظر رکھنا، یہ کسی کوفون نہ کرے۔“

”اس کا فون تو آشیانہ میں پڑا تھا چارج پہ لگا تھا۔ تم فکر نہ کرو، واپس جا کر میں فون ہی لے لوں گی۔“

جہان کچھ کہے، بنا سیر حیاں اترنے لگا۔

حیا نے پلٹ کر بہارے کو دیکھا، پھر آنے کا اشارہ کیا۔

وہ خاموشی سے سر جھکائے، اپنا گلابی پرس مضبوطی سے پکڑے ان کے پیچھے چلنے لگی۔

اس کا موبائل اس کے گلابی پرس کے اندرونی خانے میں رکھا تھا۔



ایک سو ساٹھ

ڈاٹ کام

آخری باب

آنے اپنی مخصوص کرسی پہ بیٹھیں، سلائیوں کو مہارت سے چلاتی، سوئٹشر بن رہی تھیں۔ اون کا گولا لڑھک کر ان کے قدموں کے قریب گرا پڑا تھا۔

عائشہ گل ان سے فاصلے پہ بے صوفی کے ایک کونے پہنچی، لون کے گولے کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی نگاہیں دھماگے پہ جمی تھیں، مگر ذہن کہیں دور بھٹک رہا تھا، زندگی اب لون کے گولے کی سی لگتی تھی۔ کوئی اُسے کب سن دے، کب ادھیڑ دے۔ سلائیوں اس کے ہاتھ میں تو تھی ہی نہیں۔

”عائشہ! تمہارا فون بج رہا ہے۔“ آنے کے پکارنے پہ وہ چونکی، گود میں رکھا موبائل کب سے بج رہا تھا۔

اس نے نمبر دیکھا، اور پھر ایک معصوم سی مسکان نے اس کے لبوں کو چھو لیا۔

”بہارے!“ نمبر پہ لکھا نام بہت محبت سے لے کر اس نے آنے کو بتایا، اور سبزیشن دبا کر فون کان سے لگایا۔

”سلام علیکم!“ اس نے مسکرا کر سلام کیا تھا۔

”میں ٹھیک ہوں، تم سناؤ، ترکی والے کیسے ہیں؟“ اس کی مسکراہٹ اور بھی خوبصورت ہو گئی تھی۔ آنکھوں میں طمانیت کے سارے رنگ اتر آئے تھے۔

”ہاں، بتاؤ، کیا ہوا؟“ اس کے الفاظ سن کر آنے نے بے اختیار سلائیوں چلاتے ہاتھ روک کر اسے دیکھا۔

اسی پہل عائشہ سیدھی ہو کر بیٹھی۔ اس کی مسکراہٹ ایک دم کم گئی تھی۔

”کون سا بارڈر؟ ترکی اور شام کا؟“ اس نے آہستہ سے دہرایا تھا۔ آنے فاصلے پہ بیٹھی تھیں۔ ان کو سنائی نہیں دیا تھا، مگر انہوں نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا ضرور تھا۔ وہ ان کو یوں دیکھتے پا کر زبردستی ذرا سی مسکرائی، پھر معذرت خواہانہ نگاہوں سے گویا اجازت طلب کرتی، اٹھ کر کچن میں آ گئی۔

آنے نے ذرا حیرت سے اسے گردن موڑ کر دیکھا۔ وہ کچن کے کھلے دروازے سے کاؤنٹر کے پیچھے کھڑی، فون پہ بات کرتی نظر آ رہی تھی۔ آنے واپس سلائیوں کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

”ہاں، کبو پھر، میں سن رہی ہوں۔“ کاؤنٹر پہ کبھی رکھ کر جھکے کھڑے عائشہ نے ایک محتاط نظر باہر لاؤنچ میں کھڑکی کے پاس بیٹھی آنے پہ ڈالی۔ وہ اب اس کی جانب متوجہ نہیں تھیں۔

”ذرا اونچا بولو، اتنا آہستہ مجھے سمجھ نہیں آ رہا۔ کیا کوئی آس پاس ہے؟“ اس نے رک کر سنا، پھر اثبات میں سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے، مجھے ساری بات سمجھاؤ اب۔“

اس نے پھر اُدھ کھلے دروازے سے جھانکا۔ آنے اپنی بنائی میں مصروف تھیں۔

”کیا؟ ایک منٹ۔ مجھے سمجھ نہیں آیا۔ کیلیس کے کس طرف ہے وہ بارڈر؟“ وہ تیزی سے فرنچ کی جانب بڑھی اور اس کے دروازے پہ نصب ہولڈر سے چین نکالا، اور ساتھ ہی آئیناں نوٹ پیڈ کے اوپری صفحے پہ تیزی سے لگنے لگی۔ ”منٹل کی رات، یعنی پیر اور منٹل کی درمیانی رات، دو سے تین بجے، وہ الیگل بارڈر کراس کرے گا، اچھا، اور؟“ روانی سے چند الفاظ گھسیٹے گئی۔

”ہاں، ٹھیک، میں سمجھ گئی۔ اچھا..... اوکے.....“ اس نے چین واپس ہولڈر میں رکھا، اور نوٹ پیڈ کا صفحہ پھاڑا، پھر تہہ کر کے مٹھی میں

دبایا۔

”اچھا..... میں..... دیکھتی ہوں۔ کیا ہوا؟ کوئی آ گیا ہے؟ اچھا تم فون رکھو، بعد میں بات کریں گے، مرحبا!“ اس کا ”مرحبا“ ادا ہونے سے قبل ہی فون بند ہو چکا تھا۔ اس نے ایک نظر موبائل کو دیکھا، اور پھر چند گہرے گہرے سانس لے کر اپنے حواس بحال کیے۔ دل ابھی تک

اس نے اپنے دل سے پوچھنا چاہا۔ عجیب سا ہیجان اور تذبذب ہر جگہ غالب تھا۔

اس نہج پہ وہ ذرا سی چونکی۔

”عائشہ گل کبھی کچھ نہیں کر سکتی!“ عبد الرحمن ہمیشہ سے کہا کرتا تھا یہ۔ اس کا پسندیدہ فقرہ۔

مگر اس وقت یہ فقرہ کسی تیر کی طرح اسے آگاتا تھا۔ وہ شکستہ قدموں سے چلتی واپس لاؤنج کے بڑے صوفے کے کنارے آئی۔

آنے نے سلامیوں سے نظر ہٹا کر اسے دیکھا۔

”کیا کہہ رہی تھی بہارے؟“

عائشے نے مات ٹھک سے سی نہیں تھی، بس نفی میں گردن ہلائی۔ وہ کہیں اور گم تھی۔

کہا! اے عبدالرحمن کو دکھا دینا چاہئے کہ عائشہ گل بہت کچھ کر سکتی ہے؟

کسا واقعی؟

☆ ☆ ☆

وہ چلتے چلتے اس جنگل نما علاقے تک آ پہنچے تھے۔

اونچے سرسبز درخت، اور ان کے درمیان سے دریا تنگ جھرنے کی مانند بہہ رہا تھا۔ پانی کے اوپر پل کی صورت لکڑی کے پھٹے گے تھے، اور درمیان میں ایک لکڑی کا بڑا ساخت تھا۔ تخت پہ سرخ قالین بچھا تھا، اور تین طرف منڈیر بنا کر گماؤ کیلئے گئے تھے۔ چوتھی طرف منڈیر نہ تھی، تاکہ وہاں ٹانگیں لٹکا کر میٹھو تو پیرانی کو چھو گئیں۔

سبز پانی، سبز درخت اور اوپر جھلکتا نیلا آسمان۔ ہل کے اس پار جھونپڑے سے بنے تھے، جن میں سے ایک سے وہ ابھی ابھی نماز پڑھ کر نکل تھی۔ ظہر سے عصر تک وہ بس چلتے ہی رہے تھے، پھر اس مقام پہ جہاں انہیں چھوڑ کر اپنے کسی کام کی غرض سے چلا گیا تھا۔ اس کو گھنٹے تک آنا تھا۔ وہ اس آٹھائیں کھانا کھا کر اب نماز سے فارغ ہوئی تھی۔ باہر نکل کر دیکھا تو بہارے ہل کے تحت پہ بٹھی، پیر کے انگوٹھے سے پانی میں دائرے بنا رہی تھی۔

حیائے اپنی سرخ، میلو اتار کر اندر جھونپڑے میں رکھ دیں۔ (جہاں کون سا دیکھ رہا تھا) اور پاؤں سے عبایا ڈرا سا اٹھائے، ننگے پیر چلتی پل تک آئی۔ بہارے کے ساتھ بیٹھ کر اس نے پاؤں پانی میں ڈالے تو وہ ٹخنوں تک سبز مائع میں ڈوب گئے۔

جہان سکندر کا ترکی واقعی بہت خوبصورت تھا۔

”عبدالرحمن کب آئے گا؟“ بہارے گود میں رکھے اپنے گلانی پرس یہ لگے موتی یہ انگلی پھیرتی، پانی کو دیکھتے ہوئے بولی تھی۔

”آجائے گا بھی۔ تم نے اتنی دیر کیا کیا؟“ اس نے مگردن ذرا سی موزکرمسکراتے ہوئے بہارے کو دیکھا۔ وہ کھانے کے بعد جب نماز پڑھنے لگی تھی تو بہارے باہر آ گئی تھی۔

”کچھ بھی نہیں کیا۔“ اس نے مجھے مجھے چہرے کے ساتھ نفی میں سر ہلایا۔ جہان کی ڈانٹ کا اثر ابھی تک باقی تھا۔

”کیا تم اس لیے اداس ہو کہ اس نے تمہیں ڈانٹا ہے؟“

”وہ ہر وقت ہی ڈانٹتا ہے، مگر میں نے کچھ غلط نہیں کیا۔“

سامنے سے ایک پرندہ اڑتا ہوا آیا، پانی کی سطح سے اپنے پنجے ٹکراتے ہوئے ذرا سے قطرے چوچ میں بھرے اور بغیر رکے، پھر

پھر پھڑپھڑاتا اڑتا گیا۔

”کیا تم نے واقعی ہماری باتیں سنی تھیں؟“ استفسار کرتے ہوئے بھی وہ جانتی تھی کہ اگر اس نے سنا ہو، تب بھی وہ سمجھ نہیں پائی ہوگی۔

”نہیں سنائیں نے کچھ۔ سب مجھے کیوں الزام دیتے ہیں؟“ وہ خفگی سے کہتی سر اٹھا کر دور جاتے پرندے کو دیکھنے لگی جو اوپر آسمان پہ

اڑتا جا رہا تھا۔

شاید اس کے لیے چوچ بھر پانی ہی کافی تھا۔ اس کی وسعت بس اتنی ہی تھی۔

”اچھا، پھر اداس کیوں ہو؟“

”حیا، کیا جب میں پندرہ سال کی ہو جاؤں گی تو شادی کر سکوں گی؟“

اور حیا کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

”تمہیں ایسی بات کیوں سوچھی بہارے؟“

”غنجہ کی شادی بھی پندرہ سال کی عمر میں ہوئی تھی نا۔“

”غنجہ کون؟“

”ہماری جدی۔ میں رہتی تھی، ہم سب گئے تھے اس کی شادی پہ، عبدالرحمن بھی گیا تھا۔ تصویر بھی ہے میرے پاس۔ دکھاؤں؟“

حیا نے میکا کی انداز میں سر ہلایا۔ بہارے نے اپنا پرس کھولا، اندرونی خانے کی زپ کھولی اور ایک لفافہ نکالا۔ اسے اس کے موبائل کی

جھلک نظر آئی تھی۔

”تمہارا فون تمہارے پاس تھا؟“ اس کو پوچھا ہوا۔ ”میں سمجھی تم نہیں لاتی۔“

”میں لے آئی تھی، چار جنگ ہوئی تھی۔“

”کیا میں اسے دیکھ سکتی ہوں؟“ اس نے موبائل لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو بہارے نے جھٹ سے زپ بند کر کے بیگ پرے کر لیا۔

”میں نے کچھ غلط نہیں کیا۔ تم میرا یقین کیوں نہیں کرتیں؟ میں اچھی لڑکی ہوں۔“ حیا نے گہری سانس بھری۔

”اچھا ٹھیک ہے، میں تمہارا یقین کرتی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ بہارے گل اچھی لڑکی ہے، اور اچھی لڑکیاں کبوتر نہیں بنتیں۔ وہ

باتیں ادھر سے ادھر نہیں کرتیں۔“ اس نے ہاتھ واپس کھینچ لیا تھا۔ ”جہاں تمہیں جو بات آگے بتانے سے منع کر رہا تھا، وہ تم عائشے کو نہیں بتاؤ گی،

پر اس؟“

بہارے نے ”لیکن“ کہنے کے لیے لب کھولے، پھر بند کر دیے۔ پھر سر جھٹک کر لفافے سے ایک فوٹو گراف نکال کر حیا کے سامنے کیا۔

”بس میرے پاس اس کا یہی فوٹو ہے۔“ حیا کو دکھاتے ہوئے بھی بہارے نے تصویر کا کنارہ سختی سے پکڑ رکھا تھا، اتنی سختی سے کہ اس کا ناخن پیلا سفید پڑ

گیا۔ وہ اب پانی کے قریب کوئی بھی چیز سے احتیاطی سے پکڑنے کا خطرہ نہیں لے سکتی تھی۔ پانی کھوئی ہوئی چیزیں کبھی بھی لوٹا نہیں کرتا تھا۔

وہ شادی کے فنکشن کی تصویر تھی۔ کورٹ میں نکاح تھا۔ فرنٹ رو کی نشستوں پہ وہ بیٹنوں بیٹھے تھے۔ بلیک سٹ اور گرے شرٹ میں

کبکبھی، وہ بس ذرا سا مسکرا رہا تھا۔ ساتھ بیٹھی بہارے اور عائشے بھی مسکرا رہی تھیں۔ مصنوعی فیملی، جواب نوٹ گئی تھی۔

”پتہ ہے، ہماری شادیوں میں نکاح کے بعد دلہا دلہن کی کرسی اٹھاتا ہے۔“

”ہاں، میں جانتی ہوں، تا کہ وہ علامتی طور پہ یہ ثابت کر سکے کہ وہ اپنی بیوی کی ذمہ داری کا بوجھ اٹھا سکتا ہے۔“

”مگر غنجہ اتنی موٹی تھی کہ اس کے دل پہ سے کرسی اٹھائی ہی نہیں گئی۔“ پھر وہ ذرا رکی۔ ”مگر تم عائشے کو مت بتانا کہ میں نے یوں کہا۔“

”اگر تم وہ بات جو جہاں نے منع کیا ہے، عائشے کو نہیں بتاؤ گی تو میں بھی اسے نہیں بتاؤں گی۔“

”مگر عائشے کو تو پہلے ہی.....“ اس نے جیسے زبان دانت تلے دبا لی۔

”کیا اسے پہلے ہی پتہ ہے؟“ حیانے بغور اسے دیکھا۔ بہارے نے جھٹ گردن نفی میں ہلائی۔ ”میں کسی کو نہیں بتاؤں گی۔“

پراس!

اس نے تصویر احتیاطاً خط کے لفافے میں ڈالی، اور اسے بیگ میں رکھ دیا۔

کچھ تھا جو حیا کو ڈسٹرب کر رہا تھا۔ کچھ غلط تھا کہیں۔ مگر خیر.....

”اور تم یہ شادی کی باتیں مت سوچا کرو۔ اچھا؟“ اسے تنبیہ کرنا یاد آیا تو فوراً کی۔

بہارے نے سر اٹھا کر اسے دیکھا، پھر نفی میں گردن ہلائی۔

”میں تمہیں نہیں بتاؤں گی کہ میں کس سے شادی کروں گی۔“

”وہ کیوں؟“

سامنے دریا کنارے درخت کا ایک پتہ ہوا سے پھڑ پھڑا رہا تھا۔ جب ہوا کا بوجھ بڑھا تو وہ ایک دم شاخ سے ٹوٹ کر نیچے گرا۔

”تم بُرا مانو گی۔ سمجھو میں نے ایسا کہا ہی نہیں۔“

ہوانے پتے کو اپنے پروں پہ سہارا دیے آہستہ آہستہ نیچے اتارا، یہاں تک کہ پانی نے اسے نرمی سے ہوا کے ہاتھوں سے لیا اور اپنے

اوپر لٹا دیا۔

”تمہیں پتہ ہے، عبدالرحمن نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ مر جائے۔ تو میں اسے جنازہ ضرور دوں گی۔“

”کیا؟“ وہ ششدر رہ گئی۔ سانس رکا، اور دل بھی دھڑکنا بھول گیا۔

ابھارا۔ کہ دریا کی سطح پر درختوں اور آسمان کا عکس جھلملار رہا تھا۔ اس عکس پہ تیرتا پتہ ان کی سمت آ رہا تھا۔

”ہاں، اس نے بہت دفعہ ایسا کہا.....“

”چھوڑو! باتوں کو۔“ اس نے خفیف سا سر جھٹکا۔ پتہ نہیں کیوں وہ ہمیشہ آگے کی ساری پلاننگ تیار رکھتا تھا، چاہے وہ مرنے کی ہی

کیوں نہ ہو۔

اس نے گردن اٹھا کر سامنے دریا کو دیکھا۔ وہاں سے چٹانیں اور غار دکھائی نہیں دیتے تھے، مگر جب وہ بیلون میں اوپر اڑ رہے تھے،

تب وہ نظر آتے تھے۔ بالکل ویسے جیسے ڈاکٹر ابراہیم کی دی گئی کینڈی کے رپر پہ بنے تھے۔

”بہارے!“ اسے ایک دم یاد آیا۔ ”یاد ہے عائشہ کہا کرتی تھی کہ قرآن میں نشانیاں ہوتی ہیں، ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے

ہیں؟ اور تم نے کہا تھا کہ تم جانتی ہو وہ اس روز ہمیں کیا بتانا بھول گئی تھی۔“

”ہاں!“ بہارے نے اثبات میں سر ہلایا۔

پتا بہتا ہوا ان کے قدموں کے قریب آ رہا تھا۔ جیسے ہی وہ مزید آگے آیا، بہارے نے اپنے پاؤں سے اس کا راستہ روکنا چاہا۔

حیا کو احساس ہوا کہ وہ دونوں پتے کو دیکھ رہی تھیں، بہارے نے اسے روکنے کی کوشش کی تھی، مگر اس نے نہیں کی۔

”عائشہ نے بتایا ہی نہیں تھا کہ آخر میں جنگ کون جیتا۔“

بہارے نے اپنے پیر سے پتے کو واپس دھکیلا۔ وہ ذرا پیچھے ہوا، پھر اسی رفتار سے واپس آیا۔ اب کے بہارے نے اسے نہیں روکا۔

وہ ان دونوں کے پیروں کے درمیان سے گزرتا تخت کے نیچے بہتا چلا گیا۔

”مسلمان جیتے تھے، یہ تو مجھے پتہ ہے۔“ عیا کو حیرت ہوئی۔ یہ تھی وہ بات جس کو جاننے کے لیے اسے بہت تجسس تھا؟

”مگر مجھے نہیں پتہ تھا، موسیٰ نے اسٹوری بک سے پڑھ لیا تھا بعد میں۔“ ساتھ ہی بہارے نے گردن مزید کر پیچھے دیکھا۔ پھڑاہوا پتا

اپنے درخت سے بہت دور، پیچھے کو بہتا چلا جا رہا تھا۔

”بس؟ یہی بات تھی؟“

”ہاں!“ بہارے نے اثبات میں سر ہلایا۔

حیا کو ماپوسی ہوئی تھی۔ یہ تو سامنے کی بات تھی کہ مسلمان ہی جیتے تھے تو پھر؟ بہارے نے سمجھا عائشہ بتانا بھول گئی ہے جبکہ عائشہ نے اس لیے اس بات کا ذکر نہیں کیا کہ سب جانتے ہیں، احزاب کی جنگ مسلمانوں نے جیتی تھی۔ یہ کوئی اہم بات تو نہیں تھی۔ شاید ڈاکٹر ابراہیم اسے یہی بتانا چاہ رہے تھے کہ آخر میں یہ جنگ وہ جیت جائے گی۔ پھر بھی، کہیں کچھ منگ تھا۔ کچھ تھا جو وہ پھر بس کر گئی تھی۔ اس نے خفیف ساسر جھٹکا۔ پتہ نہیں۔

بہارے ابھی تک گردن موڑے دور جاتے پتے کو دیکھ رہی تھی۔ وہ پتا جسے اب کبھی اپنے درخت کے پاس واپس نہیں آنا تھا۔

☆ ☆ ☆

جہان آیا تو وہ لوگ اہلارا گاؤں آ گئے۔ اب شام ہو رہی تھی، سو وہ وہیں سے واپس ہولیا جبکہ انہوں نے کب لے لی اور واپس آ شیانہ آ گئے۔

جہان نے کہا تھا، کل یہاں سے روانہ ہونا ہے۔ اسی حساب سے وہ آج پکنگ کر رہی تھی۔ پناہ رات میں چائے دینے آئی تو ان کو سامان سمیت ادکھ کر افسردہ ہو گئی۔

”میری متنگی ہوگی سرماییں، کیا تم لوگ آؤ گے؟ میں تمہیں ضرور انوائیٹ کر دوں گی۔“
 ”میں ضرور آؤں گی!“ بہارے نے چپک کر کہا، پھر حیا کو دیکھ کر مسکراہٹ ڈرا سٹی۔ ”میرا مطلب ہے، شاید آؤں!“
 ”ہوں!“ پناہ مسکرا کر اس کا گال تھپتھپاتی باہر نکل گئی۔

”عائشہ کہتی ہے، جب میں اس کے پاس آ جاؤں گی تو ہم دونوں دور کسی دوسرے ملک چلے جائیں گے، جہاں پاشا بنے ہو، اور جہاں ہم عائشہ اور بہارے بھی کر رہیں، مٹی اور خد نہ ہیں۔ اور پھر وہاں ہم بہت سا پڑھیں گے بھی سبھی۔“

”میں کیا کہہ سکتی ہوں؟“ اس نے شانے اچکاتے ہوئے اپنے سفری بیگ کی اندرونی زپ کھولی۔ ایک خانہ ذرا پھولا ہوا تھا۔ اوہ، اسے یاد آیا۔ اس نے اس خانے سے وہ سیاہ مٹلیں ڈبی نکالی۔

اپنا فراک تہہ کرتی بہارے وہ ڈبی دیکھ کر کھٹکی، پھر اس کے پاس چلی آئی۔ حیا نے ڈبی کھولی۔ اندر سیاہ بھل پوہ نازک سائیکلیس جگمگا رہا تھا۔ حیا نے نگاہیں اٹھا کر بہارے کو دیکھا۔

پہلے اس کی آنکھوں میں حیرت اتری، پھر الجھن، اور پھر سمجھ کر اس نے نفی میں سر جھٹکا۔
 ”یہ وہ نہیں ہے۔ یہ وہ نہیں ہو سکتا۔ کیا تم نے اسے خریدا ہے؟“

”میں نے اور عبدالرحمن نے مل کر اسے خریدا ہے، ادالارا کی شہزادی کے لیے۔“
 بہارے نے اپنے فراک کو آخری تہہ دی اور پلٹ کر اسے بیگ میں ڈالا۔ جیسے وہ افسردہ ہو گئی تھی۔

”کیا پھر کبھی تمہارا موتی نکلا؟“ حیا نے اس کی پشت کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔
 ”میں نے پھر نہیں ڈھونڈا۔“

”مگر جب کبھی موتی نکلا تو.....“
 ”یہ میرے پاس نہیں رہے گا حیا۔ میں نے اپنا موتی عبدالرحمن کو دیا، اس نے مجھ سے دیا مگر وہ بوسفورس میں گر گیا۔ عائشہ نے بھی اپنے موتی عبدالرحمن کو دیے، اس نے وہ تمہیں دے دیے۔ اب یہ بھی مجھ سے گم جائے گا۔ میں یہ نہیں لوں گی۔“

”مگر یہ میں نے تمہارے لیے لیا ہے بہارے!“
 بہارے بیگ چھوڑ کر اس تک آئی، بھل پر سائیکلیس اٹھایا، اس کی بک کوالٹ پلٹ کر دیکھا، پھر اسے حیا کی کلائی کے گرد لپیٹ کر، اس کی بک آخری کنڈے کی بجائے، کلائی کے گھیر کے برابر ایک کنڈے میں ڈال دی، یوں کہ سائیکلیس کلائی کے گرد پورا آ گیا، اور ایک لڑی سی ساتھ لٹکنے لگی، جیسے برہ سلت کی لٹکتی ہے۔

”یہ اب تمہارا ہو گیا!“ وہ پہلی دفعہ مسکرائی تھی۔

حیاء نے کلائی کو گھما کر دیکھا۔ زنجیر سے لٹکتے ہیرے بہت بھلے لگ رہے تھے۔ کلائی کے عین سائیز پہ ایک لمبا سا کنڈا خالی تھا۔
 ”حیاء تم نے پھر سیپ ڈھونڈنے؟“ بہارے نے بھی اسی خالی کنڈے کو دیکھ کر کہا۔
 حیاء نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔
 ”بس ایک دفعہ۔“

”اس میں سے کیا نکلا؟“ حیاء چند لمحوں سے دیکھتی رہی، پھر نفی میں گردن ہلائی۔
 ”پتہ نہیں، بس وہ کوئی اچھی چیز نہ تھی۔“
 ”مگر تمہا کیا؟“

”جانے دو۔“ اس نے پھر سے اپنی کلائی کو دیکھا۔ اوپر ہاتھ کی تیسری انگلی میں پلٹینم بینڈ تھا۔ وہ دونوں بالواسطہ یا بلاواسطہ جہان کے ہی تھے تھے۔

”شکر یہ بہارے!“ وہ ذرا سا مسکرائی۔ تحفہ تو تحفہ ہوتا ہے نا۔
 ”کیا میں پھر کبھی عبدالرحمن سے نہیں مل سکوں گی؟“ بہارے اب سرخ صوفے کے کنارے جا چکی تھی، اور ہتھیلیوں پہ چہرہ گرائے
 ادا سی سے پوچھ رہی تھی۔
 ”نہیں، کبھی بھی نہیں۔ تمہیں اب اس بارے میں سوچنا چھوڑنا ہوگا۔“ وہ اپنی باقی چیزیں سمیٹنے لگی۔ مسلسل حرکت سے کلائی سے لٹکتی
 زنجیر ادھر ادھر بھول رہی تھی۔

”میں کل انقرہ سے ایران چلی جاؤں گی اپنی بہن کے پاس۔ تم لوگ پھر کدھر جاؤ گے؟“
 ”دیکھو، پتہ نہیں۔“ اس نے مصروف سے انداز میں ٹالنا چاہا۔
 ”کیا تم لوگ کیلیس جاؤ گے؟“

اس کے متحرک ہاتھ ٹھہر گئے۔ اس نے سر اٹھا کر بہارے کو دیکھا۔ ”تم نے اس وقت کچھ سنا تھا نا، بہارے۔ کیا سنا تھا؟“
 ”بس اتنا سا!“ اس نے انگلی اور انگوٹھے کو ایک انچ کے فاصلے پر رکھ کر بتایا۔ ”مگر جان بوجھ کر نہیں، خود بخود.....“
 ”اور تم نے کیا سنا؟“

”عبدالرحمن کیلیس کا نام لے رہا تھا۔ کیا کوئی کیلیس جا رہا ہے؟ واللہ مجھے نہیں پتہ کہ کس کی بات کر رہا تھا۔“ اس ساتھ میں قسیمیہ انداز
 میں ہاتھ سے کان کی لو کو چھوتے ہوئے ”جج“ کی آواز نکالی۔
 ”اور تم نے عائشہ کو بتائی یہ بات؟“

”نا..... نہیں!“ بہارے ذرا سی انگی تھی۔ جہان نے کہا تھا اس نے اگر سنا ہو تب بھی وہ کچھ نہیں سمجھے گی۔ اس نے اپنی عقل کی بجائے
 جہان کی عقل پہ بھروسہ کرنا زیادہ مناسب سمجھا، اور واپس پیننگ کرنے لگی۔ بہارے سے انہیں کوئی خطرہ نہ تھا۔
 بیک کی ایک زپ میں ڈی جے کی ٹوٹی عینک رکھی تھی۔ اس نے احتیاطاً اسے وہاں سے نکال کر اپنے بینڈ بیک کے اندرونی خانے
 میں رکھ دیا جہاں سفید رومال میں کچھ لپٹا ہوا رکھا تھا۔ اور پھر بیک کی زپ زون کی آواز کے ساتھ زور سے بند کی۔
 کل انہیں انقرہ جانا تھا۔



آشیانہ کی فیلی اور فاتح ان کوئی آف کرنے آشیانہ کے صحن میں کھڑے تھے۔ اتنے دن یوں لگ رہا تھا کہ وہ ہوٹل میں نہیں، بلکہ کسی
 کے گھر میں ٹھہرے ہوئے ہوں۔ اب ایک ایک کو خدا حافظ کرنا، مسز سونا اور پٹار کے گلے لگ کر دوبارہ آنے کا بے یقین، کھوکھلا وعدہ کرنا، سب
 بہت اداس کر دینے والا تھا۔ اس کی آنکھیں بار بار بھر آ رہی تھیں۔ ترکی میں اگر اس نے بہت کچھ کھو یا تھا تو بہت کچھ پایا بھی تھا۔ کبھی جب وہ سودو
 زیاں کا حساب کرنے بیٹھے گی تو پانے والا پڑہ شاید بھاری نکلے۔

پنار کی ایرانی بلی مار فیلڈ اس کے بازوؤں میں تھی۔ حیا سے مل کر وہ بچوں کے بل نیچے بیٹھی، اور بہارے سے گلے ملی تو دونوں کے درمیان نرم بلی کسمائی۔

”جب کبھی میری بلی بچے دے گی تو میں ایک تمہارے لیے بھی رکھوں گی پھوٹی بلی!“

بہارے نے کچھ کہا نہیں، بس اداسی سے نفی میں سر ہلادیا۔

سرسو ناگٹ تک فکر و اپنائیت سے پوچھتی رہی تھیں۔

”کیمرے، موبائل، چارجز، سب رکھ لیا تھا؟ راستے کے لیے پانی رکھا ہے؟ کچھ کھانے کو چاہیے؟“ ترک بہت ہی پیاری تو م تھی۔

باہر نکل کر بہارے نے پوچھا۔

”کیا پنار کی بلی کی بھی سر مایں منگنی ہو جائے گی؟“

”اوں ہوں۔ وہ تو یونہی کہہ رہی تھی۔“ اس نے ہولے سے اس کے سر پہ چپٹ لگائی۔ پھر پلٹ کر دیکھا۔ وہ سب انہیں ہاتھ ہلا

رہے تھے۔

حیا نے بھی مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلایا۔

وہ ان لوگوں کی مہمان نوازی کا بدلہ کبھی بھی نہیں چکا سکتی تھی، البتہ وہ اتنا ضرور کر سکتی تھی کہ اب جب بھی وہ اپنے ملک اور اپنی یونیورسٹی میں کسی ترک بلکہ کسی بھی غیر ملکی اسٹوڈنٹ سے ملے گی تو کوشش کرے گی کہ اس کے لیے بھی وہ اتنا ہی وقت نکالے جتنا ان ترکوں نے اس کے لیے نکالا تھا، اور جتنا وہ ہر مہمان کے لیے نکالتے تھے۔

اور کاش وہ یہ کر بھی سکے۔



جہان نے بہارے کے سارے کاغذات اسے پہنچا دیے تھے، البتہ انفرہ میں وہ خود انہیں نہیں ملا تھا۔ حیا نے اسے ایئر پورٹ پہنچ

آف کرنا تھا اور تہران میں اس کی بہن نے اسے ریسو کر لینا تھا۔

بہارے ایئر پورٹ پہ آخری وقت تک داخلی احاطے کو دیکھتی رہی تھی، شاید وہ آجائے!

”وہ نہیں آئے گا بہارے، اس نے کہا تھا کہ وہ نہیں آ سکے گا۔“

بہارے کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ پس منظر میں اعلان ہونے لگا تھا۔ اب ان دونوں کو الگ ہونا تھا۔

”کیا ہم پھر کبھی نہیں ملیں گے حیا؟“

اس کی بات پہ حیا نے گہری سانس بھری، اور بہارے کے سامنے بچوں کے بل بیٹھی، پھر اس کے دونوں ہاتھ تھام کر کہنے لگی۔

”بہارے گل، زندگی میں انسان کو ہر چیز دیے نہیں ملتی جیسی اس نے سوچی ہوتی ہے۔ سب ہماری مرضی کے مطابق نہیں ہو سکتا، اور

جو ہم کہتے اور سوچتے ہیں، وہ تو کبھی نہیں ہوتا۔ پہلے ہم نے سوچا تھا کہ ہم ہمیشہ ایک دوسرے سے رابطے میں رہیں گے، مگر یہ نہیں ہو سکا۔ اور اب ہم

سوچ رہے ہیں کہ ہم کبھی دوبارہ مل نہیں پائیں گے، تو ہو سکتا ہے کہ یہ بھی نہ ہو۔“

اس کے ہاتھوں میں اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھ دیے کھڑی بہارے اس بات پہ چونکی، پھر ایک انوکھی سی چٹک اس کے چہرے پہ اُٹھ آئی۔

”ہاں بہارے، ہو سکتا ہے، زندگی کے کسی موڑ پہ، کسی شاپنگ مال میں، کسی ریستورنٹ میں، کسی فلائٹ کے دوران، ہم کئی سال بعد

اچانک سے ایک دوسرے سے ٹکرا جائیں۔ زندگی میں سب کچھ ممکن ہوتا ہے۔“

”ہاں واقعی!“ مگر پھر اس کا چہرہ ذرا سا بجھا۔ ”لیکن میں تمہیں کیسے پہچانوں گی؟ تم تو نقاب کرتی ہو۔“

”اگر قدرت نے ہمیں کسی ناممکن کنڈیشن میں آنے سامنے کر دیا تو پہچان بھی وہ کرادے گی۔“

اب کے بہارے کھل کر مسکرائی۔ بہت دیر بعد اس نے بہارے کے معصوم، اُداس چہرے پہ وہ مسکراہٹ دیکھی تھی۔

”حیا سلیمان، بہارے گل تم سے بہت پیار کرتی ہے!“ اس نے باری باری حیا کے دونوں رخسار نقاب کے اوپر سے چومے۔

اور پھر.....

بہارے گل چلی گئی۔

زندگی کا ایک باب ٹھک سے بند ہوا۔

جہاں کی جاب کا اصول تھا کہ ایک اسائنمنٹ ختم ہو جانے کے بعد اس سے متعلق تمام کلائنٹس سے تعلقات قطع کر دیے تھے، ہاں اگر جاب کے دوران دوبارہ کسی دوسرے اسائنمنٹ کے لیے ان تعلقات کی ضرورت پڑے تو ان کو پھر سے بحال کیا جاسکتا تھا۔ بس ایک موبوم ہی امید تھی وہ بھی، کہ شاید یوں کبھی وہ چاروں پھر اکٹھے ہو سکیں، مگر بہت موبوم..... جیسے تیز آندھی میں عثمانی موسمِ باری کا شعلہ.....

☆ ☆ ☆

کھڑکی سے چمن کر آتی روشنی کتاب کے صفحوں پہ پڑ رہی تھی جو اس نے اپنے سامنے پھیلا رکھی تھی۔ وہ الفاظ پہ نگاہیں مرکوز کیے ہوئے بھی ان کو نہیں پڑھ رہی تھی۔ ذہن کہیں اور تھا۔ دل میں بھی عجیب اداسی چھائی تھی۔ جب تک بہارے نے نہیں آنا تھا، وہ یونہی افسردہ رہتی۔ یہ وہ وجہ تھی جس سے وہ خود کو بھلا لیتی، کہ ہاں، یہ اداسی صرف بہارے کی وجہ سے ہے۔ مگر وہ جانتی تھی کہ جب وہ آ جائے گی تو بھی یہ افسردگی رہے گی۔ بس تب جب ختم ہو جائے گی، بہانہ ختم ہو جائے گا۔

کھڑکی کی جالی سے ہوا کا تیز جھونکا آتا تو کتاب کے صفحے اس کے ہاتھ میں پھڑپھڑا کر رہ گئے۔ اس کی زندگی کا ایک باب بھی کتاب کے اس صفحے کی مانند تھا جسے کسی نے بے دردی سے پھاڑ دیا ہو، یوں کہ کوئی نشان، جلد سے لگا کاغذ کا کوئی ٹکڑا باقی نہ رہا ہو۔ عاتشے گل نے کتاب بند کر کے تپائی پہ ڈال دی۔ اس کا دل کسی شے کے لیے نہیں چاہ رہا تھا۔

زندگی کا وہ باب..... عبدالرحمن پاشا..... ایک انجمنی جوان کی زندگیوں میں آیا، اور پھر ان کی پوری زندگی بن گیا۔ وہ کتنا اچھا، کتنا سلجھا ہوا، ویل میزڈ اور فاسٹ پسند آدمی تھا۔ اس کی ہر چیز پرفیکٹ ہوتی تھی۔ وہ اس کے ساتھ بھی بہت اچھا تھا۔ اس کی رائے کو اہمیت دیتا، اس کی سمجھداری و ذہانت کی قدر کرتا۔ جب عثمان بے نے اپنے بیٹے کا رشتہ پاکستان میں طے کر دیا اور سفیران سے ناراض ہو گیا تھا، تب عبدالرحمن کے کہنے پہ ہی اس نے سفیر سے بار بار اس موضوع پہ بات کی تھی۔ عبدالرحمن کو جب بھی کوئی خاص کام ہوتا، وہ اس کے پاس آیا کرتا تھا۔ جیسے اس رات وہ حیا کو لے کر آیا تھا جب اس کے بالوں پہ ویکس گری تھی۔

اس رات تو وہ اسے عبدالرحمن لگائی نہیں تھا۔ اتنا زلفِ حلیہ، بے چین، مضطرب، بکھر، بکھر اسل، مگر جب اس رات کی صبح ہوئی، تو وہ وہی پرانے والا عبدالرحمن بن گیا، بلکہ وہ بن گیا جو وہ اس تھپڑ کے بعد بنا تھا۔

اچھی لڑکیاں جلد بازی نہیں کرتیں، مگر اس سے ہو گئی تھی۔ وہ تھپڑ اس کے اور عبدالرحمن کے درمیان ایک ایسی سرد دیوار بن گیا جسے وہ کبھی پاٹ نہ سکی۔ اس نے عاتشے کو اس تھپڑ کے لیے کبھی معاف نہیں کیا تھا، اور اب تو وہ ان سے بہت دور جا چکا تھا۔

بہارے، آنے اور وہ خود، وہ سب اس کو بھلا دیں؟ کیا؟ پاشا بے تو اپنے کاموں میں مصروف سطحی سا آدمی تھا، مگر آنے؟ اس نے نگاہ اٹھا کر دیکھا۔

کمرے کے دوسرے کونے پر آنے بیٹھی سویٹر ٹرن رہی تھیں۔ پچھلے، اور اس سے پچھلے، دونوں سرمایوں نے عبدالرحمن کے لیے سویٹر بنے تھے، اس دفعہ بھی وہ اپنی روٹین ڈہرا رہی تھیں۔ وہ دیکھتی تھی کہ کس طرح آنے فون کی بیل، دروازے کی دستک، اور ہر آہٹ پہ چونکتیں، پھر عبدالرحمن کی خیر خبر نہ پا کر مایوسی سے اپنا کام کرنے لگتیں۔ کیا وہ سب ایک نارمل زندگی گزار پائیں گے؟ شاید ہاں۔ شاید نہیں۔

مگر ابھی اسے کیا کرنا ہے؟

اس نے بلاؤز کی جیب سے وہ تہہ کیا ہوا کاغذ نکالا، اور اسے کھولا۔ یہ ترکی کی امانت تھا۔ کیا اسے یہ امانت لوٹا دینی چاہیے؟ اس نے گردن پھیر کر کیلنڈر کو دیکھا۔ آج ہفتہ تھا اور یہ معلومات پرسوں، یعنی پیر اور منگل کی درمیانی شب کے بارے میں تھیں۔ اب

صحیح وقت آن پہنچا تھا۔

وہ ایک فیصلے پہ پہنچ کر ابھی اور اپنا پرس اٹھالیا۔

قریباً آدھے گھنٹے بعد وہ اپنے گھر سے بہت دور ایک پے فون پہ کھڑی، کارڈ ڈال کر ایک نمبر ملا رہی تھی۔

(دیکھ لو عبدالرحمن، عائشے گل کیا کر سکتی ہے!)

ریسرکان سے لگائے، اس نے وہ تہہ کیا ہوا کاغذ سامنے کھول کر رکھ لیا۔ ساتھ ہی کلائی پہ بندوقی گھڑی دیکھی۔ ان کو اس کی کال ٹریس کرنے میں نوے سیکنڈ لگتے تھے۔ وہ اسی ویں سیکنڈ کال کاٹ دے گی۔

کال ملنے کے دسویں سیکنڈ میں اس کا رابطہ موجودہ کمانڈر سے ہو گیا۔

”میرے پاس آپ کے لیے ایک ہے۔“

”آپ کون اور کہاں سے بول رہی ہیں؟“ بھاری آواز والے مرد نے کال لمبی کرنے کی کوشش کی تھی۔

”جھوٹ بولنا نہیں چاہتی اور ظاہر ہے سچ بتاؤں گی نہیں۔ میرا وقت ضائع مت کریں۔ وہ ٹپ (خبری) سنیں جو میرے پاس ہے۔“

وہ تیزی سے بولی۔

پچیس سیکنڈ!

دل تھا کہ اندر زور سے دھڑک رہا تھا۔

”جی..... جی..... کیسے۔“ دوسری جانب کال ریکارڈ کی جانے لگی تھی۔ ریڈارٹ۔

”مشکل اور پیری کر دمیانی شب دو بج کے قریب کیلیس سے تین کلومیٹر دور، ترکی اور شام کی سرحد کو کوئی کر اس کرے گا۔ اس کے بہت سے نام ہیں، مگر میں آپ کو وہ نام بتاؤں گی جو آپ جانتے ہیں۔“

چالیس سیکنڈ.....

”کون سی چوکی کے قریب سے؟“ وہ نوٹ کر رہے تھے۔

عائشے جلدی جلدی وہ تمام چیزیں دہرائے گی جو اس نے کاغذ پہ لکھ رکھی تھیں۔ چھوٹی چھوٹی باتیں، جواہم تھیں۔

”اطلاع دینے کا شکریہ، کیا آپ کو یقین ہے کہ وہ اپنا پروگرام نہیں بدلے گا؟“

اسی سیکنڈ.....

”نہیں۔ مہربا!“ اس نے کھٹ سے ریسور رکھا، اور پھر دل پہ ہاتھ رکھ کر چند گہری سانسیں اندر اتاریں۔

اللہ، اللہ! اس نے کر ہی دیا۔ یہ تو ذرا بھی مشکل نہ تھا۔

اب وہ آہستہ آہستہ سانس لیتی اپنے پھوٹے تنفس کو بحال کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ دل تھا کہ بُری طرح دھڑک رہا تھا۔

(عبدالرحمن..... دیکھو، عائشے گل کیا کچھ کر سکتی ہے!)

وہ پلٹی اور سر جھکائے، تیز تیز چلتی کیب اسٹینڈ کی جانب بڑھ گئی۔ اسے جلد سے جلد گھر پہنچنا تھا تاکہ آنے کو شک نہ پڑے۔

☆ ☆ ☆

چھت سے گھسلی، گرے اسپورٹس کار کشادہ ہائی وے پہ دوڑتی جا رہی تھی۔ وہ کہنی دائیں طرف کھلی کھڑکی پہ دکائے، بند مٹی سے گال کو سہارا دیے، آنکھیں موندے کچی کچی نیند میں تھی۔ گرم ہوا سے سیاہ اسکارف پھڑ پھڑا رہا تھا۔ دفعتاً کار کو ذرا سا جھکا لگا تو اس کا چہرہ آگے کوڑھکا مگر اگلے ہی پل وہ آنکھیں کھول کر، سنبھل کر پیچھے ہوئی۔

سامنے، لمبی ہائی وے کے افق پہ سورج طلوع ہو رہا تھا۔ ہوا میں گرمی کی شدت بڑھ گئی تھی۔ سڑک کے دونوں اطراف خشک ویرانہ تھا۔

دور پہاڑ تھے۔

”میں سو گئی تھی؟“ اس نے آنکھیں ملتے جیسے خود سے پوچھا۔

”نہیں مادام، آپ کل رات سے ڈرائیو کر رہی ہیں۔ سو تو میں رہا تھا۔“

حیائے بائیں جانب دیکھا۔ جہان اسٹیزنگ و ہیل پہ دونوں ہاتھ رکھے، ڈرائیو کر رہا تھا۔ نیلی جیپز پہ نیلی ڈریس شرٹ کے آستین کھینچوں تک موڑے، آنکھوں پہ سیاہ گلاسز لگائے، جن کے سائڈ سے آنکھ کے قریب زخم کا نشان صاف نظر آرہا تھا۔

”کیا ہم کیلیس پہنچ گئے؟“ اس نے گردن اودھرا دھڑ پھیری۔ موٹر وے کے اعتراف کا مخصوص ویران علاقہ۔

”نہیں، سو جاؤ۔ جب پہنچیں گے تو تمہیں اٹھا دوں گا۔“

”ہوں!“ حیائے اثبات میں سر ہلایا اور گردن سیٹ کی پشت سے ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ جہان نے نگاہ پھیر کر اسے دیکھا اور پھر

افسوس سے سر جھٹکا۔

”حیا خانم، فرنٹ سیٹ پہ بیٹھنے کے جو ethics آتھیں ہوتے ہیں، ان میں دوسرا نمبر کس چیز کا ہوتا ہے؟“

”میں نے سیٹ بیلٹ پہن رکھی ہے۔“ بند آنکھوں سے کہتے، اس نے ہاتھ سے اپنی سیٹ بیلٹ کو چھو کر یقین دہانی کی۔

”وہ پہلا اصول ہے۔ دوسرا فرنٹ سیٹ پہ سونے کی ممانعت کے حوالے سے ہے۔“

نیند ویسے ہی کھل گئی تھی، اوپر سے اس کے منہ سے آنکھیں کھول کر پوری طرح جاگ کر سیدھی ہوئی۔

”تمہارے منہ سے آتھیں کس کا ذکر کرتا خوبصورت لگتا ہے نا جہان!“

”کیوں؟ چند ایک باتوں کے علاوہ میں ایک بہت ڈیسنٹ آدمی ہوں!“ وہ بُرا مان گیا۔ حیائے بہت حیرانی سے اسے دیکھا۔

”ٹھیک یو ویری گج جہان سکندر، ورنہ میں انفرہ سے یہاں تک یہی سوچتی آ رہی ہوں کہ یہ کاتہماری اپنی ہے یا چوری کی؟“

جہان نے ایک خفا نگاہ اس پہ ڈالی، اور ”رینٹ کی ہے۔“ کہہ کر سامنے دیکھنے لگا۔

”ہم کیلیس کب پہنچیں گے؟“ اس نے ذرا کسلندی سے پوچھا۔

”ڈرائیو میں کر رہا ہوں، تم تو سوئی آئی ہو، پھر؟“

”ایک تو پتہ نہیں ہر ڈرائیو کرنے والا یہ کیوں سمجھتا ہے کہ اس کے علاوہ باقی تمام مسافر تھک نہیں سکتے۔“

”اوہ تمہارا پاؤں تو نہیں دکھ رہا؟“

”نہیں ٹھیک ہے۔ اور تمہارا سر درد؟“ اس نے پھر سے جارحیت کے پردے میں دفاع کیا۔

”میں ٹھیک ہوں!“ حیائے اس بات پہ گردن موڑ کر بغور اس کا چہرہ دیکھا۔

”آخری دفعہ کب بولا تھا؟“

”ابھی دس سینڈ پہلے جب میں نے کہا کہ میں ٹھیک ہوں۔“

وہ جانتی تھی کہ اگر اس کے سر میں درد تھا، تب بھی وہ نہیں بتائے گا۔

چند لمحے خاموشی سے گزرے۔ باہر چلتی گرم ہوا کے تھپڑوں کے سوا کوئی آواز نہ سنائی دیتی تھی۔

”ہم کیلیس کب پہنچیں گے؟“ اس نے اب کذرا کتا کر کوئی تیسری دفعہ پوچھا۔

”دو گھنٹے مزید لگیں گے۔ میں نے نہیں کہا تھا کہ آؤ۔ تم خود مقرر تھیں۔“

”شکایت تو نہیں کر رہی۔ ٹائم ہی پوچھ رہی ہوں۔“

”کوئی ستر ہویں دفعہ پوچھ رہی ہو۔“ وہ باقاعدہ بُرا مان گیا تھا۔ ”اور تم تو کپاد کیہ دیکھنے آئی تھیں۔ پھر کیلیس آنے کی کیا

ضرورت تھی؟“

”میری مرضی!“ اس نے بے نیازی سے شانے اچکائے۔ یہ کہہ نہیں سکتی تھی کہ وہ اس کو اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔ اسے ڈرتا تھا کہ وہ

اسے کھوندے۔

کار اسی طرح سنسان سڑک پہ دوڑ رہی تھی۔ شاذ و نادر آس پاس سے اکا دکا گاڑی گزر جاتی، ورنہ ہر سونہری سی خاموشی تھی۔

”ہم کیلیس میں کہاں رہیں گے؟“ کبھی کبھی بہارے گل بننے میں حرج نہیں ہوتا، سو اس نے پھر سے سوال کیا۔

”ایک سیف ہاؤس ہے۔ رات وہیں رہیں گے۔ آج تو ارہ ہے۔ کل پیر کا دن بھی وہیں گزاریں گے۔ پھر میں کل رات بارڈر پہ چلا جاؤں گا، اور تم پرسوں صبح استنبول چلی جاؤ گی۔ پھر پرسوں رات تم پاکستان کی فلائٹ لے لو گی۔ اب اگر کبھی ہو تو اکسبر دیں دفعہ سارا پلان دہرا دیتا ہوں۔“

”اتنی بڑی لگ رہی ہوں تو نہ لاتے مجھے۔ تم نے ایک دفعہ بھی منع نہیں کیا اور فو راضی ہو گئے۔ تم اندر سے خود ہی چاہتے تھے کہ میں تمہارے ساتھ آؤں!“

”واہ..... یہ سن کر میری آنکھیں بھر آئیں۔“ جہان نے مسکراہٹ دبائے سر جھٹکا۔ وہ یقیناً اس کے سونے سے بور ہو رہا تھا اور چاہتا تھا کہ وہ جاگ جائے، اور جلی کٹی ہی سنائے، مگر بولتی رہے، مگر مجال ہے جو یہ ادبی اعتراف کر لے۔

وہ خفگی سے رخ موڑے بائیں طرف باہر دیکھتی رہی۔ پاکستان میں ڈرائیونگ سیٹ دائیں طرف ہوتی تھی، مگر ترکی میں بائیں جانب تھی، سو وہ جہان کے دائیں بیٹھی تھی۔

سورج اب پوری طرح سے نکل آیا تھا۔ کل رات، جب انفرہ میں ہوٹل سے جہان نے اسے پک کیا تھا، تب سے اب تک وہ حلیف سفر میں تھے۔

”ویسے اب بتاؤ، دنیا کا سب سے خوبصورت شہر کون سا ہے؟“ وہ اسے چھبھڑ رہا تھا۔

”اسلام آباد!“ وہ بے نیازی سے بولی۔

”اچھا!“ اسٹیرنگ وھیل گھماتے ہوئے جہان نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”اور ہیلین آف ٹرائے کے“ ٹرائے“ کا ذکر تو سنا ہوگا تم نے؟“

”ہاں، اس کا یہاں کیا ذکر؟“ وہ دو نظر آتے پہاڑوں کو دیکھ کر بولی۔

”ٹرائے کا تاریخی شہر ترکی میں ہی واقع ہے۔ ہاں، وہ ہیلین آف ٹرائے کی کہانی ترکی کی ہی ہے۔“

”اچھا!“ جہان نے اپنے تئیں اسے متاثر کرنے کی کوشش کی مگر حیا نے ذرا اثر نہیں لیا۔ وہ ابھی ڈی جے کی دوست ہونے کا حق ادا کرنا چاہتی تھی۔

جہان کچھ دیر دانت سے لب دبائے کچھ سوچتا رہا، پھر ایک دم اس نے گردن موڑ کر حیا کے اس طرف دور سے دکھائی دیتے پہاڑوں کو دیکھا، اور ایک مسکراہٹ اس کے لبوں پہ آ گئی۔

”اس پہاڑ کا نام معلوم ہے تمہیں؟“

حیا اس طرف دیکھ رہی تھی، بس ذرا سے شانے اچکائے۔

”نہیں۔“

”وہ ماؤنٹ نروت ہے۔“ کہہ کر جہان نے اس کے تاثرات دیکھے۔

”اچھا!“ وہی بے نیازی۔

”نہیں، تم نہیں سمجھیں۔ یہ ماؤنٹ نروت ہے۔ نروت کو تو جانتی ہو گی تم؟“

”کون؟“ اس کے لبوں سے پھسلا۔ پھر یاد آیا، ترکوں کے جو نام ”ت“ پہ ختم ہوتے تھے، وہ ہمارے ہاں ”ڈ“ پہ ختم ہوتے تھے۔ امت سے بنا احمد، مولوت سے بنا مولود، اور نروت سے بنا.....

”نمروڈ؟ بادشاہ نمروڈ؟“ وہ چونکی۔

”ہاں، وہی نمروڈ۔ اور یہ وہی پہاڑ ہے جہاں نمروڈ نے ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں اتارا تھا۔“

”اللہ، اللہ، یہ وہ پہاڑ ہے؟ وہ پہاڑ ترکی میں ہے؟“ اس کو حیرت کا جھٹکا سالگ تھا۔ وہ فوراً سیدھی ہو بیٹھی۔ وہ بھورسا پہاڑ، جو ان سے بہت دور تھا، کافی دیر سے ان کے ساتھ چلا آرہا تھا۔

یہ تھا وہ پہاڑ؟ وہ پانچ ماہ سے ترکی میں تھی اور اسے کبھی یہ نہیں پتا چلا کہ وہ سارا قصہ، وہ سب آج کے ترکی میں ہوا تھا؟ جہاں اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر آسودہ سا مسکراتے ہوئے ڈرائیو کر رہا تھا، اور وہ اپنا اسلام آباد بھلائے، بنا پلک جھپکے اسی پہاڑ کو دیکھ رہی تھی۔

وہ چار ہزار سال پرانا قصہ، وہ جس کا ذکر قدیم مقدس کتابوں میں ملتا ہے، وہ اس پہاڑ پہ پیش آیا تھا۔ بالکل اسی پہاڑ پہ۔ جب ہم سب کے ابراہیم علیہ السلام کو، ابراہیم علیہ السلام کو جنہیں یہود، عیسائی اور مسلمان سب اپنا پیغمبر مانتے ہیں، ان کو آگ میں ڈالا گیا تھا۔ اس آگ میں جو جلا دیتی ہے۔ جو رکھ کر دیتی ہے۔ مگر وہ آگ ان کے لیے گلزار بن گئی تھی۔ نرم گلابوں کی طرح۔

لیکن پھر ہر کسی کے پاس قلب سلیم تو نہیں ہوتا نا۔ اور جانے اس سلیم دل کو حاصل کرنے کے لیے پہلے انسان کو کتنا جلنا پڑے، یہاں تک کہ آگ اس پہ اثر کرنا چھوڑ دے۔ ہاں، تپش اثر کرنا چھوڑ دیا کرتی ہے جب جل جل کر انسان کندن بن جاتا ہے، اور پھر لوگ پوچھتے ہیں کہ آپ کو عیالیا میں گرمی نہیں لگتی اور جابی لڑکی حیران ہوئی ہے کہ گرمی؟ کون سی گرمی؟

اس نے بے اختیار اپنے بازو کے اوپری حصے کو چھوا، جہاں داغ گئے تین حروف آج بھی ویسے ہی تھے۔ WHO؟ وہ کون تھی؟ ہاں، بہت گناہگار، بہت غلطیاں کرنے والی جی سہی۔ بہت نافرمان قسم کی مسلمان ہی سہی، مگر سامنے اس پہاڑ پہ نقش تاریخ سے ”ایک امت ہوئے“ کا شریک تو تھا ہی۔ اور زندگی میں بعض لمبے ایسے ہوتے ہیں جب کسی مسلمان کو خون کے اگلنے جوش، بازو پہ کھڑے ہوتے روگٹوں اور فرط جذبات سے بھیکتی آنکھوں کے ساتھ اپنے مسلمان ہونے پہ بہت فخر محسوس ہوتا ہے۔ اس کے لیے بھی وہ ایک ایسا ہی لمحہ تھا۔



کیلیس قریب آیا تو نمروت داغ (کوہ نمروت) دور ہوتا گیا، مگر اس کا سحر ابھی تک قائم تھا۔ جہاں بتا رہا تھا کہ نمروت داغ پہ نمروت کے بڑے بڑے مجسمے بنے ہیں، جن کے سر کاٹ دیے گئے ہیں۔ اب وہ کئے ہوئے سر پہاڑ کے قدموں میں جا بجا پڑے ہیں، اور سچا ان پہ اسٹونل کی طرح بیڑھ کر تصاویر بنوا رہے ہیں۔ جو سر جھکتے نہیں، وہ اسی طرح کاٹ دیے جاتے ہیں۔ چلو، وقت انسان سے جو بھی چھینے، کم از کم اس بات کا فیصلہ تو کر ہی دیا کرتا ہے کہ کون تاریخ کے درست طرف تھا اور کون غلط طرف۔

کیلیس سے ذرا دور، وہ ایک گیس اسٹیشن پہرے کے تو جہاں نے کہا کہ وہ ادھر موجود اسٹور سے گفٹ لینا چاہتا ہے۔ کس کے لیے؟ اس نے نہیں بتایا۔ یقیناً اپنے میزبانوں کے لیے۔ وہ بھی کار سے نیچے اترا آئی۔

اسٹور میں آ کر وہ پرفیوم والے ریک کی طرف چلا گیا۔ خالص زنانہ پرفیومز۔ اسے شبہ ہوا کہ وہ کسی لڑکی کے لیے شاپنگ کر رہا ہے۔ عجیب سا لگا۔ خبر۔ وہ میک اپ سیکشن میں کاسمیٹکس الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ پھر یاد آیا کہ کاجل خریدنا تھا، اس کا کب سے ختم ہو چکا تھا۔ اب استعمال بھی ذرا کم کرتی تھی۔ پتہ نہیں یہاں سے کیسا ملے۔

کاجل اسٹکس کی نوکری سے جیسے ہی اس نے ایک کاجل اٹھایا، ایک یاد چمپ سے آنکھوں کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ ترکی آنے سے قبل وہ چند روز جب اس نے اور ڈی جے نے اکٹھی شاپنگ کی تھی۔ انہی میں سے ایک دن وہ دونوں ایک شاپ کے کاسمیٹکس سیکشن میں کھڑی تھیں۔

”حیا..... سب سے اچھا اور اعلیٰ میک اپ برانڈ کون سا ہے؟“ اس نے لپ گلاس ہونٹوں پہ لگا کر چیک کرتی حیا کو ماہر تصور کر کے پوچھا تھا۔

”Mac میک!“ اس نے مصروف سے انداز میں جواب دیا۔

”آہاں! ڈی جے سیز گرل کی طرف مزی۔“ ”ایک میک کا کاجل دکھا دیں۔“

سیز گرل نے فوراً میک کا کاجل نکال کر سامنے کیا۔

خوبصورت ڈبی، جدید انداز۔ ڈی جے کی آنکھوں میں ستائش ابھری۔

”کتنے کا ہے؟“ اس نے الٹ پلٹ کر ڈبی دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”آٹھ سو روپے کا۔“

ڈی جے کا منہ کھل گیا۔

”یہ ایک آٹھ سو روپے کا؟“

سیلز گرل نے شائستگی سے اثبات میں سر ہلایا۔

ڈی جے نے ہاتھ میں پکڑے کا جل کو دیکھا، اور پھر سیلز گرل کو۔ پھر حیا کی طرف ہو کر سرگوشی کی۔

”Be Pakistani and Buy Pakistani“ ساتھ ہی ٹھک سے کا جل کا ڈنر پہ رکھ کر قطعیت سے سیلز گرل سے

بولی۔

”دکھائیں بھی وہی اپنا مینیتیس روپے والا ہاشمی کا جل۔“

منظر نگاہوں کے سامنے سے تحلیل ہو گیا، اور نگاہیں دھندلا گئیں۔ پھر بھی وہ دھیرے سے ہنس دی اور آنکھیں رگڑیں۔ یادیں..... جو

بھی چھپا نہیں چھوڑ تیں۔

وہ کا جل لیے بغیر (کراپ پاکستان جا کر ہی لے گی) جہان کی طرف چلی آئی۔ وہ ایک پرفیوم خرید چکا تھا اور اب بے منٹ کر رہا تھا۔

”اتنا چھوٹا سا اسٹور ہے، تمہیں کیسے پتہ کہ اتنا مہنگا پرفیوم جو لے رہے ہو وہ اور تھینل ہے یا نقل؟“ جہان کو نوکنا تو می فریضہ تھا اس

کے لیے۔

جہان نے بقایا پیسے واپس پکڑتے ہوئے مرکز سنجیدگی سے اسے دیکھا اور پھر لفافے سے پرفیوم نکال کر، ڈبی سے شیشی باہر نکالی۔ پھر

شیشی کی اسپرے نوزل اپنی انگلی کے قریب لے جا کر اسپرے کیا۔

”دیکھو، یہ کتنا فائن اور برابر اسپرے ہوا ہے۔ اگر نقلی ہوتا تو ذرا پچکودی کی صورت اسپرے ہوتا۔ اور میں نے کئی بار پریس کر کے دیکھا

ہے کیونکہ پہلی دفعہ میں تو اور جنبل پرفیوم پریس کرنے پہ بھی اسپرے اتنا فائن نہیں ہوتا۔“ اس نے ہاتھ پہ لگی خوشبو کو انگلیوں سے مسلا، پھر شیشی کا

نوزل حیا کے سامنے کیا۔ ”دیکھو یہ نوزل کتنا پتلا ہے، اور جنبل پرفیوم کا ہمیشہ پتلا ہوتا ہے، جبکہ اسی برانڈ کے نقلی پرفیوم کا نوزل ذرا کھلا ہوگا۔“ پھر وہ

شارپ میں پرفیوم ڈالٹا پلٹ گیا۔

اس نے بس اثبات میں سر ہلادیا۔ اس آدمی کے پاس ہر مسئلے کا حل ہوتا تھا!

جب وہ کیلیس کی گلیوں میں سے گزر رہے تھے تو وہ سوچنے لگی کہ کیسے، آخر کیسے اس کے پاس ہر مسئلے کا حل ہوتا تھا؟ یہ ساری باتیں

کوئی سکھا تو نہیں سکتا۔ یہ خود بھی جاتی ہیں۔ تجربے سے۔ مشاہدے سے۔ ہاں، وہ یقیناً کسی مسئلے کی وجہ سے اکتا جاتا ہوگا، مگر پھر عام لوگوں کی

طرح اس چیز کو ٹھپ کر کے نہیں بیٹھ جاتا ہوگا، بلکہ اس کا حل ڈھونڈنا ہوگا۔ اور ڈھونڈنے سے تو سب مل جایا کرتا ہے۔ ہاں، وہ اسٹرگل کرنے والوں

میں سے تھا۔ وہ اس سے متاثر ہوئی تھی۔ مگر خیر، یہ بات اسے کہے گی تو وہ بھی نہیں۔

کیلیس چھوٹا سا قصبہ تھا۔ تنگ مگر صاف گلیاں، خانچہ فروش، پھلوں سبزیوں کی ریزہ حیاں، پاکستان کے کسی چھوٹے شہر جیسا، مگر

زیادہ صاف ستھرا قریب آدھے گھنٹے بعد وہ ایک ایسی ہی گلی میں ایک گھر کے دروازے پہ کھڑے تھے۔ دستک دینے کے چند لمحوں میں ہی دروازہ

کھل گیا۔

”مرحبا!“ معمر خاتون نے مسکراتے ہوئے سلام کیا۔ مسکراہٹ کا پتہ آنکھوں سے چلا، ورنہ انہوں نے کھلے اسکرٹ اور لمبے بلاؤز

کے اوپر اسکارف سے نقاب لے رکھا تھا۔

”مرحبا!“ ساتھ ہی جہان نے حیا کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ خاتون راستہ چھوڑ کر کھڑی تھیں۔ حیا نے ذرا جھجک کر جہان کو دیکھا،

پھر ان خاتون کو سر کے اثبات سے سلام کا جواب دیتی اندر داخل ہوئی۔

چھوٹا سا مچن۔ آگے کمرے کا دروازہ تھا۔ برآمدہ وغیرہ نہیں تھا۔ وہ تینوں دروازے تک ساتھ آئے۔ چوکھٹ پہ جہان جھک کر بوٹ

کے تھے کھولنے لگا، پھر جھکے جھکے، گردن اٹھا کر آنکھوں سے حیا کو ذرا نگلی سے اشارہ کیا۔

”اوہ!“ وہ جلدی سے آگے بڑھی، اور نقاب اتارتے ہوئے تعظیماً ان خاتون کا ہاتھ لے کر چوما اور آنکھوں سے لگایا۔
 ”یہ میری بیوی ہے، حیا!“ وہ اب جوتے پیروں سے نکال رہا تھا۔ خاتون نے مسکراتے ہوئے اسے دعا دی۔ عمر میں برکت اور نعمتوں کی بقا کی دعا۔

وہ مسکراتے ہوئے دوبارہ نقاب کرنے لگی تو وہ سیدھا ہوتے ہوئے بولا۔ ”یہاں اور کوئی نہیں ہے، اتار دو۔“ پھر ان خاتون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ ”یہ مریم خانم ہیں۔ میرے دوست علی کرامت کی والدہ۔“
 حیا کو حیرت کا جھٹکا لگا۔

اللہ، اللہ، یہ تھیں وہ؟ حد ہے، جہان نے بتایا ہی نہیں۔

”بہت خوش ہوئی آپ سے مل کر۔“ وہ واقعی خوشی سے بولی تھی۔ وہ خاتون مسکراتے ہوئے سر ہلا کر پھر انہیں اندر لے گئیں۔

جب وہ ایک فرشی نشست والے کمرے میں آئیٹھے تو وہ بہت اشتیاق سے کہنے لگی۔

”مجھے جہان نے بہت دفعہ آپ کے بارے میں بتایا تھا، کرامت بے، آپ کے ہر بند کی درکشاپ تھی نا، استنبول میں۔ اب کہاں ہوتے ہیں وہ؟“

اس سوال پر مریم خانم کی مسکراتی آنکھیں ذرا نمیں، انہوں نے جہان کو دیکھا اور جہان نے حیا کو۔

(کیا کچھ غلط پوچھ لیا؟)

”ان کی ڈیجھ ہو چکی ہے بیٹا۔“ وہ بولیں تو آواز سگوار تھی۔

”اوہ۔ اللہ مغفرت کرے۔“ اسے پچھتاوا ہوا۔ پھر موضوع بدلنے کی غرض سے بولی۔ ”اور..... آپ کی ایک جیٹھانی بھی تھیں، فریج۔“

جہان کو بہت پسند تھیں وہ۔ بتایا تھا اس نے مجھے کہ وہ بہت خوبصورت تھیں۔ وہ لوگ استنبول میں ہوتے ہیں کیا؟“

”خانم ہم کھانا کھائیں گے، مگر کوئی تکلف مت کیجئے گا۔ جو بنا ہے لے آئیں۔“ وہ ذرا اونچی آواز سے بولا۔ حیا خاموش ہو گئی۔ پھر

کچھ غلط پوچھ لیا تھا شاید۔

”ہاں تم بیٹھو، میں کھانا لاتا ہوں۔“ اس کی اپنائیت پہ ان کی پھینکی پڑی مسکراہٹ دوبارہ زندہ ہوئی اور وہ باہر چلی گئیں۔

”کتنا بولتی ہو تم۔“ وہ جھنجھلا کر اس کی طرف پلٹا، جو گاؤں کیے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ ”جو پوچھنا ہے مجھ سے پوچھ لو مگر ان سے

نہیں۔“

”تم تو جیسے فوراً بتا دو گے نا؟ اتنے گھٹنے ہو گئے سفر میں، ایک دفعہ ذکر نہیں کیا تم نے کہ ہم علی کرامت کے گھر جا رہے ہیں۔“

”فریج نے نئی سال پہلے خودکشی کر لی تھی، اور اس سے پہلے اس نے ان کے شوہر کو قتل کر دیا تھا۔“

وہ جو فکری سے بولتی جا رہی تھی، اس کی بات پہ دھچکا سا لگا۔

”اللہ، اللہ!“ ششدری ہو کر اس نے جہان کو دیکھا۔ ”مگر کیوں؟“

جہان نے شانے اچکائے۔

”زمین جائیداد کا مسئلہ تھا شاید۔ یہ لوگ اب یہیں رہتے ہیں۔ ان کے حالات بھی اچھے نہیں ہیں۔ علی کرامت آج کل ادھر نہیں ہوتا۔“

لیکن اب یہ ٹاپک ان کے آگے مت چھیڑنا۔“

”اوکے، میں چپ ہوں۔“ اس نے کندھے جھٹکے۔ یونہی لگا کہ جہان اصل وجہ جانتا ہے اور چھپا گیا ہے لیکن پوچھنے کا فائدہ نہیں تھا۔

”تم مریم خانم کے لیے لائے ہو پرفیوم؟“ اس نے پھر سوال کیا۔ حالانکہ ابھی اس کے سامنے ہی تو جہان نے ان کو وہ گفٹ بیگ تمھایا تھا۔

”ہاں، ان کو خوشبو پسند ہے، جب میں چلا جاؤں گا تو وہ اسے ضرور استعمال کریں گی اور انہیں اچھی بھی لگے گی۔“ وہ ان کا ذکر بہت

محبت اور ادب سے کر رہا تھا۔ اس کی اپنی مرہ جملہ!

پھر کھانے کے وقت مریم خانم نے دُش اس کے آگے کرتے ہوئے کہا

”جہان کو بورک بہت پسند ہے اور ایران بھی۔ تمہاری پسند کا نہیں پتہ تھا۔ کیا تم یہ کھا لو گی؟“
 ”جی بالکل۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پہلی دفعہ اسے احساس ہوا تھا کہ اسے جہان کی پسند ناپسند کا علم نہیں، کھانے کے بارے میں ہی تھی۔

(ایران ترک لسی تھی اور بورک سمو سے یا کچوری کی ہی ایک جدید شکل تھی)۔ جہان بہت شوق سے کھا رہا تھا، گو بہت زیادہ نہیں مگر خلوص اور محبت کا بھی اپنا ذائقہ ہوتا ہے۔

”تمہارا کمر اوپر تیار ہے تم آرام کر لو۔“ کھانے کے بعد وہ ہاتھ دھو کر آیا تو مریم خانم نے کہا۔
 ”جی۔“ وہ اثبات میں سر ہلاتا، رومال سے ہاتھ صاف کرتا اور حیا کو ایک نظر (جیسے کہہ رہا ہو، میں ذرا آرام کر لوں) دیکھ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ حیا نے گردن موڑ کر دیکھا۔ ادھ کھلے دروازے سے سیزر حیاں نظر آ رہی تھیں۔ وہ ان پہ چڑھتا اوپر جا رہا تھا۔ اس گھر سے جیسے وہ بہت مانوس تھا۔

”لائیں میں آپ کی مدد کر دیتی ہوں۔“ وہ ان کے ساتھ برتن اٹھانے لگی۔ کچن میں آ کر اس نے دیکھا کہ مریم خانم نے اپنا نقاب اتار دیا تھا۔ وہ واقعی سیاہ فام تھیں لیکن بھر بھی خوبصورت تھیں اور محبت پسندیدگی کو تو نہیں کہتے۔ عربی لغت میں تو محبت کہتے ہی کسی شخص کا کسی دوسرے کے نظر میں خوبصورت لگنے کو ہیں، اتنا خوبصورت کہ وہ دل میں کھب جائے اور واقعی اتنی خوبصورت تو پھر وہ تھیں ہی!۔
 ان کا گھر چھوٹا تھا، مگر سلیقے سے سجا ہوا۔ بڑے گھر تو سب سجا لیتے ہیں، اصل آرٹ تو چھوٹا گھر سجانا ہوتا ہے۔ بیٹھک سے نکل کر ایک طرف سیزر حیاں اور دوسری جانب کچن تھا۔

”تم بھی آرام کر لو، کافی تھک گئی ہو گی۔“ جب وہ کچن میں موجود پھیلاؤ اسٹینینے لگی تو مریم خانم نے بہت اپنائیت سے کہا۔ حیا نے ایک نظر کھلے دروازے سے دکھتی سیزر حیوں کو دیکھا۔ اوپر ایک ہی کمرہ ہو گا ظاہر ہے، اور کتنا بڑا لگے گا اگر وہ ابھی ادھر چلی گئی۔
 ”نہیں، اصل میں میں تو سوتی آتی تھی، ویسے بھی تھک گئی ہوں بیٹھ بیٹھ کے، اب لینے کا دل نہیں کر رہا۔“ وہ آرام کرے گا ابھی۔ میں آپ کے ساتھ بیٹھ جاؤں گی“

”چلو جیسے تمہاری مرضی۔“ وہ مسکرا کر بولی تھیں۔
 جب کچن سمیٹ لیا تو پھر وہ دونوں اس فرش نشست والے کمرے میں آ بیٹھیں۔ چند لمحے خاموشی سے گزر گئے۔ حیا کو کچھ نہیں آیا وہ کیا کہے، بنی جگہ تھی وہ بے تکلف ہونا بھی نہیں چاہ رہی تھی مگر اس گھر میں کچھ انوکھی ہی اپنائیت تھی۔
 ”کیا وہ اکثر یہاں آتا رہتا ہے؟“

”کبھی کبھی آتا ہے۔ وہ بھی پچھلے تین سال سے، جب سے اس کا کاروبار اس جگہ پہ ہو گیا ہے۔“
 اس بات پہ حیا نے غور سے ان کا چہرہ دیکھا مگر یوں لگتا جیسے وہ نہیں جانتیں وہ کونسا کاروبار کر رہا ہے۔
 ”تمہاری شادی کب ہوئی تھی؟“ انہوں نے مسکرا کر محبت سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔ وہ ذرا گڑبڑا گئی، پتا نہیں جہان نے کیا کہہ رکھا تھا پھر زبردستی ذرا سا مسکرائی۔ ”زیادہ عرصہ نہیں ہوا“

(بس بائیس سال ہونے والے ہیں)
 ”اچھا اللہ تعالیٰ تمہیں خوش رکھے۔“ وہ مسکرا کر سر ہلاتی دعا دے رہی تھیں، عربوں کی مخصوص عادت۔
 ”جہان کیا اتنے سال آپ سے کانٹیکٹ میں رہا تھا؟“

”ہاں فون کرتا رہتا تھا، دو تین برسوں سے تو آنے جانے بھی لگا ہے۔ بہت سعادت مند لڑکا ہے۔ میں کبھی بھی نہیں بھلایا۔“
 ”جی وہ بتاتا تھا آپ کے بارے میں اکثر۔ آپ تو ڈاکٹر تھیں نا، میرا مطلب، ہیں نا؟“
 ”ہاں مگر اب ہیرے گھنٹوں میں در در رہتا ہے۔ یہاں ہسپتال جاتی ہوں ہر پٹنے اور اتورائیکن آج تم لوگ آرہے تھے اس لیے نہیں گئی۔“
 یعنی کہ جہان ان کو آنے سے پہلے مطلع کر چکا تھا لیکن کیا تھا اگر اسے بھی بتا دیتا۔

ان کے ساتھ پہلے وہ تکلف میں بیٹھی تھی لیکن آہستہ آہستہ وہ باتیں کرتی گئیں تو حیا کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ وہ کہنی بھی پیچھے گاؤں کیے پے نکائے آرام سے بیٹھ گئی۔ کیلیس کی باتیں، یہاں کے لوگوں کی باتیں، پاکستان کی، زیتون کے درختوں کی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اسے مریم خانم کا گھر بہت اچھا لگنے لگا تھا۔



رات میں اس نے مریم خانم کے ساتھ مل کر کھانا تیار کر دیا تھا۔ انہوں نے آج مانتی بنائے تھے۔ عجیب و غریب سی ڈش تھی مگر مزیدار تھی۔ مریم خانم کے بقول جہان کو بہت پسند تھی۔ جب وہ دسترخوان پر برتن لگا رہے تھے تب وہ بیڑھیوں سے اترتا ہوا دکھائی دیا۔

”جہان، مجھے مریم آنٹی نے وہ کارڈ بھی دکھایا ہے جو تم نے ان کے لیے لکھا تھا۔ آنٹی آپ تو جہان کو اس سے بھی پہلے سے جانتی ہیں؟“ جب وہ اندر قالین پر آکر بیٹھا تو اس کے سامنے پلیٹ رکھتے ہوئے حیا نے مسکراہٹ وہائے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ مریم آنٹی اس کے پیچھے ٹرے لے کر کمرے میں داخل ہو رہی تھیں۔ اس کی بات پر مسکرا کر سر اثبات میں بلایا۔

”ہاں بیٹا، عرصہ ہو گیا ہے ان کے ساتھ تو۔“ انہوں نے مانتی کی ڈش دسترخوان کے وسط میں رکھتے ہوئے کہا پھر خود بھی وہیں بیٹھ گئیں تمام برتن رکھے جا چکے تھے اور ان کے گرد وہ تینوں تلوں کے تین خانوں کے طرح آنے سے سامنے بیٹھے تھے۔

”تو پھر بتائیں نا آنٹی جہان بچپن میں کیسا تھا؟“

وہ اسی طرح مسکراہٹ وہائے گاؤں کیے سے ٹیک لگا کے بیٹھی مڑے سے پوچھنے لگی۔

کھلے بال سمیٹ کر کندھے پر ایک طرف ڈالے لمبی جامنی قمیص کے اوپر شانوں پر ٹھیک سے زیتونی دوپٹہ پھیلائے وہ اس گھر کے ساتھ بہت مانوس لگ رہی تھی۔

”جہان کیسا تھا؟ ایسا ہی تھا جیسا اب ہے۔“ آنٹی ڈش اس کے سامنے کرتے ہوئے مسکرا کر کہنے لگیں۔ وہ اس دوران سر جھکائے خاموشی سے پلیٹ میں کھانا ڈال رہا تھا۔

”تو بتائیں نا، اب اور تب وہ کیسا تھا؟“

اس نے ابرو اٹھا کر سنجیدگی سے حیا کو دیکھا پھر سر جھٹک کے اپنی پلیٹ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”بھئی ایسا ہی تھا، بہت سمجھدار، بہت تیز ذرا لڑکا۔ ہماری جدیسی کے لڑکے جب کھیلتے تھے تو گیندا اکثر ہمارے گھروں کی چھت پر آ جاتی تھی۔ لڑکے بغیر پوچھے گھروں میں بھلا لگ لیتے تھے مگر یہ تو بہت اچھا بچہ تھا۔ کبھی بغیر پوچھے کسی کے گھر میں نہ داخل ہوتا، نہ بغیر پوچھے کسی کی چیز اٹھائی، کبھی کسی کی باتیں نہیں سنیں، کسی کی بات ادھر سے اُدھر نہیں کی، بہت ہی سعادت مند لڑکا تھا۔“ آنٹی بڑی محبت اور اپنائیت سے بتا رہی تھیں اور وہ منہ آدھا کھولے ہوا بکا سی سن رہی تھی جب کہ سعادت مند لڑکے نے اسی سعادت مندی سے اثبات میں سر بلایا۔

”بس اللہ کا کرم ہے خانم، میری مٹی کی تربیت بہت اچھی تھی۔“ ساتھ ہی اس نے مسکراہٹ وہائے حیا کو دیکھا جس کے چہرے کے خفگی بتا رہی تھی اسے یہ ساری باتیں بالکل بھی اچھی نہیں لگ رہی تھیں۔ وہ خاموشی سے اپنی پلیٹ میں کھانا نکالنے لگی۔ اگر وہ یہ سمجھتی تھی کہ جہان نے صرف اس کو بیوقوف بنایا ہے تو وہ غلط تھی۔ اس فہرست میں تو بہت سارے لوگ تھے۔ اللہ سمجھے اس کو۔

رات میں آنٹی کے اپنے کمرے میں چلے جانے کے بعد وہ اوپر آئی۔ گیٹ روم اچھا تھا۔ ڈبل بیڈ، نفیس بیڈ شیٹ۔ جھوٹے سے گھر کا چھوٹا سا کمرہ، بالکنی میں کھلتا دروازہ (ترکوں کے بالائی منزل کے کمروں میں بالکنی میں کھلتے دروازے ضرور ہوا کرتے تھے۔)

جہان کمرے میں نہیں تھا۔ وہ بیڈ کی پائنتی پر آکر بیٹھ گئی۔ سمجھ نہیں آ رہی تھی اب کیا کرے۔

بالکنی کے دروازے پر آہٹ ہوئی تو وہ فوراً اٹھنے لگی۔

”بیٹھو بیٹھو!“ وہ ہاتھ اٹھا کر دوکنا غلبت میں آگے آیا، کرسی کے سائیڈ سے اپنا بیگ اٹھا یا اور اسے کھولنے لگا۔ حیا اٹھتے اٹھتے واپس بیٹھ گئی۔

”تم سو جاؤ، مجھے ذرا کام ہے۔“ اپنے بیگ سے اپنا لیپ ٹاپ نکالتے ہوئے اس نے حیا کو کہا۔ لیپ ٹاپ کو اپنے سامنے کھول کر وہ اب کچھ سی ڈیز نکال کر لائٹ پلیٹ کرنے لگا تھا۔ وہ خاموشی سے اس کو دیکھنے لگی۔ ایک سی ڈی نکال کر جہان نے لیپ ٹاپ میں ڈالی۔ چند لمحے کے

لیے کچھ دیکھا پھر سی ڈی واپس نکالی، کور میں ڈالی، لیپ ٹاپ کو اٹھا کے بیگ میں رکھا اور پھر ذرا چونک کر اسے دیکھا۔ وہ ابھی تک جہان کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے دیکھنے پر ڈراگٹرز بڑا کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔

”تم سو جاؤ، میں جا رہا ہوں لیکن ان کو مت بتانا۔“ بیگ اٹھا کے زپ بند کرتے ہوئے وہ کھڑا ہوا، اسے کندھے پہ ڈالا اور پھر بالکنی کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ متشکری کھڑی ہوئی ”کب آؤ گے؟“

”صبح! اندر سے دروازہ بند کر لو، میرے پاس دوسری چابی ہے۔“ اس نے مڑے بغیر کہا اور مڑے بغیر باہر نکل گیا۔ کاش اس وقت مریم خانم سن لیتیں کہ ان کے گھر کی کتنی چابیاں ان کے سعادت مند بیٹے کے پاس ہیں۔

حیاء نے دروازہ بند کرتے ہوئے ذرا سی جھری سے باہر دیکھا۔ باہر ایک خستہ حال زینہ تھا جو گھر کی پشت پہ اترتا تھا اور پھر بیک ڈورز کی عادت تو اسے ہمیشہ سے تھی۔ اس نے دروازہ بند کر دیا اور اس کی پشت سے ٹیک لگائے کھڑے چند گہری سانسیں اندر اتاریں۔

چوبیس گھنٹے..... پورے چوبیس گھنٹے بعد وہ کیلیس کے بارڈر پہ ہوں گے۔ کل کی رات بلاشبہ ایک یا دو گار رات ہوگی۔ اس نے سوچا تھا۔

وہ اس کی سوچ سے بھی زیادہ یادگار ہوگی یہ وہ نہیں جانتی تھی۔



صبح کاسنہری دودھیا پن کیلیس کے کھیتوں اور زیتون کے درختوں کے جھنڈ پہ قطرہ قطرہ اتر رہا تھا۔ وہ کمرے میں رکھی اس واحد کرسی پر ٹیک لگا کر بیٹھی منتظر سی بالکنی کے دروازے کو دیکھ رہی تھی۔ سامنے میز پہ ناشتے کے برتن خالی پڑے تھے۔ وہ کافی دیر سے اسی پوزیشن میں بیٹھی تھی۔ اجڑک کے لمبے کرتے میں لمبوس بالوں میں ڈھیلا جوڑا بنائے۔ منتظر، مضطرب مگر پرسکون۔

دفعتاً دروازے کے کی ہول سے کلک کی آواز آئی۔ آہستہ سے دروازہ کھلا۔ پٹ دونوں ہاتھوں سے پکڑتے جہان نے دبے پاؤں اسے یوں دھکیلا کہ اس کی چڑچڑاہٹ کم سے کم سنائی دے۔ ابھی آدھا کھلا تھا کہ اس کی نگاہ سامنے بیٹھی حیا پہ پڑی۔ وہ شاید اس کے آرام کے خیال سے آہستہ کھول رہا تھا، اسے جاگتا دیکھ کر سیدھا ہوا اور اندر آ کے دروازہ بند کیا۔

”صبح بخیر۔ اٹھ گئیں؟“

”ہاں کب کی“

جہان نے اپنا بیگ بیڈ پہ رکھا۔ وہ تھکا ہوا نہیں لگ رہا تھا۔ ٹھیک ہی تھا۔ شاید رات کہیں اور سویا تھا یا شاید نہیں۔ یہ نہیں کیا کرتا رہا تھا۔ ”کیا خانم آئی تھیں؟“ وہ الماری کی طرف بڑھا جہاں اس کے کپڑے رکھے تھے۔

”ہاں ناشتہ دے گئی تھیں۔ میں نے تمہارا نہیں بتایا۔“

”اچھا، کیا بنایا ناشتے میں؟“ شاید ان کے ہاتھ کاذا انھما سے بہت پسند تھا سو ڈراگٹری سے پوچھا۔ ساتھ ہی الماری میں رکھے کپڑوں کو الٹ پلٹ کر کے دیکھ رہا تھا۔

”بورک لائی تھیں۔ ایک میز اور ایک تمہارا۔“

”تم نے اپنا کھالیا؟“

”ہاں“

”اور میرا؟“ اس نے ایک شرٹ اور تولیہ نکال کر کندھے پہ ڈالتے ہوئے ہاتھ روم کی طرف جاتے جاتے مڑ کر پوچھا۔

”تم تھے نہیں۔ اب واپس کیا کرتی تو میں نے وہ بھی کھالیا۔“

وہ جو کسی اور جواب کی توقع میں ہاتھ روم کی طرف جانے ہی لگا تھا، رک کے بے حد تحیر سے اسے دیکھا۔

”تم نے میرا ناشتا بھی کھالیا؟“

”ہوں!“ اس نے آرام سے سر ہلایا۔ ٹانگ پہ ٹانگ چڑھائے، ٹیک لگائے وہ مزے سے بیٹھی تھی۔ جہان نے تاسف سے اسے دیکھا۔

”دادا کہتے تھے کہ ان کے زمانے میں بیویاں شوہر کے آنے سے پہلے کھانا نہیں کھایا کرتی تھیں۔“

”یہ تمہارے دادا کیا فرعون کے زمانے کے تھے؟“ وہ منہ بنا کے بولی۔ ”ابھی تو گزر رہا ہے ان کا زمانہ۔ اب بھی وہی رواج ہیں۔ پتہ نہیں بڑوں کو کیا تو سٹیجیا ہوتا ہے کہ شاید ان کا زمانہ زیادہ اچھا تھا۔“

اس کی بات یہ جہان نے افسوس سے ذرا سار سر جھٹکا۔

”اچھا سنو! مریم خانم کے بچن کی اوپر والے کپینٹس میں سے دائیں ہاتھ کی تیسری کیبنٹ کھولو گی تو وہاں کھانے پینے کی بہت سی چیزیں پڑی ہوں گی۔ کچھ نکال لاؤ میرے لیے۔“

”اللہ اللہ، جہان! کل کو وہ کسی کے بارے میں کہہ رہی تھیں کہ وہ سعادت مند لڑکا کبھی بغیر پوچھے چیز نہیں لیتا۔“

”میں نے کب کہا ہے کہ بغیر پوچھے لو؟“

”تم نے یہ بھی نہیں کہا کہ پوچھ کے لو؟“

”بورک سے جی نہیں بھرا صبح صبح میرا دماغ کھا رہی ہو۔“ وہ خفگی سے کہتا ہاتھ روم میں چلا گیا اور دروازہ زور سے بند کیا۔ اس کے جانے کے بعد حیا کے لبوں پہ مسکراہٹ اٹھ آئی۔ وہ شرارت سے نچلا لب دانتوں سے دبائے انھی۔ سائنڈ ٹیبل کے پردے کے پیچھے سے ایک ڈھکی ہوئی پلیٹ نکالی اور پھر اوپر والی پلیٹ اٹھا کے جہان کا بورک دیکھا، اسے دوبارہ ڈھکا اور پھر سامنے میز پر رکھا۔ چند لمحوں کے لیے کھڑی سوچتی رہی پھر اپنا پرس اٹھایا، اندر سے پین اور پوسٹ اٹ نوٹ کا پتھوٹا پیڈ نکالا۔ اوپری صفحے پر لکھا ”تمہارے دماغ سے بورک کا ذائقہ بہت اچھا ہے“ اور اس نوٹ کو پیڈ سے پھاڑا اور پھر اوپری پلیٹ پہ چپکا دیا۔ چند لمحوں بعد وہ کمرے سے باہر تھی۔

کچھ دیر بعد جب جہان نیچے آیا تو وہ دونوں فرشتی نشست والے کمرے میں بیٹھی تھیں۔ اسے دیکھ کر وہ ذرا سا مسکرایا۔ وہی اپنا سبب بھری مسکراہٹ (غالباً بورک اسے مل گیا تھا)۔ وہ بھی جواباً مسکرائی۔ دونوں نے کہا کچھ بھی نہیں۔ پھر وہ تھوڑی دیر بیٹھ کر کسی کام کا کہہ کر باہر نکل گیا۔

دوپہر میں مریم خانم جب کپڑے دھونے کے لیے صحن میں آئیں تو وہ بھی اپنا عایا اور اسکا رفل لے کر ادھر ہی آگئی۔ عایا تو وہ عادتاً روزی دھوتی تھی، ترکی ہو یا پاکستان۔ حجاب کا یہ مطلب تو نہیں ہوتا کہ صفائی نہ رکھی جائے بلکہ اس میں صفائی کی زیادہ ضرورت ہوتی تھی۔ وہ کبھی بھی گیلیے بالوں پہ اسکا رفل نہیں اوڑھتی تھی اور جیسے عایا سے کپڑے نہ نظر آئیں مگر پھر بھی وہ استری شدہ کپڑے پہنتی اور بال ٹھیک سے بنا کر ہی اسکا رفل لیتی تھی۔

”آئی کیا آپ کے پاس عایا لوشن ہے؟ میرا لوشن ختم ہو گیا ہے۔“ اپنا عایا اور اسکا رفل پانی سے بھری بائی میں ڈالتے ہوئے اس نے پوچھا۔ وہ عایا کو صرف سے دھونے کا رسک نہیں لے سکتی تھی اور عایا لوشن ختم ہو چکا تھا۔ اب کس سے دھوئے۔

”اتفاق سے میرے پاس بھی نہیں پڑا ہوا۔ تم شیپو ڈال لو، وہ بھی ٹھیک رہے گا۔“

ان کی ہدایت کے مطابق اس نے بائی میں تھوڑا سا شیپو ڈالا اور ہاتھ سے مکس کر دیا۔ مریم خانم مشین میں کپڑے ڈال رہی تھیں۔ وہ ان کے پاس آکھڑی ہوئی۔

”آئی ایک بات تو بتائیں۔“

”پوچھو۔“ انہوں نے دوران مصروفیت پوچھا۔

”جہان کہتا ہے کہ قرآن میں پہیلیاں ہوتی ہیں۔ کیا واقعی ایسا ہوتا ہے؟“

”دیکھو بیٹا قرآن بذات خود پہیلی نہیں ہے۔ لیکن اس کے اندر بہت ساری نشانیاں ہیں، ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں۔ اور یہ تو قرآن خود بھی بار بار کہتا ہے۔ ہاں تم کہہ سکتی ہو کہ قرآن میں بہت ساری پہیلیاں ہیں۔“

”مگر آئی قرآن تو آسان بنا کر اتارا گیا ہے تا تو پھر کیا ضروری ہے کہ ہم اس کی ہر پہیلی ڈھونڈیں؟“

”نہیں قرآن آسان بنا کر نہیں اتارا گیا۔ اس میں غور و فکر کرنا پڑتا ہے۔“ وہ اب مشین کا ٹائم لگا رہی تھیں۔

”لیکن آئی اللہ تعالیٰ نے کہا کہ اس نے قرآن کو آسان بنا کر اتارا ہے؟“

”اللہ تعالیٰ نے یہ کہا ہے کہ قرآن کو بے سیر بنا کر اتارا ہے لیکن آسان نہیں۔ بے سیر کا مطلب آسان نہیں ہوتا۔ یہ تو انگریزی اور دوسری زبانوں میں اس کا ترجمہ آسان کر دیا جاتا ہے ورنہ اس کا مطلب آسان نہیں ہوتا۔ بے سیر کہتے ہیں کسی چیز کو تمام ضروری لوازمات سے آراستہ کر کے اسے ready to use بنا دینے کو۔“

”مگر آئی آسان بھی تو اسی چیز کو کہتے ہیں“ وہ اب بھی۔

”نہیں بیٹا، آسان کہتے ہیں پس آف ایک کو۔ یعنی کسی کو کھانے کے لیے ایک کا ایک ٹکڑا دے دینا۔ اور بے سیر کا مطلب ہے کہ کسی کو انڈے، میدہ، گھی، چینی، وغیرہ اور ایک کی رسی پی دے کر بچن میں بھیج دینا۔ سب اس کے ہاتھ میں ہوگا، مگر ایک اسے خود بنانا ہوگا۔ اب یہ اس پہ منحصر ہے کہ وہ ایک بناتا ہے یا ان اشیاء سے آلیٹ اور میدے کی روٹی بنا کر اصل مقصد سے ہٹ جاتا ہے! انسان کے لیے وہی ہوتا ہے بیٹا جس کی وہ کوشش کرتا ہے!“

مشین زوردار آواز کے ساتھ چل رہی تھی۔ اس کے عبایا کو بھگوئے بھی کافی دیر ہونے کو آئی تھی، سو اس نے بالٹی سے اپنا گیلہا عبایا اور اسکا رف نکالا اور محسن کے کونے میں لگے سنک پہ لے آئی۔

”آئی، کیا سب گناہ معاف ہو جاتی ہیں؟“ تل کھول کر دونوں ٹھیلوں سے سیاہ حریر کو پھینچتی، وہ اس کی جھاگ نکال رہی تھی۔ پانی غناغٹ کی آواز کے ساتھ سنک کے پائپ سے نیچے جا رہا تھا۔

”ہاں! کیوں نہیں!“

”تو پھر وہ پیچھے کیوں آتے ہیں؟“ سنک پہ جھکے کھڑی، کپڑا بھینچ بھینچ کر اس کے ہاتھ دکنے لگے تھی۔ جھاگ اب ذرا کم ہوئی تھی۔

”یعنی.....؟“ اس کی آئی کی طرف پشت تھی، وہ ان کی صرف آواز سن سکتی تھی۔

”یعنی کہ وہ ہمیں بار بار دکھائی کیوں دیتے ہیں؟“ اس نے گیلے عبایا کو گھڑی کی صورت بنا کر دونوں ہاتھوں سے نچوڑا۔ پانی کی

دھاریں بہتی گئیں۔

”تو اچھا ہے نا۔ ایسے انسان بار بار معافی مانگتا رہتا ہے، پھر ایک وقت آتا ہے کہ جب اس کے وہ گناہ بدل کر نیکی لکھ دیے جاتے ہیں!“

”لیکن وہ ہمارا عقاب ختم کیوں نہیں کر دیتے؟“ اس کے ہاتھ میں اب ٹھنڈا سا عبایا رہ گیا تھا۔ حریر بھی جب کپڑا تھا۔

اس کو گھڑی میں بھی ڈال دو تو ایک شکن نہ پڑتی۔ اس نے کبھی بھی اس کو استری نہیں کیا تھا۔ گول مول کر کے رکھ دو، مجال ہے جو چمک ماند پڑے۔

”سچے دل سے تو بے کرو تو گناہ نہیں آتے پیچھے!“

اس نے تار پہ عبایا پھیلا دیا، اور پھر ان کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ وہ اب مشین سے گیلے کپڑے نکال رہی تھیں۔ کنکھیوں سے اسے اپنا

عبایا ہوا سے پھڑ پھڑاتا دکھائی دے رہا تھا۔

”مگر وہ کونٹ تو دیتے ہیں نا، جیسے یہ عبایا مجھے کونٹ دے رہا ہے، لگتا ہے ابھی ہوا کا تیز جھونکا آئے گا اور یہ اڑ کر میرے سارے منظر

پہ چھا کر اس کو تاریک کر دے گا!“

اس بات پہ مریم خام زور سا سکرائیں، اور نوکری میں سے ایک کلپ اٹھا کر عبایا کے اوپر لگا دیا۔ حیا بل بھر کو بالکل ٹھہر گئی۔

”اب نہیں اڑے گا، بھلے کتنا ہی پھڑ پھڑالے! دعا بھی ایک کلپ کی طرح ہوتی ہے۔ اور یہ گناہ اس لیے یوں پھڑ پھڑاتے ہیں تاکہ تم

یہ یاد رکھو کہ اگر تم دوبارہ اس راستے کی طرف گئیں تو یہ کلپ ٹوٹ جائے گا اور کپڑا اڑ کر سب پہ چھ جائے گا۔ زمانہ اسلام میں آنے کے بعد جاہلیت

کے سب گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں، لیکن ایک دفعہ پھر غلط راستے کی طرف جانے کی صورت میں وہ پچھلے گناہ زندہ ہو جاتے ہیں، اور انسان کہ

اس پرانے زمانہ جاہلیت کا بھی حساب دینا پڑتا ہے!“

”تو..... تو گناہ اس لیے ہمیں دکھائی جاتے ہیں تاکہ ہم ڈرتے رہیں، اور رُبرائی کی طرف دوبارہ نہ جائیں؟“

”ہاں، اور تاکہ ہم خوف اور امید کے درمیان اللہ تعالیٰ کو پکارتے رہیں۔ اسی کو کہتے ہیں ایمان!“

مشین کا ڈرائیور بزرگ بجائے لگا تھا، آئی اس کی طرف پلٹ گئیں۔ وہ بس ان کی پشت کو دیکھ گئی۔

بہارے، عائشے کی باتیں دہراتی تھی، عائشے جہان کی، اور جہان مریم خانم کی۔ ہر علم والے پہ ایک علم والا ہوتا ہے۔ بس انسان کو سننا شروع کر دینا چاہیے، کیونکہ بعض لوگوں میں اللہ نے بہت خیر رکھی ہوتی ہے۔ اور یہ سننا اس نے ترکی آ کر ہی تو شروع کیا تھا۔

ترکی کے خوبصورت لوگوں کی خوبصورت باتیں!



کیلیس کا آسمان سیاہ بادلوں سے ڈھکا تھا۔ آج رات اس پہ چاند نہیں اترتا تھا۔ مکی کے کھیت سنسان پڑے تھے۔ ہر سوزیوں کی رسی لپک اور بارش سے پہلے کی مٹی کی خوشبو پھیلی تھی۔

خاموش، تاریک رات۔

جہان نے بریک پہ زور سے پاؤں رکھا تو گاڑی جھٹکے سے رکی۔

حیانے اسے دیکھا۔ سبز شرٹ، نیلی جینز، اور ماتھے پہ بکھرے بال۔ وہ چھ سوچتے ہوئے ونڈاسکرین کے پار دیکھ رہا تھا۔

”کیا ہمیں اس سے آگے پیدل چلنا ہے؟“ اس کے سوال پہ جہان کا ارکا زلونا، اس نے چونک کر حیا کو دیکھا اور پھر سر ہلایا۔

”ہاں، زیادہ دور نہیں جانا۔ گاڑی یہیں چھوڑ دیتے ہیں۔ تم واپس اس پہ آنا اور اسے خانم کے گھر چھوڑ دینا۔ اس کا مالک اسے وہیں

لے لے گا۔“ اپنی طرف کالا کھولتے ہوئے وہ کہتے کہتے رکا۔ ”آر یوشیو تم میرے ساتھ وہاں تک آنا چاہتی ہو؟“

”تمہیں کیا لگتا ہے، میری حس مزاح اتنی بری ہے کہ میں ایسی بات مذاق میں کہوں گی؟“ وہ خفگی سے کہتی باہر نکل آئی۔ اس نے

جہان کی ہدایت کے مطابق عبایا نہیں لیا تھا، تاکہ شامی عورتوں جیسی نہ لگے، اور کیلیس کی مقامی عورتوں کی طرح گھٹنوں سے نیچے کرتا کرتا فراق،

ٹراؤرز اور سر پہ مریم خانم کا پھولدار سیاہ سفید اسکارف یوں لے رکھا تھا کہ اسکارف ماتھے پہ لپیٹ کر اس کی دونوں ٹخنوں کی گرہ گردن کے پیچھے

لگائی اور پھر ان کو کندھوں پہ سامنے ڈال دیا، بالکل کشمیری عورتوں کی طرح۔ رات کے اندھیرے میں بھی اس کا چہرہ دکھ رہا تھا۔

”میں پہلے چلوں گا، جب وہ اس جھاڑی تک پہنچ جاؤں (اشارہ کرتے ہوئے) تب تم چلنا، تاکہ ہمارے درمیان فاصلہ رہے۔“

حیانے اثبات میں سر ہلادیا۔ وہ خاموشی سے آگے چلا گیا۔

حیانے پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ وہاں دور دور کچھ بتیاں دکھائی دیتی تھیں۔ اس نے واپس آگے دیکھا جہاں وہ جا رہا تھا۔ وہاں ہر طرف

اندھیرا تھا۔ پیچھے روشنی، آگے اندھیرا۔ علائی اعتراض۔

جب وہ نشان زدہ مقام تک پہنچ گیا تو وہ چلتے لگی۔ اس نے پھر وہی، وہاں وہی سرخ ہیل پہن لی تھی۔ جانتی تھی کہ جہان اس سے چڑتا

ہے، اسی لیے پہنئی تھی۔ پاؤں کا درد سیاہی تھا، مگر اپنا سیاہ پرس پکڑے، وہ اس کی پکی زمین پہ، ہر حال ہیل سے ٹھیک چل رہی تھی۔

آسمان پہ بادل وقفے وقفے سے گر جتے تھے۔ آج وہاں چاند نہیں تھا۔ آج وہاں ان کا چاند نہیں تھا۔

چند منٹ وہ یونہی چلتے رہے۔ پیر کا درد پھر سے سواہوئے لگا۔ اسے پچھتاوا ہوا۔ لیکن جہان کو چڑانا بھی تو تھا۔

وہ کہیت سے نکل کر اب ایک کھلے میدان میں چل رہے تھے۔ گرمی زوروں کی تھی۔ دور، دور بیٹوں کے چند درخت نظر آتے تھے۔

جہان ایک بڑے سے درخت کے پاس جا کر رکا، اور مڑ کر اسے دیکھا۔ اندھیرے میں اس کا چہرہ صاف نظر نہیں آتا تھا۔ وہ سب رفتار سے چلتی

اس تک آئی۔ سانس ذرا سا پھول گیا تھا۔

”وہ دیکھو!“ جہان نے درخت کے اس پار اشارہ کیا۔ وہ تنے کی اوٹ سے بدقت دیکھنے لگی۔

بہت دور، کئی سو میٹر دور، سرحدی باز تھی۔ خاردار اونچی تاریں۔ اس کے اندر اضطراب بڑھتا گیا۔ دل کی ہڑکن سواہوئی۔

”دوبکے تک ادھر ہی بیٹھتے ہیں۔“ وہ آواز سرگوشی کی مانند کیے تنے سے ٹیک لگا کر مین پہ بیٹھا۔ (لگتا تھا میجر احمد بول رہا ہے) حیا

بھی اسی کے انداز میں تنے سے پشت لگا کر اڑوں بیٹھ گئی۔ دونوں نے اپنے بیگ ایک دوسرے سے مخالف سمت میں رکھ دیے تھے۔

اوپر بجلی زور سے چمکی۔ چاندی لمبے بھر کھپھلی اور پھر سارے میں سیاہی اتر آئی۔ حیانے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔

کیا آج اسلام آباد میں بھی بادل ہوں گے، اس نے وقت کا حساب کرنا چاہا۔ یہاں ساڑھے بارہ ہو رہے تھے تو ادھر ساڑھے دس ہوں گے۔ کبھی کبھی ڈنری ٹائم کیا جاتا تھا۔ شاید اب بھی سب کھانا کھا رہے ہوں۔ ڈائینگ ٹیبل پہ سب ہوں۔ تایا بابا کی فیملی بھی، پچھو بھی۔ وہ پلاسٹک کی بنی متاشہ بھی۔ اور اگر کوئی ابھی ان کو بتائے کہ جہان اور حیا عین اسی وقت، ترکی اور شام کی سرحدی باڑ سے ذرا دور درخت تلے بیٹھے ہیں تو.....؟ اللہ، اللہ حیا۔ یہ وہ آخری موقع ہے جب ایسی بات تمہیں سوچنی چاہیے۔ اس نے خود سرزنش کی۔

جہان تنے سے سر نکائے، کلائی چہرے کے سامنے کیے گھڑی دیکھ رہا تھا۔ اس کا ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔
”کچھ وقت ادھر بیٹھنا ہوگا، پھر میں چلا جاؤں گا اور تم واپس!“

”جہان..... کیا یہ آخری طریقہ ہے شام جانے کا؟“ وہ اس کو دیکھتے ہوئے فکر مندی سے بولی۔
”میرے لیے؟ ہاں!“

”مگر پہلے تو تم میرے ساتھ بھی کتنے آرام سے سفر کر لیتے تھے۔ تو اب؟“

”میں نے بتایا تھا، نا، میرے ان سے تعلقات خراب ہیں۔ اس دفعہ میں یہی بارڈر کراس کر کے آیا تھا، سو اب اسی طرح جا سکتا ہوں۔“ وہ بہت دھیمی آواز میں سمجھا رہا تھا۔ آج دونوں کالڑے کا موڈ نہیں تھا۔

”مگر کیا تم جعلی پیپر ورک کر کے نہیں جا سکتے؟“

”میں اپنی شکل نہیں بدل سکتا حیا۔ میں ایئر پورٹ پہ گرفتار ہو جاؤں گا۔“
”بدل تو سکتے ہو!“

”وہ حیا سلیمان نہیں ہیں جن سے رات کے اندھیرے میں کوئی ڈراؤنی شکل بنا کر ملو تو وہ دن کی روشنی میں نہیں پہچانیں گے۔ وہ پورے جہوم میں بھی اپنا بندہ ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ میں اسی شکل پہ کوئی نادرل انسان والی دوسری شکل تو نہیں چڑھا سکتا نا۔“
”ہاں بس جب کسی کو بے وقوف کہنا ہو تو میری مثال کافی ہے۔“ وہ بغیر خفگی کے فہس کر بولی تھی۔ پہلی دفعہ ایسی بات نے اسے خفا نہیں کیا تھا۔ وہ ذرا مسکرا کر سامنے دیکھنے لگا۔

چند لمحے بیتے۔ خاموشی کے بوجھ نے زمینوں کی شاخوں کو مزید بوجھل کر دیا تو وہ بولی۔

”جہان! تمہاری زندگی کی سب سے بڑی خواہش کیا ہے؟“ ”یہ کہ میں زندہ رہوں، اور اس لمبی سی عمر میں اپنا کام کرتا رہوں۔“
اندھیرے میں بھی وہ اس کے چہرے پہ وہ چمک دیکھ سکتی تھی جواب اس کے لیے بہت مانوس تھی۔

”بہت محبت ہے نا تمہیں اپنی جاب سے؟“

”بہت زیادہ!“ اس نے بس دو لفظ کہے۔ جذبات سے بوجھل لفظ۔ مزید کہنا بے کار تھا۔

”اور تمہاری زندگی کی سب سے بڑی خواہش؟“

”یہ کہ میں ایک کتاب لکھوں، جس میں قرآن کی آیات کے رموز پہ غور کروں۔ لفظوں میں چھپی ہوئی پہیلیوں کو سلجھاؤں۔ ان کے نئے نئے مطلب آشکار کروں۔ کہتا ہے نا قرآن کہ اس میں نشانیاں ہیں، مگر ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں۔ میں بھی ان میں سے بننا چاہتی ہوں۔“
وہ محویت سے، ملکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے سن رہا تھا۔

”پھر کب لکھو گی یہ کتاب؟“

”کبھی نہ کبھی ضرور لکھوں گی۔ مگر پتہ ہے، میں ایک بات جانتی ہوں کہ اگر دنیا کے سارے درخت قلمیں بن جائیں، اور تمام سمندر روشنائی بن جائیں، اور میں لکھنے بیٹھوں، اور مجھے اس سے دو گنا قلم اور روشنائی بھی دے دی جائے، تب بھی سارے قلم کھس جائیں گے، ساری روشنائی ختم ہو جائے گی، مگر اللہ تعالیٰ کی باتیں ختم نہیں ہوں گی۔“
پھر اس نے سر اٹھا کر درخت کی شاخوں کو دیکھا۔

”یہ زمینوں کا درخت ہے نا، مبارک درخت!“ ایک مسکراہٹ اس کے لبوں پہ بکھر گئی تھی۔ اوپر گردن اٹھانے سے اکارف سے نکل کر

ماٹھے پہ جھوٹی لٹ کان تک جاگری تھی۔

”یعنی کہ تم واقعی قرآن پڑھتی ہو!“ وہ اس کے شجرۂ مبارکہ کا حوالہ دینے پہ سمجھ کر بولا تھا۔

”ابھی تو نہیں“ آواز میں ذرا شرمندگی درآئی۔ ”بہت پہلے پورا پڑھا تھا۔“

”تم پہلے پڑھتی تھیں قرآن؟“

”میں شریعہ اینڈ لاء کی اسٹوڈنٹ ہوں۔ قرآن، حدیث، فقہ، شرعی احکام، پانچ برسوں سے یہی تو پڑھ رہے ہیں۔ مگر پہلے کورس کی طرح پڑھا۔ عمل میں اب لائی ہوں۔ وہ وقت گئے جب شریعہ اینڈ لاء میں صرف مذہبی رجحان والی لڑکیاں داخلہ لیا کرتی تھیں۔ اب تو شریعہ کی آدھی لڑکیاں وہی بنی ہوئی ہیں جیسی پہلے میں تھی۔“

”اور اب؟“ اس نے اسی روانی سے پوچھا تھا۔

”اب تو میں..... میں بس کل پاکستان جا کر ہی اپنا ٹائٹل سیٹ کرتی ہوں قرآن پڑھنے کا۔“ وہ جیسے خود سے وعدہ کر رہی تھی۔

جہان نے اسے دیکھتے ہوئے دیر سے نفی میں سر ہلایا۔

”حیا قرآن کبھی بھی کل نہیں پڑھا جاتا۔ قرآن آج پڑھا جاتا ہے۔ اسی دن۔ اسی وقت۔ کیونکہ کل کبھی نہیں آیا کرتا۔“

”اوکے! پھر میں آج سے پڑھوں گی!“ اس نے فوراً بات مان لی۔ ”اور اگر کوئی اور ہوم ورک ہے تو وہ بھی دے دو۔“

”جیسے تم میری بہت مانتی ہو؟“

”کیا نہیں مانا؟“

”میں نے کہا تھا، واپس چلی جاؤ مگر تم نہیں گئیں۔“

”ہاں تو میں اب بھی کیلیڈس دیکھنے ہی آئی ہوں۔ تمہارے لیے تھوڑی سی آئی ہوں۔“ اس نے ناک سکڑی۔

زیتون کی خوشبو، کچی کچی، رسیلی سی خوشبو پر سوچا رہی تھی۔ جیسے اس نے کپادوکیہ میں غبارے پہ خوبانی نہیں کھائی تھی، ایسے ہی اس کا دل اب زیتون کھانے کو بھی نہیں چاہتا تھا۔ جہان ساتھ ہوتا تو اسے سننے کے علاوہ کہاں کسی دوسرے کام کے لیے جی چاہتا تھا؟

کافی دیر بعد جب وہ ایک ہی پوزیشن میں بیٹھی بیٹھی تھک گئی تو ذرا سا پہلو بدلا، اور ایسا کرتے ہوئے پاؤں کی سمت بدلی تو جوتے کی آواز آئی۔ جہان نے چونک کر دیکھا۔

”تم پھر یہی جوتے پہن آئی ہو؟“ اس نے ابنوٹ کیا تھا یا پہلے سے جانتا تھا، وہ فیصلہ نہ کر سکی۔

”ہاں، کیونکہ مجھے پتہ ہے تمہیں یہ کتنے پسند ہیں۔“

”بالکل۔ ذرا ایک منٹ اتارنا۔“

”کیوں؟“

”بس ایک منٹ نا!“

حیا نے ذرا تذبذب سے جھک کر جوتوں کے اسٹریپس کھولے، اور پاؤں ان سے نکالے۔ جہان نے ایک جوتا اٹھا کر الٹ پلٹ کیا۔ ”اچھا ہے، مگر اتنا نہیں کہ ساتھ بٹھا سکے۔“ ساتھ ہی اس نے جوتے کے دونوں کناروں کو پکڑ کر جھٹکا دیا۔ جیخ کی آواز کے ساتھ جوتا درمیان سے ٹوٹا۔

”جہان، نہیں!“ وہ ہشکل اپنی حواس باختہ جیخ روک پائی۔ جہان نے پرواہ کیے بغیر دوسرے کو بھی فوراً سے اٹھا کر اسی طرح توڑا۔ جوتے کی لکڑی ٹوٹ چکی تھی مگر چمڑے کے باعث دونوں ٹوٹے حصے ایک دوسرے سے نٹھی تھے۔

جہان نے ایک ایک کر کے دونوں کو دور اچھالا۔ وہ اندھیرے میں گم ہو گئے۔

حیا شا کڈ اسے دیکھ رہی تھی۔

”کیوں کیا تم نے ایسا؟“

اس نے جواباً بے نیازی سے شانے اچکائے۔

”دل چاہ رہا تھا۔“

”اب میں گھر کیسے جاؤں گی؟ کیا تم مجھے اپنے جوتے دو گے؟“

”میں بالکل بھی اپنے جوتے نہیں دوں گا۔“

”اور جو یہ یہاں اتنے پتھر، اتنے کانٹے اور جھاڑیاں ہیں، میں ان پہ کیسے ٹٹکے پاؤں چل کر جاؤں گی؟“ وہ خفگی سے بولی تھی۔

”یہ جوتے نے اپنے برس میں نیلے پلاسٹک بیگ میں گلابی رنگ کے کیٹنوز شوز رکھے ہیں نا، تم یہ پہن کر واپس چلی جانا۔“

اور حیا ایک دم جھینپ کر ہنس دی۔

وہ ایک دفعہ پھر پکڑی گئی تھی۔ سوچا تھا اس کو خوب چڑا کر واپسی پہ کیٹنوز شوز پہن لے گی، مگر وہ جہاں ہی کیا جو بلا اجازت کسی کا بیگ

نہ چیک کرے۔

”میں دیکھنا چاہتی تھی کہ اگر میرا جوتا نونا تو تم مجھے جوتا دیتے ہو یا نہیں؟“

”اور تمہیں یقین تھا کہ میں نہیں دوں گا، اسی لیے تم دوسرا جوتا اٹھالائی۔“

”ہاں، تمہارا کیا بھروسہ۔ اسی لیے پلان بی میں نے تیار رکھا تھا۔ مگر یہ طے ہے کہ میں تمہیں نہیں آزما سکتی، اور تم بھلے مجھے کتنا ہی

کیوں نہ آ زماؤ۔“ وہ محظوظ انداز میں بولی تھی۔ ”اور تم نے میرا بیگ چیک کیا، مطلب تمہیں مجھ پہ بھروسہ نہیں ہے۔“

”اُونہوں۔ بات بھروسے کی نہیں، پروفیشنلزم کی ہے۔ اصول، اصول ہوتے ہیں۔ اپنے escort کو بغیر چیک کیے میں

یہاں تک نہیں لا سکتا۔“

”اور کیا نکلا میرے پرس سے؟“ وہ لطف اندوز ہوتی ہوئی پوچھ رہی تھی۔

”ایک ٹوٹی ہوئی عینک۔ اور..... اس رومال میں کیا تھا؟“

وہ ذرا چوکی۔ مسکراہٹ سمٹی۔ ”تم نے اسے کھولا؟“ آنکھوں میں بے چینی اُٹھ آئی۔

”نہیں۔“

”آ خر دفعہ سچ کب بولا تھا؟“

”ابھی پانچ سینکڑ پبلے جب میں نے کہا کہ میں نے اس کو نہیں کھولا۔“

حیا خاموشی سے سامنے اندھیرے کو دیکھنے لگی۔ مبارک درخت کا سایہ اس پل مزید سیاہ ہو گیا تھا۔

”میں نے بس آخری دفعہ سیپ چنا۔ سوچا تھا کہ عائشے کی طرح کا سفید موتی لٹکے گا، یا پھر مرے ہوئے جانور کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ مگر

ان دونوں میں سے کچھ نہیں ہوا۔“

”پھر؟ کیا نکلا؟“

حیا نے ذرا مضطرب انداز سے نفی میں سر ہلایا۔

”وہ کچھ اچھا نہیں ہے۔ قابلِ فخر نہیں۔“

”دکھاؤ۔“

حیا نے بنا احتیاج کیے پرس کھولا، اندر سے وہ تہہ شدہ رومال اور ٹوٹی ہوئی عینک ایک ساتھ نکالیں، ایک ہاتھ میں عینک پکڑے،

دوسرے کی ہتھیلی میں وہ رومال تھا۔ پھر ہتھیلی جہاں کے سامنے کر کے کھولی تو رومال کی کی پوٹلی کھل کر آ بشار کی طرح ہاتھ کے ارد گرد گر گئی۔ اب ہتھیلی

پہ کاغذ کی طرح رکھے سفید رومال کے وسط میں کچھ رکھنا نظر آ رہا تھا۔

جہاں نے گردن ذرا آگے کر کے دیکھا، اور مسکرایا۔ ”اور تم کہہ رہی تھیں کہ یہ اچھا نہیں ہے؟“

حیا نے رومال کی سمت دیکھا جس کے عین وسط میں ایک موتی چمک رہا تھا۔

سیاہ رنگ کا موتی۔

”عائشے کے موتی سفید نکلتے ہیں۔ سفید ہوتا ہے پاکیزگی، معصومیت، نیکی کی علامت۔ مگر میرا موتی سیاہ رنگ کا نکلا۔ بہت سے سفید موتیوں میں کسی ugly duckling کی طرح۔“ وہ اداسی سے موتی کو دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ جہان نے سمجھ کر اثبات میں سر ہلایا۔

”واقعی، سیاہ تو برائی کا رنگ ہوتا ہے۔ جادو کی سب سے بڑی قسم سیاہ جادو کہلاتی ہے، مگنا ہوں سے بھرا دل سیاہ دل ہوتا ہے، گناہگاروں کے چہرے سیاہ ہوں گے روز قیامت۔“

اس کی بات پہ حیا کا چرہ مزید جھج گیا، مگر میراج احمد کی بات ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔

”اور تم نے اس سے یہ اخذ کیا کہ سیاہ ایک بُرا رنگ ہے؟ انہوں نے۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”سیاہ وہ رنگ ہے جو دھنک کے سارے رنگ اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ یہ ایک ڈارک رنگ ہے، اور ڈارک، بُرے کو نہیں، ڈیپ (گہرے) کو کہتے ہیں۔ سارے رنگ اس میں مدفن ہیں اور وہ ان کو کسی راز کی طرح چھپائے رکھتا ہے۔ وہ جو گہرا ہوتا ہے، ہاں وہ سیاہ ہوتا ہے۔ ٹھیک ہے، سیاہ رات میں گناہ کیے جاتے ہیں، مگر بے ریا عبادت بھی رات کی سیاہی میں کی جاتی ہے۔ کالا جادو، کالا اسی لیے کہلاتا ہے کہ یہ سفید جادو سے گہرا ہوتا ہے۔ یہ گہرائی کا رنگ ہے۔ دیرپا ہونے کا رنگ۔ اسی لیے کعبہ کا غلاف سیاہ ہوتا ہے، آسمان کا رنگ بھی تو سیاہ ہے، بارش کے قطرے اپنے اندر سونے یا دل بھی تو کالے ہوتے ہیں، قرآن کے لفظ بھی تو عموماً سیاہ روشنائی میں لکھے جاتے ہیں، اور.....“ وہ سانس لینے کو رکا۔ ”اور تمہارا رقع بھی تو سیاہ ہے نا!“

اس کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ چہرے پہ ایک سکون سا آنکھ ہرا۔

اسے جیسے میراج احمد پھر سے مل گیا تھا۔ اس نے ٹھنی بند کر دی، رومال ہاتھ کے کناروں سے جھٹکنے لگا تھا۔

”اور کیا سیاہ رات میں کی گئی نیکیاں، سیاہ برائیوں کو دھو ڈالتی ہیں؟“

”تمہیں کیوں لگتا ہے کہ ایسا نہیں ہوتا؟“

”ہوتا ہوگا، مگر..... وہ ویڈیو، اگر وہ کسی کے پاس ہوئی تو.....؟ اس کی آواز میں کرب در آیا۔ جہان نے بہت غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔

”کیا وہ کسی کے پاس ہے حیا؟“

”نہیں۔ میں تو یونہی کہہ رہی تھی۔“ وہ کہہ کر ہچکتائی۔ اب اسے جلدی سے بات بدلتی تھی۔

”اگر وہ کسی کے پاس ہے تو تم مجھے بتا سکتی ہو، میں.....“

”تمہیں مجھ سے محبت کب ہوئی تھی جہان؟ جب میں نے ریسٹورانٹ میں گلڈان توڑ کر پھینکا تھا یا جب میں نے تمہارے اوپر چنجر بریڈ کا ٹکڑا پھینکا تھا؟“

تیزی سے بات پلٹنے کی کوشش میں وہ بنا سوچے سمجھے بولی تھی۔ وہ جو روانی سے کچھ کہہ رہا تھا، اس کے لب ٹھہرے، آنکھوں میں ذرا سی بے یقینی اترتی مگر پھر وہ اسی روانی سے بولا

”جب تم نے میرے اوپر ٹھنڈا سلس پھینکا تھا۔“

وہ سانس روکے، انہی ٹھہری ہوئی پتلیوں سے اسے دیکھ گئی۔ چند لمحوں میں سر حدی لکیر کے گرد سب کچھ رک گیا۔ اور پھر، وہ دونوں ہنس دیے۔

”دیکھو، مجھے بھی آتا ہے لوگوں سے جواب نکلوانا۔“

”اللہ ان لوگوں پہ رحم کرے!“

وہ گردن پیچھے پھینکے، ہنسی جاری تھی۔ سخت گرمی میں جیسے کیلیس پہ بہار اتر آئی تھی۔ جب ہنسی رکی، تو اس نے مسکراہٹ بشکل دبائے جہان کو دیکھا۔

”کیا تمہیں یاد ہے کہ پہلی دفعہ زندگی میں تم نے کیک کب کھایا تھا؟ یا پہلی دفعہ تم کب روئے تھے؟ نہیں نا؟ کسی کو بھی ایسی باتیں یاد

نہیں ہوتیں۔ مجھے بھی نہیں یاد کہ کب پہلی دفعہ میں نے اپنے نام کے ساتھ تمہارا نام سنا تھا۔ وہ دور پھیلے کئی کے تاریک کھیتوں کو دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ”یاد ہے تو بس اتنا کہ تمہارا ذکر میرے ساتھ ہمیشہ سے تھا، جیسے میرا سایہ میرے ساتھ ہے، یا جیسے میری روح۔“

”اور تمہیں مجھ سے محبت کب ہوئی تھی؟“

حیا نے محفوظ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”میں نے تو نہیں کہا کہ مجھے تم سے محبت ہے!“

”اوکے۔ میں نے یقین کر لیا!“ وہ بھی جہاں تھا، مگر اتنی آسانی سے تو وہ نہیں کہنے والی تھی۔

”وہ جو ونڈ چائیم میں نے تمہیں گفت کیا تھا، ابھی گھر رکھا ہے، تم پاکستان آؤ گے تو تمہیں دوں گی، مگر تم نے اس پہ لکھا حضرت عمرؓ کا قول پڑھا؟ وہ شخص جو صرف اس لیے اپنی بیوی کو چھوڑنا چاہتا تھا کہ وہ اس سے محبت نہیں کرتا تھا، مگر گھر بنانے کے لیے محبت ضروری نہیں ہوتی جہاں۔ محبت تو بعد میں بھی ہو جاتی ہے۔ وفا اور قدردانی زیادہ اہم ہوتی ہیں۔“

پھر وہ رکی، اور بے ساختہ اندر آتی مسکراہٹ روک کر بظاہر بخیدگی سے بولی۔ ”تم نے قدردانی نبھائی وہ ایسے کم میری قدر کرتے ہو، اور جانتے ہو کہ سرچ لائٹ لے کر بھی ڈھونڈو گے تو میری جیسی بیوی نہیں ملے گی۔ اور میں نے وفا نبھائی، تو تمہیں نہیں چھوڑا۔ کیا ہوا جو تم میرے جتنے گز لگنگ نہیں ہو، کیا ہوا جو تم ایک بے مروت، بد لحاظ اور بد تمیز انسان ہو، مگر ہو تو میرے شوہر نا!“ ساتھ ہی اس نے شانے اچکائے۔ جہاں نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

”بہت شکریہ حیا!“

چند ساعتیں کیلیس کی سرزمین خاموش رہی۔ درخت اور ان کے پتے ہولے ہولے سانس لیتے رہے۔ پھر وہ بولا۔ ”میرا مسئلہ یہ تھا حیا کہ میں ہمیشہ سوچتا تھا کہ اس رشتے کو اپناؤں یا نہیں، مگر بہت دیر سے میں یہ سمجھا ہوں کہ یہ رشتہ تو ہم بہت پہلے اپنا چکے۔ بات ”کرنے“ یا نہ کرنے“ کی حد سے آگے نکل چکی ہے۔ اب نبھانے کا فیز ہے۔ بس سمجھنے میں دیر ہوئی مگر میں سمجھ گیا ہوں۔“

حیا کے ننگے پیروں پہ کچھ ریگا تھا۔ اس نے جلدی سے پاؤں جھاڑا۔ کوئی کیزا تھا شاید۔ مگر ماحول کا طلسم ٹوٹ گیا۔ جہاں نے گھڑی دیکھی۔ پونے دو ہونے کو تھے۔

”اب مجھے جانا ہے۔“

اور حیا کو لگا اس کا دل زور سے سمندر میں دھکیل دیا گیا ہے۔ یہ درو اتنا شدید تھا کہ اسے جسمانی لحاظ سے بھی محسوس ہوا تھا۔ وہ درخت کی ٹیک چھوڑ کر اس کی طرف مڑی۔

”جہاں پلیز..... مت جاؤ!“ آنکھوں میں اضطراب لیے وہ التجا کرنے لگی تھی۔

”نہیں حیا..... ایسے مت کرو!“

”پلیز، میرے دل کو کچھ ہورہا ہے۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے تم مت جاؤ۔“

”حیا، یہ اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ یہ اوپر ستارہ جو ہے نا“ اس نے آسمان کی طرف اشارہ کیا مگر حیا نے اوپر نہیں دیکھا۔ وہ اسی مضطرب انداز میں جہاں کو دیکھ رہی تھی۔ ”یہ ستارہ اپنے دائیں جانب رکھ کر میں چلتا رہوں گا، اور پلیز پہنچ جاؤں گا۔ یہ بہت سہل ہے حیا۔“

”جہاں، پلیز، نہ جاؤ۔ دیکھو، سکیورٹی فورسز، کیا یہ وہ جانتے ہوں، وہ پہلے سے تیار بیٹھے ہوں، پھر؟“

”وہ کیسے جان سکتے ہیں جب میں نے یا تم نے ان کو نہیں بتایا تو؟“

”مگر یہاں بارودی سرنگیں ہیں۔“

”وہ مسئلہ نہیں ہیں۔ مسئلہ صرف کمانڈر ہوتا ہے، اور کمانڈر شیعہ ہے، یعنی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“

”شیعہ؟“ اس نے حیرت سے جہاں کو دیکھا۔ یہ فرقہ واریت کہاں سے آگئی؟

”دیکھو، شام کے صدر بشار الاسد شیعہ ہیں، اور پاپا سنی ہیں۔“

”کس کے پاپا؟ اچھا، طیب اردگان!“

”اللہ کی عطا کردہ بیوی ہر ایک کو دے۔ دیکھو، طیب اردگان بنی ہیں۔ سو جب بارڈر کا کمانڈر بنی ہوتا ہے تو آپ شام سے ترکی میں داخل ہو سکتے ہیں، بیکوریٹی نرم ہوتی ہے مگر ترکی سے شام جانے میں مسئلہ ہوگا، لیکن جب کمانڈر شیعہ ہوتا ہے تو وہ آپ کو شام جانے دے گا۔“

”مجھے سمجھ نہیں آئی۔“

”مطلب یہ کہ اگر شام سے ترکی جانا ہے تو تب جاؤ جب بنی کمانڈر ہو، اور جب ترکی سے شام جانا ہو تو شیعہ کمانڈر کے وقت جاؤ میں اسی لیے اتنے دن ٹھہرا رہا کیونکہ کمانڈر بدلنا تھا۔ چار روز پہلے نیا کمانڈر آیا ہے۔ دنیا کے ہر بارڈر پہ کمانڈر کی تبدیلی کے گھنٹے بھر میں ہی اس کا نام وغیرہ آئنگلر اور جاسوسوں میں پھیل جاتا ہے، یہ واحد بارڈر ہے جہاں پہلی بات یہی پھیلتی ہے کہ وہ بنی ہے یا شیعہ۔ یہ فرقہ واریت نہیں ہے، یہ تو بس اسٹریٹجک Strategic سیاست ہے!“

وہ اسی طرح فکر مند اور پریشان سی اسے دیکھتی رہی۔

”میں اگلے ہفتے منگل کے دن پاکستان آ جاؤں گا، میرا یقین کرو!“

حیائے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ اس کو روکنا چاہتی تھی، مگر اب یہ اس کے ہاتھ سے باہر تھا۔

”اب یاد کرو، آشیانہ میں میرا وعدہ کہ ہر پلان میں ڈیپائمنٹ کروں گا۔ یاد ہے؟“

”ہوں!“ اس نے گردن ہلاتی۔ آنسو گیس میں پھندا ڈال رہے تھے۔

”اب مجھ سے کچھ وعدے کرنے ہوں گے تمہیں۔“ وہ بہت غور سے اسے دیکھتا قطعیت سے کہہ رہا تھا۔ ”میرے جانے کے بعد تم

پچھے مڑ کر نہیں دیکھو گی۔ جو پچھے مڑ کر دیکھتے ہیں، وہ پتھر کے ہو جاتے ہیں۔“

حیائے پھر اثبات میں گردن کو جنبش دی۔ اس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔

”اور میرے جانے کے بعد، پورے پانچ منٹ بعد تم یہاں سے اٹھو گی اور مڑے بغیر واپس گاڑی تک جاؤ گی۔ کیسے؟“

”ہاں، ٹھیک؟“ اس کی آواز نرم سی نکلی۔

”اور تیسری بات، اس درخت کے اس پار، یعنی سرحد کی طرف تم نہیں جاؤ گی، بلکہ واپس گاڑی کی جانب جاؤ گی۔ حیا کچھ بھی ہو

جائے بھلے کچھ بھی ہو جائے، تم اس جگہ سے آگے نہیں جاؤ گی۔“

”جہاں.....“ اس نے کہنا چاہا مگر جہاں نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش کرادیا۔

”میں کچھ نہیں سنوں گا۔ میں نے کپادوکیہ سے یہاں تک، تنہا سب باتیں مانیں۔ اب میری یہ تین باتیں تم مانو گی۔ تم یہاں

سے آگے نہیں جاؤ گی، بھلے تم کچھ بھی دیکھو یا سنو۔ مجھے کچھ بھی ہو جائے، میں مر بھی جاؤں، گرفتار ہوں جاؤں، جو بھی ہو، تم واپس گاڑی تک جاؤ

گی۔ بس!“

اس کی آنکھیں جھلملانے لگی تھیں۔ ہشکل وہ کہہ پائی۔

”ٹھیک۔ مگر ایک بات مانو میری۔“

”کیا؟“

”وہ جو تمہارا..... نقلی دانت..... سائینا نڈ۔ وہ تم مجھے دے دو۔ میں اسے یہیں پھینک دوں گی، مگر میں اس خیال کے ساتھ نہیں رہ سکتی

کہ تم اپنے منہ میں زہر..... پلیز جہاں!“

ساتھ ہی اس نے بند مٹی کھولی۔ رومال بھی کھلتا چلا گیا۔

”میں تمہارا دل نہیں توڑنا چاہتا۔“ جہاں نے چہرہ ذرا دوسری سمت کیا، اور انگلی سے دانت سے کچھ نکالا۔ حیائے آنکھیں بند کر لیں۔

اس نے کوئی نوکدار چیز رومال پہ رکھی اور رومال بند کیا۔ حیائے آنکھیں کھولیں اور پھر مٹی بھیج لی۔ گول موتی، کوکدار چیز، وہ محسوس کر سکتی تھی۔

چند لمحے وہ یونہی اسے دیکھتا رہا۔ رات گزرتی رہی۔

”تمہیں پتہ ہے حیاتِ ان جنت کے بتوں میں بہت اچھی لگتی ہو۔“

وہ بھیگی آنکھوں سے مسکرائی۔

”تم بھی میجر احمد!“

”میں؟“ اس کے چہرے پہ الجھن ابھری۔

”تم نے کہا تھا کہ جنت کے پتے ہر وہ چیز ہوتے ہیں جو انسان رسوا ہونے کے بعد خود کو ڈھکنے اور دوبارہ عزت حاصل کرنے کے لیے

اڑھتا ہے۔ تو پھر اپنی فیملی پہ لگا داغ دھونے کے لیے جو یونیفارم تم نے پہنا، جو کیپ تم نے لی، وہ سب بھی تو جنت کے بتوں میں ہی آتا ہے نا۔“

وہ ہلکے سے مسکرایا، پھر گھڑی دیکھی اور کھڑا ہو گیا۔ حیات نے اس کے جوتوں کو دیکھا۔ اس کے جوتوں کا رخ..... ان کا رخ.....

”منفل کو آؤں گا میں۔ ضرور۔ انسان کو کوئی چیز نہیں ہر اسکتی جب تک کہ وہ خود ہار نہ مان لے۔ میں نے کہا تھا قسمت ہر اسکتی ہے مگر

میں غلط تھا، قسمت انسان کو مار تو سکتی ہے، مگر ہر نہیں سکتی۔“

اور پھر وہ درخت کے پیچھے چلا گیا۔ وہ مڑ کر بھی نہ دیکھ سکی۔ اس نے وعدہ کیا تھا۔ سو وہیں چپکی بیٹھی رہی۔ اپنے دل کی دھڑکن، اپنے

ہاتھوں کی لرزش، سب محسوس ہو رہا تھا اسے۔ ایک ہاتھ میں پولٹی کے اندر موتی کی گولائی اور نقلی دانت کی چھن، اور دوسرے میں.....

وہ چوکی۔ اس کا دوسرا ہاتھ خالی تھا۔

اللہ، اللہ! اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ ڈی جے کی نوٹی عینک..... وہ ابھی اس کے ہاتھ میں تھی، پھر وہ پیر سے کیڑا

جھاڑنے لگی تب..... وہ کہاں گئی؟

اس نے بدحواسی سے ہاتھ اندھیری زمین پہ ادھر بٹھرا مارا۔ نوکیلے چھوٹے پتھر، گھاس کے سوکھے تنکے، مٹی، عینک کہیں نہ تھی۔

”نہیں! پلیز نہیں۔“ وہ ڈی جے کی عینک نہیں کھونا چاہتی تھی۔ وہ ایک دفعہ پھر سے ڈی جے کو نہیں کھونا چاہتی تھی۔ اس نے اندھوں کی

طرح روح والی بندھنی اور دوسرے کھلے ہاتھ سے مٹی کو ٹٹولا۔ کچھ بھی نہیں تھا۔

رومال پرس میں رکھنے کی غرض سے اس نے پرس کھولا، اور پھر بس ایک نظر دیکھنے کے لیے پولٹی کھولی۔

اندھریا موتی کے ساتھ ایک ننھی سی چیز پڑی تھی۔

ایک سرمئی رنگ کا چھوٹا سا کنکر۔

”جہان!“ بے یقینی سے اس کے لب کھل گئے۔

پروفیشنلزم..... اصول..... اسے ان پہ کوئی سمجھوتہ نہ تھا۔ اس کا دل رکھنے کے لیے اس نے حیا کو تار دیا کہ وہ دانت نکال رہا ہے، مگر

اپنے فرار کا واحد راستہ اس نے اپنے پاس ہی رکھا تھا۔ اس نے نیچے پڑے اس جیسے ہزاروں کنکروں میں سے ایک اٹھا کر رومال پہ رکھ دیا تھا۔

”جہان!“ بہت تکلیف سے اس نے مڑ کر درخت کی اوٹ سے اس پار دیکھا۔

پہلا وعدہ جھمن سے ٹوٹا۔

دور، سرحدی باڑ تار کی میں ڈوبی تھی۔ اتنی تاریکی کہ کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اسی بل بجلی زور کی چمکی۔ بل بھر کو سب روشن ہوا۔ اور تب

اسے دکھائی دیا۔ ایک ہیولہ جو بیڑھی چال چلتا سرحد کی طرف بڑھ رہا تھا۔

پانچ منٹ کب کے گزر چکے تھے۔ دوسرا وعدہ بادلوں کی گرج میں تحلیل ہو گیا تھا۔ وہ دم سادہ بھئی بجلی چمکنے کا انتظار کرتی، اندھیرے میں

آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر دیکھ رہی تھی۔ مگر اب اس نے وہ ہیولہ کھو دیا تھا۔

گزرتے وقت کا احساس کر کے وہ ابھی، اور واپس جانے کے لیے قدم بڑھائے۔ ساتھ ہی وہ ہٹکے ہوئے زمین پہ ہاتھ مار کر عینک

ڈھونڈ رہی تھی۔ دفعتاً قریب ہی اس کا ہاتھ کسی سخت شے سے ٹکرایا۔ اسٹریپ لکڑی..... اس نے وہ چیز اٹھائی۔ نوٹی سرخ جوتی۔

اب عینک اور دوسرا جوتا ڈھونڈنا بے کار تھا۔ وہ سیدھی کھڑی ہوئی، تاکہ واپس جاسکے۔ اب اسے پیچھے نہیں دیکھنا تھا۔ اپنے پرس کو پکڑا

ہی تھا کہ دوسرے جوتے نکالے کہ.....

ایک دم کہیں سے سورج نکل آیا۔
روشنی۔ آنکھیں چند حیاتی روشنی۔

وہ تیزی سے واپس بیٹھی۔ کالی رات روشن ہو گئی تھی۔ چلتی بچھتی روشنی۔ اس نے ہر اسان نگاہوں سے پلٹ کر دیکھا۔
سرحد پہ روشنی کے راؤنڈز فائر کیے جا رہے تھے۔ اندھیرے میں ہر طرف روشنی بکھرتی، مدھم ہوتی، پھر بکھرتی۔ سرحدی باز پہ ہیولے سے بھاگتے دکھائی دے رہے تھے۔

اس نے زمین پہ پڑے ایک بڑے پتھر کو خالی ہاتھ سے سختی سے تھام لیا۔ دل دھک دھک کر رہا تھا۔
روشنی..... فائرنگ..... گولیاں..... اسٹیکر پہ آوازیں.....

وہ بنا آواز کے لب ہلاتے ہوئے چلائی ”جہان..... واپس آ جاؤ!“ آنکھوں سے آنسو ٹوٹ کر گرنے لگے تھے۔ جسم کپکپا رہا تھا۔
روشنی فواروں کی صورت بار بار پھوٹ رہی تھی۔ اس کا دل چاہا، وہ بھاگتی ہوئی سرحد پہ چل جائے، مگر وہ تیسرا وعدہ..... وہ پیر کی زنجیر بن گیا۔ وہ ہر دفعہ اسے چھوڑ کر، جگہ چھوڑ کر چلی آتی تھی۔ پہلی دفعہ وہ اسے چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی تھی مگر جہان کے وہ الفاظ اسے واپس بھیج رہے تھے۔ ”جیا..... کچھ بھی ہو جائے..... کچھ بھی!“

اور پھر..... ایک دم زور سے دھماکا ہوا۔
پتھر کو پکڑے، ٹکڑی کی صورت بیٹھی حیا کے بہتے آنسو رگ گئے۔ اس نے ساکت نگاہوں سے سرحد کی جانب سے آتے دھوئیں کو دیکھا۔

روشنی..... چیخ و پکار..... سائرن..... بارود کی خوشبو.....
اور پھر دھوئیں کے بادل ہر طرف چھاتے گئے۔
سرحد چھپ گئی
اور

دھندلی دیوار ایک دفعہ پھر اُن دونوں کے درمیان چھا گئی۔
کیا ہوا تھا، کیا بچھا تھا، اسے نہیں معلوم تھا۔ وہ مردہ قدموں سے کھڑی ہوئی۔ ایک ہاتھ سے پرس اور ٹونا جوتا لنگ رہا تھا۔ دوسرا ہاتھ پہلو میں خالی گرہا تھا۔ خالی ہاتھ۔ خالی دامن۔ اسے دو وعدے تو زکرا ب تیسرا نبھا تھا۔ اسے واپس جانا تھا۔
بادل گرج دار آواز کے ساتھ ایک دم برسنے لگے۔ موٹی موٹی بوندیں ٹپ ٹپ کرنے لگیں۔ ترکی کی پہلی بارش میں بھی وہ ننگے پیر ٹوٹے جوتے کے ساتھ چل رہی تھی، آخری بارش بھی وہ ننگے پیر تھی۔
”ممی جواہر تک گئی ہیں۔ میں اُن کا بیٹا بول رہا ہوں۔ جہان۔“
وہ ننگے پاؤں کھردری زمین پہ چل رہی تھی۔ کانٹے چھ کر تلوں کو ذمی کر رہے تھے، مگر وہ سانس نہ دیکھ رہی تھی، بلکہ وہ تو شاید کچھ بھی نہیں دیکھ رہی تھی۔

”جوتے کو کیا ہوا ہے؟ اتنی سردی میں ننگے پاؤں بیٹھی ہو، لاؤ دکھاؤ جوتا۔“
ترازہ گرتے قطرے اسے بھگور رہے تھے۔ بادلوں نے سارا بوجھ اتار کر زمین اور زمین والوں کو بوجھل کر دیا تھا۔
”میں بکواس کر کے گیا تھا مگر میری کون سننا ہے اس گھر میں؟ دو دن نہ ہوں تو سارا نظام الٹ جاتا ہے۔“
اس کے پیروں سے خون نکل رہا تھا، جسم میں جان نہ رہی تھی، لگتا تھا ابھی لڑکھڑا کر گر پڑے گی، اور اگر گری تو اٹھ نہ سکے گی۔
”انسان وہی چیز مانگتا ہے جس کی اس کو کمی لگتی ہے، سو میں ہمیشہ زندگی مانگتا ہوں۔“

اس کے ہاتھ میں صرف اپنا ایک جوتا تھا۔ دوسرا دیں زیتون کے درخت کے آس پاس رہ گیا تھا۔ جب آدھی رات کے بعد حقیقت اپنا نقاب اتار کر چھینکتی ہے تو ہر سنڈر یا کو ایک جوتا اسی مقام پہ چھوڑ کر واپس ہونا ہوتا ہے۔ اسے بھی جانا تھا۔

”ہینڈم گائیڈ ابھی مصروف ہے، کسی غیر ہینڈم گائیڈ سے رابطہ کرو۔“

وہ بارش کے قطرے تھے یا آنسو، جو اس کے چہرے کو بھگو چکے تھے۔ دفعتاً اس کا پیر پڑا۔ وہ اوندھے منہ زمین پہ گری۔ ہتھیلیاں چلی گئیں، چہرے پہ مٹی لگ گئی۔ برستی بارش، سیاہ رات۔

”بعض دفعہ قسمت ہر ادیا کرتی ہے جیسا۔ ڈی جے کی ڈتھ ہوگئی ہے۔“

وہ اٹھنا چاہتی تھی، اٹھ نہ سکی۔ وہیں جھکی بیٹھی سسکیوں کے ساتھ روتے گئی۔ کیچڑ، بارش، آنسو۔ سب گڈمڈ ہو رہا تھا۔

”فرقان ماموں کی فیملی سے ڈر لگتا ہے، کیونکہ وہ سرخ مرچ کا استعمال کچھ زیادہ ہی کرتے ہیں۔“

بشکل ہتھیلی کے بل زور لگا کر وہ اٹھ پائی۔ پیر لہو لہان ہو چکے تھے۔ وہ لڑکھاتی ہوئی موسلا دھار بارش میں پھر سے چلنے لگی۔

”میں نے کہا تھا، تازہ زندگی میں کوئی جنت کے پتے لا کر دے تو انہیں تھام لیجئے گا۔ وہ آپ کو سوانہیں ہونے دیں گے۔“ کار سامنے

تھی، اس کے دروازے کو پکڑے پکڑے سہارا لیے خود کو سنبھالنا چاہا۔

”جب اپنا چہرہ چھپانے کے لیے میگزین سامنے کرتے ہیں تو اسے انانہیں پکڑتے۔“

اسٹیرنگ ڈیل تھا اس نے دھندلی آنکھوں سے شیشے کے پار دیکھا۔ ہر سودھندھی۔ دھند جو ان کی زندگیوں سے جھپٹی ہی نہیں تھی۔

”اگر جادو گر اپنی ٹرک کے فوراً بعد ہی راز بتا دے تو کیا فائدہ؟“

ہر شے سلوشن میں ہو رہی تھی۔ ساری آوازیں بند تھیں۔ بس حرکات دکھائی دے رہی تھیں۔

اس نے خود کو مریم خانم کے دروازے پر دیکھا۔ بارش اسی طرح برس رہی تھی، مگر اس کی سماعت بند ہو چکی تھی۔

”اچھا تم نے پاشا بے کے اوپر کافی الٹ دی تھی؟ گڈا ویری گڈا؟“

خانم اس کو سہارا دیے بستر پہ لٹا رہی تھیں۔ اس کے گروساری دنیا گول گول گھوم رہی تھی۔

”اپنی جگہ کبھی نہیں چھوڑتے جیسا۔ ہوٹل گرینڈ کی مثال یاد رکھو۔“

وہ بستر پہ لیٹی تھی، آنکھوں سے بے آواز آنسو بہہ رہے تھے۔ پائنتی کے طرف بیٹھی مریم خانم اس کے پیروں پہ دو لگا رہی تھیں۔

اسے درندہیں ہو رہا تھا۔ ساری حیات ختم ہو گئی تھیں۔

”بالکل بھی مدد نہیں کروں گا۔ جو کرتا ہے اکیلے کرو اور خود کرو کیونکہ تم کر سکتی ہو۔“

وہ اپنا ٹرائی بیگ کھینچی ریلوے اسٹیشن پہ چل رہی تھی۔ دونوں پیر بیٹوں میں بندھے تھے۔ قدم اٹھاتی کہیں اور تھی، پڑتا کہیں اور تھا۔

”لگتا ہے سب مجھ سے تنگ آ گئے ہیں جو بار بار جانے کا پوچھتے ہیں۔ دل کرتا ہے ماہ کی طرح کبوتر بن کر کسی غار میں

چھپ جاؤں۔“

ٹرین تیز رفتاری سے دوڑ رہی تھی۔ وہ کھڑکی کی طرف بیٹھی، بیگی، سرخ آنکھوں سے باہر بھاگتے مناظر دیکھ رہی تھی۔ زیتون کے

درخت پیچھے رہ گئے تھے۔ شیشے دھندلا گئے تھے یا اس کی آنکھوں میں دھند تھی، اب تو سارے فرق ختم ہو گئے تھے۔

”میرا نام جہان سکندر ہے، ممبر جہان سکندر احمد۔“

سباغی کا سبزہ زار بھی اسی کہر میں ڈوبا تھا۔ ہر سودھندھی۔ کوئی آواز، کوئی شور نہیں۔ اس نے خود کو ایک فیکٹری اپارٹمنٹ کا دروازہ بجاتے

دیکھا تھا۔

”شش چھننا نہیں، ورنہ آواز باہر جائے گی اور یہ ساری فیملی بھاگتی ہوئی آجائے گی۔“

اندر سے نفی کر رہا مائل لڑکی اسے دیکھ کر پریشانی سے اس کی جانب بڑھی تھی۔ وہ کیا کہہ رہی تھی، حیاں نہیں پار رہی تھی۔ بس اپنی آواز

کسی گہری کھائی سے آتی سنائی دی ”میرا سامان پیک کروادیں انجم باجی۔“

”اچھا تمہیں نہیں پتہ تھا میں کیا دو کیہ میں ہوں؟“

ہاں اس کے بیگ کی زپ بند کرتے ہوئے کچھ کہہ رہی تھی۔ انجم باجی اس کے جوتے رکھ رہی تھیں۔ وہ بس ساکت سی صوفے پہ

بیٹھی، سر جھکائے، بے آواز رو رہی تھی۔

”تھوڑی سی کاٹن لادو فارمیسی سے۔ کان میں ڈالنی ہے۔“

اپنے ٹرائل بیک کو ہینڈل سے گھسیٹتی وہ اتانترک ہوالائی (ایئر پورٹ) کے دروازے سے اندر داخل ہو رہی تھی۔ بے جان قدم، بے سوچ لگا ہیں۔

”پتہ ہے حیات تم کب اچھی لگتی ہو؟ جب تم خاموش رہتی ہو۔“

وہ ششاس سالہ کا تیزی سے اس کی طرف آیا تھا۔ وہ اس کو پہچانتی تھی مگر اس کو سمجھ نہ پا رہی تھی۔ وہ بول رہا تھا کچھ۔ ”عبدالرحمن بھائی نے کہا تھا کہ آپ سے مل لوں، کہیں آپ کو کچھ مدد کی ضرورت نہ ہو۔ آپ بہارے گل کو لے کر چلی گئیں، میں بہت پریشان تھا، یہ می نے بھجوائے ہیں آپ کے لیے۔“ وہ کوئی بیکٹ اس کی طرف بڑھا رہا تھا۔

”میری لغت میں دو بے کج مطلب ہوتا ہے ایک بے کج چہن منٹ۔“

آفسیر اس کو لیپ ٹاپ ہینڈ کیمری میں اٹھانے کا کہہ رہی تھی۔ اس نے خالی خالی نگاہوں سے اسے دیکھتے، لیپ ٹاپ بیک اٹھالیا۔ اب کسی چیز سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

”مجھے کچھ بھی ہو جائے، ہر جاؤں، گرفتار ہو جاؤں، جو بھی ہو، تم واپس گاڑی تک جاؤ گی، بس؟“

جہاز کی کھڑکی سے نیچے، بہت دور بوسفورس کا سمندر نظر آ رہا تھا۔ نیلی چادر، سفید جھاگ اور ان سب پہ چھائی دھند۔ پھر بھی اس نے آنسو نہیں پونچھے۔ وہ ترکی سے ہمیشہ روتے ہوئے جاتی تھی۔ اسے اس دفعہ بھی روتے ہوئے جانا تھا۔

مگر کون جانے،

کہ اس دفعہ غم،

سب سے بڑا تھا۔



وہ آنکھوں پہ بازو رکھے لیٹی تھی۔ دفعتاً دروازے پہ دستک ہوئی۔ اس نے آنکھوں سے بازو نہیں ہٹایا۔ اسی طرح لیٹی رہی۔ دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور پھر چلتے قدم۔ آنے والے نے آگے بڑھ کر کھڑکی کے پردے ہٹائے۔ اسے بند آنکھوں سے بھی سورج کی روشنی چھن کر خود پہ پڑتی محسوس ہوئی تھی۔

”حیا، اٹھ جاؤ بیٹا۔ طبیعت کیسی ہے؟“ اس نے سین پھوپھو کی آواز سنی اور پھر بیڈ کی پائنتی کے پاس دباؤ محسوس ہوا، جیسے وہ ادھر بیٹھ گئی تھیں۔

”بخارا اتر اتمہارا؟“ انہوں نے جھک کر اس کے ماتھے کو چھوا۔ حیا نے بازو آنکھوں سے ہٹایا اور خالی خالی نگاہوں سے ان کو دیکھا۔

شانوں پد پونہ لیے، بال کچر میں باندھے، وہ ویسی ہی تھیں۔ پُرسکون، صابر، ٹھنڈی۔

”میں ٹھیک ہوں۔“ وہ کہنی کے بل ذرا سی اٹھی۔ نقا ہٹ، پڑ مرو گی۔ جیسے جسم میں جان ہی نہ رہی تھی۔

”اور یہ تمہارے پاؤں کو کیا ہوا ہے۔ نتاشا کہہ رہی تھی کہ ابھی ہینڈج لاتی ہے، یہ ہینڈج تو بالکل خراب ہو گیا ہے۔“ انہوں نے ہولے سے اس کے پیر کے انگوٹھے کو چھو کر کہا جس پہ لگی پٹی اب پرانی اور خستہ ہو چکی تھی۔ حیا نیکی کے سہارے بیٹھی اسی طرح انہیں دیکھتی رہی۔

”جہان تمہارے ساتھ تھا؟“ انہوں نے نرمی سے پوچھا۔ جب سے وہ آئی تھی، اتنی پیار ہو گئی تھی کہ پھپھو سے باقاعدہ بات اب ہو پا

رہی تھی۔

اس نے گردن کو اثبات میں جنبش دی۔ گلے میں آنسوؤں کا پھندا سا پڑنے لگا تھا۔

”پھر؟“

اور اس پھر کے آگے سارے جواب ختم ہو جاتے تھے۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبائیں۔

”میں نہیں جانتی پھوپھو۔ ہم ساتھ تھے۔“ وہ کہنے لگی تو آواز بہت بوجھل تھی۔ ”اس رات آسمان پہ بادل تھے اور چاند نہیں تھا، تارے بھی نہیں تھے۔ وہ آگے جا رہا تھا، میں نے اسے روکنا چاہا۔ منع بھی کیا مگر اس نے..... اس نے میری نہیں مانی، وہ چلا گیا..... اور پھر.....“ وہ رکی اور پلک جھپکی تو آنسو رخسار پہ اڑھکنے لگے۔

”پھر پتا نہیں کیا ہوا..... مگر..... مگر وہ واپس نہیں آیا۔“

کمرے میں چند لمحوں کے لیے بوجھل سی خاموشی رہی۔ پھوپھو کے چہرے پہ وہ ہی سکون، وہ ہی ٹھہراؤ تھا۔

”کیا اسے اسی وقت واپس آنا تھا؟“

”نہیں اس نے کہا تھا کہ آنے والے منگل کو وہ آجائے گا۔“

”تو ابھی منگل میں کچھ دن ہیں نا، وہ آجائے گا۔ تم فکر کیوں کر رہی ہو؟“

حیائے نفی میں سر ہلایا۔

”وہ نہیں آئے گا۔ وہ مشکل میں ہے۔ میں نہیں جانتی کہ وہ ٹھیک بھی ہے یا نہیں مگر وہ مشکل میں ہے۔ شاید زخمی ہو، شاید گرفتار ہو اور شاید.....“ اس سے آگے فقرہ ٹوٹ گیا، دل بھی ساتھ ہی ٹوٹ گیا۔

”اگر اس نے کہا تھا آئے گا تو وہ ضرور آئے گا۔ مجھے پورا یقین ہے۔“ انہوں نے جیسے دلاسا دیتے ہوئے اس کے ہاتھ کی پشت کہہ چکا۔ وہ ان ہی ہتھکنی نگاہوں سے ان کا ہر سکون چہرہ دیکھتی رہی۔

”میں سمجھتی تھی کہ آپ میں اور مجھ میں بہت فرق ہے پھوپھو۔ آپ صبر سے انتظار کرنے والی عورت ہیں مگر میں چیزیں اپنے ہاتھ میں لیکر جہان کے ساتھ چلنے والی عورت ہوں۔ لیکن اب مجھے لگتا ہے کہ تکلیف ہم دونوں کے حصے میں برابر آئے گی۔ آپ ظاہر نہیں کرتیں اور میں چھپا نہیں سکتی۔ بس یہی فرق ہے۔“

”بے یقین نہ ہو بیٹا۔ اللہ سے اچھا گمان رکھو، اچھا ہی ہوگا۔“ انہوں نے نرمی سے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔ وہ سر بھی نہ ہلا سکی۔ عجیب بے یقینی سی بے یقینی تھی۔

دروازہ ڈرامی دستک کے ساتھ کھلا۔ پھوپھو اور حیائے ایک ساتھ اس سمت دیکھا۔ تناشا دروازے میں کھڑی تھی۔ حیاء دقت پھیکا سا مسکرائی اور آنسو ہیلی کی پشت پر صاف کیے۔

”حیاء کیا تم گھٹی ہو؟ میں تمہارے لیے بینڈج لائی تھی۔ وہ خراب ہو چکا ہے، اسے اتار دیتے ہیں۔“ تناشا رسان سے انگریزی میں کہتی ہوئی اندر آئی اور چھوٹا سا بکس بیڈ پہ حیا کے پیروں کے پاس رکھا۔ پھوپھو اس کو جگہ دینے کے لیے اٹھ گئیں تو وہ وہیں پھوپھو کی جگہ پہ بیٹھ گئی۔

”ہو کیا تھا تمہیں، اتنے زخم کیسے آئے؟“ وہ اب حیا کی ابرویں سے بینڈج اتارتے ہوئے بولی تھی۔ لہجہ زیادہ متفکر تھا، نہ زیادہ سرد۔ یہ نہیں وہ اسے اچھی لگتی تھی یا بُری۔ ویسے تو بے ضرری ہی تھی البتہ اس کا لباس۔ اللہ اللہ۔ اس ساری پریشانی میں بھی حیا کے ذہن میں آیا تھا کہ یہ اس طرح سیلوئس ناپ اور کیپری میں گھر میں گھومتی ہوگی اور روئیل یا بابا کو کوئی فرق نہیں پڑتا؟

”کیا ہوا تھا حیا پیر پہ؟“ تناشائے دو الگاتے ہوئے دوبارہ پوچھا۔ حیا چونکی۔

”کاج، پتھر، زمین پہ بہت کچھ گرا تھا اور میں انہی کے اوپر چلتی رہی۔“

”بہت بداحتیاطی ہے یہ ویسے۔ اوکے، میں اسے بینڈج کر رہی ہوں۔ بہت جلدی ٹھیک ہو جائیں گے، زیادہ گہرے نہیں ہیں۔“ وہ اب مصروف انداز میں کہتی اس کی پٹی باندھ رہی تھی۔ دفعتاً آسمانوں پہ اذان کی آواز گونجنے لگی۔ پھوپھو جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ اس نے انہیں نہیں روکا۔ اس کے پاس انہیں روکنے کے لیے کوئی جواز نہ تھا۔



لاؤنج سے باتوں کا شور کمرے تک سنائی دے رہا تھا۔ تناشا و سرخشی اپنی امی کے ساتھ آئی تھیں اور حسب معمول ان کی آمد پہ ارم اور سونیا بھی چلی آئی تھیں۔ وہ ابھی تک کمرے میں ہی تھیں، ان سے نہیں ملتی تھی۔ اماں دروازے پہ دو دفعہ آکر باہر آنے کا کہہ چکی تھیں۔

”اب تو بخار بھی اتر گیا ہے، باہر آ جاؤ۔ وہ کب سے آئی ہوئیں ہیں، اچھا نہیں لگتا۔“ اور پھر بھی وہ کچھ کہے بنا بیٹھی رہی۔ دل ہی نہیں چاہ رہا تھا کسی سے ملنے کو۔ پھر کافی دیر بعد اٹھی اور اپنا بیگ کھولا تا کہ کوئی جوڑا نکالے۔ ابھی پہنا لباس ملگجا سا ہو رہا تھا۔ گرے شلوار قمیص اور ساتھ میں پتہ نہیں کس جوڑے کا گلابی دوپٹہ پہنے، بہت بکھرے بکھرے سے حلیمے میں وہ بیماری لگ رہی تھی۔ بیگ کھول کے ڈھکن اٹھایا تو سامنے کپڑوں پر گفٹ پیک میں ملفوف ایک پیکٹ رکھا تھا۔

اس نے پیکٹ اٹھایا۔ کچھ مدہم مدہم سیاد تھا کہ سفیر نے جاتے ہوئے یہ اس کے حوالے کیا تھا، شاید حلیمہ آنٹی نے دیا تھا۔ اس نے رپر پھاڑا، اندر بہت خوبصورت سفید ران کلی سلک کا کپڑا تھا۔ ساتھ میں ایک چھوٹا سا کارڈ بھی لگا ہوا تھا۔ اس نے کارڈ اٹھایا۔

”حیا کے لیے بہت دعاؤں کے ساتھ۔ تم ہمیشہ پوچھنا جانتی تھیں کہ تمہارے ساتھ فلائیٹ میں عثمان نے سامنے بیٹھی ٹرک عورت سے کیا کہا تھا تا کہ وہ تم سے زیادہ فریگ نہ ہو سکے۔ تو میں تمہیں بتائے دیتی ہوں۔ انہوں نے اسے کہا تھا کہ ہم نے ایسی ڈش کا آرڈر دیا ہے جس میں انڈین سٹائل کی تلی ہوئی پیاز بھی شامل ہے۔ اور بات یہ ہے حیا کہ ٹرک عورتوں کو تلی ہوئی پیاز کی خوشبو سے سخت الرجی ہے لیکن آف کورس وہ صرف اس لیے ایسا کرنا چاہ رہے تھے کہ کہیں کسی اجنبی سے بے تکلفی سے تمہیں انفصان نہ ہو۔ ہم اپنے دوستوں کا بہت خیال رکھتے ہیں! فقط حلیمہ اور عثمان۔“

اس کے چہرے پہ افسردہ سی مسکراہٹ اٹھ آئی۔ کچھ باتیں ادھوری بھی رہ جائیں تب بھی ان کی تشنگی نہیں ہوتی۔ جیسے ڈی جے کو گنڈ مارنگ ڈی جے کہنے والا لڑکا اسے نہیں ملا تھا۔ وہ کون تھا، وہ کبھی بھی نہیں جان پائے گی۔ اور کون جانے کہ اس کو خود بھی پتہ تھا یا نہیں کہ ڈی جے اس دنیا سے چلی گئی ہے۔

کون جانے!!!

اس نے بیگ سے کپڑے ادھر ادھر کیے۔ آگے پیچھے ہر جگہ دیکھا۔ پھر دوسرا بیگ کھولا۔ اس کا ونڈ چائم کہیں نہیں تھا۔ پتہ نہیں وہ اسے کہاں بھول آئی تھی۔ دل اتنا خراب ہوا اس بات سے کہ وہ لباس بدلے بغیر، بال کچر میں باندھے ہی باہر آ گئی۔

”مطلب حد ہوگئی۔ ایک دم سے نہیں اتنی سادیں رضا بھائی نے۔ ہمارا کیا قصور؟ اور وہ فائزہ وغیرہ، ان کو بھی تو دھیان رکھنا چاہیے تھا نا۔“

ٹاللاؤنچ کے صوفے پہ بیٹھی زور و شور اور خفگی سے کہہ رہی تھی۔ حیا کو آتے دیکھا تو بات روک کر جلدی سے اٹھی۔ ”حیا آپ کا کدھر ہیں آپ، سب کہہ رہے تھے کہ آپ آتے ساتھ ہی بیمار پڑ گئی ہیں۔“ وہ بڑے تپاک سے اس کے گلے لگی۔ حیا زبردستی ذرا سی مسکرائی۔ سونا بھی اچھے سے ملی۔ باقی حشر اور ارم تو اپنے اپنے موڈ میں تھیں مگر اسے کہاں پرواہ تھی۔ منتنا اپنے مصروف انداز میں بے نیازی صوفے پہ بیٹھی میگزین کے ورق پلٹ رہی تھی۔

”تو پھر کیا تم نے فائزہ سے شکایت کی؟“ وہ سب بیٹھ گئیں تو سونا بھائی نے ٹال کو تنظر سے دیکھتے ہوئے سلسلہ کلام وہیں سے جوڑا۔ لاؤنچ کی وسط میز پر شیشے کے پیالے میں سٹرا بریز بھری تھیں۔ درمیان سے کئی ہوئی سرخ رسیلی سٹرا بریز۔ حشر بات سنتے سنتے ایک ایک پھل کر کے کھا رہی تھی۔

”ہاں آج جا کر فون کرتی ہوں فائزہ باجی کو۔ حد ہے۔“ پھر حیا کو دیکھ کر ٹال وضاحت کرنے لگی۔ ”فائزہ باجی نے پتہ ہے کیا کیا؟“

”کیا۔“ حیا نے اسی کے انداز میں دوہرایا۔ اسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ فائزہ ارسل کی بہن تھی اور ارسل وہ تھا جس کے ویسے کی رات بتایا یا

نے اس کی بے عزتی کی تھی۔

”فائزہ باجی نے ارسل بھائی کے ویسے کی تصویریں فیس بک پہ لگا دیں۔ چلو اپنی نگاہیں، خیر تھی۔ مگر ہماری نیبل کی بھی تین تصویریں

الہم میں لگا دیں اور پرائیویسی پبلک رکھ دی۔ رضا بھائی نے دیکھا اور پھر ہمیں ہی سنانے لگے۔ اب فائزہ باجی سے پوچھو کہاں کے ایجنٹ کس ہیں یہ کہ کسی اور کی تصویر یوں لگا دو؟“

وہ بس خاموشی سے ٹال کو دیکھتی رہی۔ اس کا ذہن کیلیس کی سرحد سے آگے نہیں بڑھا تھا۔

”آپ کی تصویر بھی تھی۔“ ٹال نے یاد کر کے بتایا۔ اس پہ وہ ذرا سی چوٹگی۔

”مگر آپ کی تو خیر ہے، آپ نے تو پلیٹ کر دوپٹہ لیا ہوا تھا نا۔ پتہ ہی نہیں چل رہا تھا کہ کون ہے مگر میری تو اچھی خاصی کلاس نے لی بھائی نے۔“ وہ سخت رنجیدہ تھی، غالباً ان کے گھر آتے ہوئے ہی رضا سے ان کا ٹاکرا ہوا تھا۔

”ہاں حیا کا دوپٹہ نہ ہوا، سلیمانی چغہ ہوا۔“ ارم ذرا سی ہنسی۔ حیا نے نگاہ پھیر کر اسے دیکھا۔ وہ ہاتھ میں پکڑی شیشے کی پلیٹ پر رکھی سڑا بری کوکانے میں پھسار ہی تھی۔ پھر کاٹنا منہ میں لے جاتے ہوئے اس نے حیا کو دیکھا۔ حیا کی نگاہوں میں کچھ تھا کہ ارم بے اختیار دوسری طرف دیکھنے لگی۔

”ایک تو پتہ نہیں ہمارے بھائیوں کو اپنے دوستوں کا تاخوف کیوں ہوتا ہے۔ ایسے ہم سارے زمانے میں بغیر دوپٹے کے گھومتے رہیں تب کچھ نہیں ہوتا لیکن اگر بھائی کی یونیورسٹی کے سامنے کار میں بھی گزرو تو بس۔ ہاتھ اندر کرو، سر پہ دوپٹہ لو، میرا کوئی دوست گزر رہا ہو تو دیکھنا نہیں۔ اف۔“ ثناء رضا کی نقل کرتے ہوئے بولی تو سحرش ہنس دی۔ ارم فقط مسکرائی پھر اس نے حیا کو دیکھا۔ وہ ابھی تک خاموش مگر گہری نظروں سے ارم کو دیکھ رہی تھی۔ ارم ذرا جزبہ ہو کر دوبارہ ثناء کو دیکھنے لگی۔

”جہاں نہیں آیا تمہارے ساتھ حیا؟“ سحرش نے بات کا رخ پھیرا تو حیا نے نگاہیں اس کی طرف پھیریں۔ پھر ہلکا سا ہنسی میں سر ہلایا۔ ”نہیں۔“ اس کا لہجہ سیاہ تھا۔

”اچھا تم تو کہہ رہی تھیں کہ وہ تمہارے ساتھ آئے گا۔“ معصوم سا سوال تھا مگر اسے بہت زور سے چھما۔ سونیا نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ اسے یقیناً سحرش کا لہجہ اچھا نہیں لگا تھا۔

”کہا تھا مگر ایسا ہو نہیں سکا۔“ اس نے فقط یہی کہا۔ کوئی صفائی نہیں، کوئی دلیل نہیں، کوئی منہ توڑ جواب نہیں۔ اب تو کسی بات کا دل نہیں چاہتا تھا۔

”اچھا!“ سحرش نے ذرا سے شانے اچکاتے ہوئے آگے ہو کر ایک اور سڑا بری اٹھائی۔ حیا نے سرخ پھلوں سے بھرے پیالے کو دیکھا۔ سرخ رسیلا پھل۔ سرخ جوتے۔ مین کے کنارے پد لگا خون کا سرخ قطرہ۔

اس کا دل بھرا آیا تھا۔ وہ ایک دم ابھی اور تیزی سے کمرے کی طرف گئی۔

سب نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔

نتاشا اسی طرح بے نیازی میگزین کے صفحے پلٹ رہی تھی۔



”حیا باجی آپ کا فون ہے۔“ وہ اپنے کمرے میں لیپ ٹاپ کے سامنے عائشہ کو میل لکھ رہی تھی جب نور بانو نے دروازے سے جھانک کر صدا لگائی۔ وہ اچھا کہہ کر سینٹر کا مین دبا کر ابھی اور باہر آئی۔ زندگی میں ناامیدی اتنی بڑھ گئی تھی کہ فون کی گھنٹی پہ بھی چونکنا چھوڑ دیا تھا۔ میجر احمد اسے لینڈ لائن پہ کبھی بھی کال نہیں کیا کرتا تھا سو اسے دلچسپی نہ تھی کہ کس کا فون ہے۔

”ہیلو؟“ اس نے کریڈل کے پاس رکھا الٹا۔ سیوراٹھا کرکان سے لگایا۔

”بہت شکریہ میری بات سننے اور سمجھنے کا۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ نے عقلمندی کا ثبوت دیا۔“ ولید کا مسکراتا لہجہ۔ اسے لگتا تھا کہ سارے احساس مر گئے ہیں مگر ایک ابال سا اندر سے اٹھا تھا۔ ہاں ابھی دل میں کچھ زندہ تھا۔

”جو بھی کہنا ہے صاف کہو“ وہ دبے لہجے میں فرمائی۔

”میرے خلاف وہ کیس واپس لے کر آپ نے ثابت کر دیا ہے کہ آپ ایک عقلمند خاتون ہیں۔“ لمبے بھر کو اس کے اعصاب مفلوج سے ہو گئے۔

کیس واپس؟ اس نے تو نہیں..... پھر کس نے؟

”میں نے تمہارے خلاف کوئی کیس واپس نہیں لیا“

”میں جانتا ہوں کہ آپ کے دباؤ پہ ہی یہ ہوا ہے اور میں جانتا ہوں کہ آپ نے یہ کیوں کیا ہے۔ یہ کال آپ کا شکر یہ ادا کرنے کے

لیے کی تھی اور یہ پوچھنے کے لیے کہ ہم پھر کبل رہے ہیں؟“ وہ جیسے بہت مسرور اور مطمئن تھا۔

اس کے اندر جوار بھانا پکنے لگا۔ بمشکل اس نے ضبط کیا۔ ”میں فون رکھ رہی ہوں“

”کل دوپہر ایک بجے میں جناح سپردالے پڑا ہٹ پہ آپ کا انتظار کروں گا۔ ضرور آئیے گا، مجھے کچھ اہم باتیں کرنی ہیں، کیونکہ ابھی

وہ آرکیٹیکٹ والا مسئلہ حل نہیں ہوا!“

”اچھا اور تمہیں لگتا ہے میں آ جاؤں گی۔ وہ اور ہوتی ہیں کمزور لڑکیاں جو تم جیسوں سے ڈر جاتی ہیں۔ مائی فٹ۔“ (اتنا غصہ آیا تھا کہ

دل چاہیہ فون دیوار پہ دے مارے)

”آپ کو آتا ہوگا۔ یاد رکھیں وہ ویڈیو میرے پاس ہے۔ اگر آپ نہیں آئیں تو میں آپ کے گھر آ کر وہ ویڈیو آپ کے بی ٹی وی پہ چلا کر

دکھاؤں گا اور یہ میرا وعدہ ہے۔“ اس کے لہجے کی سفاکی..... حیا کا دل لرز کر رہ گیا مگر جب بولی تو آواز مضبوط تھی۔

”تو پھر تم کرگزرو جو تم کرنا چاہتے ہو۔ ایسا سوچنا بھی مت کہ میں تم سے یوں ملنے چلی آؤں گی۔ جنم میں جاؤ تم۔“ کہہ کر اس نے

فون زور سے کریدل پر پٹکا۔ پھر تیزی سے مڑ کر باکے کمرے کی طرف گئی۔

وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ٹائی کی ناٹ صحیح کر رہے تھے۔ آفس جانے کے لیے بالکل تیار۔

”ابا کیا آپ نے ولید کے خلاف کیس واپس لے لیا؟“ وہ پریشانی سے کہتی بنا اجازت اندر آئی۔ سلیمان صاحب نے چونک کر اسے

دیکھا اور پھر واپس شیشے کے سامنے ہو کر ٹائی کی ناٹ تنگ کرنے لگے۔

”ہاں، واپس لے لیا۔“

”مگر کیس؟“ وہ صدمے سے بولی۔

”پہلی بات یہ کہ وہ بہت ہی کمزور کیس تھا۔ دوسری بات یہ کہ ہمارے پاس کوئی خاص گواہ نہیں ہے۔ اور تیسری بات اس کی گاڑی سے

کسی کو نقصان نہیں پہنچا۔ فرقان بھائی کو چوٹ گرنے سے آئی تھی اس لیے اس کیس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ اب پرفیوم اٹھا کے خود پہ پیرے کر رہے

تھے۔ بیماری نے ان کے پہلے سے کافی کمزور کر دیا تھا لیکن اب وہ دن بدن رو بصحت تھے۔

”مگر ابا آپ جانتے ہیں کہ اس نے مجھے مکر مارنے کی کوشش کی۔“

”حیا میں اسے اس طرح نہیں چھوڑوں گا۔ آرکیٹیکٹ کے ساتھ مل کر جو اس نے بے ایمانی کی ہے، اس پہ میں اسے آڑے ہاتھوں

لوں گا۔ تمہوڑا انتظار تو کرو۔“ لیکن ابا کی بات کے برعکس ان کا لہجہ غیر سنجیدہ تھا۔ وہ مزید سے بغیر بھاگتی ہوئی باہر آئی۔ چند ہی لمحوں بعد وہ تایا فرقان

کے گھر تھی۔

تایا ابا اور صائمہ تائی ڈرائنگ روم میں اکیلے ناشتہ کر رہے تھے۔ لڑکے کام پر تھے۔ سونیا اور ارم بھی ساتھ نہ تھیں۔

”تایا ابا۔“ وہ پریشانی سے ان کے پاس آئی۔

”آؤ حیا، طبیعت کیسی ہے؟“ وہ ہموار لہجے میں بولے، ساتھ ہی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ پہلے جیسی محبتیں بھی نہیں مگر پچھلے کچھ عرصے

والی رکھائی بھی نہیں۔ درمیانہ سا انداز۔

”تایا ابا، آپ لوگوں نے ولید کے خلاف کیس کیوں واپس لے لیا؟“ وہ بے چینی سے وہیں کھڑے کھڑے بولی۔ صائمہ تائی اس کے

لہجے پہ بے اختیار پلٹ کر اسے دیکھنے لگیں۔

”میں نے نہیں لیا تمہارے ابا نے لیا ہے۔ اور وہ اتنے غلط بھی نہیں ہیں۔ کیس کمزور ہے۔ وقت اور پیسے ضائع کرنے کا فائدہ؟“

”مگر اس طرح تو وہ اور بھی شہر ہو جائے گا۔ وہ سمجھ گا کہ ہم.....“

”حیا ہم سب ٹھیک ہیں۔ چوٹ مجھے لگی تھی۔ جب میں سمجھوتہ کرنے پہ مجبور ہوں تو پھر؟“۔ تایا ابا بھی شاید ولید کے خلاف کسی سخت

کارروائی کے حق میں نہ تھے۔ کاروباری سیاستیں۔ اف۔

”اور آرکیٹیکٹ والا کیس؟“

”دیکھو ہم اس کو کھلم کھلا تو ذیل نہیں کر سکتے۔ کمپنی کی ساکھ کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ مگر تمہارے ابا اس سے ضرور نمٹیں گے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم فکر نہ کرو“

وہ جانتی تھی کہ اب اس سے کوئی نہیں بنے گا۔ وہ اسے صرف اور صرف اس کو آرکیمیٹ والے کیس کا ڈراوا دے رہے تھے تاکہ اس کو سیدھا کر کے رکھ سکیں۔ شطرنج۔ بساط۔ سیاست۔

”آپ نہیں سمجھیں گے۔“ اس نے تاسف سے نفی میں سر جھٹکا۔

”جیا جہاں نہیں آیا؟“ صائمہ ثانی نے ان کی گفتگو کو اختتام پذیر ہوتے دیکھا تو رہ ناکسیں۔

اللہ اللہ۔ پھر وہی سوال؟ اس کے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔

”وہ نہیں آ سکا ثانی۔“ آواز بھی دھیمی پڑ گئی۔

”تو کب آئے گا تمہارے ابا اور اماں تو چاہ رہے تھے کہ تمہارا نکاح بھی رو حیل کے ویسے کے ساتھ اناؤنس کریں۔ مگر.....“ ثانی نے ہنکارہ بھر کر بات ادھوری چھوڑ دی۔ وہ نامکمل معنی اخذ کیے بغیر پلٹ دی۔ تایا ابا اس وقت اخبار کی طرف متوجہ ہو چکے تھے۔

ہر کوئی پوچھتا تھا کہ وہ نہیں آیا، کوئی یہ کیوں نہیں پوچھتا تھا کہ وہ کیوں نہیں آیا۔ سب اپنے مفاد کی بات پوچھتے تھے۔ جہاں کی تو کسی کو فکر نہ تھی۔

☆ ☆ ☆

اس کی میل پہ عائشہ کا جواب آ گیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ شام میں آن لائن ہوگی، تب وہ دونوں بات کریں گی۔ وہ عائشہ سے کیا بات کرنا چاہتی تھی، وہ نہیں جانتی تھی، بس وہ اپنا دکھ اور اضطراب کسی سے بانٹنا چاہتی تھی۔ کسی سپاہی کی بیوی ہو کر دنوں، ہفتوں، مہینوں اس کا صبر سے انتظار کرنا کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے، وہ اب جان پاتی تھی۔

”کیسی ہو؟“ اسکرین پہ عائشہ کا شفاف، خوبصورت چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ وہ کمپیوٹر کے سامنے ریو الونگ چیئر پہ بیٹھی تھی، اور بات کرتے ہوئے وہ شیشے کی ننھی پیالی سے ترک چائے کے گھونٹ بھر رہی تھی۔

”مجھے نہیں پتہ میں کسی ہوں؟“ وہ اداسی سے بولی تھی۔ ملگجے لباس، اور کچر سے بندھے بالوں میں جیا بہت کمزور اور افسردہ دکھائی دیتی تھی۔

”کیا ہمارا اناطولیہ اچھا نہیں لگا؟“ عائشہ نے حیرت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ پیالی سائیڈ پہ رکھی۔ (کپا دو کیہ، وسطی اناطولیہ میں واقع تھا۔)

”نہیں، بہت اچھا لگا۔“ وہ پھیکا سا مسکرائی۔

”بہارے بتا رہی تم لوگ انقرہ بھی گئے تھے، کیا اس کے جانے کے بعد تم نے انقرہ دیکھا یا واپس آ گئی؟“

”میں کیلیس چلی گئی تھی۔“ اس کے لبوں سے پھسلا۔

چائے کی پیالی اٹھائی عائشہ ذرا چوکی تھی۔

”اچھا؟ کس دن گئیں تم کیلیس؟“

”اتوار کو گئی تھی، منگل کی دوپہر واپس آ گئی۔“ اب چھپانے کا کیا فائدہ تھا۔ عائشہ چند لمحے کچھ سوچتی رہی تھی۔ پیالی اس کے ہاتھ میں تھی، مگر وہ اسے لبوں تک لے جانا جیسے بھول گئی تھی۔

”کیا بارڈر وہاں سے بہت قریب پڑتا ہے؟“

”ہاں! بہت قریب!“ اس کی نگاہوں کے سامنے پھر سے وہی رات گھوم گئی۔ وہ خوفناک، برستی بارش والی رات۔

”تو کیا بارڈر کی ساری خبریں کیلیس میں لوگوں کو مل جایا کرتی ہیں؟“

”کس قسم کی خبریں عائشہ؟“ اس نے اچھنبے سے اسکرین کو دیکھا۔

”مطلب جو لوگ ایگل بارڈر کراس کرتے ہیں، ان کی گرفتاری کی خبریں۔ کیا منگل کی صبح تم نے کوئی ایسی خبر سنی تھی؟“ وہ بہت سوچ سوچ کر بول رہی تھی۔ اور لمحے بھر کے لیے حیا کو لگا، اس کا سانس رک گیا ہے۔

”وہ اپنی بہن کی جاسوس ہے، ساری باتیں اس کو بتاتی ہوگی۔“

”تمہارا موبائل تمہارے پاس تھا بہارے؟“

”کیا تم لوگ کیلیس جاؤ گے۔ عبدالرحمن کیلیس کا نام لے رہا تھا۔“

”حیا؟“ عائشہ نے اسے پکارا۔ وہ چونکی۔ کڑیاں سے کڑیاں ملائیں تو ایک عجیب سا خیال ذہن میں ابھرا۔ نہیں، یہ نہیں ہو سکتا تھا۔ عائشہ کسی کو، پولیس کو کیوں بتائے گی؟ مگر پھر وہ بارڈر کی گرفتاری کے بارے میں سننے میں اتنی دلچسپی کیوں رکھتی تھی؟

”ہاں، پیر اور منگل کی درمیانی رات وہ بارڈر کراس کر رہا تھا عائشہ، مگر سکیورٹی اہلکار اس کے انتظار میں تھے۔ وہ گرفتار ہوا یا مارا گیا، میں نہیں جانتی۔ مگر میں اتنا جانتی ہوں کہ..... کہ وہ اس کے انتظار میں تھے کیوں کہ تم نے ان کو بتایا تھا۔ ہے نا؟“ پتہ نہیں کیسے یہ سب اس کے منہ سے نکلا تھا۔ لاشعور میں جڑتی کڑیاں مل کر ایک ایسی زنجیر بن گئی تھیں جس نے اس کے گلے میں پسند اڑال دیا تھا۔

عائشہ نے سمجھ کر خاموش ہو گئی۔ حیا کو لگا، وہ انکار کر دے گی، مگر وہ جھوٹ نہیں بول سکتی تھی۔

”ہاں، میں نے ان کو کال کی تھی۔ یہ میرا فرض تھا۔ اگر مجھے یہ معلوم ہو کہ ایک قومی مجرم قانون توڑنے جا رہا ہے، تو مجھے سکیورٹی فورسز کو بتانا چاہیے تھا۔“

وہ بے یقینی سے عائشہ کو دیکھ رہی تھی۔ وہ کتنے آرام سے یہ سب کہہ رہی تھی۔ کیا اسے نہیں معلوم تھا وہ کیا کہہ رہی تھی؟

”مرحبا حیا!“ بہارے کہیں پیچھے سے آئی اور بہن کے کندھے سے جھول کر چپک کر اسکرین میں دیکھا۔ حیا نے جواب نہیں دیا، وہ ابھی تک عائشہ کو دیکھ رہی تھی۔

”عبدالرحمن مجرم نہیں تھا عائشہ! وہ مجرم نہیں تھا!“

چائے کا گھونٹ بھرتے بھرتے عائشہ گل بھری۔ اس کی آنکھوں میں نہجدا ابھرا۔ ”عبدالرحمن کا کیا ذکر؟“

”تم.....“ حیا نے لب کھولے، مگر رک گئی۔ اس کے اندر ابلتا غصہ، بے یقینی سب کچھ رک گیا۔ کہیں کچھ غلط تھا۔

”تم..... تم نے.....“ عائشہ..... ہم عبدالرحمن کی بات کر رہے ہیں جسے میں نے کیلیس میں کھو دیا ہے۔“ بے بسی سے اس نے کہا

چاہا۔ بہارے کبھی عائشہ کو دیکھتی اور کبھی اسکرین کو۔

چائے کی پیالی بے اختیار ایک طرف رکھتے ہوئے وہ سیدھی ہوئی اس کی آنکھوں میں ابھری حیرت اب بے یقینی میں بدل گئی تھی۔

”عبدالرحمن کیلیس میں کیا کر رہا تھا؟“

”تم جانتی ہو وہ کیا کر رہا تھا۔ تم نے سکیورٹی کو بتایا اس کے بارڈر کراسنگ کا.....“

”حیا، وہ کیلیس میں نہیں تھا، اسے انقرہ سے جرمنی جانا تھا، وہ کیلیس کیوں گیا؟“

”تم جہاں ہو وہ کیلیس میں تھا عائشہ۔ تمہیں..... بہارے نے بتایا تھا، مجھے معلوم ہے.....“ جذبات کی شدت سے اس کی آواز بلند ہو گئی تھی۔

”بہارے گل، تم جانتی تھیں؟“ عائشہ نے بے یقینی سے اپنی بہن کو دیکھا۔ وہ بے ساختہ سہم کر پیچھے ہوئی۔

”میں نے کچھ نہیں کیا۔ سب مجھے ایسے کیوں دیکھتے ہیں؟“ اس کی آنکھیں ڈبڈبائیں۔

”وہ منگل کی رات بارڈر کراس کرنے جا رہا تھا، کیا یہ تمہیں بہارے نے نہیں بتایا؟“

”وہ بارڈر کراس کرنے جا رہا تھا؟ نہیں حیا..... نہیں ہو سکتا۔“ عائشہ ابھی تک بے دم بخود تھی۔ ”میں نے اس کے بارے میں تو کسی کو کچھ نہیں کہا۔ میں نے تو نصوح فخری کے بارے میں بتایا تھا۔ سکیورٹی کو، اس نے بارڈر کراس کرنا تھا، منگل اور پیر کی درمیانی شب!“

”وہ جہاں تھا عائشہ، جس کے بارے میں تم نے ان کو بتایا..... اور..... اور..... تم نے کال ہی کیوں کی سکیورٹی کو؟“ وہ دبی دبی

چلائی تھی۔

اس رات کے زخم، بارود کی بو، روشنی کے گولے، سب پھر سے تازہ ہو گیا تھا۔
 ”کیونکہ مجھے عبدالرحمن نے ایسا کرنے کو کہا تھا۔“ وہ بے بسی سے بولی تھی۔ بہارے نے تائید میں سر ہلایا۔
 ”میری بہن سچ کہہ رہی ہے، میں نے ان کی باتیں سنی تھیں چرچ میں۔“ اور حیا کو لگا، وہ اگلا سانس نہیں لے سکے گی۔

☆ ☆ ☆

”عائشے تمہارا فون بج رہا ہے۔“ آنے کے پکارنے پر وہ چونکی، گود میں رکھا موبائل جانے کب سے بج رہا تھا۔
 ”بہارے!“ نمبر پر لکھا نام بہت محبت سے لے کر اس نے آنے کو بتایا اور سبزیشن دبا کر فون کان سے لگایا۔
 ”سلام علیکم!“ اس نے مسکرا کر سلام کیا۔

”علیکم السلام۔ کیسی ہو؟“ ایران سے ہزاروں کلومیٹر دور، وہ اہلارہ وادی کے چرچ میں کھڑا، بہارے کے فون کو کان سے لگائے کھڑا تھا۔ ساتھ ہی اس نے پلٹ کر دیکھا۔ چرچ کے کھلے دروازے سے بیرونی میزریاں نظر آ رہی تھیں جو پہاڑ کے نیچے تک جاتی تھیں۔ حیا ابھی نماز پڑھ کر نہیں آئی تھی، اور بہارے کے پرس سے فون پہلے سے نکال کر، اس نے اسے تصویریں کھینچنے چرچ کی اوپری سنزل پر بھیجا تھا۔
 ”میں ٹھیک ہوں، تم سناؤ، ترکی والے کیسے ہیں؟“ اس کی مسکراہٹ ابھی خوبصورت ہو گئی۔ طمانیت کے سارے رنگ آنکھوں میں اتر آئے تھے۔ بہت دن بعد اس نے عبدالرحمن کی آواز سنی تھی۔

”عائشے، یاد ہے تم نے کہا تھا کہ تم مجھے ایک فیور دو گی؟“ وہ چرچ کی چوکھٹ میں کھڑا سیڑھیوں کو ہی دیکھ رہا تھا۔ حیا کے آنے سے پہلے پہلے اسے بات ختم کرنی تھی۔

”ہاں، بتاؤ، کیا ہوا؟“

”تم ترکی کے سب سے بڑے بارڈر کے بارے میں کیا جانتی ہو؟“

”کون سا بارڈر؟ ترکی اور شام کا؟“ دوسری جانب وہ چونکی تھی۔

”ہاں، اس بارڈر کو ایک قومی مجرم اس منگل کی رات کر اس کرے گا، غیر قانونی طور پر۔ ایسے میں تمہیں کچھ کرنا ہے۔“

چند لمحے کی خاموشی کے بعد، (غالباً وہ کسی اور جگہ آ گئی تھی) وہ بولی۔

”ہاں، کبو پھر، میں سن رہی ہوں۔“

”ترکی کا تم پر قرض ہے عائشے، اپنے دل سے پوچھو کہ اگر تمہیں معلوم ہو جائے کہ ایک مجرم، ترکی کا ایک قومی مجرم غیر قانونی طریقے

سے سرحد پار کر رہا ہے تو تمہیں کیا کرنا چاہیے؟“

عائشے خاموش رہی تھی۔ وہ آواز مزید دہی کرتے ہوئے بولا

”تمہیں بارڈر سیکورٹی فورس کے کمانڈر کو فون کرنا چاہیے، تمہیں ان کو بتانا چاہیے سب کچھ تا کہ وہ اسے گرفتار کر سکیں، مگر نہیں، عائشے

گل یہ کیسے کرے گی؟، عائشے گل تو کچھ نہیں کر سکتی۔“

”ذرا اونچا بولو، اتنا آہستہ مجھے سمجھ نہیں آ رہا۔ کیا کوئی آس پاس ہے؟“ وہ بُرا مان کر ذرا خشکی سے بولی، جیسے آخری فقرے کو نظر انداز

کرنا چاہ رہی ہے۔

”میں نہیں چاہتا کہ کوئی سنے۔ تم یہ سب لکھ لو۔ اور کمانڈر کا نمبر بھی۔“

پھر وہ اسے تمام ضروری باتیں بتاتا گیا، اور وہ لکھتی گئی۔

”ابنیں تمہاری کال ٹریس کرنے میں نوے سیکنڈ لگیں گے، تم نے اسی ویس سیکنڈ کال کاٹنی ہے۔ تم یہ کرو گی نا؟ تم نے مجھ سے وعدہ کیا

تھا۔“ اور جیسی اس کو اپنی پشت پر آہٹ کا احساس ہوا، وہ تیزی سے پلٹا۔ اندر چرچ کی سیڑھیوں پر حرکت سی ہوئی تھی۔

”کوئی آ گیا ہے، بعد میں کال کروں گا۔“ اور اس کا مہربان سننے سے قبل ہی وہ سبک رفتاری سے آگے آیا، اور سیڑھیوں کی اوٹ میں

کھڑی بہارے گل کوکان سے پکڑ کر باہر نکالا۔

”میں ابھی آئی تھی، واللہ! میں نے کچھ نہیں سنا۔“ چھوٹی ملی بوکھلائی تھی مگر وہ لب بھینچے، برہمی سے اسے چرچ سے باہر لایا تھا۔

”تو تم میری باتیں سن رہی تھیں۔ تمہیں تمہاری بہن نے سکھایا نہیں ہے کہ کسی کی باتیں چھپ کر نہیں سنتے؟“

”میری بہن کو کچھ مت کہو۔“

”جو تم نے سنا ہے، اگر وہ تم نے حیا کو بتایا تو مجھ سے رُک کوئی نہیں ہوگا بہارے۔“

وہ دبے دبے غصے سے کہہ رہا تھا۔ ”اور اگر تم نے اپنی بہن کو بتایا کہ میں نے یہ بات حیا کو بتانے سے منع کیا ہے، تو میں واقعی بہت بُرا

پیش آؤں گا۔“

سیرھیوں پہ تک تک کی آواز گونجنے لگی۔ وہ اوپر آ رہی تھی۔ جہان نے بہارے کو موبائل واپس کیا جسے اس نے جلدی سے اپنے پرس

میں ڈال دیا۔

”اگر تم نے میری بات نہ مانی بہارے۔“

”میں نے کچھ نہیں سنا۔“ وہ روہا سی ہو گئی تھی۔ حیا تک اوپر پہنچ چکی تھی۔

☆ ☆ ☆

”اس نے یہ سب کہا؟“ وہ بے یقینی سے اسکرین پر نظر آتیں عائشے اور بہارے کو دیکھ رہی تھی۔

”ہاں، میری بہن سچ کہہ رہی ہے۔ میں نے خود سنا تھا۔“

”تم نے یہ سب سنا تھا؟“ اور وہ سمجھتی رہی کہ شاید اس نے اس کی اور جہان کی باتیں سنیں تھیں، مگر وہ تو اردو میں بات کر رہے تھے، وہ سن

بھی لیتی تو اسے کیا سمجھ آتا؟ اس نے ان کی باتیں سن ہی نہیں تھیں۔ وہ ایک دفعہ پھر ایک طرف کی کہانی سے نتیجہ اخذ کر گئی تھی۔

”اس نے اپنی خبری خود کروائی؟ اس نے خود کو خود گرفتار کروایا؟ مگر کیوں؟“ اس سارے قصے کا کوئی سنسن نہ بنتا تھا۔ وہ حیران تھی۔

پریشان تھی۔

”تمہیں کیسے پتہ کہ وہ گرفتار ہو گیا ہے؟“ عائشے نے بے چینی سے پوچھا۔

”میں نے خود دیکھا تھا، وہ۔۔۔۔۔ حیا کے الفاظ لیوں پہ ٹوٹ گئے۔ اس نے کیا دیکھا تھا؟ ہیولے؟ دھواں؟ روشنی کے گولے؟ ایک

طرف کی کہانی؟

”مجھے نہیں پتہ میں نے کیا دیکھا تھا۔ مجھے نہیں پتہ۔“ وہ بے بسی سے نفی میں سر ہلانے لگی۔ پھر ایک دم جھماکے سے اسے یاد آیا۔

جہان کے جوتوں کا رخ۔۔۔۔۔ جب وہ اٹھا تھا تو اس کے جوتوں کا رخ بائیں جانب تھا، حالانکہ وہ سرحد کی طرف منہ کیے کھڑا تھا۔ کیا وہ

سرحد کی طرف نہیں جا رہا تھا؟ وہ بائیں جانب جا رہا تھا؟ مگر بائیں طرف کیا تھا؟

”پلیز تمہیں جب بھی کچھ پتہ لگے، مجھے ضرور بتانا۔ اگر اسے میری وجہ سے کچھ ہوا تو میں ساری زندگی خود کو معاف نہیں کروں گی۔“

عائشے بہت فکر مند ہو بے چین ہو گئی تھی۔ حیا نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلایا۔ عائشے کو تسلی دینے کے لیے ایک لفظ بھی اس کے پاس نہ تھا۔

سرحد کی وہ رات اور ہر قلینس کی دائمی آگ سے اٹھتے دھوئیں کے مرغولے، سب پھر سے ذہن میں تازہ ہو گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس نے دیوار پہ لگے کیلنڈر کی تاریخوں کو ایک دفعہ پھر دیکھا۔ ابھی ابھی اس نے سرخ چین سے آج کی تاریخ یعنی ہفتے کا دن کاٹا تھا۔

اب مزید دو روز باقی تھے۔ پھر منگل تھا۔ چین رکھ رکھ کر وہ ڈیرنگ ٹیبل تک آئی اور آئینے میں خود کو دیکھا۔ ڈوبتی امید کے درمیان اس کا دل جبنے

سنور نے، تیار ہونے، کسی بھی چیز کو نہیں چاہ رہا تھا۔ سادہ سفید شلوار قمیص اور شانوں پہ پھیلا سفید دوپٹہ اور ڈھیلے جوتے میں بندھے بال، ویران

آنکھیں۔ دل تو وہیں زیتون کے درختوں میں کھو گیا تھا۔

وہ بہر آئی تو روئیل کچن کی آدھ کھلی دیوار کے پیچھے سے نظر آ رہا تھا۔ اسے آتے دیکھ کر ذرا سا مسکرایا۔

”ہوگی؟“ وہ کپ میں کانٹے سے کافی پھینٹ رہا تھا۔

”اؤہوں!“ وہ ہلکا سا نفی میں سر ہلاتے آگے آئی اور ہکن کی سینئر ٹیبل کی کرسی کھینچ کر بیٹھی۔

”اور کیا ہو رہا ہے؟ جہان نے کب آنا ہے؟“ گھوم پھر کر وہی سوال۔

”اچھا ہے نا وہ نہیں آیا۔ سب خوش ہو گئے۔ اسے اور مجھے ساتھ دیکھ کر خوش تھا ہی کون بھلا۔“ وہ تلخی سے بولی۔

”ارے میں تو خوش تھا بلکہ وہ آتا تو اور بھی خوش ہوتا۔ خیر پھوپھو کہہ رہی تھیں کہ وہ منگل کو آ جائے گا؟“ روئیل پوچھ رہا تھا یا بتا رہا تھا وہ

سمجھ نہیں سکی۔ پھوپھو کو تو اس نے خود ہی بتایا تھا مگر جب اسے خود ہی یقین نہیں تھا تو روئیل کو کیا دلاتی۔

”متناشا کہاں ہے؟“ اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے موضوع بدلا۔

”اندر ہوگی۔ ویسے کے لیے اپنے ڈریس کی ڈیزائننگ کرتی پھر رہی ہے۔“

”اچھا، خوش ہے وہ پاکستان آکر؟“

”ہوں۔“ روئیل نے کافی پھینٹتے ہوئے ذرا سے شانے اچکائے۔ یہ ہاں تھا یہ ناں، وہ سمجھ نہیں پائی۔

”اور اب تو اب بھی جہان سے خوش تھے۔“

”تو پہلے کونساہ.....“ وہ کہتے کہتے رکی۔ ایک دم سے کچھ یاد آیا تھا۔ بھوک ادا میں جب روئیل سے اس کی بات ہوئی تھی تب اس نے

کچھ بتایا تھا۔ ”تم نے بتایا تھا روئیل یاد ہے کہ اب کسی وجہ سے جہان سے نفرت تھی۔“

”چھوڑ دیا۔ رہنے دو، وہ تو بس ایسے ہی۔“

”نہیں مجھے بتاؤ تو سہی، تم نے کہا تھا بعد میں بتاؤں گا۔“

”کوئی خاص بات نہیں تھی۔ لیکن جب اب اڑیڑھ سال پہلے اتنبول میں سین پھوپھو سے ملے تھے تو انہوں نے کسی لڑکی کو جہان کو

ڈراپ کرتے دیکھا تھا۔ بس اسی بات سے ان کے دل میں گرہ لگ گئی تھی۔ مگر خیر چھوڑو۔ اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں سے کیا فرق پڑتا ہے۔“

اور حیا کو تو یہ بات اتنے سے یاد تھی۔ اس نے اب اور تایا کی باتیں سنیں تھیں۔ ہاں وہ یہی بات کر رہے تھے۔ لیکن جہان نے اسے یہ بات

کبھی نہیں بتائی کیونکہ اس نے پوچھی نہیں تھی۔ تو کیا ابھی بھی کچھ ایسی باتیں تھیں جو وہ اسے نہیں بتاتا تھا جیسے عائشہ کو وہ سب کہنا۔ اف۔

وہ دونوں ابھی وہیں بیٹھے تھے کہ فون کی کھنٹی بجی۔ حیا نے آگے ہو کر فون اٹھایا۔ ذہن میں پہلا خیال ولید کا آیا تھا۔

”حیا کیا تم فارغ ہو؟“ صائمہ تائی بہت ہی شیریں لہجے میں بول رہی تھیں۔ یقیناً کوئی کام تھا۔

”جی بتائیے۔“

”ارم کے ساتھ مارکیٹ تک ہواؤ۔ کچھ قمیصیں لینی ہیں اسے اور اپنے تایا کو تو تمہیں پتہ ہی ہے، وہ اکیلے جانے کہاں دیتے ہیں۔“

”اوکے میں آ رہی ہوں۔“

کوئی اور وقت ہوتا تو شاید وہ نہ آتی لیکن اسے ارم سے بھی تو بات کرنی تھی۔ سو ایک کچھ پہنچ کر وہ اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی۔



اس نے کار پارکنگ ایریا میں روکی اور گیزو کو نیوٹرل پہ کیا۔ چابی گھماتے ہوئے ارم کو دیکھا۔ شلو ارقیس پر سرکارف لیے وہ ذرا بے چین

بے چین نگاہوں سے شاہنگ پلازہ کو دیکھ رہی تھی۔

”چلیں؟“ اس کی بات پہ ارم چونکی۔

”ہاں چلیں۔ مجھے کچھ قمیصیں لینی ہیں۔ بلکہ ایسا کرتے ہیں کہ.....“ ارم ذرا تذبذب سے رکی۔ ”مجھے پنک کمر میں لان چاہیے۔ تم

یوں کرو، تم شاپ کے اندر چلی جاؤ جو اچھے لگیں، نکلوالینا۔ تمہارا ٹیسٹ بھی زیادہ اچھا ہے۔ مجھے کچھ جیولری بھی اٹھانی تھی، میں تب تک دوسرے

پلازہ سے اٹھاؤں۔ تم بیٹھو میں آتی ہوں۔“

وہ جیسے ساری تمہید تیار کر کے لائی تھی اور اب جلدی جلدی لاک کھولنے لگی۔

”میں بھی ساتھ چلتی ہوں۔“

”نہیں خیر ہے۔ تمہاری طبیعت نہیں ٹھیک، تمہیں یوں کیوں تھکاؤں۔ بس دس منٹ تو لگیں گے۔“

”ارم اگر تمہیں یوں اکیلے جانا ہے تو پہلے اپنے اپنے ابا سے پوچھ لو۔“ اس نے کہنے کے ساتھ ہی اپنے موبائل پر تایا کا نمبر ملایا اور کال کے بٹن پر ہاتھ رکھ کر دبائے بغیر سکرین ارم کو دکھائی۔ دروازے کو کھولتا ارم کا ہاتھ ٹھہرا۔ آنکھوں میں الجھن اور پھر غصہ در آیا۔

”تمہیں کیا لگتا ہے میں کسی لڑکے سے ملنے جا رہی ہوں؟“

”نہیں مجھے لگتا ہے تم ولید سے ملنے جا رہی ہو۔“

اس نے بغور ارم کو دیکھتے ہوئے رساں سے کہا۔ ایک لمحے کے لیے ارم کے چہرے کا رنگ بدلا۔ اس نے تھوک نگلی۔ مگر پھر وہ جی کڑا کر بولی۔

”اور اگر جا بھی رہی ہوں تو کیا کر لو گی تم؟“

”میں اکیلی گھر چلی جاؤں گی اور کسی کو کچھ بھی نہیں کہوں گی۔ پھر جب تم تنہا آؤ گی تو سب کو خود ہی وضاحت دو گی۔ میں تمہارے لیے قربانی کا بکرا کیوں بنوں ہمیشہ؟“

”میں کسی سے نہیں ڈرتی حیا!“

”وہ تو مجھے معلوم ہے۔ تم نے جو میری ویڈیو دینے کی حرکت کی ہے اس سے پتہ چل گیا تھا کہ تمہیں اللہ کا خوف بھی نہیں ہے۔“

”کوئی ویڈیو؟“ ارم نے ابرو اٹھائی۔ چہرے کا بدلتا رنگ گواہی دے رہا تھا کہ یہ حرکت اسی نے کی تھی۔ فون پر بھلے وہ جتنی مضبوطی سے بات کر لے، سامنے کی بات اور ہوتی ہے۔

”تمہیں بھی پتہ ہے اور مجھے بھی پتہ ہے کہ میں کس ویڈیو کی بات کر رہی ہوں۔ تم نے اس طرح کرنے سے پہلے اتنا بھی نہیں سوچا کہ اس میں تمہاری بھی بدنامی ہوگی۔“ وہ دکھ سے ارم کو دیکھتے ہوئے بولی۔ گاڑی کے شیشے آدھے کھلے تھے، اس کے باوجود باہر کے شور سے بے نیاز وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہی تھیں۔ حیا دکھ سے اور ارم تلخی سے۔

”میری زیادہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے تمہیں۔ میری جتنی بدنامی تم نے کروائی تھی کروالی۔“

”ارم تم ولید سے وہ ویڈیو واپس لے لو۔“ اس نے التجائیں کی تھی بس قطعیت سے کہا تھا۔

”اچھا، یہ چاہتی ہوں۔ اور اگر میں نہ لوں تو؟“ ارم کے چہرے پر کڑوی سی مسکراہٹ تھی۔

”تو تم نتائج کی ذمہ دار خود ہو گی۔“

”اور اگر میں اس شرط پر لوں گی ابا کے سامنے جا کر تم کہو گی کہ میں اس رات تم ہی سے بات کر رہی تھی اور وہ تمہارا ہی کوئی جاننے والا تھا جس نے ابا کے فون کرنے پر فون اٹھایا تھا تو کیا تم ایسا کر لو گی؟“

حیا چند لمحے بہت دکھ سے اسے دیکھتی رہی۔

”یونوائٹ، تم اور ولید ایک جیسے ہو۔ جب خود پھنسنے ہوئے ہوتے ہو تب بھی تمہیں لگتا ہے کہ دوسروں کو اپنے اشاروں پر نہچا سکتے ہو۔ میں ایسا کبھی بھی نہیں کروں گی۔“

”تو پھر ٹھیک ہے۔ کرنے دو ولید کو اس ویڈیو کے ساتھ جو وہ کرنا چاہتا ہے۔“

چند لمحے دونوں کے درمیان ایک تلخی خاموشی حاکم رہی۔ حیا سوچتے ہوئے ونڈ سکرین کے پار دیکھتی رہی۔ کسی طرح اسے ارم کو کنوئس کرنا تھا کہ وہ ولید سے وہ ویڈیو لے لے، کسی بھی طرح۔

”ارم میری بات سنو۔ اس میں تمہارا پارٹ بھی ہے۔ صرف میں نہیں، تم بھی بدنام ہو جاؤ گی۔“

پہلی دفعہ ارم کے چہرے پر ایک مطمئن سی مسکراہٹ ابھری۔

”آرپیٹیور حیا کہ اس میں میرا پارٹ بھی ہے؟“

اور حیا سن رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ ارم نے اپنا پارٹ ایٹ کر دیا تھا اور وہ ان کاموں میں بہت اچھی تھی۔ اسے پہلے یہ خیال کیوں نہیں آیا کہ وہ ایسا بھی کچھ کر سکتی تھی۔

”تو تم نے صرف مجھے بے عزت کرنے کے لیے یہ سب کچھ کیا۔ ارم تم مجھ سے اتنی نفرت کرتی ہو؟“ وہ جوتانی دیر سے پاٹ لہجے میں بات کر رہی تھی اب کہ اس کی آواز میں شدید صدمہ در آیا تھا۔

”ہاں کرتی ہوں اور مجھے تمہارے اس برقعے سے بھی نفرت ہے۔ ہمیشہ تمہاری وجہ سے مجھے اب اسے باتیں سننی پڑتی تھیں۔“ ارم ایک دم پھٹ پڑی تھی۔ ”جب روجیل بھائی امریکا گئے اور تم یونیورسٹی تو تم ایک دم ماؤرن ہو گئیں۔ اب تمہیں کچھ نہیں کہہ سکتے تھے سوانہوں نے مجھ پر روک ٹوک زیادہ کر دی کہ کہیں میں تمہارے جیسی نہ بن جاؤں۔ تمہاری وجہ سے مجھ پہ سختیاں بڑھی ہیں اور اب میں تنگ آگئی ہوں اس زبردستی کے سکارف سے۔ میرا بس چلے تو میں اس شہر کی ساری سکارف شاپس کو آگ لگا دوں۔ نہیں کرنا مجھے سکارف، کیوں کرتے ہیں اب اتنی سختی۔“ وہ ایک دم رونے لگی تھی۔

”تو پھر کیا کریں وہ سختی تا کریں تو کیا اپنی بیٹیوں کا کھلا جھوڑ دیں کہ جو مرضی کرو؟ ایسا نہیں ہو سکتا ارم۔ ہاں ٹھیک ہے ان کو ذہن سازی بھی کرنی چاہیے۔ انہیں سکارف کے لیے پہلے کنوں کرنا چاہیے۔ مگر ارم ان کی نیت تو ہمیشہ اچھی تھی نا۔“ اس نے سمجھانے کی کوشش کی۔ ارم کے آنسوؤں سے اس کا دل ذرا پگھلا تھا۔

”تمہیں زیادہ ابا کی وکالت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر تمہیں شاپنگ نہیں کرنی تو ٹھیک ہے چلو گھر۔ مجھے نہیں جانا کہیں۔“ وہ آنسو پونچھتی ایک دم بہت تلخی سے کہتی سیدھی ہوئی۔ حیا نے ففسوس سے اسے دیکھا۔ دل میں جو نرم گوشہ بننے لگا تھا وہ فوراً مٹ گیا۔ آخر وہ بھول بھی کیسے سکتی تھی کہ ارم نے ولید کو وہ ویڈیو دے دی تھی۔ اتنا بڑا دھوکا اس نے حیا کے ساتھ کیا تھا۔

اس نے ففسوس سے سر جھٹکا اور انکیشن میں چابی گھمائی۔ کار کے انجن میں حرارت پیدا ہوئی۔ ارم بھیگی نگاہوں سے شیشے کے پار دیکھ رہی تھی۔ اسے اب بھی اپنی ہی فکر تھی۔ اپنا سکارف، اپنے ابا کی سختیاں، اپنی مجبوریاں۔ اسے اب بھی حیا کی یا اس ویڈیو کی فکر نہیں تھی۔



منگل آیا، صبح ہوئی، دوپہر پڑھی، شام اتری، اور رات چھا گئی۔ وہ نہیں آیا۔ بدھ بھی گزر گیا، اور جمعرات کو زائد چچا کی بیٹی مہوش پاکستان آ گئی، مگر وہ شدید کرسسز میں تھی۔ زائد چچا اور عابدہ چچی نے کسی کو نہیں بتایا مگر صائمہ تائی کو اپنے کسی سوس سے پتہ لگ ہی گیا۔ مہوش کا شو ہر اس سے اگلی فلائٹ میں آ رہا تھا مگر امیگریشن کے کسی چکر میں پھنس گیا، اور عین وقت پہ گرفتار کر لیا گیا۔ مہوش کی فلائٹ چونکہ ایک روز قبل کی تھی، سو وہ اس وقت تک پاکستان آ چکی تھی، اور پھر، خبر ملتے ہی تایا فرقان اور ان کی فیملی سمیت سب ہی عابدہ چچی کی طرف اکٹھے ہو گئے تھے۔

ڈائیننگ ہال میں میز کے گرد چھ کرسیوں پہ سو نیا اور وہ پانچ کزنز بیٹھی تھیں۔ مہوش خاموش تھی، اور وہ سب بھی۔ حیا تو سربراہی کرسی پہ بیٹھی، دوپٹہ سر پہ ٹھیک سے لیے، دیکھ بھی کہیں دور خلا میں رہی تھی۔

ڈائیننگ ہال اور ڈائیننگ روم کے درمیان جالی دار پردہ آدھا گرا تھا، اس کے پار صوفوں پہ سب بڑے بیٹھے تھے۔ لڑکے وغیرہ بھی اکٹھے ہو گئے تھے سو وہ باہر لان میں تھے۔ اب تو حیا کی وجہ سے وہ لڑکیوں والی طرف آنے سے بھی جھجھکتے تھے۔ روجیل اور نشاء البتہ صوفوں پہ ہی بیٹھے تھے۔

”عفان کے ماں باپ کیا کہتے ہیں؟ تایا ابا پوچھ رہے تھے۔ ان کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ جواب میں عابدہ چچی بُرے دل سے کچھ بتا رہی تھیں۔ ان کو یقیناً یوں سب کا ”فسوس“ کے لیے آنا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

”آج کل کے لڑکے بھی پتہ نہیں کن چکروں میں ہوتے ہیں۔“ صائمہ تائی نے ہمدردی سے کہا تھا۔ مہوش نے دبے دبے غصے سے جالی دار پردے کو دیکھا، اور ایک دم اٹھ کر اندر چلی گئی۔ سو نیا نے افسردگی سے اسے جاتے

دیکھا۔ کیا کیا جاسکتا تھا؟

”بس اللہ تعالیٰ خیر سے اسے واپس پہنچا دے۔“ پھوپھو نے دھیرے سے کہا تھا۔ انہیں بھی صائمہ تائی کا یوں اصرار سے سب کو ”افسوس“ کے لیے ادھر لے آنا اچھا نہیں لگتا تھا۔

”جہان کی کیا خبر ہے بین؟ منگل تو گزر گئی، اس کا کوئی اتہ پتہ ہی نہیں؟“ صائمہ تائی کو پھوپھو کا نوکسائز لگا تو یوں کا رخ عغان سے جہان کی طرف کر دیا۔ حیا چونک کر آدھے پٹے پر دے کود کھینے لگی۔

”آج آئے گا بھابھی۔ کسی مسئلے میں ہو گا بھی دیر ہوئی ہے۔“ پھوپھو کی آواز مزید صبی ہو گئی۔

”تم بھی اپنے بیٹے پہ نظر رکھا کرو بین۔“ تایا ابا نے اسی انداز میں کہا جس میں وہ عغان کی بات کر رہے تھے۔ ”پتہ نہیں وہ بھی کسی ٹھیک کام میں ہے یا..... اپنے باپ کے جنازے پہ بھی تو نہیں آیا تھا۔“

”جہان کا یہاں کیا ذکر بھائی؟“ پھوپھو کے لہجے میں دبا دبا شکوہ تھا۔

حیا نے میز کا نوک تختی سے پکڑا۔ پیشانی کی رگیں بھینچ گئی تھیں۔ اندرا یک ابال سا اٹھا تھا۔

”عغان کا بھی تو ہمیں معلوم نہیں تھا۔ یہاں شاید کسی کا بھروسہ نہیں ہوتا۔“ تایا ابا نے پھوپھو کی بات سے بغیر تبصرہ کیا۔ حیا کے اندر کا ابال بس کسی لاوے کی طرح پھٹ پڑنے کو تیار تھا۔ بمشکل وہ ضبط کر کے لب بھینچے بیٹھی رہی۔

”ایسا کچھ نہیں ہے بھائی۔ میں اپنے بیٹے کو اچھی طرح جانتی ہوں۔“ حیا نے مڑ کر دیکھا۔ جالی دار پردے کے پاس پھوپھو ذرا خفگی سے کہتی نظر آرہی تھیں۔ اس نے صائمہ تائی اور عابدہ چچی کے چہروں کے معنی خیز تاثرات دیکھے اور پھر ابا کو دیکھا جو خاموشی سے پھوپھو کو دیکھ رہے تھے۔

”سچ کہوں تو بین مجھے تمہارے بیٹے کے کام مشکوک سے لگتے ہیں۔ کبھی کہتا ہے ریسٹورانٹ ہے، کبھی کہتا ہے جاب سے چھٹی نہیں ملی۔ بہتر ہو گا تم اس کو بھی چیک میں رکھا کرو تا کہ کل کو کوئی بڑا نقصان نہ اٹھانا پڑے۔ میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ کام کیا کرتا ہے۔“

اور تایا کی اس بات پر اسے لگا کہ اس کی برداشت ختم ہو گئی ہے۔ بس بہت ہو گیا، اب مزید وہ نہیں برداشت سکتی تھی۔ یہ ٹھیک تھا کہ اسے راز رکھنے آتے تھے مگر اسے صرف وہ راز رکھنے چاہئیں تھے جن کے رکھنے کا کوئی فائدہ ہو۔ اب مزید نہیں!

وہ تیزی سے اٹھی اور جالی دار پردہ اٹھا کر ڈرائنگ روم کے دہانے پہ آئی۔ اس کے یوں آنے پہ سب نے اسے مڑ کر دیکھا تھا۔

”کیا آپ جانتے ہیں تایا ابا کہ وہ کیا کام کرتا ہے۔ اگر نہیں جانتے وہ کیا میں آپ کو بتاؤں؟“ ہاں یہ ٹھیک ہے کہ وہ بڑے تھے اور اسے ان سے ادب سے بات کرنی چاہیے تھی مگر وہ اپنے لہجے میں پنہاں غصے کو ضبط کیے جب بولی تو اس کی آواز کافی بلند تھی۔ تایا ابا نے قدرے جراتی، قدرے نرمی سے اسے دیکھا، اور پھر سلیمان صاحب اور فاطمہ کو جیسے کہہ رہے ہوں کہ ان کی بیٹی کو کیا ہو گیا ہے۔

”شاید آپ نہیں جانتے۔ ٹھہریں میں آپ کو بتاتی ہوں۔“ وہ اسی انداز میں اونچی آواز سے بولی۔ ”جہان ابھی اسی لیے نہیں آسکا کیوں کہ وہ اپنی آفیشیل اسائنمنٹ میں پھنسا ہوا ہے۔ آپ تو یہ بھی نہیں جانتے ہوں گے کہ وہ ہماری انجنیئرنگ کا ایک ایجنٹ ہے، ایک بہت قابل آری آفیسر!“

یہ بات کہہ کر جب وہ فارغ ہوئی تو اس نے باری باری سب کے چہروں کو دیکھا۔ تایا ابا، صائمہ تائی، زاہد چچا، عابدہ چچی۔

سب حیران سی نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے جیسے انہیں سمجھ نہیں آیا ہو کہ اس نے کیا کہا ہے۔ آہستہ آہستہ اس کے الفاظ ان کے ذہنوں میں ٹھہرنے لگے اور ان کے معانی ان کے سامنے عیاں ہونے لگے۔

”آری آفیسر۔ ایجنٹ۔“ تایا فرقان نے کچھ حیران نگاہوں سے پہلے اسے دیکھا جو اپنی بات کہہ چکنے کے بعد ذرا ہر سکون سی چوکھٹ پہ کھڑی تھی۔ پھر بین پھوپھو کو دیکھا جو خاموشی سے صوفے پہ بیٹھی تھیں مگر ان کی آنکھوں کا سکون اس بات کا غماز تھا کہ انہیں حیا کی اس بات سے خوشی ہوئی ہے۔ ضروری تو نہیں تھا تا کہ سب کچھ جہان آ کے بتاتا۔ انہیں شاید جہان نے منع کر رکھا تھا سو انہوں نے بیٹے کا مان

کا بھی رکھا لیکن حیا کے اس عمل سے جیسے ان کو ڈھیروں سکون مل گیا تھا۔

”وہ ہماری انجینی کے لیے کام کرتا ہے؟“ صائمہ ثانی شاکزی بولیں۔ ”کیا وہ آری آفسر ہے، کیا واقعی؟“

”جی ثانی یہ سچ ہے۔“ وہ سینے پہ بازو پلپٹے بہت اعتماد سے کہہ رہی تھی۔ ہر دفعہ انسان کو اپنے لیے جنگ نہیں لڑنی ہوتی۔ کئی دفعہ

دوسروں کے لیے بھی لڑنی پڑتی ہے اور وہ اس وقت وہی کر رہی تھی۔

”اس نے بہت عرصہ یہ بات اپنی تک رکھی، آپ لوگوں کو نہیں بتائی، اس لیے نہیں کہ وہ آپ کو اپنا نہیں سمجھتا تھا۔ ہاں ٹھیک ہے اس کی جاب کی نوعیت ایسی تھی کہ اسے اپنی اصل شناخت چھپا کے رکھنی تھی۔ لیکن وہ چاہتا تو بتا سکتا تھا۔ جیسے پھوپھو کو ہمیشہ سے معلوم تھا، جیسے بہت سے دوسرے لوگوں کو معلوم تھا۔ لیکن اس نے آپ لوگوں کو نہیں بتایا شاید اس لیے کہ وہ آپ کا مان نہیں توڑنا چاہتا تھا۔ وہ مان جس کے ساتھ بہت سال پہلے آپ لوگوں نے.....“ اس نے ’لوگوں‘ کہتے ہوئے تایا فرقان کو دیکھا۔ ”..... بہت فخر سے کہا تھا کہ کسی غدار کے بیٹے کو فوج میں کمیشن نہیں مل سکتا۔ حالانکہ ایسا نہیں ہوتا تا یا ابا۔ کتنے ہی غداروں کے بیٹے، جیسے آج بھی فوج میں کام کر رہے ہیں اور بہت دیانتداری اور محبت وطنی سے کر رہے ہیں۔ اسی لیے جب اس کو جاب مل گئی تو اس نے آپ کو نہیں بتایا تا کہ آپ کا مان نہ ٹوٹے، تا کہ آپ کے فخر کو ٹھیس نہ پہنچے۔“

وہ جانتی تھی کہ وہ کافی زیادہ بول رہی ہے، بڑوں کے سامنے اتنا نہیں بولنا چاہیے مگر بات کرتے ہوئے بھی وہ تمیز اور تہذیب کی سرحد سے آگے نہیں نکل رہی تھی۔ البتہ اس کی آواز ذرا اونچی تھی۔ بعض دفعہ لہجہ انوں کے خود غرض مجھے کو اپنی بات منوانے کے لیے تھوڑا سا بدتمیز، تھوڑا سا لاد و ہوتا پڑتا ہے۔

ڈرائنگ روم میں اتنا سنا تھا کہ سوئی بھی گرتی تو گونج پیدا ہوتی۔ تایا فرقان کے چہرے پہ ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک جا رہا تھا۔ وہ جیسے سمجھ بھی نہیں پار رہے تھے کہ یہ سب ہوا کیا ہے۔

نتاشا، روئیل سے جیسی آواز میں کچھ پوچھ رہی تھی اور وہ آہستہ سے جواب میں کچھ بتا رہا تھا۔ نتاشا اس کی بھلت سن کے ذرا سا مسکرائی اور فاطمہ نگاہوں سے اسے دیکھا اور کہا

“i guessed so”

ڈرائنگ روم میں موجود نفوس میں وہ واحد تھی جسے اس خبر نے بہت محظوظ کیا تھا۔

”کیا کرتا ہے وہ آری میں، کیاریٹک ہے اس کا؟“ زاہد چچا وہ پہلے تھے جنہوں نے سوال کیا۔ شاید ان کے ذہن نے اس بات کو قبول کر لیا تھا۔

”مجھ پر ہے۔“ اس سے پہلے کہ وہ جواب دیتی، جواب کسی اور نے دیا۔ نہ اس نے، نہ پھوپھو نے۔ حیا بے اختیار چونکی۔

سلیمان صاحب!

اب حیران ہونے کی باری اس کی تھی۔ اس کے لب ذرا سے کھل گئے اور آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئیں۔ ابا کو پتہ تھا؟ ابا کو کب سے پتہ تھا؟ اس نے پھوپھو کی طرف دیکھا وہ بھی حیران ہوئی تھیں۔

”کیا تمہیں معلوم تھا؟“ تایا فرقان کو جھک کا لگا۔

”جی، کافی عرصے سے پتہ تھا۔“ انہوں نے کہتے ہوئے حیا کو دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں کہ تم وہ واحد نہیں ہو جسے یہ بات معلوم

تھی۔ ”میں اس شہر میں رہتا ہوں اور میرے اپنے بھی سوسر ہیں۔ مجھے کافی عرصے سے پتہ تھا اور مجھے اس پر اسی بات کا غصہ تھا کہ کیا تھا اگر وہ ہمیں بتا دیتا۔ ہم اس کے اپنے تھے، دشمن تو نہیں تھے۔“

حیا نے بے اختیار روئیل کی طرف دیکھا۔ روئیل نے اثبات میں سر ہلایا۔ تو یہی بات تھی جس لیے ابا اس سے برگشتہ رہتے تھے۔ وہ بڑی والا معاملہ نہیں تھا۔ وہ یہ بات تھی۔ روئیل کو بھی پتہ تھا، ابا کو بھی پتہ تھا، نتاشا کو شک تھا، بس ایک وہی بیوقوف تھی جو تین مہینے اس کے پزل باکس کی پہیلیاں ڈھونڈتی رہ گئی۔ کاش وہ ان سب سے پہلے پوچھ لیتی۔

”حیرت ہے۔“ تایا فرقان بمشکل کہہ پائے۔ وہ ابھی تک بے یقین تھے۔ ”اسے کبھی تو چاہیے تھا کہ ہمیں بتا دے۔ مجھے.....“

پتہ نہیں.....“

”وہ بتانا چاہتا تھا مگر اس کی جاب کی کچھ مجبوریات تھی کہ وہ نہیں بتا سکا۔ آپ تو جانتے ہیں کہ ایسی جاب میں مشکل ہو جاتی ہے۔ بہر حال اس کی طرف سے میں آپ سے معافی مانگ لیتی ہوں۔“ سین پھو پھو نے بہت سکون سے کہا تھا۔ ان کے چہرے سے ظاہر نہیں ہوتا تھا مگر وہ مطمئن تھیں، بہت مطمئن۔

”تمہیں کس نے بتایا؟“ فاطمہ ابھی تک حیران تھیں۔ کبھی اسے دیکھتیں، کبھی سلیمان صاحب کو۔ جیسے سمجھتا پار ہی ہوں کہ انہیں اس بات پہ خوش ہونا چاہیے یا نہیں۔

”جہان نے! اسے مجھے ہی بتانا چاہیے تھا۔“ اس نے شانے اچکاتے ہوئے جواب دیا۔ بس وہ ایک جواب ہر جواب پہ بھاری ہو گیا۔ صائمہ تائی، عابدہ چچی کی معنی خیز نگاہوں، طنز و طعنے کے نشتر، ہر شے کو اپنا جواب مل گیا۔

وہ واپس ٹپٹی تو دیکھا ڈاننگ روم میں موجود لڑکیاں اسے انہیں ششدر و حیران نگاہوں میں دیکھ رہی تھیں۔ ہاں خبر بڑی تھی مگر جلد ہی وہ اسے قبول کر لیں گے۔ اگر وہ آیا تو پتہ نہیں وہ اس کے ساتھ کس قسم کا سلوک کریں گے۔ مگر وہ آئے تو سہی۔ کب آئے گا، وہ نہیں جانتی تھی، البتہ وہ یہ جانتی تھی کہ اس جنگ میں جہان اکیلا نہیں ہوگا، وہ ہمیشہ اس کے ساتھ ہوگی۔

☆ ☆ ☆

وہ اپنے کمرے میں لیپ ٹاپ کے آگے بیٹھی ترکی کی تصویریں دیکھ رہی تھی جب اس کا موبائل بجا۔ سکرین کو دیکھتے ہوئے اس نے فون اٹھایا اور نمبر دیکھتے ہوئے جیسے اندر تک کڑواہٹ گھل گئی۔ لید۔ جانے یہ کب اس کی جان چھوڑے گا۔

چند لمحوں پہ جلتی بجتی سکرین دیکھتی رہی، اٹھائے یا نہیں۔ مگر اس آدمی سے کچھ بعید نہیں تھا۔ اٹھانا ہی پڑے گا۔ اس نے سبز ٹنن دبا کسے فون کان سے لگایا۔

”میں تمہارے گھر کے باہر ہوں۔ کیا تم پانچ منٹ میں باہر آ سکتی ہو؟“

اس کا دل جیسے کسی نے ٹھٹھی میں لے کے دبا دیا۔

”کیا؟ تم ادھر کیا کرنے آئے ہو؟“ وہ حیران پریشان سی کھڑی ہوئی۔ پھر کمرے سے باہر نکلی۔ وہ بیرونی دروازے کے طرف

نہیں بلکہ سڑکیوں کی طرف جا رہی تھی۔

”میں نے تم سے کہا تھا کہ مجھے تم سے بات کرنی ہے۔ وہ آرکائیو والا مسئلہ ابھی حل نہیں ہوا اور میں جانتا ہوں تم اسے حل کرواؤ گی۔ میں اس دن بیزاہٹ میں ویٹ کرتا رہا مگر تم نہیں آئیں! اور اب میرا خیال ہے کہ وہ وقت آ گیا ہے جب تمہیں میری بات کو سنجیدگی سے سننا چاہیے۔“

”اور میں نے تمہیں کہا تھا کہ میں نہیں آؤں گی۔ تم مجھے کیا سمجھتے ہو۔ تمہارا خیال ہے کہ میں تمہاری ان گیڈر بھیمکیوں سے ڈر جاؤں گی؟ grow up! لہجے میں سختی رکھتے ہوئے وہ تیزی سے سڑکیاں چڑھ رہی تھی۔ اس نے ٹیرس کا دروازہ کھولا اور تیزی سے باہر آئی۔

”میں نے فون تمہاری یہ سب باتیں سننے کے لیے نہیں کیا۔ تم باہر آؤ، مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔ بس پانچ دس منٹ

لگیں گے۔ اوکے!“ کال کاٹ دی گئی۔

اس نے شک زدہ انداز میں ہدفن کو دیکھا اور پھر تیزی سے آگے آئی۔ چھت پہ کوئے میں پڑے جمو لے کے پیچھے سے اس نے منڈ پر پر سے جھانکا۔ باہر رات سیاہ تھی۔ کہیں کہیں سٹریٹ پول جل رہے تھے۔ گھر کے گیٹ سے ذرا دور و لید کی سیاہ کار ڈکھڑی تھی۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھا، شیرنگ ویل پہ ہاتھ رکھے منتظر سا ان کے گیٹ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ حیا کے اندر طوفان سا اٹھنے لگا۔ بے بسی بھی تھی،

غصہ بھی تھا۔ یہ آدمی کسی طرح اس کا پچھا چھوڑنے کو تیار نہیں تھا۔ یہ نہیں کچھ لوگوں کو اللہ کا خوف بھی نہیں ہوتا۔ کسی کی کمزوری ہاتھ لگنے پہ وہ خود کو خدا کیوں سمجھنے لگتے ہیں۔ مگر نہیں ایسے خداؤں سے، ایسے بلیک میلروں سے دنیا اسے اچھی طرح آتا تھا۔

وہ مڑی اور نیرس پہ رکھے ان مصنوعی پودوں کی طرف آئی جو بڑے بڑے گملوں میں رکھے تھے۔ گملے بڑے تھے اس لیے ٹہنیوں کو کھڑا رکھنے کے لیے انہیں مٹی کے بجائے چھوٹے بڑے پتھروں سے بھرا گیا تھا۔ اس نے ایک گملے سے ایک وزنی سا پتھر اٹھایا اور واپس منڈیر تک آئی۔ ولید ابھی تک منتظر نگاہوں سے گیٹ کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے اس کا خیال تھا کہ اس کی بلیک میلنگ میں آکر وہ ابھی گیٹ سے آتی دکھائی دے گی اور ایک دفعہ پھر اس کی گاڑی میں بیٹھ جائے گی۔ مومن ایک سوراخ سے کبھی دو بار نہیں ڈسا جاتا۔ وہ آتی کمزور تو نہیں تھی کہ اس کی بلیک میلنگ کی وجہ سے اس کے ساتھ بیٹھ جاتی۔ وہ اور ہوتی ہوں گی کمزور لڑکیاں جو بلیک میلنگ سے گھبرا جاتی ہوں گی۔ نہیں۔ اگر اس نے جنت کے پتے تھاے تھے تو اللہ اسے رسوا نہیں کرے گا۔ یہ وعدہ اس سے جہان نے کیا تھا مگر جہان تو اس وقت نہیں تھا جو اپنا وعدہ نبھا سکتا۔ اسے خود ہی کچھ کرنا تھا۔

اس نے ایک نظر ہاتھ میں پڑے پتھر کو دیکھا اور ایک نظر نیچے کھڑی گاڑی کو۔ لمبے بھر کے لیے ساری باتیں سیلاب کے طرح اٹل کر اس کے ذہن پہ چھاتی گئیں۔ ولید کی بلیک میلنگ، اس کی بدتمیزیاں، اس کی ہر وہ حرکت جس نے اسے ذہنی کوفت میں مبتلا کر رکھا تھا۔ اور پھر اس نے سمجھنا شروع کیا کہ وہ پتھر اس کی گاڑی پہ مارا۔

اندازہ اس نے دند سکرین کا کیا تھا مگر وہ بوٹ پہ لگ کر نیچے گرا۔ ولید نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا اور اس سے پہلے کہ وہ اوپر گردن کرتا، حیا پیچھے ہو گئی۔ یہ نہیں تھا کہ وہ اس کے سامنے آنے سے ڈرتی تھی، بس اس نے سکارف نہیں لے رکھا تھا۔

گاڑی سارٹ ہونے کی آواز آئی اور نائزوں کی رگڑ۔ حیا نے حیرت سے منڈیر کے سوراخ سے نیچے دیکھا۔ ولید کی گاڑی دور جاتی دکھائی دے رہی تھی۔ اتنا بزدل نکلا وہ؟ بس ایک پتھر سے ڈر گیا؟ اس کو واقعی حیرت ہوئی تھی۔ یا شاید ہر بلیک میلر اتنا ہی بزدل، اتنا ہی کمزور اور اتنا ہی گھنیا ہوتا ہے۔ ہو نہ۔

تنفس اور حواسوں کو قابو کرتی وہ واپس آئی۔ کمرے میں آکر اس نے لیپ ٹاپ پہ لگی تصویریں بند کر دیں۔ دل اتنا اچاٹ ہو گیا تھا کہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کی کیا کرے۔ وہ بدنیت آدمی یہ نہیں کب اور کس طرح اس کا پچھا چھوڑے گا۔ کیا ساری زندگی وہ یہی کرتا رہے گا۔ وہ کب تک اس کو پتھر مار کر، بک جھک کر اپنے سے دور رکھے گی۔ کسی دن اگر وہ واقعی ان کے گھر پہنچ گیا اور وہ سی ڈی ابیا کسی کو دکھادی تو پھر نتائج کیا نکلیں گے۔ وہ اپنی عزت کھو دے گی، مقام کھو دے گی۔ ولید کے ہاتھ سے ملنے والی سی ڈی سب خراب کر دے گی۔

ارم اور ولید۔ ان دونوں کو اللہ کا کوئی خوف نہیں تھا۔ وہ بے دلی سے بیڈ پہ آکے بیٹھ گئی۔ سمجھ نہیں آ رہی تھی کیا کرے۔ باہر لاؤنج میں اماں اور پھوپھو کے ساتھ بھی بیٹھے کا دل نہیں کر رہا تھا۔ پھوپھو تو ویسے بھی ان دونوں میں سب کے سوالوں کے ہی جواب دے رہی تھیں۔ جہان نے کب، کیا اور کیسے جو کچھ کیا، اسے ان چیزوں سے دلچسپی نہیں تھی۔ وہ تو اپنی طرف سے ہم پھوڑ کر فارغ ہو چکی تھی۔ آگے پھوپھو جانیں اور ان کا بیٹا۔

جب دل زیادہ اداس ہوا تو وہ وضو کر کے آئی اور قرآن کھول کے بیڈ پہ بیٹھ گئی۔ ہاں اس نے جہان سے وعدہ کیا تھا کہ وہ روز قرآن پڑھے گی مگر ابھی تک نہیں پڑھ سکی تھی۔ اب وہ پڑھا کرے گی۔ مگر کہاں سے شروع کرے۔

بہر حال اس نے سورہ نور نکالی۔ یہ سورہ تھی جس نے ہر چیز شروع کی تھی۔ جس نے اسے ایک اور دنیا میں پہنچایا تھا۔ اب اسے ایک دفعہ پھر یہ پڑھنی تھی۔ ہاں عائشہ کہتی تھی قرآن میں ہر چیز کا جواب ہوتا ہے۔ ہر دکھ کا مداوا، ہر پریشانی کی تسلی۔ ہر فکر کا حل۔ وہ سورہ نور پڑھنے لگی۔ آہستہ آہستہ دل پہ چھائی نئی قرآن پہ لکھے سیاہ حروف سے کم ہونے لگی۔ سیاہ حروف، اس کا سیاہ موتی جو رومال میں رکھا تھا اور ساتھ نکر بھی۔ اس کے دل میں دوسرے خیال آنے لگے۔ اس نے سر جھٹکا اور آیات پر توجہ دی۔

”وہ لوگ جو تم میں سے ایمان والے ہیں،

اور انہوں نے اچھے کام کیے ہیں،

اللہ نے ان سے وعدہ کیا ہے
کہ ان کو وہ ضرور زمین میں جانشین مقرر کرے گا
، جیسا کہ ان سے پہلوں کو مقرر کیا،
اور ان کے لیے جس دین کو پسند کیا ہے،
اسے ضرور مستحکم کرے گا،
اور ان کے خوف ضرور امن میں بدلے گا،
بس شرط یہ ہے کہ وہ میری عبادت کرتے رہیں
اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں!“ (النور ۵۵)

لمحے بھر کو کمرے میں روشنی سی ہو گئی۔ سونے کے پتیلے سے ہر سو گرنے لگے تھے۔ نور تھا اور پر نور کے۔ وہ الفاظ بہت ہی خوبصورت، بہت ہی پُر امید تھے۔ کیا واقعی ایسا ہو سکے گا۔ کیا واقعی اسے اپنے دین کی ثباتی نصیب ہو سکے گی۔
کبھی کبھی قرآن کی باتیں اتنی پُر امید دکھائی دیتی تھیں کہ اپنی ناامید زندگی سے اسے ریلیٹ کرنا مشکل لگتا تھا۔ مگر مریم خانم نے کہا تھا کہ یقین سے مانگیں تو ضرور ملتا ہے۔ ایک دفعہ ان آیات پہ یقین کر کے تو دیکھے۔ کون جانے...
اس نے قرآن ہند کر کے احتیاط سے بک شیلف پہ رکھا اور بیڈ پہ آ کے آنکھوں پہ بازو رکھے لیٹ گئی۔ ابھی وہ صرف سونا چاہتی تھی۔ تھکن بہت زیادہ ہو گئی تھی، بہت زیادہ۔

☆ ☆ ☆

صبح وہ ابھی تو پہلا خیال ان آیات کا آیا تھا۔ ہاں کمرے میں اب صرف سورج کی روشنی تھی اور صبح کی ٹھنڈی ہوا۔ رات والی روشنی اب ادھر نہیں تھی۔

انسان اسی خیال کے ساتھ اٹھتا ہے جس کے ساتھ وہ سویا تھا۔ شاید اسی لیے انسان جس ایمان کے ساتھ مرے گا، اسی کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔ درمیان کا دورانیہ بے معنی تھا۔
وہ بال لپٹتی باہر آئی۔ سارا گھر ابھی سو رہا تھا۔ لاؤنج اور کچن کے بیچ آدھی کھلی دیوار سے نور بانو کام کرتی نظر آ رہی تھی۔ پس منظر میں کوئی مانوس، غیر مانوس سی آواز آ رہی تھی۔
”نور بانو، ناشتہ!“

”میں نے ناشتا باجی کے لیے میٹلو سٹش بنایا تھا۔ آپ پیئیں گی؟“

وہ سر ہلاتی ہوئی آگے آئی، کاؤنٹر سے گلاس اٹھایا اور سٹش والے جگ کو اس میں انڈیلا۔ کوئی ہوئی برف اور جوس کی دھار اس میں گرنے لگی۔ پھر وہ پاس رکھی کرسی پہ بیٹھی اور گلاس لبوں تک لے جاتے ہوئے یونہی سراٹھایا۔ ایک لمحے کے لیے ساری دنیا ساکت ہو گئی۔

ہر شے ٹھہر گئی۔ بس ایک چیز تھی جو حرکت کر رہی تھی۔ گول گول دائرے میں گھومتی ہوئی، کانچ اور لکڑی کے ٹکڑوں کی مدھم آواز۔ کانچ کی گلاب کی پگھڑیاں۔ سلور راز۔

لبوں تک جاتا گلاس والا ہاتھ تیزی سے نیچے آیا تھا۔ آنکھوں کی پتلیاں بے یقینی سے پھیلیں۔

لاؤنج اور کچن کی درمیانی دیوار کے عین اوپر اس کا ونڈ چائم ہوا سے جھول رہا تھا۔

”یہ..... یہ یہاں کیسے آیا؟ یہ کس نے لگایا؟“ اس نے حیرت و شاک سے نور بانو کی طرف دیکھا۔ کام کرتی نور بانو نے مڑ کر ونڈ چائم کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اچنبھا ابھرا۔ پھر اس نے نا سمجھی سے نفی میں سر ہلایا۔

”مجھے نہیں پتہ باجی۔ میں نے تو ابھی دیکھا ہے۔“

”یہ تو میرا ہے۔ یہ تو ترکی میں مجھ سے گم گیا تھا۔ یہ یہاں کیسے آیا۔ یہ یہاں کس نے لگایا۔“ وہ نور بانو سے کم اور خود سے زیادہ

بات کر رہی تھی۔

نور بانو ہراساں سی ہو گئی۔ ”میں تو پہلے ہی کہتی تھی باجی کہ ہمارے گھر میں جن ہیں۔“

مگر وہ نے بغیر تیزی سے کچن سے باہر آئی۔ بیڑھیوں کے اوپر والے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ وہ سلس کا گلاس ہاتھ میں پکڑے ننگے پیر تیز تیز یہاں چڑھنے لگی۔ پاؤں پہ لگے بیڈنگ اب کھل چکے تھے مگر زخموں کے نشان وہیں تھے۔

ایک، دو، تین، چار..... قدم جیسے زینوں پر نہیں، س کے دل پہ پڑ رہے تھے۔

سانس تیز تیز چل رہا تھا۔

اسے نہیں پتہ وہ چند بیڑھیاں، چند صدیاں کیوں بن گئی تھیں۔

جیسے یہ فاصلہ کبھی ختم ہی نہیں ہوگا۔

وہ پھوٹے تنفس کے ساتھ اوپر آئی۔ اور دھڑکتے دل سے اس آخری کمرے کا دروازہ دھکیلا۔

گیسٹ روم کے بیڈ پر ایک کھلا ہوا بیگ رکھا تھا جس میں سے شرٹ نکالتے ہوئے وہ بیڈ کے ساتھ ذرا جھکا ہوا کھڑا تھا۔ آہٹ پہ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔

حیا چوکت پلسش کا گلاس اٹھا کر کھڑی پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ جہاں اسے دیکھ کر چند لمحے کچھ کہہ نہیں پایا، پھر دھیرے سے مسکرایا۔ شرٹ بیگ پر رکھی اور قدم قدم چلتا اس تک آیا۔ نیلی جینز اور سبز شرٹ میں وہ بہت فریش لگ رہا تھا۔

”مرحبا!“ حیا سے چند قدم دور رک کر اس نے ہلکی سے مسکراہٹ کے ساتھ سر کو خم دیتے ہوئے سلام کیا۔ حیا چند لمحے ویسی ہی ساکت نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی۔ اور پھر.....

پھر اس کے ادھ کھلے لب بھنج گئے، پیشانی کی رگ تن گئی اور حیرت زدہ آنکھوں میں یکا یک غصہ در آیا۔ ایک دم سے اس نے سلس سے بھرا گلاس جہاں پہ پھینکا۔

”تم وہاں مرنے کے لیے مجھے چھوڑ گئے تھے۔ میں وہاں کتنی دفعہ مری ہوں، تمہیں پتہ ہی نہیں اور اب تم آ کر کہتے ہو مرحبا!“ وہ ایک دم پھٹ پڑی تھی۔

سلس جہاں کی شرٹ پہ گرا تھا۔ وہ ایک دم پیچھے ہوا۔ پہلے اس نے اپنی شرٹ کو دیکھا اور پھر حیا کو، جیسے اسے یقین نہ آیا ہو کہ حیا نے یہ کیا ہے۔ جیسے اسے یقین نہ آیا ہو کہ ایک دفعہ پھر حیا نے یہ کیا ہے۔

”حیا!“ وہ لمحے بھر کے لیے کچھ بول ہی نہیں پایا۔

”کچھ مت کہو تم۔ تمہیں کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ تم کیا سمجھتے ہو مجھے۔ بیوقوف ہوں جو میں نہیں سمجھتی کی تم نے عائشہ کو

فون کر کے خود اپنی مجبوری کروائی، تم نے اپنے آپ کو خود پکڑ دانا چاہا۔ یا شاید پتہ نہیں تم وہاں گئے بھی تھے یا نہیں۔ میں نہیں جانتی وہاں کون

تھا۔ مگر میں نے وہاں بارودی سرنگیں پھٹنے دیکھیں۔ میں نے وہاں پرمکولیاں چلتے سینیں۔ میں نے وہاں پردھواں دیکھا۔ میں نہیں جانتی

وہاں پر کیا ہوا۔ مگر جو بھی ہوا اس کے پیچھے تمہارا ذہن تھا۔ میں جانتی ہوں جہاں تم ہمیشہ چیزیں پلان کرتے ہو مگر تم نے کہا تھا کہ اس دفعہ تم

کچھ پلان نہیں کرو گے لیکن تم نے کیا کیا تھا اگر تم مجھے بتا دیتے۔ میں کتنا پریشان رہی، میں کتنی تڑپی۔ میں کتنی بے سکون رہی ہوں ان چند

دنوں میں، اندازہ نہیں ہے تمہیں!“

وہ وہیں بیڈ کے کنارے پہ بیٹھی اور پھر ایک دم ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ جہاں نے ایک دفعہ پھر گردن جھکا کر اپنی

گیلی شرٹ کو دیکھا اور پھر فرش پہ گرے پلاسٹک کے گلاس کو۔ شکر ہے وہ پلاسٹک کا تھا سونو نا نہیں۔

”تم نے کیا کیا اس وقت، میں نہیں جانتی۔ مگر جو بھی کیا وہ بہت بُرا تھا۔ اگر وہاں میرے دل کو کچھ ہو جاتا، میں شاک سے ہی

مر جاتی تو تم کیا کرتے۔ مگر تمہیں تو کوئی فرق ہی نہیں پڑتا!“ وہ روتے روتے کہہ رہی تھی۔

”اگر تمہاری یادداشت ٹھیک سے کام کر رہی ہے تو تمہیں یاد ہوگا کہ میں نے کہا تھا، فوراً وہاں سے چلی جانا۔ اگر تم نے سب کچھ دیکھا ہے تو اس کا مطلب ہے تم وہیں پر تھیں۔ تم نے میری بات نہیں مانی۔“

حیائے ایک دم سے گلیا چہرہ اٹھایا۔

”میں چلی بھی جاتی تو کتنا دور جاتی۔ چند میٹر دور ہی تو کھڑی تھی ہماری جیب۔ کیا مجھے وہاں تک سرنگیں بھٹنے، دھماکے اور گولیوں کی آواز نہ آتی۔ وہ ایک تاریک خاموش رات تھی اور تم جانتے تھے کہ مجھے آواز آئے گی اسی لیے تم نے مجھے کہا تھا کہ میں سرحد تک نہ جاؤں۔ کیا تم واقعی سرحد کے پار گئے تھے۔ کیا یہ تم گئے ہی نہ ہو۔ مجھے اب تمہاری کسی بات کا یقین نہیں رہا جہاں۔“

کتنے دن وہ مضطرب، بے چین اور دلگیر رہی تھی اور اب کتنے مزے سے وہ آکر کہہ رہا تھا۔ ”مرحبا!“

”یعنی کہ تم نے میری بات نہیں مانی۔ یعنی کہ تم ہمیشہ اپنی ہی مرضی کرتی ہو۔ اور اگر میں اپنی مرضی کروں تو تم غصہ کرتی ہو اور.....“ جہاں نے سر جھکا کر اپنی کینٹی شرت کو دیکھا ”کیا کچھ رہ گیا ہے جو تم نے میرے اوپر نہیں توڑا تو ایک ہی دفعہ توڑ لو تا کہ یہ سلسلہ ختم ہو جائے۔“ وہ غلٹی سے بولا۔ حیائے اس کی بھیگی شرت کو دیکھا۔ اسے ذرا بھی افسوس یا پچھتاوا نہیں تھا۔ فی الحال وہ اسی قابل تھا۔

”میں نے تمہیں کہا تھا کہ ترکی اور شام کا بارڈر سب سے آسان بارڈر ہے۔ میں نے تمہیں یہ بھی کہا تھا کہ وہ ہمیں نہیں پکڑ سکتے جب تک ہم خود نہ چاہیں۔ آسان بارڈر ہونے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ آپ منہ اٹھا کر سرحدی باڑ سے چلے جائیں گے۔ آسان بارڈر کا مطلب یہ تھا کہ ایسے بارڈر پہ سرحدی فوج کو ڈانچ دینا آسان ہوتا ہے۔“ وہ کہتا ہوا ہاتھ روم کی طرف گیا، چند ہی لمحوں بعد وہ شرت کا گرہ بیاں تو لیے سے صاف کرتے ہوئے واپس آیا تھا۔

”ہم ترکی اور شام کا بارڈر اسی طرح کراس کرتے ہیں۔ کمانڈر رشید تھا اس لیے مجھے یہ چاہیے تھا کہ میں اسے ایران سے کال کرواؤں اور ایران میں میرے پاس بہترین آپشن عائشہ تھی۔ عائشہ نے انہیں فون کر کے ایک ایسے کمرشل کا بتایا جسے وہ پکڑنا چاہ رہے تھے۔ حالانکہ وہ آدمی اس سے ہفتہ پہلے ہی ترکی سے شام چاچکا تھا۔ لیکن ان سکیورٹی فورسز والے گدھوں کو نہیں معلوم تھا۔“ شرت صاف کر کے اس نے گردن کے اوپر جوس کے قطرے بھی اس نے تولیے سے پونچھے پھر سر اٹھا کر گلہ آمیز نگاہوں سے جیا کو دیکھا۔

”اور اگر تم کسی پر کچھ گرانے سے پہلے اس کی بات سن لیا کرو تو زیادہ بہتر ہوگا۔ میں نے جس کمرشل کے بارے میں انہیں بتایا تھا وہاں پر جا ہی نہیں رہا تھا۔ جو بندہ میری جگہ بارڈر سے اس پوسٹ تک گیا تھا اس کو پھینوس کی ضرورت تھی۔ جب وہ اسے پکڑ لیں گے تو چھ ماہ اسے جیل میں رکھیں گے اور پھر چھوڑ دیں گے اور ان چھ ماہ میں اس کے گھر والوں کا بہت اچھا گزرا ہوا ہو جائے گا۔ یہ صرف ایک diversion تھا جو اپنی طرف سے ہم سکیورٹی فورسز کو دیتے ہیں تاکہ وہ بخبری کی گئی چوکی کی طرف اپنا فوکس رکھیں اور ایسے میں ان کی توجہ کسی قریبی چوکی سے ہٹ جایا کرتی ہے اور ہم ان کی اسی بے دھیانی کا فائدہ اٹھا کر بارڈر کے پار چلے جایا کرتے ہیں۔ ترکی اور شام کا بارڈر سب اسی طرح کراس کرتے ہیں۔ ایک بندہ پکڑواتے ہیں اور پوری کی پوری فیملی قریب ہی کہیں دوسری جگہ سے بارڈر کراس کر لیا کرتی ہے۔ اور جو بارودی سرنگ پھٹی وہ ان لوگوں سے بہت دور تھی۔ صرف افراتفری پھیلانے کے لیے کیا تھا میں نے یہ۔“

تو اسی لیے اس کے جوتوں کا رخ بائیں طرف تھا، وہ بارڈر کی طرف جا ہی نہیں رہا تھا، اس نے جانا ہی بائیں طرف تھا۔ کچھ نہ کچھ تو تھا جو جہاں نے اسے سیکھا یا تھا۔ مگر اس سیکھی ہوئی بات کو وہ پہلے ایلانی کر لیتی تو اتنی پریشانی نہ ہوتی۔

”اگر میں تمہیں بتا دیتا کہ وہاں پر سکیورٹی فورسز والے تیار ہیں، بارودی سرنگ بھٹنے لگی، گولیاں چلیں گی، تو کیا تم مجھے وہاں جانے دیتی؟ تم پریشان ہو جاتی۔ تم اتنے دن پریشانی میں گزارتی کہ کہیں میرا diversion ناکام تو نہیں ہو گیا۔ کہیں یہ نہ ہو کہ سکیورٹی فورسز والوں کو اندازہ ہو گیا ہو اور انہوں نے آس پاس کی فورسز بڑھا دی ہو۔ تم اسی طرح کی باتیں سوچتی رہتی اور پریشان ہوتی۔ اسی لیے میں نے تمہیں نہیں بتایا۔ مگر نہیں، وہ حیا سلیمان ہی کیا جو میری بات مان لے، جو اپنی عقل سے بے عقلی والے کام نہ کیا کرے۔“ سکیلے تو لیے کوصوفے کی پشت پہ ڈالتے ہوئے وہ برہمی سے کہہ رہا تھا۔

حیائے پھیکے رخسار پھیلی کی پشت سے صاف کیے۔

”اور وہ لڑکی کون تھی جس کے ساتھ ایک دفعہ ابا نے تمہیں دیکھا تھا؟ اب مت ظاہر کرنا کہ تمہیں یاد نہیں ہے!“

”وہ..... ہاں وہ..... عائشہ تھی!“

”عائشہ تم سے کبھی اتنی بے تکلف ہو ہی نہیں سکتی، سچ بتاؤ!“

”نہیں، ان فیکٹ، مجھے یاد آیا، وہ میری سیکرٹری تھی، دیت۔“ اور وہ جانتی تھی کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ وہ اصل بات کبھی نہیں بتائے گا۔ اب بھی کچھ باتیں تھیں جو وہ اسے نہیں بتاتا تھا۔ مگر فی الوقت وہ اسے کچھ بتانا چاہتی تھی۔

”میں وہاں تمہارے لیے گئی تھی جہاں، میں ترکی تمہارے لیے گئی تھی۔“

جہاں کے خفا چہرے کے تھے ہوئے نقوش ذرا ڈھیلے پڑے اور پھر ایک مسکراہٹ اس کے لبوں پر آگئی۔

”ویری گڈ۔ میں یہی سننا چاہتا تھا!“ وہ بہت محظوظ ہوا تھا۔ ”میں ہمیشہ سے جانتا تھا کہ تم وہاں کپادو کیلئے گئے تھے۔“

آئی۔

”کپادو کیلئے کی بات کون کر رہا ہے جہاں۔“ اس نے اکتا کر ٹوکا۔ ”تمہیں اچھی طرح پتہ ہے کہ تم نے مجھے کپادو کیلئے خود بلایا تھا ورنہ تم کبھی مجھ سے ماہن والی بات نہ کہتے۔ تم چاہتے تھے کہ میں وہاں آؤں۔ لیکن میں کپادو کیلئے کی بات کر رہی نہیں رہی۔“ وہ اس کے سامنے آکر کھڑی ہوئی اور جب بولی تو اس کی آواز پہلے سے ہلکی تھی۔

”میں ترکی تمہارے لیے گئی تھی جہاں۔ میں نے سانجی کا سکا لرشپ تمہارے لیے لیا تھا۔ میں تم سے ملنا چاہتی تھی۔ میں تم سے ان سارے گزرے ماہ و سال کا حساب لینا چاہتی تھی جن میں میں نے تمہارا انتظار کیا۔ میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ میں نے تمہارا نام کب سنا میں نہیں جانتی لیکن میں اتنا جانتی ہوں کہ تمہارا نام ہمیشہ میرے نام کے ساتھ رہا تھا۔ اب تم اس کو محبت کہو یا جو بھی کہو مجھے نہیں پتہ۔ میں بس اتنا جانتی ہوں کہ نہ میں تمہارے بغیر رہ سکتی ہوں نہ تم میرے بغیر رہ سکتے ہو۔ مگر احمد!“ آخر میں وہ ہنسی آنکھوں سے مسکرائی۔ جہاں نے ایک دم سے اسے دیکھا اور پھر دروازے کو۔

”آہستہ بولو کوئی سن لے گا۔“ حیا کی مسکراہٹ ذرا سی کٹمی۔ بے اختیار اس نے تھوک نگلا۔ اف ایک بات تو رہی گئی.....

”سن بھی لے گا تو کیا ہوگا۔“ انجان بننے ہوئے اس نے شانے جھٹکے۔

”میں نہیں چاہتا ابھی کسی کو پتہ چلے، سمجھا کرو نہ۔“ وہ ذرا سا جھنجھلایا تھا۔

”اس روز جب تباہی افغان وغیرہ تمہارے بارے میں پوچھ رہے تھے اور تمہیں الزام دے رہے تھے تو میں نے.....“ وہ ذرا سی

کھکاری۔ ”میں نے ہر چیز بتادی ان کو۔“ بات کے اختتام پر اس نے جہاں کا چہرہ دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں پہلے ابھرتا اور پھر.....

”تم نے سب کو کیا بتادیا؟“ وہ بری طرح سے چونکا۔

”وہی جوچ تھا۔ وہی جو تمہیں بہت پہلے ان کو بتانا چاہیے تھا مگر تم میں ہمت ہی نہیں تھی سو میں نے سوچا ٹھوڑی سی ہمت میں کر لوں اور میں نے بتادیا، بس!“ وہ جتنی لا پرواہی سے کہہ رہی تھی اس کے دل کی تیز ہوتی دھڑکن اس کے برعکس تھی۔ جہاں کس طرح ری ایکٹ کرے گا اس پر تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔ تب یقیناً جو نہیں تھا کہ وہ آجائے گا۔

”مگر تم نے ایسا..... اف..... اف.....“ اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ کیا کہے۔ وہ متشکر سا نظر آنے لگا تھا۔

”پتہ نہیں اب سب کیسے ری ایکٹ کریں گے۔ ایک دفعہ پھر نیا ایٹو۔ میں مزید ایٹو فوڈ نہیں کر سکتا۔“ وہ جھنجھلایا تھا۔

”تمہیں کس نے کہا ہے کہ وہ ایٹو بنائیں گے۔ وہ کوئی ایٹو نہیں بنائیں گے جہاں۔ تمہیں شاید ایک بات نہیں پتہ۔“ اس کے دل کی دھڑکن نارمل ہوئی اور جھک کر فرش سے پلاسٹک کا گلاس اٹھایا۔ پھر سیدھی ہو کر مسکراتے ہوئے بولی ”تمہیں دنیا کی ہر تہذیب، ہر ملک، ہر علاقے کا پتہ ہوگا۔ تمہیں بہت سی زبانیں آتی ہوں گی۔ مگر ایک جگہ تم غلطی کر گئے ہو۔ تم پاکستان میں کم رہتے ہو نا، تمہیں پتہ نہیں ہے کہ ہم پاکستانی بھلے مارشل لاء کے جتنے بھی خلاف ہو جائیں، ہمیں اپنے جرنیلوں، ڈکٹیٹرز سے کتنے ہی شکوے کیوں نہ ہوں، ہم ان کی پالیسیز سے کتنا ہی اختلاف کیوں نہ کریں مگر ایک بات ہمیشہ سے ملے ہے کہ ہم اپنی فوج سے واقعی محبت کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے۔“

جہان نے سر اٹھا کر اسے دیکھا پھر اس کے متفکر چہرے پہ ذرا سی مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہوئی۔

”اور کیا اس ہم میں تم بھی شامل ہو؟“

”یہ ایک پہیلی ہے اور اس کا جواب تمہیں خود ڈھونڈنا ہوگا۔ اب تم کام کرو اور میں ذرا عائشے کو بتا دوں کہ تم واپس آ گئے ہو۔“

”کون عائشے؟“ وہ جیسے بہت الجھ کر بولا۔ وہ ٹھہر گئی، ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی خیز لہر دوڑ گئی۔

”میرا مطلب تھا، پھوپھو کو بتا دوں۔ آف کورس، تمہاری طرح میں بھی کسی عائشے کو نہیں جانتی!“

جہان نے اثبات میں سر ہلایا، یعنی اب اسے ہمیشہ یہ بات یاد رکھنی ہوگی۔ عائشے، بہارے کا باب بند ہو گیا تھا۔

”کیا اب تمہیں کہیں جانا ہوگا یا تم گھر پہرہو گے؟“

”کیوں نہیں جانا ہوگا۔ آج تو ویسے بھی میرا یوم قیامت ہے۔ یوم حساب۔ ایک ایک پائی کا حساب دینا ہوگا۔ ان تین سال کا

حساب دیتے ہوئے بھی ایک عمر نکل جائے گی۔“ وہ واپس بیگ کی طرف مڑنے لگا مگر ایک دفعہ پھر اپنی گیلی شرٹ کو دیکھ کر رکا۔

”اور..... یہ آخری دفعہ ہوا ہے..... ٹھیک!“ اس نے حیا کے ہاتھ میں پکڑے گلاس اور اپنی گیلی شرٹ کو دیکھتے ہوئے تنبیہ

کی۔ حیا نے بڑی مشکل سے مسکراہٹ اپنے لبوں پہ روکی۔

”آئم سوری۔ بس میں غصے میں آ گئی تھی۔“

پھر اپنی مسکراہٹ چھپائی وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔ جو پہلی چیز اس نے جہان پہ گرائی تھی وہ بھی سلسل ہی تھا مگر وہ یہ نہیں جانتی

تھی کہ آج کا گرایا ہوا سلسل وہ آخری چیز ہوگی جو اس نے جہان پہ گرائی ہے یا نہیں، البتہ یہ طے تھا کہ اتنی آسانی سے تو وہ اپنی عادت نہیں

چھوڑنے والی۔



سارے گھر میں خوشیاں اتر آئی تھیں۔ وہ خوشیاں جن کا اس نے بہت انتظار کیا تھا۔ پچھلے سال دسمبر میں سانچی کے میل کے

بعد ان چھ سات ماہ میں پہلی دفعہ وہ دل سے خوش ہوئی تھی۔ بہت مشکل سے یہ خوشی اس کو ملی تھی اور وہ اس کو پورا پورا جینا چاہتی تھی۔

ابا اور پھوپھو نے فیصلہ کیا تھا کہ جہان اور اس کی منگنی، کانکشن بھی روئیل اور نٹاشا کے ویسے کے ساتھ رکھا جائے یعنی اسے

بھی دلہن بننا تھا۔ ہاں رخصتی اس کی ڈگری ختم ہونے کے بعد ہی کی جائے گی۔ فنکشن اس سنڈے کو تھا اور جب سے یہ ڈیٹا بند ہوا تھا،

سارے گھر میں افراتفری اور رونق سی لگ گئی تھی۔ جہان زیادہ تر گھر سے باہر رہتا لیکن جب بھی آتا اس کا استقبال ہمیشہ احترام اور عزت

سے کیا جاتا۔ اس کی توقع کی برعکس تاپا ابا، ابا، صائمہ تانی نے اس سے کچھ نہیں پوچھا تھا۔ کوئی گلہ یا کوئی طعنہ نہیں دیا تھا۔ جس نے پوچھا تھا،

پھوپھو سے پوچھ لیا تھا۔ شاید اس سے پوچھنے کی کسی میں ہمت ہی نہیں ہوئی۔ تاپا فرقان میں بھی نہیں۔

وقت بھی کیسے بدل جاتا ہے!

ہاں البتہ وہ اس سے اس کی جاب کے بارے میں، اس کی کیریئر کے بارے میں اور اس کے آنے والے کاموں کے بارے

میں ضرور پوچھا کرتے تھے اور وہ ان کے سامنے بیٹھا دھیمے لہجے میں مختصر سے جواب دے رہا ہوتا تھا۔ ایک لحاظ سے سب نے اپنے اور

اس کے درمیان کھڑا کر دیا تھا۔ یہ نہیں وہ اس سب سے خوش بھی تھا یہ نہیں۔ مگر وہ بہت خوش تھی۔

اس وقت بھی بچن میں بیٹھے مہمانوں کی لسٹ بناتے ہوئے وہ مسلسل خود ہی سے مسکرا رہی تھی۔ اس کے مقابل چیز ایک کے

آمیزے میں جھج ہلاتی ارم نے دزدیدہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”تم نے فنکشن کا جوڑا لے لیا؟“ جب ارم سے اس کی مسکراہٹ سہی نہ گئی تو اس نے پوچھ ہی لیا۔ اسے فاطمہ سے اجیشل چیز

ایک کے لیے بلوایا تھا کیونکہ وہ فیملی میں سب سے اچھا چیز ایک بناتی تھی۔

اس کی بات پر حیا ذرا سی چونکی، پھر نفی میں سر ہلایا۔ ”آرڈر تو دے دیا تھا مگر ابھی یک نہیں کیا۔“

”ہاں ویسے کافی لمبی ہو تم۔ ہے نا؟“ ارم نے جھج گول گول ہلاتے ہوئے کہا۔ ”کتنی آسانی سے بیٹھے بٹھائے اتنا بیڈ سم شہر۔“

تمہیں مل گیا۔“

بیٹھے بٹھائے؟ حیانے تعجب سے سوچا پھر دھیرے سے نفی میں سر ہلایا۔ اس کے پاؤں پہ زخموں کے نشان ابھی موجود تھے۔ بیٹھے بٹھائے تو کچھ بھی نہیں ملتا۔ ارم نہیں جانتی تھی کہ اس خوشی کو پانے سے پہلے وہ کتنے صحرائنگے پاؤں آبلہ پا چلی تھی۔ وہ کتنا جلی تھی، کتنا سہا تھا اس نے۔ ارم تو کچھ بھی نہیں جانتی تھی مگر اسے جتنا بے کار تھا۔ اس فنکشن اور اس کی گہما گہمی میں حیاتی خوش تھی کہ اس نے ویڈیو والی بات کو دوبارہ نہیں چھیڑا تھا۔ شاید ارم اب جہان کے آنے کے بعد احساس کر کے خود ہی وہ ویڈیو واپس لے لے۔ شاید کچھ نہ کچھ وہ کر لے۔ لاؤنج میں پھو پھو اور اماں ویسے کے انتظامات ڈسکس کر رہی تھیں۔ حیا کے لبوں پہ پھر سے مسکراہٹ اٹھ آئی۔

”اماں! نتاشا آگئی شاپنگ سے؟“

”ہاں ابھی ابھی آئی ہے ساڑھی لے کر۔ مجھے دکھا کر اندر رکھنے گئی ہے۔“ فاطمہ نے ہانکا سا سیر ہیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ روجیل کا کمرہ اوپر تھا۔ البتہ فاطمہ کے چہرے پہ ناخوش سانا ٹھرا۔

”حیا جاؤ نتاشا کو بلا لاؤ۔ پھو پھو کو بھی دکھا دے ساڑھی۔ تمہاری پھو پھو اندر تھیں جب وہ مجھے دکھا رہی تھی۔“ اماں نے یاد آنے پہ اسے پکارا۔ ان کے چہرے پہ البتہ دبی دبی سی کڑہن تھی۔ پتہ نہیں کیا بات تھی۔ پوچھنے کا ارادہ ترک کر کے وہ چین کا غزوہ ہیں پھوڑ کر اٹھی گئی۔

جہان کا کمرہ سیر ہیوں سے اوپر راہداری میں ایک کونے پہ تھا تو روجیل کا دوسرے کونے پہ۔ وہ آخری زینہ چڑھ کے اوپر آئی تو دیکھا جہان اور نتاشا، روجیل کے کمرے کے سامنے کھڑے ہستے ہوئے کچھ بات کر رہے تھے۔ نتاشا کے ہاتھ میں تین چار بڑے بڑے شاپنگ بیگز تھے اور وہ ہاتھ ہلا کر خالص امریکی انداز میں تیز تیز بولتی کچھ بتا رہی تھی۔ اتنے فاصلے سے آوازیں نہیں آرہی تھیں وہ کیا کہہ رہے تھے مگر خوش مزاجی، شناسائی..... اس کے ابرو تن گئے (اتنے ہنس کر کبھی مجھ سے تو بات نہیں کی۔ ہونہ!)

”نتاشا!“ اس نے پکارا۔ دونوں نے بے اختیار اسے مڑ کر دیکھا۔ جہان استقبالیہ انداز میں ذرا سا مسکرایا مگر وہ ایک ناراض نگاہ اس پہ ڈال کر آگے آئی۔

”نتاشا! اماں بلارہی ہیں۔ پھو پھو کو کپڑے دکھا دو۔“

”اوکے۔“ نتاشا نے ایک نظر جہان کو دیکھ کر اثبات میں سر ہلایا اور نیچے چلی گئی۔ وہ چھپتی ہوئی نگاہوں سے نتاشا کو دیکھتی ہوئی جہان کی طرف ہلٹی۔

”کیا بات ہو رہی تھی اپنی بچپن کی سبیلی سے؟“

وہ ذرا سا ہنس دیا۔

”نہیں بھئی میں تو تمہاری وجہ سے اتنا خوش اخلاق ہو رہا تھا۔ تمہاری بھابھی ہے نا!“

”میری وجہ سے تم کچھ نہیں کرتے اور اگر کچھ کرنا ہے تو شام میرے ساتھ فنکشن کے کپڑے لینے آ جاؤ۔ اگر تمہیں نہیں پسند ہوئے تو بدل لیں گے۔“ نتاشا کو بھول کر اسے کپڑوں کی بات یاد آگئی تھی۔

”ایک تو یہ نہیں ہماری معنی کنی دفعہ ہوگی۔“ وہ اس فنکشن کے آئیڈیا سے اکتا جاتا تھا۔

”اب ہو رہی ہے تو ہونے دو نا۔ کیا تم آج شام چلو گے؟“

”نہیں شام میں ذرا بازی ہوں، کل چلوں گا۔ پرامس۔“

وہ نیچے آئی تو پھو پھو اکیلی بیٹھی تھیں۔ اماں وہاں نہیں تھیں نہ ہی نتاشا۔

”نتاشا سائبر بھابھی کی طرف گئی ہے انہیں شاپنگ دکھانے۔ تمہاری اماں لان میں ہیں۔“ اس کے پوچھنے پہ پھو پھو نے بتایا

تھا۔ ”اوکے“ اس نے سر پہ دوپٹہ لیا اور پورچ کی طرف کھلتے دروازے کی طرف آئی۔ پٹ ذرا سا کھولا تو برآمدے میں فاطمہ اور روجیل رو برو کھڑے نظر آئے۔ فاطمہ غصے اور خفگی سے روجیل سے کچھ بحث کر رہی تھیں اور وہ آگے سے کچھ کہنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

”یہ پہن کر جائے گی وہ ویسے میں؟ حد ہوتی ہے روئیل۔ وہ گھر میں کیا کیا پہنے نہیں پھرتی، میں خاموش ہو جاتی ہوں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مجھے اور تمہارے ابا کو برا نہیں لگتا۔ مگر اس فنکشن میں ہزاروں لوگ ہوں گے روئیل۔ کچھ احساس ہے تمہیں؟“

”مگر اماں ایسا کیا.....“ مگر اماں اس کی نہیں سن رہی تھیں۔

”شلوار قمیص، لہنگا کچھ لے لیتی۔ بھلے سر پہ دو پٹہ نہ لیتی تب بھی خیر تھی۔ مگر یہ سلیو لیس، بیک لیس، بیہودہ سی ساڑھی اٹھا کر لے آئی ہے تمہاری بیوی۔ ہمارے خاندان میں کبھی ایسا لباس پہنا ہی کسی نے؟“

”اماں کیا ہو گیا ہے۔ جیابھی تو سلیو لیس پہن لیتی تھی۔“ اور اماں کے تانوسر پہ لگی، تلوؤں پہ بھیجی۔

”میری بیٹی کا نام مت لو!“ وہ ایک دم غصے میں آ گئی تھیں۔ ”میری بیٹی جب گھر سے نکلتی ہی تو عبا یہ پہن کر، چہرہ ڈھانپ کر نکلتی ہے۔ خاندان میں کوئی نہیں ہے جو میری بیٹی کے برابر کا ہو۔“

”مگر اماں پہلے تو جیابھی.....“

”پہلے کی بات مت کرو روئیل۔ ہم جیابھی کی بات کر بھی نہیں رہے۔ ہم تمہاری بیوی کی بات کر رہے ہیں۔!“

”اچھا ٹھیک ہے۔ میں بات کروں گا اس سے۔“ وہ جیسے جان چھڑانے والے انداز میں بولا تھا۔ مگر اماں کنوئیں نہیں ہوتی تھیں۔ وہ اور بھی کچھ کہنے کا ارادہ رکھتی تھیں مگر حیا دے قدموں واپس پلٹ گئی۔ اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔ دل بھر آیا تھا۔

ابھی کل ہی تو جب وہ شاپنگ پہ جانے کے لیے دھلے کپڑوں میں سے عبا یا ڈھونڈ رہی تھی تو اماں جھنجھلا کر کہہ رہی تھیں کہ ہر وقت اتنا براق کا شمس ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن اس کی غیر موجودگی میں اماں اس کے بارے میں کچھ اور کہہ رہی تھیں۔

دل سے تسلیم کر لینے اور زبان سے اعتراف کر لینے میں فرق ہوتا ہے، اور وہ فرق اماں پائ نہیں سک رہی تھیں۔

وہ واپس کچن کی طرف آئی جہاں ارم بیٹھی ابھی تک آمیزے کے ساتھ لگی تھی۔ نناشہ بھی اسی پل شاپنگ بیگز اٹھائے بیڑھیاں چڑھتی دکھائی دی تھی۔



حیا نے کاؤنٹر پہ رکھے ڈبے کے ڈھکن کو بند کرنے سے پہلے ایک دفعہ جوڑے کو دیکھا اور پھر جہان کے چہرے کو۔

”کیسا لگتے ہیں؟“ اس نے ذرا اشتیاق، ذرا فکر مندی سے پوچھا۔ پتہ نہیں اس کا ٹیسٹ جہان کو اچھا بھی لگتا ہے یا نہیں۔

”ہاں اچھا ہے.....“ وہ شاپ میں شاید اس سے زیادہ تبصرہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بس ذرا سے شانے اچکائے۔

حیا نے ایک دفعہ پھر اس تہہ شدہ جوڑے کو دیکھا۔ حالانکہ منگنی اور نکاح جیسے موقعوں پہ لڑکیاں لائٹ پنک، پستہ گرین یا ہلکی نیلا پہننا پسند کرتی تھیں۔ پھر بھی اس نے یہ رنگ منتخب کیا تھا۔

وہ لمبا گھیر دار پاؤں تک آتا فراک تھا، ساتھ چوڑی دار پاجامہ۔ سارا لباس ایک ہی رنگ میں تھا۔ گرے کلر۔ اور گرے کا بھی درمیانہ سا شڈ۔ نہ بہت ہلکا، نہ بہت گہرا۔ پورے فراک پر dimontes اور سفید موتیوں کا کام تھا۔

گرے اور سلور کا کامینیشن۔

پھوپھو اس کو وائٹ گولڈ اور ڈائمنڈ کا سیٹ دے رہی تھیں اور اس کی مناسبت سے اس کو یہ رنگ سب سے بہترین لگا تھا۔

حیا نے ڈبے بند کیا اور اسے شاپنگ بیگ میں ڈالتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ جہان اس کے پیچھے چٹا ہوا ہا ہر آیا۔

”کیا تمہیں واقعی پسند آیا۔ تمہارے چہرے سے تو نہیں لگ رہا تھا؟“ گاڑی میں بیٹھے ہی وہ ذرا متفکر سی بولی۔

”نہیں مجھے واقعی پسند آیا۔ بہت اچھا لگتا تھا لیکن.....“ کنکیشن میں چا بے ڈالتے ہوئے جہان نے ذرا سے شانے اچکائے۔

”لیکن میں صرف یہی سوچ رہا ہوں کہ.....“

”کہ کیا؟“ وہ جانتی تھی کہ وہ بات کو کس طرف لے کے جا۔ ہا بے پھر بھی اس نے انجان بننے ہوئے پوچھا۔

”بہی کہ تم اس لباس کے ساتھ..... میرا مطلب ہے تم اپنا پردہ کیسے کیری کرو گی وہ بن کر۔“ وہ شاید کافی دیر سے یہی سوچ رہی تھی۔

تھا۔ حیا کے لبوں پر ایک ہلکی سی اسرار بھری مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہوئی۔

”کروں گی۔“ گاڑی اب سڑک پہ دوڑ رہی تھی اور وہ ذرا سا مسکراتے ہوئی وینڈسکرٹین کے پار دیکھ رہی تھی۔

”کیا تم اس کا مدار لباس کے اوپر برقع لوگی یا چادر وغیرہ؟“

”نہیں میں برقع نہیں لوں گی۔“

”تو تم کیا اس کے کام والے ڈوپٹے سے نقاب کرو گی؟“ جہان کو کہتے ہوئے بھی یہ بات بہت عجیب سی لگ رہی تھی، بہت ہی

آکورد۔ نقاب نہیں، کا مدار ڈوپٹے سے نقاب۔ اور اسے شاید لگا تھا کہ حیا آگے سے اس کی بات کی تصدیق کر دے گی۔

”نہیں میں ڈوپٹے سے نقاب تو نہیں کروں گی۔“

”تو پھر تم کیا کرو گی؟“

حیا نے آنکھوں میں اسی مسکراہٹ کو سموئے گردن موڑ کر جہان کو دیکھا۔ وہ جیسے اس بات پہ بہت سوچنے کے باوجود بھی کسی نتیجے پہ نہیں پہنچ سکا تھا۔

”جہان، کچھ باتوں میں میں تم سے زیادہ سارٹ ہوں۔ تم ہی نے تو کہا تھا نا کہ رستہ ہوتا ہے۔ میں نے بھی رستہ نکال لیا ہے۔“

”اچھا چلو دیکھتے ہیں تم کیا کرتی ہو!“ وہ اس کی بات پر محفوظ ہو کر ذرا سا مسکرایا۔

تھوڑی ہی دیر بعد اسے محسوس ہوا کہ گاڑی گھر کی بجائے کسی اور جانب جا رہی ہے۔

”کیا ہم گھر نہیں جا رہے؟“ اس نے ذرا تذبذب سے پوچھا۔

”پہلے ہمیں کچھ اٹھانا ہے۔ میں نے ایک بیکری پہ کچھ آرڈر کیا تھا!“ وہ اسٹیرنگ ویل گھماتے ہوئے موڑ کاٹ رہا تھا۔ حیا کو

ابھٹھا ہوا۔ باہر رات ہو چکی تھی اور ان لوگوں نے ڈنر پر گھر پہنچنا تھا۔

”ایسا کیا آرڈر کیا تھا تم نے؟“

”شاید تمہیں یاد ہو میں نے تمہارا ایک جینر بریڈ ہاؤس توڑا تھا۔“ اور حیا کا سانس لمحے بھر کے لیے تھا۔

”کیا تم نے میرے لیے جینر بریڈ ہاؤس بنایا ہے؟“ وہ حیرت زدہ ہو کر رہ گئی تھی۔

”تمہیں لگتا ہے میں اتنا فارغ ہوں؟ میں نے صرف ایک بیکری پر آرڈر دیا ہے اور اب ہم نے اسے پک کرنا ہے۔ کل ہماری

منگنی تیسری دفعہ ہو رہی ہے، سو اس سے پہلے مجھے یہ حساب برابر کرنا ہے۔“ مسکراہٹ دباتے ہوئے وہ بولا تھا۔

”لیکن تم نے خود تو نہیں بنایا نا!“

”مگر پیسے تو میں ہی دے رہا ہوں نا۔“ اور یہ بات کرتے ہوئے اس غریب آدمی کے چہرے پہ خفگی سمٹ آئی۔ حیا بے ساختہ

گردن موڑ کر شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ جہان اس کی آنکھوں میں آتی مسکراہٹ کو دیکھ پائے۔

اس بیکر نے بہت محنت سے جینر بریڈ ہاؤس بنایا تھا۔ وہ اتنا ہی پیارا تھا جتنا حیا کا اپنا جینر بریڈ ہاؤس۔ یا پتہ نہیں کیوں اسے لگا

کہ یہ والا ہاؤس زیادہ پیارا تھا۔

کاؤنٹر پہ بڑے میں رکھا وہ خوبصورت سا ہاؤس جس کے اوپر الابلا کینڈیز، جیلی اور آئسکریم سے ڈریسنگ کی گئی تھی۔

”نہیں اس کو بیک نہ کریں، یہ ٹوٹ جائے گا۔ بہت نازک ہے۔ میں اس کو یونی اٹھالوں گی۔“ حیا نے احتیاط سے جینر بریڈ

ہاؤس والی ٹرے اٹھالی۔ کپڑوں والا شاپر تو ویسے ہی گاڑی میں پڑا تھا۔ اب وہ ٹرے کو اسی طرح اٹھائے گھر لے جانا چاہتی تھی۔

”اگر اس دفعہ یہ ٹوٹا تو یہ تمہاری غلطی ہوگی۔“ جہان نے باہر نکل کر اسے تنبیہ کی تھی۔ وہ جواب دیے بنا سچ کر چلتی گاڑی

تک آئی۔

پھر سارا رستہ وہ ٹرے ہاتھوں میں اٹھائے رہی تھی۔ ہاتھ دکھنے لگے تھے مگر اس نے ذرا بھی بد احتیاطی نہیں کی تھی۔ یہ جینر بریڈ

ہاؤس اسے اپنے والے سے زیادہ پیارا تھا۔

گاڑی گھر کے پورچ میں رکی تو جہان جلدی سے باہر نکلا اور اس کی طرف کا دروازہ کھولا۔ یقیناً یہ عنایت اس خنجر بریڈ ہاؤس کے لیے تھی بلکہ اپنے پیسے ضائع نہ ہونے کے لیے۔

وہ بڑے اٹھائے باہر نکلی۔ جہان نے پچھلے سیٹ پہ پڑا اس کا شاپر اٹھالیا۔

”چلیے مدام! آپ کے کپڑے ڈرائیور لے آئے گا!“ وہ مصنوعی بیچارگی سے کہتا راستہ چھوڑ کر اسے آگے جانے کا اشارہ کر رہا تھا۔ حیا کے لبوں پر مسکراہٹ اٹھ آئی۔ ابھی وہ چند قدم ہی چل پائی تھی کہ جہان کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

”یہ گاڑی کس کی ہے؟ شاید کوئی مہمان آیا ہے۔“ اس بات پہ حیا نے گردن موڑ کے دیکھا۔ پورچ میں کھڑی اپنی گاڑی کے آگے کھڑی گاڑی..... اور پیردوں کے نیچے سے زمین سرکنے لگی تھی۔

اس سیاہ کارڈ کو وہ ہزاروں گاڑیوں میں بھی پہچان سکتی تھی۔

”پپ..... یہ نہیں۔“ اس کی آواز لڑکھرائی۔ ٹرے پہ جسے اس کے ہاتھ مزید سخت ہوئے۔

جہان کچھ کہے بنا شاپنگ بیگ کپڑے اس کے آگے آگے اندر گیا۔ وہ جہان کے پیچھے اندر آئی۔ ایک ایک قدم بہت بھاری ہو رہا تھا۔

لاؤنج کے دہانے پہ بی سارا منظر دکھائی دے دیا تھا۔ اس کے قدم چوکھٹ سے ذرا پیچھے جم گئے۔ وہ تاریک گوشے میں کھڑی تھی، اندر والے لوگ اس کی طرف متوجہ نہیں تھے۔

وہاں ولید ایک صوفے پہ ٹانگ پہ ٹانگ رکھے بیٹھا تھا۔ سامنے ابا، اماں، تایا، صائمہ، تائی، روجیل، نتاشا، پھوپھو اور بھائی، سونیا..... سب ہی تھے۔ سونیا تو چلو شادی شدہ تھی سو خاندان کی روایت کے مطابق اس کا پردہ نہیں تھا مگر اچھنے کی بات یہ تھی کہ ارم بھی وہیں کونے میں کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی جیسے شاید وہ کچھ سرور کرنے کے بہانے اندر آئی ہو اور پھر وہیں کھڑی ہو گئی ہو۔

جہان آگے آیا، ایک نظران سب کو دیکھا اور پھر ’ایک منٹ‘ کہہ کر شاپنگ بیگ کی طرف اشارہ کیا جیسے انہیں رکھنا ہے اور سیڑھیاں چڑھتا گیا۔

وہ وہیں اکیلی کھڑی رہ گئی۔ ٹرے کو کپڑے اس کے ہاتھ پسینے میں بھیگ گئے تھے۔

ولید نے جہان کو سیڑھیاں چڑھتے دیکھا تو گردن اس طرف موڑی۔ حیا کو دیکھتے ہوئے ایک زہریلی مسکراہٹ اس کے منہ پہ اٹھ آئی۔ وہ کچھ مسرور سا واپس ان سب کی طرف مڑا جو ابھی تک الجھی نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

”جی سلیمان انکل تو میں کہہ رہا تھا کہ ہمیں اس معاملے پہ آرام سے بات کرنی چاہیے اور مس حیا۔ سوری مسز حیا تو یہ جانتی ہیں کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں۔“ اس نے بات کر کے پھر سے گردن موڑ کر ایک فاتحانہ نظر حیا پہ ڈالی تھی۔ ابا نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں حیا کو دیکھا اور پھر انہیں الجھی نگاہوں سے ولید کو۔

”ولید یہ میرا گھر ہے۔ یہاں اس طرح کے معاملے ڈسکس کرنے کا کیا مطلب ہے؟“ ابا کو جیسے اس کا آنا اور یہ سب کہنا بالکل بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ روجیل، تایا ابا سب کے ماتھے پہ بل تھے جیسے کسی کو یہ پسند نہیں آ رہا۔

”بات گھر کی تھی اسی لیے میں نے سوچا گھر میں کر لی جائے۔ جو چیز میرے پاس ہے اسے دیکھ کر آپ کو اندازہ ہو گا کہ آپ لوگ اتنی آسانی سے میرے شیئرز بیل نہیں کر سکتے۔“

”ولید یہ کوئی طریقہ نہیں ہے۔“ داور بھائی ناگواری سے کہتے اٹھنے لگے۔ روجیل بھی برہمی سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ ارم اسی طرح کونے میں کھڑی تھی۔ شاید اسے کسی نے جانے کے لیے نہیں کہا تھا یا شاید کہا ہو تب بھی وہ کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ غالباً سارا تماشا دیکھنا چاہتی تھی۔

اس سارے میں اگر کوئی بڑے مزے سے بیٹھی، کوک کے کین سے گھونٹ گھونٹ بھر رہی تھی تو وہ نتاشا تھی۔ ہر فکر سے بے نیاز،

ہر پجوایشن کو انجوائے کرتی ہوئی۔

”داورتم اسے ضرور دیکھنا چاہو گے۔ آخر اس کا تعلق تمہاری ہی شادی کے فنکشن سے ہی تو ہے۔“ وہ کہتے ہوئے کھڑا ہوا اور حیا کی طرف دیکھ کر اپنی جیب سے ایک پلاسٹک ریپر نکالا جس میں رکھی سی ڈی صاف نظر آ رہی تھی۔

”کیا میں اس کو چلا دوں؟“ اس نے سی ڈی حیا کو دکھاتے ہوئے پوچھا۔

سب لوگ اس بات پر مڑ کر حیا کو دیکھنے لگے تھے۔ وہ جو ساکت سی کھڑی بنا پلاک جھپکے اسے دیکھ رہی تھی، اس بات پر بے اختیار اس کے قدم پیچھے ہٹے۔ کمر دیوار سے جا لگی۔ ہاتھ میں پکڑی ٹرے بہت وزنی ہو گئی تھی۔

”جو بات کرنی ہے اب اسے کرو۔“ روچیل برہی سے بولا تھا۔ اس کی بات کو ولید نے جیسے سنا ہی نہیں۔

اسی لمحے جہان خالی سیڑھیاں اترتا دکھائی دیا۔

”جو بات کرنی ہے مجھ سے کرو۔ ہاں بولو، کیا مسئلہ ہے؟“ وہ جیسے اب فارغ ہو کر بہت سنجیدگی سے کہتا، ولید کے سامنے آ کر کھڑا ہوا۔

حیا نے امید سے جہان کی طرف دیکھا۔ وہ یقیناً سمجھ جائے گا کہ یہ وہی ویڈیو ہے۔ وہ ابھی ولید کو کچھ دے مارے گا، یا سی ڈی کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا، اسے پوری امید تھی۔

اس کی بات پہ ولید کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔ ”یہ شو ٹائم ہے اور تم تو اس شو کو ضرور دیکھنا چاہو گے۔“ بات کے اختتام پہ ولید نے پھر حیا کو دیکھا۔ اس کا بار بار حیا کو دیکھنا سب کو الجھن اور عجیب سی کیفیت میں مبتلا کر رہا تھا۔

”کیا ہے اس سی ڈی میں؟“ جہان نے سنجیدگی سے اس سے پوچھا البتہ آنکھوں میں ذرا سی الجھن تھی۔

وہ نہیں سمجھا تھا۔

اللہ اللہ۔ وہ نہیں سمجھا تھا!

اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔

جہان نہیں سمجھا تھا۔ وہ کہنا چاہتی تھی، چلانا چاہتی تھی۔ جہان اس سے مت پوچھو، پلیز جہان، اسے گھر سے نکال دو۔ اسے کچھ دے مارو مگر اسے یہاں سے بھیج دو۔

مگر سارے الفاظ حلق میں دم توڑ گئے۔

”آپ کے گھر کی چیز ہے تو آپ ضرور دیکھنا چاہیں گے اور اس کے بعد آپ فیصلہ کریں گے کہ آپ مجھے اپنی کہنی میں کس حیثیت سے کام کرنے دیں گے!“

لاؤنج میں خاموشی تھی۔ سب سن رہے تھے، بول بس وہی دونوں بول رہے تھے۔

حیا کا سانس آہستہ آہستہ رکنے لگا۔ دم گھٹ رہا تھا۔ فضا میں آکسیجن کم ہو گئی تھی۔

”مگر اس میں ہے کیا؟“

”وہ رہائی دی اور وہ اس کے نیچے ڈی وی ڈی رکھا ہے۔ اس کو لگا کر خود دیکھ لو، بہت انجوائے کرو گے۔“ اس نے سی ڈی جہان کی طرف بڑھائی۔ حیا کے منتھوں سے آکسیجن کا کوئی جھونکا نکل رہا تھا۔ سانس۔ خوش گمانی۔ امید۔ ایک کرن سی نظر آئی تھی کہ جہان سی ڈی ہاتھ میں لیتے ہی توڑ دے گا اور ولید کو دے مارے گا۔

جہان نے ذرا تذبذب سے سی ڈی کو دیکھا اور پھر اسے تھام لیا۔ مگر اس نے اسے نہیں توڑا۔ اس نے سی ڈی کو کور سے نکالا، الٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر سر اٹھا کر ولید کی طرف متوجہ ہوا۔

”آر یوشیور کہ اس میں کچھ ایسا نہیں جو کسی کے توہین کا باعث بنے۔ کیا میں اسے واقعی سب کے سامنے چلا دوں۔“

”اس میں جو ہے وہ سب سچ ہے۔ کوئی گلے نہیں ہے۔ چلاؤ، ضرور چلاؤ۔“

جہان نے سی ڈی پکڑے پکڑے تاپا ابا کو دیکھا۔ وہ اسی ابھی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ اچانک ہو کیا رہا ہے۔ اس طرح اچانک ولید کا آنا، پھر ان سب سے کہنا کہ وہ ان سے کوئی بات کرنا چاہتا ہے اور پھر یہ سی ڈی وغیرہ۔

جہان نے مڑ کر ارم کو دیکھا۔ ”کیا میں اسے چلا دوں؟“ اس نے ارم سے اجازت مانگی تھی۔ وہ اس سے کیوں پوچھ رہا تھا۔ کیا اسے احساس نہیں تھا کہ یہ سی ڈی ارم نے ہی تو ولید کو دی ہوگی۔ اور اسی لیے ارم نے بہت ہی بے نیازی سے شانے اچکائے جیسے کہہ رہی ہو میری بلا سے۔ البتہ اس کی آنکھوں میں مسکراہٹ سی تھی۔ شونائم کی مسکراہٹ کہ اب آئے گا مزہ۔

جہان نے پھر ولید کو دیکھا جیسے خود بھی متذبذب تھا کہ اسے سی ڈی چلانی چاہیے یا نہیں۔ جہان نے ایک سپاٹ سی نگاہ اس پہ ڈالی اور پھر اوکے کہتے ہوئے مڑا۔ اس کے قدم دیوار میں لگے ٹی وی کی طرف اٹھ رہے تھے۔

کچن کی کھلی کھڑکی سے ہوا کا جھونکا آیا اور آدھی کھلی دیوار پہ لٹکتے ونڈ چائیم کی لڑیاں گول گول گھونٹنے لگیں۔ اسٹک اور کانچ نکرائے۔ خاموشی میں مدھم سا نغمہ بج اٹھا۔

ماتم کا نغمہ۔

سوگ کا نغمہ۔

جہان نے ایک قدم مزید ٹی وی کی طرف بڑھایا، باہر بادل زور کے گر رہے، بجلی چمکی، اور حیا کے ہاتھ سے جنجر بریڈ ہاؤس کی ٹرے گر پڑی۔ ہلکے سے ٹھڈکی آواز کے ساتھ ٹرے اوندھے منہ زمین بوس ہوئی۔ کوئی اس کی طرف متوجہ نہیں ہوا تھا۔ وہ سب اس سی ڈی کو دیکھ رہے تھے کہ آخر اس میں ایسا کیا ہے جسے دکھانے کے لیے ولید اتنا بے چین ہو رہا تھا۔

جہان آہستہ آہستہ چلتا ٹی وی کی طرف جا رہا تھا۔ حیا کا ٹوٹا ہوا جنجر بریڈ ہاؤس اس کے قدموں میں گرا پڑا تھا۔ لیکن اسے پرواہ نہیں تھی۔ وہ بس سانس روکے لاؤنچ میں بیٹھے نفوس کو دیکھ رہی تھی۔

ابا، روجیل، جہان، باپ، بھائی، شوہر۔ کوئی اس کے ساتھ نہ تھا۔ کوئی اسے اس پرانے مرد، بلیک میلر سے بچا نہیں سکتا تھا، مگر کیا واقعی کوئی نہیں تھا؟

”اللہ تعالیٰ!“ اس نے زور سے پکارا تھا۔ اللہ کا نام وہ واحد نام ہوتا ہے جس کو بولنے کے لیے ہونٹ ہلانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس نے بھی نقاب تلے آپس بند ہونٹوں پیچھے زبان ہلا کر اسے پکارا تھا۔

”اللہ تعالیٰ، میں بہت اکیللی ہوں، میرے پاس اس وقت کوئی نہیں ہے جسے میں پکار سکوں۔“

جہان اب ٹی وی کے پاس پہنچ چکا تھا۔ حیا کے دل پہ پڑتا بوجھ اب بڑھتا جا رہا تھا۔

”صرف آپ ہیں جو میری مدد کر سکتے ہیں،

آپ دے دیں تو کوئی چھین نہیں سکتا!“

جہان نے ٹی وی کا بٹن آن کیا اور پھر ریموٹ سے ڈی وی ڈی چلایا۔ اب ٹی وی سکرین نیلی آ رہی تھی۔

”آپ چھین لیں تو کوئی دے نہیں سکتا!“

جہان نے جبکہ کر بٹن دباتے ہوئے ڈی وی ڈی کی پلیٹ باہر نکالی۔ دفعتاً ریموٹ اس کے ہاتھ سے پھسل پڑا۔ ماربل کے فرش پہ ریموٹ گرا تھا۔ چند لمحے مزید گزر گئے۔

”میری مدد کریں۔ مجھے اکیلا مت چھوڑیں!“

جہان ریموٹ اٹھا کر پھر سیدھا ہوا۔ کاش ریموٹ ٹوٹ جاتا مگر وہ نہیں ٹوٹا تھا۔

ہر چیز اس کے خلاف جا رہی تھی۔

جہان نے خالی سانچے میں سی ڈی رکھی اور اسے واپس دھکیلا۔

”مجھے ان لوگوں کے سامنے رسوا نہ کریں!“

سکرین پر میڈلکھا آ رہا تھا۔ جہان نے ذرا پیچھے ہو کر ریموٹ سے پلے کا بٹن دیا۔

”مجھے رسوا نہ کرنا! پلیز... ہیلپ می... پلیز!“

حیائے آنکھیں بند کر لیں۔ شاید سی ڈی نہ لگے، وہ اندر پھنس جائے۔ شاید..... مگر چند ہی لمحوں بعد اسے گانے کی ٹون سنائی

دی تھی۔

شیلہ کی موسیقی۔

اس کے قدموں تلے سے زمین سرکنے لگی تھی۔ سر سے آسمان ہٹنے لگا۔ اسے لگا وہ ابھی گر جائے گی۔ وہ ابھی مر جائے گی۔

ویڈیو لگ چکی تھی۔ سب دیکھ رہے تھے۔

وہ خواب نہیں تھا۔ وہ حقیقت تھی۔ وہ ایک دفعہ پھر رسوا ہونے جا رہی تھی۔

ساری رضاعت، ساری اطاعت، سب بیکار گیا تھا۔

رسوائی، گناہ۔ وہ اس کا پیچھا کبھی نہیں چھوڑے گی۔ وہ قبر تک اس کے پیچھے آئیں گے۔

اس نے اپنی سرخ پرتی بند آنکھیں کھلیں۔ لاؤنچ کا منظر ذرا سا دھندلا رہا تھا۔ اس نے ابا کے چہرے کو دیکھنا چاہا جو بہت

شاکڈ سے سکرین کو دیکھ رہے تھے۔ اس نے اپنے باپ کو سر بازار بے عزت کر دیا تھا۔

اس نے روجیل کا چہرہ دیکھنا چاہا جیسے سمجھ نہ آ رہا ہو کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔

اس نے تایا ابا کے چہرے کو دیکھنا چاہا۔ غصیض، غصیب، غصہ، پیشانی کی تہی نہیں، سرخ پڑتا چہرہ۔ اس نے صائمہ تائی اور اماں

کے چہروں کو دیکھا۔ ہکا بکا۔

گانا اسی طرح چل رہا تھا۔

اس نے نتاشا کے چہرے کے دیکھا۔ وہ بڑے ستائشی انداز میں سکرین کو دیکھتی ایکسا سٹڈی آگے ہو کر بیٹھی تھی۔ کوک کا کین

ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔

اس کی نگاہیں نتاشا سے ہوتی ہوئیں سامنے جہان کے چہرے پر پڑیں۔ جہان وہ واحد شخص تھا جو ٹی وی کو نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ

صرف جھپٹی ہوئی نگاہوں سے ولید کو دیکھ رہا تھا۔ اور ولید..... تب اس نے دیکھا۔

ولید کا چہرہ سفید پڑا ہوا تھا۔ اتنا سفید جیسے کسی نے پیٹ کر دیا ہو۔ اسی پل اس نے ارم کو دیکھا۔ اس کا چہرہ بھی اتنا ہی سفید۔

یہ کیا۔

ایک دم سے حیائے گردن گھما کر سکرین کو دیکھا۔

نقاب تلے اس کے ہونٹ ذرا سے کھلے۔ آنکھوں کی پتلیاں بے یقینی سے پھیلیں۔

اسے لگا وہ کبھی سانس نہیں لے سکے گی۔

گانا بھی وہی تھا، میوزک بھی وہی تھا، سی ڈی بھی وہی تھی مگر منظر..... نہیں یہ شریفوں کا مجرا نہیں تھا۔ نہیں۔ یہ اس کی ویڈیو نہیں

تھی۔ یہ تو۔

ارم اور ولید.....

وہ تصاویر کا ایک سلائیڈ شو تھا۔ ایک ایک کر کے بڑی بڑی تصاویر سکرین پر ابھرتیں اور چلی جاتیں۔ ارم اور ولید کی تصاویر۔

اکٹھے کسی ریسٹورانٹ میں، کسی شاپنگ ایریا، کسی پارک میں۔ ساری فوٹو ز سیلف فوٹو ز تھیں۔ جیسے ولید کے ساتھ ہو کر ارم نے بازو بڑھا کر

خود ہی موبائل سے کھینچی ہوں۔ اور اس لحاظ سے وہ دونوں بہت قریب قریب کھڑے تھے۔

ہر دو تین تصاویر کے بعد سکن شدہ ای میلز سکرین پہ ابھرتیں۔ ان میں سے کچھ فقرے ہائی لائینڈ تھے۔ وہ تصویر اتنی دیر تک سکرین پہ رہتیں کہ وہ سب ان ہائی لائینڈ فقروں کو پڑھ لیتے۔ پھر اگلی تصویر آ جاتی۔ ارم اور ولید کی ذاتی ای میلز۔

”یہ..... یہ کیا؟“ ولید ایک دم آگے بڑھنے لگا۔

”ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو ان ٹانگوں میں اپنے گھر نہیں جاؤ گے۔ وہیں کھڑے رہو۔“ جہان کا وہ الجھن بھرا چہرہ، وہ تذبذب، سب غائب ہو گیا تھا۔ وہ اتنے سرد اور کٹیلے انداز میں بولا کہ ولید کے بڑھتے قدم وہیں رک گئے۔ اس نے سششدری نگاہوں سے جہان کو دیکھا۔

”یہ شو ٹائم ہے نا ولید لغاری اور تم نے کہا تھا اس شو کو میں بہت انجوائے کروں گا۔ میں تو کر رہا ہوں۔ تم بھی کرو مگر شاید تم کوئی غلطی ڈی اٹھالائے ہو۔“

”یہ..... یہ غلط ہے..... یہ سچ نہیں ہے۔“ ولید لغاری ہکلا گیا۔ کبھی وہ صوفوں پہ بیٹھے نفوس کو دیکھتا، کبھی جہان کو۔ حیا کو دیکھنا تو اسے یاد ہی نہیں رہا تھا۔

”ابھی تم نے خود کہا تھا کہ یہ حقیقت ہے، تمہارے کون سے بیان پہ یقین کروں میں؟“ وہ درشتی سے بولا، مگر اسی اثنا، میں داور بھائی غصے سے اٹھے تھے۔

”گھٹیا انسان، میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں۔“

”پلیز!“ جہان نے ہاتھ اٹھا کر انہیں اس کے قریب آنے سے روکا۔ ”ہاتھ کا استعمال مجھے بھی آتا ہے، مگر یہاں خواتین بیٹھی ہیں، اس لیے اس آدمی سے میں خود نہپٹ لوں گا بعد میں! اور ابھی!“ اس نے انگشت شہادت اٹھا کر قہر آلود نگاہوں سے ولید کو دیکھتے تنبیہ کی۔ ”ابھی تم یہاں سے اپنی شکل گم کرلو۔ تم سے میں بعد میں ملوں گا، کیونکہ یہ سی ڈی اب میرے پاس ہے اور تم نہیں چاہو گے کہ تمہارا ہونے والا سر یا اس کی بیٹی یہ سب دیکھے۔ سینئر عبدالولی کی بیٹی سے رشتہ ہو رہا ہے تمہارا؟“

ولید لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا، تایا، ابا، روئیل، سب اپنی جگہوں سے کھڑے ہو چکے تھے۔ بس نہیں چل رہا تھا، اس آدمی کو گولی مار دیں۔

”آؤ!“ سلیمان صاحب ضبط سے بہ زور بولے تھے۔ ولید اس اڑی رنگت اور بدحواس قدموں سے پٹا۔ سامنے دیوار کے ساتھ لگی، حیا کھڑی تھی۔ اس کی نقاب سے تھلکتی سیاہ آنکھوں میں بھی سکتہ طاری تھا۔ ولید ان آنکھوں میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ تیزی سے باہر نکلا۔

باہر اسی طرح بارش کے قطرے گر رہے تھے۔

ٹی وی اسکرین پہ وہ سلائڈ شو ابھی تک چل رہا تھا۔ ارم سفید چہرے کے ساتھ وہ دیکھ رہی تھی۔ تصویریں تھیں کہ ختم ہی نہیں ہو رہی تھیں۔

”یہ سب نوٹ فکسنگ ہوگی۔“ پھپھورنجیدگی سے بولی تھیں۔ حالانکہ تصاویر بہت کلیئر تھیں، مگر تایا اور داور کے سرخ چہرے..... وہ ارم کو کسی طوفان سے بچانا چاہتی تھیں۔

تیز بارش ختم چکی تھی۔ ہلکی ہلکی بوند باندی جاری تھی۔ کھڑکیوں کے شیشوں پہ گرتی ٹپ ٹپ کی آواز مسلسل آرہی تھی۔

پھپھو کی بات پہ صائمہ تانی کو تقویت ملی تھی۔

”یہ سب جھوٹ ہے، الزام ہے میری بچی پہ۔ یہ سب ارم اور حیا کی تصویریں تھیں، یہ لڑکا کہاں سے آگیا ان میں؟“ وہ بیٹی بات سنوانے کے لیے زور سے بولی تھیں۔ ”اور یہ ساری تصویریں حیا کے پاس تھیں، اسی نے دی ہوں گی اس لڑکے کو، اور نام میری بیٹی کا لگا دیا۔“

”گھر چلو تم لوگ!“ تایا فرقان قہر برساتی نگاہ سے ان کو دیکھتے ہوئے بولے تھے۔

”میری بات سنیں، یہ جیا کے پاس تھیں تصویریں، اس نے..... اسی لیے وہ لڑکا بار بار حیا کا نام لے رہا تھا۔“

”میری بیوی کا نام تم لیں ممانی!“ اباصمہ تائی کی بات پہ ناگوار سی سے احتجاج کرنے ہی لگے تھے کہ وہ جیسے غصے سے کہتا ان کے سامنے آنکھڑا ہوا تھا۔

”یہ تصویریں شاید آپ کو اپنی بیٹی کے لیپ ٹاپ سے بھی مل جائیں۔ مگر میری بیوی کا نام اگر کسی نے لیا تو مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہوگا۔“ وہ اتنی سختی سے انگلی اٹھا کر بولا تھا کہ صائمہ ممانی آگے سے کہہ نہ سکیں۔ فاطمہ اور پچھو نے افسوس سے ایک دوسرے کو دیکھا، جیسے سمجھ نہیں آ رہی ہو کیا کریں۔

”گھر آؤ تم لوگ!“ تایا ابانے بہت ضبط سے، سرخ پڑتی نگاہوں کے ساتھ بیوی کو اشارہ کیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے باہر نکل گئے۔ اور بھائی نور اباب کے پیچھے لپکے۔

”ابا..... یہ سب میں نے نہیں..... یہ جیا نے.....“ ارم نے ان کو آواز دینا چاہی۔

”ارم!“ جہان نے حیرت اور غصے سے اسے دیکھا۔ ”تم میری بیوی کا نام اس سب میں کیسے لے سکتی ہو؟“

تایا جا چکے تھے۔ ارم نے بے بسی سے جہان کو دیکھا۔

”تمہیں کیا لگتا ہے؟ تم لڑکیوں کو کیا لگتا ہے، ہاں؟ تم موبائل سے مٹیج مٹا دو گی، کال ریکارڈ حذف کر دو گی تو وہ ختم ہو جائے گا؟ ایسا نہیں ہوتا ارم۔ ہر ایس ایم ایس ریکارڈ ہوتا ہے، ہر کال ریکارڈ ہوتی ہے۔ ایک دفعہ پھر لو میری بیوی کا نام اور میں تمہیں اپنی انجینی سے ولید کے فون پہ لگتی ہر کال کی آڈیو ریکارڈنگ نکلا کر دکھاؤں گا۔ میرے لیے یہ بہت آسان ہے۔“

ارم نے خشک لبوں پہ زبان پھیری اور اپنی ماں کو دیکھا مگر وہ پہلے ہی باہر جا رہی تھیں۔ وہ تیزی سے ان کی طرف لپکی۔ چوکت میں کھڑی حیا اور اس کے قدموں میں گرے لمبے کو اس نے دیکھا بھی نہیں۔

لاؤنچ میں پھر سے خاموشی چھا گئی تھی۔ سب جیسے ایک دوسرے سے شرمندہ تھے، سوائے نتاشہ کے۔ وہ بڑے مزے سے ہاتھ جھاڑتے ہوئے تھی، لیکن سائیڈ ٹیبل پہ رکھا اور رو جیل کو مخاطب کیا۔

"Honestly Rohail, you have a very interesting family."

رو جیل نے ”اؤہوں!“ کہتے ہوئے اسے گھورا، پھر معذرت خواہانہ انداز میں باقیوں کو دیکھا۔ نتاشہ جہان کے سائیڈ سے گزر کر بیڑھیوں کی طرف چلی گئی۔

شونا تم ختم ہو چکا تھا۔

البتہ جانے سے قبل نتاشہ نے جہان کی طرف جو مسکراہٹ اچھالی تھی، کو نے میں کھڑی حیا کے ذہن میں وہ انک کر رہ گئی۔ یہ سب کیسے ہوا؟ وہ ابھی تک دم بخود تھی، مگر نتاشہ کی مسکراہٹ۔ اوہ ڈیز نتاشہ! اس کا اور جہان کا باتیں کرنا، پھر اس کا اتنے بڑے شاپنگ بیگ اٹھا کر صائمہ تائی کی طرف جانا، اور پھر اوپر واپس جانا..... وہ صائمہ تائی کو شاپنگ دکھانے نہیں، ارم کا لیپ ٹاپ اڑانے گئی تھی، ورنہ اسے کب سے تائی سے اتنی محبت ہو گئی؟ ورنہ جہان کو کیسے پتہ کہ یہ تصاویر ارم کے لیپ ٹاپ میں تھیں؟ وہ بھی اوپر کرے میں حیا کے کپڑے رکھنے نہیں، وہی سی ڈی لینے گیا تھا، ریموٹ گراتے ہوئے جھک کر اس نے سی ڈی swap کی تھیں۔ اوہ جہان.....! وہ swapping کا ماہر تھا!

ایک ایک کر کے سب لاؤنچ سے چلے گئے تھے۔ پچھو نے البتہ جاتے ہوئے افسردہ نگاہوں سے جہان کو دیکھا تھا۔

”یہ سب کیا تھا جہان؟“

”وہ شاید کوئی غلط سی ڈی اٹھا لیا تھا۔“ اس نے شانے اچکائے۔

”جیسے میں تمہیں جانتی ہی نہیں۔ تمہارا ہاتھ ہے اس میں، پتہ ہے مجھے۔“ وہ جھڑک کر کہتی، خشکی سے باہر نکل گئیں۔

اس سارے میں وہ پہلی بار حیا کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ اسی طرح دیوار سے لگی کھڑی تھی۔ جہان کو اپنی طرف دیکھتے با کر اس نے

نقاب کھینچ کر اتارا۔ اس کا چہرہ لٹھے کی مانند سفید پڑ رہا تھا۔ اور تب ہی جہان نے دیکھا.....
 ”اللہ، اللہ، یہ تم نے کیا کیا؟“

”یہ تم نے کیسے کیا جہان؟“ ایک دم آنسو ٹوٹ کر اس کی آنکھوں سے گرنے لگے۔ وہ پریشانی سے خنجر بریڈ کے بلے کو دیکھتا اس تک آیا۔

”میرے سارے پیسے برباد کر دیے تم نے۔ یہ کیوں توڑا؟“

”جہان!“ حیا نے لبوں پہ ہاتھ رکھ کر خود کو روکنے سے روکا، مگر آنسو بہتے جا رہے تھے۔ ”میں بہت ڈر گئی تھی۔ تم جانتے تھے نا..... کہ وہ ویڈیو ولید کے پاس ہے۔“

بلے سے نگاہ ہٹا کر جہان نے گہری سانس لیتے ہوئے حیا کو دیکھا۔
 ”دریں کیو میں تم نے دو دفعہ کہا تھا کہ اگر کوئی تمہیں گاڑی تلے کچل دے تو؟ دو دفعہ کہی گئی بات کی کوئی وجہ ہوتی ہے۔ میں نے یہاں آتے ہی معلوم کر لیا تھا سب، تم نے مجھ پہ بھروسہ نہیں کیا سو میں نے بھی تمہیں نہیں بتایا۔“

”میں تمہیں پریشان نہیں.....“ اس سے بولائیں جا رہا تھا۔
 ”حیا، آپ کے اپنے اور کس لیے ہوتے ہیں؟ اور مجھے کب تم نے پریشان نہیں کیا؟ ایک دفعہ مزید کرنے میں حرج ہی کیا تھا؟ اگلی دفعہ مجھ پہ بھروسہ کر کے دیکھنا۔“

”مگر..... ارم..... اس کی تو بہت.....“

جہان کے جڑے کی رگیں تن گئیں۔

”اس کا ذکر مت کرو۔ جب انسان کچھ غلط کرتا ہے تو اس کا نتیجہ اس کو بھگتنا پڑتا ہے۔ آج کسی ایک نے تو رسوا ہونا تھا، مگر میں نے ایک لڑکی سے وعدہ کیا تھا کہ جنت کے پتے تھا مننے والوں کو اللہ رسوا نہیں کرتا۔ مجھے اپنا وعدہ نبھانا تھا۔“ پھر اس نے ٹوٹے ہوئے خنجر بریڈ ہاؤس کو دیکھا۔ ”کب تم جذبات میں آ کر چیزیں پھینکنا چھوڑ دو گی، لڑکی!“ ساتھ ہی وہ نور بانو کو آواز دینے لگا تا کہ وہ جگہ صاف کی جاسکے۔

”آئی لو یو جہان! آئی ریلی ٹو یو“ وہ رندھی ہوئی آواز، اور فراط مسرت، رونے اور مسکرانے کے درمیان بولی تھی۔ جہان نے چونک کر اسے دیکھا اور پھر دائیں بائیں۔

”میری بچپن کی سہیلی ٹھیک کتنی ہے۔ اس گھر میں سب بہت انٹرسٹنگ ہیں۔“ وہ جھرجھری لے کر آگے بڑھ گیا۔ نور بانو اسی طرف آرہی تھی۔

حیا یونہی عبا یا میں ملبوس لاؤنج کے صوفے کے ہتھ پہ بیٹھی، اور موبائل نکال کر ایک نمبر ملا یا۔ ہتھیلی سے آنسو پونچھتے اس نے فون کان سے لگایا۔

”ڈاکٹر ابراہیم..... میں نے وہ ہسپتال حل کر لی۔“ وہ مڑ کر، چوکھٹ پہ پنہوں کے بل جھکے بیٹھے جہان کو دیکھتے ہوئے بولی جو نور بانو کے ساتھ خنجر بریڈ کے نگڑے اٹھا رہا تھا۔

”اچھا، کیا ملا آپ کو پھر؟“ دوسری جانب جیسے وہ مسکرائے تھے۔

”آج جب سورۃ احزاب میں نازل ہوئی ہے، میں بتاتی ہوں آپ کو جب احزاب کی مماثلت۔“ وہ رندھی ہوئی آواز میں کہہ رہی تھی۔ ”میں بتاتی ہوں آپ کو کہ جب احزاب میں کیا کیا ہے! جنگ احزاب میں گروہ بھی ہیں، بنو قریظہ بھی، خندق بھی، سردی اور بھوک کی تنگی بھی، تین طرف خندق تو ایک طرف گھنے درختوں کا سایہ اور مضبوط چٹان بھی جو خاموشی سے آپ کو سپورٹ کرتے ہیں۔“ اس نے جہان کی پشت کو دیکھتے ہوئے کہا، وہ افسوس سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے نگڑے پلیٹ میں ڈال رہا تھا۔ اس کی جھنجر کی جیب میں ایک سی ڈی جھلمک رہی تھی۔

”لیکن اگر جنگِ احزاب میں کچھ نہیں ہے تو وہ ”جنگ“ نہیں ہے۔ یہ وہ جنگ ہے جس میں جنگ ہوتی ہی نہیں۔ اکا دکا انفرادی لڑائیوں کو چھوڑ کر، اصل جنگ، ہتھیاروں سے لڑی جانے والی جنگ سے قبل ہی ایک رات طوفان آتا ہے، اور دشمنوں کے اپنے خیموں کی ہوا اکھڑ جاتی ہے۔ ان کی ہانڈیاں ان ہی پہ الٹ جاتی ہیں، اور وہ میدان چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں۔ مجھے میری ایک چھوٹی دوست نے یہی بات کہی تھی کہ یہ جنگ جیتا کون تھا؟ تب نہیں سمجھی میں۔ اب سمجھی ہوں۔ ”جنگ“ نہیں، وہ لڑائی کی بات کر رہی تھی، لڑائی جو اس جنگ میں ہوتی بھی نہیں ہے۔ آپ کو صبر اور انتظار کرنا ہوتا ہے، کسی کو ایک دن، کسی کو ایک ماہ اور کسی کو کئی سال اور پھر ایک دن، آپ بغیر کچھ کھوئے، بغیر کسی محاذ پہ لڑے، بغیر کسی نقصان کے اچانک سیوہ جنگ جیت جاتے ہیں۔ یہی بات تھی ناسر!“

”میرے ذہن بچے، مجھے آپ پہ فخر ہے!“ وہ بہت خوش ہوئے تھے۔

حیائے ڈیڈ بانی آنکھوں سے اس غریب آدمی کو دیکھا جو ابھی تک اپنے پیسے ضائع ہونے پہ افسوس کر رہا تھا۔ چیزیں وقتی ہوتی ہیں، ٹوٹ جاتی ہیں، بکھر جاتی ہیں، ان کا کیا افسوس کرنا؟

اب ان دونوں کو خنجر بریڈ کے گھروں کو بھول کر رشتوں اور اعتماد سے بنا گھر قائم کرنا تھا۔

صبح قریب تھی۔

ان کی صبح۔

☆ ☆ ☆

وہ پارلر کے ڈریسنگ مرر کے سامنے کرسی پہ بیٹھی تھی، اور بیوٹیشن لڑکی مہارت سے اس کا آئی شیڈولگا رہی تھی۔ اس نے اپنا گرے اور سلور فرائڈ پہن رکھا تھا، بال وغیرہ ابھی بنانے تھے۔

”اونچا جوڑا بنانا پسند کیا؟“ بیوٹیشن نے آئی شیڈ کو آخری ٹچ دیتے ہوئے پوچھا تھا۔ حیائے آئینے میں چہرہ دائیں بائیں کر کے آنکھیں دیکھیں۔ اچھی لگ رہی تھیں۔

”اؤہوں۔ فرینچ ٹاٹ بنادو۔ اونچے جوڑے میں تو نماز نہیں ہوگی اور دو تین نمازیں تو فنکشن کے دوران آ جائیں گی۔“

”آج نہ پڑھیں تو خیر ہے۔“ لڑکی اکتاتی تھی۔

”اپنی خوشی میں اللہ کو ناراض کر دوں؟ انہوں!“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”اچھا نیل پالیش لگانی ہے یا نقلی ٹیلو؟“

”کچھ بھی نہیں، بار بار وضو کے لیے اتاروں گی کیسے؟“ اس نے سادگی سے التماس کیا۔

”اوہہ..... اچھا نقلی پلکیں تو لگا دوں نا؟“

”اللہ تعالیٰ کو برا لگے گا۔“

”آپ نے آئی بروز بھی نہیں بنائیں، تھوڑا سانیٹ ہی کر دوں!“

”اللہ تعالیٰ کو اور بھی برا لگے گا۔“

لڑکی کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ وہ گھوم کر اس کے سامنے آئی۔

”آپ کہیں الہدیٰ کی تو نہیں ہیں؟“

حیا ہنس دی۔

”نہیں، میں بس ایک مسلمان لڑکی ہوں، اور یہ سوچ رہی ہوں کہ جب میں تمہیں اپنا دوپٹہ سیٹ کرنے کو کہوں گی، تو تمہاری کیا حالت ہوگی؟“ وہ جیسے سوچ کر ہی محظوظ ہوئی۔ لڑکی نے اچھبے سے اسے دیکھا۔

”کیوں؟“

”پہلے میک اوور عمل کرو، پھر بتاتی ہوں۔“ مزے سے کہتی اس نے دوبارہ سر کرسی کی پشت پہ ٹکا دیا۔ بیوٹیشن لڑکی جزبزی ہو کر

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابرار	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	ممتاز مفتی
نگہت عبد اللہ	سباس گل	عنیزہ سید	مستنصر حسین
رضیہ بٹ	رخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	ام مریم	نایاب جیلانی	ایم اے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے افق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابن صفی،
جاسوسی دنیا از ابن صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

آئی شیڈ وکٹ اٹھائے پھر سے اس کے سر پہ آکھڑی ہوئی۔

اور جب حیانے اسے دوپٹہ اپنی مرضی کے مطابق سیٹ کرنے کو کہا تو اس کا منہ کھل گیا۔

”گھونگھٹ؟ کون نکالتا ہے گھونگھٹ؟ آپ کیا بات کر رہی ہیں؟“

”میں یہ تو نہیں کہہ رہی کہ بہت نیچے تک نکالو، بس تھوڑی تک آئے۔ نیچے ویسے ہی بند لگا ہے۔“ اس نے آئینے میں خود کو

دیکھتے ہوئے لا پرواہی سے کہا تھا۔

”مگر آپ کا چہرہ تو نظری نہیں آئے گا۔ اور.....“ لڑکی پریشان ہو گئی تھی۔

”تم نکال رہی ہو یا میں خود نکال لوں؟“

اور بیوٹیشن کے پاس اس کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ اس سے کوئی بعید نہیں تھی، وہ جلدی سے دوپٹہ سیٹ کرنے لگی۔

اس نے ابا سے بہت کہا تھا کہ مسکندہ گرینگ ندرکھیں، نو نو گرافر نہ ہوں، مگر ابا اور اماں نے ایک نہ سنی۔

”حیا، میں تمہارے پردے کا پھر کوئی ایڈجسٹمنٹ سنا چاہتی۔“ اماں تو باقاعدہ بے زار ہو گئی تھیں۔ حیا جانتی تھی کہ اس کے سامنے

وہ کبھی اعتراف نہیں کریں گی کہ وہ اس کے پردے سے دل سے راضی تھیں، مگر کیا فرق پڑتا تھا؟

اس نے اپنی کلاس فیلو سے پوچھا، عجابی لڑکیاں دلہن بننے ہوئے کیا کرتی ہیں کہ کوئی ناراض بھی نہ ہو اور وہ حجاب بھی کیری کر

لیں؟ جتنے آپشن نظر آئے، ان میں سب سے بہترین یہی تھا۔

گھونگھٹ۔

اور پھر نیچے سے دوپٹہ اتار پھیلا کر لیا ہو کہ ستر پوشی کا فرض ادا کرے۔ اب کوئی اس کی تصویریں کھینچے، یا نہیں، اسے پرواہ

نہیں تھی۔

میرج ہال میں جب اسے برائیزل روم سے لا کر اسٹیج پہ بٹھایا گیا تو ثناء اس کے ایک طرف آ بیٹھی تھی۔ آج کے لیے ثناء اس

کی اسسٹنٹ تھی۔ اپنی طرف سے تصاویر کھینچنے والوں کو وہ مسلسل منع کر رہی تھی۔

”حیا آپرہ کرتی ہیں، پلیز نو ٹو زونٹ کھینچیں۔“ یا اگر کوئی اس کے گھونگھٹ پہ کچھ بولتا تو وہ جواب بھی دے رہی تھی۔

”آپا کلائیکل دلہن بنی ہیں، اور وہ گھونگھٹ نہیں اٹھائیں گی۔“ کوئی چاچی، ماما، خالہ ساتھ آ کر بیٹھتی، پھر ذرا سا گھونگھٹ

اٹھا کر چہرہ دکھاتی، سلامی دیتی، تحریف کرتی یا جو بھی، سب ایسے تھیں جو عموماً مہندی کی دلہن کا ہوتا ہے۔

اس کا گرے فرائک پیروں تک آتا تھا۔ گھیرے پہ کافی کام تھا۔ گھونگھٹ تھوڑی تک گرنا تھا، نیچے دوپٹہ ”یو“ کی شکل میں پھیلا

کر سامنے ڈالتا تھا۔ آستین پورے تھے۔ اور وہ سر جھکا کر نہیں بیٹھی تھی، وہ گردن اٹھا کر پورے اعتماد کے ساتھ بیٹھی، ہر پاس آ کر بیٹھنے والی

آئی سے بڑے آرام سے باتیں کر رہی تھی۔ لوگ برا تب مانتے ہیں جب دلہن اکڑ کر بیٹھے۔ اگر وہ خوش مزاجی سے بات کر رہی ہو، پورے

اعتماد کے ساتھ، تو لوگ بھی نرم پڑ جاتے ہیں۔ البتہ کہنے والے تو کہہ رہے تھے۔ یہ کیا کیا؟ میک اپ تو چھپ گیا۔ خراب ہو گیا ہو گا تبھی یہ

کیا۔ نالک، ڈرامے، مگر وہ اب اس مقام پہ تھی جہاں یہ سب باتیں ثانوی محسوس ہوتی تھیں۔ مشکلیں بہت پڑ کر بھی آسان ہو جاتی ہیں۔

جہاں اس کے ساتھ آ کر بیٹھا تو بہت دیر سے بولا تھا۔ ”ثابت ہوا کہ تم کچھ چیزوں میں واقعی بہت اسمارٹ ہو۔“ بس

یہی ایک فقرہ کا اس نے۔ پھر وہ جلد ہی اٹھ گیا۔ اسے یوں مرکز نگاہ بن کر بیٹھنا قبول نہیں تھا۔ بد تمیز نہ ہوتو۔

وہ پھر خود بھی زیادہ در اسٹیج پہ نہیں بیٹھی اور واپس برائیزل روم واپس آ گئی۔ یہ مناشہ کا دلن تھا، اب مناشہ کو پوری توجہ ملنی چاہیے

تھی۔ خیر، وہ پوری توجہ لے بھی رہی تھی۔ سارٹھی کی پشت پہ زبردستی اس نے پلو ڈالا ہوا تھا، مگر وہ روئیل کا بازو تھا۔ مہمانوں کے درمیان

ہنسی بولتی گھوم رہی تھی۔ (اور فاطمہ کو ہول اٹھ رہے تھے۔)

”جہاں بھائی کہہ رہے ہیں، وہ ادھر آ جائیں؟“ ثناء نے اس کو آواز دی۔ وہ جو برائیزل روم میں بیٹھی، گھونگھٹ پیچھے گرائے،

لپ اسٹک ٹھیک کر رہی تھی، چونک کر کھٹی۔ کیا وہ آ رہا تھا؟ اس سے ملنے؟ اس کا دل زور سے دھڑکا۔

”ہاں، بلاؤ۔“ وہ اور ثناء اکیلے ہی تھے۔ اچھا ہے، ثناء باہر چلی جائے گی اور وہ دونوں کم از کم بات تو کر سکیں گے۔ دودن سے تو وہ نظر ہی نہیں آیا تھا۔

ذرا سی دستک کے بعد دروازہ کھول کر جہان اندر داخل ہوا۔ سیاہ ڈنر سوٹ، بال پیچھے کیے، بالکل جیسے وہ میٹرو میں لگا تھا پہلی بار۔ اب بھی ہینڈم لگ رہا تھا..... بلکہ نہیں، ہینڈم ایڈیٹ لگ رہا تھا کیونکہ.....

وہ جو خطر سی کھڑی تھی، لبوں پہ ذرا سی مسکراہٹ لیے، اس کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

جہان کے ساتھ وہ سو بر اور سادہ، لمبی سی ثانیہ بھی تھی۔

”جیا، مائی وائف اور جیا، یہ میری بہت اچھی دوست ہیں، کولیگ بھی ہیں، ثانیہ۔“ بہت تہذیب اور شانگلی سے وہ دونوں کا

تعارف کر رہا تھا۔

”بہت خوشی ہوئی۔“ ثانیہ اسی سو بر سی مسکراہٹ کے ساتھ آگے آئی اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ جیا نے بہ مروت

مسکراتے ہوئے ہاتھ تھاما اور ملا کر چھوڑ دیا۔ پھر ایک شاکی نظر جہان پہ ڈالی۔ وہ بس اس لیے اس کے پاس آیا تھا؟ بدتمیز!

”بس تمہیں ملوانا چاہ رہا تھا ثانیہ سے۔ ان کے ہز بنڈ دوست ہیں میرے۔“

”جی، ان سے تو بہت دفعہ مل چکی ہوں۔“ وہ زبردستی مسکراتے ہوئے بولی تھی۔ جہان نے بے ساختہ ماتھے کو چھوا۔

”اچھا؟ حماد نے نہیں ذکر کیا؟“ ثانیہ نے جہان کو دیکھا، وہ جو آف کے انداز میں ماتھے کو چھو رہا تھا، فوراً سے پیشانی میل کر

ہاتھ نیچے لے گیا۔

”ہاں، وہ ہم ڈنر کر رہے تھے تو وہ مل گیا تھا۔ خیر ہم چلتے ہیں، سی یو۔“ وہ حیا کو گھور کر ثانیہ کو راستہ دیتے ہوئے سامنے سے ہٹا۔

وہ ناقدانہ نگاہوں سے انہیں جاتے دیکھ رہی تھی۔

”تمہارے پاس صابر کا نمبر ہے، میں اسے کال کرنا چاہ رہا تھا تو.....“

”ہاں، ٹھہرو تمہیں سینڈ کرتی ہوں۔“ وہ دونوں اپنے اپنے میل فونز سامنے کیے باتیں کرتے باہر نکل گئے۔

”ہونہد!“ وہ پیرنچ کر واپس کرسی پر بیٹھی۔

اس آدمی کے ساتھ زندگی کبھی بھی فیکٹسی نہیں ہوگی، پہلے سے وہ جانتی تھی، مگر اب اس بات پہ یقین بھی آ رہا تھا۔ سب کچھ

بہت مشکل تھا، اور مشکل ہوگا بھی، مگر خیر، وہ ساتھ تو تھے نا۔ آہستہ آہستہ وہ اس سب کی عادی ہو جائے گی۔ اس نے خود کو تسلی دی۔ اور پھر

دروازے کی طرف دیکھا۔

ذرا سی جھری کھلی تھی، وہاں سے میرج ہال کی روشنیاں، لوگوں کا رش، ہنستے بولتے مہمان، رنگ، خوشبو، سب نظر آ رہا تھا۔

اس کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ لب آپ ہی آپ مسکرانے لگے۔ اس نے کلائی گھما کر دیکھی۔ بہارے کا ٹیکس

بریسلیٹ کی صورت اس میں پہنا تھا، اور اس کی سائینڈ پہ خالی کنڈے میں اب ایک موتی جھول رہا تھا۔

سیاہ موتی۔

وہ سفید موتی نہیں بن سکی تو کیا ہوا۔ سیاہ موتی بننے میں بھی کوئی حرج نہیں تھا۔ کہ پھر.....

موتی تو وہ ہوتا ہے،

جس کی کالک بھی چمکتی ہے۔



صبح کا دو دوھیہ پن اسلام آباد کی پہاڑیوں پہ چھایا ہوا تھا۔ گزشتہ رات کی بارش کے باعث سرمنی سڑکیں ابھی تک گیلی تھیں۔

اس نے کچن کی کھڑکی کا پردہ ہٹایا۔ جالی سے روشنی اور ہوا اندر جھانکنے لگی۔ تازگی کا احساس۔ تھپی دیوار میں نصب اوون کھانا

کینے کی گھنٹی بجانے لگا۔ وہ آگے آئی، اور اوون کا دروازہ کھولا، پھر دستانے والے ہاتھ سے ٹرے باہر نکالی۔

پچھلے ہوئے پیر سے سجا گرم گرم ہیزا تیار تھا۔ اس نے چہرہ ذرا جھکا کر سانس اندر اتاری۔ خستہ، اشتہا انگیز خوشبو۔ جہان کو پسند آئے گا۔ تعریف نہیں کرے گا البتہ تھوڑا کھائے گا، اور اس پہ بھی کئی دن ایک سرساز کا دورانیہ بڑھا کر ان کیلوریز کو برن کرنے کی کوشش کرتا رہے گا۔ اپنی فٹنیس اور صحت کے بارے میں وہ آج بھی اتنا ہی کا شمس تھا جتنا چار سال قبل ان کی شادی کے وقت تھا۔

اس نے ٹرے اندر دھکیلی، اور اوون کا ڈھکن بند کیا۔ اب جہان آفس سے آ جائے گا، تب ہی وہ اسے نکالے گی۔ ساتھ ہی اس نے پلٹ کر گھڑی دیکھی۔ ابھی اس کے آنے میں کافی وقت تھا۔ آج ویسے ہی حیا کے سارے کام جلدی ختم ہو گئے تھے، اب کیا کرے؟ سین پھپھو کی کسی پرانی دوست کے بیٹے کی شادی تھی سو وہ کراچی گئی ہوئی تھیں۔ ویسے یہاں ان کے اپارٹمنٹ سے ابا اور تایا کے گھر زیادہ دور بھی نہیں تھے، سو پہلے اس نے اماں کی طرف جانے کا سوچا، پھر ارادہ ترک کر کے اپنے کمرے میں آ گئی۔

جہان اور اس کا بندرہ بہت نفاست مگر سادگی سے سجا تھا۔ وہ تو اتنی آرگنائزڈ نہیں تھی، مگر جہان..... وہ خراب، بے ترتیب چیزیں کبھی برداشت نہیں کرتا تھا۔ اس کے ساتھ رہ کر وہ بھی بہت کچھ سیکھ گئی تھی۔

خدیجہ کا کمرہ گوکہ ساتھ والا تھا، مگر وہ ابھی اتنی چھوٹی تھی، بس تین سال کی، کہ یہ کمرہ اس کا بھی تھا۔ اس وقت بھی وہ کارپٹ پہ بیٹھی بلاکس کو توڑ کر پھر سے جوڑنے میں لگی تھی۔ ٹولے بلاکس ایک طرف تھے، جڑے ہوئے ایک طرف۔ بے ترتیبی میں بھی ترتیب تھی۔ باپ کی طرح وہ بھی Clutter نہیں پھیلاتی تھی۔

”خدیجہ گل کیا بنا رہی ہے؟“ وہ الماری کی طرف بڑھتے ہوئے اسے مخاطب کر کے بولی تھی۔ پٹ کھول کر اس نے لیپ ٹاپ کا بیگ نکالا، اور پلٹ کر اپنی بیٹی کو دیکھا، جو اس کے سوال پر سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگی تھی۔

وہ سیلوئیس سرخ فراک میں ملبوس تھی، مگر نیچے سے اس نے کہنی تک آتی پنک شرٹ پہن رکھی تھی۔ جرابیں بھی پنک۔ نرم گہرے بھورے بال پونی میں بندھے تھے۔ (جہان اس کے بال کٹوانے نہیں دیتا تھا۔ اسے لمبے بال پسند تھے۔ مگر صرف خدیجہ کے۔ خدیجہ کی ماں کے بالوں کے بارے میں وہ رائے نہیں دیا کرتا تھا۔) گوری، گلابی، رنگت، انھی ہوئی ناک، اور جہان جیسی آنکھیں۔ وہ جہان کی ہی بیٹی تھی۔ اور جہان کو لوگوں کا خدیجہ کو اس سے ملنا بہت پسند تھا۔ اس نے حیا سے صرف اچھا قد لیا تھا، مگر.....

”میں تم سے زیادہ لمبا ہوں، اس کا قد بھی مجھ پہ گیا ہے۔“ وہ شانے اچکا کر بے نیازی سے کہتا تھا۔

”تھٹک!“ خدیجہ گل نے ذرا سے شانے اچکا کر ٹیٹ میں سر ہلایا اور واپس کام میں لگن ہو گئی۔ حیا نے جب اس کا نام خدیجہ گل رکھا تھا تو جہان نے اعتراض نہیں کیا تھا۔

”تم اپنی پسند کا نام رکھو، میں تو جو نام بھی بتاؤں گا، آگے سے کہو گی، اب اس نام کی اپنی پرانی دوست کا حلیہ بھی بتاؤ جس کی یاد میں یہ رکھنا چاہتے ہو؟“ (ویسے اتنا غلط بھی نہیں تھا وہ۔) سو اس نے اپنی بیٹی کا نام خدیجہ گل رکھا تھا۔

”میری تین بہترین دوستوں کی یاد میں!“

خدیجہ ایک پری میچور بچی تھی، مگر صد شکر کہ وہ ہمیشہ صحت مند رہی تھی۔ سوان کے لیے وہ واقعی ”خدیجہ گل“ تھی، (یعنی وقت سے پہلے پیدا ہو جانے والا گلاب۔)

اپنے گلاب کو مسکرا کر دیکھتے ہوئے وہ الماری کا پٹ بند کرنے لگی، پھر یکا یک ٹھہر گئی۔ جس خانے سے لیپ ٹاپ بیگ نکالا تھا، اس کے پیچھے لکڑی کی دیوار کا رنگ باقی الماری سے ذرا ہلکا لگ رہا تھا۔ اس نے اچھپے سے اسے دیکھتے بیگ نیچے رکھا، اور ہاتھ بڑھا کر پیچھے لکڑی کو چھوا۔ کارڈ بورڈ تھا وہ۔ اُف۔ اس نے دبے دبے غصے سے کارڈ بورڈ کے کٹڑے کو دائیں بائیں کرنے کی کوشش کی، اور ذرا سی محنت سے وہ ایک طرف سلائیڈ کر گیا۔

پیچھے ایک لاکر تھا۔ چند لمعے وہ خفگی سے اس بند تجوری کو دیکھتی رہی جس میں پتہ نہیں کیا تھا، اور پھر کارڈ بورڈ کی سلائیڈ واپس جگہ پہ کر کے الماری بند کر دی۔

اس گھر میں پچھلے چار سالوں میں کوئی چار سو خفیہ خانے تو وہ ڈھونڈ چکی تھی، پتہ نہیں اب کتنے تلاشا باقی تھے۔ جہان سے پوچھنا

بے کار تھا۔ وہ بہت حیران ہو کر آگے سے کہتا، ”اچھا؟ دیری اسٹریچ۔ یہ نہیں مالک مکان نے اتنے لا کر رکھ رکھے ہیں۔ کبھی بات کروں گا ان سے۔“

ہاں جیسے وہ تو اپنے شوہر کو جانتی ہی نہیں تھی نا۔

خدیجہ اسی محویت کے ساتھ بلاس اوپر رکھ نیچے جوڑ رکھی تھی۔ وہ لیپ ٹاپ کھولے بیڈ پہ آ بیٹھی اور ای میلز چیک کرنے لگی۔ ساتھ ساتھ وہ خدیجہ پہ گاہے بگاہے نظر بھی ڈال لیتی تھی۔

ابھی یہی فرائک، پنک شرٹ کے ساتھ پہنا کر پچھلے ہی ہفتے وہ اماں کی طرف گئی تو اماں حسبِ عادت خفا ہونے لگی تھی۔ ”اتنی سی بچی تو پروہ نہیں لگتا نا۔ تم سیلیولس پہنا دو گی تو کیا ہو جائے گا حیا؟“

”آف کورس اماں، اس پہ پردہ لاگو نہیں ہوتا، مگر میں اسے کوئی زبردستی کا اسکارف تو نہیں اوڑھتا رہی نا، صرف آستین پورے پہناتی ہوں۔ اماں میں نہیں چاہتی کہ اس کی حیا مر جائے، اور وہ ان چیزوں کی عادی ہو جائے جو.....“ اور اس سے آگے اماں نہیں سنا کرتی تھیں۔ وہ آج بھی حیا کے پردے کی سب سے بڑی مخالف تھیں۔ لیکن وہ کہاں پرواہ کرتی تھی۔ ہاں کسی کا دل چیر کر تو ہم نے نہیں دیکھا ہوتا، مگر وقت اور تجربہ یہ اندازہ کرنا تو سکھا دیتا ہے کہ کون دل سے کچھ کہہ رہا ہے، اور کون صرف زبان سے۔

لیپ ٹاپ کی چمکتی اسکرین اس کے چہرے کو بھی چمکا رہی تھی۔ وہ بہت توجہ سے اپنی ای میلز دیکھ رہی تھی۔ لمبے بال آدھے کچر میں بندھے، آدھے پیچھے کھلے کمر پہ پڑے تھے، چہرہ ویسا ہی تھا، ملائی جیسا، اور اسے لگتا تھا وہ ان چار سالوں میں پہلے سے زیادہ خوبصورت ہو گئی ہے، مگر.....

”خوبصورت کی بجائے تین چار اور الفاظ ہیں میری لغت میں مگر میں کہوں گا تو تمہیں برا لگے گا۔“ ڈائینگ نیبل پہ ہی ایک رات اس کے پوچھنے پہ کھانا کھاتے ہوئے جہان نے بے نیازی سے کہا تھا۔ وہ سلگ کر رہ گئی۔

”اگر تمہاری یہ لغت کتابی شکل میں دستیاب ہوتی تو میں اسے واقعی تمہیں دے مارتی جہان!“ وہ بہت غفگی سے بولی تھی، مگر اس بات پہ اس کے ساتھ کرسی پہ بیٹھی خدیجہ نے ابروتن کرنا راضی سے بولی

”نو، حیا!“ وہ اس کے آئیڈیل باپ کو کچھ دے مارنے کی بات کر رہی تھی، وہ کیسے برداشت کرتی۔ اور بس، اس کی یہ عادت خود بخود دم توڑ گئی۔

ایک کلک کے بعد اگلا صفحہ کھلا تو وہ ٹھہری گئی۔ آنکھوں میں پہلے حیرت ابھری اور پھر الجھنا۔

وہ مصر کی ایک یونیورسٹی کا پراسپیکٹس تھا جو اس کی درخواست پہ اسے بھیجا گیا تھا۔ مگر..... یہ درخواست تو اس نے دی ہی نہیں تھی۔ کیا جہان نے اس کی طرف سے اپلائی کیا تھا؟

وہ الجھن بھری نگاہوں سے اس پراسپیکٹس کو پڑھنے لگی۔ وہ اکثر کہتی تھی کہ اب وہ ایل ایل ایم کرے گی، جہان ایسی باتوں پہ دھیان نہیں دیتا تھا کہ اپنی مرضی ہے، جو کرو۔ تو کیا اس نے.....؟ یہ نہیں۔

میلو چیک کر کے اس نے کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھی۔ جہان کے آنے میں ابھی کچھ وقت تھا۔ رسٹ وایج کے ساتھ اس کی کلائی میں وہ بریسلٹ بھی بندھا تھا، اور اس میں پرویا سیاہ موتی جوا ج بھی چمکدا تھا۔

سچا موتی۔

”بس کرو خدیجہ، اب کچھ کھا لو!“ وہ لیپ ٹاپ بند کر کے انھی اور بیٹی کے سامنے سے بلاس سمیٹنے لگی۔ خدیجہ کھانے کے معاملے میں ذرا چور تھی، بعض دفعہ زبردستی کرنی پڑتی تھی۔ ایسی ہی ایک دفعہ خدیجہ بہت بیمار تھی، اور حیا اسے کچھ کھانا چاہ رہی تھی، مگر خدیجہ نے ہاتھ مار کر پیالہ گرا دیا تو اس نے بہت غصے سے کہا تھا۔

”اللہ، اللہ، بات کیوں نہیں مانتی ہو؟ میں کدھر جاؤں؟“

اور خدیجہ نے سرخ چہرے اور ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ غصے سے کہا تھا ”جہنم میں جاؤ!“

اور وہ بالکل شرمگین۔ بس وہ آخری دن تھا، پھر اس نے اپنا سکیہ کلام ترک کر دیا تھا۔ بس، اب اور نہیں۔ بری عادتیں ہمیں خود بدلتی پڑتی ہیں۔ اپنے لیے نہیں تو اپنے بچوں کے لیے ہی سہی!

خدیجہ کو کچن کاؤنٹر پہ بٹھا کر اس نے فرنج کا دروازہ کھولا تاکہ اندر سے کھیر نکالے..... مگر.....

دروازے کے اندر دوئی طرف، انڈوں کے خانے میں ایک ”پوسٹ اٹ نوٹ“ چپکا تھا۔ اس نے نوٹ اتارا اور سیدھے ہوتے ہوئے پڑھا۔

”لنچ ٹائم پہ کبوتروں کو یاد کرنے میں کوئی حرج تو نہیں؟“

لنچ ٹائم؟ اس نے بے ساختہ گھڑی دیکھی۔ لنچ ٹائم تو ہونے والا تھا۔ اللہ، اللہ، یہ آدمی بھی نا۔

”چلو خدیجہ، بابا کے پاس جانا ہے۔“ اس نے جلدی سے بچی کو کاؤنٹر ٹاپ سے اتارا۔ بابا سن کر اس کے چہرے پہ سارے جہان کی خوشی اُمڈ آئی۔ وہ فوراً اندر کی طرف دوڑی۔ جب تک حیا دروازے، کھڑکیاں بند کر کے آئی، وہ حیا کا بڑا سا پرس کندھے پہ لٹکائے، اس کا عمایا گھنٹی (فرش پہ جھاڑو دیتی) لارہی تھی۔

”ٹھیکس۔ اپنے جوتے پہناب۔“ اس نے جلدی سے عمایا اور پرس اس سے لے لیا۔

ماہ سن کے کبوتروں کا ذکر پہلی دفعہ جہان نے ایک اطالوی ریسٹورنٹ میں کیا تھا۔ اس کے بعد سے اس ریسٹورنٹ کو وہ ”کبوتروں“ کے کوؤنیم کے ساتھ یاد کرتے تھے۔ لیکن کیا تھا اگر وہ صبح ناشتے پہ کہہ جاتا کہ لنچ باہر کریں گے، مگر نہیں، وہ انسانوں کی زبان میں بات ہی کب کرتا تھا؟ صبح سے اتنی دفعہ فرنج کھولا، پتہ نہیں کیوں نظر نہیں پڑی۔ اف!

آدھے گھنٹے بعد، وہ اپنے حریر کے سیاہ عمایا میں ملبوس، خدیجہ کی انگلی تھامے، ریسٹورنٹ کی میزیں چڑھ رہی تھی۔ اوپر آ کر دیکھا، کونے والا میز خالی تھا۔ وہ وہیں نہیں ہوگا، مگر جب تک وہ بیٹھ نہیں جائے گی، وہ نہیں آئے گا۔ ویسے وہ اس طرح باہر کم ہی بلاتا تھا، یقیناً کوئی ایسی بات تھی جو وہ گھر میں نہیں کرنا چاہتا تھا۔

خدیجہ کو مخصوص کرسی پہ بٹھا کر، وہ جیسے ہی بیٹھی، اسے وہ سامنے سے آتا دکھائی دیا۔ گرے کوٹ بازو پہ ڈالے، کف موڑے، نائی ڈھیلی، سنجیدہ چہرہ اور ہمیشہ کی طرح ہینڈم۔ اس کے سامنے کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہی وہ بولا تھا۔

”مرحبا۔ کیا حال ہے؟“ پھر موبائل، والٹ میز پہ رکھتے ہوئے اس نے جھک کر خدیجہ کے دونوں گال باری باری چومے۔ اپنی بہت سی خُرق عادات کو وہ ترک نہیں کر سکتے تھے۔

”بابا، یونو واٹ؟“ خدیجہ چپک کر جلدی جلدی اسے کچھ بتانے لگی تھی اور وہ توجہ سے مسکراتے ہوئے سن رہا تھا۔ آدھی تو یقیناً ”حیا“ کی شکایات تھیں۔ نہیں، وہ ماما کہنے کا تکلف نہیں کیا کرتی تھی۔ وہ وہی کہتی تھی جو اس کا باب کہتا تھا۔

جب آرڈر سرور ہو چکا تو وہ اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔ ”اور..... سب ٹھیک ہے؟“

”تمہید کو کٹ کر دو جہان، اور اب بتا بھی چلو کہ کیا بات ہے۔“

”نہیں، اتنا کچھ خاص نہیں ہے، بس ایسے ہی.....“ وہ پھری کانٹے کی مدد سے اسٹیک کا ٹکڑا توڑتے ہوئے لا پرواہی سے

بولا تھا۔

(بہت خاص بات ہے، اور گھر پہ نہیں ہو سکتی تھی)۔ یہ فقرہ اس نے کہا نہیں تھا، مگر حیا توجہ سے سر ہلاتی، اس کو سنتے ہوئے خود ہی

ذہن میں اس کے الفاظ ڈی کوڈ کر رہی تھی۔

”اصل میں، میں کچھ آگے کا سوچ رہا تھا.....“

(مجھے آگے کا اسائنمنٹ مل گیا ہے۔ اور اوپر سے حکم آیا ہے)

”کہ کچھ دن کے لیے تھوڑا سا گھومنے پھرنے، باہر چلا جاؤں۔“

(یعنی نہ ایک دو سال تو کہیں نہیں گئے)

”ہوں؟“ حیانے سمجھ کر سر ہلا کر اسے مزید بولنے دیا۔
 ”زیادہ دور نہیں، بس قریب ہی۔ میل چیک کی تم نے آج؟“ حیانے بس ہاں میں گردن ہلائی۔ بولی کچھ نہیں۔
 (قریب یعنی کہ مصر..... وہیں سے میل آئی ہے نا تمہیں۔)
 ”تو..... تمہارا کیا خیال ہے؟“ وہ ہنسی کی سی اس کو دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔
 (تم رہ لوگی اتنا عرصہ؟)

حیانے شانے ذرا سے اچکائے۔ ”جیسے تمہاری مرضی۔“ دل البتہ بہت اداس ہو گیا تھا۔ تو بالآخر وہ لمحہ آن پہنچا تھا جب اسے ایک فوجی کی بیوی کا کردار کرنا ہوگا۔ گھر رہ کر برسوں انتظار کرنے والی بیوی کا۔ خدیجہ بڑی ہو جائے گی، اور پھر پریتہ نہیں وہ کب اپنے باپ کو دوبارہ دیکھ پائے گی۔ زندگی بھی بہت غیر یقینی چیز تھی۔
 ”خدیجہ تو میرے بغیر رہ لے گی، مہی کے ساتھ اس کی بہت ہمتی ہے۔“ وہ بھی حیا کی طرح شاید اس کی سوچ کو ڈی کوڈ کر کے بولا تھا۔ ”مگر تمہارے لیے مشکل ہوگا، جانتا ہوں تم مجھے مس کرو گی۔“ وہ ذرا سا مسکرایا۔
 (میں تمہیں مس کروں گا مگر قیامت تک اس بات کا اقرار نہیں کروں گا۔)
 ”اچھا، تو پھر؟“

”پھر یہ کہ.....“ اس نے پلیٹ پرے کرتے ہوئے حیا کو دیکھا۔
 ”میں ایک ایسا کور پانا چاہتا رہا ہوں جس میں مجھے شاید کسی یونیورسٹی میں کچھ عرصے کے لیے پڑھانا پڑے۔ تمہیں بھی آگے پڑھنے کا شوق ہے، تو کیوں نہ ہم یوں کریں کہ خدیجہ کو مہی کے پاس چھوڑ دیں، اور تم میری اسٹوڈنٹ بن کر میری کلاس میں ان رول ہو جاؤ۔“ یہاں یہ آپ کر اس نے مسکراہٹ دہائی۔ ”ہاں لیکن میں اس بات کی یقین دہانی کروں گا کہ تم میری سے زیادہ ڈانٹ کھانے والی اسٹوڈنٹ ہو گی۔“

”اچھا اور تمہیں لگتا ہے کہ مان جاؤں گی؟“ وہ ذرا توقف کے بعد بولی تھی۔ ”ترکی کے ان پانچ ماہ کی طرح ایک دفعہ پھر تم ڈرائیونگ سیٹ میں ہو گے، اور ہر چیز کنٹرول کرو گے؟“
 ”ہاں، تو؟“

”تو میرا خیال ہے کہ یہ ایک اچھا آئیڈیا ہے، مگر تھوڑی سی تبدیلی کی گنجائش ہے۔“ اس سارے میں وہ پہلی دفعہ مسکرائی تھی۔
 ”تھیلی تھوڑی تلے رکھے، وہ بہت مطمئن سی اسے دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔“ ہم اپنی جگہیں swap کر لیتے ہیں۔“
 ”مطلب؟“ وہ الجھا۔

”مطلب کہ میں ٹیچر ہوں گی، اور تم میرے اسٹوڈنٹ ہو گے۔ اور ہاں، میں اس بات کی یقین دہانی کروں گی کہ تم میرے سب سے زیادہ ڈانٹ کھانے والے اسٹوڈنٹ ہو گے۔“
 ”اور تمہیں لگتا ہے کہ مان جاؤں گا؟“

”ہاں، کیونکہ اس دفعہ میں ڈرائیونگ سیٹ میں ہونا چاہتی ہوں۔ اور تمہارے پاس فیصلہ کرنے کے لیے دس سیکنڈ ہیں۔“ اس نے ساتھ ہی گھڑی دیکھی۔

”حیا!“ وہ جھنجھلایا تھا۔ خدیجہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا، اور پھر سے جہان کی پلیٹ سے اسٹیک کے ٹکڑے اٹھانے لگی (وہ ہمیشہ اس کی پلیٹ سے کھاتی تھی۔)

”ڈیل؟“ حیانے ابرو اٹھا کر پوچھا۔ اور دوبارہ گھڑی دیکھی۔ وہ ذرا ناخوش سا لگ رہا تھا، چند لمحے کے لیے کچھ سوچا، اور پھر شاید اسے کوئی اپنا فائدہ نظر آیا تھا، تبھی بولا۔

”اوکے، ڈیل۔“ مگر..... اس نے نیپکین سے ہونٹ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ”یہ یاد رکھنا، کہ تم ہمیشہ مجھ سے دو قدم پیچھے رہو گی۔“

”دیکھتے ہیں۔ مگر تم یہ یاد رکھنا کہ کچھ دن بعد تم مجھے میڈم کہو گے۔“

جواب میں وہ دھیمی آواز میں خفگی سے کچھ بڑبڑا کر والٹ کھولنے لگا۔ حیانے آسودہ مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا۔ خدیجہ ابھی تک اس کی پلیٹ سے کھا رہی تھی۔

مصر..... قاہرہ..... یونیورسٹی۔

کون جانے کہ اس نئے سفر پہ اسے اس کی پچھڑی ہوئی دوستیں واپس مل جائیں؟

کون جانے کہ عائشے اور بہارے بھی مصر میں رہتی ہوں؟

کون جانے کہ عائشے اب بھی ویسی ہی سادہ اور مذہبی سی ہو، جبکہ بہارے ایک خوبصورت ٹین ایج لڑکی میں بدل گئی ہو؟

جہان کو جاب کی وجہ سے ان سے رابطہ کرنے کی اجازت نہ تھی، مگر..... حیانے اپنے سامنے موجود دونوں نفوس کو دیکھتے ہوئے

زیر لب مسکراتے ہوئے سوچا.....

مگر کون جانے کہ حیانے اُن سے رابطہ کبھی ترک ہی نہ کیا ہو؟

کیونکہ چیزیں جتنی ناممکن ہوتی ہیں،

وہ اتنی ہی ممکن بھی تو ہوتی ہیں نا۔

مگر..... کون جانے!

(ختم شد)



Downloaded From
Paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

حرفِ آخر

کچھ باتیں ایسی ہیں جو میں آپ سے اس کہانی کے اختتام پہ کرنا چاہتی ہوں۔

”جنت کے پتے“ ایک فرضی کہانی ہے اور اسے فرضی سمجھ کر ہی پڑھا جائے۔ البتہ اس میں دکھائی گئی تمام جگہیں اور مقامات کے نام حقیقی ہیں، سوائے (Buyuk) بوک ادا لار کے ہوٹل گرینڈ کے۔ یہ میرا دیا گیا نام تھا، اور میں نہیں جانتی کہ اس نام کا ہوٹل ادا لار میں ہے یا نہیں۔

یہاں مجھے ان سطور کے ذریعہ سعدیہ اظہر اور ندا علی کا شکریہ بھی ادا کرنا ہے جنہوں نے ”کانٹوں پہ چل کر موتی بننے والوں“ کے تصور کو خوبصورتی سے ٹائٹل میں مزین کیا۔

جنت کے پتے چونکہ درختوں کے پتوں کی طرف اشارہ نہیں کرتے اس لیے میں ٹائٹل میں پتے نہیں دکھانا چاہتی۔ علم و عرفان پبلشرز کی پوری ٹیم کا بھی شکریہ جنہوں نے میری بہت مدد و معاونت کی۔

اس کے علاوہ لیلیٰ خان اور حنا گلزار کی میں تہہ دل سے مشکور ہوں جنہوں نے اس کتاب کی پروف ریڈنگ میں میری بہت مدد کی۔ اللہ ان سب کو اچھا اجر دے۔

اور آخر میں جنت کے پتے کے فیس بک پیج کے اُن ہزاروں ممبرز کا شکریہ جو ان پندرہ ماہ میرے ساتھ رہے جب تک کہ یہ ناول شعاع میں چھپتا رہا اور جن کے اظہارِ تشکر کے لیے الفاظ کم پڑ جاتے ہیں۔

نمرہ احمد

مئی 2013

WWW.PAKSOCIETY.COM

ایل ایل بی آنرز کی اسٹوڈنٹ حیا سلیمان کی زندگی میں دلچسپ موڑ اس وقت آیا جب اسے پانچ ماہ کا ایک سمیستر پڑھنے کے لیے ترکی کی ایک یونیورسٹی کا اسکالرشپ ملا، لیکن حالات اس وقت گھمبیر ہو گئے جب ایک فنکشن پہ بنائی گئی اُس کی ذاتی ویڈیو کو کسی نے انٹرنیٹ پہ ڈال دیا۔ اپنے روایتی قسم کے خاندان والوں کی نظر سے اس ویڈیو کو دُور رکھنے اور کسی بھی پیچیدگی سے بچنے کے لیے اس کو سائبر کرائم سیل کے ایک ایسے آفیسر سے رابطہ کرنا پڑا جو اس کی ویڈیو کو ہٹا سکتا تھا۔ مگر جلد ہی یہ احساس اسے پریشان کر گیا کہ وہ بے چہرہ آفیسر اس کے بارے میں بہت پہلے سے سب کچھ جانتا ہے۔

کیا حیا وہ ویڈیو انٹرنیٹ سے ہٹوا پائے گی؟ کیا وہ ترکی جا پائے گی؟ اور سب سے بڑھ کر کیا اُسے ترکی میں وہ مل سکے گا جس کو اُس نے کبھی دیکھا نہیں تھا مگر جس کو وہ کئی برس سے ڈھونڈ رہی تھی؟

استنبول کی گلیوں سے بوسفورس کے سمندر تک، کپادوکیہ کی غاروں سے بھارتی جیلوں کے ٹارچر سیلز تک 'جنت کے پتے' کسی ایسے رولر کوسٹر کی مانند ہے جس میں آپ کے اوپر نیچے ہوتے اکثر اندازے غلط ثابت ہوں گے اور رازوں سے بھری یہ کہانی اپنی آخری سطر تک اپنے راز محفوظ رکھے گی، کیونکہ راز رکھنا بھی ایک فن ہے اور یہ ہر ایک کو نہیں آتا۔

نئی آنے والی کتاب "پارس"

نمرہ احمد کی کتابیں

- 1- سانس ساکن تھی 2- میرے خواب میرے جگنو 3- ابلیس
- 4- قراقرم کا تاج محل 5- بلی راجپوتان کی ملکہ 6- مصحف

علم و فن پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40- اُردو بازار، لاہور۔

فون: 3723584، 37232336، 37352332

www.ilmoirfanpublishers.com

E-mail: ilmoirfanpublishers@hotmail.com